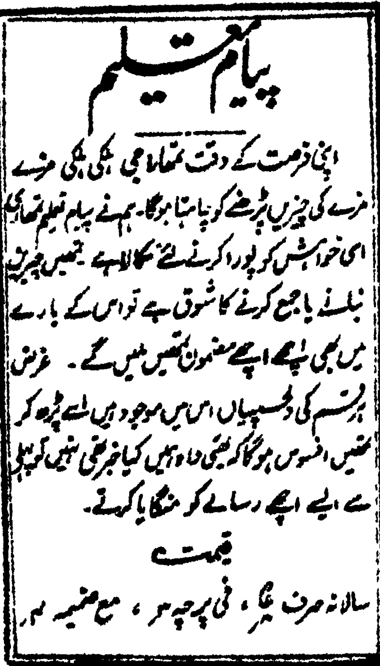
جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

آپ کے بچوں کی کتابیں

مکتبہ جامعہ نے بچوں کے لئے بہت سی کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کے مضامین سہل ہیں اور زبان آسان۔ اکثر کتابیں جامعہ کے اساتذہ اور معلمین کی لکھی ہوئی ہیں یا ان کی زیر نگرانی تیار ہوئی ہیں۔ بیان کی الجھنوں اور اغلاط سے یہ نسبتاً پاک ہیں۔ لکھائی چھپائی خوشنما ہے اور الفاظ الگ الگ ہیں کہ بچوں کو پڑھنے میں سہولت ہو۔ جامعہ کے لوگ بچوں کا لٹریچر شائع کرنا اپنا خاص کام سمجھتے ہیں اور ایسی کتابیں شائع کی جا رہی ہیں جنہیں دیکھ کر بچے اُن کی طرف بڑھتے ہیں، بھاگتے نہیں۔

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
بچوں کی کہانیاں	۲ر	عجائب خانۂ سمندر	۱۲ر
مرغی اجیہ رحمی	۲ر	کائنات	۵ر
تابعیل خاں	۲	دنیا کے بسنے والے	۳ر
نیت کا پھل	۳	تعلیمی کھیل	۳ر
شیدلا	ر	بچوں کا حساب	
بیکاری	۳	حصہ چہارم	۶ر
شہزادی گلنار	۸ر	پنجم	۱۰ر
بچوں کی نقلیں	۵ر	ششم	۹ر
بچوں کے دماغیل		باقبلاتی پروجکٹ	۸ر
جواھر ملیہ		سیلا دلہنی پروجکٹ	۳ر



آپ بھی ان میں سے کچھ کتابیں طلب فرما کر ہماری حوصلہ افزائی کیجیے

مکتبہ جامعہ، نئی دہلی

بسم [illegible]

جامعہ

زیر ادارت - ڈاکٹر سید عابد حسین ایم - اے پی - ایچ ڈی

جلد ۲۸	جنوری ۱۹۳۷ء	نمبر ۱

فہرست مضامین

			صفحہ
۱	عبادت	جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)	۱
۲	[illegible] ذہنیت	جناب سید الطاف احمد صاحب آزاد انصاری	۱۱
۳	یورپ کے نوجوان	[illegible]	۲۹
۴	شکوہ شکایت	[illegible]	۳۷
۵	فلاطون کی نصیحت	جناب عبداللہ سلمی صاحب	۵۱
۶	کارٹون		
۷	کلام آزاد	جناب سید الطاف احمد صاحب آزاد انصاری	
۸	تنقید و تبصرہ		

قیمت سالانہ ہے — فی پرچہ ۸

پروفیسر محمد مجیب بی اے آکسن [illegible] جامعہ برقی پریس میں
چھپوا کر شائع کیا

عبادت

مذہبی عقائد کی چھان بین اور جذبۂ مذہبی سے [illegible] کا سلسلہ قائم کرنے کی جو کوشش [illegible] عالم تیس
تی برس سے کر رہے ہیں اُن سے کوئی اور نتیجہ نکلا ہو یا نہ ہو قدیم زمانے کی مذہبی روایتوں اور دیومالا
کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ مشرق اور مغرب کی مقدس کتابوں کے ترجموں اور تحقیقوں
نے پہلے کے مقابلے میں مذہبی عقائد کا مطالعہ بہت آسان کر دیا ہے۔ عالم مختلف مذہبوں کو اگر
سامنے رکھ کر ان پر اسی انداز سے غور کرتے ہیں جیسے کہ ایک نقاد مختلف شاعروں کے کلام پر وہ
اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کسی قدیم یا جدید مذہب میں کوئی بات نئی یا نرالی نہیں ہے۔ اور کسی مذہب کے
پیرو یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان کے عقائد صحیح اور باقی سب کے غلط ہیں۔ کیوں کہ جس قدر ہم غور
کرتے ہیں اتنے ہی ہمیں اس کے ثبوت ملتے جاتے ہیں کہ مذہبوں میں مشترک صفات زیادہ
ہیں اور انفرادی خصوصیات کم اور یہ خصوصیات بھی حالات اور مذاق کے فرق نے پیدا کی
ہیں جیسے [illegible] کا علم پھیلے گا [illegible] اور نتیجہ جو اس تحقیق سے نکلا ہے یہ ہے
کہ ہر مذہب خود [illegible]
کہ جو عالم گیر جذبے کا حصہ ہوتا ہے [illegible] انسانوں کی [illegible] خواہش کا ایک
عکس ہوتا ہے جن کا پورا ہونا ان کی ترقی اور [illegible] کے لئے ناگزیر ہوا اور اسی وجہ سے اس
کو تقدس کا جامہ پہنا کر انکار اور مخالفت سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے

یہ اور ایسی بہت سی باتیں [illegible] عالموں نے اپنی [illegible] کی لاعلمی اور تعصبات
کی حد میں کہیں [illegible] دینی علم [illegible] باتوں کو اچھی طرح سمجھ نہ سکے وہ ان
پر بہت جز بز ہوئے۔ [illegible] علم یافتہ لوگ جو پرانے عقائد سے مطمئن نہ
تھے اس نئے علم کو اصل حقیقت سمجھتے [illegible] برس کے اندر نہ عالم ایسے

دشمن کے بچے ہوئے ہیں کہ اپنی عاقبت کو علمی تجسس کی نذر کر دیں نہ مذہبی رہنما ایسے صاحب اختیار کہ جس کھوپڑی کو غلط خیالات سے بھرا ہوا پائیں اسے پھوڑ کر رکھ دیں۔ نئے علم اور پرانے مذہب میں تضاد لوگ اب بھی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن یہ علم کی کمی یا طبیعت کی کم زوری کی وجہ سے ہے، اور جیسے جیسے علم بڑھتا جائے گا اور ذہن غلامی کے اثرات سے پاک ہوتا جائے گا مذہب اور علم کی ہم آہنگی اور یک جہتی بڑھتی جائے گی۔

اگر علمی تحقیق سے یہ ثابت ہوا ہے کہ دنیا کے تمام مذہب ایک ہی حقیقت کو بیان کرنے کے مختلف طریقے ہیں جیسے دنیا کی تمام نسلیں اور قومیں ایک اصل کے مختلف نمونے ہیں تو اس سے کسی مذہب کی قدر گھٹ نہیں جاتی، اور اس کی شخصیت میں بھی فرق نہیں آتا۔ نوع انسانی کا ہر فرد، خواہ اسے تعلیم اور ماحول نے ایک نمونے کے مطابق ڈھالنے کی کتنی کوشش کی ہو، اپنی الگ شخصیت ضرور رکھتا ہے۔ اور بعض افراد جن میں زیادہ قوت ہوتی ہے ہر طرح کے دباؤ کے باوجود ابھر کر نقل کی جگہ نیا نمونہ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح جذبۂ دینی اصل میں ہر جگہ ایک ہے لیکن بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جس میں وہ ابھر کر ایک نیا ماحول پیدا کرنے کی قوت حاصل کر لیتا ہے اور اگر بانی مذہب ایسا کامل ہو کہ ایک قوم یا ایک نسل ہی اسے اپنا نہ سمجھے بلکہ ہر قوم اور ہر نسل یعنی انسانی فطرت کا ہر نمونہ اس میں مرغوب صفات کی کامل صورت دیکھے تو مذہب خود بخود عالم گیر ہو سکتا ہے۔ اس مذہب میں ایسی حقیقت ہو نہیں سکتی جس کا کبھی کسی کو علم یا احساس نہ تھا۔ اس لئے کہ ایسی نئی حقیقت کے لئے نیا نظام کائنات اور نئی انسانی سرشت درکار ہوگی، نئی بات ہر مذہب میں بانی کی حیثیت، اس کی تعلیم کی مجموعی شکل ہوتی ہے اور مذہب کو پرکھنے کی کسوٹی یہ اندازہ ہے کہ اس میں عام انسانی سرشت اور عام انسانی ماحول کس حد تک مدنظر رکھا گیا ہے اور کس حد تک ایک خاص قوم کا مذاق اور مزاج یعنی وہ صرف اپنوں کی فکر کرتا ہے یا اپنے پرائے کی قید سے آزاد ہے۔

علمی تحقیق نے مذہب کے متعلق جو دوسری حقیقت معلوم کی ہے کہ وہ اصل میں مادی ضروریات اور اغراض کا عکس ہے علم کے پرستاروں کے نزدیک مذہب پر ایک کاری ضرب ہے۔ کیونکہ وہ

اس طرح انسانی ذہن کو تاریخ کے کھونٹے سے باندھ دیتے ہیں اور ان شاعرانہ اور علم کے نقطہ نظر سے آوارہ خیال آرائیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑتے جن پر جذبۂ دینی کی پرورش کی جاتی ہے۔ اب ہر عقیدے کی تاریخ بیان کر دینا گویا اس کے کپڑے اتار لینا ہے، کہ پھر وہ بھلے آدمیوں کا سامنا کرنے کے لائق نہ رہے اور پرانے سے پرانے ملاقاتی بھی اس کا ذکر کرتے ہوئے شرمائیں۔ لیکن اگر تاریخ بیان کرنے کا نتیجہ یہی ہوتا ہے تو ایک عقیدہ ہی منہ چھپانے پر مجبور نہیں ہوگا۔ بلکہ ساری انسانی تہذیب، اور علم کی روشنی میں اندھے ہو کر ہم پھر وحشیوں کی طرح ایسی حقیقتوں کو ٹٹولتے پھریں گے، جو ہماری زندگی کا سہارا بن سکیں، بس فرق یہ ہوا کہ وحشی آئندہ زندگی کا سامان اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے اور ہمارے دل ویرانے ہوں گے۔ ایسے انجام سے بچنے کے لئے ہمیں غور کرنا ہوگا کہ تاریخ حقیقت کے ہر پہلو پر حاوی ہو سکتی ہے یا نہیں۔ اور انسان جسے پیٹ کی غلامی نے رسوا کر ہی دیا ہے اب کتاب کا غلام ہو کر رہے گا۔ یا اس کے ارادے میں اتنی قوت ہے کہ ان نئی زنجیروں کو توڑ سکے۔

ارادہ تو ہر تندرست آدمی میں ہوتا ہے، تاریخ کی کرامات یہ ہے کہ اس نے ارادے کو عین پابندی ثابت کیا ہے۔ مگر ہم کبھی کبھی یہ بھی دیکھتے ہیں کہ پامال قوموں میں اچانک ایسی شخصیتیں نمودار ہوتی ہیں کہ وہی ماحول جس پر پہلے خزاں کی تاثیر تھی بادِ بہار بن کر خوابیدہ قوتوں کو جگاتا اور مردوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ تاریخ کے نئے عالم ہمیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ماحول میں اس کی قدرت ہے کہ وہ آپ اپنی ضد بن جائے اور ایک طرح سے اپنا جادو نہ چلا سکے تو وہ دوسری طرح چلائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ماحول ایک ایسی قوت، اثرات کا ایسا طلسم ہے کو جو ہمارے ذہن اور تخیل کے قابو میں نہیں آسکتا، اور اسے مختار کل ٹھہرانا ویسا ہی عقیدہ ہے جیسے کہ اور ہزاروں عقیدے جن کی عزت کرنا علم کی شان کے خلاف معلوم ہوتا ہے اس پر طرہ یہ کہ اس عقیدے کی بدولت اچھے اور برے غلط اور صحیح کی تمیز بھی نہیں رہتی، اس عقیدے کا مقصد سمجھانا، واضح کرنا، تحقیق کا سلسلہ جاری رکھنا ہے ہدایت تو ہیں نہ اس عقیدے سے حاصل ہوتی ہے نہ تاریخ کے اس دیئے سے جو اس مندر میں جلایا گیا ہے تاریخ

یہ بتا سکتی ہے کہ کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ لیکن جو واقع ہو اس کی اخلاقی قدر و قیمت جانچنے کے لئے تاریخ کا اپنا کوئی معیار نہیں۔ مورخوں کا البتہ اپنا معیار ہوتا ہے جسے ان کے عقیدے اور ذہنی تعصبات قائم کرتے ہیں۔ لیکن اس غیر علمی معیار کو وہ اپنے عقیدوں میں اس طرح چھپا دیتے ہیں کہ دیکھنے والے کو اس کا پتہ نہیں چلتا یہ ہماری سادہ لوحی ہے کہ ہم عالم اور شعبدہ باز کو آدمیوں کی دو مختلف قسمیں سمجھ بیٹھتے ہیں ورنہ عالموں کے بستے پر ہر طرح کا شبہ کیا جا سکتا ہے اور کیا جانا چاہیئے۔

تاریخ کے عالم شعبدہ بازی پر اس وجہ سے مجبور ہوتے ہیں کہ وہ تاریخ سے ایسے کام نکالنا چاہتے ہیں جو اس کے دائرے سے باہر اور اس کے اصل مقصد سے دور ہیں۔ تاریخ ایک نئے دین کی بنیاد نہیں بن سکتی، لیکن جذبہ دینی کے مظاہر سے ہمیں واقف کر سکتی ہے۔ ماحول قادر مطلق نہیں ہے لیکن وہ انسانی زندگی کے تمام راز اپنے سینے میں رکھتا ہے۔ اس طرح یہ دعویٰ کہ مذہب مادی ضروریات اور اغراض کا عکس ہے۔ موجودہ مذہبوں کو مٹانے اور ایک علمی مذہب قائم کرنے کی نیت سے پیش کیا جائے تو وہ غلط ہے اس لئے کہ مادی اثرات معلوم کرنے کے لئے ہمارے جو ذریعے ہیں وہ محدود ہیں اور محدود رہیں گے اور ان کی حد سے گذرنے کے لئے ایسی بصیرت درکار ہے جو علم کی ایک علیحدہ اور بہت اعلیٰ قسم ہے اور کتابی عالموں اور اصطلاحوں سے بحث کرنے والے فلسفیوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ لیکن اگر یہی دعوے جذبہ دینی کو انتہا پسندوں کے ہاتھوں سے بچانے کے لئے کیا جائے تو وہ بڑی حد تک صحیح ہے۔ مذہب کوئی کتابی علم نہیں ہے۔ عقل کے کارخانے کی بنی ہوئی چیز نہیں۔ جذبہ دینی انسانی زندگی اور انسانی شخصیت کو نمو اور فروغ دینے والی قوتوں کا سرچشمہ اور ان کا غیر محدود قدرتی ذخیرہ ہے اور جب تک ہم کو اس دنیا کے خاص مادی ماحول میں زندگی بسر کرنا ہے۔ مذہب کو مادی ضروریات اور اغراض سے کس طرح جدا کیا جا سکتا ہے۔ مادی ضروریات اور اغراض ادنیٰ بھی ہوتی ہیں اور اعلیٰ بھی، مگر اس کا کیا۔ انسان اشرف المخلوقات بھی ہے اور حیوان بھی۔

عبادت جذبہ دینی کی وہ شکل ہے جو مذہب اور زندگی کے تعلق کو قائم رکھتی ہے اور عبادت

کے جو طریقے اور اس کے جو مقصد کسی مذہب نے مقرر کئے ہوں، انھیں سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب اور زندگی کا تعلق کس قسم کا ہے۔ عبادت کے ابتدائی طریقے۔ جن کا رگ وید کے بھجن اعلیٰ سے اعلیٰ اور جان پرستی سب سے ادنیٰ نمونہ ہے، نوع انسانی کی خیر و عافیت کے لئے دعائیں مانگنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ لیکن یہ نوع انسانی کی وہ حالت تھی جب اخلاقی خیر و شر، عدل اور انصاف کا معیار بن کر تیار نہ ہوا تھا، اور نجات کی وہ تمنا جس کے سائے میں بعد کو زندگی بسر ہونے والی تھی جسمانی سلامتی کی خواہش سے جدا نہیں ہوئی تھی۔ عبادت کے طریقے جبلی ہیں، فطری ہیں۔ اخلاقی اور روحانی نہیں ہیں، تاریخ اور حیاتیات کے علم ان کے اور مہذب انسانوں کی عبادت کے درمیان رشتہ قائم کرنے میں اتنے ہی ناکامیاب ہوئے ہیں جتنا کہ انسان کا بندر سے سلسلہ ملانے میں، آدمی انسان اسی وقت سے مانا جاسکتا ہے جب اس کو خیر و شر کا شعور اور علم ہوا۔ اور جب اس نے اپنے اخلاقی معیار کے مطابق زندگی کی طرح ڈالنے کا حوصلہ کیا۔ اس اعتبار سے گوتم بدھ، حضرت عیسیٰ اور پیغمبر اسلام کی تعلیم اور عبادت کا وہ مفہوم جو اس تعلیم میں مضمر ہے پہلے کے اور تمام مذہبوں سے جدا اور اعلیٰ حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کی تاریخ کے سب سے اہم اور نتیجہ خیز انقلاب انھیں مذہبوں کے پھیلنے سے ہوئے۔ یہی وہ "اتفاقات" ہیں جنھیں تاریخ سمجھا نہیں سکتی، آزاد اخلاقی ارادے، کے وہ عظیم الشان مظہر جو ہماری آئندہ ترقی کے ضامن اور اس وقت ہمارا سب سے مضبوط سہارا ہیں۔ یہاں اس بات پر زور دینا مقصود ہے کہ یہ علمی تحقیق کے کارنامے نہیں تھے۔ عبادت کے نئے طریقوں کے وسیلے سے نئی زندگی تعمیر کرنے کے منصوبے تھے اور اس وقت بھی ہماری کامیابی اس پر منحصر ہے کہ ہم اپنی حکمتِ عملی کو علوم صحیحہ کا محتاج نہ بنائیں۔ بلکہ اسے عبادت کا مظہر جانیں

میں دراصل کچھ کہنا اور چاہتا ہوں یہ تمہید تو اس لئے ضروری تھی کہ بغیر اس کے میں اپنا مطلب سمجھا نہیں سکتا تھا۔ جب ایک طرف لوگ مذہب کو اپنی نئی زندگی سے جان بوجھ کر خارج کرنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف لوگ بغیر جانے بوجھے اپنے مذہب کا اسی نئی زندگی سے رشتہ توڑ رہے ہیں۔ ہندوستان میں مذہب کی مخالفت کرنے والے بہت سے ایسے ہیں جو سمجھتے ہیں کہ

وہ ارتقار کی اس منزل سے گذر چکے ہیں۔ جہاں اخلاق اور اعلیٰ مقاصد کے لئے مذہب اور عقیدے کا سہارا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے یورپ میں تعلیم پائی ہے یا ان کی نئی معاشرت ان پابندیوں کو گوارا نہیں کرسکتی جو مذہب نے مقرر کی ہیں۔ ان میں سے جو لوگ تعلیم کی بدولت پہنچے ہوئے بنتے ہیں ان کا علمی اور عقلی سرمایہ یورپ کے کسی مفکر کے دو چار نظریے ہوتے ہیں۔ بے رے بھگو وہ احتیاط بھی نہیں برتتے جو خود علم سکھاتا ہے اور ایسے نظریوں کو بھی بڑے جوش کے ساتھ دہراتے رہتے ہیں جو اگر غلط ثابت نہیں کئے جاچکے ہیں تو حقیقت کا مرتبہ ہرگز نہیں رکھتے، چونکہ وہ خود ارتقار کی اس منزل سے گذر چکے ہیں جہاں قول اور عمل پر ادب اور احترام کی قید لگی ہوتی ہے۔ وہ سقراط کی طرح اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ نادانوں کو چھیڑ کر دانا بنائیں۔ لیکن ان میں سقراط کی سی انسانی ہمدردی اور خلوص نہیں ہوتا۔ سقراط تو سقراط تھا[۵] یہ ڈانس بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہ تو وہ ہیں جن کی قسمت ذرا اچھی ہوتی ہے بعض تو بے چارے اپنے غصہ کی آگ میں بھنتے رہتے ہیں۔ نہ آدمی نہ کباب، نئی معاشرت کے شیدائی پھر کچھ اچھے رہتے ہیں ان کے پاس روپیہ ہوتا ہے، چین سے رہتے ہیں۔ اپنے ہی جیسوں سے میل جول رکھتے ہیں اور بحث کا موقع ہوا تو اپنے کسی عام بھائی کو سامنے کر دیتے ہیں۔ نئی زندگی کے یہ دونوں قسم کے ہرادل اپنے ان بھائیوں سے جو مذہب اور قدامت پسندی میں گرفتار ہیں سبقت لے جاتے ہیں تو بس اس اعتبار سے کہ اُن کی گرفتاری اور غلامی نئی وضع کی ہے۔

ہندوستان میں مذہب کے ایسے مخالف بھی ہیں جو مصلحت کی بنار پر مذہب کو بحث سے الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اب تک فسادیوں اور غداروں نے ہمیشہ مذہب اور ملت کی آڑ لی ہے اور سیاسی اغراض اور مفادِ عامہ کا احساس ہندوستانیوں میں جو تھوڑا بہت اتحاد پیدا کرتا ہے اسے مذہب آکر مٹا دیتا ہے ان لوگوں کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ ترقی اور اصلاح کے رستے میں مذہب کے روڑے اٹکانے والے آدمی کیسے ہیں اور قوم کو دھوکا دیتے ہوئے وہ اپنی ذاتی اغراض کو چھپا سکتے ہیں

---

[۵] سقراط نے ایتھنز کی جمہوری عدالت کے سامنے یہ عذر پیش کیا تھا کہ میں ڈانس ہوں میرا کام ایتھنز والوں کو ستانا ہے

یا نہیں وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ فساد اور غداری کسی کو ملت سے خارج نہیں کر دیتی ۔ اور مسلمان مسلمان رہتا ہے چاہے وہ ملت کا خادم ہو یا اسے ہر خریدار کے ہاتھ بیچتا پھرے ۔ اس صورت میں مذہب سے علیحدہ ہوئے بغیر کوئی کام نہیں بنتا اور اگر مذہب کو چھوڑنے سے ایسے بہت سے آدمی بھی چھٹ جائیں جو قومی مقاصد حاصل کرنے میں مدد دے سکتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں اس خیال کے جو لوگ ہیں وہ چاہے اصولاً ہر مذہب کے مخالف ہوں اور وہی عقیدے رکھتے ہوں جو یورپی علم یا معاشرت کے غلاموں کے ہیں ۔ اُن کی شکایت بالکل بجا ہے ۔ ہم برسوں سے ہر روز اور ہر جگہ مذہب کے دغا باز خیر خواہوں کو ہندوستانی قوم ہی نہیں بلکہ اپنی ملت کا کام بگاڑتے اور اسے بے آبرو کرتے دیکھتے آئے ہیں ۔ اور ان لوگوں کی طرف سے جو اصولاً اور پورے خلوص کے ساتھ مذہب کو صحیح زندگی اور سچی کامیابی کی بنیاد مانتے ہیں کوئی تحریک نہیں ہوئی ہے کہ دین داری کو پرکھنے کے لئے قوم پرور اخلاق اور مفاد عامہ کا معیار مقرر کیا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ایسا معیار مقرر نہ کیا گیا تو ہندوستان کی ہر ملت اور سب سے پہلے مسلمان خود پرست اور انگریز پرست غداروں کے ہاتھوں تباہ ہوں گے ۔

تو باوجود اس کے کہ مذہب پر اعتراض کرنے کا طریقہ اکثر خود قابل اعتراض ہوتا ہے ہمیں اس کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں میں، اور اب میں بحث صرف مسلمانوں سے کرنا چاہتا ہوں ، دین اور دنیا کے درمیان وہ رشتہ نہیں رہا ہے جو ان کا دین سکھاتا ہے وہ اپنی عبادت کے صحیح مفہوم سے ناواقف ہیں یا اسے نظر انداز کر رہے ہیں جس کا ہماری موجودہ پستی اور انتشار ہی ایک ایسا ثبوت ہے کہ اس کے علاوہ کسی اور دلیل کی ضرورت ہی نہیں ہماری عبادت سراسر روحانی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ ایک تقریب بھی ہے ۔ وہ شخصی صرف اس حد تک ہو سکتی ہے کہ خلوص ہر شخص کے لئے لازمی ہے ۔ وہ پرستش کا طریقہ ہی نہیں ۔ اتحاد اور یک جہتی رکھنے کا ایک ذریعہ بھی ہے ۔ انتہا پسندی نے عبادت کے مفہوم کو روزہ نماز کی پابندی تک محدود کر دیا ہے ۔ اور روزہ نماز کا مقصد بھی ثواب کمانا تھہرایا ہے ۔ اور اگر اسلام نے دینی فرائض مقرر کرتے

ہوئے دنیاوی ضروریات کا خیال رکھ کر ایسے رجحانات کی پیش بندی نہ کر لی ہوتی تو ہمارے انتہا پسند بزرگ ایسے اپاہج کے سوا جس کی عمر پلنگ سے اُٹھ کر مصلے پر اور مصلے سے اُٹھ کر پلنگ پر جانے میں صرف ہو۔ کسی اور طرح کا مزاج اور حوصلہ رکھنے والے آدمی کے لئے دین دار بننا مشکل کر دیتے، لیکن اسلام کی حکمت اور اس کی فطرت شناسی بھی ہمیں اس تنگ نظری یا یوں کہئے اس روحانی کاہلی سے بچا نہیں سکی ہے جو عبادت کے آسان سے آسان طریقے تلاش کر کے انھیں حجت اور تحقیق کی موشگافیوں اور تقدس اور سند کے وزن کے ذمہ داری کا ایک اچھا خاصا پہاڑ بنا دیتی ہے اور بہت سے فرائض کو جنھیں ادا کئے بغیر اسلامی عبادت کبھی مکمل نہیں ہو سکتی نظر انداز کر دیتی ہے اسے ہم صاف صاف کہنا چاہیں تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ روزے اور نماز کو لوگ آسان دیکھ کر انھیں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔ جہاد کو جو ارکان اسلام میں اتنی ہی بڑی حیثیت رکھتا ہے بھلا دیتے ہیں۔ اس کی ایسی مہمل تشریح کرتے ہیں کہ اس کا موجودہ حالت میں فرض ہونا ہی مشکوک ہو جاتا ہے۔ مسلمان جہاد کی کسوٹی پر کسی کے ایمان کو پرکھ نہیں سکتے، ایک ریاکاری ہی نہیں بلکہ صریحی غداری کو تسبیح اور مصلے کی بساط بچھاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور کچھ کہہ نہیں سکتے، اس لئے کہ وہ غلط فہمی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ہمارے مخالف اپنی نیک نیتی ثابت کرنے کے مرحلے ہی سے گذر نہیں پاتے نقصان وہ پہنچاتی ہے، لعنت کسی اور پر بھیجی جاتی ہے

اپنی جداگانہ حیثیت رکھنے کے علاوہ یہ کہنا بھی غلط تھا اور اب بھی غلط ہے کہ مسلمان پر روزے نماز کی ادائگی فرض نہیں غور اسی پر کرنا ہے کہ روزہ اور نماز علامت ہیں اس عبادت کی جو ملت کی معاشی، سیاسی اور اخلاقی اصلاح اور ترقی سے ادا ہوتی ہے مسجد بنا کر کھڑی کر دینا کافی نہیں کہ قبلہ صرف ملی آزادی کی صاف فضا میں نظر آ سکتا ہے۔ غریب اور امیر کا ایک صف میں کھڑا ہو جانا کافی نہیں۔ قوم اور ملت کی معاشی حالت میں توازن پیدا کرنا بھی لازمی ہے۔ گھر میں وقت سے نماز پڑھ لینا کیا فائدہ پہنچا سکتا ہے اگر شخصی زندگی میں کوئی ضبط اور نظام اور مقصد نہیں، نیت باندھنے سے پہلے اور سلام پھیرنے کے بعد نمازی کے دل پر ذاتی اغراض

کا ہجوم رہتا ہے اور وہ خلوص کے ساتھ صرف اپنی ہی سلامتی اور کامیابی کے لئے دعا مانگ سکتا ہے۔ جب تک جہاد کا حوصلہ دل میں نہ ہو اور زندگی میں اپنا رنگ نہ دکھائے ہماری عبادات ادھوری رہ جاتی ہیں۔

جہاد کے لئے کافر کی شرط لگائی جائے تو وہ بے شک ایک فرض ثابت نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ کفار مکہ کے نمونے اس وقت ہمیں بہت تلاش کرنے پر ملیں گے لیکن اگر ہم یہ سوچیں کہ مسلمانوں کو پچھلے دو تین سو برس میں کس نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے اور کیسے، تو ہمیں فوراً معلوم ہو جائے گا کہ مسلمانوں کے اصل دشمن کون ہیں اور ہندوستان میں ہمارے مذہب اور ہماری ملت پر غلامی کا جو دھبہ ہے وہ کیسے مٹایا جا سکتا ہے۔ اس نقطہ نظر سے دیکھئے تو ہندوستان کو آزاد کرنا، اور بلا کسی شرط اور تحفظ حقوق کے آزاد کرنا ہمارا دینی فرض ہو جاتا ہے اور اگر ہم بے وقوف نہیں بننا چاہتے ہیں تو ہمیں ہتھیار بھی وہی استعمال کرنا چاہئیں جو اس وقت کام آسکتے ہیں۔ ہمارا مقصد میدان میں پرا جما کر کھڑے ہونے سے پورا نہیں ہوگا بلکہ اتحاد اور یک جہتی پیدا کرنے سے۔ جان دینے سے نہیں بلکہ جان کھپانے سے، اس کا نام قومی خدمت یعنی قوم پر احسان کرنا کہئے تو یہ بہت مشکل ہوتا ہے اور اس سے طبیعت جلد اکتا جاتی ہے۔ اسے عبادت سمجھئے تو یہ عادت بن جاتا ہے، خود بخود ہوتا رہتا ہے اور آدمی کی نظر دنیاوی کامیابی پر نہیں بلکہ عاقبت پر رکھ کر اس میں وہ عاقبت اندیشی اور انسانی فطرت کا لحاظ پیدا کر دیتا ہے جو اور کسی طرح حاصل نہیں ہوتا۔

لیکن دنیا نے آج کل ایسا رنگ اختیار کیا ہے کہ سیاسی آزادی جہاد کی تمہید نہیں تو اس کا پہلا باب ہی ہو سکتی ہے کہ سیاسی آزادی کے ساتھ ایسی معاشی غلامی ہونا بھی ممکن ہے جو آدمی کی آبرو کو خاک میں ملا دے اور اسے اس لائق بھی نہ رکھے کہ وہ بازار میں اپنی محنت کیا اپنے آپ کو بیچ کر بھی دو کوڑی حاصل کر سکے۔ ایسا افلاس ممکن ہے جو انسانیت کو بالکل پامال کر دے۔ مختلف طبقوں اور ملتوں میں ایسی بیگانگی اور عداوت ممکن ہے جو کھلم کھلا خانہ جنگی

سے بھی بدتر ہو۔ ہمارے دشمن غیر ہی نہیں بلکہ مختلف طبقوں اور ملتوں کی غیریت بھی ہے اور اغراض کا ایسا اختلاف اور تصادم جو کہ آزادی کے مفہوم ہی کو اندر سے کھوکھلا رتیا ہے، تاریخ کو دیکھئے تو آزادی کے مطالبے کے ساتھ ہمیشہ ایک غرض لگی ہوتی ہے۔ آزادی کے جھنڈے کے پیچھے ایک فوج بھی کھڑی ہوتی ہے۔ کبھی آزادی مذہبی جماعتوں کا مطالبہ تھی جو آزاد ہوئے بغیر اطمینان سے اپنے مذہب کی پیروی نہیں کرسکتی تھیں۔ کبھی وہ ایسے طبقوں کا نعرہ تھی جس کی نشوونما ریاست یا قدامت پسند طبقے روکے ہوئے تھے۔ اس نے بعض جو بنایا وہ سیاسی تھا، لیکن تھی دراصل وہ کچھ اور اس وقت اگر ہم یہ سمجھیں کہ آزادی کے معنی صرف یہ ہیں کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو ہم آزادی کی بس ظاہری شکل دیکھیں گے۔ اور ظاہری شکل کے ساتھ ہمیشہ ڈھول کے اندر پول کا شبہ لگا رہتا ہے۔ ہمارے دلوں میں آزادی کے حوصلے کو ایک نئی زندگی تعمیر کرنے کا حوصلہ ہونا چاہیئے اور زندگی ایک طبقے کے مفاد، کسی ایک خیال کے پرچار سے بہت زیادہ بڑی چیز ہے۔

اس وقت یہ ممکن ہے کہ ان لوگوں کو جو مظلوم ہیں یا اپنے حق سے محروم رکھے گئے ہیں ظلم اور زیادتی کا احساس دلا کر بیدار کیا جائے اور انھیں ان اغراض کی مخالفت ہی پر نہیں جس کی بدولت یہ ظلم ہوا بلکہ اس سارے نظام حیات کو جس نے یہ ظلم روا رکھا درہم برہم کرنے پر آمادہ کیا جائے یعنی مختلف طبقوں کی عداوت مذہب اور تہذیب کی بیخ کنی اور سماج کے اندر خانہ جنگی، وہ تمام مرحلے طے کئے جائیں جنکے بغیر آجکل انقلابی تحریک کا اصولاً صحیح اور عملاً کامیاب ہونا دشوار مانا جاتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ ہم روس کے تجربے سے فائدہ اٹھائیں، قومی سیرت اور مخصوص حالات کا گہرا مطالعہ کریں دنیا کا رنگ دیکھتے رہیں اور زندگی کی ایسی اصلاح کریں جو چاہے کسی خاص فلسفے کے مطابق نہ ہو مگر ہمارے دیس اور دیس والوں کو پورا پورا فیض پہنچائے۔ یعنی اس وقت جو ظلم ہو رہا ہے اسے بند کرنے، جو اندھیرا پھیلا ہے اسے دور کرنے، جو مردنی چھائی ہے اس میں نئے حوصلوں کی جان ڈالنے کے لئے دو صورتیں ممکن ہیں، عداوت اور عبادت، اور اگر ہماری عبادت ثواب کمانے تک محدود رہی تو عداوت بلا روک ٹوک اپنا کام کرے گی۔

غزل کی حمایت

اعتراضات اور جوابات

ذیل کا مضمون حکیم آزاد انصاری صاحب
کے مجموعۂ کلام کے مقدمے کا ایک حصہ ہے
جو ہنوز زیرِ طبع ہے۔

بعض کور ذوق اپنی زبان اور اپنے شعر و ادب کے دشمن کچھ عرصہ سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ غزل کا وجود صفحہ ہستی سے مٹا ڈالا جائے۔ یہ نادان اپنی غزل کی دشمنی کے ثبوت میں حسب ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔ (۱) "غزل کا معشوق مذکر ہوتا ہے اور یہ ایک شرمناک امر ہے" (۲) "غزل آج تک انھیں مضامین و مطالب کی حامل چلی آرہی ہے جو صدیوں پہلے ظاہر کئے جا چکے ہیں، اس میں خیالاتِ نو کی مطلق گنجائش نہیں"۔ (۳) "غزل کے معشوق کا دہن موہوم ہوتا ہے، کمر معدوم ہوتی ہے، قد سرو شمشاد سے بھی دو ہاتھ اونچا ہوتا ہے، گردن گردنِ صراحی سے بھی دو تین بالشت لمبی ہوتی ہے، اس کی آنکھیں گلہائے نرگس کے مثل، اس کے بال سنبل کے مانند، اس کی زبان برگ سوسن کے مشابہ ہوتی ہے۔ یہ معشوق ایک ناممکنات کا پتلا ہوتا ہے، اگر کسی طرح مجسم کر دیا جائے تو آدمی ڈر ڈر کے بھاگنے لگیں" (۴) "غزل بوالہوسی اور پست خیالی سکھاتی ہے" (۵) "غزل کا ہر شعر دوگانہ اور متضاد مضمون کا حامل ہوتا ہے، اس کے اشعار میں کوئی ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا، وہ بالکل اک چوں چوں کا مربہ ہوتی ہے، جو ذہنِ انسانی کو انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ واحد دماغ میں بیک وقت اتنے مختلف اور متضاد خیالات پیدا ہوسکیں" (۶) "تمام اصنافِ سخن میں تو مطالب و معانی کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں، مگر غزل میں اس کے برخلاف الفاظ کے لئے مطالب و معانی کی جستجو کی جاتی ہے اور یہ ایک بالکل غیر فطری طریقہ ہے"۔ یہ دلائل بظاہر تو نہایت وزنی اور قطعی مسکت نظر آتے ہیں، مگر درحقیقت بالکل بے وزن۔ بے حد

فریب دہ اور محض لچر پوچ ہیں اور ان کی پیداوار نتیجہ ہیں صرف مغرب زدگی کا بالترتیب جوابات ملاحظہ ہوں

(۱) "غزل کا معشوق مذکر ہوتا ہے، اور یہ ایک شرمناک امر ہے"۔ غزل کا معشوق مذکر نہیں ہوتا بلکہ اس میں افعال وصفات مذکر استعمال کئے جاتے ہیں، یہی بالکل درست ہے اور ایسا ہی ہونا چاہئے۔ اس کی وجوہ حسبِ ذیل ہیں:۔

اوّل مرد صنف قوی ہے اور عورت صنفِ نازک، اور ہر امر میں صنفِ قوی کا لحاظ زیادہ رکھا جاتا ہے۔ اگر مرد و عورت کا جدا جدا ذکر کریں گے تو یوں کہیں گے "اتنے مرد آئے، اتنی عورتیں آئیں"۔ لیکن جب مخلوط و مشترک ذکر منظور ہوگا تو یوں کہنا پڑے گا "اتنے مرد عورت آئے۔ یا اتنے عورت مرد آئے"۔ یعنی لفظِ عورت خواہ مقدم ہو یا موخر فعل دونوں صورتوں میں مذکر ہی رہے گا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ افعال وصفات مذکر کو افعال وصفاتِ مونث پر ترجیح ہے اور یہ دونوں صنفوں کے لئے استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

دوم جب کوئی ایسا عام حکم دیا جاتا ہے جو مرد و عورت دونوں کو حاوی ہو اس وقت بھی ہمیشہ افعال وصفات مذکر ہی استعمال کئے جاتے ہیں۔ مثلاً "جو شخص اس رستے سے گذرے گا اس کو دس روپے جرمانے کی سزا دی جائے گی"۔ یہاں بھی فعل مذکر ہی استعمال کیا گیا ہے۔ مگر صرف اس بنا پر کہ اس حکم میں فعل مونث "گذرے گی" استعمال نہیں کیا گیا عورت کو اس حکم کے اثر سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاسکتا لیکن اگر یوں کہا جاتا "جو اس رستے سے گذرے گی اُس کو دس روپے جرمانے کی سزا دی جائے گی"۔ تو بالیقین مرد اس حکم کے دائرہ اثر سے خارج ہوتا۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ افعال وصفات مذکر کو ترجیح ہے اور ان کا دائرہ اثر مرد عورت دونوں کو محیط ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کے قوانینِ حکومت اور ہر مذہب کے قوانین شرع میں تمام و کمال افعال وصفات مذکر ہی استعمال کئے گئے ہیں، جو مرد عورت دونوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ دیکھو مقدمہ شعر و شاعری مصنفہ علامہ حالیؒ۔

سوم۔ اگر غزل میں افعال وصفات مونث ملائے جانے لگیں تو صرف عورت بہ حیثیت معشوق باقی رہ جائے گی اور مرد اس کے دائرہ سے خارج ہو جائے گا۔ حالانکہ کبھی مرد عاشق ہوتا ہے اور کبھی عورت

اور غزل ٹھہری مرد و عورت دونوں کے معاملاتِ عشق کے اظہار کا ذریعہ اس لئے غزل میں افعال و صفات مذکر ہی کا استعمال زیادہ انسب ہے کہ وہ ان دونوں صنفوں کو حاوی ہے۔ یہی سبب ہے کہ عورتیں بھی جب غزل کہتی ہیں تو وہ بھی افعال و صفات مذکر ہی کو ترجیح دیتی ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ہندی میں شاعری صنفِ نازک کی زبان سے کی جاتی ہے اور اس میں افعال و صفات مؤنث استعمال کئے جاتے ہیں اور مرد و عورت دونوں کو حاوی ہوتے ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ "جناب آپکے اس استدلال کو افعال و صفات مذکر کی حد تک تو قبول کیا جا سکتا ہے مگر ستم تو یہ ہے کہ غزل میں "سبزہ خط" "چہرا" "دستار" "ترک بچہ" اور "ہندو بچہ" جیسے مخصوص بہ صنفِ قوی الفاظ بھی تو پائے جاتے ہیں، جس سے قطعی یہ ثابت ہوتا ہے کہ غزل کا معشوق مذکر ہی ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت! آپ ایسے مرد کا مرد کے ساتھ عشق جتانا کیوں کہتے ہیں، ممکن ہے ان میں عورت کے جذباتِ عشق ظاہر کئے گئے ہوں، اب اگر یہ کہیں گے کہ "جناب! یہ اشعار تو اکثر مردوں کے کہے ہوئے ہیں"۔ تو میں کہوں گا کہ بے شک یہ مردوں کے کہے ہوئے ہیں۔ مگر کیا مرد عورت کے جذباتِ عشق ظاہر نہیں کر سکتا؟ آخر کیوں نہیں کر سکتا۔ کیا عورت مرد پر عاشق نہیں ہوتی اگر مرد نے عورت کے جذباتِ عشق بھی حوالہ قلم کر دیئے تو اس نے کیا گناہ کیا۔ اگر یہ کوئی عیب ہے تو اس کو ہر حالت میں عیب ہونا چاہئے۔ یہ کیا ستم ہے کہ مرد ہندی شاعری میں عورت کے جذباتِ عشق ظاہر کرے تو وہ درست مگر غزل میں نادرست۔ اور پھر آپ اس عیب کو اپنی دیگر اصنافِ سخن مثنوی اور نظم وغیرہ میں تو جائز رکھیں اور بیچاری غزل کو اس بنا پر کشتنی و گردن زدنی قرار دے دیں۔ اور آخر مردانہ حسن بھی تو آخر حسن ہوتا ہے۔ وہ بھی دلوں کو لبھاتا ہے۔ وہ بھی نظروں کو دعوتِ نظارہ دیتا ہے، اس میں بھی ایک خاص کشش ہوتی ہے، وہ بھی تعریف کئے جانے کے قابل ہوتا ہے۔ جب یہ درست ہے اور درحقیقت درست ہے تو پھر ایسے اشعار کو بُرے معنی پہنانے کس کا قصور ہے۔ آپ یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ ایک مرد نے ایک مرد کے حسن کی تعریف کر دی ہے اور بس۔

اب ایک آخری صورت اور باقی رہ گئی ہے، اور وہ یہ کہ اگر مرد جذباتِ عشق ظاہر کرے تو اس کو افعال وصفات مونث استعمال کرنے چاہئیں، اور اگر عورت ظاہر کرے تو اس کو افعال صفات مذکر البتہ یہ درست بھی ہے اور مناسب بھی، واقعی ایسا ہی ہونا چاہئے، مگر غزل میں نہیں بلکہ دیگر اصنافِ سخن مثنوی اور نظم وغیرہ میں۔ اس کی وجہ وجہ چہارم میں ملاحظہ ہو۔

چہارم۔ دنیا بھر جانتی ہے کہ متغزلین کی شاعری مجازی شاعری تک محدود نہیں ہوتی، ان کو حقیقی شاعری یعنی متصوفانہ شاعری بھی کرنی پڑتی ہے، اور معشوقِ حقیقی مذکر ہے، اس کو مونث نہیں بنایا جاسکتا اس لئے غزل میں افعال وصفات مذکر کا استعمال صرف بہتر ومناسب ہی نہیں بلکہ ضروری وناگزیر بھی ہے۔

(۲) غزل آج تک انھیں مضامین ومطالب کی حامل چلی آرہی ہے جو صدیوں پہلے ظاہر کئے جاچکے ہیں اس میں خیالاتِ نو کی مطلق گنجائش نہیں "یہ غزل دشمن اصحاب شاید واقف نہیں۔ اگر واقف ہیں تو بالیقین اس کھلی حقیقت کے اعتراف سے پہلو تہی کرتے ہیں کہ صنف غزل مخصوص ہے صرف معاملاتِ حسن وعشق کے اظہار کے لئے۔ یہ جذبات واحساسات تمام دوسرے جذبات واحساسات سے محبوب ومرغوب تر جذبات واحساسات ہیں۔ یہ کبھی پہلے چھپائے جاسکے ہیں، نہ آئندہ چھپائے جاسکیں گے، یہ ہمیشہ ظاہر کئے جاتے رہے ہیں اور ہمیشہ ظاہر کئے جاتے رہیں گے۔ یہ اس قدر قوی ہیں کہ کوئی مخالف ومزاحم قوت ان کے اظہار کو روک نہیں سکتی۔ جس طرح زندگی کے لئے چلنا پھرنا کھانا پینا اور سانس لینا ضروری ہے اسی طرح ان کا اظہار بھی ضروری ہے۔ یہ جذبات واحساسات محدود ہیں، غیر محدود نہیں، ان کی ہمیشہ تکرار ہوتی رہی ہے، اور ہمیشہ ہوتی رہے گی۔ آخر بیچارے غزل گو حضرات نئے جذبات واحساسات لائیں کہاں سے، اک بڑے سے بڑا متغزل بھی صرف اتنا ہی کرسکتا ہے کہ ان جذبات واحساسات کو اپنی قوت متخیلہ اور اپنے مخصوص پیرایۂ بیان سے مدد لے کر اک نئی، دل کش، انوکھی اور حسین تر صورت میں پیش کردے اور بس، اور اسی کا نام شاعری کمال شاعری ہے، بہ فرضِ محال اگر دشمنانِ غزل غزل کے مٹانے میں کامیاب بھی ہوجائیں، اور

غزل صنفِ شاعری سے محو بھی کر دی جائے تو بہرحال ان جذبات واحساسات کے اظہار کے لئے کوئی دوسری صنفِ شعر تلاش کرنی پڑے گی۔ جب ایسا ہے اور ضرور ایسا ہی ہے تو پھر غریب غزل ہی نے کیا قصور کیا ہے، جو آپ اس کو حلال کر ڈالنا چاہتے ہیں۔

اب رہا اس اعتراض کا دوسرا جزو کہ غزل میں خیالاتِ نو کی گنجائش نہیں، یہ بھی ایک بڑی حد تک غلط ہے۔ اگر کوئی غزل میں یہ گنجائش پیدا کرنا چاہے تو بالیقین پیدا کی جاسکتی ہے۔ اور بلند خیال اور وسیع النظر متغزلین یہ گنجائش پیدا بھی کرتے رہتے ہیں۔ مگر یہ گنجائش اسی حد تک پیدا کی جاسکتی ہے جس حد تک کہ غزل غزل باقی رہے لیکن دشمنانِ غزل تو غزل کا وجود ہی باقی رکھنا نہیں چاہتے اس سبب سے تو لفظ "گنجائش" لفظ مہمل ہو کے رہ جاتا ہے۔

(۳) "غزل کے معشوق کا دہن موہوم ہوتا ہے۔ قد سروِ شمشاد سے بھی دو ہاتھ اونچا ہوتا ہے گردن گردنِ صراحی سے بھی دو چار بالشت لمبی ہوتی ہے۔ اس کی آنکھیں گلہائے نرگس کا سا۔ اس کے بال سنبل کے مشابہ اور اس کی زبان برگِ سوسن کے مانند ہوتی ہے، یہ معشوق ایک ناممکنات کا پتلا ہوتا ہے، اگر اس کو کسی طرح مجسم کر دیا جائے تو آدمی ڈر ڈر کے بھاگنے لگیں"۔

دشمنانِ غزل کا یہ اعتراض بھی چنداں قابلِ اعتنا نہیں۔ اصلیت صرف اتنی ہے، کہ چھوٹا دہانہ (دہن) پتلی کمر، دراز قد اور لمبی گردن خوشنما معلوم ہوتے ہیں، اور اگر ایک حسین میں حسن کے ساتھ یہ صفات بھی پائی جائیں تو اس کا حسن زیادہ دلفریب اور زیادہ جاذبِ نظر ہو جاتا ہے۔ اب رہ گئے سرو شمشاد، نرگس، سنبل و سوسن۔ یہ محض تشبیہی الفاظ و اشیا ہیں، کون کہہ سکتا ہے کہ سرو شمشاد اپنے قد و قامت کے لحاظ سے خوش نما نہیں ہوتے۔ نرگس کے پھول میں چشمِ معشوق کی سی مستی نہیں پائی جاتی، سنبل کسی حسین کے بکھرے بالوں کی یاد نہیں دلاتی۔ برگِ سوسن کسی کی زبانِ حسین سے مشابہ نہیں ہوتی، مختصر یہ ہے کہ یہ سب تشبیہی الفاظ اور تشبیہی اشیا ہیں۔ ان کا استعمال غزل میں محض تشبیہاً کیا جاتا ہے نہ کہ بطورِ اصل و حقیقت۔ مگر دشمنانِ غزل ہیں کہ ان تشبیہات کا اک خوفناک مجسمہ بنا کر ہمارے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں تاکہ ہم غزل سے نفور ہو جائیں۔ اتنی بات ضرور ہے کہ بعض مبالغہ پسند

غزل گو اصحاب نے ان تشبیہات کا استعمال حد سے گذرے ہوئے مبالغہ کے ساتھ کیا ہے اور مخالفین غزل کو اسی سے غزل کے معشوق کی ایسی بھونڈی تصویر بنانے کا سامان .... ہاتھ آیا ہے۔ مگر یہ قصور ان مبالغہ پسند غزل گویوں کا ہے نہ کہ غزل کا۔

(۴) تغزل پست خیالی اور بوالہوسی سکھاتی، بلکہ پست خیال غزل گو یہ گندگی پھیلاتے ہیں، کیونکہ غزل گویوں میں اکثریت پست خیال شعرا کی ہے۔ مگر یہ غزل گویوں ہی پر کیا منحصر ہے، ہر صنف شعر میں پست خیال شعرا کی کثرت ہوا کرتی ہے، اور وہ اپنے پست خیالات اور شرمناک جذبات کی اشاعت سے ملک کی ادبی فضا کو گندہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ شعرا حقیقت میں شاعر نہیں ہوتے بلکہ متشاعر ہوتے ہیں۔ یہ ہر ملک، ہر قوم اور ہر دَور میں ہوتے ہیں۔ یہ پہلے بھی تھے، اور اب بھی موجود ہیں اگر یہ سچ ہے کہ ہر شے اور ہر کیفیت اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے تو شعرا کے ساتھ متشاعرین کا وجود بھی اسی طرح لازم و ضروری ہے جس طرح نور کے ساتھ ظلمت کا وجود۔ اگر متشاعر نہ ہوں تو حقیقی شاعر کی تمیز نا ممکن ہو جائے۔ متشاعرین کی شاعری ہمیشہ نظر انداز کی جاتی رہی ہے، اور اسی کو اب بھی نظر انداز کر دینا چاہیئے۔ یہ خود کبھی باقی رہے ہیں نہ ان کی شاعری باقی رہی ہے، نہ یہ آئندہ باقی رہیں گے، نہ ان کی شاعری باقی رہے گی۔

متشاعرین کے برخلاف حقیقی شعرا ہر زمانے میں کم ہوتے ہیں، اور بہت کم ہوتے ہیں۔ یہ پہلے بھی کم ہوتے تھے اور اب بھی کم ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ پیغمبروں کی طرح عند الضرورت کبھی کبھی مبعوث ہوا کرتے ہیں، نہ یہ خود پست ہوتے ہیں اور نہ ان کی شاعری پست ہوتی ہے، یہ بلند فطرت، بلند خیال اور بلند نظر ہوتے ہیں۔ یہ جب آتے ہیں تو اپنی قوم، اپنے ملک اور اپنے شعر و ادب کے لئے حیاتِ نو کا پیغام لے کر آتے ہیں۔ اور جب جاتے ہیں تو ان سب کو بقائے دوام عطا کر جاتے ہیں، ایسے بلند فطرت شعرا کو پست خیالی اور بوالہوسی کی اشاعت کا ذمہ دار قرار دینا چاند سورج کو تاریکی و ظلمت کا ذمہ دار ٹھہرانے سے ہرگز کم نہیں۔

زمانۂ حال کے بلند فطرت اور بلند خیال شعرا کی فہرست حسبِ ذیل ہے۔ جناب بیخود دہلوی

حضرت جگر مراد آبادی۔ مولانا وحشی شاہجہاں پوری، مولانا حسرت موہانی۔ جناب آرزو [illegible]ی
جناب صفی لکھنوی۔ جناب فانی بدایونی۔ جناب جوش ملیح آبادی۔ جناب نجم آفندی اکبرآبادی۔
جناب سیماب اکبرآبادی۔ جناب امجد حیدرآبادی۔ جناب ضامن کنتوری۔ جناب چکبست مرحوم۔
علامہ کیفی دہلوی۔ جناب پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی۔ جناب مولانا ظفر علی خاں صاحب۔ علامہ سر
اقبال۔ جناب سالک مدیر انقلاب لاہور (اگر کسی ضروری صاحب کمال کا نام بوجہ لاعلمی [illegible]
اندراج سے رہ گیا ہو تو خواستگار معافی ہوں)

ان میں بعض صرف غزل گو حضرات ہیں اور بعض ناظم (نظم کہنے والے) اور بعض ایسے جامع
کمال ہیں کہ وہ غزل گو بھی ہیں اور ناظم بھی، اور بعض ایسے وسیع النظر اور رفیع الخیال افراد ہیں جن کی شاعری
غزلیاتی یا منظوماتی شاعری کے دائرے کو توڑ کر حکیمانہ [illegible] شاعری کی حدود میں داخل ہو چکی
ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان غیر معمولی شاعرانہ دل و دماغ رکھنے والی صاحب کمال ہستیوں میں سے
علامہ سر اقبال، حضرت جوش ملیح آبادی، حضرت فانی بدایونی، مولانا ظفر علی خاں صاحب اور علامہ
سیماب اکبرآبادی کے اسمائے گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

اگر آپ مندرجہ بالا فہرست پر تھوڑا سا بھی غور کریں گے تو اس پر آپ کو اکثریت غزل گویان
ہی کی نظر آئے گی۔ للہ ہم کو بتایا جائے کہ ان صاحب کمال ہستیوں میں سے خواہ وہ متغزل
ہوں یا غیر متغزل کس کی شاعری پر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ پراگندہ و پست خیالی سکھانے والی
ہے۔ اب اگر آپ ان کو چھوڑ کر یا ان میں شامل کر کے کہ [illegible] چھوٹے یا تیسرے درجے وغیرہ جیسے وقیع
شعرا کے نام پیش کرنے کی جرأت کریں گے تو پھر آپ کو جواب ملا تو "خموشی" سننے کو تیار
رہنا چاہئے۔ بہرحال غزل کی بلندی و پستی بھی اور اصناف سخن کی طرح کہنے والے پر موقوف ہے
اگر کہنے والا پست خیال ہے تو وہ ضرور پست ہوگی اور بلند خیال ہے تو وہ بالیقین بلند ہوگی
یہ اگر سچ ہے اور درحقیقت سچ ہے تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پست خیالی و بوالہوسی کی اشاعت
کے ذمہ دار ہیں تو وہ ہمارے ملک کے متشاعر ہیں، یا پھر وہ مدیران رسائل و جرائد جو اپنی سنہری

رو پہلی مصلحتوں کی بنا، پر ان متشاعرین کا کلام شائع کرتے رہتے ہیں۔

(۵)"غزل کا ہر شعر جداگانہ خیال اور جذبے کا حامل ہوتا ہے، اس کے اشعار میں کوئی ربط، ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا۔ وہ بالکل ایک چوں چوں کا مربہ ہوتی ہے۔ خود ہی انسان کو انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے، یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک واحد دماغ میں بہ یک وقت اس قدر مختلف اور متضاد خیالات پیدا ہو سکیں"۔ اس اعتراض کے تین جزو ہیں۔ پہلا جزو یہ ہے کہ غزل کا ہر شعر جداگانہ خیال یا جذبے کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے اشعار میں کوئی ربط و ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا"۔ یہ بالکل درست ہے کہ عموماً غزل کا ہر شعر جداگانہ خیال کا حامل ہوتا۔ مگر یہ بالکل غلط ہے کہ اس میں کوئی ربط و ہم آہنگی یا تسلسل نہیں ہوتا۔ مسلسل غزلوں کی حد تک تو جو فارسی میں زیادہ اور اردو میں نسبتاً کم پائی جاتی ہیں، شاید غزل دشمن حضرات بھی ربط و ہم آہنگی اور تسلسل کے قائل ہوں، رہ گئیں غیر مسلسل غزلیں۔ اگر غائر نظر سے دیکھا جائے اور ہٹ دھرمی سے کام نہ لیا جائے تو وہ بھی ربط و ہم آہنگی یا تسلسل سے معرا نہیں ہوتیں، کیونکہ غزل کا ہر شعر بجائے خود ایک مختصر نظم ہوتا ہے، اور ایسی نظم ہوتا ہے کہ اگر وہ مناسب الفاظ میں پوری قوت سے ادا ہو جائے تو ہزار طول و طویل نظمیں مل کر بھی اس ایک شعر کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ آخر نظم گو حضرات ہی کیا تیر مارتے ہیں۔ یہی نا کہ ایک مفرد خیال کو دس پندرہ یا بیس پچیس اشعار میں پھیلا کر ایک کافی حد تک شرح و بسط سے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر غزل گو شخص اسی پھیلے ہوئے خیال کو سمیٹ کر اور اپنے مخصوص متغزلانہ اشاروں، کنایوں، اور تلمیحات سے کام لے کر صرف ایک شعر میں ادا کر دیتا ہے جس کا ہر اشارہ یا کنایہ ہزار داستان در آغوش ہوتا ہے۔ اب اگر کوئی پھر اس سمٹے ہوئے خیال کو دس بیس اشعار میں پھیلا کر نظم کے قالب میں ڈھالے گا (جیسا کہ اکثر آج کل کے نظم گو حضرات کرتے رہتے ہیں) تو یقیناً طاقت تقسیم ہو جائے گی اور جس حد تک طاقت تقسیم ہو جائے گی اسی حد تک اس کا مرتبۂ شعریت بھی پست ہو جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ آج کل زیادہ سے زیادہ بیس پچیس برس سے) نظم کا لفظ بہ اتباع مغرب جس معنی میں مستعمل ہو رہا ہے اس معنی میں ہمارے ہاں نظم کا وجود نہ تھا، مگر یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہماری شاعری میں سرے سے نظم کا وجود ہی نہ تھا۔ تھا اور ضرور تھا۔ مگر دوسری صورتوں میں اور ان صورتوں کو نظم کے نام سے موسوم

نہیں کیا جاتا تھا، فارسی زبان میں زیادہ اور اُردو زبان میں کم اکثر مسلسل غزلیں پائی جاتی ہیں، اور مسلسل غزلیں بھی نظم ہی کی صنف میں داخل ہیں، اگرچہ غیر مسلسل غزلیات کا ہر شعر جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے۔ بجائے خود ایک مختصر و مکمل نظم ہوتا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کے اشعار میں اوّل سے لے کر آخر تک یعنی از مطلع تا مقطع بالاکثر تسلسل نہیں پایا جاتا، اور پایا بھی نہ جانا چاہیئے۔ کیوں کہ صنفِ غزل مسلسل اور طول طویل خیالات ادا کرنے کے لئے ایجاد ہی نہیں کی گئی۔ وہ وضع کی گئی ہے صرف مفرد یا مرکب خیالات کے ادا کرنے کے لئے بے حد ایجاز و اختصار کے ساتھ مسلسل اور طول طویل خیالات ادا کرنے کے لئے ہماری شاعری میں دوسری ایک درجن کے قریب اصناف موجود ہیں جن کی فہرست حسبِ ذیل ہے۔

رباعی، قطعہ، مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مثمن، ترکیب بند، ترجیع بند، مستزاد، مثنوی۔

ان میں سے رباعی غزل کے بعد دوسری دلچسپ و کارآمد صنف ہے جو غزل ہی کی طرح ایجاز و اختصار کے لئے وضع کی گئی ہے۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ رباعی میں متغزلانہ افکار و اندازِ بیان کی کوئی قید نہیں، اور اس میں غزل کے برخلاف ایک شعر کی جگہ دو شعروں میں اپنے خیالات کو تسلسل کے ساتھ نظم کرنے کی آزادی بھی حاصل ہے، غزل اور رباعی کے بعد تیسری صنف قطعہ ہے۔ یہ صنف ایجاز و اختصار اور شرح و بسط دونوں کو مشترک ہے۔ کیونکہ قطعہ رباعی کی طرح کم سے کم دو شعر تک محدود ہے اور زیادہ کے لئے اگر قافیہ تنگی نہ کرے تو اشعار کی کوئی تعداد مقرر نہیں، یعنی یہ صنف رباعی کی طرح ایجاز و اختصار کے کام بھی آسکتی ہے اور نظم کی طرح تسلسل اور شرح و بسط کے بھی۔ ان تینوں صنفوں کے علاوہ باقی جس قدر صنف ہیں وہ سب کی سب مسلسل خیالات ربط و ہم آہنگی کے ساتھ ادا کرنے کے لئے ایجاد کی گئی ہیں۔ ان میں سے خصوصاً مثنوی تو ہماری شاعری میں وہ ہمہ گیر و کارآمد صنف ہے جس میں ہر قسم کے بڑے سے بڑے اور طویل سے طویل خیالات بلکہ افسانوں، داستانوں اور تاریخوں تک کو نظم کا جامہ پہنایا جاسکتا ہے۔ اور ایسی سب اصنافِ سخن جن میں طویل یا حقیر خیالات و واقعات تسلسل کے ساتھ

منظوم کئے جاتے ہیں یا کیسے جا سکتے یقیناً نظم ہی کہلانے کی مستحق ہیں۔ اس بحث سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم نے مذکورہ بالا تمام اصناف سخن میں سے اگر کوئی صنف اپنے خیالات کو پورے ایجاز و اختصار کے ساتھ بیان کرنے کے لئے وضع کی ہے تو وہ صرف ایک غزل ہے۔ اگرچہ رباعی اور قطعہ سے بھی ایک حد تک یہ کام لیا جا سکتا ہے مگر ان کا درجہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ ماحصل یہ ہے کہ جب اتنی اصناف ہماری شاعری میں مسلسل اور طویل طویل خیالات ادا کرنے کے لئے موجود ہیں اور ہم نے ان میں سے صرف ایک غزل کو ایجاز و اختصار کے لئے چن لیا ہے جو اس کے لئے ہر طرح موزوں اور مناسب بھی ہے اور حالت یہ ہے کہ اس ضروری صنف کا کوئی اچھا بدل بھی پیش نہیں کیا جاتا تو پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ غزل کو مٹا دینے کے درپے ہونا کہاں کی عقل مندی اور کون سی دانائی اور مصلحت پر مبنی ہے۔

ہم مانتے ہیں کہ کسی خیال کو شرح و بسط کے ساتھ مسلسل ادا کرنے میں جزئیات کا احاطہ کرنا پڑتا ہے۔ اور جزئیات کا احاطہ کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ایجاز و اختصار کا مرتبہ بھی بلند ہے۔ اور پھر ایک ایجاز و اختصار بھی ایسا ایجاز و اختصار جو جامع و مانع بھی ہو اور ماقل و دل بھی ہو۔ اسی قسم کے ایجاز و اختصار کا غزل کے سوا کسی دوسری صنف شعر میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے غزل کا مٹا ڈالنا اپنی شاعری کی ایک سب سے دلچسپ اور ضروری صنف ایجاز و اختصار کا مٹا ڈالنا ہے جس کا بدل ملنا مشکل ہے۔

اس اعتراض کا دوسرا جزو یہ ہے کہ "چونکہ غزل کے اشعار میں باہم کوئی تسلسل یا ربط و ہم آہنگی نہیں ہوتی لہذا وہ بالکل اک چوں چوں کا مربہ ہوتی ہے، جو ذہن انسانی کو انتشار میں مبتلا کر دیتی ہے"۔ ماتم کرنے کی جگہ ہے کہ مغرب زدگی نے مخالفین غزل کے ذوقِ صحیح اور وجدانِ سلیم کو اس درجہ مسخ و مفلوج کر دیا ہے کہ طعام و لباس سے لے کر شعر و ادب تک ہر وہ چیز جو ایشیا کی خصوصیات کی حامل ہے خواہ وہ ہماری تہذیب اور ہمارے مذاق کے نقطہ نظر سے کتنی ہی صحیح، دلچسپ اور مفید و اہم کیوں نہ ہو مگر مغربی ذوق اس پر مہر تصدیق ثبت نہیں کرتا وہ ان دشمنان وطن کے نزدیک صفحہ ہستی سے بالکل

مٹا ڈالنے کے قابل ہے۔ خدا جانے یہ حضرات غزل کو جو ایک خالص ایشیائی چیز ہے مغربی عینک لگا کر کیوں دیکھتے ہیں۔ آخر اس نظر سے کیوں نہیں دیکھتے کہ وہ ایک مجموعہ ہوتی ہے۔ چند مختلف المضامین قطعوں کا جو ایک ہی بحر اور ایک ہی ردیف وقافیہ میں لکھی جاتی ہے، اور جس کا ہر شعر بجائے خود ایک مختصر اور مکمل نظم ہوتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر یہی حضرات اپنی آنکھوں سے مغربی عینک اتار کر غزل کو ہماری بتائی نظر سے جو ہماری فطری اور حقیقی نظر ہے دیکھنے کی تکلیف گوارہ فرمائیں گے تو پھر غزل ان کو نہ تو چوں چوں کا مربہ دکھائی دے گی اور نہ کسی قسم کے ذہنی انتشار میں مبتلا کرے گی۔ بلکہ اس کے برخلاف غزل میں وہ عجیب عجیب خصوصیات اور ایسی ایسی ناقابل انکار خوبیاں نظر آئیں گی جو مغربی شاعری میں ہزاروں قسم کی جدید العصر ذہنی ترقیات کے باوجود آج تک بھی مفقود و معدوم ہیں۔

اس اعتراض کا تیسرا جز یہ ہے کہ یہ کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے کہ ایک واحد دماغ میں بیک وقت اسقدر مختلف اور متضاد خیالات سما سکیں"۔ اس کے دو جواب ہو سکتے ہیں جنھیں درج ذیل کیا جاتا ہے۔

اول تو یہی غلط ہے کہ "ایک دماغ میں بہ یک وقت دو یا دو سے زیادہ متضاد یا غیر متضاد خیال پیدا ہونے ناممکن ہیں؛ خاص خاص حالتوں میں اکثر مشاہدے میں آیا ہوگا کہ انسان وقتِ واحد میں رو بھی رہا ہے اور ہنس بھی رہا ہے، مغموم بھی ہے اور اپنے غم پر خوش وقانع بھی، شکوؤں سے معمور بھی ہے اور شکر سے تر زبان بھی، مضطرب بھی ہے اور سکونِ خاطر سے لذت یاب بھی، پریشان بھی ہے اور یہی پریشانی کا مدح خواں بھی، مانوس بھی ہے اور مایوس بھی، بیدل بھی ہے اور ساعی بھی۔ ایسے واقعات کی سینکڑوں مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مگر ہم یہاں صرف دو مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ اکثر دیکھا ہوگا۔ کہ جب بچھڑے ہوئے دو عزیز یا دو دلی دوست یا عاشق ومعشوق مدت کے بعد ملتے ہیں تو بے اختیار باہم لپٹ جاتے ہیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں اور جب تک دلوں کی بھڑاس اچھی طرح نہیں نکل جاتی ان کے لپٹ لپٹ کے رونے رلانے کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس وقت ان کے دلوں میں خوشی وغم کے دوگونہ جذبات وخیالات موجزن نہیں ہوتے اور یہی خوشی وغم کی وہ ملی جلی کیفیت ہے جو عام طور سے "گریہ مسرت" کے دلچسپ اور معنی خیز نام سے مشہور ہے۔ یہ مثال تو

کسی انسانی دل و دماغ میں بہ یک وقت صرف دو متضاد یا غیر متضاد خیالات و جذبات سما سکنے کی مثال تھی اب ہم ایک ایسا شعر پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے ایک انسانی دل و دماغ پر بہ یک وقت چار یا چار سے زیادہ مخالف و متضاد خیالات و جذبات کے مستولی ہونے کا ثبوت بہم پہنچتا ہے۔ یہ شعر ہمارا ہی ہے۔ خدا کے لئے اس کو یہ سمجھ کر یا کہہ کر رد نہ کر دیجئے کہ چونکہ یہ تیرا لکھا ہوا ہے اس لئے نا قابلِ قبول ہے۔

بیدل بھی ہوں، شاداں بھی، شاکی بھی ہوں، نازاں بھی

جو داغ دیا ہوگا، دلچسپ دیا ہوگا

عاشق معشوق سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ میں تمہارے سلوکوں سے بیدل (مایوس و غمگین) بھی ہوں اور شاداں (پُر امید و مسرور) بھی۔ شاکی (شکایت مند اور فریادی) بھی ہوں اور نازاں (مفتخر، شکرگذار اور احسان مند) بھی۔ کیونکہ تم نے مجھے آج تک جتنے داغ بھی دئیے ہیں سب دلچسپ دئیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ سب داغ تکلیف دہ ہوتے ہیں اور ان سے اذیت پا کے مایوس و غمگین اور شاکی، فریادی ہونا قدرتی بات ہے۔ مگر چونکہ معشوق نے یہ داغ دورانِ محبت میں دئیے ہیں اور دورانِ محبت میں معشوق کے ہاتھوں پہنچی ہوئی تکلیف بھی راحت سے زیادہ قابلِ قدر ہوتی ہے، پھر دلچسپ تکلیف تو اور زیادہ قابلِ قدر ہونی چاہئے۔ اس لئے عاشق خوش بھی ہے اور پُر امید بھی، اور نازاں بھی ہے اور شکرگذار و احسان مند بھی۔ اس حالت میں وہ جن متضاد یا غیر متضاد خیالات و جذبات سے متاثر نظر آ رہا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں۔ (۱) خوشی و غم (۲) امید و بیم (۳) تکلیف و راحت (۴) شکر و شکایت (۵) مدح و ذم۔ (۶) بے صبری اور صبر و رضا (۷) احسان مندی و نا احسان مندی وغیرہ۔ ایسی صریح مثالوں کی موجودگی میں کوئی احمق سے احمق بھی یہ کہنے کی جراءت نہیں کر سکتا کہ کسی انسانی دل و دماغ میں بیک وقت دو یا دو سے متضاد یا غیر متضاد خیالات و جذبات نہیں سما سکتے۔ اگر نہیں سما سکتے تو فرمائیے اتنے جذبات و خیالات کا حامل شعر بہ یک وقت کیونکر موزوں ہو گیا۔

دوئم یہ کہ غزل صرف ایک سانس یا آنِ واحد میں تو لکھ نہیں دی جاتی، اس کے کہنے اور لکھنے کے لئے بھی کچھ مدت درکار ہوتی ہے اور بعض اوقات تو یہ مدت دس دس دن اور پندرہ پندرہ دن

تک طویل ہو جاتی ہے۔ جب ایسا ہے اور فی الواقع ایسا ہی ہے تو اس سے بالبداہت ثابت ہوتا ہے کہ غزل کے مختلف و متضاد مضامین نہ بیک وقت دماغ میں آتے ہیں اور نہ بیک وقت نظم کئے جاتے ہیں۔ بلکہ یکے بعد دیگرے دماغ میں آتے ہیں اور یکے بعد دیگرے نظم کئے جاتے ہیں۔ مثلاً ایک غزل سات شعر کی ہے، اور اس کی تیاری پر ایک گھنٹہ اور دس منٹ خرچ ہوئے ہیں، یعنی ہر شعر بالاوسط دس منٹ میں کہا اور لکھا گیا ہے یعنی پہلے دس منٹ میں اور دوسرے دس منٹ میں دوسرے متضاد یا غیر متضاد مضمون کا دوسرا شعر، اور اسی طرح تیسرا اور چوتھا اور باقی بھی علیٰ ہذا القیاس۔ مطلب یہ نکلا کہ یہ ساتوں شعر بیک وقت موزوں نہیں کر دئے گئے بلکہ یکے بعد دیگرے موزوں کئے گئے ہیں، جن کے موزوں کرنے پر جدا جدا دس دس منٹ کا وقت صرف کیا گیا ہے۔ اور حالت یہ ہے کہ انسانی خیال مطلق بے لگام و بے مہار ہوتا ہے اور ایک ایک لمحے میں ہزار ہزار موافق و مخالف راہیں اختیار کرتا رہتا ہے، انتشار یا بے لگامی، اور بے مہاری اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اگر اس کو بہ جبر و کوشش روکا نہ جائے تو وہ ایک ثانئے کے لئے بھی ایک مرکز یا ایک نقطے پر قایم نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام اور جوگیوں وغیرہ کو سالہا سال تک اپنے خیال کو ایک مرکز یا نقطے پر مرکوز رکھنے کی کوشش و مشق کرنی پڑتی ہے۔ جب انسانی خیال کی یہ حالت ہے کہ ایک ثانئے کے لئے بھی کسی ایک مرکز پر قایم نہیں رہتا تو دس دس منٹ کا فصل زمانی ہے مخالف یا موافق جذبات و خیالات کو موزوں کرنا کیونکر نا ممکن قرار دیا جا سکتا ہے۔

بہر حال جب نہ تو یہ صحیح ہے کہ انسانی دل و دماغ بہ یک وقت دو یا دو سے زیادہ مخالف یا موافق جذبات و خیالات سے متاثر نہیں ہو سکتے۔ اور نہ یہ درست کہ "غزل کے تمام اشعار آنِ واحد میں نظم کر دئے جاتے ہیں" تو پھر ان فریب دہ اور لاطائل دلائل کی بنا پر غزل کی جان کا لاگو ہو جانا محض مغرب زدگی کی پیدا کردہ دیوانگی نہیں تو اور کیا ہے۔

(۶) "تمام اصنافِ سخن میں تو مطالب و معانی کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں، مگر غزل میں اس کے برخلاف الفاظ کے لئے مطالب و معانی کی جستجو کی جاتی ہے۔" یہ اعتراض مخالفین غزل کی افواج قاہرہ کے سپہ سالار اعظم شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کے غزل کش دماغ کی پیدا وار

ہے۔ مگر اس اعتراض میں بھی کوئی جان نہیں، بلکہ یہ دوسرے اعتراضوں سے بھی زیادہ کمزور اور بودا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ کلام خواہ نظم ہو یا نثر۔ دو اجزا سے مرکب ہوتا ہے (۱) الفاظ (۲) معانی۔ ہر ادیب کو خواہ وہ ناظم ہو یا ناثر کبھی معانی کے لئے الفاظ تلاش کرنے پڑتے ہیں۔ اور کبھی الفاظ کے لئے معانی۔ یہ دونوں صورتیں لازم و ملزوم اور فطری ہیں اور ان میں باہم کوئی تضاد نہیں۔ کیا دوران تصنیف و تالیف میں کبھی کبھی، کبھی کبھی نہیں بلکہ اکثر ایسے مواقع پیش نہیں آتے کہ استعارے تشبیہ یا مخصوص تراکیب اور الفاظ کی مختلف اقسام نشست اور دروبست سے ان کو نئے نئے معانی پہنانے پڑتے ہوں۔ ایسے معانی جو روزمرہ کی بول چال اور ان کے لغوی معنی سے بالکل جدا ہوں جس کے بغیر کلام میں جدت، تازگی، تاثیر پیدا ہو ہی نہیں سکتی، زیادہ طول دینے کی ضرورت نہیں۔ یہاں چند مثالیں درج کر دینی کافی ہوں گی۔

پہلی مثال "گل" "بانگ"۔ یہ دو معمولی لفظ ہیں۔ پہلے لفظ کے معنی پھول ہیں، اور دوسرے کے معنی آواز۔ علیحدہ علیحدہ یہ دونوں لفظ بجز اس کے کہ اپنے لغوی معنی دبر کسی قسم کی گہرائی یا تاثیر اپنے اندر نہیں رکھتے مگر جب انھیں دونوں لفظوں کو ملاکر "گلبانگ" بنا دیا جاتا ہے تو کیا یا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہی دونوں لفظ معمولی ترکیب پانے سے پہلے کیا تھے اور ترکیب پاکر کیا بن گئے۔ پہلے ان دونوں لفظوں کے معنی کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔ ترکیب پانے کے بعد جو رنگینی، دلکشی اور طاقت لفظ گلبانگ میں پیدا ہو گئی ہے۔ کیا اس کی تشریح ممکن ہے؟

دوسری مثال "سمند" اور "ناز" بھی دو معمولی لفظ ہیں۔ پہلے لفظ کے معنی "گھوڑا" اور دوسرے کے معنی "ناز" یعنی اک خاص قسم کی "اداے معشوقانہ"۔ ان میں بھی علیحدہ علیحدہ کوئی جاذبیت اور معنویت نہیں اور نہ لفظاً و معناً کوئی ربط ہے۔ بلکہ ایک شدید قسم کا تنافر پایا جاتا ہے۔ مگر جب یہی دونوں لفظ اس شدید بے ربطی و تنافر کے باوجود ترکیب اضافی سے ملاکر "سمند ناز" میں تبدیل کر دیتے ہیں تو کس بے پناہ طاقت کے حامل ہو جاتے ہیں کس قدر لطیف۔ دلکش اور ناقابل اظہار معنی پیدا کر دیتے ہیں، اور اپنے مفہوم کو مل کر کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔

تیسری مثال۔ یہ ایک مثال چند در چند مثالوں کا مجموعہ ہے۔ ذیل کے دو اشعار ملاحظہ کیجئے

کی مرے قتل کے بعد اُس نے جفا سے توبہ

ہائے اُس "زود پشیماں" کا پشیماں ہونا

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے

پسینہ پوچھئے اپنی جبیں سے

مندرجہ بالا اشعار کی جدت، تازگی، دلفریب انداز بیان اور رفعت خیالی کو چھوڑیئے کہ یہ ایسی ظاہر و باہر چیزیں ہیں جن کو ایک اندھا بھی دیکھ سکتا ہے۔ صرف "زود پشیماں" کی دلنواز ترکیب، اور "نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے" کی عجیب و غریب اور معجزانہ اسالیب بیان پر غور فرمائیے۔ کہا تو گیا ہے "زود پشیماں" مگر معنی پیدا کر دیئے گئے ہیں "دیر پشیماں" کے اور پھر کس قدر "دیر پشیماں" کہ قتل کرنے کے بعد جفا سے توبہ کی جا رہی ہے۔ ظاہر تو کیا جا رہا ہے کہ "نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے" لیکن مقصد یہ ہے کہ "ہم سمجھ گئے کہ تم کہیں سے آ رہے ہو" اور پھر یہی نہیں کہ سمجھ گئے کہ تم کہیں سے آ رہے ہو، بلکہ یہ بھی سمجھ گئے کہ کہاں سے آ رہے ہو" اور مزید براں یہ بھی کہ "کیا کر کے آ رہے ہو" آپ نے دیکھا کہ اس مصرعے کے چند سیدھے سادے الفاظ کن کن عجیب و غریب بلیغ مطالب و معانی کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں، اور پھر رہنمائی بھی کتنی کامیاب رہنمائی۔ اب اس شعر کا دوسرا مصرعہ لیجئے "پسینہ پوچھئے اپنی جبیں سے"۔ اک غزل کے انداز بیان سے ناواقف شخص تو یہ کہدے گا کہ "یہ مصرعہ بالکل مہمل ہے۔ نہ اس کو پہلے مصرعہ سے کوئی ربط اور نہ یہ خود کسی مطلب و معنی کا حامل۔ مگر ایک ادادانِ غزل اسے سن کر پھڑک اُٹھے گا اور بے ساختہ پھڑک اٹھے گا، اور شورِ "احسنت و مرحبا" سے آسمان سر پر اٹھا لے گا۔ وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ "شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں"۔ اب غور فرمائیے کہاں تو "پسینہ پوچھئے اپنی جبیں سے"۔ اور کہاں "شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں" کن معمولی الفاظ کو کن دلچسپ اور عجیب و غریب معنی کا حامل بنا دیا گیا ہے۔ یہ غزل کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔ ہم اس قسم کی اور سینکڑوں مثالیں پیش کر سکتے تھے۔ مگر ہمارا خیال ہے کہ سمجھنے والے کے لئے اتنی مثالیں کافی ہو سکتی ہیں۔ اور جو نہ سمجھنا چاہے اس کے لئے لاکھوں مثالیں بھی بیکار محض ہیں

آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ کہ مذکورہ بالا مثالوں میں انھیں روزمرہ کے معمولی الفاظ کو جنھیں ہم ہمیشہ استعمال کرتے رہتے ہیں اور جن کی نسبت ہم کو کبھی شبہ بھی نہ گذرا تھا کہ ان کے کچھ اور معنی بھی ہو سکتے ہیں، کیسے کیسے نئے دلکش اور ماورائے فہم و قیاس مطالب و معانی کا جامہ پہنا دیا گیا ہے جن کا لغوی معنی سے کوئی تعلق نہیں اور یہ جامہ پہنا کر ان کو ایسی غیر محدود طاقت کا مالک بنا دیا گیا ہے جس کا احاطہ کرنا بھی دشوار ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انھیں روزمرہ کے معمولی الفاظ کو جن میں اس سے پہلے کوئی جان نہ تھی۔ یہ ناقابلِ قیاس طاقت کس نے بخش دی اس کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ محض شاعر کی اس طاقتِ خلاقی نے جو اس [illegible]

[illegible] پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ بہرحال وہ ادیب و شاعر جو معانی کو صرف الفاظ کا جامہ پہنانا تو جانتا ہے، مگر الفاظ کے لئے نئے نئے مفہوم اور نئے نئے معانی پیدا کرنے سے عاجز و قاصر ہے، ہرگز ادیب و شاعر کہلانے کا مستحق نہیں، کیونکہ گو معانی کو الفاظ کا جامہ پہنانا بھی فکر و کاوش کا محتاج ہے، مگر پھر بھی آسان کام ہے لیکن الفاظ میں نئے نئے مفہوم و معانی پیدا کرنا سخت دشوار ہے اور ہر ادیب و شاعر کے بس کا روگ نہیں۔

غزل پر مذکورہ بالا اعتراضات کے علاوہ بعض اور اعتراضات کئے گئے ہیں، مگر وہ اسقدر غیر اہم ہیں کہ ان کے باضابطہ جواب دینے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ان میں سے چند کے مختصر جوابات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

پہلا اعتراض۔ "غزل کا وجود فارسی اور اردو کے سوا اور کسی زبان میں نہیں پایا جاتا، یہ کھلا ثبوت ہے اس امر کا کہ غزل ایک بیکار چیز ہے۔" اول تو یہی غلط ہے کہ غزل کا وجود دنیا کی اور زبانوں میں نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ کسی زبان کی شاعری کا جذبات حسن و عشق سے خالی رہنا ناممکن ہے۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری مروجہ غزل کی صورت میں نہیں پایا جاتا، دوسری صورتوں میں پایا جاتا ہے مگر ان جذبات کا اظہار جس صورت میں بھی پایا جائے ہم اسکو اپنی زبان میں "غزل" کے سوا اور کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ دوسرے اگر دنیا کی دوسری زبانوں میں غزل جیسی کارآمد اور دلچسپ صنف کا وجود نہیں پایا جاتا تو اس کو ان زبانوں کی بدقسمتی سمجھئے۔

دوسرا اعتراض۔ "غزل میں ایک ایک عاشق کے ہزار ہزار رقیب ہوتے ہیں، جن سے

رات دن جوتی بیزار ہوتی رہتی ہے۔"

جواب۔ اوّل تو بات یہ ہے کہ انتہائے عشق میں عاشق کے احساسات بہت نازک ہو جاتے ہیں، وہ انسان تو انساں ہَوا، گھٹا، دریا، پہاڑ، چاند، سورج، باغ، صحرا، طوطا، مینا، آئینہ، کنگھی وغیرہ جس جس چیز کی طرف معشوق کی نگاہِ التفات جاتی ہے، ان سب کو اپنا رقیب سمجھنے لگتا ہے۔ یہ دلیل ہے کمال محبت کی، اور کمال محبت کمالِ عشق مانا گیا ہے، جو مذہبِ عشق کی رُو سے اجرِ عظیم کا مستحق ہے، دوسرے ایک حسین پر بہت سے انسانوں کا فریفتہ ہو جانا بھی تو کوئی عجیب و نادر واقعہ نہیں بلکہ یہ تو بالکل اک کھلا ثبوت ہے معشوق کی فراوانیٔ حسن کا، اور یہی شاعر کا منشاء ہوتا ہے۔ اب رہا جوتی پیزار کا معاملہ، سو اگر آپ کو شاعر بہ حیثیت عاشق اپنے رقیبوں سے لفظی اظہارِ بیزاری یا زبانی ہاتھا پائی، سچ مچ کی جوتی پیزار نظر آنے لگے تو اس میں بے چارے شاعر کا کیا قصور، بہتر ہو کہ آپ اپنی آنکھوں کا علاج کرائیں۔

تیسرا اعتراض: "غزل کے مضامین میں یک رنگی و توافق نہیں ہوتا۔ یعنی ایک شعر میں جس شے کو سراہ کر عزیز بنایا جاتا ہے اُسی کو دوسرے شعر میں مذمت کر کے گرا دیا جاتا ہے۔"

جواب۔ شاعر کوئی فلسفی یا مورخ نہیں ہوتا کہ اس کے کلام میں یک رنگی و توافق کا نہ پایا جانا عیب میں داخل سمجھا جائے۔ وہ صرف شاعر ہوتا ہے۔ اور شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ کسی شے کو دیکھ کر جن مخالف و موافق جذبات سے متاثر ہو ان کو شعر کا جامہ پہنا دے۔ اگر اس نے ایک شعر میں ایک چیز کو سراہا ہے اور دوسرے شعر میں اس کی مذمت کی ہے، اور ان دونوں شعروں میں کافی شاعرانہ دلکشی پائی جاتی ہے تو یہ اس کے کمال فن کی دلیل ہے نہ کہ نقصِ کمال کی تفصیل کے لئے دیکھو مقدمہ شعر و شاعری مصنفہ علامہ حالی علیہ الرحمہ۔

چوتھا اعتراض: "غزل گو، غزل میں خاص اپنے اصلی جذبات ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوتا بلکہ اس کو یا تو یہ جذبات اپنے اوپر بہ جبر طاری کرنے پڑتے یا پھر اسے اس پر مجبور ہونا پڑتا ہے کہ وہ دوسروں کے جذبات کو حوالۂ قلم کرے۔"

جواب اوّل تو یہ غلط ہے کہ غزل گو، غزل میں اپنے جذبات ظاہر کرنے پر قادر نہیں ہوتا، اگر وہ فی الواقع قادر نہیں ہوتا تو پھر وہ شاعر نہیں بلکہ متشاعر ہے، کیونکہ شاعری میں اپنے خیالات وجذبات کو جامۂ شعر پہنانا اس سے آسان کام ہے اور چونکہ یہ آسان کام ہے اس لئے ہر غزل گو شاعر غزل میں بالاکثر اپنے ہی خیالات وجذبات کو شعر کے سانچے میں ڈھالتا ہے اور وہ زیادہ تر ایسے ہی قافیوں کا انتخاب کرتا ہے جو اس کو اس کام میں مدد دے سکیں اور یہی وجہ ہے کہ ہر متغزل کے کلام میں بعض خیالات وجذبات کی بہتات ہوتی ہے، اور بعض کم، بعض بہت کم یا کالعدم ہوتے ہیں۔ اور اسی کمی بیشی سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ایک شاعر کے رجحانات طبیعت اپنی زندگی میں کیا تھے، اور اس کو کن خیالات وجذبات یا کن معاملات سے زیادہ سابقہ پڑا تھا، اور کن سے کم۔ دوسرے شاعر کو تو ترجمانِ عالم کہا گیا ہے، اور بجا طور پر کہا گیا ہے اس کے لئے اپنے خیالات وجذبات ظاہر کرنا تو ایک پیش پا افتادہ چیز ہے، اس کو تو چرند پرند، نباتات وجمادات، کوہ ودریا، چاند سورج، آسمان وزمین۔ غرضکہ ہر چیز کی زبان سے بولنے اور ان سے گفتگو کرنے کی قدرت ہوتی ہے جب یہ صحیح ہے تو پھر اگر ایک غزل گو شاعر اپنے علاوہ اپنے دوسرے ابنائے جنس کے خیالات وجذبات کو جامۂ شعر پہنانے یا دنیا کی دوسری جاندار اور بے جان اشیا کی زبان سے بولنے اور ان سے ہم کلام ہونے پہ قادر ہے تو یہ اس کے شاعرانہ کمال کی ایک روشن دلیل ہے نہ کہ کوئی قابلِ الزام وگردنِ جرم۔ یہ کونسا انصاف ہے کہ آپ تمام دیگر اصنافِ سخن یعنی نظموں وغیرہ میں تو اس جرم کا ارتکاب روا رکھیں اور اس کو مستحسن سمجھیں، مگر بے چاری غزل کو اس مستحسن جرم کی پاداش میں جلاد کے حوالے کر دیں۔

———※———

یورپ کے نوجوان

کاش اس مضمون کا عنوان "یورپ کے نوجوان" کے بجائے "یورپی نوجوان" ہوتا۔ مگر یہ تخیل اب چند سال سے امید موہوم ہو کر رہ گیا ہے۔ یورپ کے مختلف ممالک کے نوجوان اپنے اپنے مقاصد کے ماتحت متحد ضرور ہیں۔ مگر مجھے شبہ ہے کہ آیا انھیں کبھی اتنی قوت نصیب ہوگی کہ وہ سیاسی، جماعتی یا کم سے کم اخلاقی مسائل میں فیصلہ کن ثابت ہو سکے۔

جنگ عظیم کے بعد ہم نوجوانوں کو یقین نہ آتا تھا کہ پھر اس پیمانے کی دوسری کشمکش بھی ہو سکتی ہے یہ خیال فاتح اور مفتوح دونوں کے یہاں مسلم تھا۔ مگر ۱۹۲۲ء میں ویسٹ منسٹرایبی میں مجھے پہلی بار یہ خیال ہوا کہ شاید میں غلطی پر ہوں۔ میں "نامعلوم سپاہی" کی قبر کے سامنے کھڑا تھا اس کی لوح پر لکھا تھا "وہ جو خدا کی راہ میں کام آیا اور اپنے ملک اور بادشاہ کے لئے قربان ہوا اس نے عدل و انصاف اور بنی نوع انسان کی آزادی کی خاطر اپنی جان دی"۔ چند ہی گھنٹوں کے بعد مجھے ایک تھانے میں جانے کا اتفاق ہوا کیونکہ میں ایک ایسے ملک کا باشندہ ہوں جو کبھی دشمن رہ چکا تھا اور اسی لئے میری وہاں تصدیق اور جانچ ہونی تھی۔ تھانے کے افسر نے مجھ سے پوچھا "تم جنگ میں شریک تھے؟" میں نے کہا: "میں اس وقت بہت چھوٹا تھا"۔ اس نے مجھے نیچے سے اوپر تک دیکھا، اور کہنے لگا: "خیر، اگلی جنگ کے لئے بہت موزوں ہو"۔ اس موقع پر تو مجھے گمان بھی نہیں گذرا کہ سارجنٹ کا قول ٹھیک نکلے گا۔ مگر یہ شبہ جو اس وقت پیدا ہوا تھا اب پورے یقین کے درجے تک پہنچ چکا ہے

یورپ کی موجودہ نسل کے اندر وہی انقلابی جذبہ اور کشمکش نظر آتی ہے، جو بالعموم ان نوجوانوں کے اندر کارفرما ہوا کرتی ہے جو کسی اہم تاریخی زمانے میں نشو و نما پاتے ہیں۔ نوجوانوں نے اپنے زمانے کے سیاسی، و سماجی نظام ادب کے رجحانات، فنون لطیفہ کے معیار اور مذہب کے

تخیلات کے خلاف ہمیشہ بغاوت کی ہے۔ اس لئے موجودہ انقلابی جذبہ بھی کوئی نئی چیز نہیں، ہاں مقاصد کی پیچیدگی کشمکش کی شدت اور دباؤ کی زیادتی کی وجہ سے نمایاں معلوم ہوتا ہے۔

یورپ کی اس نئی نسل کو عمر سے قطع نظر، تجربے کے لحاظ سے دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے پہلے گروہ میں اکثر وہ لوگ شامل ہیں جن کے دلوں میں جنگ کے قبل کے زمانے کی یاد باقی ہے، اور دوسرے میں وہ لوگ ہیں جو اثنائے جنگ یا اس کے بعد کے ایام میں پلے اور بڑھے۔ روزی کا سوال دونوں کے لئے یکساں طور پر مشکل ہے۔ مگر اس سے بھی مشکل یہ امر ہے کہ وہ اپنے لئے مناسب نصب العین تجویز کرسکیں جو ان کے مقاصد کے شایانِ شان ہو۔ اس لئے جوں جوں وہ عمر میں ترقی کرتے جاتے ہیں، ان کی مشکلات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ موجودہ حالات چونکہ ناقابل حل ہوتے جارہے ہیں، اس لئے انقلاب کی ضرورت ناگزیر تر ہوتی جاتی ہے۔ ان حالات، کے پیش نظر جو کچھ نہ ہوتا کم تھا۔ اسی لئے آج کل مختلف ممالک کے نوجوان نہایت سرگرمی کے ساتھ ایسے سیاسی نظام کے ماتحت مصروفِ عمل ہیں جن کا فلسفیانہ پہلو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔

جنگ کے بعد یورپ کی نئی نسل کے سامنے کون کون سی صورتیں تھیں؟ ایک طرف تو مختلف ممالک کی محدود قوم پرستی جس کی بنیا دملوکیت پر تھی، ایک دوسرے سے دست و گریباں تھی اور دوسری جانب آزاد سرمایہ داری اور آمرانہ اشتراکیت (Dictatorial Comunism) میں رقابت تھی۔ جنگ کے بعد فوراً ہی ہر جگہ اشتراکی انقلابات سے آزاد سرمایہ داری کو اندیشہ ہو چلا تھا۔ مگر قوم پرستی نے پھر سنبھالا لیا اور اب نوجوان اس گومگو میں پڑ گئے کہ آیا جمہوریت ابھی دنیا میں باقی رہے گی یا اشتراکی پیغمبروں کا قول کہ ایک عالمگیر انقلاب قریب ہے، صحیح نکلے گا۔ مگر یہ سوال جتنا بظاہر سادہ معلوم ہوتا ہے اتنا آسان نہیں ہے۔ کم وبیش تمام ممالک میں ان دونوں صورتوں میں انتخاب کرنا ناممکن ہوگیا ہے، اور جہاں ناممکن نہیں تھا وہاں بھی اب متضاد سیاسی تخیلات کے ایک جگہ جمع ہوجانے سے مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔ اشتراکیت کا دعویٰ ہے کہ اس کا وجود عقلِ سلیم پر مبنی ہے اور اس کے ذریعے ساری دنیا کا بھلا ہوگا۔ اس نے جمہوریت سے، آمریت تک اپنے

مدارج مقرر کئے ہیں۔ اس کی مدمقابل آزاد یا قدامت پسند سرمایہ داری ہے جو اس تخیل پر مبنی ہے کہ عدم مداخلت (Laissez faire) کے اصول کے ماتحت جماعت کی جو خود بخود ترتیب ہو جاتی ہے وہی برقرار رکھی جائے۔ فاشستیوں کے نزدیک بھی حصول مقاصد کا ذریعہ "استدلال" اور "عقل" ہے۔ مگر نازیوں کے یہاں کامیاب زندگی کا گُر یہ ہے کہ جو کچھ فوراً سمجھ میں آجائے اس پر بے چون و چرا اور بغیر کسی استدلال کے کاربند ہو جانا چاہئے۔ جب موجودہ نسل کے رہنما قوت واقتدار کے لئے سرمایہ دارانہ اور اشتراکی تہذیبوں میں جنگ کے نعرے لگاتے ہوئے اُٹھتے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ "قیامِ انسانیت" کی خاطر جنگ ناگزیر ہے۔ تو تخیلات کی حسرتناک پیچیدگی اپنی اصلی صورت میں نمایاں ہو جاتی ہے۔

غرض یورپ کی نئی نسل کا نہ تو زاویۂ نگاہ ایک ہو سکتا ہے، اور نہ مقاصد۔ البتہ انہوں نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے جو طریق عمل اختیار کیا ہے اسی کی بنا پر ان کو دو مختلف گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ حامیانِ جنگ کا طبقہ جس نے اس چار سالہ کشمکش کے دوران میں ہوش سنبھالا ہے، یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ قوت کی حکومت کو تسلیم کرنا چاہئے۔ چنانچہ جنگ کو ناگزیر سمجھ کر انھوں نے طے کر دیا کہ سیاسی اور جماعتی مسائل کا فیصلہ مشین گن پر چھوڑ دینا چاہئے۔

حامیانِ امن جنھوں نے جنگ کے بعد کے زمانے میں ہوش سنبھالا، یہ سمجھتے ہیں کہ قیامِ امن کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے۔ کوششِ امن سے ان کا مقصد جنگ کا سرے سے خاتمہ کرنا نہیں ہے بلکہ وہ اسے نیک کام سمجھ کر کرتے ہیں وہ بین الاقوامی اور قومی مفادات کے درمیان خوش معاملگی پیدا کرنے کے حامی ہیں اور اس سے پیشتر کہ باہمی کشمکش اسقدر نازک اور پیچیدہ صورت اختیار کرلے کہ بغیر جنگ کے اسکا تصفیہ ہی نہ ہو سکے وہ اس گتھی کو سلجھا دینا چاہتے ہیں۔ حامیانِ جنگ میں ایسے لوگ شامل ہیں جو طاقت اور اثر کے لحاظ سے بڑھے ہوئے ہیں اور روز بروز اُن کی طاقت اور تعداد میں ترقی ہو رہی ہے لیکن حامیانِ امن میں بھی ایسے لوگ شامل ہیں جن کے سیاسی، جماعتی اور معاشی تجربات نسبتاً زیادہ پختہ اور مسلم ہیں، اور روز بروز یہ

طبقہ بھی ترقی کر رہا ہے

اب سوال یہ ہے کہ یورپ کے نوجوانوں کی اکثریت ان دو طبقوں میں سے کس کے ساتھ ہوگی۔ یورپ میں نوجوانوں کی موجودہ تحریکات پر سیر حاصل تبصرے کے لئے تو مضامین کا ایک سلسلہ درکار ہے، مگر ہم یہاں ان کی ذہنیت کا مختصر طور سے تجزیہ کریں گے جس سے اُن کے طریق عمل پر کچھ روشنی پڑے گی۔ یورپ کی نئی نسل کی اخلاقی اور ذہنی کیفیت کا شاید سب سے زیادہ یاس انگیز پہلو یہ ہے کہ آج کل آپس میں خیالات و جذبات کا تبادلہ تقریباً ختم ہوگیا ہے اور وہ اپنے ہی ملک کے محدود دائرے میں رہ کر قوموں کے اندر مناقشانہ جذبات کو مشتعل کرتے رہتے ہیں۔ ہر عقیدے اور مسلک کے لوگوں نے اپنے ارد گرد گویا جادو کا ایک حلقہ سا بنالیا ہے جس کے اندر رہ کر وہ طرح طرح کے قومی ترانوں اور نعروں کی صورت میں صرف اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنایا کرتے ہیں اور محض اپنے ہی مسائل میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں۔ آج کل سائنس کی بدولت باہمی میل جول کی کتنی سہولتیں بہم ہیں، اس کے باوجود یہ جادو نہیں ٹوٹتا۔ اور کیا مجال کہ ان "طلسمی حلقوں" کے باہر کوئی قدم رکھ سکے۔ آج یورپ ذہنی اعتبار سے متعدد حصوں میں اس طرح تقسیم ہے کہ ایک کو دوسرے کے خیالات کی مطلق خبر نہیں۔ یہ صورت اتنی نمایاں ہے کہ یورپ میں ذہنی بیداری کے نشاۃ ثانیہ کے بعد سے آج تک کبھی رونما نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہی مثال لیجئے۔ سولھویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک Erasmus کی تصانیف کا مطالعہ ـــ جو تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مشترکہ زبان (Lingua Franca) لاطینی میں لکھتا تھا۔ یورپ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہایت آزادی کے ساتھ کیا جاسکتا تھا اور اس کا ترجمہ بھی اسی طرح آزادی کے ساتھ درجنوں زبانوں میں ہوتا تھا اور کونگبرگ سے آکسفورڈ تک تمام یورپ میں علم کی خاطر سفر کرتے تھے۔ اور ارباب علم و ادب کا ہر ملک میں سرگرمی سے خیر مقدم ہوتا تھا۔ مگر ایک آج کا زمانہ ہے کہ کتابوں کی درآمد تک محال ہے۔ یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں بیرونی طالب علموں کی تعداد ایام انقلاب فرانس کے

علاوہ اتنی کم کبھی نہیں رہی جتنی آج ہے۔

جن لوگوں نے روسیک کے کھیل دیکھے ہیں۔ یا جنھیں عالمگیر اسکاوٹس جمہوری دیکھنے کا موقع ملا ہے، اُنھیں ان دونوں موقعوں پر عالمگیر اجتماع کو دیکھ کر یقین ہوگیا ہے کہ نوجوان دنیا کو باہم منظم دیکھنے کے متمنی اور مشترکہ نظامِ عمل کو نہایت دلیری کے ساتھ قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان مظاہروں کے دیکھنے کے بعد یورپ کے موجودہ نوجوانوں سے کچھ امید بندھتی ہے مگر کون نہیں جانتا کہ محض امید ہی کافی نہیں ہوتی۔ اس لئے فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ضرورت کس چیز کی ہے؟ اگرچہ اس سوال کو سُن کر بیشتر نوجوان جواب کی طرف سے آنکھیں پھیرلیں گے اور اپنے اپنے مسائل میں مصروف ہوجائیں گے، لیکن ہر ملک میں ایسے چند نوجوان بھی ملیں گے جو قوموں کے بنیادی اختلافات کو دور کر کے ان کو ہم آہنگ کرنے کی ضرورت اور ان کے باہمی تعلقات میں لوچ پیدا کرنے کی اہمیت کو محسوس کریں گے۔

انھیں اس امر کا زیادہ سے زیادہ احساس ہورہا ہے کہ دنیا تو خیر، یورپ کو بھی متحد کرنے میں نہ اشتراکیت کے متعدد پہلوؤں میں سے کوئی پہلو اور نہ سرمایہ داری کی آزادانہ شکل کوئی بھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ان میں سے کسی کو کامیابی ہوگی بھی تو اس حالت میں کہ اس کے اصولوں کو تمام دنیا متفقہ طور پر سمجھ لے اور انھیں برتنے کے لئے تیار ہوجائے۔ نظری حیثیت سے تو دنیا اشتراکیت کے زیرِ اثر بھی اور سرمایہ داری کے ماتحت بھی سُکھ سے رہے گی، اس لئے کہ دونوں نظریوں کی بنیاد اس مفروضے پر قایم ہے کہ ہر جگہ ایک ہی قسم کے انسان بستے ہیں۔ آزاد خیال طبقے کے لائحہ عمل کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ یہ نتیجہ انفرادی کوششوں سے رونما ہوگا۔ اس کے برعکس اشتراکیوں کا دھیان ہے کہ یہ یکسانیت طاقت کے بغیر نہیں پیدا ہوسکتی۔ ان نظریوں کے عملی پہلو نے انھیں ایسی پیچیدگی میں ڈال دیا ہے کہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی دونوں قسم کی ریاستوں میں اس مقصد کے حصول کے لئے طاقت کے استعمال کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مساوات کا یہ نظریہ ممکن ہے قومی مسائل کو کسی حد تک حل کرنے میں کامیاب ہوجائے۔ مگر جب

بین الاقوامی معاملات میں برتا جائے گا تو بالکل بیکار ثابت ہوگا حتیٰ کہ تمام دنیا جماعتی دباؤ سے تنگ آکر ایسا طریقۂ فکر و عمل اختیار کرنے پر مجبور ہوگی جو ایلڈس ہکسلے (Aldous Huxley) نے کم و بیش اپنی تصنیف "خیالی دنیائے جدید" (Brave New World) میں پیش کیا ہے

نوجوانانِ یورپ کے مفکرین کو اب احساس ہو چلا ہے کہ یورپ میں جمہوریت، آمریت، فاشتیت اور اشتراکیت کا سایہ پہلو بہ پہلو قایم رہے گا۔ ان کے حامی ممکن ہے اپنے اندرونی (ملکی) مسائل کو سلجھانے میں کامیاب ہو جائیں، مگر مستقبل میں انھیں اُس وقت تک دوام اور استقلال میسر نہیں ہو سکتا جب تک ان میں بین الاقوامی معاملات کو سلجھانے کی صلاحیت نہ پیدا ہو جائے۔ ایسی کوئی اسکیم ابھی تک مرتب نہیں ہوئی ہے، مگر اس کی ضرورت کو سب محسوس کر رہے ہیں۔ اگر ذہنیتوں میں معقولیت پسندی آگئی تو یہ سوال کہ کس ملک میں کونسا سیاسی اور معاشی نظام رائج ہے کچھ زیادہ اہم نہ ہوگا لیکن اگر ان کے خیالات میں وسعت اور رواداری نہ آئی تو ان کے درمیان تو ایک اندیشہ ناک کشمکش جاری ہی ہے۔ دوسری ریاستوں سے بھی ان کے تعلقات خوش گوار نہ رہیں گے۔

آج کل یورپ میں باہمی اختلافات اور اتحاد بالجبر کے مسائل نے جو صورتِ حال اختیار کر رکھی ہے اس کی ایک جیتی جاگتی تصویر جولین بنڈا (Julien Benda) کے مشہور مقالہ "اقوامِ یورپ" (Discours a la Nation Europeenne) میں نظر آتی ہے۔ مقالہ نگار نے یہ مقالہ مشہور جرمن فلسفی "فشٹے" (Fichte) کے خطبات کے جواب میں لکھا ہے۔ فشٹے نے ایک صدی پہلے یہ خطبات برلن یونیورسٹی میں (Rede an die Deutsche Nation) کے عنوان سے دئے تھے۔ یہ دونوں تصنیفیں علمی و ادبی حیثیت سے اپنی اپنی جگہ ممتاز ہیں اور جتنی مقبولیت نوجوانانِ یورپ میں ان کو حاصل ہوئی شاید ہی کسی اور تصنیف کو حاصل ہوئی ہو۔ اگر کوئی شخص اِن دونوں نظریات میں سے انتخاب کرنا چاہے تو اس کے لئے مشکل ہو جائے گا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں تقریروں کا مطالعہ اگر غور سے کیا جائے اور ان کی اصلیت کو

سمجھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں کوئی بین اور بنیادی فرق نہیں ہے۔ نیٹشے نے قومیت کی تعلیم دی ہے اور اُسے فلسفۂ حیات کی بنیاد کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ اس کی رُو سے افراد کی زندگی وعمل کا بنیادی مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ اس سے جرمن قوم کی تہذیبی سماجی اور معاشی ترقی میں زیادہ سے زیادہ مدد ملے۔ گویا نیٹشے کی تعلیم مشترکہ مفاد پر انفرادی مفاد کی قربانی کی حامی ہے۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی معاملات میں نیٹشے نے بھی دوسری قوموں کے ساتھ رواداری، احترام اور مساوات کے اصولوں کو برتنے کی بڑے زور سے حمایت کی ہے، دوسری جانب بنڈا (Benda) "مذہب انسانیت" (Humanitarianism) کا علمبردار ہے اور بین الاقوامی کشمکش میں اُسی "انسانی رویہ" کے اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔

بنڈا نے اپنی تصنیف میں فکر وعمل کے دو معیار قایم کئے ہیں۔ ایک اعلیٰ اور دوسرا ادنیٰ۔ اُس نے "یورپ" کو مقدم اور "قوم" کو موخر رکھا ہے۔ مگر بہ حالتِ موجودہ جب نیٹشے اور بنڈا کے حامی "قومی" اور "یورپی" جذبے کی تعریف کرنے لگتے ہیں تو دونوں کے دونوں راستے کھینچ تان کر اپنے ہی میعار کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بنڈا کا منتہائے نظر "یورپی قوم" سے یہ نہیں تھا کہ وہ یورپ کو ایک قوم کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ بلکہ اس سے اس کا مفہوم وہ ہے جو یورپ کے متعلق نیٹشے نے پیش کیا ہے۔

جا۔ اوٹن (J. O. Otten) نے جو یورپ کی نئی نسل کے نمائندوں میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔ بنڈا کے خطبے پر تبصرہ کرتے ہوئے بڑی مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ اپنے مقالہ (Mobility and Revolution) میں لکھتا ہے۔

> "ہمیں شاعرانہ اور مبہم باتوں، خیالی اور متعصبانہ اصولوں اور روایتی پابندیوں سے آزاد ہونا پڑے گا۔ اپنے ہمسایوں کی غلط روایات اور مضرت رساں تعصبات میں رواداری کا جذبہ پیدا کرنا تو مشکل ہے ہی۔ مگر اس سے بھی مشکل یہ ہے کہ ان عقائد تخیلات کی درشتی کو دُور کیا جائے جن کے ہاتھوں یورپ تباہ ہو رہا ہے۔ لیکن اگر

ہمیں اپنی فصل کاٹنا اور دوسری کاشت کرنا ہے تو یہ سب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

ضرورت اس امر کی ہے کہ یورپ کے نوجوانوں میں ایک غیر مقلدانہ جذبۂ خدمت وایثار پیدا ہو، وہ ہر قسم کی صورتِ حال سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہیں اور قومی اور بین الاقوامی زندگی کے تمام تغیرات پر جو آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں، نظر رکھتے ہوں اور ان پر قابو پانے کے لئے کوشاں رہیں۔

کیا ان خیالات کے علمبردار کوشش کریں گے کہ یورپ کے نوجوانوں میں اس مقصد کی اہمیت اور ضرورت کا احساس پیدا ہو جائے؟ اور کیا اس کی تکمیل کے لئے وہ کوئی راستہ نکالنے کی منظم کوشش کریں گے؟ یا پھر اس حسرتناک انجام کا انتظار کیا جائے جو کبھی سماریا کے اچھوتوں کا ہوا تھا۔ کیا انجیل مقدس کا نظریۂ حیات وموت یہ نہیں:۔

"موت کے انتظار میں ہم یہاں کیوں بیٹھے رہیں، اس خوف سے کہ شہر میں داخل ہوں گے تو سب مر جائیں گے، ہم قدم نہ اٹھائیں تو یہاں بھی تو آخر مرنا ہی ہے"؟

کیا ممکن نہیں کہ نوجوانانِ یورپ بھی انہی انسانوں کی طرح آگے قدم بڑھائیں "اور کامرانی" کا پیغام لائیں؟

———— ٭٭٭ ————

شکوہ شکایت

زندگی کا بڑا حصہ اسی گھر میں گذر گیا مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا، میرے شوہر دنیا کی نگاہ میں بڑے نیک اور خوش خلق اور فیاض اور بیدار مغز ہونگے، لیکن جس پر گذرتی ہے وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو اُن لوگوں کی تعریف میں مزہ آتا ہے جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے کو تباہ کئے ڈالتے ہوں۔ جو گھر والوں کے لئے مرتا ہے اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے۔ وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے، بخیل ہے، تنگدل ہے، مغرور ہے، کور باطن ہے۔ اسی طرح جو لوگ باہر والوں کے لئے مرتے ہیں ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے۔ اب انہیں کو دیکھو۔ صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں۔ بازار سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دوکان سے لائیں گے جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہو۔ ایسی دوکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے، نہ دام ہی مناسب۔ یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ دوکان بدنام ہی کیوں ہوتی۔ انھیں ایسی ہی دوکانوں سے سودا سلف خریدنے کا مرض ہے۔ بار بار کہا کسی چلتی ہوئی دوکان سے چیزیں لایا کرو وہاں مال زیادہ کھپتا ہے۔ اس لئے تازہ مال آتا رہتا ہے۔ مگر نہیں۔ ٹٹپونجیوں سے ان کی ہمدردی ہے. اور وہ انھیں اُلٹے اُسترے سے مونڈتے ہیں۔ گیہوں لائیں گے تو سارے بازار سے خراب، گھنا ہوا چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے۔ دال میں کنکر بھرے ہوئے۔ منوں لکڑی جلا ڈالو کیا مجال کہ گلے۔ گھی لائیں گے تو آدھوں آدھ تیل۔ اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم تیل لائینگے تو ملاوٹ کا۔ بالوں میں ڈالو تو چکٹ جائیں۔ مگر دام دے آئیں گے اعلیٰ درجے کے چنبیلی کے تیل کے۔ چلتی ہوئی دوکان پر جاتے تو جیسے انہیں ڈر لگتا ہے۔ شاید اونچی دوکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دوکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔

ایک ان کی بات ہو تو برداشت کرلی جائے۔ روز روز کی یہ مصیبت نہیں برداشت

ہوتی۔ میں کہتی ہوں آخر آپ ٹٹپونجیوں کی دوکان پر جاتے ہی کیوں ہیں۔ کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تمہیں نے لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں مجھے دیکھ کر بُلانے لگتے ہیں۔ خوب! ذرا انھیں بُلا لیا اور خوشامد کے دو چار الفاظ سُنا دیئے، بس آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا۔ پھر انھیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہے یا کیا۔ پوچھتی ہوں تم اس راستے سے جاتے ہی کیوں ہو؟ کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں جاتے۔ ایسے اٹھائی گیروں کو منہ ہی کیوں لگاتے ہو۔ اس کا کوئی جواب نہیں۔ ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

ایک بار ایک زیور بنوانا تھا۔ میں تو حضرت کو جانتی تھی۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک پہچان کے سنار کو بُلا رہی تھی۔ اتفاق سے آپ بھی موجود تھے۔ بولے یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ دھوکا کھاؤ گی۔ میں ایک سُنار کو جانتا ہوں۔ میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے۔ برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں۔ میرے ساتھ چالبازی نہیں کر سکتا۔ میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا تو کہاں تک دوستی کا حق نہ نبھائے گا۔ سونے کا زیور اور پچاس روپے ان کے حوالے کئے۔ اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپے نہ جانے کس بے ایمان کو دیدیئے کہ برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا۔ اور اتنی بدنما کہ دیکھ کر گھِن آتی تھی۔ برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہی۔ ایسے ایسے وفادار تو ان کے دوست ہیں جنھیں دوست کی گردن پر چھُری پھیرنے میں بھی عار نہیں۔ انکی دوستی بھی انھیں لوگوں سے ہے جو زمانہ بھر کے فاقہ مست، قلاش، بے سرو سامان ہیں، جن کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں سے دوستی کرنا ہے۔ روز ایک نہ ایک صاحب قرض مانگنے کے لئے سر پر سوار رہتے ہیں اور بلا لئے گلا نہیں چھوڑتے۔ مگر ایسا کبھی نہ ہوا کہ کسی نے روپے ادا کئے ہوں۔ آدمی ایک بار کھو کر سیکھتا ہے، دو بار کھو کر سیکھتا ہے۔ مگر یہ بھلے مانس ہزار بار کھو کر بھی نہیں سیکھتے۔ جب کہتی ہوں روپے تو دے آئے۔ اب مانگ کیوں نہیں لاتے۔ کیا مر گئے تمہارے وہ دوست۔ تو بغلیں جھانک کر رہ جاتے ہیں۔ آپ سے دوستوں کو سوکھا جواب نہیں

دیا جاتا۔ خیر سُو کھا جواب نہ دو۔ میں بھی نہیں کہتی کہ دوستوں سے بے مروّتی کرو۔ مگر ٹال تو سکتے ہو کیا بہانے نہیں بنا سکتے۔ مگر آپ انکار نہیں کر سکتے۔ کسی دوست نے کچھ طلب کیا اور آپ کے سر پر بوجھ پڑا۔ بیچارے کیسے انکار کر دیں۔ آخر لوگ جان جائیں گے کہ یہ حضرت بھی فاقہ مست ہیں۔ دنیا انہیں امیر سمجھتی رہے چاہے میرے زیور ہی کیوں نہ گرو رکھنے پڑیں۔ سچ کہتی ہوں بعض اوقات ایک ایک پیسے کی تنگی ہو جاتی ہے۔ اور اس بھلے آدمی کو روپے جیسے گھر میں کاٹتے ہیں۔ جب تک روپے کے وارے نیارے نہ کر لے، اسے کسی پہلو قرار نہیں۔ ان کے کرتوت کہاں تک کہوں۔ میری تو ناک میں دَم آ گیا۔ ایک نہ ایک مہمان روز بلائے بے درماں کی طرح سر پر سوار۔ نہ جانے کہاں کے بے فکرے ان کے دوست ہیں۔ کوئی کہیں سے آ کر مرتا ہے، کوئی کہیں سے۔ گھر کیا ہے اپاہجوں کا اڈا ہے۔ ذرا سا تو گھر بمشکل سے دو چارپائیاں اوڑھنا بچھونا بھی با افراط نہیں۔ مگر آپ ہیں کہ دوستوں کو دعوت دینے کے لئے تیار۔ آپ تو مہمان کے ساتھ لیٹیں گے اس لئے انہیں چارپائی بھی چاہیئے، اوڑھنا بچھونا بھی چاہیئے ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے۔ جاتی ہے تو میرے اور بچوں کے سر۔ زمین پر پڑے پڑے سکڑ کر رات کاٹتے ہیں۔ گرمیوں میں تو خیر مضائقہ نہیں۔ لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آ جاتی ہے گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمانوں کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اب میں بچوں کو لئے قفس میں پڑی تڑپا کروں۔ اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں جن کے پاس کپڑے لتّے تک نہیں۔ خدا کے فضل سے ان کے سبھی دوست ایسے ہی ہیں۔ ایک بھی ایسا خدا کا بندہ نہیں جو ضرورت کے وقت انہیں دھیلے سے بھی مدد دے سکے دو ایک بار حضرت کو اس کا تجربہ اور بے حد تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر اس مرد خدا نے تو جیسے آنکھیں کھولنے کی قسم کھالی ہے۔ ایسے ہی ناداروں سے ان کی پٹتی ہے۔ ایسے ایسے لوگوں سے آپ کی دوستی ہے کہ کہتے شرم آتی ہے۔ جسے کوئی اپنے دروازے پر کھڑا بھی نہ ہونے دے وہ آپ کا دوست ہے۔ شہر میں اتنے امیر کبیر ہیں۔ آپ کا کسی سے بھی ربط ضبط نہیں۔

کسی کے پاس نہیں جاتے۔ امرا مغرور ہیں، مدمّغ ہیں، خوشامد پسند ہیں۔ ان کے پاس کیسے جائیں دوستی گانٹھیں گے ایسوں سے جن کے گھر میں کھانے کو بھی نہیں۔

ایک بار ہمارا خدمتگار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمتگار نہ ملا۔ میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی۔ مگر بابو صاحب کو جلد سے جلد کوئی آدمی رکھ لینے کی فکر سوار ہوئی گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے مگر آپ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی رُکی ہوئی ہے۔ ایکدن جانے کہاں سے ایک بانگڑو کو پکڑ لائے اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگلو ہے مگر آپ نے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیا کہوں۔ بڑا فرماں بردار ہے، پرلے سرے کا ایمان دار، بلا کا محنتی، غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجے کا باتمیز۔ خیر، میں نے رکھ لیا۔ میں بار بار کیونکر ان کی باتوں میں آجاتی ہوں، مجھے خود تعجب ہے۔ یہ آدمی صرف شکل سے آدمی تھا۔ آدمیت کی کوئی علامت اس میں نہ تھی۔ کسی کام کی تمیز نہیں۔ بے ایمان نہ تھا، مگر احمق اول نمبر کا۔ بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین تو ہوتی کہ خود کھا جاتا ہے۔ کم بخت دوکانداروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ اُسے دس تک کی گنتی بھی نہ آتی تھی۔ ایک روپیہ دے کر بازار بھیجوں تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے۔ غصہ پی پی کر رہ جاتی تھی۔ خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سُور کے کان اُکھاڑ لوں۔ مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا۔ آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ دور بیٹھا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ میرا خون کھولنے لگتا لیکن انھیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا بھی تو آپ اُسے قریب نہ آنے دیتے۔ اس کے عیبوں کو ہنر بنا کر دکھایا کرتے تھے اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو ان عیوب پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ کمبخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مردانہ کمرہ ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے۔ اس میں جھاڑو دیتا تو اِدھر کی چیز اُدھر، اوپر کی نیچے گویا سارے کمرہ میں زلزلہ آگیا ہو اور گرد کا یہ عالم کہ سانس لینی مشکل۔ مگر آپ کمرہ میں اطمینان سے بیٹھے رہتے، گویا کوئی بات ہی نہیں۔ ایک دن میں نے اُسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا اگر کل

سے تو نے سلیقہ سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دونگی۔ سویرے سو کر اٹھی تو دیکھتی ہوں کمرہ میں جھاڑو دی ہوئی ہے۔ ہر ایک چیز قرینہ سے رکھی ہے، گرد و غبار کا کہیں نام نہیں۔ آپ نے فوراً ہنسکر کہا، دیکھتی کیا ہو، آج گھورے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے۔ میں نے سمجھا دیا۔ تم طریقہ تو بتاتی نہیں ہو، اُلٹی ڈانٹنے لگتی ہو۔ لیجئے صاحب، یہ بھی میری ہی خطا تھی۔ خیر۔ میں نے سمجھا اس نالائق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقہ کے ساتھ کیا۔ اب روز کمرہ صاف ستھرا ملتا۔ اور میری نگاہوں میں گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی۔ اتفاق کی بات۔ ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے اُٹھ بیٹھی اور کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازے پر کھڑا ہے اور خود بدولت بڑی تندہی سے جھاڑو دے رہے ہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ ان کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور گھورے کے سر پر پٹک دی۔ حرام خور کو اسی وقت دھتکار بتائی۔ آپ فرمانے لگے اس کی تنخواہ تو بیباق کردو۔ خوب! ایک تو کام نہ کرے دوسرے آنکھیں دکھائے، اس پر تنخواہ بھی دیدوں۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہ دی۔ ایک کُرتہ دیا تھا وہ بھی چھین لیا۔ اس پر حضرت کئی دن مجھ سے روٹھے رہے۔ گھر چھوڑ کر بھاگے جا رہے تھے۔ بڑی مشکلوں سے رُکے۔

ایک دن مہتر نے اتارے کپڑوں کا سوال کیا۔ اس بیکاری کے زمانے میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں۔ شاید رئیسوں کے گھر میں ہوں۔ میرے یہاں تو ضروری کپڑے بھی کافی نہیں۔ حضرت ہی کا توشہ خانہ ایک بقچی میں آجائیگا جو ڈاک کے پارسل سے کہیں بھیجا جا سکتا ہے۔ پھر اس سال سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنوانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا سردی شدّت کی تھی۔ اس کا مجھے خود احساس تھا۔ غریبوں پر کیا گزرتی ہے، اس کا بھی علم تھا۔ لیکن میرے یا آپ کے پاس اس کا افسوس کے سوا اور کیا علاج ہے۔ جب رؤسا اور امراء کے پاس ایک ایک مال گاڑی کپڑوں سے بھری پڑی ہوئی ہے تو پھر غربا کیوں نہ برہنگی کا عذاب جھیلیں۔ خیر۔ میں نے تو اسے جواب دے دیا۔ آپ نے کیا کیا کہ اپنا کوٹ اٹھا کر اس کے حوالے کر دیا۔ میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ حضرت کے پاس یہی ایک

کوٹ تھا۔ یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا۔ مہتر نے سلام کیا، دعائیں دیں، اور اپنی راہ لی۔ آخر کئی دن سردی کھاتے رہے۔ صبح کو گھومنے جایا کرتے تھے، وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ مگر دل بھی انھیں قدرت نے عجیب قسم کا دیا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنتے آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں تو کٹ جاتی ہوں۔ آپ کو مطلق احساس نہیں۔ کوئی ہنستا ہے تو ہنسے آپ کی بلا سے۔ آخر مجھ سے نہ دیکھا گیا تو ایک کوٹ بنوا دیا۔ جی تو جلتا تھا کہ خوب سردی کھانے دوں مگر ڈری کہ کہیں بیمار پڑ جائیں تو اور بھی آفت آجائے آخر کام تو انھیں کو کرنا ہے۔

یہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے میں کتنا نیک نفس اور منکسر مزاج ہوں۔ شاید انھیں ان اوصاف پر ناز ہو۔ میں انھیں نیک نفس نہیں سمجھتی۔ نہ منکسر مزاج ہی سمجھتی ہوں۔ یہ سادہ لوحی ہے سیدھی سادی حماقت۔ جس مہتر کو آپ نے اپنا کوٹ دیا اسی کو میں نے کئی بار رات کو شراب کے نشہ میں بدمست، جھومتے دیکھا ہے اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے تو پھر دوسروں کی کج روی کا تاوان ہم کیوں دیں۔ اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں سے بھی تو فیاضانہ برتاؤ کرتے یا ساری فیاضی باہر والوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔ گھر والوں کو اس کا عشر عشیر بھی نہ ملنا چاہیئے؟ اتنی عمر گذر گئی مگر اس شخص نے کبھی اپنے دل سے میرے لئے ایک سوغات بھی نہ خریدی۔ بیشک میں جو چیز طلب کروں اسے بازار سے لانے میں انھیں کلام نہیں مطلق عذر نہیں۔ مگر روپے میں دیدوں یہ شرط ہے۔ انھیں خود کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ بیچارے اپنے لئے بھی کبھی کچھ نہیں لاتے۔ میں جو کچھ منگوا دوں اسی پر قناعت کر لیتے ہیں۔ مگر آخر انسان کبھی کبھی شوق کی چیزیں چاہتا ہی ہے۔ اور مردوں کو دیکھتی ہوں۔ گھر میں عورت کے لئے طرح طرح کے زیور۔ کپڑے۔ شوق سنگار کے لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے۔ بچوں کے لئے بھی مٹھائی، کھلونے۔ باجے۔ بگل شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں قسم سی کھالی ہے۔ اس لئے میں تو انھیں بخیل کہوں گی۔ بدشوق کہوں گی۔ مردہ دل کہوں گی فیاض نہیں کہہ سکتی۔ دوسروں کے ساتھ ان کا جو فیاضانہ سلوک ہے اسے میں حرص نمود اور

سادہ لوحی پر محمول کرتی ہوں۔ آپ کی منکسر مزاجی کا یہ عالم ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اس کے کسی عہدے دار سے آپ کا میل جول نہیں۔ افسروں کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے خلاف ہے۔ نذر نیاز ڈالی تو دور کی بات ہے۔ اور تو اور، کبھی کسی افسر کے گھر جاتے بھی نہیں۔ اس کا خمیازہ آپ نہ اٹھائیں تو کون اٹھائے۔ اوروں کو رعائتی چھٹیاں ملتی ہیں، آپ کی تنخواہ کٹتی ہے۔ اوروں کی ترقیاں ہوتی ہیں آپ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ حاضری میں پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو جواب طلب ہو جاتا ہے۔ بیچارے جی توڑ کر کام کرتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ مشکل کام آ جائے تو انھیں کے سر منڈھا جاتا ہے۔ انھیں مطلق عذر نہیں۔ دفتر میں انھیں گھسو اور پیٹو وغیرہ خطابات ملے ہوئے ہیں۔ مگر منزل کتنی ہی دشوار طے کریں، ان کی تقدیر میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے۔ میں تو اسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں۔ آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو دنیا میں مروت اور رواداری سے کام چلتا ہے۔ اگر ہم کسی سے کھچے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم سے نہ کھچا رہے۔ پھر جب دل میں کبیدگی ہوتی ہے تو وہ دفتری تعلقات میں بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، جس کی ذات سے افسر کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچتا ہے یا جس پر اعتماد ہوتا ہے اس کا لحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے۔ ایسے بے غرضوں سے کیوں کسی کو ہمدردی ہونے لگی۔ افسر بھی انسان ہیں۔ اس کے دل میں جو اعزاز و امتیاز کی ہوس ہے وہ کہاں پوری ہو۔ جب اس کے ماتحت ہی فرنٹ رہیں۔ آپ نے جہاں ملازمت کی وہیں سے نکالے گئے۔ کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے۔ یا تو افسروں سے لڑ گئے۔ یا کام کی کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعویٰ ہے۔ آپ کے کئی بھائی بھتیجے ہیں۔ وہ کبھی آپ کی بات بھی نہیں پوچھتے مگر آپ برابر ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ ان کے ایک بھائی صاحب آجکل تحصیلدار ہیں۔ گھر کی جائداد انھیں کی نگرانی میں ہے۔ وہ شان سے رہتے ہیں۔ موٹر خرید لی ہے۔ کئی نوکر ہیں۔ مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہوئی

میں نے کہا اپنے برادر مکرم سے کیوں نہیں مانگتے۔ کہنے لگے کیوں انھیں پریشان کروں۔ آخر انھیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے۔ کون سی ایسی بچت ہوجاتی ہو گی۔ میں نے بہت مجبور کیا تو آپ نے خط لکھا معلوم نہیں خط میں کیا لکھا۔ لیکن روپے نہ آنے تھے نہ آئے۔ کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا کچھ جواب آیا حضور کے بھائی صاحب کے دربار سے؟ آپ نے ترش ہو کر کہا ابھی ایک ہفتہ تو خط پہنچے ہوئے ابھی کیا جواب آسکتا ہے۔ ایک ہفتہ اور گذرا۔ اب آپ کا یہ حال ہے کہ مجھے کوئی بات چیت کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں۔ باہر سے آتے ہیں تو خوش خوش کوئی نہ کوئی شگوفہ لئے ہوئے۔ میری خوشامد بھی خوب ہو رہی ہے۔ میرے میکے والوں کی تعریف بھی ہو رہی ہے۔ میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی۔ یہ ساری دلجوئیاں محض اس لئے تھیں کہ آپ کے برادر مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں۔ سارے ملکی، مالی، اخلاقی، تمدنی، مسائل میرے سامنے بیان کئے جاتے تھے۔ اتنی تفصیل اور شرم کے ساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جائے۔ محض اس لئے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملے لیکن میں کب چوکنے والی تھی۔ جب پورے دو ہفتہ گذر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آپہنچی تو میں نے پوچھا کیا ہوا۔ تمہارے بھائی صاحب نے دہن مبارک سے کچھ فرمایا۔ یا ابھی تک خط ہی نہیں پہنچا۔ آخر ہمارا حصہ بھی گھر کی جائداد میں کچھ ہے یا نہیں؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں؟ پانچ سو روپے سال کا نفع نو دس سال قبل تھا۔ اب ایک ہزار سے کم نہ ہوگا۔ کبھی ایک جھنجھی کوڑی بھی ہمیں نہیں ملی۔ موٹے حساب سے ہمیں دو ہزار ملنا چاہیئے۔ دو ہزار نہ ہو۔ ایک ہزار ہو، پانچ سو ہو۔ ڈھائی سو ہو۔ کچھ نہ ہو تو بیمہ کمپنی کے پریمیم بھر کو تو ہو۔ تحصیلدار کی آمدنی ہماری آمدنی کی چوگنی ہے۔ رشوتیں بھی لیتے ہی ہیں۔ تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے۔ آپ ہیں ہیں ہاں ہاں کرنے لگے۔ یہ بیچارے گھر کی مرمت کراتے ہیں۔ عزیز و اقارب کی مہمان داری کا بار بھی تو انھیں پر ہے۔ خوب! گویا جائداد کا منشا محض یہ ہے کہ اس کی کمائی اسی میں صرف ہوجائے۔ اس بھلے آدمی کو بہانے گھڑنے بھی نہیں آتے۔ مجھ سے پوچھتے میں ایک نہیں، ہزار بتادیتی

کہہ دیتے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا اثاثہ جل کر خاک ہو گیا۔ یا چوری ہو گئی۔ چور نے گھر میں تنکا تک نہ چھوڑا۔ یا دس ہزار کا غلہ خریدا تھا اس میں خسارہ ہو گیا، گھاٹے سے بیچنا پڑا۔ یا کسی سے مقدمہ بازی ہو گئی، اس میں دیوالہ پٹ گیا۔ آپ کو سوجھی بھی تو بچری بات۔ اس جولانی طبع پر آپ مصنف اور شاعر بھی بنتے ہیں۔ تقدیر ٹھونک کر بیٹھ رہی۔ پڑوس کی بیوی سے قرض لئے تب جا کر کام چلا۔ پھر بھی آپ بھائی بھتیجوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں ہم میں آگ لگ جاتی ہے۔ ایسے برادران یوسف سے خدا بچائے!

خدا کے فضل سے آپ کے دو بچے ہیں۔ دو بچیاں بھی ہیں۔ خدا کا فضل کہوں یا خدا کا قہر کہوں۔ سب کے سب اتنے شریر ہو گئے ہیں کہ معاذ اللہ۔ مگر کیا مجال کہ یہ بھلے مانس کسی بچے کو تیز نگاہ سے بھی دیکھیں۔ رات کے آٹھ بج گئے ہیں، بڑے صاحبزادے ابھی گھوم کر نہیں آئے میں گھبرا رہی ہوں۔ آپ اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جھلائی ہوئی آتی ہوں، اور اخبار چھین کر کہتی ہوں جا کر ذرا دیکھتے کیوں نہیں لونڈا کہاں رہ گیا۔ نہ جانے تمہارے دل میں کچھ قلق ہے بھی یا نہیں۔ تمہیں تو خدا نے اولاد ہی ناحق دی۔ آج آئے تو خوب ڈانٹنا۔ تب آپ بھی گرم ہو جاتے ہیں۔ ابھی تک نہیں آیا! بڑا شیطان ہے۔ آج بچا آتے ہیں تو کان اکھاڑ لیتا ہوں۔ مارے ہنٹروں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ یوں بگڑ کر، طیش کے عالم میں آپ اس کی تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ اتفاق سے آپ اُدھر جاتے ہیں، اِدھر لڑکا آجاتا ہے۔ میں کہتی ہوں تو کدھر سے آگیا۔ وہ بیچارے تجھے ڈھونڈھنے گئے ہوئے ہیں۔ دیکھنا آج کیسی مرمت ہوتی ہے یہ عادت ہی چھوٹ جائے گی۔ دانت پیس رہے تھے۔ آتے ہی ہوں گے۔ چھڑی بھی ہاتھ میں ہے۔ تم اتنے شریر ہو گئے ہو کہ بات نہیں سنتے؟ آج قدر عافیت معلوم ہو گی۔ لڑکا سہم جاتا ہے اور لیمپ جلا کر پڑھنے لگتا ہے۔ آپ ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتے ہیں۔ حیران و پریشان، اور بدحواس۔ گھر میں قدم رکھتے ہی پوچھتے ہیں آیا کہ نہیں؟ میں ان کا غصہ بھڑکانے کے ارادے سے کہتی ہوں۔ آکر بیٹھا تو ہے۔ جا کر پوچھتے کیوں نہیں؟ پوچھ کر

ہارگئی کہاں گیا تھا۔ کچھ بولتا ہی نہیں۔

آپ گرج پڑتے ہیں۔ منّو۔ یہاں آؤ۔

لڑکا تھر تھر کانپتا ہوا آ کر آنگن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں بچیاں گھر میں چھپ جاتی ہیں کہ خدا جانے کیا آفت نازل ہونے والی ہے۔ چھوٹا بچہ کھڑکی سے چوہے کی طرح جھانک رہا ہے۔ آپ جامہ سے باہر ہیں، ہاتھ میں چھڑی ہے۔ میں بھی وہ غضبناک چہرہ دیکھ کر پچھتانے لگتی ہوں کہ کیوں ان سے شکایت کی۔ آپ لڑکے کے پاس جاتے ہیں۔ مگر بجائے اس کے کہ چھڑی سے اس کی مرمت کریں آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بناوٹی غصہ سے کہتے ہیں، تم کہاں گئے تھے جی۔ منع کیا جاتا ہے، مانتے نہیں ہو۔ خبردار جواب اتنی دیر کی۔ آدمی شام کو گھر چلا آتا ہے یا اِدھر اُدھر گھومتا ہے؟

میں سمجھ رہی ہوں کہ یہ تمہید ہے۔ قصیدہ اب شروع ہوگا۔ گریز تو بری نہیں لیکن یہاں تمہید ہی خاتمہ ہو جاتی ہے۔ بس آپ کا غصہ فرو ہو گیا۔ لڑکا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے اور غالباً خوشی سے اُچھلنے لگتا ہے۔

میں احتجاج کی صدا بلند کرتی ہوں۔ "تم تو جیسے ڈر گئے۔ بھلا دو چار طمانچے تو لگائے ہوتے۔ اسی طرح تو لڑکے شیر ہو جاتے ہیں۔ آج آٹھ بجے آیا ہے کل نو کی خبر لیگا۔ اس نے بھی دل میں کیا سمجھا ہوگا۔"

آپ فرماتے ہیں۔ "تم نے سنا نہیں میں نے کتنے زور سے ڈانٹا۔ بچہ کی روح ہی فنا ہو گئی ہو گی۔ دیکھ لینا جو پھر کبھی دیر میں آئے۔"

"تم نے ڈانٹا تو نہیں، ہاں آنسو پوچھ دیئے۔"

آپ نے ایک نئی اُپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہو جاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں لڑکوں کو آزاد رہنا چاہیئے۔ ان پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہیئے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشوونما میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ

لڑکے شتر بے مہار بنے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک منٹ بھی کتاب کھول کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی گلی ڈنڈا ہے،
کبھی گولیاں، کبھی کنکوے۔ حضرت بھی انھیں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ چالیس سال سے تو متجاوز
آپ کی عمر ہے مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا۔ میرے باپ کے سامنے مجال تھی کہ کوئی لڑکا کنکوا
اُڑالے یا گلی ڈنڈا کھیل سکے۔ خون پی جاتے۔ صبح سے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جاتے۔ سکول سے
جونہی لڑکے واپس آتے پھر لے بیٹھتے۔ بس شام کو آدھ گھنٹے کی چھٹی دیتے۔ رات کو [illegible]

جیسے باپ کا بھلا لڑکوں پر کیا رُعب ہو سکتا ہے۔ اباجان کے سامنے میرے بھائی سیدھے آنکھ
اٹھا کر دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی قیامت آجاتی تھی۔ انھوں نے گھر میں قدم
رکھا اور خموشی طاری ہوئی۔ ان کے روبرو جاتے ہوئے لڑکوں کی جان نکلتی تھی اور اسی تعلیم کی
یہ برکت ہے کہ سبھی اچھے عہدوں پر پہنچ گئے۔ صحت البتہ کسی کی بہت اچھی نہیں ہے۔ تو اباجان
کی ہی صحت کون بہت اچھی تھی۔ بیچارے ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتے۔ پھر لڑکوں
کی صحت کہاں سے اچھی ہو جاتی۔ لیکن کچھ بھی ہو۔ تعلیم و تادیب میں انھوں نے کسی کے
ساتھ رعایت نہیں کی۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحبزادے کو کنکوا اُڑانے کی تعلیم دیتے دیکھا۔ یوں گھماؤ،
یوں غوطہ دو، یوں کھینچو، یوں ڈھیل دو۔ ایسا دل و جان سے سکھا رہے تھے گویا گرو منتر دے رہے
ہوں۔ اس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہوں گے۔ میں نے صاف کہہ دیا تم کون
ہوتے ہو میرے بچوں کو بگاڑنے والے۔ تمھیں گھر سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ نہ ہو۔ لیکن آپ
میرے بچوں کو خراب نہ کیجئے۔ بُرے بُرے شوق نہ پیدا کیجئے۔ اگر آپ انھیں [illegible] انھیں سکتے

پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں۔ چلو چلو، وہاں بڑی بہار ہے، خوب آتشبازیاں چھوٹیں گی، غبارے اڑیں گے۔ ولایتی چرخیاں بھی ہیں۔ ان پر مزے سے بیٹھنا۔ اور تو اور۔ آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے۔ یہ انگریزی کھیل بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ کرکیٹ، فٹ بال، ہاکی ایک سے ایک مہلک۔ گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے۔ مگر آپ کو ان کھیلوں سے بڑی رغبت ہے۔ کوئی لڑکا میچ میں جیت کر آجاتا ہے تو کتنے خوش ہوتے ہیں گویا کوئی قلعہ فتح کر آیا ہو۔ حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کسی لڑکے کو چوٹ لگ گئی تو کیا ہوگا ہاتھ پانوں ٹوٹ گیا تو بیچاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی۔

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی۔ آپ کو یہ ضد تھی کہ جہیز کے نام کانی کوڑی بھی نہ دیں گے، چاہے لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔ آپ اہل دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں، پھر بھی چشم بصیرت نہیں کھلتی۔ جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے، اس وقت تک یہ رسم فنا نہیں ہوسکتی۔ دو چار افراد بھلے ہی ایسے بیدار مغز نکل آئیں جو جہیز لینے سے احتراز کریں، لیکن اس کا اثر عام حالات پر بہت کم ہوتا ہے اور برائی بدستور قائم رہتی ہے۔ جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لئے بھی بیس پچیس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھا جائے گا اس وقت آپ ہی آپ یہ رسم رخصت ہو جائے گی۔ میں نے جہاں جہاں پیغام دیئے جہیز کا مسئلہ پیدا ہوا اور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑائی۔ جب اس طرح ایک پورا سال گذر گیا اور لڑکی کا سترہواں سال شروع ہو گیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کرلی۔ حضرت بھی راضی ہو گئے۔ کیونکہ ان لوگوں نے قرارداد نہیں کی۔ حالانکہ دل میں انھیں پورا یقین تھا کہ اچھی رقم ملے گی اور میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی شادی کے بہ خیر و عافیت انجام پانے میں کوئی شبہہ نہ تھا۔ لیکن ان مہاشے کے آگے میری ایک چلتی تھی۔ یہ رسم بیہودہ ہے۔ یہ رسم بے معنی ہے۔ یہاں روپیہ کی کیا ضرورت؟ یہاں گیتوں

کی کیا ضرورت؟ ناک میں دم تھا۔ یہ کیوں، وہ کیوں؟ یہ تو صاف چھیڑ ہے۔ تم نے میرے مُنہ
میں کالک لگا دی۔ میری آبرو مٹا دی۔ ذرا خیال کیجئے بارات دروازے پر پڑی ہوئی ہے
اور یہاں بات بات پر ردّ و قدح ہو رہی ہے۔ شادی کی ساعت رات کے بارہ بجے تھی
اس دن لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں۔ میں نے بھی برت رکھا۔ لیکن آپ کو ضد تھی
کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب لڑکے کے والدین برت نہیں رکھتے تو لڑکی کے والدین
کیوں رکھیں۔ میں اور سارا خاندان ہر چند منع کرتا رہا لیکن آپ نے حسب معمول ناشتہ کیا۔
کھانا کھایا۔ خیر۔ رات کو شادی کے وقت کنیا دان کی رسم آئی۔ آپ کو کنیا دان کی رسم
پر ہمیشہ سے اعتراض ہے۔ اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں۔ لڑکی دان کی چیز نہیں۔ دان روپے
پیسے کا ہوتا ہے۔ جانور بھی دان دیے جا سکتے ہیں۔ لیکن لڑکی کا دان ایک لچر سی بات ہے
کتنا سمجھاتی ہوں صاحب، پرانا رواج ہے۔ شاستروں میں صاف اس کا حکم ہے۔ عزیز
اقارب سمجھا رہے ہیں مگر آپ ہیں کہ کان پر جوں نہیں رینگتی۔ کہتی ہوں دنیا کیا کہے گی؟ یہ لوگ
کیا بالکل لامذہب ہو گئے۔ مگر آپ کان ہی نہیں دیتے۔ پیروں پڑی۔ یہاں تک کہا کہ بابا
تم کچھ نہ کرنا۔ جو کچھ کرنا ہوگا میں کرلوں گی تم صرف چل کر منڈپ میں لڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ۔
اور اسے دعا دو۔ مگر اس مرد خدا نے مطلق سماعت نہ کی۔ آخر مجھے رونا آگیا۔ باپ کے ہوتے
میری لڑکی کا کنیا دان چچا یا ماموں کرے، یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے تنہا کنیا دان کی رسم
ادا کی۔ آپ گھر میں جھانکے تک نہیں۔ اور لطف یہ کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے۔ بارات
کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں۔ جھک مار کر مجھی کو منانا پڑا۔

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے
لئے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انھیں پیار کرتی ہوں۔ ان میں
وہ کون سی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر کوئی چیز ہے ضرور جو
مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے۔ وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو میں بے چین

نہ دیکھوں۔ یہ فرض کی بیڑی نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔ یہ رواجی وفاداری بھی نہیں ہے۔ بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں، کچھ ایسی صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہیں گویا کسی مشین کے کل پُرزے گھس گھسا کر فٹ ہو گئے ہوں۔ اور ایک پُرزے کی جگہ دوسرا پُرزہ کام نہ دے سکے چاہے وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول اور نیا اور خوشنما کیوں نہ ہو۔ جانے ہوئے رستے سے ہم بے خوف، آنکھیں بند کئے چلے جاتے ہیں۔ اس کے نشیب و فراز، موڑ اور گھماؤ، سب ہماری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس کسی انجان رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہو سکتا ہے۔ قدم قدم پر گمراہ ہو جانے کے اندیشے۔ ہر لمحہ چور اور رہزن کا خوف! بلکہ شاید آج ہم ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں۔

افلاطون کی وصیّت

معلمین اور متعلمین کے لئے

مشہور و معروف یونانی فلسفی "افلاطون" کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں آج اس کی وصیت و نصیحت جو استادوں شاگردوں اور طلبہ کے سرپرستوں کے لئے بہت کارآمد ہے پیش کی جارہی ہے۔ یہ وصیت اس قابل ہے کہ لوگ اسے دستورالعمل قرار دیں۔ وہ کہتا ہے کہ :-

"میں نہ تو اہلِ فلسفہ و حکمت اور ماہرینِ فن بلاغت کے اعلیٰ طبقے کی جماعت کو خطاب کرتا ہوں اور نہ اس سے کمتر طبقے کے لوگوں سے میرا خطاب ہے۔ بلکہ میرا روئے سخن ان دونوں طبقوں کے درمیانی گروہ کی طرف ہے

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ پر خود اپنے نفس کی اصلاح و تذکیر اور علم و ادب کے لئے ترغیب و تحریص لازم ہے۔ بجائے اس کے کہ میں کسی دوسرے شخص کو اپنی اصلاح و تہذیب کی ضرورت کا احساس دلاؤں، عقلاً یہ ضروری ہے کہ میں خود اپنے نفس کو اپنے نفع و نقصان کا مخاطب قرار دوں۔ جب میں ایسا کروں گا تو ارباب علم و ادب سے بہرہ مند ہو سکوں گا۔

کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ میں اپنے آپ کو نہیں پہچانتا، میں نہ حکیم ہوں نہ دانا اور نہ علم و تعلیم پر حاوی۔ میں اب تک ادب و حکمت کا طالب ہوں، کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میرے بعد فصیح و بلیغ صاحب تحریر اور شاہراہِ ہدایت قائم کرنے والا کون ہوگا۔ جو دونوں جماعتوں کو ایک ساتھ مطمئن کردے، اعلیٰ طبقہ (علماء و حکماء کی جماعت) بھی خوش رہے اور ادنیٰ طبقے کی تعلیم و تادیب بھی ہوجائے۔ نہ اُن کے ساتھ زیادتی ہو نہ اُن پر سختی، نہ اُن کا کسی خیال سے اکرام کرے، نہ اُن کے ساتھ زجر و توبیخ سے ذلت کا سلوک کرے نہ ان لوگوں میں گھل مل کر قرابت کا سا رویہ

اختیار کرے ، نہ ان کے ساتھ تساہل وغفلت اور بے رُخی کا برتاو کرے ۔ بلکہ دونوں گروہوں کے ساتھ مساوات اختیار کرے یعنی اپنے علو مرتبت وشان ریاست (سرداری) کو میری تعلیم کے مطابق قائم رکھے اور اُن کو اس بات کی تعلیم دے جو میں نے بتلائی ہے ۔

تادیب وتعلیم کے مدعیو! اگر تم دلبستان ادب کے سرتاج معلم بننا چاہتے ہو تو میری وصیت کو سمجھو۔ جو میں تم کو لکھ کر دیتا ہوں ۔ تمھارے اخلاق تلامذہ وطلبہ کے ساتھ بلا زیادت و نقصان نہایت صحیح ومستقیم ہونے چاہئیں ۔ قسم ہے اللہ کی جس نے ہر علم وادب کو پیدا کیا ہے میں تم سے حلف لیتا ہوں کہ تم حد سے ہرگز متجاوز نہ ہونا ۔ اپنی عادات کو پاکیزہ بناؤ اور اپنے علو مرتبت کا خیال رکھو ۔ روحانی روشنی حقیقی آب وتاب کے مجسمے بن جاؤ ۔ طلبا کے لئے صاف شفاف آئینہ بن جاؤ ، انسانیت ومروت ، تہذیب وفتوّت کے ہادی بنو تاکہ وہ تہذیب و فتوّت حاصل کرلیں ۔ بُری باتوں ، مصیبت والام ، موت وفنا کا سبب بن جانے والی خواہشوں سے ان کو باز رکھو اور تم شہوت مذمومہ اور ارتکاب خطایا سے باز رہو ۔ اُن سے خندہ پیشانی سے ملنے اور شیریں زبانی سے گفتگو کرنے میں بخل نہ کرو ۔ ایسی چیز کے پاس نہ جاؤ جو تمھاری ملامت کا باعث ہو ! اور نہ تم کسی مذموم عادت کا سبب بنو کہ جس کی وجہ سے تمھارے شاگرد تمھارے ساتھ جسارت ودلیری سے پیش آئیں ۔ تم ان کو اپنے ساتھ کھانا کھانے کی جرأت نہ دلاؤ ۔ کسی ناپسندیدہ ، مکروہ بات کا ان کے سامنے ذکر نہ کرو ۔ اُن کے ساتھ تمھارا برتاؤ رازداری کا ہرگز نہ ہونا چاہیئے جب تم ان کو تعلیم دو تو ایسا کلام نہ کرو جو حاضرین (طلبا) کی جماعت سے پوشیدہ رہنے والا ہو ۔ دھوکا اور فریب کے ساتھ اُن کو تعلیم مت دو ۔ انعام واکرام کے ساتھ ان کا تقرب حاصل نہ کرو ۔ ان کے سامنے مت ہنسو ۔ اُن کے ساتھ اُن کے استحقاق کے مطابق برتاؤ کرو ۔ ان کو سکھاؤ کہ وہ اپنے علمی مراتب سے تنزل نہ کریں ۔ ورنہ تم بھی ان کی تعلیم میں اپنے مرتبے سے تنزل کر جاؤ گے ۔ رات کے خواب ، زوال پذیر نعمت و دولت اور فانی لذتوں کے ساتھ محفلیں قائم نہ کرو ، ورنہ تمھاری ذات کا خلوص اور تعلیم کا وقار

جاتا رہے گا۔ تم ان سے حیا کرو۔ عیوب سے بچو اور توقیر اختیار کرو۔ تم کو اور تمھارے شاگردوں کو بھی چاہیئے کہ اس بیش قیمت پند و نصیحت پر عمل کر کے اپنے آپ کو لعن طعن۔ جرح قدح سے محفوظ کرلیں تم ان کو اپنی اور اپنے ہم پیشہ لوگوں کی نیز دوسرے اشخاص کی اکرام و اعزاز کے ساتھ خدمت کرنے کا عادی بناؤ اور تم ان کو اس سے نہ روکو۔

تم ان کو موقع و محل پر ادب کی تعلیم دو اور صحیح طور پر سمجھ بوجھ کر یہ شک و شبہ نہ ہو کہ تم نے ان کے ساتھ کوئی بے جا روش اختیار کی ہے۔ مبادا کہ تم اپنے علو مرتبہ سے تنزل کر جاؤ طلباً میں سے جسارت کرنے والوں کے ساتھ والدین کی طرح نرم دلی نہ اختیار کرو اور نہ اس سے عزیز و اقارب جیسی محبت کرو۔ بلکہ اجنبی کی طرح بالکل ابتدائی تعلق سمجھ کر سیاست و تہذیب دینی چاہیئے۔ اور تکلیف و مشقت کے ساتھ ان سے مواخذہ کرنا چاہیئے۔ اگر ان کے عزیز و اقارب میں سے کوئی اس سیاست و تادیب و گرفت سے منع کرے اور تم سے رحم دلی اور نرمی کی درخواست کرے تو اس کو اپنے پاس سے نکال دو۔

تمھاری اصلاح و سزا غصہ اور بدحواسی کی حالت میں نہ ہو اور نہ تم اُن کو اپنی بے التفاتی اور نامہربانی کی وجہ سے بے کار چھوڑ دو۔ تمھارے سلوک کی رفتار غیر منظم، بے ترتیب نہ ہونی چاہیئے اور نہ ان کو بغیر کسی قاعدے کی پابندی کے آزاد چھوڑ دینا چاہیئے۔ تم ان کے اجسام اور خط و خال پر نظر تامل کرنے سے اجتناب کرو۔ جب کبھی ان سے محبت کرنے لگو اور ان پر تمھاری مہربانی زیادہ ہونے لگے تو تم ان کو بجائے دشمن کے خیال کرو اور وقعت و بزرگی کا لحاظ رکھ کر ان کو روحانی حقیقی تعلیم دینا یاد رکھو۔ اور ضرورت کے وقت لطیف اور عمدہ دواؤں سے ان کا علاج کرو تاکہ ان کے ذہن صاف اور روشن ہو جائیں اور جو علم تم ان کو سکھانا چاہتے ہو وہ ان کے واسطے باعثِ فخر و عزت ہو۔ ان کو باقلا، لوبیا، پیاز، لہسن جیسے نسیان پیدا کرنے والے کھانوں سے پرہیز کرنے کا عادی بناؤ اور سمیات کے استعمال سے بھی، نیز اس قسم کے اور کھانوں سے بھی ان کو باز رکھو مقررہ اوقات کے اندر عمدہ لطیف غذا کی معین مقدار کھانے کا پابند بناؤ۔ کھانے کی حرص

اور نشے سے ان کو بچاؤ ۔ ان کی علمی حالت کے موافق عمل میں حد اعتدال سے تجاوز نہ کرنے دو بدکاری کی طرف مائل کرنے والی اور مہلک شہوانی نظر سے ان کو باز رکھو ، بھدی نامعقول تیز رفتار سے چلنے کی ممانعت کرو ۔

ان ہی میں سے ایک نائب استاد (مانیٹر) ان پر مقرر کرو ۔ جو ان پر مناسب طور سے نگران رہے ۔ اور وہ سب سے متقدم (اعلیٰ) ہونا چاہیئے ۔ خواہ وہ غنی ہو یا فقیر ، وجیہہ و شکیل ہو یا بدشکل ، بے عقل خوب صورت کا خیال نہ کرنا چاہیئے بلکہ عقل و دانش کو مقدم سمجھنا چاہیئے ۔ اُن نوجوان طلباء کا مانیٹر ایسا ہونا چاہیئے جس پر وثوق و اعتماد کیا جاسکے ۔ جو ذکی سمجھ دار بارعب ہو اس کی شہرت ، بدسلوکی ، بدمعاملگی ، بدباطنی سے داغ دار نہ ہو ، بدافعال شخصوں کو مانیٹر نہ بناؤ بلکہ اُن سے دور رہو ۔ جب تم کو خوش قسمتی سے ، صفات حسنہ و اخلاق فاضلہ سے مزین و آراستہ مانیٹر مل جائے تو اس وقت مناسب ہے کہ تم طلباء کا روپیہ پیسہ ، زرامانت اور ان کی چیزیں اس کے سپرد کر دو کہ وہ انتظام کے ساتھ اُن کے لئے تصرف میں لائے ۔

تم کو اپنے ہر طالب علم کے لئے مناسب تعلیم کا فیصلہ کرنا چاہیئے ۔ تمھاری تعلیم ان کے لئے امتیاز و تربیت کے خلاف نہ ہو ، ان پر ان کی طاقت کے مطابق بار ہونا چاہیئے ۔ جبر و اکراہ اور تکلیف مالایطاق سے ان کے دلوں کو مردہ مت بناؤ ۔ ان میں سے ہزار ہزار ، سَو سَو ، پچاس پچاس ، دس ، دس پر نائب استاد مقرر کرو ۔ جو اپنے طلباء پر امر و نہی کا مختار ہوگا اور اگر کبھی کوئی نائب علم و ادب کے راستے سے ہٹ کر اپنے طلباء کو ایسے کام کی ہدایت کرے جس کا وہ خود عامل نہیں ۔ تو اس کو معزول کر کے دوسرے کو اس کی جگہ قائم کرنا چاہیئے ۔ حزم و احتیاط کے یہ بات خلاف ہے کہ کسی خائن اور جھوٹے پر اعتماد کیا جائے ۔ اور جو شخص عمداً کسی کی جان لے لے اس کا بھی عذر قبول نہیں کرنا چاہیئے ۔ اگر کسی نوجوان سے لغزش ہو جائے تو معاف کر دینا چاہیئے اور تین مرتبہ تک یہ معافی ہو سکتی ہے ۔ تین دفعہ غلطی کے بعد اس کو طلباء کی جماعت سے خارج کر دیا جائے اور اس کی آمد و رفت بند کر دی جائے تاکہ اور نوجوان اس سے متاثر نہ ہو سکیں ۔

علم و ادب کو دوست رکھنے والے بھائیو! میری وصیت سنو اور یاد رکھو، میں بھی تمہاری طرح علم و حکمت کا شیدائی ہوں، میں تم کو ایک آسان مقالہ لکھ کر دیتا ہوں جس میں تم کو ہر عمدہ علم وفن حاصل کرنے کا راستہ بتاؤں گا جس سے ہر متعلم لطف اندوز ہوگا۔

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ علم کی تحصیل شروع کرنے سے پہلے تم کو بالکل پاک باطن اور صاف دل ہونا چاہیئے نہ تم میں کسی طرح کا عیب ہو۔ کیوں کہ ناپاک اشیا پاک صاف چیزوں کے ساتھ، اور پاک چیزیں ناپاک کے ساتھ نہیں مل سکتیں۔ ناپاک لوگوں کو تعلیم مت دو۔ بلکہ پاک صاف نیک طبع لوگوں کو زیور علم سے آراستہ کرو۔ عیب دار، کور باطن شخص کو پاک باطن، صاف دل انسان کے پاس بھی نہ آنے دیا جائے۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ صاف لطیف اور شیریں پانی کا ایک گلاس متعفن کالی مٹی کے گھڑے کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ نیز کم زور آشوب زدہ نگاہ سورج کی شعاعوں کی تاب نہ

ارتکاب معصیت سے آلودہ ہو۔ علم و حکمت اور اللہ عزوجل سے تشبہ (بفحوائے "تخلقوا باخلاق اللہ") افعال حسنہ و اخلاق نا صفر کے رہنما اور عقل و دانش کا معلم ہے۔

حسد سے بچو! یہ نفاق و شقاق، جدائی و افتراق پیدا کرنے والی چیز ہے۔ تمہارا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تواضع کا سلوک ہونا چاہیئے۔ کمال محبت کے اندر مساوات اختیار کرنی چاہیئے اپنے نفسوں کو اللہ کی طرف جھکا دو اور عقلائے کاملین اور فضلائے عالمین کی اطاعت کرو جو اپنے افعال و اعتدال اور صبر و قناعت کی وجہ سے عظمت کا کامل استحقاق رکھتے ہیں۔

آباؤ اجداد پر فخر کرنے والے ناقابل اعتماد ہیں۔ ایسی اولاد ہیں کہ اپنے بزرگوں سے تہذیب نفس کا علم اور دیگر ضروریات و لوازم سے واقفیت حاصل کرنے میں قاصر رہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ طلباء کے سامنے آبائی ورثہ کے بلا استحقاق مدعی بنتے ہیں۔ یہ لوگ ظالم ہیں، علم و حکمت

کے دشمن ہیں۔ شیطان کے جال میں پھنسانے والے ہیں ان سے اجتناب لازم ہے۔ تم میں سے ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے رفیق کو اپنے جیسا سمجھے۔ اس کو رازداری کا اہل خیال کرے۔ ہر ایک پر دوسرے کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت ضروری ہے تاکہ آپس میں رازداری بلاخوف وخطر ہو سکے۔

" سننے والے اطاعت شعار، حق و حکمت کے طالب و پرستار، حق کی طرف سے برسرِ پیکار، صدق و راستی کے دوست دار بنو، اوقات وازمنہ اور ان کے اختلافات کا علم حاصل کرو، صلاح وسکون، سلامتی و اطمینان کے قیام کے واسطے معتمد مرکز بن جاؤ۔ نیک لوگوں کی باتیں کیا کرو۔ ان کی ظاہری و باطنی بصیرت سے متواضع ومنکسر ہوکر بینائی حاصل کرو، متکبر مت بنو، خداؤں (معبودوں) کی سی رفعت حاصل کرو، ہمیشہ ترک لذات کا سبق دیتے رہو۔ روحانیت وحقائق کے اندر تدبر و تفکر کیا کرو۔ ایسا کلام اختیار کرو جو دائمی حیات کا باعث ہو۔ فضائل ومحاسن سے تمسک کرو تکبر کا بارگراں اپنے کندھوں پر نہ اُٹھاؤ۔ اپنے مراتب سے تجاوز نہ کرو۔ جھوٹی تعریف اور غیر واقعی باتوں سے اپنی شان کا اظہار نہ کرو۔ فخر و مباہات سے اپنی عظمت قائم نہ کرو، سرکش جابر لوگوں کے اخلاق سے دور رہو۔ تم اپنی کم علمی و نادانی سے بے خبر غافل نہ رہو۔ جو کچھ تم سکھلاتے ہو اس سے کامل طور پر واقف بنو اپنے حدود سے تجاوز کرنے کی جرأت نہ کرو بے حقیقت باتوں پر مت جھگڑو۔ غلط اور لغو باتیں اختیار نہ کرو۔

شہوات قبیحہ سے بچو۔ ایسی خواہشات کی طرف رجحان نفس و میلانِ طبع کو روکو، علمی کتابوں کا مطالعہ لازم سمجھو، اور کبھی مطالعے سے مکدر و بددل نہ ہو۔ حکماء علماء کے سامنے کامل سکوت وسکون اختیار کرو۔ اپنے والد اور بزرگوں کا خوف وادب ملحوظ رکھو۔ اپنی ماؤں کا اکرام واحترام کرو آرام طلبی و کاہلی اور نیند اور سستی نہ پسند کرو۔ خیر و شر میں امتیاز، نفع و نقصان میں فرق کرو۔ جب تک تم سے سوال نہ کیا جائے جواب نہ دو۔ جھگڑے قضیوں سے بچو لطیف غذائیں

استعمال کرو۔ کھانے کی حرص سے گریز کرو۔ مسکرات و نشہ آور چیزوں سے باز رہو بلکہ معارف وحکم اور علم وادب کی دائمی حلاوت پر خور و نوش کی فانی لذت کو ترجیح نہ دو۔ اور شراب خوری کی حرص نہ کرو۔ تمھارے کھانے کے اوقات مقرر ہونے چاہئیں۔ اگر ممکن ہو تو کھانے میں شہد بھی استعمال کرو۔

"اللہ عزوجل کا ذکر بہت کیا کرو۔ اس کے احسانات کو فرداً فرداً بھی اور مجتمع ہو کر بھی یاد کیا کرو۔ اپنے سے بڑے اور زیادہ عمر والے کے سامنے اپنی آواز بلند نہ کرو۔ ان سے کلام و گفتگو میں جرح و قدح نہ کرو، ان کے سامنے لغو باتوں کے لئے اپنی زبان کو آزادی نہ دو۔ دوسروں کی برائیوں کو اپنا مشغلہ نہ بناؤ۔ تم اپنے آپ کو عاقل و دانش مند نہ سمجھو۔ بلکہ دوسرے خود تمھاری دانش وحکمت کی شہادت دیں گے۔ جب کبھی تمھاری بات صحیح و درست اور تمھاری دلیل قوی ہو جائے تو اپنے دل میں خوش نہ ہو۔ اور مخالف پر غالب آجانے سے فخر نہ کرو۔"

"تنہائی و وحدت کے اندر سکون و اطمینان اختیار کرو، رفعت و سرداری کی خواہش نہ کرو۔ اگر کوئی شخص تمھاری تعظیم و تکریم کرے تو تم اپنے دل میں متواضع اور منکسر بنو۔ اگر کوئی ذمہ دار حاکم شخص تم کو کسی کام کا ذمہ دار بنائے تو تم اس کام کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دو غصے کو پی جانا اپنی عادت بناؤ، غیظ وغضب کو جلدی اختیار نہ کرو۔ عزت نفس و خودداری کا خیال رکھو۔ اس کی وجہ سے تم کو عظمت حاصل ہوگی، کوئی کام غیظ وغضب کی حالت میں نہ کرو۔ دوستوں کا دوستی سے پہلے امتحان کر لو۔ آزمائش سے قبل دوست نہ بناؤ۔"

"بازاروں میں کھڑا ہونا معیوب سمجھو۔ اگر تم بازار نہ جانے کا انتظام کر سکو تو ضرور کرو، کیوں کہ بازار، آبادی اور شہر کے گھورے ہیں۔ اور وہاں انسان کو کوئی پاک صاف چیز نہیں ملتی۔ عوام خصوصاً بازار کے لوگوں کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ وہ لوگ بے خبر، بے عقل، سفلے ہیں ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ صحیح علم حقیقی معرفت سے بے بہرہ ہیں۔ اپنے اسرار و بھید کسی کو نہ بتاؤ۔ حکام سے تواضع کے ساتھ بات کرو۔ بلکہ ہر شخص کے لئے جھک جاؤ۔ متواضع

ہوجاؤ، لوگوں کے ساتھ میل جول کم رکھو، تم سب آرام سے رہوگے۔ تم کو اگر تکلیف ہوگی تو جان پہچان والوں ہی سے ہوگی۔ اس دنیا کی عارضی عزت وشوکت جو اکثر لوگوں کی نگاہ میں بہت بڑی چیز ہے تمہارے دل میں اس کی وقعت بالکل نہ ہونی چاہیئے۔ جب کسی انسان کا کوئی فعل تم کو ناگوار معلوم ہو تو اس کو اسی وقت متنبہ کردو، دورخی مت اختیار کرو، تمہاری محبت میں چاند کی روشنی کے اختلاف وانقلاب کی طرح تلون وتغیر نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ سورج کی روشنی کی طرح قائم ودائم بلا زیادت ونقصان رہنا چاہیئے۔ احکام کے اندر لوگوں کی طبیعت کا خیال نہ کرو بلکہ عاقلانہ بلاخوف وخطر حکم بنو، جو تمہاری نظروں سے غائب ہیں اُن کی برائی مت کرو۔ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے قسم نہ کھاؤ، تم سلاطین وملوک کے زمرے میں مت رہو اگر وہ تمہارے حق میں غاصب ہیں۔ تم کو بوڑھا ضعیف اور ذہن وحافظہ کو خراب کرنے والے لہو ولعب سے بچنا چاہیئے ہنسی کی مداومت سے دور رہو اور ایسے لوگوں کی مجالست سے اجتناب کرو جو شہوات قبیحہ کو مستحسن ومزین کرکے دکھلاتے ہیں اور اپنی تدبیروں سے غلط کاریوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جو اپنی دسیسہ کاری سے ناقص خواہشات، فاسد خیالات پیدا کرکے تم کو سانپ، اژدہا، سمیات، اور مہلک ادویات پر جرأت دلاتے ہیں ان لوگوں سے بھی دور رہو جو ایسی ایسی عجیب چیزیں دکھلاتے ہیں جن کی حقیقت کچھ نہیں۔ شعبدہ بازی، جادوگری جھاڑ پھونک اور ہنسی دلانے والی باتوں سے بھی بچو، دوست نما دشمن، اور اس بھائی سے بھی بچو جس کے کلام میں صداقت نہیں۔ ضمانت وذمہ داری کا اعتبار نہیں۔ بات کے اندر صواب

" نوجوانوں کو فن حرب کے متعلق صف بندی، نشانہ بازی، بھاگ دوڑ، پہلوانی اور اسلحہ کے استعمال کی ضروری ضروری باتیں معلوم ہونی چاہئیں۔ لیکن ان چیزوں میں انہماک نہ ہونا چاہیئے۔ ان کے لئے گھوڑے کی سواری ضروری ہے۔"

" علم موسیقی کے متعلق بھی کچھ واقفیت مناسب ہو۔ کیونکہ فنون لطیفہ میں سے ایک یہ بھی

ہے ۔ آوازہ لحن کے جوڑ توڑ اور مخارج کی مناسبات اور عود " کے اقسام معلوم کرو ۔ اور دوسرے آلات موسیقی سے بھی کچھ واقفیت ہو جانی چاہیئے ۔ سب سے بہتر " ارغن" ہے جس میں طبائع اربعہ کے لحاظ سے " اسّی " تار ہوتے ہیں"

" دیکھو! جب تم اس تہذیب و حکمت کے زیور سے آراستہ ہو جاؤ اور تم کو اس کی ہدایت و رشد حاصل ہو جائے تو تم علم و ادب کے آسمان پر خورشید جہانتاب و مہر عالمتاب ہو کر چمکو گے پھر تم اس " اللہ " کا شکریہ ادا کرو جو تمام و کل کا مدبر ، ازلی ، قدیم ، حق و انصاف کا قائم کرنے والا ہے جو اس وصیت و نصیحت کے خلاف کرے تو متعلین کے ذمہ دار نگران پر اس کی تادیب واجب ہے کیونکہ ہر خطا کے لئے سزا ضرور ہے ۔ خواہ فوری ہو یا بتاخیر ۔ لیکن فوری سزا اختیار کرنا مناسب ہے ۔ تاکہ لوگوں میں خلل و فساد کا اسبب اور مجادلہ و مقاتلہ کا باعث نہ ہو جائے ۔ ایسے شخص کو نکال دینا چاہیئے اور متعلمین کی جماعت میں نہ شامل ہونے دیا جائے ۔ بلکہ اس کو آرام و چین کی زندگی بھی نہ بسر کرنے دی جائے"

" نوجوانوں کے نظام و تدبیر کے ذمے دار نگراں پر واجب ہے کہ وہ صاف شفاف آئینہ کے مانند ہو ، کیونکہ وہ افسری و سرداری کا ذمہ دار ہے جو اس وصیت پر عمل کرنے سے کوتاہی کرے اس کو تعلیم طلبہ و تادیب متعلمین سے معزول و برطرف ہو جانا چاہیئے "



سانپ کے منہ میں مینڈک نہ اُگلا جائے نہ نگلا جائے۔



اسپین کے ساتھ مدعیانِ ہمدردی کی دستگیری

ورسائی کے معاہدے پر ایک اور ضرب

ورسائی کے معاہدہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ جرمنی دریا بین الاقوامی اختیار میں رہیں گے لیکن ہٹلر نے نومبر ۳۶ء میں اپنے ملک کے سب دریاؤں پر کامل قبضہ کا اعلان کر دیا۔



دنیا کی بڑی طاقتوں کا جنگی ساز و سامان

بحری قوت ۔ ایک جہاز برابر ہے ایک لاکھ ٹن کے

برطانیہ	۱۱۶۱۰۰۰ ٹن
امریکہ	۱۰۷۳۰۰۰ "
جاپان	۸۵۰۰۰۰ "
فرانس	۵۰۲۰۰۰ "
اٹلی	۴۱۶۵۰۰ "
روس	۲۰۰۰۰۰ "
جرمنی	۱۸۰۰۰۰ "

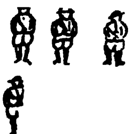
ہوائی طاقت ۔ ایک جہاز برابر ہے ۵۰۰ جہازوں کے

روس	۴۰۰۰
برطانیہ	۳۵۰۰
فرانس	۳۱۰۰
جرمنی	۳۰۰۰
اٹلی	۳۰۰۰
امریکہ	۱۵۰۰
جاپان	۱۰۰۰

بری طاقت

ایک آدمی برابر ہے ایک لاکھ فوج کے

جرمنی سپاہی	۱۲۰۰۰۰۰
روس "	۱۳۰۰۰۰۰
اٹلی "	۷۵۰۰۰۰
فرانس "	۶۶۵۰۰۰
برطانیہ "	۵۴۰۰۰۰
جاپان "	۴۰۰۰۰۰
امریکہ "	۱۴۰۰۰۰



کلامِ آزاد

جناب حکیم الطاف احمد صاحب آزاد انصاری اردو کے نہایت خوش فکر شعراء میں سے ہیں، غزل گوئی میں آپکا پایہ بہت بلند ہے اور اردو کے چوٹی کے غزل گو شعراء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کے کلام کی خصوصیت انتہائی سلاست و روانی کے ساتھ باریک سے باریک فلسفیانہ اور عارفانہ مسائل کا بیان کرنا ہے۔ مگر اس کے باوجود آپ کی غزل، غزل کے حدود سے متجاوز ہو کر وعظ و خطبہ کی صورت نہیں اختیار کرتی اسکی رنگینی اور دلکشی برابر قائم رہتی ہے۔ ذیل میں ہم موصوف کی زیر طبع دیوان سے چند غزلیں منتخب کر کے پیش کرتے ہیں۔ اس انتخاب کا باقی حصہ اگلی اشاعت میں شائع کیا جائے گا۔

حالِ دلِ فگار سنایا نہ جائے گا
زخمِ درونِ سینہ دکھایا نہ جائے گا

ظاہر کا ربط و ضبط بڑھانے سے فائدہ
دل ایسی چیز ہے کہ گنوایا نہ جائے گا

اِک مدعائے واجب الاظہار دل میں ہے
لیکن زبان تک کبھی لایا نہ جائے گا

یارانِ غمگسار کی غمخواریاں فضول
الفت وہ درد ہے کہ بٹایا نہ جائے گا

اب تیری عادتوں کا بدلنا محال ہے
جو ہم نے کھو دیا ہے وہ پایا نہ جائے گا

تیرے ستم جو آج نہ بھولے تو کل سہی
لیکن ترا خیال بھلایا نہ جائے گا

انجامِ کار کا بھی تجھے کچھ خیال ہے
کیا جو ستا رہا ہے وہ ستایا نہ جائے گا

غیروں کے واسطے ہی مسیحائے وقت ہو
ہم کو تو خاک میں بھی ملایا نہ جائے گا

آزاد مفت جان کھپانے سے فائدہ
قسمت کی خوبیوں سے بر آیا نہ جائے گا

کبھی مہرباں ہو کے دل شاد فرما
کبھی قدر خدماتِ آزاد فرما

اگر ہو سکے بھول کر یاد فرما
اگر شاد فرما سکے شاد فرما

کبھی اپنی موجودہ غفلت سے باز آ
کبھی الفتِ ماسبق یاد فرما

یہ خاموشی حیرت افزا کہاں تک
کچھ احباب کے حق میں ارشاد فرما

اسیرانِ الفت بہ تنگ آچکے ہیں
جو خوفِ خدا ہے تو آزاد فرما

کچھ احساس تکلیف شوقِ نہاں کر
کچھ اظہار دردِ خداداد فرما

جو برلا سکے حاجتِ شوق برلا
جو فرما سکے فکرِ امداد فرما

ترے لطف بے انتہا ہیں تو ہونگے
کبھی کوئی تشریح اعدا کو فرما

جہاں تک ہو پامال جور و جفا کر
جہاں تک ہو تکمیلِ بیداد فرما

کہاں تک جنونِ تغافل کہاں تک
کچھ اصلاح طبع خداداد فرما

کبھی شرطِ منصف مزاجی بجا لا
کبھی حق رسیہائے آزاد فرما

شکر ہے کہ دل دے کر یار دلربا پایا
یعنی جس قدر کھویا اس سے کچھ سوا پایا

خنجرِ فنا کھا کر ثمرۂ بقا پایا
زیست کی بنا ڈھا کر زیست کا مزا پایا

جس نے ہر دو عالم کو چشم غور سے دیکھا
اس نے ہر دو عالم سے تم کو ماورے پایا

ہم نے بے نشاں ہو کر آپ کا نشاں ڈھونڈا
ہم نے آپ کو کھو کر آپ کا پتا پایا

شاد رہ کے بھی شاکر رنج سہہ کے بھی شاکر
بندۂ محبت کو بندۂ رضا پایا

ہم کو بتکدے میں بھی شانِ حق نظر آئی
ہم نے بتکدے کو بھی خانۂ خدا پایا

صرف اک غمِ الفت وجہ صد خوشی دیکھا
ورنہ ہر تعلق کو رنج و غم فزا پایا

ہاں متاعِ راحت بھی قیمتی سہی لیکن
جنسِ دردِ الفت کو جنس بے بہا پایا

اے ندیم دور اندیش اپنے عشقِ جاناں میں
یہ نہ پوچھ کیا کھویا اس کو دیکھ کیا پایا

اس میں شک نہیں آزاد شوخ بھی ہے منہ پھٹ بھی
کچھ سہی مگر اس کو آدمی کھرا پایا

سرسبز پھر بہار سے سارا چمن ہوا
معمورِ جلوۂ گل و سرو و سمن ہوا

پھر حکم مے کشی مسرت کا عام ہے
پھر اذن چارۂ غم و رنج و محن ہوا

پھر شیخ دل سے پیرِ مغاں کا مرید ہے
پھر زاہدوں کا نشۂ تقویٰ ہرن ہوا
پھر محو سادہ زاہدِ شب زندہ دار ہے
پھر رہن بادہ خرقۂ زہد کہن ہوا
پھر جام لے کے ساقیِ رنگیں ادا ہوا
پھر گرمِ نغمہ مطربِ گل پیرہن ہوا
پھر صحنِ گلستاں میں بساطِ طرب بچھی
پھر شغلِ مے کشی لبِ نہرِ چمن ہوا
پھر جلسۂ طرب میں غزل خوانیاں چھڑیں
پھر انعقادِ محفلِ شعر و سخن ہوا
پھر چار سمت سرو قدوں کے ہجوم ہیں
پھر اجتماعِ لالہ رخانِ زمن ہوا
پھر ہم زبان ہر صنمِ گل بدن بنا
پھر مہرباں ہر بتِ غنچہ دہن ہوا
پھر اخترِ مقدرِ عالم چمک اٹھا
پھر آفتابِ لطفِ خدا ضو فگن ہوا

پھر اب کے سال چار طرف اتنے خم لنڈھے
آزاد فاقہ مست بھی پی کر مگن ہوا

حقِ الفت ادا کریں گے آپ؟
آپ پاسِ وفا کریں گے آپ؟
ہم فریبِ نگاہ کیوں کھاتے
کیا خبر تھی دغا کریں گے آپ
کون واقف کسی کا دل لے کر
کیا بنائیں گے کیا کریں گے آپ
آپ کیوں درپئے دل و جاں ہیں
ہم نثار ادا کریں گے آپ
آپ پرسانِ حالِ غم ہوں گے؟
آپ خوفِ خدا کریں گے آپ؟
کب تک آزاد جبر کے ہوتے
صبر پر اکتفا کریں گے آپ

اس کو قیدِ مکاں سے کیا نسبت
بے نشاں ہے نشاں سے کیا نسبت
عرش و کرسی کی رفعتیں برحق،
مگر اس آستاں سے کیا نسبت
مہر بھی ضو فشاں سہی لیکن
اس رخِ ضو فشاں سے کیا نسبت

شعر: خدا کا گھر ہی سہی
پھر و پیر مغاں سے کیا نسبت
برق مضطر سہی مگر آزاد
میرے قلب تپاں سے کیا نسبت

میں وہ بیکس کہ واجب الامداد
تو وہ کافر کہ خوگر بیداد
دل بھی ناشاد جان بھی ناشاد
ہر طرح جی پہ آ بنی فریاد
ایک دل اور سینکڑوں دلبر
ایک صید اور لاتعد صیاد
ہائے وہ لطف الفت باہم
یاد ہے آج تک وہ عالم یاد
منزل عشق پر خطر ہے تو ہو
شوق کہتا ہے ہرچہ بادا باد
او ستم دوست! منصفی فرما
داد خواہوں پر اور یہ بیداد
کون تاب مقاومت لاتا
ہم تھے اور تیرے عشق کی افتاد
اب وہ ظالم ہے اور فکر جفا
لے! امید وفا مبارک باد
نہ وہ صبر و سکون دل باقی
نہ وہ صبر و سکوں کی استعداد
میرے غم سے نمود شادی غم
میرے دم سے وجود کون و فساد
کہیں آیا وہی نہ ہونے دیا
بارک اللہ! قسمت برباد
حال آزاد کیا گذارش ہو
کہ وہ آزادیاں نہ وہ آزاد

اک مرا دل کہ مصائب کا شکار
اک مری جان کہ صرف افکار
تو اور اک چشم عنایت سے دریغ
میں اور امید وفا کا آزار
نامرادانہ بسر ہوتی ہے
نہ وہ دنیا ہے نہ وہ لیل و نہار

نہ وہ تسکین کے پہلو باقی
نہ وہ امید ۔۔ نہ وہ صبر و قرار

نہ کوئی درد و مصیبت کا شریک
نہ کوئی یار نہ کوئی غم خوار

نہ وہ خوش وقتی بزم عشرت
نہ وہ دل چسپئی سیر گلزار

نہ وہ محفل نہ وہ غوغائے نشاط
نہ وہ گلشن نہ وہ دنیائے بہار

نہ وہ آنکھیں نہ وہ رنگیں جلوے
نہ وہ نظریں نہ وہ لطف دیدار

جس جگہ جائیے دل کو وحشت
جس طرف دیکھئے کلفت دوچار

کامرانی کا زمانہ نہ رہا
کوئی حسرت ہو نکلنی دشوار

کیا پڑی ہے کہ کوئی رہبر ہو
میں ہوں اور منزل دشوار گذار

اے ترے لطف کی دنیا بھوکی
اس طرف بھی نگہ لطف شعار

کوئی انجام کا کھٹکا نہ رہا
اے زہے شغل ہجوم افکار

وضع آزاد نرالی دیکھی
ہاتھ میں سبحہ گلے میں زنار

تو کہ ہر وقت غرق جلوۂ ناز
میں کہ دن رات سجدہ ہائے نیاز

بارک اللہ دلربا انداز
آنکھ میں سحر بات میں اعجاز

میری امید یاس کی تمہید
میری تسکین درد کا پرواز

میرے حصے کا اضطراب ازل
میرے قصے کا درد سے آغاز

تیرے گھر کے طواف میرا حج
تیرے در کے سجود میری نماز

تیری منزل بلند تر منزل
میری پرواز پست تر پرواز

وہ کمال کرم وہ غایت قرب
وہ وصال بہم وہ راز و نیاز

طاقت ضبط راز۔ سلب نہ کر
جو مرا راز خود وہ تیرا راز

تم ہمارے ہو ہم تمہارے ہیں
دل کی آواز غیب کی آواز

شکرِ احسانِ دوست، دل بخشا
اور وہ دل کہ درد سے ممتاز

سرمدی زندگی عطا کر دی
اے غمِ دوست تیری عمر دراز

بندہ پرور اب آپ کا آزادؔ
خود ہی بندہ ہے خود ہی بندہ نواز

وہ ستیدائے اصنام ہے اور بس
یہ عہد در و بام ہے اور بس

کلِ آفاق اب تک باایں عقل درائے
گرفتار او ہام ہے اور بس

وجود وفا کی تلاشیں عبث
فقط نام ہی نام ہے اور بس

نہ اذکارِ دنیا نہ افکارِ دیں
حدیثِ مے و جام ہے اور بس

وہی ہم ہیں اور شغلِ بیکارِ عشق
وہی فرصتِ نام ہے اور بس

زمانہ ہے اور کوششِ جد و جہد
مگر ہم ہیں آرام ہے اور بس

نہ آزادؔ مے کش نہ شاہد پرست
وہ کم بخت بدنام ہے اور بس

تو ہے اور فکرِ جفا ہے اور بس
میں ہوں اور شکرِ خدا ہے اور بس

بندہ پرور اس طرف بھی اِک نظر
اِک نظر کی التجا ہے اور بس

یا تو دل تھا اور لاکھوں مدعا
یا دل بے مدعا ہے اور بس

کوئی بارِ عشق اٹھا سکتا بھی ہو
ادعا ہے ادعا ہے اور بس

عادتِ چون و چرا کے دن گئے
اب سرِ صبر و رضا ہے اور بس

کل تک اصرارِ خطا تھا لیکن آج
میں ہوں اقبالِ خطا ہے اور بس

ہو چکے دنیا کے شکوے ہو چکے
اب فقط تجھ سے گلا ہے اور بس

ناخدا بھی ناخدائی کر چکے
اب خدا کا آسرا ہے اور بس
دوستو ناصح مرا دشمن نہیں
اِک ذرا سر پھر گیا ہے اور بس

شکوۂ جور و جفا سے کیا غرض
کیا غرض اِک بیوفا سے کیا غرض
اب کوئی امید ہی دل میں نہیں
زحمتِ بیم و رجا سے کیا غرض
دل جہاں بہلے وہی گلزار ہے
باغ و گلشن کی فضا سے کیا غرض
مجھ کو اپنی زندگی دو بھر نہیں
التفاتِ جاں فزا سے کیا غرض
آپ کے ارمان بھی تھوڑے نہیں
جستجوئے ماسوا سے کیا غرض
آپ کی حسرت بھی ناکافی نہیں
خواہشِ ہر دوسرا سے کیا غرض
اب سراپا مدعا ہوں اب مجھے
عرضِ حالِ مدعا سے کیا غرض
آپ تکمیلِ ستم فرمائیے
آپ کو خوفِ خدا سے کیا غرض
جن کو توفیقِ مےُ معشوق ہے
ان کو ضبطِ اتقا سے کیا غرض
حضرت آزاد ہم اک رند ہیں
پارسایانہ ریا سے کیا غرض

تنقید و تبصرہ

پیلی یاس اور میلی ساند | ڈراما مصنفہ مارس میٹر لنک، مترجمہ جناب تمنائی صاحب، مقدمہ از پروفیسر شرف عالم آرزو جلیلی صاحب، ناشر پنجاب بک ڈپو تقطیع ۲۰×۳۰، حجم ۱۰۰ صفحے۔ قیمت ۱۲

مارس میٹر لنک یورپ کے انوکھے ڈرامانویسوں، ادیبوں اور فلسفیوں میں مشہور ہے۔ انسان کی لاعلمی، بے بسی، موت کے بعد کی انجان دنیا کے خیالی نقشے، یہ اس کے پسندیدہ موضوع ہیں۔ زبان میں اسے خاص ملکہ ہے۔ بلکہ بیشتر فرانسیسی ادیبوں کی طرح اس کا اصل سرمایہ زبان ہی ہے۔ وہ حقیقت نگاری کیا دنیا اور زندگی اور انسانوں کی اس شکل کو جو ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں نظر انداز کر کے تمام تصورات اور جذبات کو تمثیل کے کڑھاؤ میں گھونٹتا ہے اور زبان کے قوام میں ڈال کر نئے نئے مزے کی مٹھائیاں تیار کرتا ہے جن میں سے سب کی تعریف یہ ہے کہ وہ معدے تک پہنچنے نہیں پاتیں۔ کبھی منہ ہی میں گھل کر ہوا بن جاتی ہیں۔ کبھی دماغ میں ہلکا سا سرور پیدا کر کے رہ جاتی ہیں۔

پروفیسر آرزو جلیلی صاحب نے مقدمے میں میٹر لنک کی سوانح حیات اور اس کی ادبی خصوصیات بیان کی ہیں اور خاصی وضاحت سے۔ ترجمہ بھی خاصا رواں ہے۔ لیکن ہم اصل سے مقابلہ نہیں کر سکے۔ اس لئے اسکی صحت کا کوئی اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ چھپائی اچھی نہیں ہے۔ اور نام صحیح پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ شروع میں مینجر صاحب پنجاب بک ڈپو نے فاضل مترجم، اور مقدمہ نویس کا شکریہ ادا کیا ہے۔ اور اشاعت کے آداب میں اس نئی رسم کا اضافہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

م م

نصاب شہریت | مصنفہ پروفیسر عطار الله، ایم اے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ناشر قومی کتب خانہ لاہور، تقطیع ۲۰×۳۰، حجم ۲۰۰ صفحے۔

یہ کتاب مڈل اسکولوں کے طلباء کے لئے تیار کی گئی ہے اور اس میں پنجاب کے حالات خاص طور پر مدنظر رکھے گئے ہیں۔ نظام حکومت کا کوئی بڑا شعبہ توجہ سے محروم نہیں رہا ہے اور آخر میں مجلس اقوام یا لیگ آف نیشنز کا بھی ذکر خیر ہے۔ اگر خیال نہیں رکھا گیا ہے تو طالب علم کی طبیعت اور دلچسپی کا، اور اس حقیقت کا کہ ضروری معلومات کے ساتھ طالب علم کے دل میں ایسے حوصلے پیدا ہونا چاہئیں جو اسے اچھا اور سچا شہری بنائیں۔ اس ایک کتاب کے مضامین کو چار کتابوں میں تقسیم کرکے انھیں اس طرح بیان کرنا چاہیئے تھا کہ طالب علم کا شوق بڑھے اور علم سے اسے لگاؤ ہو جائے۔ لیکن دنیا کی مصلحتوں کو کوئی کیا کرے۔

م م

فن انشا پردازی | ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے، پی ایچ ڈی، پروفیسر ادبیات اردو، جامعہ عثمانیہ، ناشر کا نام و پتہ درج نہیں۔ تقطیع ۲۰ × ۱۳، حجم ۵۱۱ صفحے مع اشاریہ

یہ اس قسم کی کتاب ہے جیسے کہ انگریزی میں کوئلر کاؤچ کی تصنیف "لکھنے کا فن" (THE ART OE WRITING QWITER CONCH) اور اتنی ہی مفید اور دلچسپ بھی ہے۔ اس میں نومشق ادیبوں کو جو ہدائیں دی گئی ہیں وہ بیشتر صحیح اور اچھی ہیں اور اس وقت جو بد مذاقی پیدا ہو گئی ہے اس میں اعتراض کرنے میں کوئی تکلف نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن ایک بڑی کسر یہ رہ گئی ہے کہ مختلف اچھے اور برے طرز کی عبارتوں، موزوں اور ناموزوں تشبیہوں اور استعاروں کے نمونے نہیں دیئے گئے ہیں۔ انشاء پرداز کو اپنی زبان سے محبت ہونا ضروری ہے اور یہ محبت زبان کے اچھے نمونے ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ ہمارے خیال میں عنوانات کے مسئلے پر اس قدر تفصیل سے بحث کرنا جیسے کہ فاضل مصنف نے کیا ہے۔ چنداں کارآمد نہیں۔ مضمون سمجھ میں آجائے تو عنوان خود بخود قائم ہو جاتا ہے۔ اور مضمون سمجھ میں آنے کے لئے موضوعوں اور عنوانوں کی فہرست نہیں بلکہ مطالعہ اور مشاہدے کا شوق درکار ہے اسی طرح ہم سمجھتے ہیں کہ انشاپردازی کے معلم کو افسانہ نویسی کے فن سے براہ راست کوئی مطلب نہیں۔ افسانہ نویس کی ہدایت نقاد کا کام ہے معلوم نہیں فاضل مصنف نے شاعری کو بحث سے کیوں خارج کر دیا ہے۔ ہم کو تو صرف نثر

لکھنے والوں پر یہ جتانا ہے کہ انھیں الفاظ اور محاوروں اور زبان کی روانی پر اتنی ہی توجہ کرنا چاہئے جتنی کہ شاعر کرتے ہیں۔ دوسری زبانوں میں بھی نظم کی ادبی خوبیاں نثر کے لئے نمونہ مانی جاتی ہیں لیکن فاضل مصنف کے مدنظر اصولی بحث نہیں معلوم ہوتی بلکہ اس وقت کی ضرورت، اور اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو یہ کتاب بہت مناسب ہے اور خاصی مکمل بھی۔

۴۴

ہندستانی لسانیات | ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ایم اے، پی ایچ ڈی پروفیسر ادبیات اردو۔ جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد، تقطیع ۲۲×۱۸/۱۶ حجم ۱۹۰ صفحے مع اشاریہ۔ ناشر کا نام درج نہیں۔ ملنے کا پتہ مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، کتابستان، سٹی روڈ، الہ آباد، مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

اردو زبان کی تاریخ پر کام کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہ پہلی کتاب ہے جس میں اردو اور ہندستانی پر علم لسانیات کے اصولوں کے مطابق بحث کی گئی ہے۔ فاضل مصنف نے ابتدا علم لسانیات سے کی ہے۔ اور زبان کی ماہیت، آغاز اور تشکیل کے طریقے سمجھا کر اور دنیا کی زبانوں کی تقسیم پر ایک نظر ڈال کر ہندوستان کی زبانوں کی تقسیم واضح کی ہے۔ کتاب کے دوسرے حصے میں صرف ہندوستان پر بحث کی گئی ہے اور اس بحث میں لسانیات، تاریخ، روشن خیالی اور وسعت نظر سب نے برابر کا حصہ لیا ہے۔

یہ کتاب ضروری معلومات کا ایک خزانہ ہے اور وہ اردو بولنے والے بہت ہی غریب رہ جائیں گے جو اس سرمائے سے فائدہ نہ اٹھائیں۔

۴۴

بچہ کا دل اور دوسرے ڈرامے | از سعدی مجھلی شہری، ناشر بچوں کا کتب خانہ، کلائیو روڈ، نئی دہلی۔ حجم ۱۷۰ صفحے، تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶

یہ سات ڈراموں کا مجموعہ ہے، اور خواجہ حسن نظامی صاحب، شوکت تھانوی صاحب فرید جعفری صاحب نے اس کا مقدمہ، دیباچہ اور تعارف لکھا ہے، ڈرامے سب بالکل مہمل ہیں۔

نوجوان مصنف کو اگر واقعی ادبی ذوق ہے تو انھیں اچھے ڈراموں کا مطالعہ کرنا اور لکھنے کی مشق کرنا چاہیئے۔

ضرب کلیم | بال جبریل کے بعد ڈاکٹر اقبال کے تازہ اردو کلام کا مجموعہ ضرب کلیم کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ کس قدر دلکش اور روح پرور ہے صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان اشعار کی تعریف کرنا یا دوسرے شعراء کے کلام کی طرح اُن کی داد دینا، یا اپنے خیال کے ساتھ ان کی مطابقت دکھانا، یا بے کیف توضیحات کرکے اُن کی لطافت کو کھونا نہ صرف کور ذوقی ہے بلکہ شریعت ادب میں گناہ کبیرہ ہے۔ کیونکہ یہ شاعری نہیں ہے بلکہ حیاتِ ملیہ اسلامیہ کے ان اہم مسائل کے متعلق جن میں مفکرین غلطاں و پیچاں ہیں۔ اور جو دفتر کے دفتر سیاہ کرنے سے بھی حل نہیں ہوتے دو دو اور چار چار شعروں میں جچی اور تلی رائیں، روشن تعلیمات، اور بے پردہ حقائق ہیں جو اہل بصیرت کی نگاہوں میں موتی کی طرح بڑی چمک رہی ہیں۔ ان کی کیفیت بقول مرزا بیدل یہ ہے ؎

نزاکتہاست در تصویر مینا خانۂ حیرت　　　مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را

ان کو تو بس دیکھئے، پڑھئے، سوچئے اور نہاں خانۂ دل کے کسی گوشہ میں محفوظ رکھ لیجئے۔

لیکن چونکہ میرا طریقۂ فکر جداگانہ ہے۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بعض باتوں سے کلی طور پر میں متفق نہیں ہو سکا۔ انھیں کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہوں

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ مہدی کے عنوان سے وہ فرماتے ہیں

مجذوب فرنگی نے باندازِ فرنگی　　　مہدی کے تخیل سے کیا زندہ وطن کو

اے وہ کہ تو مہدی کے تخیل سے ہے بیزار　　　نومید نہ کر آہوئے مشکیں سے ختن کو

اس میں غالباً روئے سخن میری طرف ہے۔ کیونکہ مہدی کے عقیدے کے قرآنی ہونے سے سب سے پہلے میں نے علی الاعلان انکار کیا ہے، اس لئے گذارش کرتا ہوں کہ تخیل سے مراد اگر عقیدہ ہے تو ہمارے پاس اس کا ایک معیار ہے یعنی کلام اللہ۔ اس میں کہیں مہدی بھیجنے کا

وعدہ نہیں کیا گیا ہے لہذا اگر ہم یہ عقیدہ رکھا بھی کریں تو اللہ کے اوپر کیا ذمہ داری ہے کہ وہ مہدی کو بھیجے۔ اور اگر محض تخیل مقصود ہے تو مایوس قوموں کے تخیلات بھی اُن کے لئے عذاب ہی ہوا کرتے ہیں صدیوں پر صدیاں گذرتی جا رہی ہیں اور امت ہے کہ اس امید میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے کہ

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

کبھی کبھی جب مایوسی کا غلبہ ہوتا ہے تو گھبرا کے کہنے لگتی ہے۔

یہ انتظارِ مہدی و عیسے بھی چھوڑ دے

پھر مجبور ہو کر اس ٹوٹی ہوئی امید کا سہارا لیتی ہے اور پکارتی ہے۔

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا

غالباً اسی تخیل کا اثر ہے کہ ملت کے اُن سربرآوردہ افراد کو بھی جو اس وقت تعمیر قوت میں سرگرم ہیں ڈاکٹر صاحب اپنے بلند معیار کے مطابق نہیں پاتے اور کہتے ہیں

نہ مصطفےٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی ۔۔۔ کہ روحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

دوسری بات یہ ہے کہ انھوں نے کہا ہے۔

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے ۔۔۔ غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

یہ خالص شاعرانہ استدلال ہے۔ غالب کی طرح جس نے کہا ہے۔

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد ۔۔۔ مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

جس طرح مگس کی قے کہہ دینے سے شہد کی لطافت اور شیرینی میں فرق نہیں آسکتا اسی طرح محکومیت کی نسبت سے الہام بھی اگر حق ہو۔ غارت گرِ اقوام نہیں ہو سکتا۔ خود حضرت عیسےٰ علیہ السلام رومی سلطنت کے محکوم تھے جن کی نسبت ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا
نبیِ عفت و غمخواری و کم آزاری

بلکہ اکثر انبیاء کرام علیہم السلام محکوم اقوام ہی میں مبعوث کئے گئے جس کے خاص اسباب وعلل تھے جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔

دراصل نبوت کی صداقت کا معیار حاکمیت یا محکومیت پر نہیں ہے بلکہ خود الہام کی نوعیت پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی مجموعے میں ایک دوسرے شعر میں اس کسوٹی پر بھی اس کو کسا ہے۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگ حشیش | جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

نسخ جہاد اور کفر کی غلامی کا دوامی پٹہ کبھی سچی نبوت کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔

پنجابی مسلمانوں کی مذہبی ذہنیت کے متعلق فرماتے ہیں۔

مذہب میں بہت تازہ پسند اس کی طبیعت | کرے کہیں منزل تو گذرتا ہے بہت جلد
تحقیق کی بازی ہو تو شرکت نہیں کرتا | ہو کھیل مریدی کا تو ہرتا ہے بہت جلد
تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے | یہ شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

یہ حقیقت اگرچہ ناقابل انکار ہے مگر اسی ذم سے پنجابی مسلمان کی مدح کا بھی ایک پہلو نکلتا ہے جو یقیناً ڈاکٹر صاحب کے پیش نظر بھی رہا ہوگا۔ مگر انھوں نے اس تنبیہہ کے موقع پر اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن میں تو ظاہر کئے بغیر نہیں رہوں گا۔ یعنی

لیکن اُسے مل جائے جو اچھا کوئی رہبر | بگڑا ہوا مدت کا سنورتا ہے بہت جلد

نظریہ حیات کے متعلق تین اقوال لکھے ہیں۔

پنوزا

نظر حیات پہ رکھتا ہے مرد دانشمند | حیات کیا ہے حضور و سرور و نور و وجود

فلاطون

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مرد دانشمند | حیات ہے شب تاریک میں شرر کی نمود

اقبال

حیات و موت نہیں التفات کے لائق | فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

فلسفۂ خودی پر پہنچ کر رک گئے۔ لیکن تصوف (کہ برائے شعر گفتن خوب است) ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے اور صوفی کی زبان سے کہتا ہے۔

حیات و موت و خودی جلوہ ہیں عوارض نفس — حقیقت ایک ہی جو خود ہے شاہد و مشہود

(اسلم)

بلاغ الحق | مصنفہ شمس العلما حافظ سید محب الحق صاحب۔ کتابت و طباعت و کاغذ عمدہ، تقطیع ۲۰×۲۶ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت فی نسخہ عہ۔

مصنف سے "پر فضا" پٹنہ کے پتہ سے مل سکتی ہے۔

شمس العلماء حافظ محب الحق صاحب کا سلسلہ حقانیہ چار جلدوں میں ہے۔ اس کی پہلی تین جلدیں دعوۃ الحق، منہاج الحق، اور شرعۃ الحق مطبوع ہو کر شائع ہو چکیں اور عام طور پر اہل نظر نے ان کو پسند کیا اور ایک بلند تصنیف قرار دیا۔ لیکن یہ چوتھا حصہ جو ان سب کا نچوڑ اور بیان کی خوبی اور دلائل کے متانت کے باعث نہایت پر مغز ہے اب تک نہیں چھپا تھا۔ یہ پہلی بار شہزادہ ناصر الدین محمد اسد الرحمن قدسی کے حکم سے عزیزی پریس آگرہ میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ اس میں عقائد اسلامی، عبادات معاملات، اور اخلاق وغیرہ کے متعلق قرآن کی تعلیمات پیش کی گئی ہیں۔ جو لوگ قرآن سے ذوق رکھتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب نہ صرف مفید بلکہ شمع راہ ہے۔

جامع النحو | مولفہ حکیم محمد احمد صاحب۔ معلم مدرسۃ الاصلاح۔ سرائے میر اعظم گڈھ۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ ضخامت ۱۰۰ صفحے۔ تقطیع ۲۰×۲۶ قیمت فی نسخہ ۸؍

مصنف سے مل سکتی ہے۔

حکیم محمد احمد صاحب زمانے سے صرف و نحو کی تعلیم دیتے دیتے اس کے ماہر ہو گئے ہیں۔ انھوں نے اپنے تعلیمی تجربے کے بعد طلباء کی آسانی کے لئے یہ کتاب لکھی۔ میرا خیال ہے کہ جس سہولت کے ساتھ اس کتاب سے نحو عربی کے مسائل ذہن نشین ہو سکتے ہیں۔ اس آسانی

کے ساتھ کسی درسی کتاب سے نہیں ہو سکتے۔ اس میں طلبار کی ضروریات پیش نظر رکھی گئی ہیں اور خوش اسلوبی کے ساتھ مسائل ترتیب دئے گئے ہیں ۔ جو لوگ عربی سیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کو نحو کے لئے یہ کتاب ضرور منگانی چاہیئے ۔

خانہ کعبہ کے موجودہ محافظ کی سرگزشت

یعنی

سوانح حیات سلطان ابن سعود

جس میں پہلی سعودی حکومت کے محیر العقول کارنامے عرب میں ترکی اور مصری حکومتوں کے الجھے ہوئے حالات خاندان ابن رشید کی المناک سرگذشت تحریک وہابیت کی تبلیغ واشاعت۔ وہابیوں کا جزر ومد۔ تحریک اخوان بناء وتاسیس سلطان ابن سعود کے عہد بعہد کے حالات وکوائف اور درخشندہ فتوحات۔ فتح حجاز کے مفصل واقعات۔ دستور ملکی کا قیام ونفاذ۔ انتظامات ملکی کی اصلاحات۔ علوم وفنون کی ترویج وتشویق۔ امنیت و مدنیت کے لئے گراں قدر مساعی۔ نجدی معیشت ومعاشرت۔ مغربی حکومتوں سے تعلقات اور متعدد معاہدات وغیرہ وغیرہ پوری شرح وبسط سے درج ہیں۔

کتاب مستند معلومات کا بے نظیر ذخیرہ ہے۔ طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ نہایت اعلیٰ ضخامت ۲۰×۲۶/۸ ۲۷۶ صفحے۔ قیمت صرف دو روپے

ملنے کا پتہ

...سلسلہ...

پنجاب

تعلیم کی اصلاح و تنظیم

جیسا کہ تمام حضرات کو معلوم ہوگا۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس جوبلی اس سال علی گڑھ میں ایسٹر کی تعطیلات میں منعقد ہو رہا ہے تعلیمی مباحث کی شمولت کے لئے اور تقسیم کار کے اصول پر اجلاس کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جن میں سے ہر ایک کے لئے ایک علیحدہ سکریٹری اور صدر کا انتخاب ہوا ہے۔ انھیں شعبوں میں ایک شعبہ ثانوی تعلیم کا ہے۔ جس کی صدارت ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب (پرنسپل جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی) فرمائیں گے۔

چونکہ ثانوی تعلیم کا مسئلہ ملک کی ذہنی اور علمی ترقی کے لئے خاص اہمیت رکھتا ہے اور اس کے بہت سے مسائل غور طلب ہیں۔ جن کا کوئی مناسب اور تشفی بخش حل اب تک پیش نہیں ہو سکا اس لئے میں ملک کے تمام ارباب فکر اور ماہرین تعلیم سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس شعبے کے اجلاس میں شامل ہو کر اس کے مباحث میں شریک ہوں اور جو حضرات ثانوی تعلیم کے کسی مسئلہ پر اپنا مقالہ پڑھنا چاہیں وہ مجھے اپنے اس ارادے سے مطلع فرمائیں اور مقالہ کا عنوان لکھ بھیجیں۔ فروری کے اخیر تک مقالہ کی ایک نقل میرے پاس آجانی چاہئے تاکہ اس کو پروگرام میں شامل کیا جا سکے۔ شعبہ کانفرنس کا عام عنوان "ثانوی تعلیم کی اصلاح اور تنظیم" ہوگا اور مقالہ نگار حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مسئلے کے کسی خاص پہلو سے بحث کریں۔ مقالے مختصر ہونے چاہئیں اگر زیادہ طویل ہوں تو کانفرنس میں پڑھنے کے لئے ان کی ایک تلخیص تیار کر لینی چاہئے۔ شعبہ کا مفصل پروگرام بعد میں شائع کیا جائے گا۔

غلام السیدین
سکریٹری شعبہ تعلیم ثانوی
پرنسپل۔ ٹریننگ کالج۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مکتبہ جامعہ کی نئی کتابیں

المدنیۃ والاسلام

یہ کتاب علامہ مصر محمد فرید وجدی کی مشہور تصنیف ہے۔ از مولوی رشید احمد صاحب انصاری مرحوم۔ اب مکتبہ جامعہ نے اس کے تمام نسخے مجلد کرا کے نہایت نفیس گرد پوش (DUST COVER) کے باوجود قیمت صرف دو روپے (۲) کر دی ہے۔ المدنیۃ والاسلام میں ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی تمدن اور اصول و قوانین انسانی ترقی کے لئے ایک مفید چیز ہیں۔ قیمت دو روپے ۲

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ ہے۔ انگریزی میں یہ کتاب شائع ہوتے ہی ساٹھ ہزار فروخت ہوگئی، اردو میں ہندوستان کی اور سب زبانوں سے پہلے چھپی ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ ہے۔ کتاب ایک ہزار صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے بلاک کی چودہ تصویریں ہیں اور دو خوش نما جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ قیمت مکمل مجلد چار روپے (للعہ)

شعلہ و شبنم

حضرت جوش ملیح آبادی کی پرجوش اور کیف آور نظموں کا مجموعہ، جو آپ کو آتش کدے کی شعلہ افشانیوں اسلامی شان و حریت کے خون کھولا دینے والے واقعات، بادۂ سرجوش کی سرمستیوں اور گلہائے رنگ فطرت کے روح پرور نغموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے گا۔ شاعر انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام سے مرصع ہے۔ کتاب مجلد ہے۔ اور نہایت خوش نما گرد پوش سے آراستہ ہے۔ قیمت صرف تین روپے (عہ)

تاریخ فلسفہ اسلام

مشہور جرمن فلسفی۔ ٹ، ج، دی بوئر کی مستند تصنیف کا اردو ترجمہ از جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی۔ یہ کتاب اب کچھ ترمیم و اضافے اور نظر ثانی کے بعد چھوٹے سائز پر نہایت خوش نما جلد کے ساتھ شائع کی گئی ہے اس میں اسلامی فلسفے کی نشو و نما، یونانی و عربی علوم، فلسفہ فطرت، یونانی و اسلامی حکما، مشرق میں فلسفے کا انحطاط وغیرہ پر کار آمد مباحث۔ قیمت دو روپے

پستالوزی

از ڈاکٹر قاضی عبد الحمید صاحب بی اے (جامعہ)، ایم اے، پی ایچ ڈی، برلن۔ پستالوزی نے تعلیم کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس کتاب میں پستالوزی کی زندگی اس کے فلسفہ تمدن اس کے تعلیمی افکار اور تعلیمی کارنامے اور ان کی تفصیل سلیس زبان اور دل کش انداز بیان میں ملاحظہ فرمائیے ۔

درس ادب اگر بود زمزمہ محبتے ✤ جمعہ بمکتب آورد طفل گریز پائے را

قیمت مجلد عہ

مکتبہ جامعہ قرولباغ، نئی دہلی

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم۔اے۔ پی ایچ ڈی

جلد ۲۷ فروری ۱۹۳۷ء

فہرست مضامین

۱	مولینا نذیر احمد کی تصنیفات کا عام رنگ	جناب علی عباس حسینی صاحب لکھنؤ	۸۱
۲	امثال القرآن	جناب مولنا نجم الدین صاحب	۹۷
۳	پابندیاں	جناب عبدالقادر صاحب ۔بی ۔اے (جامعہ)	۱۱۹
۴	پاٹ	جناب حیت اللہ صاحب انصاری ۔بی۔ اے۔	۱۳۱
۵	غزل	حضرت جگر مرادآبادی	۱۶۵
۶	احسن الکلام	جناب احسن مارہروی	۱۶۶
۷	کلام آزاد	حضرت آزاد انصاری	۱۶۷

قیمت سالانہ صہ فی پرچہ

پروفیسر محمد مجیب۔ بی۔اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شایع کی ہیں۔ جو حضرات جس خاص مضمون یا شعبے سے دلچسپی رکھتے ہوں، از راہِ کرم مطلع فرمائیں مطبوعہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی۔ چند فہرستوں کے نام درجِ ذیل ہیں :۔

(۱) مطبوعاتِ جامعہ ۔ جامعہ کی شایع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست ۔

(۲) ناشرینِ اُردو ۔ جامعہ کے علاوہ اردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ ۔

(۳) مصنفینِ اُردو ۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مولفین اردو کی کتابوں کی فہرست

(۴) بچوں کی کتابیں ۔ بچوں کے لئے اُردو کی کتابوں کی فہرست ۔

(۵) عورتوں کی کتابیں ۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابیں ۔

(۶) مختصر فہرست کتب ۔ کتب اُردو کی تقریباً ایک ہزار مشہور کتابوں کی فہرست ۔

(۷) ادبی کتابیں ۔ تاریخ و تنقید ادب، مقالات و انشار، ناول، افسانہ، نظم، ڈراما، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اُردو کتابوں کی مکمل فہرست ۔

(۸) مذہبی کتابیں ۔ ڈھائی سو منتخب مذہبی کتابوں کی فہرست ۔

(۹) تاریخی کتابیں ۔ پانچسو منتخب تاریخی کتابوں کی فہرست ۔

(۱۰) اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاقیات، طبیعات، کیمیا، طب، حفظانِ صحت، زراعت اور صنعت و حرفت پر اردو کی تمام کتابوں کی مکمل فہرست زیرِ طبع ہے۔ عنقریب شایع ہوگی۔

مولانا نذیر احمد مختصر سوانح

اور

رنگ

مختصر سوانح آپ کا پورا نام مع خطابات اور ڈگریوں کے شمس العلماء مولوی حافظ ڈاکٹر نذیر احمد ال ال ڈی ہے۔ آپ ۶ ستمبر ۱۸۳۶ء کو نگینہ ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ فارسی گھر پر اپنے والد مولوی سعادت علی صاحب سے پڑھی۔ عربی کی تکمیل دہلی کالج میں کی ۱۸۵۴ء میں ضلع گجرات میں ایک اسکول میں نوکر ہوئے مگر دو ہی برس بعد اپنے صوبے میں جگہ مل گئی۔ اور کانپور کے ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر ہو گئے۔ اسی زمانے میں آپ نے مرآۃ العروس اور بنات النعش لکھی۔ یہ کتابیں عام طور پر بہت مقبول ہوئیں۔ گورنمنٹ سے آپ کو ان پر انعام ملا۔ اور آپ کا تبادلہ الہ آباد کر دیا گیا، یہاں آپ نے انگریزی بھی اتنی حاصل کر لی کہ اس زبان کی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے لگے۔ اس زمانے میں تعزیرات ہند کا اردو میں ترجمہ ڈائرکٹر صاحب سررشتہ تعلیم کی نگرانی میں ہو رہا تھا۔ مولانا نذیر احمد نے بھی چند صفحے ترجمہ کر کے پیش کیے۔ ڈائرکٹر صاحب نے ان کے ترجمے کو پسند فرمایا۔ وہ یہ کام ان کے سپرد کر دیا۔ چنانچہ آپ نے تھوڑی ہی مدت میں انکم ٹیکس اور تعزیرات ہند کے ترجمے کر ڈالے گورنمنٹ نے ان کاموں سے خوش ہو کر آپ کو ۱۸۶۱ء میں تحصیل داری عنایت کی آپ نے اس عہدے کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ ضابطہ فوج داری اور قانون شہادت کے بھی ترجمے کر ڈالے اور ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے۔

گورنمنٹ سے پنشن لینے کے بعد آپ حیدرآباد طلب کئے گئے اور ایک بڑے عہدے پر مقرر ہوئے۔ یہاں کی عام رعایا سے موانست بڑھانے کے لیے آپ نے تلنگی زبان سیکھی

اور اپنے فرائض کی انجام دہی میں مشغول رہے۔ جب حیدرآباد کی ملازمت سے بھی سبکدوش ہوئے تو دلی واپس آئے اور وہیں مستقل قیام فرمایا۔ اس پیرانہ سالی میں بھی علمی ذوق و شوق کا یہ حال تھا کہ سنسکرت سی مشکل زبان حاصل کی اور تصنیفات اور لکچروں کے ساتھ ساتھ برابر طلبا کو مکان پر درس دیتے رہے۔ ۲۰ اپریل ۱۹۱۲ء کو آپ نے بعارضہ فالج انتقال کیا۔

تصانیف اور ان کا عام رنگ

علاوہ ان ترجموں کے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے آپ نے آخر میں قرآن مجید کا بھی ترجمہ فرمایا ہے جو اس الہامی کتاب کے سب سے بہتر ترجموں میں شمار ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ حسب ذیل مراۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، محصنات، رویائے صادقہ، ایامیٰ، الحقوق و الفرائض، ابن الوقت اور موعظۂ حسنہ بھی آپ کی یادگار ہیں۔ ہمیں اس وقت مولانا کے ترجموں، مواعظ یا نظموں سے بحث نہیں وہ اس کتاب کے موضوع سے علیحدہ چیزیں ہیں۔ ہمیں ان پر اس وقت بحیثیت ایک قصہ گو اور ناولسٹ کے نظر ڈالنی چاہیئے۔

مولانا واعظ ہیں

اس سے پہلے یہ عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا باقاعدہ ناول نویس نہیں کہے جا سکتے ہیں اور نہ اس حیثیت سے وہ اس کتاب میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کا ذکر اس لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ اردو میں سب سے پہلے انھیں نے فطری قصوں کی طرف توجہ کی ہے اس کا سہرا انھیں کے سر ہے کہ انھوں نے پہلی مرتبہ اس امر کو محسوس کیا کہ اردو میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہماری معاشرتی زندگی کے فوٹو پیش کئے جائیں اور ہم جن، پری، بھوت پریت کی کہانیوں کو ترک کر کے اپنے گرد و پیش کے لوگوں اور اپنی ہی طرح کے معمولی انسانوں کے قصے بیان کریں۔ مولانا نے اس سلسلے میں یہ ضرور غلطی کی کہ وہ شروع ہی سے واعظ و ناصح بن بیٹھے، اور جتنے قصے لکھے ان میں اپنے اغراض و مقاصد کو اس طرح واضح کر دیا کہ قصے کی دلچسپی بڑی حد تک جاتی رہی پھر بھی ان کا اپنی تصانیف سے غیر فطری اجزا کا نکال ہی دینا اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ وہ فطرۃً ایک حقیقت نگار تھے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر انھوں

نے دوسری زبان کے ناولوں کا مطالعہ اپنی مولویت کے زور میں ناجائز اور عبث نہ سمجھ لیا ہوتا تو شاید معاشرتی ناول لکھنے میں ان سے زیادہ کوئی کامیاب نہ ہو سکتا۔

پلاٹ بہت ہی مختصر ہوتے ہیں

اسی فن ناول نویسی سے ناواقفیت ہی کا یہ بھی نتیجہ ہے کہ مولانا نے جتنے پلاٹ بنائے ہیں ان کا خلاصہ ابتدا ہی کے چند ابواب دیکھنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے۔ انھوں نے جہاں اپنے اشخاص قصہ سے تعارف کرایا ہے وہیں پر ان کی سیرتیں اس طرح واضح طور پر تفصیل کے ساتھ پیش کر دی ہیں کہ ناظر بہت ہی آسانی سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ نذیر احمد کا قلم اس سیرت کا کیا حشر کرنے والا ہے۔ لیکن مولانا کی صفائی میں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کا مقصد ناول لکھنا نہیں تھا۔ نہ وہ ان چیزوں کو بحیثیت آرٹ کے پیش کر کے انسانی خوشی اور مسرت میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ انھوں نے ہر کتاب کا تعارف کراتے وقت اس کے مقاصد بتا دیے ہیں اور اس کی غرض ظاہر کر دی ہے۔ مراۃ العروس اور بنات النعش عورتوں کی تعلیم و تربیت کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ محصنات تعدد ازدواج کی مخالفت میں ہے۔ توبۃ النصوح طاعت و اخلاق کے بارے میں۔ اور ابن الوقت انگریزی معاشرت و لباس کی مذمت میں ہے۔ چنانچہ محصنات کے دیباچے میں سر ولیم میور لفٹننٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی (یوپی) کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے اپنے اغراض یوں ظاہر فرمائے ہیں:

"انھیں کی قدر دانی مجھے تصنیف و تالیف کے باعث ہوئی۔ یہاں تک کہ عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ مرتب ہو گیا۔ خانہ داری میں مراۃ العروس، معلومات میں بنات النعش، خدا پرستی میں توبۃ النصوح۔ … انھیں دنوں مجھے یہ خیال ہوا تھا کہ مسلمانوں کی معاشرت میں عورتوں کی جہالت اور نکاح کے بارے میں مردوں کی آزادی، دو بہت بڑے نقص ہیں۔ میں نے ایک نقص کے رفع کرنے میں 'جہد المقل' کوشش کی ہے تو دوسرے نقص کے دفع میں بھی کچھ کرنا ضرور ہے۔"

غرض "محصنات" اسی "جہد المقل" کا نتیجہ ہے۔ اب رہا ابن الوقت، تو وہ غالباً سر سید

کے مذہبی خیالات کی تردید ہے۔ اس لئے کہ وہی مسلمانوں کے ریفارمر تھے اور انھیں کو اس زمانے کے لوگ نیچری، لامذہب، کرسٹان وغیرہ خدا جانے کیا کیا کہتے تھے۔ مگر مولانا نے پوری کتاب میں کہیں ان کا نام نہیں لیا ہے بلکہ اپنے قصے کا ہیرو ایک ایسے شخص کو بنایا ہے جسے تقریباً اسی طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ جو سرسید کے سوانح میں ملتے ہیں اور جس کے خیالات بھی بہت حد تک ان نظریات سے ملتے جلتے ہیں۔ جن کی تبلیغ سرسید نے کی ہے۔ بہرنوع نذیر احمد کے قصوں کا یہ سب سے بڑا عیب ہے کہ ان میں سے ہر ایک ہی خاص اخلاقی و اصلاحی مقصد کو پیش نظر رکھ کے لکھے گئے ہیں اور انہیں واضح کرنے کے لئے اشخاص قصہ کی زبانی بڑی طولانی بحثیں کرانی پڑی ہیں۔ مثلاً میہ متقی نے بھانجے اور بھانجی سے جو گفتگو کی ہے وہ اتنی خشک اور طولانی ہے کہ پڑھنے والے کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ نصوح نے اپنے خیالات کی وضاحت میں جہاں کہیں تقریریں کی ہیں وہ اتنی طویل اور خشک ہیں کہ معلوم ہوتا ہے نماز جمعہ کے بعد خطبہ پڑھا جا رہا ہے۔ حجۃ الاسلام اور ابن الوقت کی بحثیں دیکھئے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ باقاعدہ مناظرہ چھڑ گیا ہے، اور ایک نظریے کے پیش کئے جانے کے بعد دوسرے کے پیش کرنے کے لئے آدھ گھنٹے سے زیادہ صرف تمہیدی تقریروں میں صرف ہو رہا ہے۔ ان قصوں کے پڑھنے کے لئے بڑے استقلال اور سخت پامردی کی ضرورت ہے ان طولانی مباحث اور تقاریر کی وجہ سے عام قصے کی دلچسپی میں بے حد کمی ہو جاتی ہے۔ مگر مولانا کے نزدیک اصل چیزیں یہی تھیں اور سارا قصہ انھیں خیالات کے اظہار کے لئے لکھا گیا تھا اس لئے ان میں ترمیم یا تخفیف بالکل ناممکن تھی!

مولانا کا نظریۂ تعلیم | مولانا نے اپنی تعلیمی کتابوں میں جو نظریہ تعلیم پیش کیا ہے اس میں صحیح طرح کی تربیت، صحبت اراذل سے پرہیز، اطاعت والدین اور اطاعت خدا پر خاص طور سے زور دیا ہے۔

تربیت | چنانچہ بچوں کی تربیت کے متعلق ان کے خیالات مرأۃ العروس اور توبۃ النصوح دونوں کتابوں میں واضح طور پر موجود ہیں۔ اکبری کی سیرت کی خرابی کا باعث محض

ماں اور نانی کا لاڈ پیار ہے ۔ چنانچہ وہ خود فرماتے ہیں :۔

" جو لڑکیاں چھٹ پن میں لاڈ پیار میں رہا کرتی ہیں اور ہنر اور سلیقہ نہیں سیکھتیں ، یوں اکبری کی طرح عمر بھر ۔ رنج و تکلیف اٹھاتی ہیں ۔ اکبری کی ماں اور نانی کے لاڈ نے زندگی بھر کیسی مصیبت میں رکھا "

نصوح کا بڑا لڑکا کلیم اور بڑی لڑکی سلیمہ اس لئے غیر مطیع اور خودسر بن گئے کہ اُن کے بچپنے میں ان کو صحیح طور پر تربیت نہیں دی گئی بلکہ ہمیشہ اُن کی ہر خواہش کو پورا کرنے اور ہر ہٹ کو ماننے کی کوشش کی گئی ۔

صحبت ارازل سے پرہیز

اس تربیت کے سلسلہ میں صحبت کا مسئلہ بھی آجاتا ہے مولانا نذیر احمد اپنے نوح باہداں بنشست ۔ خاندان نبوتش گم شد سے بھی کچھ زیادہ ہی کے قائل تھے وہ آج کل کے زمانے والوں کی طرح مساواتی نہیں تھے ۔ عورتوں کے لیے وہ اس کے حق سے قائل تھے کہ انھیں شریفوں کی بہو بیٹیوں کے علاوہ چھوٹی قوم والوں سے بالکل نہ ملنا چاہیئے ۔ مراۃ العروس میں وہ محمد عاقل کی زبانی اکبری پر یوں طعن کرتے ہیں :

" محلے میں جو آدمی بازاری طور کے رہتے ہیں تم نے انھیں کی لڑکیوں کو بہن بنا رکھا ہے رات دن جھوندو بھٹیارے کی بیٹی جینیہ اور کنجشو تیلی کی بیٹی زلفن کمو کی بیٹی راحت ، مومن کنجڑے کی بیٹی سمتی ، تمھارے پاس گھسی رہا کرتی ہیں اور تم کو اس بات کا کچھ خیال نہیں کہ یہ لوگ نہ ہماری برادری میں ہیں اور نہ بھائی بند ، نہ ان سے ہماری ملاقات ، نہ راہ و رسم ، نہ محبت ۔ تمام محلے میں چرچا ہو رہا ہے کہ کیسی بہو آئی ہے ۔ جب دیکھو ایسی ہی لڑکیاں اس کے پاس بیٹھی ہیں "

اصغری جب بیاہ کر آئی تو اس کے یہاں بھی ایسی ہی لڑکیوں کا ہجوم ہوا مگر اصغری نے انھیں منہ نہیں لگایا ۔ بقول مولانا :۔

محلے کے کمینوں کی لڑکیاں تو چاٹ کی آشنا ہوتی ہیں ۔ جب انھوں نے دیکھا کہ

تو یاں پر پان ملتا ہے ، نہ سود سے سلف کا ذکر ہے ۔ چھ سات دن میں بادی کی طرح
چھپٹ کر الگ ہو گئیں ۔"

ماحول تربیت چنانچہ مولانا جس طرح کے ماحول کے مخالف تھے اور جس طرح کے ماحول کے حامی دونوں کی تصویریں آپ کو توبۃ النصوح میں کلیم اور نعیمہ کی
زبانی مل جائیں گی ۔ نصوح نے جب تک خواب نہ دیکھا اس کے گھر کا وہ رنگ تھا جو مولانا کسی
مسلمان کے یہاں دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے بعد کا رنگ خاص مولانا کی پسند کا ہے دیکھیے
نعیمہ اپنی خالہ زاد بہن صالحہ سے اپنے گھر کی بدلی ہوئی کیفیت یوں بیان کرتی ہے :۔

" نعیمہ :۔ جب سے اس روزے نماز کا چرچا ہمارے گھر میں ہوا ، کھلنا ہنسنا اور شرافت
سب گئی گذری ہوئی ۔ اب آئی ہو تو دو دیا ، دن رو کر یہ ایک کا رنگ ڈھنگ دیکھنا ، نہ وہ زمین
رہی نہ آسمان ، گھر کا باوا آدم ہی کچھ بدل گیا ہے ۔ نہ وہ ہنسی ہے ، نہ وہ دل لگی ہے ۔ نہ وہ
چرچے ہیں ، نہ وہ مذاق ، نہ وہ چہچہے ہیں ، گھر میں ایک اداسی چھائی رہتی ہے ۔ ورنہ ابھی ایک
مہینے کا ذکر ہے کہ محلے کی عورتیں تمام تمام دن بھر کی رہا کرتی تھیں کوئی گیت گا رہی ہے کوئی
کہانی کہہ رہی ہے یہ ہمسائی اجو بہ کچھ اس طرح کی زندہ دل ہیں کہ ہر روز نئی نئی نقلیں کر کے
سب کو ہنساتے لٹا لٹا دیتی تھیں ۔ اب کوئی گھر میں آکر تھوکتا بھی نہیں گھر ہے کہ کمبخت اکیلا پڑا
بھائیں بھائیں کیا کرتا ہے ۔

صالحہ :۔ آخر اس کا سبب کیا ہے ؟

نعیمہ :۔ سب تمھاری خالہ جان اور حمیدہ کے ابا جان کی بد مزاجی ۔ کسی کو کیا غرض
کیا مطلب ؟ کہ اپنے کام کا حرج کرے اور پرائے گھر آکر بیٹھے ۔ کیا لوگوں کے گھروں میں بیٹھنے
کو جگہ نہیں ہے ۔ لوگوں کی خاطر داری ہوتی تھی محبت سے ان کے ساتھ پیش آتی تھیں ۔ لوگ
دوڑے آتے تھے ۔ اب یہ حال ہے کہ ہر وقت منہ کپے کی طرح پھولا رہتا ہے ۔ غیر آدمی کیوں
برداشت کرنے لگے ۔ سب کے سب چلتے پھرتے نظر آئے ، ابا جان کے اچھے ہونے پر

ڈومنیوں نے سینکڑوں ہی پھیرے کئے آبجی نے کہا، ہمسائی اجوبہ نے منتیں کیں ہاتھ جوڑے ایک نہ مانی، آخر وہ رت جگا تو خاک بھی نہ ہوا۔ نگوڑے مسجدوں کے ملاؤں کو بلاکر کھلا دیا، اب تو بو دن رات نماز کا وظیفہ ہے۔ وہ دیکھو تخت پر ہر وقت نماز کا جیتھڑا بچھا رہتا ہے۔ وضو کا کھڑا کیا مجال کہ کسی وقت پاس سے الگ ہو جائے کام سے فارغ ہوئیں تو یا نماز پڑھنے کھڑی ہوگئیں یا کتاب پڑھنے بیٹھ گئیں، ایک تسبیح بھی ان کا دل لگی ہے۔ اور ان کو اکسایا کرتی ہے میرا بس چلے تو لگا دوں [illegible] ایسا مانوں کہ یاد کرے۔

نعیم نے بھی ان ماحولوں پر دوسرے پہلو سے روشنی ڈالی ہے۔ وہ کہتا ہے

کل کی بات ہے کہ میری مدت ہوتی تھی اور مجھ کو بات پر شاباش ملتی تھی، دفعتاً میں ایسا بے بہرہ ہو گیا کہ نجلہ نکمے اور تعلیم پانے کی نعمت سے ہے۔ سچ بلے ہم کیا ہیں کیا ہو گئے کیا کیا ہو کر میرا کون سا فعل ہے جو تم کو اور ابا جان کو معلوم نہیں۔ کیا ابا جان نے میری غزلیں نہیں سنیں؟ میں اُن کے ہاتھ کی بنائی ہوئی دکھا سکتا ہوں۔ ابھی پورا ایک مہینہ بھی نہیں گذرا کہ شطرنج کا ایک بڑا مشکل نقشہ ابا جان نے کسی اخبار میں دیکھا تھا۔ اس کو میں نے حل کیا۔ کبوتر اڑاتے نہیں دیکھے یا پتنگوں کی لڑائی انھوں نے نہیں سنی، کبھی تم نے روکا یا انھوں نے ٹوکا؟ اب نئی بات البتہ سننے میں آتی ہے کہ نماز پڑھو مسجد میں معتکف بن کر بیٹھو کھیلو مت کسی یار و آشنا سے ملو مت بازار مت جاؤ۔ میلے تماشے میں مت شریک ہو۔ بھلا تعجب ہے یہ باتیں ہونے والی ہیں

جو دل قمار خانے میں بت سے لگا چکے — وہ کعبتیں چھوڑ کے کعبے کو جا چکے"

گران کاموں سے مولانا کی پسند کا ماحول واضح نہ ہو تو اس موقع کو ملاحظہ فرمائیے جب نصوح نے نعیم کے کمروں کا جائزہ لیا ہے دیکھئے کہ مولینا نے پردہ دے آرٹ کا کس طرح خون لیا ہے۔ ذرا طول ہے مگر خالی از لطف نہیں۔

مولانا کی آرٹ سے دشمنی

عشرت خانہ کھولا گیا تو ایک تکلف خانہ تھا کمرے کے بیچ میں چوکیوں کا فرش اس پر دری اس پر سفید چاندنی اس خوش سلیقگی کے ساتھ تنی ہوئی کہ کہیں دھبے یا سلوٹ کا نام نہیں صدر کی جانب گجرات کا نفیس قالین بچھا ہوں گا دیکھیے اٹھا ہوا سامنے اگالدان لب قالین پیچوان جو کیول

کے اردگرد کرسیاں تھیں تو لکڑی کی، لیکن آئینہ کی طرح صاف اور چمکتی ہوئی۔ چھت میں ٹپا پٹی کی گوٹ کا نیلھا تنا ہوا۔ جلانے کے واسطے نہیں بلکہ دکھانے کے لئے۔ اس کے پہلوؤں میں جھاڑ جھاڑوں کے بیچ میں رنگ برنگ کی ہانڈیاں۔ چھت کیا تھی بلا مبالغہ آسمان کا نمونہ تھا جس میں نیلھا بجائے کہکشاں کے تھا۔ جھاڑ بمنزلہ آفتاب و ماہتاب اور ہانڈیاں ہو بہو جیسے ستارے۔ چھت کے مناسب حالت دیواریں، تصویروں اور قطعات اور دیوارگیروں سے آراستہ تھیں نصوح اس ساز و سامان کو تھوڑی دیر تک ایک سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ایک آہ کھینچ کر بولا کہ افسوس کتنی دولت خداداد اس بیہودہ نمائش اور تکلف اور آرائش میں ضائع کی گئی ہے۔ کیا اچھا ہوتا یہ روپیہ محتاجوں کی امداد اور غریبوں کی کارپردازی میں صرف کیا جاتا۔ اس کے بعد اس کی نگاہ مقابل جو پڑی تو کیا دیکھتا ہے کہ آمنے سامنے دو میزیں لگی ہیں۔ ایک پر گنجفہ، شطرنج، چوسر، تاش، کھیل کی چیزیں اور ارگن باجے رکھے تھے۔ دوسری پر گلدان اور عطردان وغیرہ کے علاوہ ایک نہایت عمدہ طلائی جلد کی موٹی سی کتاب۔ نصوح نے نہایت شوق سے اس کتاب کو کھولا تو تصویروں کا البم تھا۔ مگر تصویریں کسی عالم، حافظ، درویش، خداپرست کی نہیں، کھوا بچاؤجی، تان سن گویا، میر ناصر احمد بین نواز، صمد خان پہلوان کھلونا بھانڈ، حیدر علی قوال، نتھوا ہیجڑا، قاضی محمد علی ٹھکرا، عدو جواری اس قسم کے لوگوں کی، شیفتہ الات کی وجہ سے نصوح نے دیوار والی تصویروں کو بغور نہیں دیکھا تھا، اب البم کو دیکھ کر اسے خیال آیا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے تو وہ تصویریں اور بھی بیہودہ تھیں قطعے اور طغرے اگرچہ ان کا سواد خط پاکیزہ تھا۔ مگر مضمون و مطلب دین کے خلاف، مذہب کے برعکس نصوح نے وہیں سے ایک میر فرش اٹھا کر ان سب کی خبر لینی شروع کی اور بات کی بات میں کل چیزوں کو توڑ پھوڑ برابر کیا اور جو کچھ باقی رہا اس کو صحن میں رکھ آگ لگا دی اور نوکروں کو حکم دیا کہ اچھا اب خلوت خانہ کھولو۔ اس میں تکلف کے معمولی ساز و سامان کے علاوہ کتابوں کی ایک الماری تھی، دیکھنے میں تو اتنی جلدیں تھیں کہ انسان اُن کی فہرست لکھنا چاہے تو سارے

دن میں بھی تمام نہ ہو۔ لیکن کیا اردو کیا فارسی، سب کی سب کچھ ایک ہی طرح کی تھیں، جھوٹے قصے، بیہودہ باتیں، فحش مطلب، لچے مضمون، اخلاق سے بعید، حیا سے دور۔ نصوح ان کتابوں کی جلد کی عمدگی، خط کی پاکیزگی، کاغذ کی صفائی، عبارت کی خوبی، طرز ادا کی برجستگی پر نظر کرتا تھا۔ تو کلیم کا کتب خانہ اس کو ذخیرۂ بے بہا معلوم ہوتا تھا۔ مگر معنی و مطلب کے اعتبار سے ہر ایک جلد سوختنی اور دریدنی تھی۔ اسی تردد میں اس کو دوپہر ہوگئی۔ کئی مرتبہ کھانے کے لئے گھر سے اس کی طلب ہوئی۔ مگر اس کو فرصت نہ تھی، بار بار کتابوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا تھا اور رکھ رکھ دیتا تھا آخر یہی رائے قرار پائی کہ ان کا جلا دینا ہی بہتر ہے۔ چنانچہ بھری الماری کتابیں لکڑی کنڈے کی طرح اوپر تلے رکھ آگ لگادی۔ نصوح کا یہ برتاؤ دیکھ کر اندر سے باہر تک تہلکہ اور زلزلہ پڑ گیا۔ علیم دوڑا دوڑا جا اپنا "کلیات آتش" اور "دیوان شرر" اٹھالایا اور باپ سے کہا کہ جناب میرے پاس بھی یہ دو کتابیں اسی طرح کی ہیں۔ علیم نے آتش کو دہکتی آگ اور شرر کو جلتے انگاروں میں پھینک دیا۔ علیم کی دیکھا دیکھی میاں سلیم نے بھی "واسوخت امانت" لا باپ کے حوالے کی اور کہا کہ ایک دن کوئی کتاب فروش کتابیں بیچنے لایا تھا۔ بڑے بھائی جان نے فسانۂ عجائب، قصۂ گل بکاؤلی، آرائش محفل، مثنوی میر حسن، مضحکات نعمت خاں عالی، منتخب غزلیات جرکیں، ہزلیات جعفر زٹلی، قصائد ہجویہ مرزا رفیع سودا، دیوان جان صاحب، بہار دانش باتصویر، اندرسبھا، دریائے لطافت، میر انشا اللہ خاں، کلیات بند وغیرہ بہت سی کتابیں اس سے لی تھیں۔ میں بھی بیٹھا ہوا تھا مجھ کو دیکھ کر بولے "کیوں سلیم تم بھی کوئی کتاب لوگے؟" میں "جو آپ تجویز فرمائیں۔" بھائی جان "کون سی کتاب تم کو دے دوں؟ یہ کتابیں جو میں نے لی ہیں اول تو میرے شوق کی ہیں۔ دوسرے تم کو ان کا مزا نہیں ملے گا۔ کتاب والے کی گٹھری میں سے یہ "واسوخت" اور "دیوان نظیر اکبر آبادی" دو کتابیں انھوں نے میرے لئے نکالیں اور کہا کہ واسوخت تو خیر مگر یہ دیوان بڑی عمدہ کتاب ہے۔

میاں نظیر کے اشعار آج تک کسی نے جمع نہیں کئے تھے اس کے حاشیہ پر وہ بھی ہیں چونکہ

بھائی جان نے ناولوں کی بہت تعریف کی تھی۔ میں نے اس کو نہایت شوق سے کھولا تو پہلے چوہوں کا اچار نکلا۔ اس گندے مضمون سے میری طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی۔ میں نے دونوں کتابیں پھینک دیں۔ مگر بھائی جان نے یہ داسوخت" زبردستی میرے سر منڈھ دی۔۔۔"

غرض فنون لطیفہ و تفریحی سامان کے ساتھ ساتھ ادب کی بھی گت بنی اور سب تو سب آتش و نظیر اکبر آبادی بھی آگ میں جھونک دیے گئے۔ حالانکہ آتش و نظیر دونوں کے ہاں تصوف کا رنگ غالب ہے اور اخلاقی تعلیمات کا عنصر حد درجہ واضح، مگر نذیر احمد کے سے ملائے مسجدی کو یہ بھی پسند نہ تھے۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ شیخ سعدی علیہ الرحمہ کی گلستاں کے متعلق جو نصوح اور فہمیدہ کے درمیان گفتگو ہوئی ہے۔ وہ اس موضوع پر یادگار چیز ہے۔ عجب نہیں کہ جب کبھی یہ ٹکڑا پڑھا یا پڑھایا جاتا ہو تو شیخ علیہ الرحمہ کی بوسیدہ ہڈیاں ان کی منہدم تربت میں کروٹیں لینے لگتی ہوں ملاحظہ ہو :-

نصوح :- "کیا تم کو گلستاں پڑھنا یاد ہے"؟

فہمیدہ :- "ہاں یاد کیوں نہیں ہے، جس دن حمیدہ کا دودھ چھٹا ہے۔ اس کے دوسرے دن میں نے گلستاں شروع کی تھی"۔

نصوح :- "بھلا تم کو یہ بھی یاد ہے کہ میں تمہارے سبق سے آگے جا بجا سطروں کی سطروں پر سیاہی پھیر دیا کرتا تھا بلکہ دو دو صفحہ کے صفحے اُلٹے ہیں کہ مجھ کو اوپر سے سادہ کاغذ لگا کر ان کی چھپانے کی ضرورت ہوئی"۔

فہمیدہ :- "خوب اچھی طرح یاد ہے، چوتھائی کتاب سے کم تو نہ کٹی ہوگی"۔

نصوح :- "تم پڑھتی تھیں تب چوتھائی بھی کٹی۔ اگر کوئی دوسری عورت یا لڑکی پڑھتی ہوتی تو آدھی کی خبر لیتا، وہ تمام بیہودہ کتابیں تھیں۔ جن کو میں کاٹتا اور چھپاتا پھرتا تھا"۔

فہمیدہ :- "سچ کہو، تو میں سمجھی مشکل جان کر چھڑا دیتے ہیں"۔

نصوح :- "بڑی مشکل یہ تھی کہ میں ان واہی اور فحش باتوں کو تمہارے روبرو بیان نہیں

کرسکتا۔ پھر یہ اس کتاب کا حال ہے جو پند و اخلاق میں ہے اور تصنیف بھی ایسے بزرگ کی ہے کہ کوئی مسلمان ایسا کم تر نکلے گا کہ ان کا نام لے اور شروع میں حضرت اور اخیر میں رحمۃ اللہ علیہ یا قدس اللہ سرہ العزیز نہ کہے۔ یعنی ان کا اعتداد اولیاء اللہ میں ہے اور جو کتابیں میں نے جلائیں۔ کتابیں کاہے کو تھیں گالی، جھکڑ، ہزلیات، ٹر، بکواس، ہزیان، خرافات، میں نہیں جانتا، ان میں سے کون سا نام اُن کے لئے زیادہ زیبا ہے "!

غرض مولانا کے ہاں تعلیم کے معنی ہیں قرآن اور حدیث کی مزاولت اور زندگی کے معنی ہیں ہر لمحہ قال اللہ و قال الرسول کی تکرار!

مگر مجھے خوف ہے کہ احادیث رسول اور کلام پاک میں بھی ایسے اجزا ضرور ہی نکل آئیں گے جنہیں پڑھ کر نصیحت کی افراط حبا "اچھوتیوں" کی طرح ہو جائے گی اور نوع و سواں کی طرح عرق عرق نظر آنے گی! یہ نہیں معلوم کہ مولانا کی شریعت میں ایسے ٹکڑوں کا فہمیدہ کو پڑھانا اور سمجھانا جائز ہوگا۔ یا وہاں بھی کاغذ کی چیپیاں لگانا پڑیں گی!

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ ابھی ہمیں اپنے مصنف کے دوسرے نظریوں کا ذکر منظور کہ ان میں سے مخصوص چیزیں نظریۂ حق العباد، نظریۂ دین اور نظریۂ تقدیر ہیں۔

حق العباد

مثلاً میں سید حافظ ست میں نے جو تقریر کی ہے اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو اس سے حق العباد کے نظریے پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

"انسان کے ذمے دو طرح کے حقوق ہیں، حقوق اللہ اور حقوق العباد، لوگ حقوق العباد کی نسبت بڑی غلطی میں پڑے ہیں، اور اُن کو آسان سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، اگر کسی آدمی سے اللہ کے حقوق ضائع ہوں اور بہت سے ہوتے ہیں تو بندے کا خدا سے کیا مقابلہ حقوق الٰہی کا ضائع ہونا سہو او غفلت اور نادانی اور کوتاہ اندیشی کی وجہ سے ہوتا ہے اور امید ہے کہ خداوند غفور الرحیم بندوں کے ضعف پر نظر فرما کر اُن کے قصور معاف کرے اور کرے گا۔ مگر حقوق العباد کا یہ حال نہیں ہے۔ اس میں ایک بندہ زور سے، ظلم سے، ہیکڑی

سے، زبردستی سے دوسرے بندے کو ستانا، اس کے دل کو دکھانا۔ اس کو ایذا پہنچاتا ہے۔ اور اس قصور کا معاف کرنا نہ کرنا اسی بندۂ مظلوم کے اختیار میں ہے۔ مگر انصاف کرو دنیا میں کتنے لوگ اس کی پرواکرتے ہیں، لاکھوں تنظلمے ہیں جن کو بندگان خدا مرتے وقت اپنے سر دل پر لاد کرلے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دین کو کھیل اور مذہب کو ہنسی سمجھ رکھا ہے۔ منہ سے کہتے ہیں کہ مرنا برحق، نکیرین کے ساتھ سوال وجواب کا ہونا برحق، عذاب قبر برحق، دوزخ برحق مرنے کے بعد زندہ ہونا برحق، رتی رتی کا حساب دینا برحق، جنت برحق، دوزخ برحق اور کردار حق تھو......"

دین مولانا نے جو دین کے معنی سمجھائے ہیں اس سے اُن کا منشاء اور زیادہ واضح ہوتا ہے وہ بھی سن لیجئے، میرتقی مبتلا سے یوں فرماتے ہیں:۔

"ہمارے نزدیک بلکہ تمام اہل ادیان کے نزدیک دین کے معنی ہیں انسان کی اصلاح اور اس کے دو حصے ہیں۔ اصلاح معاد اور اصلاح معاش، پس دین اور دنیا میں اگر ایک طرح کی منطقی مغائرت ہے۔ جیسے عموماً کل اور جز میں ہوا کرتی ہے۔ اس کو تباین یا تناقص یا تنافر، یا بے تعلقی سے تعبیر کرنا مغالطہ دہی ہے۔ کتنا ہی پڑھاؤ، جب انسان میں دین نہیں، حمیت نہیں مروت نہیں، محبت نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ انسانیت نہیں، اس پر بھی اگر وہ آدمی دنیا کے کام کا ہو تو اس دنیا کو خیرباد ہی اور اس کام کو سلام......" ابن الوقت میں دین کی تعریف حجۃ الاسلام کی زبانی یوں کرائی ہے۔

دین کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا اور دنیا کے تعلقات سب ہیچ ہیں، دنیاوی خوشیوں کو منغص نہیں بلکہ دنیاوی رنج اور خوشی دونوں کو انسان کی نظر میں حقیر اور ناچیز کر دیتا ہے جو شخص غصے کو پی جائے، انتقام نہ لے، جھوٹ نہ بولے، غیبت نہ کرے، حریص وطماع نہ ہو جابر وسخت گیر نہ ہو، ممسک وبخیل نہ ہو، مغرور ومتکبر نہ ہو، کسی سے لڑے نہ جھگڑے نہ کسی کا حسد کرے، نہ کسی کو دیکھ کر جلے، عافیت میں شاکر، مصیبت میں صابر، منکسر، خلیق، بُردبار، متحمل، متحمل متواضع، منکسر مستغنی، نفس پر ضابط، قانع، سیرچشم، متوکل، تواب، عافیت کا امیدوار، متواضع، منکسر مستغنی نفس پر ضابطہ، قانع، سیرچشم، متوکل، تواب، عافیت کا امیدوار یعنی خلاصہ یہ کہ دین دار ہو۔

اگر آپ ان منقول حصوں سے یہ سمجھتے ہوں کہ مولانا ہر شخص کو اپنی سیرت کے بنانے اور بگاڑنے میں آزاد سمجھتے تھے اور وہ انسان کو فاعل مختار مانتے تھے تو آپ بہت بڑی غلطی کریں گے۔ مولانا کے نزدیک باوجود ان تمام باتوں کے جو ابھی انھیں کے الفاظ میں بیان کی گئی ہیں انسان بالکل مجبور ہے - ہر امر اس کے لئے پہلے ہی سے مقدر ہے اور جو کچھ ہوتا ہے ۔ وہ صرف خدا کے حکم سے ہوتا ہے ۔ چنانچہ نظریہ تقدیر کو لیجیے:۔

نظریۂ تقدیر و جبر

اصغری اپنے میاں سے گفتگو کرتے ہوئے کہتی ہے:۔

"سو بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ نوکری تقدیر سے ملتی ہے ۔ بڑے لائق منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں، اور اگر خدا کو منظور ہوتا ہے ، تو نہ وسیلہ نہ لیاقت ، چھپر پھاڑ کر دیتا ہے گھر سے بلا کر دیتا ہے ۔ تقدیر سے بڑھ کر مل نہیں سکتا۔"

اور فلسفۂ جبر کے بارے میں میر تقی کی زبانی یوں روشنی ڈالی گئی ہے:۔

"بندے بھلے اور برے ، امیر اور غریب ، قوی اور ضعیف ، حاکم اور محکوم ، بادشاہ اور رعیت ، یہاں تک کہ ولی اور پیغمبر سب کے سب اس قدر عاجز اور بے اختیار ہیں کہ بدون خدا کی مرضی کے ایک پتا ہلانا چاہیں تو نہیں ہلا سکتے ۔ ایک ذرے کو جگہ سے سرکانا چاہیں تو نہیں سرکا سکتے ۔ کسی انسان کا نفع اور ضرر نہ اس کے اختیار میں ہے نہ کسی دوسرے انسان کے دنیا میں جس کسی کو جس کسی کے ساتھ کسی طرح کی محبت ہے اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ جس کے ساتھ محبت رکھتا ہے ۔ اس کا فائدہ چاہتا ہے نہ یہ کہ اس کو فائدہ پہنچاتا ہے یا پہنچا سکتا ہے اسی واسطے دنیا کی ساری محبتیں از برائے نام ہیں ۔ سچی اور اصل محبت خدا کی ہے کہ ساری نعمتیں اور ساری برکتیں جو ہم کو حاصل ہیں ۔ یہاں تک کہ زندگی اسی کی دی ہوئی ہے ، بایں ہمہ انسان کو اس زندگی میں ایذائیں بھی پہنچتی ہیں مگر ان میں ضرور انسان کا کوئی نہ کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے۔"

مولانا کے ہم عصر سر سید احمد اور مولانا حالی مرحوم کی رائیں اس کے بالکل برعکس تھیں ان کا خیال ہی نہیں بلکہ ایمان تھا کہ انسان فاعل مختار ہے ۔ کامیابی و ناکامی ، برائی

اور اچھائی، سب کچھ اسی کی تدبیر اور اسی کے خیال پر منحصر ہے۔ حالی نے ایک مختصر رسالہ اسی مبحث پر لکھا ہے اور اس امر کو ثابت کیا ہے کہ "مسلمانوں کے کاہل اور اپاہج ہونے کا سب سے بڑا باعث یہی نظریۂ تقدیر ہے" ہم نے جس موضوع کے نقد کا ذمہ اپنے سر لیا ہے اس سے یہ بحث بہت دور ہے اور ہمیں اصولی طور پر ان چیزوں کا ذکر ہی اس کتاب میں نہ کرنا چاہئے تھا۔ لیکن چونکہ مولانا نذیر احمد کی کتابوں کا اصلی رنگ دکھانا اور ان کو ناولوں کے زمرے میں نہ شامل کرنے کا باعث بھی بتانا ضروری تھا اس لئے ان کی یہ مخصوص چیزیں مذکور ہوئیں۔

اب ہم ان چند خصوصیات پر بھی نظر ڈالنا ضروری سمجھتے ہیں جن کی وجہ سے بعض ناقدین مغالطہ میں پڑ کر مولانا نذیر احمد کو باقاعدہ ناول نویسوں میں شمار کرنے لگے ہیں۔ ان میں سب سے پہلی چیز حقیقت نگاری ہے۔

حقیقت نگاری

مولانا نے جہاں تک عورتوں کی خانگی زندگی کا تعلق ہے بہت حد تک حقیقت نگاری کی ہے ان کی آپس کی رنجشیں، چشمکیں، لین دین، رشک و حسد وغیرہ بہت ہی عمدہ طرز پر پیش کیا ہے۔ کہیں کہیں پر دوسرے جذبات سے بھی بحث کی ہے مثلاً اولاد سے محبت، بھائی سے محبت، باپ سے محبت، مگر اس کے ساتھ ان کی متشرع طبیعت، رنگین محبت ہی سے نہیں، بلکہ زن و شوہر کی محبت کے نام سے بھی "لجاتی" ہے۔ اُن کی معرکۃ الآرا کتاب مراۃ العروس نام ہی نام کی رنگینی ہے۔ اس کی ہیروئن اصغری اس طرح کی قدسی صفات ہے کہ اس کا شوہر غالباً اسے ایک نظر دیکھنے کے لئے پہلے وضو کرنا ضروری سمجھتا ہوگا۔ بنات النعش کی چمک بھی صرف نام ہی تک محدود ہے۔ ورنہ جن مستورات کا اس میں ذکر ہے وہ دن ہو یا رات کسی وقت بھی "عریاں" ہونے والی نہیں۔ توبۃ النصوح میں تو توبہ و استغفار ہی ہے، بھلا اس کی "فہمیدہ" میں قیامت کی متانت نہ ہوگی تو کس میں ہوگی؟ رہیں مبتلا اور ابن الوقت سی تصنیفیں تو آخر الذکر کے ہیرو نے ساری عمر انگریز بننے میں صرف کر دی، اسے صنف نازک کو جنس لطیف سمجھنے کا وقت ہی نہ ملا اور اول الذکر نے گو ایک کی جگہ دو دو بیویوں کا بیک وقت تجربہ حاصل کیا

مگر نہ اس کے ہاں ان دکھیاریوں کے لئے کوئی خاص کشش پیدا ہوئی اور نہ اُن بے چاریوں کے ہاں اس مابہ النزاع سرتاج کے لئے۔ ہمارے نزدیک اس لطیف ترین جذبے کے ذکر سے اغماض کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو مولانا ان کا ذکر ہی بے حیائی سمجھتے تھے یا انھیں اس دنیا سے کلیتہً ناواقفیت تھی ان میں سے جو بھی سبب ہو۔ مگر اس عنصر کے عدم نے مولانا کی کتابوں سے ناول کہلانے کا حق سلب کر لیا۔ اور خود انھیں حقیقت نگار کے خطاب سے محروم کر دیا۔

مکالمہ و زبان

اب رہا مکالمہ تو بے شک و شبہ مولانا عورتوں کے مکالمے کے بادشاہ ہیں۔ صنف نازک کا تکلم، طرزِ گفتگو، نشستِ الفاظ، اور روز مرہ و محاورہ پر جیسا انھیں عبور ہے۔ سوائے سرشار اور مرزا رسوا کے کسی کو نصیب نہیں، ان مقامات پر مولانا نے سلاست، روانی اور آمد کے دریا بہا دئے ہیں اور اتنی ٹکسالی زبان لکھی ہے کہ ہر فقرے پر جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ مگر جس جگہ پر خود اپنے خیالات ظاہر کئے ہیں یا مردوں کی گفتگو لکھی ہے۔ وہاں روانی کا دریا عربی کے ثقیل الفاظ کی چٹانوں سے بار بار ٹکرایا ہے۔ زور وہاں بھی بلا کا ہے۔ بہاؤ میں کمی نہیں۔ مگر ہاں یہ سبزہ زاروں سے گذرتا ہوا دریا نہیں، بلکہ کوہساروں سے الجھتی ہوئی ندی ہے۔ پھر ان مقامات کی زبان بھی دلی اور لکھنو کی ٹکسال کی پابند نہیں، اس میں جگہ جگہ پر اس کے بیّن ثبوت ملتے ہیں کہ مولانا نے مدت العمر ایک دورہ کرنے والے ڈپٹی کی زندگی بسر کی ہے اور ان کا اصلی وطن دلی کا شہر نہ تھا بلکہ یوپی کا بجنور!

امثال القرآن

یہ پُر مغز مقالہ جامعہ کے شعبہ دینیات کے ماتحت پڑھا گیا تھا۔ امثال القرآن جیسے اہم موضوع پر اردو زبان میں بہت کم مواد موجود ہے۔ مولانا نجم الدین صاحب نے اسی موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ امید ہے کہ قرآنی مباحث سے دلچسپی رکھنے والے حضرات غور و توجہ سے اس کا مطالعہ کریں گے۔

یہ مقالہ عنقریب کتابی صورت میں بھی شائع کیا جائے گا۔

قرآن حکیم ایک ایسی جامع اور مکمل کتاب اور دستور العمل ہے جو انسانی ترقی کے لئے تمام اصول و مبادی، قواعد و قوانین پر مشتمل ہے۔ ابتدائے نزول سے لیکر اس وقت تک کسی دور یا کسی ملک یا کسی قوم کو اس پر عمل پیرا ہو کر شاہراہ ترقی پر گامزن ہوتے ہوئے کوئی دشواری یا رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ نوع انسانی کی تمام ترقیوں اور کمالات حاصل کرنے کے لئے اس میں ہدایات اور احکام موجود ہیں۔ مثلاً اگر کسی صوفی اہل اللہ کو مقامات تصوف اور احوال نفسانی و فیوض روحانی کی جستجو و آرزو دامنگیر ہو۔ تو قرآن حکیم اس کے لئے بھی مشعل راہ و چراغ ہدایت کا کام دیتا ہے۔ مراتب روحانی و مقاماتِ علیا کے لئے جابجا ارشادات موجود ہیں۔ ابتدائی مراحل سے انتہا تک ارشادات موجود ہیں۔ مثلاً مقام خوف کے لئے جابجا اس مضمون کا اعادہ فرمایا گیا۔

یدعونَ ربّھم خوفاً وطمعاً۔

رجاء کے لئے:۔

من کانَ یرجو لقاءَ اللہِ فَاِنَّ اجل اللہ لآتٍ۔

جوع اور ترکِ شہوت کے لئے متعدد آیات میں رہنمائی فرمائی گئی:۔

وَلنبلونّکم بشیءٍ مِن الخوفِ والجوعِ۔۔۔ وَبشّرِ الصّابرین۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلٰى اَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَة۔

مقامِ خشوع اور تواضع کے لئے یوں ارشاد ہوا:۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُونَ۔

مخالفت نفس وہوا کے لئے:۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَاءِ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى۔

اسی طور پر ہر ایک مقام قناعت۔ صبر۔ شکر۔ توکل۔ انابت۔ قنوت۔ یقین۔ توبہ۔ مراقبہ رضا۔ عبودیت۔ استقامت۔ اخلاص۔ وغیرہ درجات کا ذکر مختلف آیات میں پایا جاتا ہے۔ اور آیت ذیل میں بطور عموم جملہ درجاتِ تصوف کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔

ایسے ہی اگر کسی بادشاہ یا خلیفہ کو ملک گیری یا ملک داری کے قوانین اساسی وضوابط ملکی وسیاسی کی ضرورت لاحق ہو تو قرآن مجید اسکی ہر ایک موقع ومحل پر پوری امداد واعانت فرما کر رہنمائی کرتا ہے۔ خصوصاً سورۂ انفال۔ توبہ اور احزاب، فتح اور بقرہ میں اس قسم کے احکام جابجا پائے جاتے ہیں۔

امور معاشرتی وخانہ داری کے سلجھانے کے لئے بھی اس نے ہر ایک پہلو کو مکمل طور پر واضح کردیا ہے۔ سورۂ بقرہ۔ نساء۔ نور۔ احزاب۔ طلاق وتحریم میں اس کا نمایاں حصہ ذکر فرمایا گیا ہے

غیر مسلم اقوام سے عہد وپیمان کے تعلقات اور اعلان جنگ وغیرہ کے احکام پر بھی مکمل بحث کی ہے۔ سورۂ انفال۔ توبہ۔ سورۂ محمد۔ فتح میں اس کی زیادہ تشریح پائی جاتی ہے۔

فصل خصومات وضابطۂ دیوانی وفوجداری کا ایک مکمل نقشہ پیش کرتا ہے۔ سورۂ بقرہ کے آخر میں اور نساء کے بعض حصص میں اور مائدہ ونور میں بھی اس کی توضیح فرمائی گئی ہے۔

اور اس میں سپہ سالار کے لئے فوجی قواعد کی پوری تشریح موجود ہے۔ اکثر حصہ سورۂ توبہ انفال، فتح و محمد میں پایا جاتا ہے۔

غرضیکہ جس پہلو اور جس عنوان پر نگاہ ڈالی جائے، ذی فہم انسان کے لئے ایک مکمل دستور العمل موجود ہے۔ اور آیۃ

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (نحل ع۱۱ پارہ ۱۴)

کی پوری تصدیق ہوتی ہے۔ اور فرمان واجب الاذعان۔

وَاِنَّهٗ لَكِتَابٌ عَزِيْزٌ لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (سجدہ پ۲۴ ع۵) کا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ آنحضرت صلعم نے اسی قرآن کریم پر عمل فرما کر ترقی کا جو نمونہ پیش فرمایا ہے اولین و آخرین اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں۔ آنحضرت صلعم نے کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذتہ نہیں فرمایا۔ ان کے پاس صرف یہی قرآن حکیم تھا، جس پر عمل پیرا ہو کر دنیا کو حیران و متعجب کر دیا اسی کتاب اللہ پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آنحضرت صلعم کے اسوۂ حسنہ کو پیش نظر رکھ کر اور اس کی روشنی میں کارفرما ہو کر جس بام عروج کو پہنچے وہ کسی سے مخفی اور پنہاں نہیں۔

آنحضرت صلعم کے زمانے سے لے کر اس وقت تک مختلف اوقات و ازمنہ میں لوگوں نے قرآن حمید کی تفسیریں لکھیں جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ ہر ایک مفسّر نے اپنے اپنے خیال و مذاق کے مطابق اس کے مطالب اخذ کرنے میں کوشش کی۔ کسی نے مسائل فقہیہ کے استنباط اور استخراج میں اپنی ساری کوشش صرف کر دی۔ تفسیر احکام القرآن ابوبکر جصاص اور احکام القرآن ابن عربی وغیرہ کا یہی مقصد، اور منتہائے مرام ہے۔ ان لوگوں نے صرف آیات احکام ہی کو اپنے فن کا موضوع قرار دے کر ہر ممکن خدمت انجام دی ہے۔

متاخرین میں سے تفسیر احمدی میں ملاں جیون ؒ نے بھی اسی مقصد کو ملحوظ رکھا اگر کسی کا مذاق محدثانہ تھا تو اس نے بھی اپنے فن کا پورے طور پر پاس رکھا۔ زیر بحث آیات میں جس قدر احادیث یا اقوال سلف صالحین کا امکان تھا جمع کیا اور اس میں کسی قسم کی کمی اور خامی نہ چھوڑی۔ ابن جریر اور ابن کثیر کی تفسیروں کا عموماً یہی مذاق ہے اگرچہ فن توجیہ کو بھی انہوں نے ہاتھ سے نہیں دیا مگر یہ حصہ مغلوب اور پہلا غالب ہے جلال الدین سیوطی ؒ نے بھی اپنی تفسیر درمنثور میں اسی روش کو اختیار کیا ہے۔

اگر کسی عالم کا مذاق عربیت کی طرف زیادہ مائل تھا تو اس نے قرآن حکیم کے نظم ونسق سے فصاحت وبلاغت کے نکات نکالنے اور صرف ونحو کے استشہاد پیش کرنے میں ساری کوشش صرف کردی۔ علامہ زمخشری اور قاضی بیضاوی نے اسی روش کو پسند فرمایا، اگرچہ انہوں نے فن توجیہ اور اثبات اعتزال یا اس کی تردید میں بھی کافی بحث کی ہے لیکن اول حصہ زیادہ نمایاں ہے۔

صاحب جلالین نے تو کوئی انتہا ہی نہ چھوڑی سوائے چند ترکیبوں کے کسی شئی کو معرض بحث قرار ہی نہیں دیا۔ اِلَّا مَاشَاءَ اللّٰہ

جب کسی عالم کا توغل عقلیات وفلسفیات کے ساتھ تھا اور اسی میں اس کی مزاولت رہی تو اس نے کتاب اللہ سے تمام مسائل فلسفیہ اور دلائل عقلیہ کے طرز بیان کو اختیار کرکے اپنی پوری ہمت کا مظاہرہ کیا۔ اس صف میں علامہ فخرالدین رازی ؒ سب سے پیش پیش نظر آتے ہیں۔ جب کبھی کسی آیت سے ذرا بھی گنجائش نظر آئی تو فوراً انہوں نے مصطلحات فلسفہ کو اس میں ٹھونسنے کی کوشش کی۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الخ میں انہوں نے علم ہیئت کے تمام مسائل کو بالاستیعاب ذکر کردیا۔ اسی طرح جہاں بھی خلق السموات والارض یا کسی ستارے یا سورج چاند کا ذکر ہوا۔ فوراً ان کا ذہن علم ہیئت کی طرف منتقل ہوا۔ اسی طور پر جب کبھی کسی فلسفی طبعی یا الٰہی مسئلہ

کا تھوڑا سا جوڑ بھی کسی آیت سے نظر آیا تو تمام طبیعیات و الٰہیات کے دفتر کھول کر رکھ دیئے ان کی تقلید میں اور بھی کئی علماء اسی رو میں بہ نکلے۔ اگرچہ تفسیر رازی میں بہت سے مسائل متعلق تشریح و تفسیر قرآن حکیم موجود ہیں اور نکات و حکم سے وہ خالی نہیں ہیں مگر غلبۂ غیر متعلق مسائل کے باعث یہ کہا گیا۔ کُلّ شئی فیہ الا التفسیر۔

اگر کسی اہل ذوق کو روحانیات اور عالم ملکوت سے زیادہ تعلق تھا تو اس نے انسان کے روحانی کمالات اور مدارج کے استنباط کرنے پر اپنی نظر کو محدود رکھا۔ شیخ محی الدین ابن عربی نے اپنی مشہور تفسیر میں اسی رنگ کو اختیار کیا۔ کوئی آیت ایسی نہیں چھوڑی جس کو فلسفۂ تصوف پر انھوں نے حل نہ کیا ہو۔ ان کے علاوہ صاحب روح المعانی نے بھی اپنی تفسیر میں عام متداول تفسیر کا ذکر کرنے کے بعد اس سلسلے کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اول سے لے کر آخر تک اس کو بھی ساتھ ہی ساتھ نباہتے چلے گئے غرض ہر ذی فہم صاحب ذوق نے اپنے مذاق کا مطالعہ قرآن مجید کی نظم و نسق سے فرما کر ناظرین سے خراج تحسین حاصل کیا۔ ہمارے خیال میں ہر ایک مفسر نے قرآن کریم کی خدمت کو اپنا مقصد قرار دے کر اپنے فہم کے مطابق عہدہ برائی کی۔ جزاھم اللہ عنا خیرا لجزاء۔

باوجود اس قدر تفاسیر لکھے جانے اور اس خدمت کے بجا لانے کے میرے ناقص خیال میں تفسیر کے بعض پہلو تا حال مکمل طور پر زیر بحث نہیں لائے گئے۔ جن پر غور و پرداخت کرنا امت پر فرض تھا اور ہے۔

(۱) اول اقسام القرآن یعنی قسموں کی تشریح اور غرض قسم اور قسم اور جواب قسم میں ربط قائم کرنا۔ اس موضوع پر مستقل اور علیحدہ مکمل بحث کرنے کی اشد ضرورت تھی مگر میری نظر سے اس وقت تک اس موضوع پر صرف دو کتابیں گزری ہیں۔ ممکن ہے کہ سلف صالحین اور متاخرین نے اس فن پر اور کتابیں بھی لکھی ہوں مگر وہ ہم تک نہیں پہنچیں۔

(۱) التبیان فی اقسام القرآن مصنفہ حافظ ابن قیمؒ۔ اس کتاب میں اگرچہ انھوں نے حسب تبحر خود بہت سے نکات تفسیریہ ذکر فرمائے ہیں۔ مگر اصل موضوع پر کوئی ایسی معتدبہ روشنی نہیں ڈالی جو مشتاق منتظر کے انتظار کو رفع کر سکے کہیں کہیں وہ ذکر کر جاتے ہیں کہ اقسام سے مقصود استشہاد ہوتا ہے بمقسم بہ کی حالت اور اس کے اطوار گرد و پیش کے حالات سے جواب قسم کا اثبات مقصود ہوتا ہے مگر جب کسی قسم کی تفسیر پر قلم اٹھاتے ہیں تو وہی پرانا قصہ مقسم بہ کی عظمت اور شان وغیرہ کے مباحث چھڑ جاتے ہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے تصریح بھی فرمائی ہے۔ کہ قسم سے مقصود استشہاد ہوتا ہے۔ مگر عملی رنگ میں۔ کسی سورت میں بطور نمونہ جاری کرنے کی زحمت گوارا نہیں فرمائی۔ خدا جانے انھوں نے باوجود سابق تصریح کے کیوں پہلو تہی کی۔

(۲) امعان فی اقسام القرآن مصنفہ مولانا عبد الحمید فراہی مرحوم۔ مصنف نے اس کتاب میں اس سلسلے کے لئے کچھ داغ بیل ڈالی ہے۔ مگر ان کو بھی تکمیل کی فرصت نہیں ملی۔ اگرچہ اصولی طور پر انھوں نے بہت سے امور ذکر فرمائے ہیں جن کی مدد سے صاحب ذوقِ سلیم فائدہ اٹھا سکتا ہے اور تکمیل کا رنگ پیدا کر سکتا ہے۔ اگر خود مصنف علیہ الرحمۃ اس چیز کو مفصل لکھ جاتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

(۲) دوم ربط الآیات والسوَر۔ یہ مسئلہ نہایت ہی اہم اور ضروری تھا۔ اور عین عقل کے تقاضے کے مطابق ایک سورت کی آیتوں میں ربط کا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے اور سورتوں کا اس ترتیب پر رکھا جانا جو شان نزول کی تاریخ کے خلاف ہے ضرور کسی حکمت اور فائدے پر مبنی ہوگا۔ ورنہ ترتیب نزولی کو ہی اختیار کیا جاتا۔ ترتیب نزولی ایک طبعی اور فطرتی چیز ہے۔ اس کا خلاف اسی وقت اختیار کیا جا سکتا ہے، جب اس کے مقابل میں کوئی داعیٔ قوی موجود ہو۔ مگر مسئلہ ربط ایک ایسا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ ہے جو عام نظروں سے مخفی اور مستتر رہا۔ اسی خفاء اور استتار کے باعث

ء علماء نے سرے سے ربط کے وجود کا ہی انکار کر دیا اور برملا کہہ دیا۔ نہ تو ایک سورت کی آیات میں باہم کوئی ربط ہے اور نہ ہی ایک سورۃ کا دوسری سورۃ کے ساتھ کوئی ایسا لگاؤ ہے جو اس کا مقتضی ہو کہ وہ اس کے بعد ذکر کی جائے۔ اور جن لوگوں نے ربط کو مانا ہے انھوں نے بھی کوئی ایسی معتد بہ شے پیش نہیں کی جو مخالفین کی غفلت یا تساہل کو دور کر سکتی یا ہماری پیاس کو بجھا سکتی اور قرآن حکیم کی شایان شان معلوم ہوتی معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے اس مسئلہ کی طرف کوئی زیادہ توجہ مبذول نہیں فرمائی ورنہ وہ اس موضوع پر کافی روشنی ڈال سکتے تھے۔

علامہ فخر الدین رازی نے آیات میں ربط پیدا کرنے کی بہت کوشش کی ، اور بالالتزام اس بحث کو عام طور پر نباہتے گئے۔ مگر انھوں نے صرف چند مقاصد کو پیش نظر رکھ کر آیات کو باہم مرتبط کر دیا۔ عام طور پر انھوں نے مقاصد قرآنی کو مندرجہ ذیل مضامین میں حصر کر دیا ہے۔ توحید۔ رسالت۔ حشر نشر۔ کہیں تو توحید کا ذکر مقدم آگیا اس کے بعد رسالت۔ اس کے بعد حشر نشر اور کہیں بالعکس۔ ان تین چیزوں کی ضرورت ہر ایک شخص کے نزدیک مسلم ہے جو بھی پہلے آجائے اس کے بعد دوسرے کا لانا کوئی بے ربط نہیں ہو سکتا۔ یہ ربط کوئی ایسا نہیں جو اعجاز قرآنی اور شان تنزیل کے مناسب ہو کیونکہ قرآن کریم کے مقاصد نہایت ہی وسیع اور تمام ضروریات بشری کے متکفل ہیں۔ جن میں کبھی بھی تبدیلی یا ترمیم کی ضرورت نہیں پڑی اور نہ پڑے گی۔ جب ہمارے سامنے یہی دستور العمل اور قانون دائمی ہے۔ تو ہر ضرورت کے لئے اس میں بحث اور مادہ کا ہونا ضروری اور لابدی معلوم ہوتا ہے۔

علامہ فخر الدین رازی کے بعد چند دیگر مفسرین نے بھی اس مذاق کو پسند فرمایا۔ مگر بالاستیعاب ربط کو ذکر نہیں کیا گیا۔

سید علی مہائمی نے بھی اپنی تفسیر کا اعلےٰ مقصد اسی کو قرار دیکر قابل قدر سعی فرمائی۔ مگر

تا حال جن مقاصد کے استنباط کرنے کے لئے اہل ذوق کے قلوب منتظر ہیں وہ ابھی تک معرض شہود میں نہیں آسکے۔ آنحضرت صلعم کا اعلان بالکل صحیح اور مطابق واقع ہے۔ لا ینقضی عجائبہٗ چیدہ چیدہ چند مفسرین نے غیر لازمی طور پر کہیں کہیں ربط قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بعض مواقع پر انھوں نے اعلیٰ قسم کے نکات بیان فرما کر ہماری رہنمائی فرمائی ہے اور بعض مقامات پر محض ایک معمولی بات پر قناعت کرکے آگے چل دیئے بہرحال وہ ہمارے شکریئے اور دعائے خیر کے مستوجب و مستحق ہیں۔

صاحب تفسیر بقاعی نے بھی ربط قائم کرنے کا التزام کیا ہے۔ بہت سے حضرات نے اس کی بہت توصیف بھی فرمائی۔ مجھے اس کے پورے طور پر مطالعہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اتفاق حسنہ سے ایک دفعہ ایک جلد تھوڑی دیر کے لئے میری نظر سے گذری وہ بھی کچھ زیادہ مفید معلوم نہیں ہوئی۔ جس طرح اور لوگوں نے ربط کے متعلق سعی فرمائی ہے انھوں نے بھی وہی مسلک پسند فرمایا ہے۔ شاید دوسرے حصص کے دیکھنے کے بعد رائے میں کچھ تبدیلی ہوسکے تاحال اس کی طباعت نہیں ہوئی قلمی نسخہ میرے مطالعہ سے گزرا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں جب کوئی مصنف کوئی کتاب تصنیف کرنے لگتا ہے تو مضامین میں ضرور کوئی ربط قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس ترتیب کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اگر کسی کتاب میں کوئی مسئلہ بے محل ذکر ہو جائے تو تمام لوگوں کی نگاہیں اس بے ربطی اور بے مذاقی پر اٹھتی ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں مقام پر یہ چیز بے ربط اور بے محل ذکر کر دی ایسے ہی کوئی واعظ یا مقرر اپنے وعظ و تقریر میں کوئی جملہ یا قصہ یا حکایت بے ربط و بے ترتیب ذکر کر دے تو تمام حاضرین اس کی بدمذاقی اور بے ذوقی پر نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں۔ جب انسانی کلام میں فطرتی طور پر ربط کا ہونا ضروری ہے تو احکم الحاکمین کے کلام قدیم میں کیونکر بے ربطی کو گوارا کیا جا سکتا ہے۔ جو کلام علیٰ رؤس الاشہاد تمام انسانوں بلکہ جن وانس کو اپنی نظیر پیش کرنے سے عاجز قرار دیتا ہے وہ کیونکر بے ربط و بے ترتیب ہو سکتا ہے۔ مانا کہ ہم

اس کی تہ تک یا حقیقت تک کماحقہ نہیں پہنچ سکتے۔ مگر یہ انصاف نہیں کہ جو چیز ہماری سمجھ سے بالاتر ہو اس کا ہم انکار کریں۔ بلکہ ہمارا ایمان ہے کہ وفوق کل ذی علم علیم۔ عرب میں جب کوئی شاعر بزم میں رزم یا رزم میں بزم کا رنگ پیدا کرتا تھا تو فوراً اس پر گرفت شروع ہو جایا کرتی تھی۔ قرآن کریم کے نزول کے وقت صدہا شعراء و فصحاء و بلغاءِ عرب موجود تھے۔ کسی نے اس پر یہ اعتراض نہ کیا کہ یہ کلام غیر مرتبط اور غیر مناسب ہے۔ حالانکہ ان کے پاس اس قسم کے دواعی موجود تھے جو انھیں قرآن حکیم پر نکتہ چینی کرنے کے لئے مجبور کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ حکیم کے ربط کے متعلق دشمنان اسلام کو بھی کوئی شبہہ نہ تھا ورنہ ضرور وہ یہ اعتراض کرتے السکوتُ فی معرض البیان بیانٌ کے مقولے کے مطابق ان کا اعتراف پایا جاتا ہے کہ قرآنِ حکیم کی آیات میں ضرور ارتباط ہے۔ معلوم نہیں کہ جن لوگوں نے ربط کا انکار کیا ہے ان کا اصل مقصد کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت فرما کر اپنی رضا حاصل کرنے کی توفیق بخشے۔

(۳) تیسری بات۔ قرآن حکیم میں ایک ہی قصہ مختلف سورتوں میں مختلف ترتیب سے ذکر فرمایا جاتا ہے۔ کہیں کسی واقعہ کو ابتدا سے لے کر انتہا تک ذکر کر دیا جاتا ہے اور کہیں بالکل اجمالی طور پر کسی خاص حصے کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے۔ اور کہیں ایک مضمون ایک سورۃ میں مقدم ذکر کیا جاتا ہے۔ اور دوسری سورۃ میں اسی مضمون کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم لایا جاتا ہے لامحالہ کلام الحکیم لایخلو عن الحکمۃ کے مطابق ضرور اُسلوب بیان اور تفصیل و اجمال و عکسِ ترتیب میں کوئی نہ کوئی حکمت ملحوظ رکھی گئی ہوگی، جس کے سمجھنے سے ہمارے عقول و اذہان تاحال قاصر ہیں۔

(۴) چوتھی چیز امثال القرآن ہے۔ قرآن حکیم میں مختلف مضامین مختلف قسم کے حالات کو مشاہد و مشخص کرنے کے لئے یا اعمال کے حُسن و قبح دکھانے کے واسطے امثالاً ذکر کئے گئے ہیں۔ ان پر مفسرینؒ نے حتی الامکان بہت کچھ تحقیق و تدقیق فرمائی ہے۔ تاہم امثال کے بعض پہلو ابھی تک پورے طور پر منقح اور مشرح نہیں ہوئے جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

غالباً وہ ان حضرات کی نگاہ میں اس قدر ضروری اور اہم نہ ہوں گے جیسے کہ ہمیں ضروری معلوم ہورہے ہیں۔ ورنہ وہ لوگ ضرور ہی ان کو بغیر تحقیق وتشریح نہ چھوڑتے۔ آج کے مقالہ میں اس وقت صرف امثال القرآن کے متعلق کچھ عرض کیا جائے گا۔ اس موضوع پر مکمل بحث کرنے کے لئے چند امور کا جاننا ضروری ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) لفظ مثل کی تحقیق۔

(۲) اس کی تاریخی حیثیت۔

(۳) غرض مثل۔

(۴) ممثل لہٗ اور مثل کے درمیان تطبیق اور امثال کی تشریح اور ان کے نتائج مثل کی حقیقت اور اس کی فقہی حیثیت۔

(۱) لفظ مثل کی لغوی تحقیق پر علمائے لغت نے بہت کچھ لکھا ہے۔ صاحب قاموس اور اس کے شارح صاحب تاج العروس اور لسان العرب وصاحب کشاف ومبرّد وغیرہ کے حوالے میرے زیر نظر ہیں مگر سردست میں صرف مفردات امام راغبؒ اصفہانی کا قول نقل کرتا ہوں جس کو انھوں نے غرائب القرآن میں ذکر کیا ہے۔

قال الامام الراغب الاصفہانی فی غرائب القرآن وَالمَثَلُ عبارۃٌ عن قولٍ فی شئٍ یُشبِہُ قولاً فی شئٍ آخر بینھما مُشابھۃٌ لِیُبَیِّنَ احدھما الاٰخر ولیصوّرہٗ نحو قولھم فی الصیف ضَیَّعتِ اللَّبَنَ۔ فَاِنَّ ھٰذا القولَ یُشبِہُ قولك اھملتِ وقتَ الامکان امرکِ وعلیٰ ھٰذا الوجہِ ما ضرب اللّٰہ تعالیٰ الامثالَ فقالَ وَتلك الامثال نضربھا للناس لعلھم یتفکرون وفی اُخریٰ وَمَا یعقلھا الاّ العالمونَ والمثل علیٰ وجھین احدھما بمعنی المثل نحو شَبَہٍ وَشِبْہٍ وَنَقَضٍ وَنِقْضٍ قَالَ بَعضھم وقد یُعبّرُ بھما عن وَصف الشئِ نحو قولہ تعالیٰ مثل الجنۃ التی وعد المتقون۔

وَالثانی عبارۃٌ عن المشابھۃِ لغیرہٖ فی معنًا من المعانی أی معنًا کانَ وَھُوَ أعمُّ الالفاظ الموضوعۃ للمشابھۃِ وَذالِکَ أنَ النِّدَّ یقالُ فِیمَا یُشَارِکُ فی الجوھر فقط وَشِبْہٌ یقال فیما یُشَارِکُ فی الکیفیۃ والمساوی یقالُ فیما یُشَارِکُ فی الکمیتہ فقط۔ وَالشکل یقال فیما یشارکہٗ فی القدرِ وَالمساحۃِ فقط۔ وَالمِثْلُ عَامٌّ فی جمیع ذالِکَ فبھذا لَمّا ارادَ اللہ تعالیٰ نفی التشبیہِ من کل وجہٖ خصّصہٗ بالذکر فقال لیس کمثلہٖ شیٔ۔ وَأمّا الجمع بین الکاف وَالمِثْلِ فَقَد قِیل ذالک لتاکید النفی تنبیھًا علیٰ أنّہٗ لَا یصح استعمال المِثْلِ وَالکاف۔ فَنَفیٰ بِلیس الامرین جمیعاً وَقِیل المِثْلُ ھٰھُنَا ھو بمعنی الصِّفت ومعناہُ لیس کصفتہٖ صفتہٌ تنبیھاً علیٰ أنّہٗ وإنْ وُصِفَ بکثیرٍ مما یُوْصَفُ بہٖ البَشَرُ فلیس تلک الصفاتُ لَہٗ علیٰ حسب ما یُستعمل فی البشر وقولہٗ للذین لَا یومنونَ بالاٰخِرۃِ مَثَلُ السَوْءِ وِللّٰہِ المثل الاعلیٰ۔

(۲) مثال کا استعمال حکما اور علما کے کلام میں ہمیشہ رہا. قدیم ترین کتاب میں جس کو ایک قوم کے خیال میں کلامِ الٰہی مانا جاتا ہے، جسے وید کہتے ہیں. جابجا امثال موجود ہیں۔ اشیاء کے حسن و قبح یا ترہیب و ترغیب کے لئے بہت سے اشلوکوں میں امثال کا استعمال ہوا ہے. جن میں سے بعض بعض تمثیل نہایت ہی نفیس اور قابل قدر ہیں۔

توراۃ انجیل میں بھی جابجا امثال کا ذکر آتا ہے. قرآن حکیم نے بھی اسی دستور العمل قدیم کو ملحوظ فرماتے ہوئے کثرت سے امثال ذکر فرمائیں۔ امام ابو الحسن الماوردیؒ نے جو شوافع کے بڑے علماء میں سے شمار ہوتے ہیں، امثال القرآن پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ مگر وہ کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری۔ نہ معلوم کہ انھوں نے اس کتاب میں کیا کیا باتیں ذکر فرمائی ہیں۔

اگر کتب سماوی یا غیر سماوی کے امثال کا بطور نمونہ یہاں تذکرہ کیا جائے تو ایک بحث طویل شروع ہو جاتی ہے۔ جس کو ہمارے اصل موضوع کے ساتھ چنداں تعلق نہیں صرف سلسلۂ موضوع کے ارتباط کے لئے اسی قدر کافی ہے کہ امثال کا استعمال قرآن حکیم سے پیشتر بھی ہوتا رہا۔ قرآن مجید نے امثال کے ذکر کرنے سے مخاطبین کو کسی غیر مانوس چیز کے سمجھنے کی طرف متوجہ نہیں فرمایا۔

(۳) مثل کے ذکر کرنے سے بہت سے اغراض ہوا کرتے ہیں جو نہایت ہی اہم اور ضروری ہیں۔ آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات سے اس کی طرف توجہ اور تفکر اور تدبر کا ارشاد ہوا ہے۔ قال اللّٰہ تعالیٰ وَلقد ضربنا للناسِ فی ھٰذا القراٰنِ من کلِ مثل لعلھُمْ یَتَذَکَّرون۔ وقالَ اللّٰہ تعالیٰ وَتلکَ الامثالُ نضرِبھا للناس وما یعقلھا الا العالمون۔ وَ قال اللّٰہ تعالیٰ وتلکَ الامثال نضربھا للناس لعلھم یتفکرون۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی ایک آیات سے امثال میں تفکر کرنے اور نتائج اخذ کرنے کے لئے حکم دیا گیا ہے۔ ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مثل کوئی معمولی چیز نہیں جسے انسان سطحی نظر سے دیکھ کر آگے چل دے۔ مذکورہ بالا تین آیات کے فواصل میں اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ امثال کے فوائد اور نتائج کا اخذ کرنا ہر کہ ومہ کا کام نہیں۔ پہلی آیت میں لعلھم یتذکرون کا لفظ خاص ارباب ذکر کے استفادہ حاصل کرنے کی طرف مشعر ہے۔ دوسری میں وَمَا یعقلھا الا العالمون کا لفظ ارباب عقل وعلم کے مستفید ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ عقل فطرتی کے ساتھ علم اکتسابی کی بھی امثال کے سمجھنے میں ازبس ضرورت ہے۔ جن لوگوں میں عقل ہی نہیں۔ یا جو ذوقِ علم سے بے بہرہ ہیں وہ امثال قرآنی سے فائدہ اٹھانے کے اہل نہیں۔ ان دو شرطوں کا ہونا ازحد ضروری ہے۔ ورنہ فاقد والشرطین کے نزدیک تو امثال غیر مفید و بے سود ہیں۔ تیسری آیت میں لعلھم یتفکرون کا لفظ ارباب فکر و

نظر کی خصوصیت پر دلالت کرتا ہے۔ امثال سے وہی لوگ فائدہ اٹھانے کے قابل ہیں جو مبادی سے مطلوب کی طرف انتقال کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اور وہی حقیقی طور پر امثال سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ احادیث میں بھی تدبر بالامثال و اعتبار بالامثال کا کئی جگہ ذکر آیا ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان القرآن نزل علی خمسۃ اوجہ حلال وحرام ومحکم ومتشابہ وامثال فاعملوا بالحلال واجتنبوا الحرام واتبعوا المحکم وآمنوا بالمتشابہ واعتبروا بالامثال رواہ البیہقی۔ (اتقان جلد۲ صفحہ ۱۳۱)

اس حدیث سے جو امثال کی اہمیت معلوم ہوتی ہے وہ کسی ذی فہم اور عقلمند پر مخفی نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن حکیم کے مضامین کو پانچ قسموں میں منحصر فرمایا ہے۔ پانچویں قسم امثال القرآن ہے۔ جس سے عبرت اور استنباط کرنا اہل اسلام کا فرض لازم ہے۔

امام ماوردیؒ نے امثال کے متعلق یہ لفظ ارشاد فرمایا ہے۔ من اعظم علم القرآن علم امثالہ والناس فی غفلۃ عنہ لاشتغالہم بالامثال واغفالہم عن الممثلات والمثل بلا ممثل کفرس بلا لجام والناقۃ بلا زمام۔ (اتقان جلد۲ صفحہ ۱۳۱)

امام شافعیؒ نے فرمایا کہ ہر مجتہد پر امثال کی معرفت اور ان کا علم واجب اور لازم ہے امثال کے اندر اوامر و نواہی کے بے انتہا مسائل مضمر ہیں۔ ہم مثل کو پڑھ کر بلا تفکر و تدبر آگے چل پڑتے ہیں۔ مگر جو غرض اور مقصد اصلی تھا۔ اس کی طرف ہماری توجہ بہت کم مبذول ہوتی ہے۔ شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے فرمایا ہے۔ اِنّما ضرب اللہ الامثال فی القرآن تذکیراً و وعظاً فما اشتمل منہا علی تفاوت فی ثواب او علی احباط عمل او علی مدح او علی ذم او نحوہ فانہ یدل علی الاحکام۔ (اتقان جلد۲ صفحہ ۱۳۱)

دیکھو ان بڑے بڑے علماء اور مجتہدین نے امثال کو کس قدر اہم اور ضروری سمجھا ہے
ضرب الامثال سے حسب موقع بہت سے امور کا استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ کبھی تو تذکیر مقصود
ہوتی ہے۔ تذکیر کی تین قسمیں ہیں۔ کبھی تو تذکیر بآیات اللہ مقصود ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے
مظاہر قدرت کو بطور تمثیل کسی شئے کے امکان یا امتناع پر بطور دلیل پیش فرمایا کرتا ہے۔
اور کبھی تذکیر بایام اللہ مطلوب ہوتی ہے۔ امم سابقہ کے حالات تعمیری یا تخریبی بیان
فرما کر مخاطبین کو ان کے نقش قدم پر چلنے یا ان کی گمراہی سے دور رہنے کی ہدایت کی
جاتی ہے اور کسی موقع پر تذکیر بما بعد الموت مقصود ہوتی ہے۔ انسان کی اس
نشأۃ کے ختم ہونے کے بعد جو واقعات اس کو عالم برزخ میں یا قیامت کے دن پیش
آنے والے ہیں ان کو امثال کے رنگ میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی ضرب الامثال
سے یہ مقصود ہوتا ہے۔ کہ مخاطب کو کسی کام پر برانگیختہ کیا جائے یا کسی بری چیز سے اس
کے افعال یا عقائد و اعمال کو تشبیہ دے کر اسے متنفر و مجتنب کیا جاتا ہے بسا اوقات
کوئی ایسا مسئلہ مخاطب کے سامنے ذکر کیا جاتا ہے جو اچھی طرح اس کے ذہن نشین نہیں
ہوتا۔ تو مثال کے ذریعے ذہن نشین کرایا جاتا ہے۔ بعض موقعوں پر انسان اپنی کوتاہ فہمی
کے باعث کسی امر کو غیر ممکن یا ممکن الوقوع کو غیر ممکن الوقوع خیال کر بیٹھتا ہے تو اس کی
غلط فہمی کے ازالہ کے لئے مثال کے ذریعے سے اس کے سامنے باطل کی تردید کی جاتی
ہے۔ اور بعض موقعوں پر کسی غیر محسوس شئے کو محسوس مثال سے متقرر فی الذہن کرنا مقصود
ہوتا ہے۔ مثال سے کبھی ایک متوہم شئے کو مشاہد دکھانا مطلوب ہوتا ہے۔ اور بعض مواقع
پر بذریعہ امثال کسی شئے کی عظمت و فخامت یا ذلت و حقارت بیان کی جاتی ہے۔
علم بیان میں ایک ہی مضمون کو مختلف طرق و اسالیب سے ادا کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔
علم الامثال اس فن کا ایک بڑا شعبہ سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا قرآن عظیم میں وعلمہ البیان
کے امتنان کی تکمیل کے لئے امثال کو کثرت سے ذکر فرمایا گیا۔

اصل مقصد تو امثال سے ممثل لہٗ کی حقیقت کو واضح کرنا۔ یا دوسرے اغراض کو مکمل کرنا ہے ممثل کی شان یا عظمت کا مثال کے ساتھ مطابق، یا مساوی یا اس کے شان کے شایاں ہونا ضروری اور لازمی نہیں۔ مگر بعض غلط فہم لوگوں نے یہ خیال کیا کہ مثال کو ممثل کی شان کے برابر ہونا ضروری ہے۔ ان لوگوں کی تردید کے لیئے قرآن حکیم میں ارشاد ہوا
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَستحی ان یضرب مثلاً مّا بعوضۃً فما فوقہا الخ الا الفاسقین۔
جب اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں کفار کے معبودات باطلہ کو عاجز۔ غیر مقتدر۔ غیر مفید ثابت کرنے کے لئے مندرجہ ذیل دو آیتیں نازل فرمائیں تو کفار نے یہ اعتراض کرنا شروع کر دیا کہ اس قسم کی کمزور چیزوں کا ذکر کرنا خدا کی شان کے لائق نہیں۔ ایسی چیزوں کا ذکر تو وہ کرے جو کمزور کم حیثیت ہستی کا مالک ہو۔ خدا کی ہستی کے لائق تو یہ تھا کہ بڑے بڑے عظیم الجثہ حیوانوں یا کواکب یا آسمانوں یا ملائکہ جیسی عظیم ترین ہستیوں کا ذکر فرماتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں ان اللہ لا یستحی ان یضرب کو نازل فرمایا۔ جن دو آیتوں سے ان کو شبہ پیدا ہوا تھا وہ یہ ہیں۔ ان الذین تدعون من دون اللّٰہ لن یخلقوا ذباباً ولو اجتمعوا لہٗ وان یسلبہم الذباب شیئاً لا یستنقذوہ منہ ضعف الطالب والمطلوب وما قدروا اللّٰہ حق قدرہ انّ اللّٰہ لقوی عزیز (پارہ ۱۷ سورہ حج)

(۲) مثل الذین اتخذوا من دون اللّٰہ اولیاء کمثل العنکبوت اتخذت بیتاً وانّ اوھن البیوت لبیت العنکبوت (پارہ ۲۰ سورہ عنکبوت)

ان بیوقوفوں کو اس بات کی سمجھ نہ آئی کہ اللہ تعالیٰ جس شے کی مثال بیان فرما رہا ہے اس کے مطابق یہی مثال ہو سکتی ہے کیونکہ ان دو مثالوں کے بیان کرنے سے یہ مقصد ہے کہ ان کے معبودات باطلہ کسی مفید چیز کے پیدا کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور نہ کسی مضر چیز

چیز چھین کر لے جائے تو اس کمزور ہستی کے جانور سے وہ چیز واپس دلانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ خواہ وہ سب کے سب اکٹھے ہو کر اس کے پیدا کرنے یا اس سے چیز کو واپس لینے کے در پے و ساعی ہو جائیں۔ شیطان نے ان کو کس قدر جاہل اور گمراہ بنایا کہ ایسی بے حیثیت بے بس چیزوں کو انھوں نے اپنا معبود قرار دے کر حوائج و مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ان سے التجائیں شروع کر دیں۔ اور اپنے عجز و انکسار کو ان کے سامنے اس طور پر ظاہر کرتے ہیں جیسا کہ خالق مطلق کے سامنے ہونا چاہیئے۔ مَا قدروا اللّٰہ حق قدرہٖ۔

دوسری مثال میں بھی ان کی جہالت اور حماقت کا اظہار کیا گیا ہے۔ انسان دنیا میں جب مکان اور گھر تیار کرتا ہے تو اس کے سامنے کئی مقصد ہوتے ہیں مثلاً موسمی تغیرات سے بچنے کے لئے مکان مفید ہوتا ہے۔ یا دشمنوں کے حملے سے محفوظ رہنے کے لئے ممد و معاون بنتا ہے۔ مگر عنکبوت کا گھر نہ تو ہوا کے جھونکوں سے بچاتا ہے اور نہ سردی گرمی کے حملوں کو روکتا ہے اور نہ ہی دشمنوں کی زد سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح ان کے معبوداتِ باطلہ کسی مصیبت سے بچانے یا کسی فائدہ کے پہنچانے میں کارگر ثابت نہیں ہوتے ان کے مناسب حال یہی مثال ہو سکتی تھی جس کو قرآن حلیم نے ذکر فرمایا۔ مگر ان کی عقلوں پر ایسے پتھر پڑے ہیں بجائے اس کے کہ وہ مثالوں سے ممثل لہٗ کے حالات کا موازنہ کرتے اُلٹے مثال پر اعتراض کرنا شروع کر دیا۔

(۴) مثلھم کمثل الذی استوقد نارًا فلما اضاءت ما حولہٗ ذھب اللّٰہ بنورھم وترکھم فی ظلمات لا یبصرون صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فھم لا یرجعون اوکصیبٍ من السماء فیہِ ظلمات ورعدٌ وبرق یجعلون اصابعھم فی اذانھم من الصواعق حذر الموت واللّٰہ محیطٌ بالکٰفرین یکاد البرق یخطف ابصارھم کلما اضاء لھم مشوا فیہِ واذا اظلم علیھم قاموا ولو شاء اللّٰہ لذھب بسمعھم وابصارھم ان اللّٰہ علیٰ کل شیءٍ قدیر۔ (پارہ اول سورہ بقرہ)

جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اختیار کرلیا اور بصارت کے عوض عمی کو پسند کیا۔ ان منافقوں کے حال کے مطابق اللہ تعالیٰ نے مذکورہ بالا آیات میں دو مثالیں ذکر فرمائیں۔ ایک ناری اور دوسری مائی۔ نار سے روشنی اور اشراق معلوم ہوتا ہے اور پانی سے زندگی اور حیوٰۃ۔ جو وحی اللہ تعالےٰ نے آسمان سے نازل فرمائی وہ بھی دو چیزوں پر مشتمل ہے۔ اول حیات قلوب۔ دوم اضاءت نفوس۔

اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو کہیں تو کلمۂ روح سے تعبیر فرمایا۔ اور کہیں اسے نور کہا گیا۔ اس سے فائدہ اٹھانے والوں کو احیاء کہا گیا۔ اور جنھوں نے اس کو قبول نہیں کیا انکو اموات سے تعبیر کیا گیا۔ وحی الٰہی کے نزول کے بعد جو حالت ان منافقین پر طاری ہوئی اس کی مثل یہ ہے۔ جیسے کسی شخص نے آگ جلائی تاکہ اس سے روشنی اور فائدہ اٹھائے۔ منافقوں نے بھی اسلام میں داخل ہو کر اپنے قلوب کو زندہ اور روشن کرنے کا خیال ظاہر کیا۔ اور کلمۂ اسلام زبان پر لائے اور مسلمانوں سے میل جول کرنا شروع کیا۔ ظاہری کلمہ گو ہونے سے ان کے جان و مال محفوظ ہو گئے اور اہل اسلام میں ان کا شمار ہونے لگا۔ ہر ایک بات میں مسلمانوں کے ساتھ مساوی حقوق کے مستحق ہو گئے۔ کلمۂ اسلام چونکہ صرف ان کی زبان پر تھا۔ نور اسلام اور چراغ ہدایت ان کے دلوں میں نہ تھا لہٰذا ان کی روشنی گل ہو گئی۔ اظہار اسلام کے بعد انھوں نے نفاق کا کام شروع کیا۔ یا ابتدا میں پکے مُسلم بنے آخر میں نفاق کو پسند کیا۔ جیسا کہ ذھب اللّٰہ بنورھم سے معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نور کے چلا جانے کا ذکر فرمایا ہے۔ نار کے بجھ جانے کا تذکرہ نہیں فرمایا۔ جو اس بات کی طرف مشعر ہے کہ نار سے دو فائدے ہیں۔ اضاءت اور احراق۔ نور کے چلے جانے کے بعد اضاءت کا تو نام و نشان بھی باقی نہ رہا مگر نار کی دوسری صفت کا کام بدستور ان کے حق میں باقی رہا۔ جس سے تکلیف ان کو برابر پہنچتی رہی یعنی احراق اور دخان سے وہ دو چار ہوتے رہے۔ نور کے چلے جانے کے بعد وہ ایسے مرتد اور برگشتہ از اسلام ہوئے کہ دوبارہ زمرۂ اسلام میں آنے کی توقع ہی نہیں رہی۔ جیسا کہ صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ کے ارشاد سے ظاہر ہے۔ یہ ایک منافقوں کی خاص جماعت ہے جس پر مثال

ناری منطبق ہوتی ہے۔

او کصیب من السمآء الخ کو بھی عام مفسرین نے اسی قسم کے منافقین کی مثال بیان فرمائی ہے۔ حالانکہ قرآن کے الفاظ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں ایک گروہ کی مثالیں نہیں ہوسکتیں کیونکہ آیت صمٌ بکمٌ عمیٌ الخ سے ان پر عدم رجوع الی الاسلام کا قطعی حکم لگایا گیا ہے۔ دوسری مثال میں صاف طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ یکاد البرق یخطف ابصارھم الخ ابھی تک ان میں بصارت کا مادہ موجود ہے۔ اور اس بات کا امکان ہے کہ وہ شاید ہدایت پر چل کر کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھاتے رہیں جیسا کہ کُلَّمَآ اَضاء لھم مشو فیہِ سے مفہوم ہوتا ہے۔ ان الفاظ میں غور کرنے کے بعد یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں منافقون کی دو قسموں کی دو مثالیں بیان کی گئی ہیں ایک نفاق فی الاعتقاد۔ دوسرا نفاق فی العمل۔ پہلی مثال منافقین فی الاعتقاد کی ہے اور دوسری مثال منافقین فی العمل کی۔ منافقین فی العمل کا اعتقاد اسلام کے متعلق درست ہے وہ اسلام کو سچا مذہب جانتے ہیں مگر شامت اعمال اور تکاسل کے باعث میدان عمل میں کمزوری دکھاتے ہیں۔ جیسا کہ کُلَّمَآ اضاء لھم الخ سے ظاہر ہے۔ اسلام کے تہدید آمیز جملے اور اوامر و نواہی کو جب سنتے ہیں تو انھیں صاعقہ کے مشابہ نظر آتے ہیں۔ اور احکام و اوامر ان کی جان پر ایسے مشکل معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ صاعقہ کا برداشت کرنا۔ انسان کی طاقت سے بالاتر ہے۔ اسی خوف کے مارے اس کے سننے سے اپنے کانوں میں اُنگلیاں ٹھونستے ہیں تاکہ نہ وہ سنیں اور نہ تکلیف شرعی کے پابند ہوں۔ مگر جب انھیں کوئی خاص مطلب یا ضرورت درپیش آتی ہے تو اس وقت پورے منقاد و مطیع ہوجاتے ہیں یا جب غنیمت اور مال مل جانے کی توقع ہوتی ہے تو پکے مومن بن جاتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی جنگ یا سفر میں فتح اور کامیابی نہ ہو تو اسلام کو خیرباد کہہ دیتے ہیں۔ اور اگر پھر کسی مصیبت کو دور کرانے یا کسی حاجت کو پورا کرانے کے لئے ضرورت لاحق ہو تو پھر پورے پابند اور عامل بالشرع ہوجاتے ہیں۔ ابن الوقت کی طرح جب مطلب پورا ہوجاتا ہے

تو مذہب کو خیرباد کہہ دیتے ہیں اور اپنے مشاغل دنیاوی میں منہمک اور مستغرق نظر آتے ہیں۔ جب پھر کسی موقع پر کوئی ضرورت در پیش آئی تو راہ خدا میں جانثار ہونے کے مدعی بن جاتے ہیں۔ کُلَّمَآ کا لفظ تکرار پر دلالت کرتا ہے۔ یکاد البرق سے عدم زوال بصر کا پتہ چلتا ہے لہٰذا ان دو مثالوں کو ایک گروہ پر چسپاں کرنا عدمِ تدبر الفاظ قرآن پر دال ہے۔ ان منافقین کی مثال کے مناسب مدعیان اسلام میں سے اور بھی کئی خاص فرقے پائے جاتے ہیں۔ جن کے دلوں میں اگرچہ اسلام جاگزیں ہے۔ مگر بعض بعض مسائل اور معتقدات میں ان کا من وجہٖ اختلاف ہے جیسے منکرین صفاتِ الٰہی خدا کی توحید اور ذات کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہیں مگر جب ان کے سامنے آیات صفاتِ الٰہی یا احادیث صفات الٰہی جو ان کے معتقدات باطلہ کے خلاف ہیں پڑھی جائیں، تو وہ منافقین کی طرح کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں۔ اور اس آیت کے مصداق بن جاتے ہیں۔ کَاَنَّھُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَۃٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَۃٍ۔ پارہ ۲۹ سورہ مدثر

ایسے ہی وہ لوگ جو کسی نوع کے شرک میں مبتلا اور گرفتار ہیں۔ اگر توحید خالص کی آیتیں ان پر پڑھی جائیں تو وہ بھی اس آیت شریفہ کے مصداق بن جاتے ہیں جو اللہ تعالےٰ نے ان کے حق میں نازل فرمائی ہے۔

وَاِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَحْدَہُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ وَاِذَا ذُکِرَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖٓ اِذَا ھُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ۔ (سورہ زمر پارہ ۲۴)

ایسے ہی اعدائے صحابہؓ رفضہ یا اعدائے اہل بیتؓ خوارج کے روبرو جب صحابہ رضؓ یا اہل بیتؓ کے فضائل کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں یا ان کی فضیلت میں احادیث نبویؐ سنائی جاتی ہیں تو انھیں نہایت ہی گراں معلوم ہوتی ہیں اور ان کے دل اس کے سننے سے بہت بیزار ہوتے ہیں۔ حفظنا اللہ تعالیٰ عما ابتلا بہٖ کثیراً من الناس۔

مثال مذکور میں منافقین کی غیر محسوس تکلیف کو بصورت محسوس دکھانا مقصود ہے

منافق دل ہی دل میں نہایت پریشانیوں اور مصیبتوں میں گرفتار تھے. اگر ان تکالیف و مصائب کو محسوس صورت میں دکھایا جائے تو بعینہٖ مستوقد نار یا اصحاب صیّب کی سی مصیبتوں میں گرفتار ہیں۔ ہر ایک مثال چونکہ تشبیہ مرکب کی قسم سے ہے اجزائے مثل اور ممثل لہٗ کا باہم منطبق ہونا ضروری نہیں صرف ایک حالت کو دوسری حالت سے تشبیہ دینا مطلوب ہے۔ جیسے قرآن حکیم نے منافقین کی دو قسمیں ذکر فرمائیں ویسے ہی مومنین اور کفار کی بھی دو قسمیں ہیں :-
مومنین اول السابقون المقربون جن کا ذکر سورہ واقعہ میں آیا ہے۔

(۲) انزل من السماء ماءً فسألت اودیۃٌ بقدرها فاحتمل السیل زبداً رابیاً ومن مّا یوقدون علیہ فی النار ابتغاء حلیۃٍ او متاعٍ زبدٌ مثلہ کذالک یضرب اللہ الحق والباطل فامّا الزبد فیذھب جُفاءً واما ما ینفع الناس فیمکث فی الارض کذالک یضرب اللہ الامثال (سورہ رعد پارہ ۱۳)

یہاں بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے دو مثالیں بیان فرمائی ہیں ایک ناری اور دوسری مائی۔ جو وحی کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتاری تاکہ مومنین کے قلوب اور قوائے نظریہ وغیرہ میں زندگی پیدا کرے اس کو اس پانی سے تشبیہ دی گئی جو آسمان سے زمین کی زندگی اور اس کے نشوونما کے واسطے اتارا جاتا ہے۔

قلوب کو وادیوں سے تشبیہ دی گئی۔ بعض قلوب وسیع ہوتے ہیں جو بہت سے علوم کے متحمل ہو سکتے ہیں. جیسے کہ وادئ کبیر میں زیادہ پانی کی گنجائش ہوتی ہے اور بعض قلوب صغیر جو اپنی بساطت کے مطابق تھوڑے سے علم کی استعداد رکھتے ہیں. جیسا کہ وادی صغیر میں تھوڑا سا پانی سما سکتا ہے۔ جیسا کہ وادیاں اپنی گنجائش کے مطابق پانی کو اپنے اندر جگہ دیتی ہیں. اسی طور پر قلوب بھی علم اور ہدایت کو اپنی استعداد کے مطابق قبول کر لیا کرتے ہیں. جس زمین پر سیلاب گزرتا ہے اس کے خس و خاشاک اور تنکوں کو اپنے کندھے پر اٹھا لیتا ہے۔ اسی طرح علم اور ہدایت بھی جب قلوب میں جاگزیں ہوتے ہیں تو تمام شبہات شہوات باطلہ قلبیہ کو باہر نکال لاتے ہیں۔

جیسے کسی مریض کو جب دوائے مسہل پلائی جائے تو وہ اسکے پیٹ سے مواد ردیہ و اخلاط فاسدہ کو ابھار کر باہر نکالنے میں امداد دیتی ہے اس وقت اگرچہ مریض کی طبیعت میں پریشانی اور غثیان و تکدر کے آثار نمودار ہو جاتے ہیں مگر در اصل یہ پریشانی اسکی صحت کا پیش خیمہ ہے یہ دوا اسکے بدن کو مواد موذیہ و اخلاط غیر طبعیہ سے پاک و صاف کر دیگی۔ ایسے ہی وحی الٰہی کا پانی جب قلوب انسانی میں منجذب و مجتمع ہوتا ہے تو تمام عقائد باطلہ و شبہات شیطانیہ کے استیصال میں ممد و معاون بنتا ہے۔ باطل اور ردی مواد کے اخراج کے بعد قلوب آئینہ وار ہو کر اس قابل ہو جاتے ہیں کہ انوار وحی کا عکس قبول کرلیں۔

مثل ناری میں بھی اسی طرح حق و باطل کے امتیاز کا تذکرہ فرمایا گیا۔ سنار جب سونے چاندی وغیرہ کے فلزات معدنیہ کو کٹھالی میں ڈال کر آگ پر رکھتا ہے تو جو غل و غش اس میں ملے ہوئے ہیں انکو اعماق فلزات سے نکالکر ظاہری سطح پر نمودار کر دیتا ہے اس موقع پر کھرے اور کھوٹے مفید و غیر مفید کو علیحدہ کرنا نہایت ہی آسان ہو جاتا ہے۔ خالص سونا یا چاندی کٹھالی کی تہ میں منجمد و بستہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ جس طرح پہلی مثال میں پانی کی سطح بالا سے خس و خاشاک کا دور کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ وحی الٰہی و علوم خداوندی کا نزول جس وقت قلوب و نفوس پر ہوتا ہے تو شبہات و خواہشات نفسانی کی صورت بالکل الگ تھلگ نظر آنے لگتی ہے۔ ان حالات میں ہر ذی بصر سونے کو سونا، پانی کو پانی حق کو حق باطل کو باطل جاننے میں متردد و متحیر نہیں رہتا پانی سے ہر قسم کے منافع و فوائد حاصل کیے جاتے ہیں اور خس و خاشاک بیکار و ردی سمجھے جاتے ہیں ایسے ہی زبد بیکار اور ردی شمار کی جاتی ہیں۔ علوم حقیقہ و معارف حقہ کے منافع علی الدوام ثمرات حسنہ و نتائج مفیدہ کیلئے منتج ہوتے رہتے ہیں اور شکوک و شبہات بے حقیقت ہو کر غیر ملتفت الیہ اور بے اعتنا خیال کیے جاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں قلوب بنی آدم کی تقسیم تین قسموں پر فرمائی ہے جیسے نزول مَآءٍ مِّنَ السَّمَآءِ کے وقت زمین کی تین قسمیں ذکر فرمائیں۔

(۱) زمین طیب شیریں جو پانی کو اپنے اندر جذب کر کے قوائے نامیہ و مولدہ کو مستعد و آمادہ کر دیتی ہے۔ مناسب موسم و ملائم وقت پر مختلف قسم کی کھیتیاں اور پھول پھل پیدا کرتی ہے جس سے ہزار ہا نفوس انسانی و حیوانی متمتع و مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ یہ کھیتیاں اور پھول پھل خود زمین کے لئے بھی موجب حسن و خوبصورتی سمجھے جاتے ہیں اور جن لوگوں کی زندگی کا دارو مدار ہی ان پر ہے انکے فوائد و عوائد کا تو ذکر ہی کیا۔

(۲) دوسری قسم کی وہ زمین ہے جو بصورت حوض پانی کو تو جمع کر لیتی ہے لیکن نہ اس میں کوئی سبزہ اُگتا ہے۔ اور نہ کوئی کھیتی باڑی پھول و پھل نشو و نما پاتے ہیں۔ لیکن ہزاروں جانوروں کی پیاس بجھانے اور سیر کرنے میں وہ مدد و کار آمد ثابت ہوتی ہے۔

(۳) تیسری قسم کی وہ زمین ہے جو چٹیل میدان کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ نہ تو وہ خود پانی کو جذب کرتی ہے۔ اور نہ اس کی وضع ایسی بنائی گئی جو پانی کو جمع کر سکے۔ جو بوند آسمان سے اس پر گرتی ہے اسے پھسلا کر دوسری زمین کی طرف منتقل کر دیتی ہے۔

پہلی زمین کی مثال ان لوگوں کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے۔ جنھوں نے علوم الٰہی کو اپنے دلوں میں جگہ دی اور ان سے خود بھی فائدہ اٹھایا اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچانے میں اعانت کی۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے علوم الٰہی کو حاصل کرنے کے بعد ان پر عمل پیرا ہو کر دوسروں کو اپنی تبلیغ و پند و نصیحت سے فائدہ پہنچایا۔

دوسری زمین کی مثال ان لوگوں کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے جو بہت سے علوم حقہ پڑھ کر یاد کر لیتے ہیں۔ اور ان کی حفاظت میں بھی اپنی تمام سعی و کوشش کو صرف کر دیتے ہیں مگر خود میدان عمل میں ناکام اور غیر فائز المرام نظر آتے ہیں۔ مگر اور لوگ ان سے علوم سیکھ کر شاہراہِ ہدایت پر چل کر قرب الٰہی و رضائے خداوندی حاصل کر لیا کرتے ہیں۔ مگر وہ باوجود اس قدر علوم الٰہی اور ذخائر خداوندی کے مالک ہونے کے کمثل الحمار یحمل اسفارا کا نمونہ بن جاتے ہیں۔

(۳) تیسری قسم کی زمین ان لوگوں سے مشابہت رکھتی ہے جنھوں نے نہ تو علوم الٰہیہ کو اخذ کر کے خود فائدہ اٹھایا۔ اور نہ ان علوم و ہدایات کو جمع کر کے دوسروں تک پہنچانے میں امداد کی۔ یہ مثال مومنین کے لئے بیان کی گئی ہے۔ پہلی مثال میں بھی نار اور ماء کا ذکر کیا گیا مگر وہاں چونکہ منافقین پر اس کا چسپاں کرنا مطلوب تھا۔ تو اس کے ساتھ اس قسم کے امور کا تذکرہ کیا گیا جو منافقین کے حالات سے مناسب تھے۔ سورہ رعد میں یہ مثال ہدایت اور ضلالت کے لئے لائی گئی تھی۔ اس میں ایسے مناسبات جمع کئے گئے جو اس کے ساتھ پوری مناسبت رکھتے تھے۔

پابندیاں

اطالیہ کے خلاف عاید کردہ پابندیاں ناکام رہیں، اس سے ایک تو مجلسِ اقوام کی ہیئتِ گدائی کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ دوم اس سے ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا معاشی سہولتوں اور تجارتی مال کی خرید و فروخت بند کر دینے سے جنگ رُک سکتی ہے۔ نیز معاشی دباؤ کن حالات میں کامیاب ہو سکتا ہے۔

طاقت اور غلبہ دنیا میں ہمیشہ تین قسم کا ہوا کیا ہے، روحانی، عسکری، اور معاشی۔ مذہبی اثرات جوں جوں کم ہوتے گئے روحانی تفوق کی جگہ پر پروپیگنڈا اور دہشت زدگی نے لے لی اور ان دونوں کا جنگ کی دھمکی اور بھوک سے گہرا تعلق ہے۔ اقتصادی قوت اگرچہ پہلے بھی مفقود نہ تھی لیکن اس کی اہمیت برابر بڑھتی چلی گئی۔ معاشی دباؤ کا حربہ بغیر فوجی قوت کے نہیں لایا جا سکا ہے۔

صنعتی ترقیات کے ساتھ معاشی دباؤ کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ چنانچہ اس کے استعمال پر بعض حلقوں میں اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی اور ان کے نزدیک جنگ صنعتی نظام کی دشمن قرار پائی، ان کا خیال تھا کہ لڑائی صرف پیشہ ور سپاہیوں تک محدود رکھی جائے اور اسے تجارتی اور کاروباری معاملات میں دخل انداز نہ ہونا چاہئے۔ بحری راستے جنگ کی حالت میں بھی اسی طرح کھلے رہنے چاہئیں جیسے کہ امن کی حالت میں۔ غرض صنعتی طبقہ کے لوگ کہتے تھے کہ ملکی حکومت نامعقول ہے جو ہماری تجارت پر پابندی عاید کرتی ہے اور اپنے مفاد کی خاطر ہم غریبوں کو سزا دیتی ہے۔

گذشتہ جنگِ عظیم میں مرکزی یورپ کی حکومتوں کے خلاف معاشی دیواریں حائل کی گئیں لیکن ان کی کامیابی کی صرف یہ وجہ تھی کہ اتحادیوں نے بحر و بر دونوں میں اپنی پوری فوجی قوت استعمال کی آجکل معاشی دباؤ کو فوجی قوت سے بالکل الگ کر کے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا خیال پھیل رہا ہے۔ ایسا معاشی دباؤ جنگ کا بدل ہو سکتا ہے اور نہ اسے روکنے والا لیکن آئے دن

ہڑتالیں اور بائیکاٹ ہوتے رہتے ہیں اور ان سے سماج پر جو مصائب نازل ہیں، وہ ان معاشی حربوں کی ہمہ گیر قوت کی زندہ شہادت ہیں۔ لڑائی کرنے والے ملک کے خلاف اگر ان معاشی حربوں کا استعمال کیا جائے تو وہ اپنی مفسدانہ حرکات سے باز آجائے گا۔ یا اپنی فتح کے ثمرات سے محروم ہو جائیگا۔

مجلس اقوام کے آئین کی دفعہ ۱۶ کا مفادیہ ہے کہ جملہ ارکان مجلس جنگ شروع کرنے والے ممالک کے ساتھ ہر قسم کے تجارتی تعلقات فی الفور منقطع کر دیں۔ نیز اس کی رُو سے عہد شکن حکومت اور دیگر حکومتوں کے مابین معاشی آسانیاں جاری رکھنے کی قطعی ممانعت ہے۔ خواہ ایسی حکومتیں لیگ کی رُکن ہوں یا نہ ہوں۔ اٹلی کے خلاف اس دفعہ کا اطلاق موافق حالات میں ہوا۔ معاشی حیثیت سے اٹلی ریاست ہائے متحدہ امریکہ، برطانیہ، جرمن، فرانس کی برابری نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اس کے قدرتی ذرائع محدود ہیں اور آبادی ملکی رقبہ کے لحاظ سے زیادہ ہے۔ اس کا سرمایہ اور قومی آمدنی کم ہیں۔ یہاں تک کہ موخر الذکر ۲۹ء تک برطانیہ کے مقابلے میں صرف ایک چوتھائی تھی اشیائے خوردنی اور اجناس خام کے لئے اٹلی کا دارومدار بہت حد تک دوسرے ممالک پر ہے۔ بیشتر چیزیں جو جنگ میں کام آتی ہیں شلاً کوئلہ، تانبا، لوہا، روئی، سیسہ، اون، تیل باہر سے آتی ہیں۔ وہاں نکل (Chrome) پلاٹینیم (Tungolee) ٹین اور ربڑ نہیں پیدا ہوتے۔ اس کا تجارتی توازن ہمیشہ ناموافق رہا ہے، یہاں تک کہ اٹلی کے ملکی بجٹ میں ۱۹۳۱-۳۲ء میں ڈیڑھ کروڑ ڈالر کی کمی تھی جو ۳۴ء میں ڈھائی کروڑ تک پہنچ گئی۔

اسی طرح اٹلی کی جغرافیائی حیثیت بھی کمزور ہے، بحیرہ روم کے اندرونی اور بیرونی راستوں پر برطانیہ قابض ہے، خشکی کی راہ سے مال تجارت مجلس اقوام کے علاقہ سے ہو کر جاتا ہے۔ اٹلی کے قریبی ہمسائے سوئزرلینڈ اور آسٹریا اسے چھیڑنا نہیں چاہتے۔ تاہم سمندر پار کا سامان جو اسے بھیج سکتے تھے اس کا فرانس یا جرمنی کی حدود سے گذرنا ضروری تھا۔ جرمنی کی بین الاقوامی اقتصادی حیثیت اسقدر نازک تھی کہ وہ اٹلی کے مفاد کے لئے اپنے کو خطرے میں ڈالنے کے لئے تیار نہ تھا۔

علاوہ بریں جاپان، برازیل اور امریکہ لیگ کے رُکن نہ تھے۔ جاپان کا معاشی رویہ کوئی

اہمیت نہ رکھتا تھا۔ اس لئے کہ جن چیزوں کی اسے خود ضرورت تھی وہ اٹلی کو کیونکر مہیا کر سکتا تھا۔ امریکہ اٹلی کی اکثر ضروریات پوری کر سکتا تھا بشرطیکہ وہ غیر جانب دار رہکر اختیارات کو استعمال کرنے پر اصرار کرتا۔ برطانیہ لیگ کا روح رواں ہونے کے باوجود امریکی مال تجارت کو جبرالٹر میں روک نہیں سکتا تھا لیکن اس صورتِ حال کا پیدا ہونا ممکن نہ تھا، کیوں؟ اس لئے کہ خود امریکہ میں رائے عامہ اٹلی کے خلاف ہو گئی تھی۔ غیر جانب داری کی صورت بدل دی گئی۔ اسلحہ کی برآمد بند کر دی گئی زیادہ سے زیادہ اٹلی وہی مقدار منگا سکتا تھا جو جنگ سے پہلے تھی۔

سب سے بڑی بات اٹلی کی تائید میں یہ تھی کہ جنگ مختصر اور چھوٹے پیمانے پر تھی۔ حبشہ کے پاس میکانکی آلات حرب نہ تھے اس لئے اٹلی کی جنگی ضروریات بھی کم تھیں۔ چند مہینوں کے اندر اس نے کافی سامانِ حرب جمع کر لیا تھا اور لڑائی میں اگر کمی ہو جاتی تو وہ قلیل آلاتِ جنگ کی درآمد سے اس کی تلافی کر سکتا تھا۔ ایک اوّل درجے کی طاقت اور حکومت کے مقابلہ میں اٹلی کو جسقدر سامانِ حرب درآمد کرنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی وہ حبشہ کے مقابلہ میں محسوس نہیں ہوئی۔

مزید برآں اکثر منڈیوں میں کساد بازاری تھی۔ کارخانہ دار اپنا مال فروخت کرنا چاہتے تھے باوجودیکہ قیمت ملنا یقینی نہ تھا۔ ان ملکوں کی حکومتیں دنیا کی گھٹتی ہوئی تجارت دیکھ کر نئے معاہدات کرنے کے لئے تیار رہتی تھیں۔ اٹلی کی درآمد سنہ ۱۹۲۹ء میں ۲۱۰۲ کرور لائیرا سے گھٹ کر سنہ ۱۹۳۳ء میں ۷۰۴ کرور لائیرا تک پہنچ گئی۔ اس مالی درآمد کا ۱۴۰۶ فی صدی جرمنی سے آتا تھا ۱۵ فی صدی امریکہ سے، ۹۰۸ فی صدی انگلستان سے اور ۵½ فی صدی فرانس سے۔ اس تخفیف کی وجہ اٹلی کا شدید (Quota System) تھا نیز یہ کہ وہ اپنی تجارتی قرضہ جات ادا نہیں کر سکتا تھا۔

معاشی دباؤ کا یہ مقصد کہ مجلس اقوام کے بائیکاٹ کے خدشے سے جنگ رک جائے گی حاصل نہ ہو سکا۔ اٹلی کو اس انقطاعِ تعلق کا ڈر نہ تھا اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس کا رویہ

حق بجانب تھا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ جمعیتِ اقوام مانچوریا کے معاملہ میں منصفانہ حیثیت ظاہر کرچکی ہے۔ یا ممکن ہے اٹلی نے یہ فرض کرلیا ہو کہ نو آبادی حاصل کرنے کے لئے حبشہ جیسے غیر مہذب ملک پر چڑھائی کرنا امنِ عامہ پر حملہ کرنے کا مرادف نہ ہوگا۔ برطانیہ عظمیٰ نے آسٹریلیا کے معاملہ میں سکوت ظاہر کیا اور بعدازاں حملہ کی صورت میں اپنا آئندہ رویہ بھی نہ بتایا۔ ممکن ہے اٹلی نے اس حالت کو خاموش اغماض سمجھا ہو، زوردار، واضح، غیر مبہم الفاظ میں ۱۱ ستمبر ۱۹۳۵ء تک اعلان نہیں ہوا، جب کہ برطانوی سیاست اخلاقی بلندی کے عروج پر پہنچی ہوئی معلوم ہوتی تھی، اس پر طرہ یہ کہ مفاہمت کے دوران میں دونوں ملکوں کے لئے اسلحہ کی درآمد روک دی گئی اور یہ فعل حملہ آور کے حملہ کی خاموش تائید تھا، اٹلی جنگ کے لئے بالکل تیار ہوچکا تھا اور مئی ۱۹۳۵ء تک شرقی افریقہ کی اس مہم پر ۲ کروڑ بیس لاکھ لائیر خرچ ہوچکے تھے۔ اگر اجناسِ خام پر تحدید نہ ہوتی تو اٹلی اپنے اسلحہ خود تیار کرسکتا تھا اور حبشہ کے پاس اسلحہ خریدنے کے لئے نہ تو نقد روپیہ تھا نہ ساکھ کہ جس سے اسلحہ مستعار لے لیتا اور نہ وہ خود اپنے ملک میں ہتھیار بنا سکتا تھا۔ سٹرولٹ نے حبشہ میں جو تیل کی مراعات حاصل کی تھیں اور جن کے معاوضہ میں شاہ حبشہ کو نقد روپیہ جس کی اُسے سخت ضرورت تھی مل سکتا تھا ان پر دباؤ ڈال کر واپس کردی گئیں۔ یہ بھی اٹلی کی کھلی ہوئی تائید تھی، سب سے آخر یہ کہ حکومت اٹلی کو خوب معلوم تھا کہ حکومتِ فرانس آسٹریا کے مقابلہ میں حبشہ پر اٹلی کا اقتدار گوارا کرلے گی۔

معاشی پابندیاں جنگ کا انسداد کرنے میں ناکام نہیں ہوئیں، کیونکہ وہ اس مقصد کے لئے عاید ہی نہیں کی گئیں کسی سلطنت نے اٹلی کو لیگ کی رکنیت سے خارج کردینے کی دھمکی نہیں دی باوجودیکہ وہ علانیہ لیگ کی دفعہ نمبر ۱۶ کی خلاف ورزی کرچکا تھا۔ اس پر اٹلی نے یہ قیاس کیا (اور وہ درست بھی تھا) کہ متعلقہ حکومتیں لیگ کے آئین کے احترام کے لئے کونسل کو بھی یہ مشورہ نہ دیں گی کہ اٹلی کے خلاف متفقہ طور پر کوئی بحری، بری اور فضائی کارروائی کی جائے کہ وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوجائے اور لیگ کا وقار قایم رہے۔

۹ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو اٹلی کے جارحانہ اقدام کا اعلان کیا گیا اور معاشی پابندیاں عاید کرنے کا فیصلہ ۱۰ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو ہوا لیکن ان کا نفاذ ۱۸ر نومبر سے پہلے نہیں ہوا، پابندیاں فوراً عاید نہیں ہوئیں اور نہ وہ ہر قسم کی تجارت اور کاروباری تعلقات پر حاوی تھیں جو دوسری حکومتوں اور آئین شکن حکومت کے مابین قایم تھے۔ ۱۴ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو مجلس اقوام کی آرڈی ننس کمیٹی نے اٹلی کے ساتھ جملہ مالی اور کاروباری تعلقات کی ممانعت کردی، اٹلی کی حکومت کے لئے چندہ جمع کرنا، بنکوں کا اس سے لین دین کرنا، تجارتی ہنڈیوں کا تبادلہ اور دیگر ہر قسم کے قرضہ جات بند کر دئیے گئے۔ یہ مالی قطع تعلق بہت سخت تھا اور اس سے تجارتی حلقوں نے دقت بھی محسوس کی لیکن عملی اعتبار سے اس کی اہمیت صفر کے برابر تھی، کیونکہ اٹلی کی مالیات پہلے ہی روبہ تنزل تھی (اور شاید حبشہ کو ہڑپ کر جانے کی یہی ایک وجہ ہو) اس کا بیرونی قرضہ اتنا کم تھا کہ اسے کوئی دقت نہ ہوتی کسی سلطنت کے عوام یا تاجر پیشہ لوگ اٹلی کو قرضہ نہیں دینا چاہتے تھے۔ تبادلہ زر پر پورا قبضہ ہونے کے باعث غیر ملکی تاجروں کو سخت مشکلات کا سامنا ہوا۔ کیونکہ ان کو برآمد کردہ مال کا روپیہ نہیں ملتا تھا۔ اگست ۱۹۳۵ء تک برطانوی تاجروں کی دو لاکھ پونڈ کی رقم بقایا تھی، تجارتی بائیکاٹ کے اس سے زیادہ کچھ معنی نہیں تھے کہ اخلاقی فرض کے طور پر مجلس اقوام نے اٹلی کے ساتھ دانشمندانہ کاروباری رویہ اختیار کیا۔

۱۹ر اکتوبر ۱۹۳۵ء کو یہ تجویز پاس ہوئی کہ اٹلی کی پیداوار اور مصنوعات کی درآمد بند کردی جائے۔ پچاس حکومتوں نے اس پر صاد کیا۔ ان کی مجموعی تجارت اٹلی کے بیشتر مال برآمد پر مشتمل تھی۔ دسمبر ۱۹۳۴ء سے فروری ۱۹۳۵ء تک ہر ماہ کی اوسط برآمد دو کروڑ ڈالر تھی جو ۱۹۳۵-۳۶ء کے انہی مہینوں میں ایک کروڑ بیس لاکھ ہوگئی۔ دسمبر کے بعد ایک کروڑ نوے لاکھ سے گھٹتی گھٹتی پچاس لاکھ رہ گئی۔ بالفاظ دیگر اٹلی کی قوت خرید بقدر ۳/۱ کم ہوگئی۔ اسی درآمد کی دیوار حائل ہو جانے سے ملکی تجارتی تباہی کا اندیشہ ہو چلا تھا۔ امریکہ کی درآمد جنوری ۱۹۳۵ء دو لاکھ ڈالر تھی جو مارچ ۱۹۳۶ء میں ... ۹ ڈالر رہ گئی۔ فرانس کی درآمد بھی دو لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ گئی لیکن امریکہ نے

مارچ ۱۹۳۶ء میں اٹلی سے اتنا ہی مال خریدا جتنا کہ جنوری ۱۹۳۵ء میں خرید کیا تھا (یعنی ایک لاکھ ساٹھ ہزار ڈالر) جرمنی نے بھی خرید میں کمی کر دی لیکن مارچ ۱۹۳۶ء میں یہ تعداد بڑھ گئی۔ سوئٹزرلینڈ نے اپنی خرید نصف کر دی۔ آسٹریا اور ہنگری دونوں نے اپنی خرید کا تناسب بحال رکھا یا کبھی کچھ زیادہ کر دیا اکسچینج (Exchange) پر قبضہ ہونے کی وجہ سے اٹلی کا روپیہ جرمنی، آسٹریا اور ہنگری کے ذمہ تھا وہ نہیں مل سکتا تھا کہ وہ اس روپے سے دوسرے ممالک سے اپنی ضروریات خرید سکے۔

اٹلی کوئی ایسی چیزیں تیار نہیں کرتا جو دوسرے ذرائع سے دستیاب نہ ہو سکتیں، اٹلی کو الگ کر دیا جائے تو کسی چیز کی کمیابی کا اندیشہ نہیں ہو سکتا لیکن دقت اٹلی کے ان قرض خواہوں کو ہوئی جن کے مطالبات اطالوی مال کی شکل میں ادا کئے جاتے تھے۔

اٹلی کی برآمد پر کامل پابندی بھی عاید کر دی جاتی تو اس کی قوت خرید بالکل تباہ نہ ہو سکتی تھی کیونکہ سونا چاندی اور سکہ جات اس پابندی سے مستثنے قرار دیئے گئے تھے۔ گو ان کے ملک سے باہر چلے جانے کی وجہ سے اٹلی کے ذخائر پر ضرب کاری لگی تاہم وہ اس طریقہ سے اپنی ضروریات خریدتا رہا۔ بنک آف اٹلی کا زر مخصوص جو جنوری ۱۹۳۴ء میں ۳۷ کرور ڈالر تھا اگست ۱۹۳۴ء میں ۲۷ کرور رہ گیا۔ نومبر ۱۹۳۵ء سے مارچ ۱۹۳۶ء تک اٹلی کو آٹھ کرور ستر لاکھ ڈالر کا نقصان ہوا لیکن یہ رقم اس قوت خرید کی کمی کو پورا کرنے کے لئے بہت کافی تھی جو برآمد کی تخفیف کے باعث واقع ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ اٹلی نے اپنے باشندوں کی غیر ملکی کفالتیں حاصل کر لیں اور ان کو تبادلہ میں اطالوی تمسکات ۵ فیصدی سود کے اضافہ کے ساتھ دیدیئے، اس ترکیب سے اٹلی کی حکومت نے اپنی رعایا سے بیس کرور ڈالر کے تمسکات حاصل کئے اور اُن کو ممالک غیر میں فروخت کر دیا اس فروخت سے جو روپیہ ملا اس کو اپنی ضروریات کی خرید میں صرف کیا گیا نتیجہ یہ نکلا کہ اٹلی کی قوت

(Bauxits) المونیم اور لوہا وغیرہ بھی شامل کر دیئے گئے اسی ذریعہ سے اٹلی کی درآمد بہت
حد تک کم ہوگئی۔

اس قسم کی معدنی پابندیاں طویل عرصے کی لڑائی میں یقیناً کارگر ہوسکتی ہیں، بشرطیکہ وہ
مکمل ہوں اور نیم تیار شدہ چیزوں پر حاوی ہوں۔ اٹلی کی لوہے کی پیداوار سات لاکھ ٹن ہے اور
یہ مقدار اس کے لئے کافی نہیں، چنانچہ دو لاکھ ٹن لوہا اسے باہر سے منگوانا پڑتا ہے۔ لوہے پر
پابندی ایک طویل المدت جنگ میں اس کے لئے تکلیف دہ ہوسکتی تھی کیونکہ جو دھاتیں آلاتِ
جنگ کی تیاری میں کام آسکتی ہیں ان کے لئے اٹلی کا انحصار دوسرے ممالک پر ہے لیکن چونکہ جنگ
بڑے پیمانے پر نہ تھی جس میں جمع کردہ سامانِ حرب جلد ختم ہوجاتا ہے، اٹلی اس کمی کو نیم تیار شدہ
چیزوں کی درآمد سے پورا کرسکتا تھا (Pig Iron) اور آہنی سلاخوں کی درآمد کی اسے
اجازت تھی۔ جملہ معدنیات کی ماہانہ میزان جو دسمبر ۳۴ء میں ۷۸۰۰۰ ٹن تھی۔ جنوری ۳۶ء میں ۱۸۰۰۰
اور مارچ ۳۶ء میں ۱۵۰۰۰ ٹن رہ گئی اور مارچ ۳۶ء میں پھر ۲۲۰۰۰ ٹن ہوگئی۔ ممنوع فولاد کا
سامان جرمنی آسٹریا اور امریکہ سے آتا رہا اور غیر ممنوع چیزیں روس اور فرانس سے آئیں۔ یہاں تک
کہ مارچ ۳۶ء تک اٹلی کی درآمد بہتر حالت میں ہوگئی اور جو سلطنتیں ان پابندیوں میں شریک
نہ تھیں ان کو بھی فائدہ ہوا۔ کوئلہ، تیل اور تانبے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اٹلی نے اپنی کوئلہ کی درآمد
بہت حد تک کم کردی۔ دسمبر ۳۴ء اور جنوری ۳۵ء میں ۱۱ لاکھ ٹن کی درآمد تھی جو مارچ ۳۶ء
میں ۶ لاکھ سترہ ہزار ٹن تک گھٹ گئی۔ سب سے زیادہ نقصان برطانیہ کو اٹھانا پڑا جس کی برآمد
۴ لاکھ ۲۰ ہزار ٹن سے صفر کے برابر ہوگئی۔ جرمنی، بلجیم اور امریکہ نے فائدہ حاصل کیا۔ پابندیاں
عائد کرنے والی سلطنتوں کو اگرچہ تیل بیچنے کی اجازت تھی تاہم اس کی برآمد میں بہت کمی واقع
ہوگئی (کروڈ آئل) دسمبر ۳۴ء میں ۸ ہزار ۹ سو ۸۴ ٹن سے فروری ۳۶ء میں تین ہزار تیس
ٹن اور مارچ میں ۶ ہزار ۷ سو ۳ ٹن ہوگیا (Moter Sprit .) کی برآمد مارچ ۳۵ء
میں ۲۳ ہزار ۶ سو ۸۰ ٹن تھی جو فروری ۳۶ء میں ۳ ہزار ۷ سو ۴۷ ٹن رہ گئی اور مارچ ۳۶ء

میں ۹ ہزار دو سو ۲۳ ٹن ہوگئی گیس آئل اور ایندھن کی برآمد دسمبر ۱۹۳۴ء میں ۹۹ ہزار چھ سو ۱۵ ٹن سے جنوری ۱۹۳۶ء میں ایک لاکھ ۲۱ ہزار ایک سو چوبیس ٹن ہوگئی اور مارچ ۱۹۳۶ء میں ۱۴۱ ہزار ۵ سو تراسی ٹن تک پہنچ گئی (Lubricating oil (دُہنیات) کی برآمد دسمبر ۱۹۳۴ء میں ۲۶۸۶۷ ٹن سے گھٹ کر مارچ ۱۹۳۶ء میں صرف ۹۹۹ ٹن رہ گئی۔

پابندیوں کے اثر انداز ہونے سے پہلے ہی اٹلی اپنی ضرورت کے لئے سامان حرب کا بڑا ذخیرہ کر چکا تھا، اس نے اپنی تیل کی ضروریات امریکہ سے خریدنا شروع کر دی تھیں جو ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک ۶ ½ فیصدی تیل مہیا کرتا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں سال بھر اٹلی امریکہ سے ۱۲ ½ فی صدی تیل خریدتا رہا اور اسی سال جنگ کے تین مہینوں یعنی اکتوبر، نومبر، دسمبر میں یہ تعداد ۱۷ ½ فیصدی تک بڑھ گئی۔ جرمنی اٹلی کو کوئلہ بھیجتا رہا اور اس کو برطانیہ عظمیٰ سے بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔ امریکہ نے تیل بھیج کر اٹلی کو اس قابل کر دیا کہ وہ رومانیہ اور روس سے بدلہ لے سکے۔ رومانیہ نے اٹلی کو ۲۵ ہزار ٹن گیس اور جلانے کا تیل جنوری ۱۹۳۶ء میں بھیجا اور گیارہ ہزار ۶ سو ٹن مارچ میں لیکن امریکہ کے پٹرول کی برآمد مارچ ۱۹۳۶ء میں دسمبر ۱۹۳۵ء کے مقابلہ میں ایک تہائی رہ گئی، روس کی برآمد ۲۰۰۰۰ ٹن سے گھٹ کر ۵۲۰۰ ٹن ہوگئی۔ پابندیاں عاید کرنے والے ملکوں کی تانبے کی برآمد زیادہ ہوگئی جن میں سے امریکہ سب سے زیادہ تانبہ مہیا کرتا تھا۔ چونکہ ان منڈیوں کا دروازہ اٹلی کے لئے کھلا ہوا تھا اس لئے کوئلہ، تانبا اور تیل پابندیوں سے مستثنےٰ قرار دیئے گئے۔

حکومت امریکہ نے اٹلی کو تیل بھیجنا بند نہیں کیا۔ قانونی غیر جانب داری کے ماتحت "آلاتِ جنگ" کی برآمد روک دی گئی تھی لیکن یہ بھی یقینی طور پر واضح نہ تھا کہ بموں کے لئے ایندھن یا بارود آلاتِ جنگ کی تعریف میں شامل ہے۔

مجلس اقوام کی سلطنتوں کے لئے شاید یہ ممکن تھا کہ وہ پابندیوں کی مدافعانہ حکمتِ عملی سے تجاوز کر کے پیش قدمی شروع کر دیں تاکہ بائیکاٹ میں حصہ لینے والی حکومتیں ان حکومتوں کا اٹلی میں مال بھیجنا بند کر دیں جو بائیکاٹ میں شریک نہ تھیں اور یہ اس طریقہ سے ہو سکتا تھا کہ نہر سویز

اور جبل الطارق پر مال روک لیا جاتا، امریکہ کی رائے عامہ شاید اس کی تاب نہ لاسکتی کیوں کہ غیر جانب داری کا نیا مفہوم جس کا منشا امریکہ کو جنگ سے علیحدہ رکھنا تھا اور جو غیر جانب داروں کے اختیارات کے استعمال پر نہیں بلکہ فرائض پر زور دیتا تھا، ابھی تک عام طور پر نہیں سمجھا گیا تھا۔ لیکن معاشی پابندیوں کے اطلاق نے حالتِ جنگ فرض کر لی جو حملہ آور طاقت نے لیگ کے تمام ارکان کے خلاف پیدا کر دی تھی بین الملی امن کی خاطر مدافعانہ معاشی جنگ لڑنا بین الاقوامی آئین اور امریکن رائے عامہ کے رو سے درست تھا امریکہ کو اس بات پر آمادہ کرنا ممکن تھا کہ وہ مال کی برآمد بند کر دے جو بصورتِ دیگرا سے جنگ کی لپیٹ میں لاسکتی تھی۔ امریکہ کی حکومت کا رویہ کسی طرح بھی ایسے تصادم کے خلاف نہ تھا جو امریکی آئین اور موجودہ سیاسی حالات کے ماتحت ممکن تھا۔ کاروباری حلقے اپنے نفع کے خیال سے شاید اسپہ معترض ہوتے بالخصوص اس حالت میں کہ ان کو امریکہ کے تیل کے لئے مستقل منڈیاں ہاتھ آرہی تھیں۔ ان کی مخالفت کو اس طریقہ سے دور کیا جاسکتا تھا کہ امریکن کمپنیاں تیل کی وہ مقدار جو اٹلی بھیجی جاتی تھی ان سے خرید لیتیں۔ تیل کی صنعت کے اجارہ دارانہ انتظام میں یہ بات بہت آسان تھی۔ امریکہ سے یہ درخواست کرنا بھی ممکن تھا کہ وہ ربڑ اور نکل ممالک غیر سے منگوا کر بھی اٹلی کو مہیا نہ کرے لیگ کی دفعہ نمبر۱۶ کے ماتحت معاشی پابندیوں کے عاید ہونے سے معاشی جنگ کی حالت پیدا ہو گئی اور معاشی جنگ معاشی دباؤ کی حد تک پہنچے بغیر کامیابی سے نہیں لڑی جاسکتی۔ امریکہ کی حکومت کا رویہ مناسب طور پر جانچا نہیں گیا اگر یہ امر صاف الفاظ میں بیان کر دیا جاتا کہ جنگ کی حالت نہ صرف اٹلی اور حبشہ کے درمیان بلکہ اٹلی اور مجلس اقوام کے مابین قایم ہو چکی ہے تو کیا امریکہ کو تیل، تانبا، ربڑ اور نکل فروخت کرنے پر اصرار ہو سکتا تھا۔

مجلسِ اقوام کی حکمتِ عملی نامکمل تھی، نہ صرف بعض سامان حرب مثلاً تیل پہ پابندی عاید نہیں ہوئی بلکہ جہازوں کی آمدورفت، سیاحوں کی تجارت اور تارکان وطن کی ترسیلاتِ زر میں بھی مداخلت نہیں کی گئی۔ اٹلی کا رویہ صاف اور واضح تھا کہ ہم تمام پابندیوں کا جب تک کہ وہ ہمیں بہت

سخت نقصان نہ پہنچائیں، مقابلہ کریں گے اور اگر وہ حد سے بڑھ گئیں تو ہم لڑیں گے"۔ اب لیگ کے لئے صرف دو ہی صورتیں تھیں یا تو وہ اٹلی کا چیلنج منظور کر کے اس پر ایسی پابندیاں عاید کرتی کہ اس کے لئے لڑنا ناممکن ہو جاتا یا پھر اس بات کا اعتراف کر لیتی کہ حبشہ کی آزادی عالمگیر جنگ کے مقابلہ میں کچھ قیمت نہیں رکھتی، بہت ممکن تھا کہ ایسی جنگ پیش ہی نہیں آتی لیکن یہ یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ پابندیاں ناکام رہیں۔ دباؤ اگر ڈالا ہی نہ گیا ہو تو ناکامی کیسی؟ نہ یہ امر بھی ثابت ہوا ہے کہ معاشی دباؤ ڈالنے سے جنگ کا پیش آنا لازمی تھا۔ اگر اٹلی کی حکومت سے صحیح اور معقول حکمتِ عملی کی توقع تھی تو حبشہ کی جنگ فتح کرنے کا مناسب طریقہ یہ نہ تھا کہ وہ لیگ سے جنگ مول لے۔ بصورتِ دیگر یہ حکمتِ عملی اگر غیر معقول تھی اور اس کی باگ ڈور ایک مخبوط الحواس کے ہاتھ میں تھی جو مضطرب ہو کر ساری دنیا سے ٹکرانا چاہتا تھا تو ابتدا ہی حکومتوں کی اکثریت کو عسکری قوت استعمال کرنا چاہئیے تھا۔

لیگ کے اجلاس میں اٹلی کو ظالم قرار دیا گیا کہ اس نے ایک مقدس آئین کی خلاف ورزی کی لیکن ساتھ ہی اس اخلاقی مجرم کو جس نے دانستہ لیگ کے قانون کی دھجیاں بکھیر دیں، درخواست کی گئی کہ وہ باقاعدہ اس کا رکن بنا رہے۔ لیگ کا یہ فعل اسقدر غیر مناسب تھا کہ اگر مادی شکست نہ بھی ہو تو اخلاقی شکست یقینی ہے۔

مانا کہ اٹلی کے ساتھ سیاسی تعلقات قایم رکھنے کے خاص اسباب ہوں اور ایسے تعلقات غیر ارکین سے بھی ہیں لیکن اٹلی کو لیگ کا رکن بنائے رکھنا اور اس کو تمام مراعات سے استفادہ کرنے کا موقع دینا باوجودیکہ اس نے بنیادی قانون توڑ دیا، ایک ایسا کھلا مذاق تھا جس سے اٹلی کو اس حد تک پہنچنے کی جسارت ہوئی۔

پابندیوں نے اٹلی کے لئے کافی مشکلات پیدا کر دیں اس کی ضروری اشیاء خوردنی اور اجناس خام کی درآمد چار کروڑ پچاس لاکھ ڈالر سے گھٹ کر مارچ ۱۹۳۶ء تک دو کروڑ ساٹھ لاکھ رہ گئی اور شاید اس دباؤ کی شدت اور بھی تیز ہو گئی ہو۔ سونے کا ذخیرہ ختم ہونے اور غیر ملکی تبادلہ رُک جانے

سے غالباً ملک کے اندر قحط رونما ہو جاتا لیکن اس اثنا میں موجودہ ذخیرہ اور جزیرسی آڑے آئی نیز سونے کے ذریعے مال کی خرید، غیر ملکی کفالتوں، تارکانِ وطن کی ہنڈیوں اور سیاحوں کے مصارف کی وجہ سے ملک کے اقتصاد پر ناقابل برداشت بوجھ نہیں پڑا تاہم بڑھتی ہوئی گراں باری کا خدشہ موجود تھا اور شاید یہی وجہ ہو کہ اٹلی نے زہریلی گیس کی استعمال کا فیصلہ کر لیا اور اِس طرح ایک اور مقدس ضابطے کو توڑ دیا۔

چونکہ دنیائے تجارت کی حالت بہتر ہو رہی تھی اس لئے پابندیاں عائد ہونے سے بعض ملکوں کی کل میزان تجارت پر کوئی زیادہ اثر نہیں پڑا۔ برطانیہ عظمیٰ کی برآمد بجز اٹلی کے ۱۱۸۰۰۰۰۰ (گیارہ کروڑ اسی لاکھ) سے مارچ ۱۹۳۶ء میں بارہ کروڑ چالیس لاکھ ہو گئی۔ اٹلی کی برآمد تیس لاکھ سے گھٹ کر ایک لاکھ رہ گئی۔ چنانچہ اٹلی کی منڈیوں میں برطانیہ کو جو نقصان پہنچا اس کی دوسرے ملکوں سے تلافی ہو گئی، دوسرے ملک کم خوش قسمت ثابت ہوئے۔ اٹلی کی فرانس سے درآمد مارچ ۱۹۳۵ء میں سترہ لاکھ سے مارچ ۱۹۳۶ء میں ۳½ لاکھ رہ گئی۔ فرانس کی دوسری اشیا کی برآمد پچاس کرور سے انچاس کرور ہو گئی۔ رومانیہ کی کل ماہانہ تجارت مارچ ۱۹۳۵ء سے مارچ ۱۹۳۶ء تک باون لاکھ سے گر کر اڑتالیس لاکھ رہ گئی اور اٹلی کے ساتھ اس کی تجارت آٹھ لاکھ تیس ہزار سے دو لاکھ انیس ہزار رہ گئی۔

ان سلطنتوں کو جنہیں اٹلی کی درآمد بند ہو جانے سے اور اٹلی کی منڈیاں ہاتھ سے چلے جانے کی وجہ سے نقصان کا اندیشہ تھا باہمی امداد و اعانت کی تدابیر سوچی گئیں۔ مشترکہ فنڈ کی تجویز منظور نہ ہوئی لیکن تجارت کی کمی پورا کرنے کے لئے آپس میں ایک دوسرے کو بعض اشیا منتقل کر دینے پر اتفاق ہو گیا لیکن چونکہ غیر مساوی نقصانات کا حادثہ ناگزیر تھا اس لئے بعض قومیں ایک دوسرے پر الزام لگاتی رہیں، اور شاید یہی وجہ تھی کہ اٹلی پر دباؤ کا اثر کم ہوتا گیا جیسا کہ مارچ ۱۹۳۶ء کے اعداد و شمار سے ظاہر ہے۔

ظاہر ہے کہ مجلس اقوام کے ارکان کے لئے ایک ضدی قوم کے خلاف یکساں معاشی

حکمتِ عملی کا جاری رکھنا دشوار تھا۔ اِس حالت میں کہ خود ان کے باہمی معاشی اغراض ایک دُوسرے کے مخالف تھے۔ اقتصادیات میں جابرانہ بدنظمی پیدا ہو رہی ہو تو سیاسی حیثیت سے اجتماعی امن قایم نہیں رہ سکتا۔

اہلِ غرض حلقوں میں نقصان کے باعث قدرتاً بے اطمینانی کا اظہار رہوا، اب تک بیرونی لڑائیاں حصولِ منفعت کے لئے بہترین مواقع پیدا کرتی رہیں۔ پابندیوں نے نہ صرف ایسے موقعے کھو دئیے بلکہ بعض مصنوعات کو خاصہ نقصان پہنچایا ممکن ہے بعض نقصانات موہوم ہوں۔ اٹلی کے ہاتھ مال فروخت کرنا آسان تھا لیکن روپیہ اکٹھا کرنا مشکل تھا۔ پابندیوں نے تجارت کی مقدار معین کر دی اور نقدلین دین جاری کرکے رہے سہے کاروبار کو قایم رکھا، بدقسمتی سے پابندیاں عاید کرنے والی حکومتوں نے اپنے اہلِ ملک کے لئے تجارتی نقصان کی تلافی کرنے سے انکار کر دیا اور درحقیقت اِس قسم کے مطالبات کو پورا کرنا آسان بھی نہ تھا لیکن آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ معاشی جنگ و جدل کا بارِ گراں لوگوں کے ایک خاص طبقے کو اٹھانا پڑے ؟ مثلاً ایسا کیوں ہے کہ برطانوی کوئلہ فروش خسارہ برداشت کریں حالانکہ برطانوی تیلی فائدہ اٹھا رہے ہوں ؟ اگر شروع میں یہ اصول تسلیم کر لیا جاتا کہ خاص خاص حلقوں کی بجائے پوری قوم معاشی جنگ کا بوجھ برداشت کرے تو مخالفت بہت کم ہوتی۔ مزید برآں جارحانہ اقدام کرنے والے کو صاف طور پر کہہ دینا چاہئے تھا کہ اس کی وجہ سے تجارت کو جتنا بھی نقصان پہنچے وہ اس کی تلافی کا ذمہ دار ہوگا۔ تاوانِ جنگ بسا اوقات ایک قسم کا ناجائز ٹیکس ہوتا ہے۔ اکثر و بیشتر فاتح اپنے کو عدالت کا منصف قرار دے کر اپنے ہی نقصانات کا تخمینہ لگاتا ہے لیکن لیگ کے ارکان جس کے قواعد ایک بانیِ فساد نے جو خود بھی اس کا رکن تھا توڑ دئیے تھے تلافی کا حق رکھتے تھے۔

پابندیاں اگرچہ ایسی موثر نہ تھیں جیسا کہ ہونا چاہئے تھیں تاہم لیگ نے یہی ایک حربہ اٹلی کے خلاف استعمال کیا اور قبل اِس کے کہ لیگ کے ارکان اور حملہ آور سلطنت میں صلح ہو جائے اِس ہتھیار کو رکھ دینا اِس امر کا کھلا ثبوت ہے کہ ذمہ دار طاقتیں اِس معاشی حربے کو یا تو استعمال ہی کرنا نہیں چاہتی تھیں یا پھر ان میں اس کے مناسب استعمال کی ہمت نہ تھی ممکن ہے اس کی دونوں وجہیں ہوں۔

پاٹ

(ریڈیو ڈراما)

(صرف آوازیں سنائی دیتی ہیں)

مقام ——— یوپی کا کوئی شہر

زمانہ ——— موجودہ

—

کردار جس طرح سامنے آتے ہیں

شیخ جی	ایک جلاہا۔ جو پیشہ چھوڑ چکا ہے۔
یوسف	شیخ جی کا پوتا عمر ۷ سال نذرو کا بیٹا
شیخانی	شیخ کی بیوی
زلفن	شیخ جی کی لڑکی عمر ۱۵ سال
یوسف کی ماں	نذرو کی بیوی
بفاطن	باورچن ——— آج کل بیکار ہے
رتن لال	ایک وکیل جو "اگاہیوں"[1] پر روپیہ بانٹتا ہے
منا	رتن لال کی بیوی
راج منی	رتن لال کی خادمہ

[1] ایک اگاہی دس روپیہ کی ہوتی ہے۔ ایک اگاہی لینے کے بعد عبہ ماہوار سال بھر تک دینا ہوتا ہے

داروغہ جی ایک تھانیدار

نذرو شیخ جی کا بڑا لڑکا عمر ۲۵ سال میونسپلٹی میں ۱۵ روپیہ ماہوار کا ملازم ہے

یامین نذرو کا بڑا لڑکا۔

دوکاندار نخاس میں بیٹھنے والا ایک کباڑی

پہلا ایکٹ ——————— پہلا سین

(نخاس - دور پر آوازیں آرہی ہیں

۱- کیا بولے اس میز کا —— کیا بولے —— کیا بولے اس میز کا ...."

۲ " نو آنے ایک —— نو آنے دو —— نو آنے ...."

۳ " ہر مال ملے گا چار آنے کو —— ہر چیز ملے گی چار آنے کو" (دھن میں)

آدمیوں کے چلنے پھرنے، بولنے غل مچانے کا غوغا۔)

(ایک منٹ تک یہی غل و شور سنائی دیتا ہے۔ پھر بالکل قریب سے آواز آتی ہے)

دوکاندار- بڑے میاں کیا چاہتے ہو۔ آؤ —— ادھر آؤ ہم دکھائیں

شیخ جی - (دور سے) ذرا اس کونڈے کو دیکھ رہا تھا۔

دوکاندار - آئیے —— دیکھئے —— آئیے نا۔ یہ ؟

شیخ جی - نہیں وہ (بالکل قریب آکر) وہ ——— ادھر - ہاں

دوکاندار - " صاحب آپ نے چیز اچھی پسند کی - بالکل نیا پاٹ ہے ......"

یوسف - پی - او - ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن - پی - او - ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن

(POT کا تلفظ ٹھیک ادا کرتا ہے) رٹے جاتا ہے

دوکاندار - نہ ٹوٹا نہ پھوٹا۔ ایک ذرا ادھر ٹھیس لگ گئی ہے۔ ہاں صاحب سچ بولنا چاہیئے۔

چاہے کوئی لے۔ چاہے نہ لے۔ اور سب ٹھیک ہے

یوسف - پی - او - ٹی پاٹ ...... (رٹے جاتا ہے)

دوکاندار ۔ ہاتھ میں لے کر دیکھئے ــــــــ ماشے اللہ سے 'شاہب جاوے' نے انگریزی خوب یاد کی ہے ۔"

شیخ جی ۔ بڑا ہسیار ہے۔ اپنے بھائی کو سن سن کر سیکھ گیا۔ ہاں اور تو سناؤ۔ وہ کیا 'سنن' معنی سورج ـــ اور 'ہاٹھاٹ' معنی گرم

یوسف ۔ (نعرہ مارتا ہے) پی۔ او۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن۔ پی۔ او۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن (اتنی دیر میں اس نے دھن پیدا کرلی)

شیخ جی ۔ اور بتاؤ "سنن" بتاؤ ـــ "ہاٹھاٹ" بتاؤ

یوسف ۔ پی۔ او۔ ٹی ....(بکتا ہوا دور چلا جاتا ہے)

شیخ جی ۔ بیوقوف! دام کیا ہیں ؟

دوکاندار ۔ "جو چاہے آپ دیدیں۔ اس کا ڈھکنا کھو گیا ورنہ صاحب لوگ کہیں ایسی چیز چھوڑتا ہے 'رپیوں' میں بک جاتی ۔"

شیخ جی ۔ "بات یہ ہے کہ گھر والی نے کہا تھا کہ ایک اتنا بڑا' اور تین چھوٹے چھوٹے پاٹ (تلفظ غلط sahib کی طرح ادا کرتا ہے) لیتے آنا۔ اب اس کے خریدنے میں یہی ہے کہ ان کو پسند آئے۔ یا نہ آئے۔"

دوکاندار ۔ "پسند نہ آئے تو واپس۔ دوکان آپ کی ہے۔ اور بڑے صاحب ایسی چیز تو گھر میں ہونا چاہیئے۔ کوئی "فیشائیبل" آجائے۔ آپ لوگوں کے یہاں تو سب طرح کے لوگ آتے ہوں گے ۔"

شیخ جی ۔ واپس کیا کرنے آئیں گے۔ بڑی دور رہتے ہیں۔ محلہ بانس گنج میں مکان ہے

دوکاندار ۔ درست۔ اچھا صاحب میں ایک دام کہوں گا۔ بس کچھ کہئے گا نہیں۔ میں نے خانساماں سے ۵ رکا خریدا ہے۔ آپ کو ۲ رکا دیدوں گا۔

شیخ جی ۔ اتنے دام نہیں۔ کہو تو چار آنے دیدوں۔

دوکاندار ۔ "اب گنزائش نہیں ۔"

شیخ جی ۔ "اچھی بات تمھاری چیز ہے۔ (دور جاکر) الیسف ادھر آ۔ (لڑکے کی آواز قریب

آجاتی ہے)۔

دوکاندار۔ "اجی جاتے کہاں ہیں۔ اچھا لیجئے۔ آپ کی بات کیا ٹالوں آپ کی صورت میرے چچا سے ملتی ہوئی ہے۔ یہ ایسی چیز ہے۔ کہ ——— اب کیا بتاؤں۔ برسوں رہے اور پرانی نہو۔ اچھا اور کیا چاہئے۔ یہ مٹی کے تیل کا چولھا لے لیجئے۔ اچھا یہ دیکھئے ایک لمپ رکھا ہے۔ شادی بیاہ ہو۔ تقریب ہو۔ کوئی آئے جائے۔ اسی سے حیثیت بن جائے گی بستا دیدوں گا اچھا اور کچھ؟"

شیخ جی۔ چھوٹے پاٹ چاہئیں۔

دوکاندار۔ کس کام کے لئے؟

شیخ جی۔ یہی کام کیا۔ عید قریب ہے۔ ذرا سوئیوں اویّوں کے لئے ضرورت ہوگی۔

دوکاندار۔ اوچھوٹے لال۔ اوچھوٹے لال۔ ذرا بڑے میاں کو پیالے دکھانا۔ عمدہ قسم کے ہوں سستے دینا۔ یہ اپنے ہی ہیں ——— شیخ جی چونی تو ذرا کھراب ہے۔ دوسری بدل دیجئے۔

(بھدی آواز سے الاپتا ہے) "من کی آنکھیں کھول پیارے"

پہلا ایکٹ

شخانی۔ "یہ کہاں رہ گئے تھے"

شیخ جی۔ تمہارا سودا کچھ ایسا ویسا ہوتا ہے۔ شہر بھر گھوم کر سب سامان لایا ہوں۔ لالٹین قریب لاؤ تو دکھاؤں۔

شخانی۔ کیا ہے؟ جس کے لئے اتنی اچاپت ہورہی ہے۔ ادھر لاؤ۔ ذرا کھولوں۔

یوسف (چلانے لگتا ہے) پی۔ او۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن۔ پی۔ او۔ ٹی پاٹ

یوسف کی ماں۔ چپ۔ کیا بک لگائی ہے۔

یوسف کی ماں
شخانی } ایک ساتھ { یہ کیسی کونڈالی / یہ کیا لائے / اہو ہو
زلفن

یوسف ۔ (پھر چلانے لگتا ہے) پی ۔ او ۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن ۔ پی ۔ او ۔ ٹی پاٹ
(دور ہوتا جاتا ہے)

شخانی ۔ یہ کس کام کی ۔ اتنی تو بڑی ہے ۔ اس سے نکالتے نہیں بنے گا ۔ سوئیوں کے کام کی تو نہیں ۔

شیخ ۔ اتنا تو اچھا ہے ۔ تم کہتی ہو کام کا نہیں ۔ (ذرا تیز ہو کر) ایک روپیہ دیا تھا کہ اس میں ایک کونڈالی لاؤ ۔ تین پیالے لاؤ ۔ چھ چمچے لاؤ ۔ ایک طرف پیدل مرو ۔ دوسری طرف کا اکہ کا کرایہ اسی روپیہ سے نکالو ۔ روپیہ نہوا عمر عیار کی زنبیل ہو گیا ۔ خالی کونڈالی روپیہ سے کم کی نہیں ملتی تھی ۔ یہ تو ذرا پرانا ہے' اس لئے مل بھی گیا ۔

زلفن ۔ اماں اچھی تو ہے ۔ اس میں تو پکڑنے کا کنڈھا بھی لگا ہوا ہے ۔ یہ اور اچھا ہے ہاتھ نہیں جلے گا ۔

یوسف کی ماں ۔ جیسے چار کی پیالی ہو ۔ کیسی خوبصورت

شیخ جی ۔ میرا لایا ہوا سودا تو کبھی ان کو بھاتا ہی نہیں ۔ دو پہر سے دوڑتے دھوپتے یہ وقت آیا میرا سن اب ایسا نہیں ہے کہ تین میل پیدل چلوں ۔ پھر الیسف ساتھ ۔

شخانی ۔ یہ ہے کتنے کی ؟

شخانی ۔ اب تم ہی بتاؤ کتنے کا آنکتی ہو ۔ صاحب لوگوں ۔ رئیسوں کے کام کی چیز ہے ۔ دوکاندار کہتا تھا اگر اس کا ڈھکنا ہوتا تو چھٹ سے روپوں میں بک جاتی ۔

شخانی ۔ ۸ آنے سے زیادہ کی نہیں ہے ۔

شیخ جی ۔ چھ آنے کا ہے ۔

شخانی ۔ سستی تو ضرور ہے۔ مگر پرانی چیز ہے۔

زلفن ۔ (ٹن سے آواز آتی ہے) یہ کیا ہے؟

شیخ ۔ یوں ہی ذرا سی ٹھیس لگ گئی ہے۔ مگر یہ ایسی چیز ہے کہ برسوں رہے، اور پرانی نہو۔

زلفن ۔ ارے یہ اور زیادہ سفید ہے۔ دیکھو تو اماں میں نے یہاں ذرا اونگلی سے رگڑا تھا کیسا سفید نکل آیا۔

یوسف کی ماں ۔ دھولا ۔ دھولا

شخانی ۔ بالکل چار کی پیالی۔

یوسف ۔ اماں! اماں ۔ کیا بڑے لوگوں کی چار کی پیالی بڑی ہوتی ہے۔

(سب قہقہہ مار کر ہنستے ہیں)

یوسف کی ماں ۔ چپ پگلے ۔ کہیں بڑے آدمی ہونے سے ان کی چیزیں بھی بڑی ہو جاتی ہیں

یوسف ۔ واہ راجہ صاحب کا مکان اتنا بڑا ہے کہ کچھ کہنے کو نہیں۔

شخانی ۔ بات یہ ہے کہ ایسی نئی نئی چیزیں بڑے گھروں میں اچھی لگتی ہیں ۔ اب جو ہمارے یہاں دیکھے گا یہی سمجھے گا کہ کہیں سے اٹھا لائے۔

لڑکی ۔ (دور سے چلا کر) کیا اماں غریب لوگوں کے دل نہیں ہوتا۔ اچھی چیزیں سب ہی کو اچھی لگتی ہیں۔ جس کو میسر آئے وہی رکھے۔ تم تو ایسی کہا کرتی ہو۔

شیخ جی ۔ سچ ہے ۔ گھر میں دو ایک اچھی قسم کی چیزیں بھی ہونا چاہیئے ۔ دوکاندار تو ایک لمپ بھی دے رہا تھا ۔ کہتا تھا کہ آپ کے یہاں تو سب ہی طرح کے لوگ آتے ہیں ۔ میں بھی سوچتا ہوں کہ اب تھوڑا تھوڑا کر کے حیثیت کی چیزیں لے آؤں گا ۔ نذرو کے دوست ہیں جو سرکار میں نوکر ہیں ۔ وہ آتے ہیں ۔ شاید کبھی نذرو کا صاحب آ جائے ۔ ایک بار داروغہ جی آئے تھے۔

شخانی ۔ تو کیا جو آئے گا اسی کو یہ کونڈالی دکھاتے پھروگے؟

شیخ جی ۔ (بگڑ کر) نہیں۔ تم نے نہ جانے کیسی کھوپڑی پائی ہے ۔ اسی طرح کی چیزیں اور لاؤں گا جیسے لمپ ۔

شخانی ۔ مکان ٹھیک کرانے کو روپیہ نہیں ہے ۔ لمپ لائیں گے ۔ لمپا لائیں گے ۔

شیخ جی ۔ (زیادہ بگڑ کر) لمپ میں کون چھپن ٹکے لگ جائیں گے ۔ جو میں کہتا ہوں تم ہمیشہ اس کی الٹی کہتی ہو۔

شخانی ۔ بڑے آدمی بنیں گے ۔ یہ منہ اور مسور کی دال ۔

زلفن ۔ کیسی ادجلی اوجلی نکل آئی ۔ دیکھو اماں ۔

یوسف کی ماں ۔ اہا ۔ اے خالہ اسے عید کے دن ضرور نکالنا ۔

شیخ جی ۔ سنو دولھن ۔ تم اپنی خالہ کو بکنے دو ۔ عید کو ضرور نکالنا ۔ اور وہ پھولدار چدر نکالنا ۔ ساری عمر یہی ترستے رہے کہ کچھ حیثیت بنے ۔ مگر ان کی وجہ سے کچھ نہوا ۔

شخانی ۔ (بگڑ کر) میری وجہ سے ؟ اپنی تقدیر کہو ۔ کبھی پیسہ بھی جڑا جو حیثیت بنتی ؟ ۔ اب لڑکا پندرہ روپیہ کا نوکر ہو گیا ہے تو حیثیت بنائیں گے (چمک کر) یہ موئی چار کی پیالی کی ایسی کنڈلیا آئی ہے ۔ عید کو نکالی جائے گی ۔ ایک پھولدار چدر پڑی ہے وہ نکالی جائے گی ۔ بس ہوگئی حیثیت ۔ چدر نہیں چدرا نکلے گا ۔ ابھی لڑکی بیاہنے کو پڑی ہے ۔ چدر اس کے کام آئے گی ۔ یا بڑھوتی میں ان کی حیثیت بنائے گی ۔

یوسف کی ماں ۔ "خالہ کیا ہرج ہے اگر شیخ جی لمپ لے آئیں گے"

شخانی ۔ تو چپ رہ ۔ بڑی چلی ہے ۔ بیچ میں بولنے والی خصم کیا نوکر ہو گیا سمجھتی ہے کہ میں کچھ ہوگئی ۔ جب تک میں زندہ ہوں تو کیا ہے ۔

یوسف کی ماں ۔ خالہ تم تو ہوا سے لڑتی ہو ۔ میں نے کب کہا میں گھر والی ہوں ۔

شخانی ۔ (آپے سے باہر ہو کر) گھر والی ۔ گھر والی ۔ گھر والی

(پاٹ جو پانی سے بھرا ہوا ہے بعد سے گر پڑتا ہے)

شیخ جی - کیا ہوا - توڑ ڈالا۔

زلفن - ارے یہ یوسف کنڈالی کب اٹھالے گیا۔

یوسف کی ماں - "ابے ادھر آ حرامزادے - کمبخت - خدا تیرا ستیاناس کرے"

یوسف (دور سے) "پانی بھر کر ناؤ تیرا رہے تھے"

یوسف کی ماں - چل ناؤ کے بچے - کمبخت (آواز دور ہوتی جاتی ہے) (دھب دھب مارتی ہے)۔

یوسف (روتا ہوا) اب نہیں کریں گے - اب نہیں

شخانی - (دوڑ کر جاتی ہے) چھوکری تیرے حواس ہیں - (دھب دھب) چھوڑ - چھوڑ - آگ لگے اس کنڈالی کو - میرے بچے کو پیٹ کر رکھدیا - چپ رہ - چپ رہ - لا ناؤ کہاں ہے - آ - ابھی پانی بھر کر تیراتی ہوں۔

زلفن - ایسف رو نہیں - رو نہیں - اماں لاؤ - یہ کنڈالی مجھے دیدو - ایسف تمھارا کہا نہیں سنتا - اگر چپ نہو گے تو میں لے جاؤں گی۔

یوسف - (روتا ہوا) لاؤ - لاؤ ہمارا پاٹ لاؤ - پی - او - ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن - پی - او ٹی - پاٹ پاٹ معنی برتن۔

شخانی - (قریب آکر) وہ تو میں کہتی تھی - کہ یہ بڑے گھروں کی چیزیں ہم لوگوں کو راس نہیں آسکتیں - (ٹھنڈی سانس بھر کر) "جھونپڑیں" میں رہ کر محلوں کا خواب - جس حالت میں ہو پڑے رہو۔

شیخ جی - "اب تو لے آیا ہوں"

شخانی - ہاں لے تو آئے ہو - (ذرا چپکے سے) تم کہتے ہو کسی صاحب کا مال ہے اب وہ مردہ ہو یا زندہ - مجھے تو یہی ڈر ہے کہ منحوس نہ نکلے - پرانی دھرانی چیزمیں یہی تو برائی ہوتی ہے - دیکھو وہ بندا جس دن سے آیا کیسی تباہی آئی - کھانے تک کو نہیں جڑتا تھا - اور جب سے الگ کیا گیا

ذرا کھانے پینے کا سستا ہوا۔

زلفن ۔ اماں بہو جی کوٹھری میں گھس گئی ۔

شغانی ۔ مجھے تیہا دکھاتی ہے ' ایسپھ ' کو دھنک کرڈالدیا ۔ رہنے دے مردار کو وہیں (نقل کرکے) " میں کب کہتی ہوں کہ میں گھر والی ہوں " تو کہہ کب سکتی ہے ؟ مرے ہوتے ہوئے ۔ میں مالک ہوں گھر کی ؛

شیخ جی ۔ تم تو ہوا سے لڑتی ہو ۔ وہ بچاری تو سیدھی سی بات کہہ رہی تھی کہ لمپ لانے میں کیا برائی ہے؛

شغانی ۔ ہاں جو تمھاری ایسی کہے وہی اچھا ہے ۔

شیخ جی ۔ (ذرا تیز ہوکر) میری ایسی کیا ۔ وہ گھر بنانے والی بات کہہ رہی تھی ۔ تم نے اتنے دنوں میں ذرا سی بھی گرستی نہیں جوڑی ۔

شغانی ۔ (تیز ہوکر) گرستی کیا جوڑتی ۔ پیٹ بھرنے کو نہیں تھا ۔ گرستی جوڑتی ، آج تو تم بڑی بڑی باتیں سیکھ کر آئے ہو ۔ اسی مردار نے کان میں ڈالی ہوں گی ۔ گرستی نہیں ہے حیثیت نہیں ہے ۔ اے خدا کا شکر بھوجو کھانے کو مل جاتا ہے ۔ ہزاروں ایسے گھومتے ہیں جن کو پیٹ بھرنے کو سوکھا ٹکڑا ۔ اور تن ڈھکنے کو چیتھڑا نہیں ۔ آدمی کو چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیئے ۔

شیخ جی ۔ تم تو زندگی اجیرن کئے دیتی ہو ۔ اب تک تو ہم ہی تھے ، اب بیٹھے بٹھائے اس بچاری سے الجھ پڑیں ۔

شغانی ۔ (کنکھار کر) تم تو بڑھاپے میں سمجھ کھو بیٹھے ۔ اگر تو وہ کے سامنے ایسی باتیں کروگے تو اس کا دماغ بھر جائے گا ۔ گھر بار سمیٹ کر ہم لوگوں کو دودھ کی مکھی کی طرح الگ کردے گی ۔ اس بڑھاپے میں کس کے دروازے جاکر پڑوگے ۔ کنڈالی رہنے دو ۔ جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا عید کے دن ۔

(جوتیوں کی سڑ سڑ کی آواز دور سے آتی ہے)

بفاطن ۔ اے سکھانی کہاں ہیں ؟

شخانی ۔ کیا ہے بفاطن ۔ چھپر کے نیچے آؤ ۔ (چپکے سے) کنڈالی کپڑے سے ڈھانک دو کنڈالی کپڑے ڈھانک دو (زور سے) کیسے آنکلیں ؟

(بفاطن جوتیاں سڑسڑ کرتی ۔ اونگلیوں سے پیالہ بجاتی اندر آتی ہے)

بفاطن (اٹھلا اٹھلا کر کہتی ہے) ہم نے اس وقت چنے کی روٹی پکائی ہے ۔ اسے دیکھ کر منے نے ادھم جوت دیا ۔ کہ دال بھات لاؤ ۔ دال بھات لاؤ ۔ تمھارے یہاں پکا ہو تو ذرا سا لیتی جاؤں ۔ صبح پکاؤں گی تو دے جاؤں گی ۔

شخانی ۔ دال تو ابھی لگ گئی تھی ——— لیتی جاؤ تھوڑی سی ۔

بفاطن ۔ یہ کپڑے سے ڈھانک کر کیا دھرا ہے ؟

(یوسف دور پر چلتا ہے ۔ پی ۔ او ۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن پاٹ معنی برتن)

شخانی (جلدی سے) ادھر نہ جاؤ ۔ اس میں وہ بند ہے ۔ کیا نام وہ ۔ ایسپہ کے لئے ایک چڑیا پکڑی ہے ۔

بفاطن ۔ ہونہ ۔ اے ایک پنجرا منگوالو ۔ کیا اس میں بند کیا ہے ۔ کالا کالا کیا ہے ۔ کنڈھا ۔

شخانی ۔ ہاں منگواؤں گی ۔ ۵ اروپیہ میں کیا کیا کروں ۔ سب تو سب مردار بندہ کہتی ہے ۔ تم گھروالی بنتی ہو ۔ (چیخ کر) میں گھروالی نہیں ، تو کیا وہ بنے گی ۔

بفاطن ۔ ایسا کہتی ہے ؟ برا کرتی ہے ۔ اپنا پوت پالا پوسا ۔ اب بڑا ہو کر نوکر جا کر ہوا تو ان کا ہو گیا ۔

بہو ۔ (دور سے) اے مالک ۔ جس نے ایسا کہا ہو اسی کا منہ سڑ جائے ۔ موئی کمبخت اندھی ہو جائے ۔ اس کے بدن سے کوڑھ ٹپکے ۔

شخانی (فتحیاب ہو کر) ادھر جا کر دال لے لو ۔ بھات بھی لے لو ۔

(بفاطن پیالہ بجاتی ۔ سڑسڑ کرتی جاتی ہے)

شخانی ۔ معنی خیز کنھکارتی ہے۔ کچھ اپنی فتحیابی پر۔ اور کچھ زلفن کو اشارہ دینے کے لئے کہ دال چاول کم کم دے۔ دور سے برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ ہلکی ہلکی ۔ یوسف کی ماں کی ہچکیوں کی آواز۔ اور بیچ بیچ میں یوسف کی پاٹ معنی برتن پاٹ معنی برتن کی صدا۔ ایک منٹ کے بعد بفاطن سڑ سڑ کرتی آتی ہے)

بفاطن ۔ لو دیکھ لو۔ اتنا لئے جاتی ہوں

شخانی ۔ لے جاؤ ۔ اس میں دکھانا کیا۔

(بفاطن سڑ سڑ کرتی جاتی ہے)

شخانی (ذرا کڑک کر۔ آواز میں فتحیابی کا اثر موجود ہے) دیکھ زلفن ہاتھ روک کر چیز نکالا کر۔ اتنی ایک دال جو دیدی تو اپنے گھر میں کمی نہ پڑے گی ۔ کھانا چلنا دوبھر ہو جائے گا۔

زلفن ۔ میں نے پہلے ذراسی نکالی تھی ۔ اس نے کہا تھوڑی اور دو۔

شخانی ۔ وہ کہے گھر اٹھا کر دیدے تو دیدے گی ۔ ارے میں نہ دیکھوں تو یہ گھر اڑ جائے ۔ کہتے ہیں تم کو گھر بنانا نہیں آتا۔ گھر بنانا نہیں آتا ۔ اور اس موئی زلفن کی مت تو اڑ گئی ۔ اچھا اور دیکھ یہ کنڈالی اٹھا کر کوٹھری میں دھر دے جو دیکھے گا یہی کہے گا کہیں سے اٹھا لائے ہیں۔ یا کسی مرے گوئیے کا مال ہے کل جب نذر و آئے تو نکالنا ۔ تب لوگوں سے یہی کہیں گے کہ نذرو کو اس کے صاحب نے دی ہے ۔

شیخ جی ۔ مجھے کھانا بھی دو گی ۔ لالٹین میرے منہ کے پاس سے ہٹاؤ ۔

شخانی ۔ ٹھہرو ——— چولھے پاس چل کر کھالو ———"

دوسرا ایکٹ   سین پہلا

رتن لال (غصے سے بھرا ہوا) سنتی ہو اپنے پوت کے کرتوت ۔ ایسے بدچلن لڑکے کو میں گھر

میں نہیں دیکھ سکتا۔

منا ۔ (ذرا دھیمی آواز سے) کیا ہوا؟

رتن لال ۔ ہوتا کیا؟ اس بدمعاش نے وہی کیا جو تم نے سکھایا۔ اگر یہ لڑکا گھر لوٹ کر ہم دونوں کو ٹکڑوں کا محتاج نہ کردے تب کہنا۔ میں تو مردود کو اسی بار پولیس میں دیدیتا جب ہیرالال کی گھڑی چرالایا تھا ——— کون گن ہیں جو اس میں نہیں۔ اس سن میں موتی بائی سے......

منا (ذرا اونچی آواز سے) ارے میں سنوں تو۔ ہوا کیا؟

رتن ۔ ہوتا کیا۔ پاٹ جس کے لئے میں نے نوکروں کو مفت میں مارا پیٹا یہی چرائے گیا تھا اور لے جاکر ایک کباڑی کے یہاں دس روپیہ کو بیچا (پکار کر) اجی دوڑ جا بیٹھکے میں ایک پاٹ رکھا ہے اٹھالا ——————— ایسے ہی لڑکے باپ کی کمائی منٹوں میں اڑادیتے ہیں۔

منا ۔ وہ کباڑی تمھارے پاس آیا تھا؟

رتن ۔ اس کو کیا معلوم کہ وہ لڑکا میرا تھا یا کسی ڈاکٹر کا۔ جس دلال سے ہم نے کہا تھا کہ ہمارے پاٹ کا جوڑ ڈھونڈھ لاؤ وہ یہ پاٹ لے کر آیا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ایک ہفتہ ہوا کباڑی نے اس کو ایک ۱۷۔۱۸ سال کے لڑکے سے خریدا تھا۔

منا (ذرا تیکھی ہوکر) اور اس لڑکے کا نام سکھولال تھا۔ کیوں نا؟

رتن (جھنجھلا کر) پہلے پوری بات سنو۔ میں نے کہا کہ پاٹ کہیں چوری کا نہو۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ میں نے سب پوچھ گچھ لیا ہے۔ جو لڑکا بیچنے آیا تھا اس کی حیثیت تو ایسی نہیں معلوم ہوتی آگے بھگوان جانے۔ بائسکل پر بیٹھ کر آیا تھا۔ سلک کا سوٹ پہنے تھا۔ سونے کی عینک سونے کی گھڑی لگائے تھا۔ کان میں سونے کا پھول۔

منا ۔ تم سمجھتے ہو کہ دنیا میں اس چہرے مہرے کا اور کوئی نہیں۔

رتن ۔ تمھاری مت نہ جانے کہاں چلی گئی ——— پاٹ تو دیکھو ——— (دوڑنے کی ہلکی سی

آواز آتی ہے۔ قریب آکر رک جاتی ہے) لو پاٹ آگیا — وہی ہے یا نہیں۔

منا ۔ میں کیا جانوں۔ ایک جیسے ہزاروں ہوں گے۔ بنانے والا ایک بنا کر مر تھوڑے گیا ہوگا۔

رتن ۔ ۵ سال سے گھر میں ہے اور پہچان نہیں سکتی؟ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو۔

منا ۔ دیکھ رہی ہوں (سنجیدگی سے) یہ میرا پاٹ نہیں ہے۔

رتن ۔ تمہارا نہیں ہے تو پھر کس کا ہے۔ ابھی سکھو نے نہیں کسی اور نے چرایا ہوتا تو تمہارا ہو جاتا۔

منا (ان سنا کرکے) اس جگہ ایک گدّا پڑا ہوا ہے۔ یہ ایک پتی جھڑ گئی ہے۔ یہ دیکھو کسی نے چاقو سے کھرچا ہے۔ اور میں کہتی ہوں کہ یہ کچھ چھوٹا بھی ہے۔

رتن ۔ ماں کی آنکھوں سے یہی تو دکھائی دے گا۔

منا ۔ اچھا اب تم ذرا باپ کی آنکھوں سے دیکھو۔ تمہارے پاٹ میں کہیں یہ سرخ کلیاں تھیں پتیوں پر اس طرح کے ریشے بنے تھے۔ اور یہ دیکھو ایسا پھول اس جگہ پر تھا۔ اور تو اور۔ یہ مونگھٹر کی بیل دیکھو۔ اس پاٹ کی مونگھٹر پر کہیں بیل تھی؟ یہ پاٹ وہ ہے ہی نہیں۔ کہنے کو جو چاہے وہ کہہ دو۔

(خاموشی ۵ اسکنڈ)

کچھ تو فرق معلوم ہوتا ہے؟"

رتن (ذرا مطمئن ہوکر کہ اپنے لڑکے کے سر سے الزام ٹل گیا) میں نے کبھی اتنے غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اور دیکھا بھی ہو تو یاد نہیں پھول کیسے تھے۔ اور ان پھولوں پر سرخ نقطے تھے یا ہرے' وہ نقطے گول تھے کہ چوکور ہمیں اتنی فرصت کہاں کہ ان باتوں میں وقت خرچ کریں — بلکہ مجھ سے تو اگر پوچھو تو یہ بھی نہیں بتا سکتا ہوں کہ جن پیالیوں میں چائے پیتا ہوں ان پر کس ڈزائن کے پھول بنے ہیں۔ یا میرے ٹیبل کلاتھ پر کیا ڈزائن بنا ہے۔

منا (سخت طعن سے) ہاں اگر جانتے ہو تو اتنا جانتے ہو کہ سکھو ہی پاٹ چرا کر لے گیا ہے۔

رتن (جھنجھلا کر) ابھی کباڑی کو بلا کر سکھو کا سامنا کراؤں

منا (بگڑ کر) میں کہتی ہوں تم اپنے لڑکے کی عزت آبرو کے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ میں بتاؤں کیا کرو وہ کون داروغہ جی ہیں جو تمہارے دوست بھی ہیں۔ اور قرضدار بھی۔ بلا کر ان سے کہو کہ سکھو کو ایک دس سال کے لئے جیل بھجوا دیں۔ تمہارے کہنے کو ٹالیں گے ہرگز نہیں۔ بس۔ پھر تو تمہارا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ چین سے ٹانگیں پھیلا کر سونا۔ میں بھی دکھیا رو رو کر مر جاؤں گی۔ پھر تمہاری چیزوں کو۔ تمہارے روپیہ پیسے کو تباہ کرنے والا۔ مٹنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ (ذرا مٹک کر) آپ ہی میاں دروبار۔ آپ ہی میاں کھیت کھلیان۔

رتن ۔ نہ الٹی مانو نہ سیدھی۔ اگر یہ پاٹ تمہارا نہیں ہے تو پھر کباڑی کو بلا کر سامنا کرانے میں کیا ہرج ہے۔

منا ۔ ہائے بیچارا سکھو۔ اب غریب کا یہ حال ہو گیا کہ جب تک ایرے غیرے نتھو خیرے آکر گواہی نہ دیں جرم ہٹ ہی نہیں سکتا۔ اس موئے کباڑی کا کیا بگڑتا ہے۔ بلکہ وہ تو اور خوش ہو گا کہ بڑے اشرافوں کے کرتوت کھل رہے ہیں۔ بیٹ سے کہہ دے گا یہی ہیں صاحب! میں نے تو ان کی 'تصبیر' لی تھی کہو کھو گئی ورنہ ابھی دکھا دیتا۔ تب دھری رہ جائے گی وکیل صاحب کی ساری وکالا ہٹ۔

رتن (جھنجھلا کر۔ ہارے ہوئے لہجے میں) تم جانتی ہو کہ بک بک سننے کی میری عادت نہیں۔ جو میں کہتا ہوں اس کا سیدھی طرح جواب دو۔ ایک جواب۔ یہ پاٹ تمہارا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو کباڑی کو بلا کر سامنا کرانے میں کیا ہرج۔

منا (بگڑ کر) سو باتوں کی ایک بات کیوں نہیں کہتے۔ سکھو کو کسی نہ کسی بہانے سے جیل بھجوانا ہے تم کو تو اس سے ایک آڑسی ہے۔ چار آم دئے تھے پانچ کیوں کھا گیا۔ چار روپیہ مہینہ دیتا ہوں پانچ کیوں خرچ کئے۔ اور تو اور بائسکل میں پنچر کیوں ہوا۔ موئے پتلون میں کھونچا کیسے لگا۔ اس کے بیٹھکے میں چار دوست آگئے چار پی لی۔ پان کھائے۔ (نقل کر کے) "مجھے یہ لچھن اچھے نہیں لگتے" جو چاہے اس کے ساتھ کرو۔ تم جانو وہ جانے تم باپ وہ پوت۔ اس کو کچھ ہو جائے گا میں کر ہی کیا سکتی ہوں۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہوں گی۔ پچھلے جنم میں بھگوان جانے کون پاپ کئے تھے جو بھوگ رہی ہوں۔

رتن (اکتا کر) ان کی کھوپڑی میں کوئی بات گھستی ہی نہیں۔ میں باپ ہو کر سکھو کا برا چاہوں گا۔

کچھ تو سوچو۔ اندھی نہ بنو۔ کسی بری ڈگر لگ گیا تو تم ہی سر پکڑ کر روؤگی۔ سو مرتبہ بتا چکا ہوں کہ مجھ
ہ آم ۵ آم کا کچھ نہیں۔ مگر ہر بات ڈھنگ سے ہونا چاہئے۔ جو چیز خرچ ہو، ایک حساب سے خرچ
ہو۔ سکھو کو تو کسی بات کا ڈھنگ نہیں۔ اس کو کیسے کیسے سوٹ بنوا دئے۔ مگر کبھی کھونچا لگا چلا آرہا ہے
کبھی روشنائی گر گئی ہے۔ تو کبھی کودنے پھاندنے میں مسک گیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ سوٹ میں روپیہ
لگا ہے۔ کچھ دنوں تو چلے۔ اس کو پہن کر اچکنے کودنے کی کیا پڑی ہے۔

منا ہاں۔ اچھے سوٹ والوں کو جب کودنا ہوتا ہے تو ننگے ہو جاتے ہیں۔

رتن لال۔ "اے بھگوان! عورتیں بڑی گدھی ہوتی ہیں۔ اسی لئے تو نے ان کو سمجھ نہیں دی۔"

منا ۔ کہاں جاتے ہو؟ سکھو کو حوالات میں بند کرانے۔

رتن ۔(دور پر) اپنا سر چھوڑنے۔ (وقفہ ۵ اسکنڈ)

منا (بڑبڑاتی ہے) آگ لگے بیاج کو۔ اس گھر سے پریم اڑ گیا۔ اب جو کچھ ہے روپیہ ہے۔
اگر سکھو کہیں چلد یا تو دیکھیں بڑھوتی ہیں ان کی کون دیکھ بھال کرتا ہے —— کیا ہے اجمنی (کنی
پھینک کر) لے جتنا جی چاہے گھی نکال لے مجھ سے "اسوخت" نہ بول۔

راجمنی ۔ بات یہ ہے کہ (کنکھار کر) وہ یہ کہ چھٹی پاکر میں گھر گئی تو بٹیا نے کہا کہ پانی نہیں۔ ہے تو،
بہت بکی جھکی کہ تجھ کو یہ دھیان نہیں رہتا کہ تھکی مری چلی آرہی ہوگی، پانی سب اٹھا ڈالا۔ مگر کرتی کیا
گگرا لاد کر نل پر گئی۔ وہاں سے کچھ دور۔ اتنی دور جیسے یہاں سے وہ دیوال، شیخ جی کا لونڈا پاٹ
پاٹ بکتا پھرتا تھا۔ میں نے اپنے جی میں کہا پاٹ تو ہمارے گھر میں تھا جو چوری ہو گیا یہ کیا بکتا پھرتا
ہے۔ میں نے پاس بلا کر چمکار کر پوچھا کیا بکتا ہے۔ وہ چلا کر اور بہت کچھ بکنے لگا۔ کچھ گیت سا تھا
'پی آؤ جی'۔ اور کیا پاٹ معنی برتن۔ اتنے میں پھاطن گھڑا لئے آئی۔ اس دکھیا کے پاس گگرا کہاں
ہے۔ گھڑے میں پانی بھرتی ہے۔ اور مجھ سے چپکے سے کہنے لگی کہ یہ جو شیخ جی ہیں ان کو کہیں سے ایک
برتن مل گیا ہے جس کو یہ لوگ پاٹ کہتے ہیں۔ اور کہنے لگی کہ بات یہ ہے کہ آج کھاتی کے یہاں دال لینے گئی
تو میں دینے گئی۔ انھوں نے میری صورت جو دیکھی تو فوراً پاٹ پر کپڑا ڈھانک دیا۔ مگر میں نے دیکھ لیا

کہ کیا ہے۔ کالا کالا چمکدار گول گول برتن تھا۔ اس میں کنڈھا بھی لگا ہوا تھا۔ میں نے سکھانی سے پوچھا کیا ہے۔ سکھانی چلی مجھے اُلّو بنانے۔ کہنے لگی۔ ایسپھ کے لئے چڑیا پکڑ کر بند کی ہے۔ میں ان کے چلتروں میں آنے والی کب۔ میں سمجھ گئی کہ کچھ دال میں کالا ہے۔ پھر مجھ سے کہنے لگی تجھے گنگا قسم کسی سے کہنا نہیں۔ (اپنے آپ سے) اے مجھے کیا گرج پڑی ہے جو ہر ایک سے کہتی پھروں۔

منا ۔ بلا تو وکیل صاحب کو دھتا ہی سمجھتی تھی کہ نہ تو یہ میرا پاٹ ہے۔ اور نہ وہ کمبخت لڑکا جو بیچنے گیا میرا اسکھوہے۔ بلانا وکیل صاحب کو۔ یہ مرد بڑے مورکھ ہوتے ہیں جو سنتے ہیں اس پر بھروسا کر لیتے ہیں۔ کچھ سوچیں، کچھ سمجھیں۔ (آن ہند ——— ذرا پاندان ادھر بڑھا۔ اور سن وکیل صاحب کو بھیج کر۔ ذرا چلی جانا، اور بفاطن کو بھی بلاتی لانا۔

راج منی ——— آ

منا نہیں نہیں تو گھبرا نہیں۔ میں اپنے ڈھنگ سے پوچھوں گی۔

ایکٹ دوسرا   سین دوسرا

۔ اداب عرض ہے وکیل صاحب

۔ آئیے داروغہ صاحب۔ تشریف رکھئے آپ کے تو درشن ہی نہیں ہوتے۔

۔ مجھے آپ کا پرچہ ملا تھا۔ اور ایک ہفتہ سے اسی سوچ بچار میں تھا کہ کسی سے کچھ روپے کا بندوبست ہو جائے تو آپ کے پاس آؤں۔ خالی ہاتھ کیا آؤں۔ بات یہ ہے وکیل صاحب، آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگوں کی آمدنی کا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ ایسی ہے کہ ہو گئی تو ہزاروں اور نہ ہوئی تو پھر مہینوں کا کال ہے۔

۔ ہاں، زمانہ بہت ہو گیا تھا اس لئے آپ کو یاد دلا دیا۔ صاحب میں بیوپار میں ہر چیز صاف رکھتا ہوں۔ اسی بات پہ 'وائف' سے جھگڑا ہوا کرتا ہے۔ ورنہ آپ تو اپنے ہیں ——— آج ایک اور بات تھی جس سے آپ کو تکلیف دی۔ بات یہ ہے کہ میرے پاس ایک اتنا بڑا پاٹ تھا جستے کا یا کلٹ کا بنا ہوا تھا۔ اس پر چاندی کی بڑی بڑی پھول پتیاں تھیں ان پر دودھ کی ایسی سفید میناکاری تھی۔ ان پر دودھ کی ایسی سفید میناکاری تھی۔ اسی کمرے میں رکھا رہتا تھا۔ شاید آپ نے بھی خیال کیا ہو۔ ادھر رہتا تھا۔ اچھا لگتا تھا۔ ایک ہی تھا اس میں پودا، او دا کیا لگاتا۔ تو ادھر رکھا رہتا تھا۔ میری وائف نے اس پر کپڑا ڈال دیا کہ میلا نہ ہو جائے۔ آج آٹھواں دن ہے میں نے کپڑا اٹھا کر جو دیکھا تو اس کے نیچے ایک گما اینٹ ... تھی۔

داروغہ جی۔ اچھا ——— ہوں

رتن لال۔ آج میں نے ایک خبر سنی۔ یہاں پڑوس میں ایک جلاہا رہتا ہے۔ شیخ جی شیخ جی اس کو کہتے ہیں۔ اس کے یہاں اسی طرح کا ایک پاٹ ہے۔

داروغہ جی۔ شیخ جی کس حیثیت کے آدمی ہیں۔

رتن لال۔ حیثیت کیا؟ کپڑا بننا چھوڑ چکا ہے۔ اس کا ایک بیٹا ہے وہ کسی دفتر میں ۱۵ روپیہ کا نوکر ہے۔ اسی سے کام چلتا ہے۔ اس کے بیوی بچے ہیں۔ شیخ جی کے بیوی بچے ہیں۔

داروغہ جی۔ ان میں سے کوئی بدچلن تو نہیں ہے۔ یا کسی کو کوئی لت تو نہیں ہے۔

رتن لال۔ ان باتوں کی تو آپ لوگوں کو خبر ہونا چاہئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ نہ کوئی بدچلن ہے۔ نہ کسی کو کوئی لت ہے۔ مگر ان کے خرچ پر شک ہو سکتا ہے۔ شیخ جی کا لڑکا باہر رہتا ہے۔ اپنے ساتھ اپنے لڑکے کو رکھتا ہے جو اسکول میں پڑھتا ہے بتائیے اتنا خرچ ۱۵ میں کیسے ہو سکتا ہے۔

داروغہ ۔ کچھ اوپر کی آمدنی بھی ہوگی۔ اچھا کسی طرح یہ پتہ مل سکتا ہے کہ شیخ جی کو ادھر روپیہ کی ضرورت تو نہیں تھی

رتن ۔ (اچھل کر) تھی تو ضرور۔ شیخانی میری بیوی کے پاس آئی تھی کہ مجھے پچاس روپیہ دلا دو مکان بنانا ہے میں نے انکار کر دیا۔ ایسے کم حیثیت لوگوں کو روپیہ دینا۔ روپیہ اٹکانا ہے۔ جب آمدنی نہ ہو تو کہاں سے ادا کریں گے۔

داروغہ ۔ اچھا۔ وہ برتن آپ نے کتنے کا خریدا تھا۔

رتن ۔ کتنے کا خریدا تھا۔ یہ تو نہ پوچھئے۔ ایک دن ایک صاحب، جن کو میں پہلے سے جانتا تھا گھبرائے ہوئے آئے کہ صاحب دس روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔ یہ برتن رکھ لیجئے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں سو دو سو سے کم کا معاملہ نہیں کرتا۔ کسی بنئے کے پاس جائیے۔ وہ پریشان بہت تھے آنسو بھر لائے، اور کہنے لگے کہ میں آپ کے سوا کسی کو نہیں جانتا۔ مجھے ترس آگیا، اور برتن بھی کچھ پسند آگیا۔ میں نے دس روپیہ صندوقچہ سے نکال کر دیدئے۔ اس دن سے آج تک ان کی صورت نہیں دکھائی دی۔

داروغہ جی - تو آپ کو گویا دس روپیہ کا پڑا۔

رتن - یہ تو نہ کہئے۔ ہم تو روپیہ کے تاجر ہیں۔ اگر وہ دس روپیہ نقد ہوتے، اور چلتے رہتے تو آج ۵ برس میں کم از کم ۳۰ تو ہو گئے تھے۔ اب اندازہ کر لیجئے کہ برتن کتنے کا پڑا۔

داروغہ - "وہ برتن ۲۰ - ۲۵ کی مالیت ہو سکتا ہے" رتن "اس میں کیا شک"

داروغہ - شیخ جی۔ یا شخانی کی آپ کے یہاں آمد ورفت رہتی ہے؟

رتن - اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ابھی پچھلی بار جب روپیہ مانگنے آئی ہے تو یہ کمرہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔ اور میں کچہری گیا تھا۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جاتے وقت چپکے سے اندر گھس گئی ہو اور برتن لے کر کپڑوں میں چھپا چلدی ہو۔

داروغہ - آپ تو کہتے ہیں کہ برتن کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا، اور چرانے کے بعد کسی نے اسی جگہ، اینٹ رکھدی۔ اس سے تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس میں کسی گھر والے کا ہاتھ ضرور ہے۔ اچھا آپ کو یہ کیسے پتہ چلا کہ شیخ جی کے یہاں برتن ہے۔

رتن - اس محلے میں ایک عورت بفاطن رہتی ہے۔ جو ادھر ادھر پکانے کی نوکری کرتی رہتی ہے شخانی نے اس سے کل دال مانگ بھیجی۔ جب وہ دینے گئی، اور ان لوگوں نے اس کو آتے دیکھا تو کپڑے سے برتن ڈھک دیا۔ مگر وہ کچھ کھلا رہ گیا۔ اس پر بفاطن کی نگاہ پڑ گئی اس نے پوچھا یہ کیا ہے تو شخانی نے اڑن گھائیاں بتائیں۔ بفاطن نے میری مہری سے کہا۔ بفاطن، اس وقت گھر ہی میں ہے کہئے تو بلاؤں ــــــ (گھنٹی بجاتا ہے) ــــــ (حکومت سے) گھر میں کہدیا تھا کہ اگر بفاطن آئے تو اس کو روک لینا۔ دیکھو اگر وہ ہو تو اسے یہاں بلا لاؤ۔

داروغہ - شیخ جی کی ایسی حیثیت نہیں کہ ان کے گھر یاٹ ہو، اور پھر شخانی نے بفاطن کو دیکھ کر اس کو ڈھک دیا یہ تو بتاتا ہے کہ۔

رتن - وہ تو میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ لوگ بہت چھوٹی حیثیت کے ہیں۔ پیٹ پالنے کے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے اتنا بڑا خاندان ۱۵ روپیہ میں کیسے گذر کرتا ہوگا۔

داروغہ جی ۔ مکان ان کا ذاتی ہے

رتن ۔ بھگوان جانے ۔ مکان میں دھرا ہی کیا ہے ۔ ایک چھپر، ایک کوٹھریا ۔ چار دیواری بھی ایک طرف سے گر گئی ہے ۔ وہ تو جب روپیہ کا معاملہ ہونے والا تھا میں نے ان باتوں کی دیکھ بھال کی تھی ۔ ــــــ داروغہ جی، اس محلے میں دو ایک بھلے مانسوں کے علاوہ سب ٹکڑ گدے بستے ہیں ۔ جو آٹھ آنے پیسوں کے لئے جان لے لیں ۔ مجھے تو یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ کسی دن یہ لوگ آ کر مجھے نہ لوٹ لیں ۔ وہ تو کہیئے آپ لوگوں سے بڑی دوستی ہے اس لئے ذرا دبے رہتے ہیں ۔

داروغہ جی ۔ آپ سول لائن میں، کوئی مکان کیوں نہیں لے لیتے ؟

رتن ۔ کئی دفعہ یہی ارادہ ہوا ۔ روپیہ کا تو کچھ خیال نہیں ۔ بس یہی ہے کہ رہتے رہتے اس مکان سے ہم لوگوں کو ایک لگاؤ سا ہو گیا ہے ۔

داروغہ ۔ اجی اس کی تو نہ کہیئے ۔ جہاں رہنے لگے وہیں سے لگاؤ ہو جاتا ہے ۔ اس حصے میں تو سو برائیاں ہیں ۔ گنجان آبادی ۔ خراب راستے، ہر طرف گندہ غلیظ ۔ اگر بیماری پھیلے تو اسی طرف سے پھیلے ۔ دوسری بات یہ ہے چور، اچکے، خونی سب ایسے ٹکڑ گدوں میں تو پیدا ہوتے ہیں ۔ یہ بارہ برس پولیس میں رہ کر میں نے سیکھا ہے ۔

رتن ۔ بات تو ٹھیک ہے ۔ مگر آپ سے کیا چوری ۔ یہاں رہ کر پھر بھی ان لوگوں سے تھوڑا بہت پیسہ واپس مل جاتا ہے ۔ اگر یہاں سے ٹل جاؤں تو سب مٹی میں مل جائے ۔

(جوتیوں کے سڑ سڑ کی آواز آتی ہے)

بفاطن ۔ (اطمینان سے زبان اینٹھ کر) سلام وکیل (گھبرا کر سیدھی طرح سے، اور ذرا آہستہ سے) صاحب ۔ سلام داروغہ جی سلام ۔

داروغہ ۔ ادھر آؤ ۔ دیکھو جو کچھ کہنا سچ کہنا، اسی میں تمہاری بھلائی ہے ۔

بفاطن ۔ اے لو میں کبھی جھوٹ بولتی ہوں جو بولوں گی ؟

داروغہ ۔ بات تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا ۔

بفاطن ۔نہیں صاحب ۔ بات کہتے تو میں نے ایسے کو سنا ۔ ہاں گول گول کالے رنگ کا ایک برتن ضرور آنکھوں سے دیکھا تھا۔

داروغہ ۔ ہاں یہی مطلب

داروغہ ۔ برتن تم سے کتنی دور تھا ؟

بفاطن ۔بس جتنی ہمارے آپ کے بیچ میں دوری ہے ۔

داروغہ ۔کیا وقت ہوگا ؟

بفاطن ۔میں کوئی گھڑی دیکھ کر تھوڑے چلتی ہوں ۔ مجھے کیا معلوم کیا وخت ہوگا ۔شام ہوئے دیر ہو چکی تھی ۔ آٹھ کا "ٹیم" ہوگا

داروغہ ۔ وہ لوگ کہاں بیٹھے تھے ۔

بفاطن ۔چھپر کے نیچے

داروغہ ۔جب تم وہاں گئیں تو وہ لوگ کیا کر رہے تھے ۔

بفاطن ۔میں گئی تو چھپر کی طرف اندھیرا سا معلوم ہوا ۔تب میں سیدھی چولھے کی طرف چلی ۔میں نے کہا اے سکھانی کہاں ہیا ۔تب سکھانی نے میری آواز سن لی ، اور بولی ادھر آؤ ۔ میں جو گئی تو جھٹ انھوں نے برتن پر کپڑا ڈھانک دیا ۔

داروغہ ۔جب وہاں اندھیرا تھا تو تم نے برتن کیسے دیکھ لیا ؟

بفاطن ۔اس کے پاس تو لال ٹین دھری تھی ۔

داروغہ ۔پھر وہاں اندھیرا کیسے تھا ۔

بفاطن ۔(اکتا کر) ایک تو لالٹین موئی ، چندھی چڑی ، تھی ۔ پھر دونوں ، بڑھیا بڑھوے ، بیچ میں برتن کے پاس ، لالٹین ، ٹھونسے ، بیٹھے تھے ، اندھیرا ہوتا ۔

داروغہ ۔ برتن کا رنگ کیسا تھا ۔

بفاطن ۔برتن تو ڈھکا ہوا تھا ۔ ذرا سا جو دکھائی دیتا تھا وہ تھا سفید سفید ۔ اور کنڈھا کھلا ہوا تھا

وہ تھا کالا کالا۔

دروغہ ۔ برتن پر کچھ پھول پتیاں بنی تھیں ؟

بفاطن ۔کنڈھے پر کچھ سفید سفید چمکتا ہوا تھا تو ضرور۔ کچھ پھول سا۔ چمکتا تھا جیسے تارا ۔ اور ہوں "شایت" کچھ پتیاں بھی ہوں۔

دروغہ ۔تم وہاں کس کام کو گئیں تھیں ۔

بفاطن ۔میں نے کل دن کے "دخت" چنے کی روٹی پکائی تھی میر حقو نے وہ فیل مچایا کہ میں دال بھات کھاؤں گا۔ دال بھات کھاؤں گا ۔ لاکھ جتن کئے وہ "آگ لگا" نہ مانا تب میں نے کہا لاؤ سکھانی کے یہاں سے تھوڑا سا دال بھات مانگ لاؤں ۔

دروغہ ۔ "تم نے مہری سے تو کہا تھا کہ شخانی نے دال مانگی تھی ۔ اور تم دینے گئیں تھیں"

بفاطن ۔(اپنے کو گرفت میں پاکر) کہا ہوگا ۔ (ذرا تیزی سے) اے میں نے کب کہا ۔مہری آکر کہدے میرے سامنے ۔ میں فوراً جھٹلا دوں گی ——— کہدوں گی اس کے منہ پر کہ تو جھوٹی ہے۔ (حسرت سے) ان کا بیٹا ۱۵ روپیہ کا نوکر ہے ۔ دونوں "دخت" گھر میں چولھا جلتا ہے۔ وہ بھلا مجھ دکھیا سے دال مانگیں گی۔

دروغہ ۔اب خوب سوچ کر بتاؤ کہ برتن پر پھول بنے تھے ؟

بفاطن (کچھ سوچ کر) "شایت" ہوں گے۔ بڑا سا کوئی پھول ۔ سفید سفید ۔کیا جانے کپڑا تو اوڑھا ہوا تھا۔ بھیتر کا حال معلوم نہیں پڑتا تھا۔

دروغہ جی ۔ یہ تو تم کو معلوم ہے کہ وکیل صاحب کا پاٹ چوری گیا ہے ۔ اور تمھارے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی پاٹ شیخ جی کے گھر میں ہے۔

بفاطن ۔نہیں ——— ہاں وکیلنی مجھ سے کہہ رہی تھیں ۔ میں نے کہا کہو قسم کھا جاؤں جو میں کچھ بھی جانتی ہوں کہ کون موا اٹھالے گیا۔

دروغہ ۔ اس طرح کام نہیں بنے گا ۔تم پھنس جاؤگی ۔ ورنہ جو میں کہوں وہ کرو۔

لطافن میں پھنس جاؤنگی ! ایسا اندھیر انہیں ! اے میں دیکھنے بھر کی گنہگار ہوں ۔ ورنہ مجھ بچاری کو اپنے گھر ہی سے کہاں چھٹی جو دوسروں کو چرا چرا کر برتن دیتی پھروں ــــ اور چراتی تو آپ رکھ لیتی ۔ داروغہ جی میں انہیں صاحب کے گھر کام کر چکی ہوں ــــ ہاں ــــ ابھی جو کچھ ہوا تو ڈپٹیائی کے پاس چلی جاؤں گی ۔

داروغہ جی (ذرا ڈپٹ کر) چپ رہ ۔ بک بک مت کر ۔ ابھی حوالات میں بند کر کے سڑا ڈالوں گا ۔ ساری بکواس نکل جائے گی ۔ جب تونے ایسی چیز شیخ جی کے یہاں دیکھی تھی تو تھانہ میں آکر رپٹ کیوں نہیں لکھائی ۔ ڈپٹی صاحب ہوں کہ لاٹ صاحب قانون کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے ۔

لطافن (گھبرا کر ، چلا کر) ہائے مالک میں کیسے ' اجاب ' میں پڑ گئی ۔ کیوں اس گھڑی وہاں دال لینے گئی تھی ۔ مرے یہ کمبخت منا ۔ غارت ہوا ــــ اے لوگوں کیسا اندھیر ہے ۔

داروغہ ۔ سن جو ہم کہیں وہ کر تو صاف چھوٹ جائے گی ۔ ابھی جا کر شیخ جی کے یہاں دیکھ کہ وہ برتن کس قسم کا ہے اس پر پھول پتیاں بنی ہیں یا نہیں ۔ اور اگر نہیں ہیں تو کس وضع کی ہیں ۔ کس رنگ کی ہیں ۔

لطافن ۔ سکھانی بڑی چلتی ہوئی ہیں ۔ جب انھوں نے اس دن مجھے دیکھتے ہی کپڑا ڈال دیا تو اب کیا دیکھنے دیں گی ۔

داروغہ ہم یہ نہیں جانتے ۔ کسی نہ کسی طرح دیکھ کر آ ــــ خبردار ان کو نہ معلوم ہونے پائے کہ تو میری بھیجی ہوئی ہے ۔ ورنہ کالے پانی بھجواؤں گا ۔ کالے پانی ۔ یاد رکھنا ۔ اچھا جا ــــ ادھر جا کر بیٹھ جب ہم بلائیں تب آنا ۔

(سڑ سڑ کرتی بڑبڑاتی ہوئی جاتی ہے)

داروغہ ۔ وکیل صاحب ! شبہ کی تو گنجائش ہے ۔ اگر کوئی خاص بات نہ ہوتی تو شخانی برتن کپڑے سے کیوں ڈھانک دیتیں ۔ مگر اس بگلی سے مخبری کا کام نہیں چل سکتا ۔ سیدھی سی تو یہ ترکیب ہے کہ آپ رپٹ لکھا دیجئے کہ ایسا ایسا برتن میرے یہاں سے غائب ہو گیا ہے ' اور شیخ جی پر شبہہ کیا جا سکتا ہے میں ابھی تلاشی کراتا ہوں ۔

(خاموشی ہ اسکنڈ)

رتن (ٹہلتا ہے۔ آواز دھیمی، اور پھر تیز ہوتی رہتی ہے) کچھ ایسی باتیں ہیں کہ رپٹ لکھانا ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میرا پڑوسی غریب ہو یا امیر میں سب کو بھائی سمجھتا ہوں۔ ان کی عزت اپنی عزت سمجھتا ہوں۔ جب تک یقین نہو جائے کہ وہ پاٹ میرا ہی ہے۔ میں اس طرح ان لوگوں کے گھر کی تلاشی کرا کے، ان کو دوسروں کی نظروں میں گرانا نہیں چاہتا۔ اور دوسری بات یہ ہے (ذرا سنبھل سنبھلکر لہجہ بناتا ہے کہ اصل بات یہی ہے) ایک کباڑی نے ایک برتن اسی قسم کا خریدا ہے۔ میں نے تو پہچان لیا کہ وہ میرا نہیں ہے۔ مگر میری بیوی ——— آپ تو جانتے ہیں کہ عورتیں ہر چیز کو سرسری دیکھا کرتی ہیں ——— میری بیوی کو شک ہوتا ہے کہ وہ پاٹ میرا ہی ہے۔ تو روپیہ میں ایک آنہ ایسا ہو سکتا ہے کہ وہی کباڑی والا پاٹ میرا ہو جائے۔ اس لئے اس طرف سے بے فکر نہو نا چاہئے اور وہ کباڑی کہتا ہے کہ ——— وہ کباڑی جو ہے ——— وہ میرے باپ کے وقت سے آتا جاتا رہتا ہے وہ ذرا پھنس جائے گا۔

داروغہ ۔ رپٹ لکھانے کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ ہمارے آپ کے بس کی بات نہیں رہے گی۔

وکیل صاحب ۔ نہیں نہیں رپٹ جانے ہی دیجئے۔ آپ اپنی ہی طرف سے کچھ کارروائی کر لیجئے۔ نہیں تو جانے دیجئے پاٹ کو۔ ایک وجہ ذرا اور ہے ——— آپ تو جانتے ہیں کہ سکھ لال ۱۷-۱۸ برس کا ہے۔ مگر ہے ابھی بچہ ہی۔ اور آپ بھی کہتے ہیں کہ کسی گھر کے آدمی کا ہاتھ ہو سکتا ہے اور وہ ہے بھی ذرا شریر ——— یعنی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ آپ یوں ہی پتہ چلانے کی کوشش کیجئے۔ شیخ جی کو ڈرائیے دھمکائیے۔ اگر بلا رپٹ لکھائے تلاشی ہو سکے تو تلاشی بھی کرا لیجئے۔

داروغہ اچھی بات ہے۔ کوشش کروں گا۔ ذرا بفاطن کو ادھر بھیجدیجئے۔ دیکھئے اگر اس بگلی سی سکھا پڑھا کر کام نہ نکالا تو کچھ نہیں کیا۔

ایکٹ دوسرا

سین تیسرا

زلفن ۔ اماں دیکھو پیجامہ کتنا سفید ہوگیا۔ پاٹ سے ملاکر دیکھوں ؟

شخانی ۔ چل گدھی۔ وہ ولایت کا بنا ہوا ہے۔ تیرا پیجامہ گھر کا دھلا۔ اس کی کیا برابری کریگا۔

ب۔ ارے یمن آگیا۔ نذرو کہاں رہ گیا۔

ب۔ (۱۴ برس کا سن) ابا مزدور کے سر پہ سامان لارہے ہیں۔ ہم آگے آگے بھاگ آئے

ام۔ سلام۔ سلام

زلفن ۔ جیتے رہو
جیتے رہو
خوش رہو
اچھے رہو

یوسف ۔ پی۔ او۔ ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن۔ پی۔ او ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن

یامین ۔ ہا ہا ہا۔ انھوں نے انگریزی شروع کی ہے۔

زلفن ۔ انگریزی کیا شروع کی ہے۔ داوا ایک پاٹ لائے ہیں۔ کل عید ہے۔ جاجم بچھےگی اس پر پاٹ دھرا جائے گا۔ اس میں سوئیاں ہوں گی۔ پیالوں میں نکال نکال کر دی جائےگی سب چمچوں سے کھائیں گے۔

یامین ۔ کیسا پاٹ

زلفن ۔ اتنی بڑی کنڈالی ہے۔ معلوم ہوتا ہے جیسے چار کی پیالی

یوسف کی ماں (بے حد خوش ہوکر) ایسف کہہ رہا تھا کہ اماں کیا بڑے لوگ بڑی پیالیوں میں چاء پیتے ہیں (سب قہقہہ لگاتے ہیں) (یوسف کو آواز سے پیار کرتی ہے) یہ بڑا سیانا ہوگا خوب کمائی کرنے جائے گا۔

یوسف ۔ پی۔او۔ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن۔ پی۔ او ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن۔

شیخ جی (دور سے) پاٹ لاکر تو دکھاؤ۔ ایک جگہ ذرا ٹھیس لگ گئی ہے۔ ورنہ روپوں کا مال ہے (چر چر جوتوں کی آواز آتی ہے۔ کوئی آکر کھٹ سے صندوق رکھتا ہے۔ پھر باہر جاتا ہے اور بستر لاکر بھو سے ڈالتا ہے)

مدرو ۔ ے یامین جا کر پیسے دے آ۔ آداب۔ آداب

شخانی ۔ جیو

شیخ جی ۔ جیو

زلفن ۔ سلام

مدرو ۔ یوسف تجھے سلام کرنا نہیں آتا۔

یوسف ۔ (چپکے چپکے) پی۔او۔ٹی پاٹ پاٹ معنی برتن

مدرو ۔ اچھا۔ انگریزی یاد کی ہے۔ یہ تو بڑا شوکین نکلا۔ واہ وا

شیخ جی ۔ ابھی ٹھہرو۔ ایک چیز تو دیکھو۔ جلفن کہاں ہے؟ پاٹ لا ——— ہم ایک پاٹ نخاس سے خرید کر لائے ہیں۔ کیا عمدہ چیز ہے! ۔ پانی اس میں رکھو۔ کپڑا اس میں رنگو۔ ابھی عید کے دن۔ اس میں سوّیاں نکال کر رکھی جائیں گی۔ یہ گنوار پنا ہے کہ پتیلی سے نکال نکال کر دے رہے ہیں۔ ہم نے شیخ مدارو کے گھر دیکھا۔ بڑی سی لگن میں سوئیاں تھیں۔ اور بجا وج بیٹھی سب کو نکال نکال کر دے رہی تھیں۔ آدمی کی حیثیت بنانے سے بنتی ہے۔ تب چار آدمی عزت بھی کرتے ہیں۔

مدرو ۔ (تعجب سے) یہی پاٹ ہے!

شیخ
زلفن } ساتھ ہی { ہوں / جی

مدرو ۔ یہ! ۔ معلوم ہے کہ صاحب لوگ اسے کس کام میں لاتے ہیں؟

شیخ ۔ کس کام میں ؟

نذرو ۔ یہ گونڈے کے کام میں آتا ہے

شیخ جی ۔ (جلدی) اسی لئے تو میں لایا ہوں

نذرو ۔ گول گونڈا ؟ جو بڑے لوگوں کی چوکی کے نیچے رکھا جاتا ہے (وقفہ ۵ سکنڈ)

شیخ جی :

و ۔ ہاں (کھینچ کر)

(وقفہ ۲۰ سکنڈ)

شیخانی ۔ (ذرا آہستہ سے ۔ لہجہ ایسا ہے گویا اپنے اوپر طعن کر رہی ہے) بناؤ اب حیثیت ۔ ایک رہی سہی لنگوڑی ذات تھی وہ بھی گئی ۔

زلفن ۔ اب کیا ہوگا ؟

شیخ جی ۔ ہوگا کیا ۔ بھلا کہیں ممکن ہے کہ ایسی عمدہ نفیس چیز ایسے برے کام میں آتی ہو (بگڑ کر) یہ لونڈے جہاں کسی قابل ہوتے چلے اپنے بڑوں کو "وہ" بنانے ۔ میں دنیا دیکھ چکا ہوں ۔

نذرو ۔ ابا تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو ۔ میں اور اتنی چھوٹی سی بات نہ جانوں ۔ صاحب لوگوں کے ساتھ رہتا ہوں ۔ سب طور طریق دیکھے ہوئے ہوں ۔ دو ایک بار خانساماں جی سے کہہ کر خود بانٹ پر گیا بھی ہوں ۔

شیخ جی (کھسیانہ غصہ) بس چپ رہ ۔ چلا بڑا ' لفاطوں ' بننے ۔ صاحب بہت سمجھ دار ہوتا ہے ۔ (زور سے گویا قائل کرنے والی دلیل مل گئی) وہ یہ کبھی نہیں کر سکتا کہ روپوں کی چیز خریدے اور اس میں پھینک دے ۔ (سمجھا کر) یہ اور بات ہے کہ جو ذرا ٹوٹا پھوٹا ہوتا ہوگا ۔ اسی کام آجاتا ہوگا ۔ چلے ہیں ہم کو بنانے ۔

یامین ۔ نہیں دادا ۔ ہم نے بھی اسکول میں دیکھا ہے ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کے لئے جو چوکی ہے اس کے نیچے رکھا رہتا ہے ۔

شیخ جی - چپ کمبخت تیری بھی اب یہ توفیق (بہت بھرپور تلفظ) ہو کہ مجھے وہ کرے۔ ماروں گا ایک لپڑ منہ ادھر سے ادھر ہو جائے گا۔

شخانی - میں بھی کہتی ہوں کہ ایسی اچھی چیز اس طرح کون ناس کرے گا۔

نذرو - اماں تم تو جانتی نہیں ہو۔ صاحب لوگ صفائی کو بہت پسند کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ گندے پن سے بیماری پھیلتی ہے۔ اگر تم کبھی وہ جگہ دیکھو جہاں یہ بات اور سب سامان لگا ہوتا ہے تو تم کہو گی کہ یہ بہشت ہے کہ کوئی چیز ہے کیا ہے۔ قرآن قسم ہم جب کبھی خانساماں سے کہہ سن کر وہاں گئے تو بس آنے کا جی نہیں چاہتا تھا روز صابن سے تو وہ جگہ 'وش' کی جاتی ہے۔

شخانی - یہی سے وہ لوگ ایسے موٹے تازے ہوتے ہیں۔ بدن سے خون ٹپکا پڑتا ہے۔

نذرو - وہاں دن بھر صفائی ہوتی رہتی ہے۔ صاحب میم کے ایک جوڑے کے لئے چار چار بیرا ہوتا ہے وہ بھی صاف رہتا ہے۔ یہی سب باتیں ہیں جس کی وجہ سے وہ بادشاہت کرتے ہیں۔

یاسین (ذرا جوش سے) ابا ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی تو اسی طرح رہتے ہیں۔ ایک اور ماسٹر صاحب ہیں ان کے پاس بھی بیرے ہیں۔

شیخ جی - پھر یہ بولا۔ اس کو تو نذرو نے پاس رکھ کر اور چوپٹ کر دیا۔ چلا ہے تیرا ہیڈ ماسٹر کا بچہ بننے۔

نذرو - ابا تم تو جب سے سٹھیا گئے۔ کچھ خیال نہ 'ویال' کہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیا نہیں۔

شخانی - سٹھیا نہ جاتے تو یہ موا کونڈا اٹھا لاتے ـــــــ توبہ ـــــــ چھی ـــــــ وہ تو کہو اس میں کچھ کھایا پیا نہیں (ٹھنک کر) حیثیت بنائیں گے۔ حیثیت بنائیں گے۔۔۔ اگر یہی خدا کو 'منظور' ہوتا تو صاحب لوگ نہ بناؤ تھا۔ وہ تو کہو خدا نے کیا لڑکا ۱۵ روپیہ سے لگ گیا نہیں تو اپنے بھائی کی طرح در در کی ٹھوکریں کھاتے گھومتے۔

شیخ جی (بڑا افروختہ ہو کر) میرے بھائی کو تو کہتی ہے۔ اور اپنے گھرانے کو نہیں ملاحظہ (ملاحظہ) کرتیں جن کو ڈلیا ڈھونے کو نہیں ملتی۔ ابھی دس روز کی بات ہے کہ دو روپیہ مانگنے آئے تھے۔

شخانی (بات کاٹ کر تیزی سے) ان کو کیوں کہوں۔ وہ کیا حیثیت بناتے پھرتے ہیں ب۔ گھر گوری کا

میلا سیمنٹے کا برتن نخاس سے اٹھا لاتے ہیں۔ مزدوری سینکڑوں کو نہیں ملتی۔ لاکھوں بچارے ہیں جوان سے بھی 'جیادہ محتاز' ہیں۔ ارے مرا تو وہ گھر ہے۔ جہاں روپیہ برساہے روپیہ۔ بچپن میں اس بندی نے پوتوں ملائی کھا ڈالی۔ یہ تو تمھارا گھر ہے کہ مہینوں دال روٹی کھائے بیت جاتے ہیں۔ وہ بھی میرا لڑکا جب سے سرکار میں نوکر ہوا۔ تب سے یہ بھی جڑنے لگا۔ ورنہ وہی تھا اس کا سودا لائے تو کچھ مل گیا اس کے سودے سے کچھ نکال لیا۔ اس کے دام کاٹے۔ اس کو ٹھگا۔ ارے ہاں یہی تو تھا جو اتنے دنوں کام چلا۔ آگ لگے اس گھر کو۔ ذرا عیش (ثقیل تلفظ) نہ جڑا

شیخ جی (طعن سے) وہ بھول گئیں جو کا مدانی کا دوپٹہ اوڑھا تھا۔ کھیریں کھایا کرتی تھیں۔

شخانی (آپے سے باہر ہوکر) اے مالک۔ ایک دفعہ کا مدانی کا دوپٹہ کیا اوڑھ لیا جنم بھر کو ٹھیکہ ہو گیا۔ ارے میں بھی 'جوان جہاں' تھی۔ اتنی ارمان بھی نہ نکالتی (چٹک کر) ارے وہ تو کہو میری کوئی اور بندی ہوتی تو وہ ٹکنی کا ناچ نچاتی۔ دوپٹہ اوڑھا تھا۔ کھیریں کھایا کرتی تھی۔ دودھ میں چاول گھونٹ کر پکا لئے کہ منہ میں چھالے ہیں کچھ نگل لوں' وہ کھیر ہو گئی ——————

نذرو ۔ اے اماں خدا کے لئے چپ رہو۔ پڑوس کے لوگ کیا کہیں گے۔ ہائے اللہ میرا بھی کیا نصیب ہے گھر آیا تھا کہ ذرا خوشی میسر ہو۔ آتے ہی یہ طوفان مچ گیا۔

شیخ جی ۔(بے تکی اونچی آواز سے) بالکل جھوٹ۔ یہ تم دونوں ماں بیٹیوں کی کارستانی ہے یہ پاٹ' وہ کونڈا نہیں ہو سکتا۔ زلفن ادھر لا میرا پاٹ

یوسف ۔ پ۔ او ٹ پاٹ پاٹ معنی برتن۔ پ۔ او

شیخ جی (حد سے زیادہ اونچی آواز سے) چوپ

شخانی
یوسف کی ماں } ایک ساتھ { چپ۔ چپ
چپ۔ چپ

یوسف رونے لگتا ہے

شخانی ۔ اچھی بہو ملی۔ ساس بیٹھی ہوتی ہے۔ اور خصم کے سامنے ٹرٹر کرتی ہے —— تو

کیوں روتا ہے یوسف۔

شیخ جی (ڈانٹ کر) چپ چپ

نذرو ۔ چپ یوسف (یوسف کی ماں یوسف کو دھب دھب مارتی ہے) ہائیں ہائیں۔ ارے مارتی کیوں ہے، ارے مارتی کیوں ہے؟

(شخانی دوڑ کر جاتی ہے)

چھوڑ۔ مردار۔ چھوڑ۔ یہ بہو بھی ایسی ملی کہ ہمیشہ معصوم بچے پر چپا نچہ اتارتی ہے آگ لگے اس بات پر۔ جب آیا تو یہی تھکا فضیتی ہوئی۔ اور آج جو موئے کی وہ ——— کھلی تو یہی ——— ارے یہ تو ہم لوگوں کے نصیب میں لکھا ہے۔ حیثیت حیثیت جو یہ بگھار رہے تھے تو خدا کو برا لگا کہ ہم کو پیدا کیا کیچڑ میں اور یہ چاہیں ہیں کہ بیٹھیں جا جم پر

شیخ جی (ہاری مانتے ہوئے) اور وہ جو تم کہتی تھیں کہ لڑکی کی کہیں سے اچھی بات نہیں آتی جب تک اپنی حیثیت نہ ہو اچھی بات کیسے آئے گی۔ میں نے تو تمہارے بھلے کی سوچی تھی (ذرا زور پکڑ کر) اور اب بھی پیسہ ہو تو جا کر لپ لے آؤں۔ (یوسف رونا بند کر دیتا ہے)

شخانی (اس جگہ پہنچتی ہے) اس کے نصیب میں ہوگا۔ چھپر پھاڑ کر اچھی بات آئے گی۔ ہوتا ہی ہے۔ اگلے زمانے میں بادشاہوں نے غریبوں کے گھر شادیاں کیں تو کیسے کیں۔

نذرو ۔ اماں خدا کے لئے۔ اس جھک جھک بک بک کو ختم کرو۔ ہائے اللہ اس سے تو اچھا تھا کہ میں نہ آتا۔

پایلین ۔ چلو ابا چلیں

شیخ جی ۔ پھر بولا۔ اس کا تو بولنا مجھے زہر لگتا ہے۔

نذرو ۔ (تراق سے تھپڑ دیتا ہے) ملعون!

شخانی ۔ اے لو۔ اور لو بیوی نے ایک کو مارا تھا۔ تو میاں اپنی لیاقت (نقلیں) کیوں نہ بگھاریں

نذرو ۔ یا اللہ میرا تو جی ہے کہ نکل جاؤں۔ یا کچھ کھا کے سو رہوں۔ دفتر میں چپراسیوں کی خوشامد کرو

باپوں کی جھڑکیاں سہو۔ وہاں سے مرتے ہوئے آؤ اور کھانا پکاؤ۔ تب دوزخ پٹے۔ اوپر سے بڑی مصیبت بنئے کا تقاضا۔ نہ موقع دیکھے نہ محل۔ سر پر کھڑا ہوا ہے منشی جی لاؤ روپیہ لاؤ۔ اوپر کی آمدنی جو دو ایک روپیہ ہوجاتی تھی وہ الگ بند۔ کیا زندگی ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ مزدور ہوتا شام کو ڈلیا ڈھوکر آتا۔ اور مزے سے ٹانگیں پسار کر پڑ رہتا۔

شخانی ۔ تو یہ آج کھلا اوپر کی آمدنی بھی تھی۔ جو سینت سینت کر اپنی چھبیلی کو لا کر دیتے ہوگے۔

نذرو ۔ بچتا کیا ہے جو اس کمبخت کو دوں۔ دو دو آدمیوں کا کھانا۔ ارے ہاں اب یامین بھی برابر کا کھانے والا ہوگیا ہے۔ ایک روپیہ مہینہ کمرے کا دینا ہوتا ہے۔ یامین کی آدھی فیس ہے۔ کتابیں خریدنا ہوتی ہیں۔ اے اماں ذرا سمجھو تو اگر کچھ بچتا تو بنئے کا قرضہ کیوں رکھتا جس نے زندگی اجیرن کر دی ہے

شخانی (بڑبڑاتی ہے) باپ بیٹے دونوں کی ایک بناوٹ ہے

شیخ جی (ذرا شیر ہوکر) ہاں ہم دونوں کی تو ایک بناوٹ ہے۔ سب 'منحوسیت' تو تمھاری ہے تمھاری منحوسیت سے اچھا خاصا 'پاٹ' کونڈا نکل گیا۔

نذرو ۔ لے ابا ہاتھ جوڑوں۔ پیر پڑوں، اب اس کمبخت کا ذکر جانے دو۔ یہ بھی سمجھ لو کہ اگر برادری میں بات نکل گئی تو بیٹھے بٹھائے حقہ پانی بند ہوجائے گا۔ خوشامد درآمد کر کے اگر پنچوں نے 'جرمانے' ہی پر بات ختم کر دی تو بھی اتنا بھی تو نہیں ہے کہ دس روپیہ کہیں سے لا کر دوں۔ اگر ہوتے تو گھر کی مرمت نہ ہوجاتی ——— یامین صندوق تو اٹھا لانا۔ ابا ——— دیکھو تم لوگوں کے لئے جوتیاں لایا ہوں۔

(صندوق کھلنے کی آواز آتی ہے۔ جوتیوں کی کھڑکھڑ سنائی دیتی ہے۔ خاموشی ایک منٹ)

نذرو ۔ اب دیکھ لو کون کس کے پاؤں میں ٹھیک آتی ہے۔

شیخ جی (ایک جوتی پہن کر کھٹ کھٹ چلتے ہیں) بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے ہی پاؤں کے لئے لیں تھیں۔ (کھٹ کھٹ)

زلفن ۔ یہ میرے پاؤں میں ٹھیک ہوگی۔

تخانی - ابھی نہیں - پہلے ان چاروں کو لے جاکر اپنی بھابھی کو دکھا - ان کو کون پسند ہے -
(زلفن کھٹ کھٹ کرتی جاتی ہے)

شخانی (اونچی آواز سے) ارے ابھی ان کو جھوٹی نہ کر - پہلے بہو کو دکھالے -

شیخ جی (بدستور ٹہلتے ہوئے) بڑا آرام ملتا ہے - ہمارے جوتوں سے اچھی ہیں - اب یہی پہن کر بزار جایا کروں گا (وقفہ ۵ اسکنڈ) یوسف ایک جوتی پہننے کو دے رہا ہے اور بہت خوشی میں گا رہا ہے
پی - او - ٹی - پاٹ - پاٹ معنی "برتن")

شخانی - یہ ہمارے "لائق" ہے -

زلفن (کھٹ کھٹ کرتی آتی ہے) بھابھی کو یہ رنگ برنگی پٹی والی اچھی لگتی ہے -
(چپکے سے) اماں یہ تو ہم لیتے

شخانی - نخ -

(سڑ سڑ کی آواز آتی ہے - اور بفاطن آتی ہے)

بفاطن - اے سلام - سلام - سلام - اے میاں کب آئے - اچھے رہے
—— تو یہ (گھبرا کر) میں کہتی کہ یہی بات ہے جس کے لئے ایسا اودھم جوت رکھا ہے -

بندرو (چوکنا ہو کر) کیسا اودھم ؟

شیخ - اودھم کیسا باتیں کر رہے تھے - اپنے گھر میں بھی زور زور باتیں نہ کریں -

شخانی - ٹھہرو - بات تو سمجھنے دو - کیا بات ہے بفاطن - بیٹھ تو جاؤ -

بفاطن - اے کیا بتاؤں سکھانی - کہنے والی بات ہو تو کہوں - توبہ —— میں تو کہتی ہوں کہ بات نہ بات - سوا ہاتھ —— کیا بتاؤں یہ جو نہیں ہیں - وکیل صاحب - اے وکلائن کے میاں بیاج پر روپیہ چلاتے ہے - پیسہ والے ہیں - انھوں نے آج درو گہی کو بلایا اور کمرے میں بیٹھ کر ان سے خوب باتیں کیں -

شخانی - کیا باتیں کیں -

بفاطن - وہ دروگہ جی مجھے بلا کر لگے ڈرانے دھمکانے - میں نے کہا میں کیا جانوں کیسا پاٹ اور کون لے گیا - میں نے نہ تمھارا پاٹ دیکھا، اور نہ سیکھ جی کا۔

نذرو (گھبرا کر) کیا مطلب ؟

بفاطن - لے وہی ان کے یہاں کوئی پاٹ تھا - وہ کوئی اٹھالے گیا - کاہے کا، ـــــــ لوہے کا کہ جستے کا کالا کالا بنا ہوا - کہتے ہیں اس پر چاندی کے پھول پتیاں تھیں - اس پر چونے کا ایسا سفید رنگ پھرا تھا - کہاں یہ پاٹ، اور کہاں وہ

شخانی - ہائے کمبخت نکھا - تو اب اس پاٹ کے کارن ہم پر چوری لگے گی۔

بفاطن - وہ تو میں پہلے ہی سمجھی تھی - درو گہ جی نے ایسا ڈرایا دھمکایا کہ نچاؤ گی تو یہ (جھٹکے سے) کروں گا - وہ کروں گا۔

شخانی (تلملا کر) تو تم کچہری کرنے آئی ہو ؟ کچہری ؟ مرو تم - اور تمھارے وکیل اور وکلائن اور دروگہ جی - حرامزادی - ہم کو چور بنائے گی - اب ہم ایسے گئے گذرے ہوئے کہ تیرے میرے گھر کے میلا اٹھانے کے کونڈے چراتے پھریں گے - ارے وہ تو اگر ہیرے ٹکے ہوں تو بھی ایسی گھنونی چیز میں ہاتھ نہ لگاؤں - بڑی بنی ہیں وکیلن اور وکیل - ان کی عزت آبرو ہے ہماری عزت آبرو ہی نہیں - ہم لوگ بھنگی ٹھہرے - ارے لوگوں پیسہ پاکر لوگوں کا کیسا سر پھر جاتا ہے - بھاج کھانے والے - قصائی کہیں کے - آگ لگے ان کے گھر میں - ستیاناس ہو جائیں وہ ـــــــ اور تو حرامزادی ـــــ نکل ابھی گھر سے - ابھی نکل - اور لے جا یہ 'میلے کا کونڈا' ان دونوں کے سر پہ ٹپک دینا (بھڑ سے پاٹ پھینک دیتی ہے) چل مردار، ابھی لے جا کر ان 'کیڑے پڑوں' کو دکھا - نہیں تو ابھی مار کر دفن کر دوں گی ـــــــ اٹھاتی ہے ؟

(بفاطن جلدی جلدی سٹر سٹر کرتی جاتی ہے)

شخانی (بڑبڑاتی ہے) کیا آگ لگا کونڈا آیا تھا ـــــــ چھ آنے کا نقصان ہوا۔

نذرو - پہلے تو میں سمجھا کہ بچوں کو۔

شیخ جی (بات کاٹ کر) چار آنے کا۔ (چہچہکے سے) روزے میں پیدل مرتے ہوئے کیسے جلتے —— وہ کون ساعت تھی جو میں نے اس پاٹ کو دیکھا تھا۔

یوسف (چہکے چہکے) پی۔ او۔ ٹی۔ پاٹ پاٹ معنی ——————۔۔

ڈرا

پ

غزل

شاعرِ فطرت ہوں میں جب فکر فرماتا ہوں میں ۔۔۔ روح بن کر ذرے ذرے میں سما جاتا ہوں میں

آ کہ تجھ بن اس طرح اے دوست گھبراتا ہوں میں ۔۔۔ جیسے ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتا ہوں میں

جس قدر افسانۂ ہستی کو دہراتا ہوں میں ۔۔۔ اور بھی بیگانۂ ہستی ہوا جاتا ہوں میں

تا کجا ضبطِ محبت تا کجا دردِ فراق ۔۔۔ رحم کر مجھ پر کہ تیرا راز کہلاتا ہوں میں

میری ہمت دیکھنا میری طبیعت دیکھنا ۔۔۔ جو سلجھ جاتی ہے گتھی پھر سے الجھاتا ہوں میں

یاد ایامے کہ ہر ہر سانس تھا لبریزِ عشق ۔۔۔ اب تو نامِ آرزو بھی سن کے تھراتا ہوں میں

میں نہیں رہتا ہوں میں جب پاس آتا ہے وہ شوخ ۔۔۔ دل نہیں رہتا ہے دل جب سامنے جاتا ہوں میں

یا کسی کے قہر پر بھی مسکرا دیتا تھا دل ۔۔۔ یا نگاہِ لطف سے بھی آہ شرماتا ہوں میں

میری ہستی شوقِ پیہم میری فطرت اضطراب ۔۔۔ کوئی منزل ہو مگر گذرا چلا جاتا ہوں میں

تیری محفل تیرے جلوے پھر تقاضا کیا ضرور ۔۔۔ لے اٹھا جاتا ہوں ظالم لے چلا جاتا ہوں میں

ہائے ری مجبوریاں ترکِ محبت کے لئے ۔۔۔ مجھ کو سمجھاتے ہیں وہ اور ان کو سمجھاتا ہوں میں

تیرے اک آنکھوں کا ساغر تیرے اک رخ کی بہار ۔۔۔ یہ میسر ہوں تو ہر جنت کو ٹھکراتا ہوں میں

دل مجسم شعر و نغمہ وہ سراپا رنگ و بو ۔۔۔ کیا فضائیں ہیں کہ جن میں حل ہوا جاتا ہوں میں

ایک دل ہے اور طوفانِ حوادث اے جگر ۔۔۔ ایک شیشہ ہے کہ ہر پتھر سے ٹکراتا ہوں میں

ترکِ مے کو مدتیں گذریں مگر اب تک جگر

دیکھ کر جامِ تہی کچھ اشک بھر لاتا ہوں میں

احسن الکلام

کروں کیا مجھ سے تیرا سنگِ در چھوڑا نہیں جاتا / اٹھاتا ہوں قدم، لیکن دلِ شیدا نہیں جاتا

خوشی کیا آج کی ہو جب غمِ فردا نہیں جاتا / جئیں کیا بے خلش، جب موت کا کھٹکا نہیں جاتا

مریضِ عشق رہتا ہے جہانِ کس مپرسی میں / جسے پوچھا نہیں جاتا جسے دیکھا نہیں جاتا

یہ محویت ہے دل کی یا تری محفل کی دلچسپی / یہاں ہم بیٹھ جاتے ہیں تو پھر اُٹھا نہیں جاتا

خطا پر جو نہ ہو نادم، عطا کا مستحق کیا ہو / جسے لینا نہیں آتا اُسے بخشا نہیں جاتا

ترے جلوے کو ہم اے جلوہ گر سمجھیں نہ کیوں پردہ / دکھایا جا رہا ہے وہ مگر دیکھا نہیں جاتا

وہاں لب پر کبھی آتا نہیں ذکرِ دلِ محزوں / یہاں دل سے خیالِ حسنِ بے پروا نہیں جاتا

بلو جب تک نہ تم کیونکر مریضِ ہجر ہو اچھا / دوا جس کی نہیں ہوتی مرض اُس کا نہیں جاتا

شکستِ عہد پر ہر وقت وہ آمادہ رہتے ہیں / مگر ٹوٹے ہوئے دل کو کبھی جوڑا نہیں جاتا

جب آیا اُن کا پیکاں لے گیا تاب و توانِ دل کی / یہ مہماں میزباں کے پاس سے تنہا نہیں جاتا

سمجھ لیتی جو عقل اُس کو تو یوں عاجز نہ ہو جاتی / کہ وہ سمجھا رہی ہے اور سمجھا یا نہیں جاتا

جنونِ عشقِ صادق جانِ عاشق بن کے رہتا ہے / قضا جب تک نہیں آتی ہے یہ سودا نہیں جاتا

وہ احسن جس کا عالم آشنا تھا عشق سے پہلے
اسے دیکھے تو اب کوئی کہ پہچانا نہیں جاتا

(احسن مارہروی)

کلام آزاد

اب نہ وہ ارباب الفت کا لحاظ — اب نہ وہ مہر و محبت کا لحاظ

اب نہ وہ باہم وگر ملت کی شرم — اب نہ وہ صاحب سلامت کا لحاظ

کچھ مرے حقہائے الفت پر نظر — کچھ مری دیرینہ خدمت کا لحاظ

اب نہ ڈر قصد گنہ آساں نہیں — دل ہے اور اس کی معیت کا لحاظ

اب نہ وہ دن رات شغل ناؤ نوش — اب نہ وہ اوقات فرصت کا لحاظ

اب نہ وہ شوق طرب کا احترام — اب نہ وہ ذوق طبیعت کا لحاظ

اب نہ وہ ارمان صحبت کا ادب — اب نہ وہ سودائے عشرت کا لحاظ

ب نہ ظاہر پر نہ باطن پر نظر — اب نہ صورت کا نہ سیرت کا لحاظ

ب نہ تنگی کا نہ وسعت کا خیال — اب نہ کثرت کا نہ قلت کا لحاظ

جائیے بس شیخ صاحب جائیے — ہو چکا حضرت سلامت کا لحاظ

تم کو اپنے حلقۂ بیعت کی شرم — ہم کو اپنے اہل صحبت کا لحاظ

حضرت آزاد آخر تا کجا
ایک یار بے مروت کا لحاظ

کچھ آثار رخ سے عیاں اور بھی ہیں — کچھ اسرار دل میں نہاں اور بھی ہیں

فقط وجہ قرب خدا ہی نہ سمجھو — مقامات عشق بتاں اور بھی ہیں

حرم میں پناہیں نہ پا سکنے والو! — مقامات امن و اماں اور بھی ہیں

ابھی ظرف قابل ہی جانچا گیا ہے — ابھی سیکڑوں امتحاں اور بھی ہیں

وہ اپنی وفا کو وفا ہی نہ سمجھیں | کہ ان کی وفا پر گماں اور بھی ہیں
زباں گرم اظہارِ الفت ہے لیکن | نظر سے ارادے عیاں اور بھی ہیں
سن اے یار اندازہ دانِ وفا سن | وفا کے کچھ اندازہ داں اور بھی ہیں
بتوں ہی سے ان بن کا خطرہ نہیں ہے | سجودِ خدا میں زیاں اور بھی ہیں
جو اہلِ حرم درپئے دشمنی ہیں | تو پروا نہیں آستاں اور بھی ہیں
کبھی مے کبھی دُردِ مے کے علاوہ | مراعاتِ پیرِ مغاں اور بھی ہیں
نذرِ قتلِ عالم روا رکھنے والو | تدابیرِ فتحِ جہاں اور بھی ہیں

غلامانہ خوا تفاقی ہے ورنہ
روایاتِ ہندوستاں اور بھی ہیں

شکوۂ غم بجا نہیں نہ سہی | حکم چون وچرا نہیں نہ سہی
انتہائے جفا نہیں نہ سہی | رحم کھانا روا نہیں نہ سہی
سیکڑوں خوبیوں کے مالک ہو | ایک صاحب وفا نہیں نہ سہی
آپ نے دردِ سن لیا ہوتا | درد کی کچھ دوا نہیں نہ سہی
دل ازل سے ترا شناسا ہے | آنکھ شکل آشنا نہیں نہ سہی
میں بھی سرکار ہی کا بندہ ہوں | لائقِ اعتنا نہیں نہ سہی
تو ہو اور تیری زلف ہائے رسا | میری قسمت رسا نہیں نہ سہی
الفتِ معنوی بھی کیا کم ہے | پرسشِ برملا نہیں نہ سہی
باطنی قرب اصلِ عزت ہے | ظاہری واسطا نہیں نہ سہی
دولتِ دردِ دل تو حاصل ہے | دولتِ دوسرا نہیں نہ سہی
آپ کا تو پتہ لگا ہی لیا | اب جو میرا پتہ نہیں نہ سہی
شکرِ غم پر ملال کا کیا کام | قدرِ نعمت بجا نہیں نہ سہی

تم کہ دردِ جہاں کے درماں ہو | میرے دکھ کی دوا نہیں نہ سہی
آپ حکم سزا سنا بھی دیں | قصدِ عفو خطا نہیں نہ سہی
صبر کی تاب تو عطا فرما | جبر کی انتہا نہیں نہ سہی
میں تو اظہارِ درد کرتا ہوں | کوئی درد آشنا نہیں نہ سہی
ترکِ حاجت بھی ممکنات سے ہے | کوئی حاجت روا نہیں نہ سہی

رند ہوں اور رندِ پاک نہاد
متقی پارسا نہیں نہ سہی

صحافت کے ذریعے سے

ہندوستانی ذہنیت میں زبردست انقلاب پیدا کرنے کی اردو زبان میں پہلی کوشش

کلیم دہلی

زیرِ ادارت شاعرِ انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

ہر صاحبِ عقل ہندوستانی کو جو اس دور کے رجحانات سے واقف ہے اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے۔ اگر آپ کو اس مقصدِ عظیم سے ہمدردی ہے تو "کلیم" کی خریداری منظور فرما کر ملک کے اربابِ فکر کا ہاتھ بٹائیے۔ اور سنجیدہ علمی اور ادبی مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب کچھ بھی ہوگا جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں شاعرِ انقلاب کا تازہ بتازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شائع ہوتا ہے۔ عمدہ تصاویر سے مزین، کتابت و طباعت دیدہ زیب، رنگین سرورق

سالانہ چندہ چھ روپے　　　　ششماہی تین روپے آٹھ آنے

نمونے کے پرچے کے لئے ۹ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

منیجر کلیم، اکبر منزل، اجمل روڈ قرولباغ، دہلی

ندیم بک

کچہری روڈ۔ گیا

صوبہ بہار میں جلد سازی کا کوئی ایسا کارخانہ نہیں ہے جہاں اعلیٰ معیار پر فینسی، بہترین ڈیزائن، پائیدار اور مستحکم جلد بندی کا کام ہوتا ہو مصنفین، معززین شہر، وکلا اور اہل علم حضرات اس کی سخت کمی محسوس کر رہے تھے۔ نیز ندیم آفس میں جس کثرت سے قابل قدر و قیمتی کتابیں، رسالے، اخبارات آتے رہتے ہیں ان سب کا لحاظ کرتے ہوئے اعلیٰ معیار پر جلد سازی کا ایک کارخانہ میں نے اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء میں کھولا ہے جس کا نام "ندیم بک بائنڈنگ اسٹورز" رکھا گیا ہے۔ اس کارخانہ کی امتیازی شان یہ ہے کہ یہاں جلد سازی کا کام نہایت ہی پسندیدہ و حسب دلخواہ، اعلیٰ پیمانہ پر ہوتا ہے وقت کی پابندی کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا ہے۔ چنانچہ اپنی انھیں خوبیوں کی وجہ سے صرف چند ہی ماہ کے عرصہ میں اس قدر مقبول و مشہور ہوا کہ بار لائبریری، کلبس، معززین شہر اور وکلا کے کثرت سے کام ملنے لگے۔ ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ اس دوکان سے زیادہ پائیدار اور ساتھ ہی ارزاں جلد سازی کا کام دوسری جگہ نہیں ہو سکتا۔ ایک مرتبہ تشریف لا کر ضرور آزمائیے۔

جلد سازی کے کام کے علاوہ رجسٹر، نوٹ بک، فائل، فلیٹ فائل، پیڈ، رائٹنگ پیڈ کاپی، بہی وغیرہ بھی تیار کئے جاتے ہیں۔

"طنزیات مانجوری" کی جلد سازی بھی اسی کارخانہ میں ہو رہی ہے۔ یہ مجلد مجموعہ عنقریب ہی ناظرین ندیم کی خدمت میں پہنچے گا۔

پروپرائیٹر

محمد یعقوب پریمی

تاریخ امت

ابتدائے رسالت سے آخر زمانہ خلافت عثمانیہ تک تمام ضروری معلومات اور مسلمانوں کے
کارناموں کا ذکر نہایت سلیس اور دلچسپ عبارت میں کیا گیا ہے۔

اسلامی تاریخ کا یہ سلسلہ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے بڑی جانفشانی اور تحقیق سے مرتب فرمایا ہے
ملک کی متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہے۔ بالخصوص ہائی اسکول اور
انٹرمیڈیٹ کے طلبار کے لئے نہایت مفید ہے طباعت وکتابت نہایت عمدہ۔

حصہ اول	سیرۃ الرسولؐ	قیمت	عہ	مجلد	عمہ
حصہ دوم	خلافت راشدہ	قیمت	عار	"	عالہ
حصہ سوم	خلافت بنی امیہ	قیمت	عہ	"	عمہ
حصہ چہارم	خلافت عباسیہ	قیمت	عار	"	عالہ
حصہ پنجم	عباسیہ بغداد	قیمت	عار	"	عالہ
حصہ ششم	عباسیہ مصر	قیمت	عار	"	عالہ
حصہ ہفتم	خلافت عثمانیہ	قیمت	عہ	"	عمہ

نوٹ۔ جو صاحب یہ مکمل سلسلہ بہ یک وقت طلب فرمائیں گے ان کو پورا سٹ مجلد پیش
کیا جائے گا۔ اور قیمت غیر مجلد کی لی جائے گی۔ جلدیں نہایت اہتمام کے ساتھ اچھے مضبوط کپڑے
کی تیار کرائی گئی ہیں جس پر کتاب اور مکتبہ جامعہ کا نام بلاک سے چھپوایا گیا ہے۔ جلد پر ایک خوشنما
کاغذ کا کور ہے۔ اس کی طباعت بھی بلاکوں سے کی گئی ہے۔

حصص اول و دوم طلبار کی ضروریات کے خیال سے چھوٹے سائز پر بھی شائع کئے ہیں
اور ان کی قیمت ہر ایک کی ایک ایک روپیہ ہے۔

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت۔ ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

نمبر ۳	مارچ ۱۹۳۷ء	جلد ۲۷

فہرست مضامین

۱	ابن الوقت	جناب علی عباس حسینی صاحب لکھنو	۱۷۱
۲	اقبال کا فلسفۂ سیاست ...	جناب برکت علی صاحب فراق متعلم سندی جامعہ	۱۹۱
۳	امثال القرآن	جناب مولانا نجم الدین صاحب	۲۱۹
۴	پرینیڈ	پروفیسر محمد مجیب صاحب استاد جامعہ	۲۵۱

قیمت سالانہ صہ

فی پرچہ ۸

پروفیسر محمد مجیب بی۔ اے (آکسن) پرنٹر و پبلشر نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شایع کی ہیں، جو حضرات جس خاص مضمون یا شعبے سے دلچسپی رکھتے ہوں ازراہِ کرم مطلع فرمائیں مطبوعہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی۔ چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں

(۱) **مطبوعات جامعہ**۔ جامعہ کی شایع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۲) **ناشرین اُردو**۔ جامعہ کے علاوہ اُردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ۔

(۳) **مصنفین اُردو**۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مؤلفین اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

(۴) **بچوں کی کتابیں**۔ بچوں کے لئے اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

(۵) **عورتوں کی کتابیں**۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابوں کی فہرست۔

(۶) **مختصر فہرست کتب**۔ کتب اُردو کی تقریباً ایک ہزار مشہور کتابوں کی فہرست۔

(۷) **ادبی کتابیں**۔ تاریخ و تنقید ادب، مقالات و انشاء، ناول، افسانہ، نظم، ڈرامہ، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اُردو کتابوں کی مکمل فہرست۔

(۸) **مذہبی کتابیں**۔ ڈھائی سو منتخب مذہبی کتابوں کی فہرست۔

(۹) **تاریخی کتابیں**۔ پانچسو منتخب تاریخی کتابوں کی فہرست۔

(۱۰) اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاقیات، طبیعات، کیمیا، طب، حفظانِ صحت، زراعت اور صنعت و حرفت پر اُردو کی تمام کتابوں کی مکمل فہرست زیرِ طبع ہے، عنقریب شایع ہوگی۔

مکتبہ جامعہ دہلی

ابن الوقت

مراۃ العروس اور توبۃ النصوح کے بعد یہ نذیر احمد کی تیسری معرکۃ الآرا تصنیف ہے یہ کتاب اس غرض سے لکھی گئی ہے کہ وضع ظاہر، لباس اور تمدن میں انگریزوں کی تقلید نہ کرنا چاہئے، اس سے نقصانات عظیم پہنچتے ہیں۔ اور مسلمانوں کو اس سے سختی سے احتراز لازم ہے اس قصے کا ہیرو ابن الوقت ہے۔ یہ ایک بڑے خاندان کا رکن اور "نواب معشوق محل" کا داروغہ تھا غدر کے زمانے میں اس نے ایک انگریز نوبل صاحب کی جان بچائی۔ اس کے صلے میں اسے ایک پرگنہ انگلشیہ کی طرف سے عطا کیا گیا اور غدر کے بعد امن کی تفتیش کے لیے نوبل صاحب کی اسسٹنٹی بھی ملی۔ ابن الوقت کو جو انگریزوں سے [illegible] تو انگریزوں کی ریس کرنے [illegible] انگریزوں کی طرح [illegible] کپڑے وضع قطع معاشرت سب اس نے اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے اس [illegible] دیا اور اسے اپنا مقابل سمجھ کے جلنے لگے۔ اس سلسلے میں جو تدریجاً ابن الوقت کے خیالات نے مشرقیت ترک کر کے مغربیت کا رنگ اختیار کیا ہے اور نوبل صاحب کے چلے جانے کے بعد جو اسے مصیبتیں اور تکلیفیں پیش آئی ہیں وہ سب بیان کی گئی ہیں۔

اشخاص قصہ ابن الوقت، اس کی پھوپھی، نوبل صاحب، ابن الوقت کا ملازم، شارپ صاحب، اور حجۃ الاسلام ہیں۔

ابن الوقت مصنف نے اس کی سیرت کا ارتقا بہت ہی خوب دکھایا ہے اسے ابتدائے عمر سے تاریخ سے محبت تھی، بڑی محنت سے اس مضمون کو پڑھتا، دلی کے کھنڈروں میں گھومتا، اور جو لوگ تجارت و سیاحت کے بہانے دلی میں آجاتے ان سے مل مل کے ان کے شہروں اور ملکوں کے حالات و کیفیات وضع قطع معاشرت کی تفتیش کرتا تھا، وہ دنیا کی قوموں اور ذاتوں اور رسموں کی ٹوہ میں لگا رہتا تھا۔ مذہب کے بارے میں اس کی معلومات "کتاب الملل والنحل" سے کہیں زیادہ

تھیں جب کوئی نئی کتاب جماعت میں شروع ہوتی، اس کا پہلا سوال یہ تھا کہ اس کا مصنف کون تھا کہاں کا رہنے والا تھا۔ کس سے اس نے پڑھا۔ اس کے معاصر کون کون تھے۔ اس کے وقائع عمری میں کون کون سی بات قابل یادگار ہے "

خودداری اس کے مزاج میں اس درجہ تھی کہ لوگ اسے مغرور خیال کرتے تھے۔ دوسرے کا احسان اٹھانے میں اس کو سخت عار تھی، ابن الوقت اپنی رائے بہ دیر قائم کرتا تھا۔ مگر جب ایک بار قائم کر لیتا اس کے بدلنے کی گویا اسکو قسم تھی، اس کی یہ رائے کسی سے مخفی نہ تھی کہ کسی قوم میں سلطنت کا ہونا اس بات کی کافی دلیل ہے کہ اس قوم کے مراسم، عادات، خیالات، افعال، اقوال، حرکات، سکنات۔ یعنی کل حالات، فرداً فرداً نہیں تو مجتمعاً ضرور بہتر ہیں۔ وہ نہایت وثوق کے ساتھ کھلم کھلا کہا کرتا تھا کہ سلطنت ایک ضروری اور لازمی نتیجہ ہے قوم کی برتری کا "

غرض اسے انگریزوں کے سارے عادات، مراسم، معاشرت کے کل طریقے، ہندوستانی تہذیب و تمدن سے کہیں بہتر برتر معلوم ہوتے تھے، اب جو نوبل صاحب کو غدر میں اپنے مکان میں مہینوں لاکے چھپا کر رکھا تو اسے اُن سے گفتگو اور مبادلۂ خیالات کا اور بھی موقع مل گیا۔ غدر کے بعد انگریزی سلطنت کی طرف سے عزت جو ملی اور اس پر نوبل صاحب کا یہ اصرار کہ تم مسلمانوں کے ریفارمر بن کے انھیں انگریزی معاشرت اور انگریزی طور طریقے سکھاؤ۔ بس اب کیا تھا ابن الوقت بالکل صاحب بن بیٹھے، مکان کی جگہ بنگلے میں رہنا شروع کیا، ہندوستانی لباس کے ساتھ غذا بھی ترک کی، بالکل صاحبوں کی طرح کالے آدمیوں سے ملنا بھی چھوڑ دیا۔ ادھر کفر کے فتووں کا زور بندھا، ابن الوقت، دھن کا پکا تو تھا ہی۔ مزاج میں ضد بھی پیدا ہوگئی۔ منہ سے اپنے کو تو مسلمان مسلمان کہتا رہا مگر نماز روزہ سب کچھ چھوڑ بیٹھا، اور لگا اسلامی احکام کا تمسخر کرنے۔ اتنے میں نوبل صاحب ولایت تشریف لے گئے تو شارپ صاحب کلکٹر ضلع کے عملے والوں نے کان بھر دئے۔ وہ خود بھی کسی ہندوستانی کو انگریزی وضع میں دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ شکایتوں نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ صاحب بگڑ بیٹھے، ابن الوقت سے استعفے کے کاغذ لکھا لئے، اور اُن کو بے دست و پا کر دیا۔ اب ذرا ابن الوقت کو بھی ہوش آیا۔

مگر کرتے کیا خاموش بیٹھے سب کچھ دیکھ رہے تھے، کہ حجتہ الاسلام آ پہنچے، انھوں نے شارپ صاحب سے مل کر اُن کا دل صاف کرایا اور ابن الوقت سے مختلف اوقات میں بحثیں کر کے انھیں انگریزی معاشرت ترک کرنے اور ہندوستانی معاشرت اختیار کرنے پر مجبور کیا جب اس مزاج اور سیرت کا آدمی کسی انگریز کے ساتھ برسوں رہے گا اور اتنے بڑے غدر کو مٹھی بھر انگریزوں کو اس استقلال و جرأت سے فرو کرتے دیکھے گا تو اس کے دل میں ان کی برتری کے خیالات کیوں نہ راسخ ہو جائیں گے؟ ان تمام امور پر مزید سرکار انگلشیہ کی عطائیں ہوئیں۔ پھر دلی کے تمام افسروں کا اس سے ملنے کی خواہش کرنا اور خود نوبل صاحب سے فہمیدہ باثر اور ابن الوقت کے بہی خواہ انگریز کا اسے مسلمانوں کا ریفارمر اور مصلح بننے پر زور دینا۔ اگر اس کے قصد کو عزم بالجزم کے مرتبے پر پہنچا دیں تو کون سی جائے عجب ہے؟

مصنف نے ابن الوقت کے خیالات میں آہستہ آہستہ جس خوبی سے یہ تبدیلی دکھائی ہے۔ اور انگریزی معاشرت اختیار کرنے کے بعد جس طرح سے آہستہ آہستہ بے دینی کی طرف جاتے ہوئے لکھا ہے وہ اُن کے ماہر علم النفس ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔ ابن الوقت اس سے پہلے نماز کا پابند تھا، بلکہ مصنف نے اس بیان کو حقیقت کا رنگ دینے کے لئے یوں لکھا ہے کہ :۔

"ہم ان لوگوں سے سنی ہوئی کہتے ہیں جن کو ابن الوقت کے ساتھ رات دن کی نشست برخاست ہمسائگی اور قرابت قریبہ کے تعلقات تھے کہ اٹھارہ بیس برس کی عمر تک ابن الوقت کا یہ رنگ رہا کہ جیسے عابد متشرع مسلمان ہوتے ہیں وہ نوافل اور مستحبات کا اس قدر اہتمام رکھتا تھا کہ ایسا اہتمام فرض و واجب کا خدا ہم کو نصیب کرے۔ پانچوں وقت جامع مسجد کی اول جماعت کی تکبیر تحریمہ ناغہ نہیں ہونے پاتی تھی اور تہجد اور اشراق کے علاوہ تحیۃ المسجد، صلوۃ التسبیح منزل فیل، دلائل الخیرات، حزب البحر اور خدا جانے کتنے اوراد و وظائف جمعہ کے دن کبھی اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا ہے تو پہر دن چڑھے سے نماز جمعہ کی تیاری ہو رہی ہے۔ ایام بیض کے روزے داخل معمولات تھے پھر مدت تک ترک حیوانات اور چلہ کشی وغیرہ مذہبی ریاضتوں کی زحمت اٹھاتا رہا۔ انھیں دنوں لوگ خیال کرتے تھے کہ شاید وہ شاہ حقانی صاحب سے بیعت کرنے والا ہے۔ پھر ایک زمانے میں اس کو ہندو جوگیوں

اور سنیاسیوں کی طرف میلان رہا۔ پھر جو سنبھلا تو اہلِ حدیث میں جا شامل ہوا جن کو لوگ تعنّتاً وہابی کہتے ہیں۔ غدر سے چند روز پیشتر وہ پادریوں کا ایسا گرویدہ تھا کہ بس کچھ پوچھو نہیں، نوبل صاحب کی صحبت میں اس کے مذہبی خیالات نے دوسرا رنگ پکڑا یہاں تک انگریزوں میں جا ملا۔ اس سے تو انکار ہو ہی نہیں سکتا کہ اس کے مذہبی خیالات میں ایک طرح کا تزلزل ضرور تھا مگر تبدیلِ وضع تک ضروریاتِ دین میں اس سے کمی سرزد نہیں ہوئی، بلکہ تبدیلِ وضع کے بعد بھی لوگوں نے اس کو مسجد میں جماعت سے تو نہیں، بارہا اکیلے نماز پڑھتے دیکھا، یہاں تک کہ شروع شروع میں ان دنوں اس کو نماز روزے کی بہت پرچول تھی، کچہری کے اہلکار ہندو مسلمان سب یہی کہا کرتے تھے کہ کیسے ہی کام میں مصروف ہوں، اول سویر کی تو کبھی نہیں جاتی مگر نماز ابھی تک تو چھوڑی نہیں۔ ہم تو ہر روز پرائیویٹ روم میں ظہر کی بلکہ جب دن دیر تک کچہری رہتی ہے عصر کی بھی نماز پڑھتے دیکھتے ہیں۔ لیکن انگریزی وضع کے ساتھ نماز روزے کا نبھنا ذرا تھا مشکل، کوٹ تو خیر اتار کر الگ کھونٹی پر لٹکا دیا کیجئے۔ پتلون کی بڑی مصیبت تھی کہ کسی طرح بیٹھنے کا حکم نہیں۔ اتارنا اور پھر پہننا بھی وقت سے خالی نہ تھا۔ اس سے کہیں زیادہ وقت طہارت کی تھی، جو نماز کی شرطِ ضروری ہے۔ پھر اکثر اتفاق پیش آجاتا تھا کہ ابن الوقت اپنے پرائیویٹ روم میں نماز پڑھ رہا ہے اور کوئی صاحب اس کی کچہری میں آنکلے اور اجلاس خالی دیکھ کر واپس چلے گئے، یا نماز کا وقت ہے اور انگریزوں نے گھیرا ہے، ان کو چھوڑ کر جا نہیں سکتے۔ یا کوئی صاحب کچہری برخاست کر کے جانے لگا۔ تو ابن الوقت کے پاس سے ہو کر نکلا "کیوں مسٹر ابن الوقت ہوا خوری کو چلتے ہو، یار چلو ذرا انٹا کھیلیں" یہ اور اس طرح کے دوسرے اتفاقات ہر روز پیش آتے تھے، اور نماز کا التزام ممکن نہ تھا کہ باقی رہ سکے۔ ایک بڑی قباحت یہ تھی کہ اکثر انگریز مطلق پابندیٔ مذہب کو حمق اور سخافت سمجھتے تھے، غرض نماز پر تو انگریزی سوسائٹی کا اثر یہ دیکھا کہ پہلے وقت سے بے وقت ہوئی پھر نوافل پھر سنن جاکر نرے فرض رہے۔ وہ بھی پانچوں وقت پہلی رکعت میں سورۂ عصر تو دوسری میں سورۂ کوثر پھر جمع بین العصرین و المغربین، شروع ہوا پھر قضائے فائت، پھر بالکل چٹ۔ کھانے پینے میں احتیاط کے باقی رہنے کا کوئی محل ہی نہ تھا۔ ابن الوقت کو انگریزوں کے ہو جانے کی پڑی تھی، اور وہ بے شراب کے پرچ نہیں سکتے تھے، ابن الوقت نے

کون سی بات اٹھا رکھی تھی، کہ وہ شراب خواری کے الزام سے ڈرتا۔ اگرچہ ہم کو تحقیق معلوم ہے کہ وہ شراب سے بہ پاس مذہب اسلام محترز نہ تھا، بلکہ اس وجہ سے کہ ڈاکٹر نے اس کو ڈرایا تھا کہ اگر تم شراب پیو گے، تو کوڑھی ہو جاؤ گے۔ اس پر بھی بہت سے انگریزی کھانے ہیں کہ شراب ان کے مسالے میں داخل ہے بہترین دوائیں ہیں کہ بدون شراب کے نہیں بن سکتیں۔ بلکہ ان لوگوں کی طب میں شراب خود دوا ہے کثیر الاستعمال انگریزی تمدن اختیار کرنا اور شراب سے پرہیز رکھنا ایسا ہے کہ کوئی شخص کوئیلوں کی دوکان میں رہے اور منہ کالا نہ کرے۔ بے تکلف انگریزی سوسائٹی کے بڑے معزز ممبر کتے کیوں کر ممکن تھا کہ جاں نثار جو ابن الوقت کی تبدیل وضع میں نشاط کا کام دے رہا تھا۔ انگریزیت کی شہ بلا ضروری کو بھول جاتا۔ اس نے پہلے ہی سے ابن الوقت کے لیے کئی قسم کے کتے بہم پہنچا رکھے تھے ان میں بعض ایسے بھی تھے کہ ہر وقت ہمزاد کی طرح ابن الوقت کے ساتھ لگے رہتے تھے، غرض تبدیل وضع سے ایک ہی مہینے کے اندر اندر ظاہر آ سدہ کوئی چیز ابن الوقت اور اس کے متعلقات میں باقی نہ تھا۔"

اسی تبدیل معاشرت کا یہ نتیجہ ہوا کہ وہ مالی مشکلوں میں پھنس کے قرض دار ہو گیا، مگر اسے اس کی مطلقاً پروا نہ تھی، بقول مصنف "یہ تو اپنے ان خیالات میں مست تھا کہ صاحب کمشنر مجھ کو مائی ڈیر ابن الوقت اور اپنے تئیں "یور سنسیرلی" لکھتے ہیں۔ چیف کمشنر نے سالانہ رپورٹ میں میری کارگزاری کا شکریہ ادا کیا ہے جو ڈیشنل کمشنر نے ایک فیصلے میں میری نسبت لکھا ہے کہ اس کی طبیعت کو قانون سے فطری مناسبت ہے فنانشل کمشنر نے فلاں سرکلر کا مسودہ مجھ سے طلب کیا تھا، ان کی چٹھی موجود ہے۔ اب جو چھپ کر آیا تو میں دیکھتا ہوں کہ ایک لفظ کا ردو بدل نہیں کیا، قانون شہادت کی فلاں دفعہ میرے اصرار سے بڑھائی گئی۔ لیجس لیٹو کونسل کے لیگل ممبر نے مجھ کو چٹھی میں اطلاع دی مگر نہیں معلوم اپنی اسپیچ میں میرا تذکرہ کیوں نہیں کیا یا رپورٹر کی فروگذاشت ہے یا ممبر صاحب کو اس وقت خیال نہ رہا ہوگا، فلاں صاحب نے ولایت سے میرا فوٹوگراف منگوایا ہے اور لکھتے ہیں کہ میم صاحب متقاضی ہیں۔ اور وہ مس جوزفا جو ہمارے ڈرائنگ روم کی تصویروں کو بہت پسند کرتی تھی اور گھنٹوں ہمارے کتوں سے کھیلا کرتی تھی۔ ابھی ولایت کی ڈاک میں اس کی ماں کی چٹھی آئی ہے ایک

بڑے سوداگر کے ساتھ اس کی شادی ہونے والی ہے میجر صاحب نے آئیس کریم (ملائی کی برف) جانے کے لئے ہمارے آدمی کو بلا بھیجا ہے۔ یہاں سے برف ہی جموا کر نہ بھیج دی جائے۔ کرنیل صاحب کا اسباب نیلام ہوگا: تو دو گھوڑے ہم ضرور لیں گے، کیوں کہ ہم نے خوب خیال کر کے دیکھا تو ہمارے دو گھوڑے ہمیشہ صاحب لوگوں کی سواری میں رہتے ہیں اور چڑیوں اور پھولوں کے گملوں کو تو ہم اُن سے زبانی کہہ چکے ہیں۔ پرسوں کیا اتفاق ہوا کہ میں ٹھنڈی سڑک پر جا رہا تھا۔ کپتان صاحب اور ان کی میم صاحب کے ہاتھ میں ایک پھول تھا۔ انھوں نے میری طرف پھینک دیا۔ کپتان صاحب بولے "مسٹر ابن الوقت میرے پاس کوئی پھول نہیں کہ تم کو دیتا۔ میں نے کہا آپ کے پاس تو نہ سہی، خوب صورت گلدستہ ہے۔ میم صاحب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دونوں میاں بیوی ہنستے ہوئے برابر سے نکل گئے۔ فرنڈ آف انڈیا نے ایک آرٹکل میں مجھ کو مسلمانوں کا رفارمر لکھا ہے۔

"غرض جس طرح ایک آدمی کو کسی بات کی زٹ نہیں لگ جاتی، بس ابن الوقت کو انگریز بننے کی زٹ تھی، شروع شروع میں تو اس کو مسلمانوں کے حال پر بھی ایک طرح کی نظر تھی لیکن چند روز کے بعد اس کی ساری رفارم اسی میں منحصر ہوگئی تھی کہ انگریزی اوضاع و اطوار میں سے کوئی وضع اور کوئی طور چھوٹنے نہ پائے۔ کمبخت آپ بھی برباد ہو رہا تھا اور اس کی دیکھا دیکھی ایسی ہوا چلی کہ مسلمانوں کے نوجوان لڑکے خصوصاً جنھوں نے ذری سی انگریزی پڑھی تھی یا جو گھر سے کسی قدر آسودہ تھے۔ تباہی کے لچھن سیکھتے جاتے تھے۔" نتیجہ اس کا ظاہر بظاہر تو یہ ضرور تھا کہ وہ انگریزوں سے میل ملاپ میں سب سے آگے دکھائی دیتا تھا مگر اصل میں یہ سب کچھ نوبل صاحب کی سرپرستی کا نتیجہ تھا، جیسے ہی وہ انگلستان سدھارے کمانڈنگ افسر نے وبا کا بہانہ کر کے ہر نیٹو کو چھاونی چھوڑ دینے کا حکم دے دیا اس جبری حکم کی بدولت یہ بھی اپنے نئے خاندان سے نکالے گئے، یہ ابھی نقل مکان ہی میں گرفتار تھے کہ سرشتہ دار نے صاحب کلکٹر کے کان بھرے اور ان سے محکمۂ بغاوت کا کام بھی نکال لیا گیا۔ شامتِ اعمال شام کی ہوا خوری کے سلسلے میں گاڑی پر سوار نکلے، اور صاحب بہادر پیدل اس نے گاڑی روک کے صاحب سلامت کی، وہ اسے گستاخی سمجھے اور باقاعدہ جواب مانگ بھیجا۔ جب انھوں نے ایک

خط کے ذریعے ملنے کی درخواست کی تو صاحب نے بہ اکراہ پنسل سے جواباً لکھ بھیجا کہ وہ کسی نیٹو سے
اپنی کوٹھی پر انگریزی لباس میں نہیں ملنا چاہتا۔ غرض ہر طرف سے ابن الوقت کی پریشانی اور ذلت
کے سامان ہونے لگے، اس سلسلے میں مالی مشکلات بھی بڑھیں مگر لالہ نکوڑی ساکھا کر گیا اور اس نے سارے
قرضداروں کا حساب صاف کر کے ابن الوقت پر اپنے قرضے کے علاوہ اپنے احسان کا بھی بار لاد دیا،
یہ اسی مصیبت میں گرفتار پھرتے تھے کہ ان کی تقدیر نے حجتہ الاسلام کو اُن کی مدد کے لئے بھیج دیا،
وہ ایک پرانے مولوی ٹائپ کے ڈپٹی کلکٹر تھے۔ انھوں نے شارپ صاحب سے ملاقات کر کے اُن
کے معاملات صاف کئے اور اُن سے بحث ومباحثہ کر کے انھیں انگریزی وضع ترک کرنے اور ہندوستانی
ہی لباس و معاشرت کے اختیار کرنے پر مجبور کیا۔

ابن الوقت کی سیرت میں خودداری قابل تعریف ہے۔ وہ کسی افسر سے جھک کے ملنا پسند
نہیں کرتے ہیں۔ جہاں تک فرائض کا تعلق ہے وہ افسر کو افسر ماننے سے انکار نہیں کرتے مگر جہاں
سے سماجی اور نجی تعلقات شروع ہو جاتے ہیں، وہ صاحب کلکٹر کو اپنا ہم مرتبہ جنٹلمین سمجھتے ہیں انھوں
نے جتنی دعوتیں دوسروں کے یہاں کھائیں اس سے زیادہ خود کھلائیں۔ انھوں نے انگریزوں سے ملنا
جلنا یا ان کی وضع و اطوار کسی خوشامد کی وجہ سے اختیار نہیں کئے تھے بلکہ محض اس لئے کہ ان کے
اوضاع کو ہندوستانی اطوار سے بہتر جانتے تھے، اس لئے انھوں نے انگریزی معاشرت
اختیار کرنے کے بعد بھی نوبل صاحب کے علاوہ کسی سے یارانہ پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی وہ بڑے
سخت اصولی آدمی تھے، اور ہمیں افسوس ہوتا ہے کہ اُن کا سا آدمی نوبل صاحب کے جاتے ہی اس
طرح کی آفتوں میں گرفتار ہو گیا، حق یہ ہے کہ گو مصنف نے اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے
کہ یہ ساری خرابیاں انگریزی وضع کی پیدا کی ہوئی ہیں مگر ہمیں تو ان سب کی اولین وجہ ہندوستانی
فطرت کا حسد و رشک محسوس ہوتی ہے۔

ہم ہندوستانیوں میں کچھ اس طرح کی عادت ہے کہ ہم اپنے معاملات سے زیادہ دوسروں
کے معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں اور اگر ہم کسی کو اوضاع و اطوار میں اپنے سے مخالف پاتے ہیں،

تو ہمیں بلاوجہ اس سے دشمنی ہو جاتی ہے۔ ہم موقع بے موقع اس کا تمسخر کرتے ہیں اور اسے ذلیل و سبک کرنے کے در پے رہتے ہیں۔

پھر ہمیں یہ بھی نہیں بھاتا کہ افسروں کی نظر میں ہمارا کوئی بھائی باعزت بن کر رہے۔ سررشتہ دار کو ابن الوقت نے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا، اور نہ ان لوگوں کو جنھوں نے مختلف طریقوں سے صاحب کلکٹر کے کان بھرے۔ مگر شکایت کرنے والوں کو اس سے کیا مطلب، وہ تو یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کا ایک بھائی ترقی کر رہا ہے۔ بہت عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے نہ اُن کی تقلید کرتا ہے اور نہ صاحبوں کی خوشامد، بس اتنا کافی تھا، بری طبیعتوں نے نقصان پہنچانے میں اپنی بڑائی سمجھی پر ابن الوقت کو خودداری نے اس کی بھی اجازت نہ دی کہ ان لوگوں کے پاس دوڑا دوڑا جائے اور ان کی خوشامدیں کرے۔ کہ وہ انھیں رام کرتا اور اُن کے ذریعے صاحب کلکٹر کو، یہ سب کچھ ہو سکتا تھا مگر اس کی غیرت و حمیت اسے جھکنے نہیں دیتی تھی، اگر واقعی وہ ابن الوقت ہوتا تو اسے ان تمام ہتھکنڈوں میں برق ہونا چاہیے تھا۔ انگریزی وضع اس نے محض انگریزوں کی ریس میں اختیار نہیں کی تھی بلکہ واقعی طور پر اسے ہندوستانی وضع سے بہتر سمجھ کر۔ اس کی یہ رائے غلط ہو یا صحیح اس سے ہمیں بحث نہیں، ہمیں جو کچھ بھی دیکھنا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے یہ سب کچھ محض صاحبیت کے شوق میں نہیں کیا تھا بلکہ سوچ سمجھ کے وہ اپنے نزدیک ان کی حمایت میں معقول دلائل رکھتا تھا، مگر محض اتنے سے گناہ پر اسے خدا جانے کن کن طرح کے مصائب میں گرفتار ہونا پڑا۔ اس افراط و مبالغے کی پردہ پوشی شارب صاحب کی عجیب شخصیت نے کر دی ہے ہمیں خواہ مخواہ ایسے ہندوستانیوں سے چڑ تھی، جو نیٹو ہونے پر انگریزی وضع اختیار کرتے تھے پھر کان کے بھی ایسے کچے تھے کہ اہل محلہ کی لگائی بجھائی پر یقین کر لیتے تھے، ابن الوقت کے کردار کا استقلال بھی قابل تعریف ہے، مصنف خود بھی اس کے قائل ہیں: "ابن الوقت پرلے درجے کا مستقل مزاج آدمی تھا، مشکلات کو دیکھ کر اور دلیر ہوتا، وہ رنجیدہ ہوتا، افسوس کرتا، اس کو غصہ بھی آتا، مگر کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں ہوا کہ جو وضع اختیار کی ہے اس کو چھوڑ دوں

یا جس رفارم کا بیڑا اٹھا چکا ہوں اس کے رواج دینے میں کوتاہی کروں "

ابن الوقت کے کردار میں ایک اور خصوصیت اس کا تدبر ہے ، وہ معمولی قابلیت کا ہندوستانی نہ تھا۔ بلکہ اس نے پہلے ہی ڈنر کے بعد جو کئی گھنٹے تقریر کی ہے ، اس میں حاکم و محکوم کے سارے تعلقات سے بحث کر ڈالی ہے اور اسی سلسلے میں برٹش گورنمنٹ اور اس کے افسروں کو ان اصول سے آگاہ کیا ہے جن پر کار بند ہونے کی صورت ہی میں انھیں ہندوستان کی حکومت پر کامیابی حاصل ہو سکتی ہے اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے ریاستوں کے مسئلے پر بھی جس نے آج اتنی اہمیت حاصل کر لی ہے ۔ بہت کافی روشنی ڈالی ہے ۔ اس تقریر کا وہ حصہ حد درجہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے ۔ ملاحظہ ہو

" اگر کوئی مجھ سے پوچھے ، تو میں اس بات کو بڑے شد و مد سے پیش کروں کہ اگر گورنمنٹ اپنے تعلقات اندرونی ایشیائی گورنمنٹوں کے ساتھ درست کرے ، یہ ہندوستانی ریاستیں جن کا مجموعہ ، کیا رقبہ ، کیا مردم شماری ، کیا محاصل کسی اعتبار سے انگریزی سلطنت سے کم نہیں باستثنائے معدودے چند ، اس قدر بیٹ بھر کر خراب ہو رہی ہیں کہ ان کی حالت نہ صرف انہیں کے حق میں خطرناک ہے بلکہ انگریزی طرز نظام ، انگریزی رعایا ، سبھی کے حق میں ، اور جب تک ان ریاستوں کی پوری پوری اصلاح نہ ہو ۔ انگریزی گورنمنٹ کو اپنے انتظام کی طرف سے مطمئن نہیں ہونا چاہیے ۔ اُن میں سے ایک ایک ریاست ، اگر اس کے انتظام میں فساد ہے انگریزی گورنمنٹ کے حق میں بغلی گھونسہ ہے ، فساد انتظام سے میری مراد یہی نہیں کہ رئیس اپنے تئیں سرکار انگریزی کا مدمقابل سمجھتا ہو ، یا نافرمانی یا عدول حکمی سے گورنمنٹ کا استخفاف کرتا ہو ۔ میں اس بات کو پکار کے کہتا ہوں کہ ہندوستانی رئیس ہندو ہو یا مسلمان آرام طلب ہوگا ، کاہل ہوگا ، احمق ہوگا ، جاہل ہوگا ۔ عیاش ہوگا ۔ غافل ، مسرف ہوگا ، خرچ آمدنی سے فاضل ہوگا ۔ غرض اس میں سب طرح کے جنون ہوں گے ، مگر نہیں ہوگا تو ایک جنون بغاوت سرکار نے اپنی فوجی طاقت کو ہندوستان میں خصوصاً بعد غدر ایسے زور سے ثابت کر دیا ہے جیسے آگ نے جلانے کی خاصیت کو بس ہندوستانی رئیسوں کی طرف ایسا خیال بالکل لغو اور محض بے اصل

ہے۔ لیکن جس روز سے گورنمنٹ انگریزی کو ہندوستانی رئیس اپنی چند در چند نالائقیوں اور گوناگوں بدکرداریوں کی وجہ سے ایسی خرابیاں کر رہے ہیں کہ اول تو خود انھیں کی رعایائے نا مہذب و ناشائستہ سے گورنمنٹ کو ہمیشہ خائف رہنا چاہیے۔ دوسرے ان ریاستوں کے بُرے نمونے دیکھ کر رعایائے انگریزی کی طبیعتیں بگڑی چلی جاتی ہیں۔ جسد سلطنت میں یہ ریاستیں گویا برص کے چھٹے ہیں۔ کیوں کر اطمینان ہو سکتا ہے کہ ان چھٹوں کا فساد دوسرے اعضائے صحیح تک متعدی نہیں ہوگا اگر میری تقریر سے ایسا مستنبط ہوا ہو کہ میں ان ریاستوں کے ضبط کرنے کی رائے رکھتا ہوں، تو مجھ سے بڑھ کر قوم و ملک کا کوئی دشمن نہیں، لیکن یہ میری رائے ضرور ہے کہ ان ریاستوں کا نامنتظم حالتوں میں رہنے دینا ویسا ہی ظلم ہے جیسا ان کا ضبط کرنا، جب کہ انگریزی گورنمنٹ اپنے تئیں ان شکمی گورنمنٹوں کا مربی و حامی اور محافظ سمجھتی ہے اور واقع میں وہ ہے بھی تو ان کی اصلاح اُن کا فرض لازمی ہے۔ لیکن انگریزی گورنمنٹ نے اس فرض کے ادا کرنے میں کما حقہٗ اہتمام نہیں کیا، بے شبہ سرکار کی طرف سے ایجنٹ یا ریزیڈنٹ کے نام سے ایک عہدہ دار ایک ہندوستانی ریاست پر مسلط ہے۔ لیکن اس کو ریاست کے اندرونی انتظام میں مطلقاً کوئی مداخلت نہیں۔ وہ اتنی ہی بات کی نگرانی رکھتا ہے کہ ریاست میں سرکار انگریزی کا رعب داب اچھی طرح قائم رہے، اور کوئی عام بدنظمی نہ ہو اگر ایک باپ اولاد کے ساتھ وہ کرے جو انگریزی گورنمنٹ نے ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ اب تک کیا ہے۔ تو ہم ایسے باپ کی مدح نہیں کر سکتے۔ حقیقتاً اس نے کیا اچھا کیا، مگر اس کو اس سے بہت زیادہ کرنا چاہیے تھا،

مہذب دنیا کی نظر میں انگریزی گورنمنٹ کبھی من حیث المجموع منتظم گورنمنٹ نہیں سمجھی جائے گی، تاوقتیکہ اس کی تمام شکمی گورنمنٹیں اسی طرح منتظم نہ ہوں جیسے اس کا اپنا علاقہ، انگریزی گورنمنٹ کبھی بیرونی دشمنوں کے خدشے سے خالی نہیں رہتی اور اس کو خالی رہنا چاہیے بھی نہیں بلکہ تعجب کی بات ہے کہ میں اس کو شکمی ہندوستانی ریاستوں کی طرف سے کبھی خدشہ کرتے ہوئے نہیں پاتا حالانکہ اگر یہ ریاستیں نامنتظم رہیں جیسی کہ اب ہیں تو یہ اندرونی دشمن بیرونی دشمن سے بہت

زیادہ خطرناک ہیں ؛۔

اتنا ہی نہیں بلکہ علامہ نذیر احمد کے دماغ نے ابن الوقت کو وہ بات سمجھا دی ہے جو آج سیاسی نظام میں فیڈریشن کے نام سے موجود دکھائی دیتی ہے۔

اگر شروع سے گورنمنٹ نے اس کا خیال کیا ہوتا تو آج کو یہی ہندوستانی رئیس جن کو تنگ ہندوستان کہتے ہیں، یہاں کی کونسل تو خیر ولایت کے پارلیمنٹ کے قابل ہوتے، لیکن گورنمنٹ نے ان ہندوستانی ریاستوں کے بارے میں بڑی غلطی کی۔ ان کو شتر بے مہار کی طرح مطلق العنان رہنے دیا کہ بیٹ بھر بگڑ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کہ ان ریاستوں کی خرابی کو گورنمنٹ انگریزی اپنے استحکام کا موجب سمجھتی ہے اب فرض کیجئے کہ ہم ان ریاستوں کو کونسل میں بٹھانے لگیں، تو شروع شروع میں ان کی کارروائی ضرور ایسی ہوگی جیسی تھوڑی دیر ہوئی میں نے بیان کی۔ لیکن ہم جتنے صبر کریں، تو آخر ان رئیسوں کو کبھی تو غیرت آئے گی، کبھی تو شرمائیں گے۔ میں تو کہتا ہوں کہاں تک کالج اور کہاں کے مدرسے، رئیسوں کے حق میں تو یہی کونسل کافی ہے علی سبیل البدیہہ سب کو کونسلوں میں بٹھایا جائے اور پھر ایک ایسا حکم بندھے کہ مثلاً ہر پانچویں برس کونسل میں حاضر ہونے پر مجبور کئے جائیں۔ پھر دوسری ہی نوبت میں دیکھئے کہ ان کی حالت میں کس قدر ترقی ہوتی ہے غرض گورنمنٹ کا یہ رنگ کہ وہ ملک کا انتظام رعایا کی رائے پر کرنا چاہتی ہے۔ ہندوستان کی گورنمنٹ میں تو ہے نہیں۔ ہندوستانیوں کی قسمت کی جو " اسپاٹک " (شخصی خود مختار) گورنمنٹ سدا سے تھی، اب بھی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے اپنی گورنمنٹ تھی اب اس پر پراجنبی مسلط ہیں۔

ابن الوقت کے تدبر فہم وفراست، قابلیت و لیاقت ان تمام امور کے لئے یہی ایک تقریر کافی ہے اگر اس کی بابت کسی اور ثبوت کی ضرورت ہو تو وہ بحث جو اس سے اور حجۃ الاسلام سے تقدیر کے مسئلہ پر ہوئی ہے بہت زیادہ کافی ہی، اور حق تو یہی ہے کہ گو مصنف نے اپنے مسلک کے مطابق حجۃ الاسلام کو اس مباحثے میں جتا دیا ہے مگر حقیقت میں جیتا ابن الوقت ہی ہے۔ بہرنوع ابن الوقت کی سیرت میں اس پوری بحث کے بعد کیا انقلاب ہوا اس کا ہمیں قصے سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ظاہر

مولانا کا ارادہ تھا کہ وہ ناول کے دوسرے حصے میں ان تمام امور کو دکھائیں گے۔ مگر شاید انھیں اس ارادے کو پورا کرنے کی فرصت نہ مل سکی اور اس طرح یہ قصہ ناتمام رہ گیا۔

حجۃ الاسلام اس قصے کے دوسرے نمایاں کردار حجۃ الاسلام ہیں یہ بالکل نذیر احمد کے دل کے آدمی ہیں۔ باوجود ڈپٹی کلکٹر ہونے کے اس طرح کے کٹر مسلمان ہیں کہ ابن الوقت کی کوٹھی میں گاڑی سے اترے ہیں تو خدمت گار وضو کا آفتابہ لئے ہوئے ساتھ ساتھ تھا، گویا یہ پہلے سے یقین تھا کہ ایک بھائی اور مسلمان کے ہاں نہ تو وضو کا سامان ہو سکتا ہے اور نہ نماز کا کوئی انتظام۔ یا تو ظن خیر کا پتہ نہیں یا پھر شک و احتیاط کی انتہا ہے پھر شروع سے آخر تک جتنی باتیں کی ہیں، وہ سب قل اعوذ ہی کی۔ بات بات پر حدیثیں، آیتیں، عربی کے اقوال، سب کچھ موجود ہیں جو گویا واقعی حجۃ الاسلام بن کے آئے ہیں۔ اصول حفظان صحت کے منکر ہیں، طب اور ڈاکٹری کو بیکار جانتے ہیں اور تدبیر کو بالکل ہی عبث اور فضول، کوٹھی میں کتوں کی موجودگی سے نالاں ہیں، کمروں میں تصویروں کے آویزاں ہونے سے خفا اور اس بات پر مصر ہیں کہ ہر شخص کے لئے انھیں کی طرح صرف ایک دالان اور ایک حجرہ زندگی بسر کرنے کے لئے کافی ہونا چاہیئے، بالآخر خفا ہو کے چلے آئے۔ اور گو ابن الوقت نے قیام کے لئے بہت اصرار کیا۔ مگر نہ اس کے یہاں ٹھیرے اور نہ انھوں نے اس کے یہاں کچھ کھایا پیا۔ یہ اسی کے ساتھ ان کی صفائی میں یہ کہنا ضروری ہے کہ

وہ ان مولویوں میں نہ تھے، جنھوں نے ابن الوقت کو کفر کے فتوے دے رکھے تھے وہ اس پر یقین رکھتے تھے، کہ ابن الوقت مسلمان ہے۔ چنانچہ ساس سے اپنی روداد بیان کرتے وقت انھوں نے بڑے شد و مد سے کہا "بھائی ابن الوقت اپنے تئیں چوری چھپے بھی نہیں کھلے خزانے پکار پکار کر مسلمان کہتے ہیں اور مسلمان ہیں بھی" اور اسی لئے وہ محض بھائی کا معاملہ ٹھیک کرنے کے لئے اور اس سے اور شارپ صاحب سے صفائی کرانے کے لئے مخصوص طور پر بھیجے گئے تھے

انھوں نے جس طرح اس معاملے کو انجام دیا ہے اور جس خوب صورتی سے ابن الوقت کی صفائی شارپ صاحب کے سامنے پیش کی ہے وہ ان کی ذہانت اور قابلیت پر دال ہے۔ یہ

انھیں کی سلجھانے والی طبیعت اور انداز بیان کا اثر تھا کہ شارپ صاحب کا سا بگڑے دل انگریز ابن الوقت کی طرف سے صاف ہو گیا۔ اور انھیں ان کے اختیارات اور کام واپس دے دیئے ان کی یہ گفتگو اس بات پر بھی دال ہے کہ وہ برابر پر خود غور و فکر کرنے کے عادی تھے، اور انھوں نے ابن الوقت کا بہت گہرا مطالعہ کیا۔ مگر اُن کی سیرت میں بھی خودداری اور غیرت بڑی حد تک تھی، انھوں نے پوری گفتگو میں شارپ صاحب کی بے جا خوشامد نہیں کی بلکہ بہت ہی آزادی سے دلائل اور براہین پیش کرتے رہے اس خودداری کا ثبوت اُن کا وہ بیان بھی ہے جو انھوں نے ابن الوقت سے اس سے پہلے ملاقات میں کلکٹر ضلع سے ملنے کے سلسلے میں دیا ہے، گو ٹکڑا طویل ہے مگر اس وقت کے حاکم اعلیٰ اور ماتحت کے تعلقات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ اس لئے نقل کیا جاتا ہے۔

انگریزوں سے ملاقات کا گذشتہ طریقہ عجب نہیں کہ جو اس میں ہلکی سی چاشنی ملی ہے، وہ مرغوب خاطر ثابت ہو:-

جاڑا ہو، پانی برستا ہو، کڑاکے کی دھوپ ہو۔ لوئیں چلتی ہوں۔ ہندوستانی ڈپٹی نہیں، ڈپٹی کا باوا کیوں نہ ہو، اور چاہے وہ اپنے مکان سے چار گھوڑوں کی بگی پر سوار ہو کر کیوں نہ آیا ہو کلکٹر جنٹ اسسٹنٹ کی بڑی بارگاہیں ہیں، اگر یورپین ڈپٹی کلکٹر سے ملنے گیا ہے (اور نہ ملے تو رہے کہاں) تو احاطے کے باہر اترنا ضرور اور احاطے بھی شیطان کی آنت کہ ہم جیسے پرانی فیشن کے لوگ کوٹھی تک پہنچتے پہنچتے ہانپنے لگتے ہیں اور اگر صاحب کہیں اس حالت میں دیکھ پائیں، ڈسمجھو کر ملاقات کو گئے، نوکری نظر کر آئے، اسی دن رپورٹ ہوتی دھری ہے کہ یہ شخص دس قدم پیدل نہیں چل سکتا، پس ڈپٹی ضرور ہے۔ کم از کم ڈاک کے ہرکارے کی طرح ایک چوکی تک پوئی نہیں تو ڈکی ہی بغلی کا بستہ لے کر بھاگ سکے۔ پس اس ڈر کے مارے کسی درخت کی آڑ میں یا کوئی ایسا ہی گانٹھ کا پورا ہے اور اس نے شاگرد پیشوں کو پہلے ہی سے حکو تھیا کر ادمی ہیں تو باورچی خانہ یا اصطبل میں پاؤ گھنٹے آدھ گھنٹے کھڑے کھڑے دم لیا، اور جب سانس اچھی طرح پیٹ میں سمانے لگا تو رومال سے منہ ہاتھ پونچھا۔ ہاتھ سے ڈاڑھی مونچھ کو سنوار آہستہ سے عمامہ کو

کوذرا اور جالیا، چغے کے دامن سمیٹے اور بڑے مودب مقطع بن کر ہاتھ باندھے نیچی نظریں کئے ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں کوٹھی کی طرف کو بڑھے۔ خدمت گار اور اردلی کے چپراسیوں نے تو احاطے کے باہر سے تاڑ لیا تھا، کہ کوٹھی کے پاس آتے، دیکھ قصداً ادھر ادھر کو ٹل گئے۔ تھوڑی دیر نیچے زینے کے ٹھٹکے کہ کوئی آدمی نظر آئے، اوپر چڑھنے کا قصد کریں، چلنے کی، باتوں کی، اور چیزوں کے رکھنے اٹھانے کی آوازیں ہیں، کہ چلی آتی ہیں، مگر کوئی آدمی نظر نہیں آتا۔ آخر ناچار ستون کی آڑ میں جوتیاں اتار ہمت کر کے بے بلائے اوپر پہنچے، کرسی نہیں، مونڈھا نہیں، فرش نہیں، کھڑے سوچ رہے ہیں کہ کیا کریں، لوٹ چلیں، پھر خیال آیا ایسا نہ ہو لوٹنے کو صاحب اندر آئینوں میں سے دیکھ لیں' شرمندگی کے ٹالنے کو وہیں تھوڑی سی جگہ میں ٹہلنا شروع کیا اتنے میں باورچی خانے کی طرف سو ایک آدمی آتا ہوا نظر آیا۔ جی خوش ہوا کہ اس سے صاحب کے اردلی لوگوں کا حال معلوم ہوگا وہ لپک کے ایک دوسرے دروازے سے اندر گھس گیا، اور ادھر کو رخ بھی نہ کیا۔ غرض کوئی آدھے گھنٹے (اور اس انتظار میں تو ایسا معلوم ہوا دو گھنٹے) اسی طرح کھڑے سوکھا کئے۔ بارے خدا خدا کر کے ایک چپراسی اندر سے چٹھی لئے ہوئے نمودار ہوا۔ کیا کریں اپنی غرض سے گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے، حیا اور غیرت بالائے طاق آپ منہ پھوڑ کر اس کو متوجہ کیا کیوں "جمعدار" کچھ ملاقات کا بھی ڈھنگ نظر آتا ہے بس اس کو ڈپٹی کلکٹری کا ادب سمجھو یا شکایت کا ڈر، مگر میں جانتا ہوں کہ ڈر اور ادب تو خاک بھی نہیں صرف اتنی بات کا لحاظ کہ شہر کی فوجداری سپرد ہے، خدا جانے کب موقع آ پڑے، چارو ناچار اچکتا ہوا سلام کر کے، جیسے کوئی مکھی اڑاتا ہے اس کو کہنا پڑا کہ "آج ولایت کی ڈاک کا دن ہے، ملاقات تو شاید ہی ہو۔ لیکن آپ بیٹھیے، ابھی تو صاحب غسل خانے میں ہیں" یہ کہہ کر وہ اندر کو جانے لگا، تو آخر نہ رہا گیا، اور زبان سے نکلا کہ کہاں بیٹھوں؟ اپنے سر پر، تب اس نے ایک ٹوٹی ہوئی کرسی، تکیہ اور ایک بانو نما دو گویا بید کی تپائی لاکر ڈال دی، اس کے بعد جب جب کوئی چپراسی یا خدمت گار باہر آتا یہی معلوم ہوتا کہ صاحب ابھی غسل خانے سے نہیں نکلے (الہی کیا غسل میت ہے) اب کپڑے بدل رہے ہیں، اب میم صاحب کے کمرے میں ہیں، اب چٹھی لکھ رہے ہیں یہاں تک کہ آخر کو معلوم

ہوا کہ کھانے کی میز پر ہیں۔ یہ سن کر جی ہی تو بیٹھ گیا۔ کہ بس اب کیا خاک ملاقات ہوگی، ارادہ ہوا کہ گھر کی راہ لیں پھر خیال ہوا کہ کون وقتوں سے انتظار کر رہے ہیں، آنا تو پڑے ہی گا۔ دوسرے دن کا کیا بھروسا، اتنی محنت کیوں ضائع کی۔ گھنٹہ، ڈیڑھ گھنٹہ اور صبر کرو بڑی دیر بعد چپراسی یہ حکم لے کر نکلا کہ سررشتہ دار کو رپورٹ خوانی کے لئے بلایا ہے۔ اب رہی سہی امید اور بھی گئی گذری ہوئی تب تو اپنا سا منہ لے کر چپراسی سے یہ کہتے ہوئے اٹھے کہ "خیر میں تو اب جاتا ہوں۔ صاحب سے میرے آنے کی اطلاع کر دینا"۔ تب خدا جانے چپراسی کے دل میں کیا آئی کہ کہنے لگا "میں دو بار آپ کی اطلاع کر چکا ہوں، کچھ بولے نہیں۔ اب پھر کہے دیتا ہوں خفا ہوں گے تو آپ میرے آدھ سیر آٹے کی فکر کرنا غرض بلائے گئے، صاحب کو دیکھا کہ پائپ منہ میں لئے ٹہل رہے ہیں۔ بس معلوم ہو گیا کہ مطلق ملاقات نہیں ہو سکتی، سر جھکائے کوئی کاغذ یا کتاب دیکھ رہے ہیں، اب کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آئی کہ کیوں کر اُن کو خبر کروں کہ میں آیا ہوا کھڑا ہوں اور کیا معلوم ہے شاید جان بوجھ کر کھڑا رکھا ہو، بلکہ مجھ کو تو اس بات کا بھی شبہ ہے کہ میرے آنے کے بہت دیر پہلے سے اُن کو خبر تھی۔ چپراسی نے شاید نہ بھی کہا ہو، مگر چاروں طرف آئینے کے کواڑ میں سامنے کے دروازے سے آیا درختوں کے نیچے ٹہلتا رہا۔ پھر بڑی دیر تک برآمدے میں بیٹھا رہا۔ کیا اتنے عرصے میں ایک بار بھی ان کی نظر نہ پڑی ہوگی، ضرور پڑی ہوگی، خیر آخر آپ ہی سر اُٹھایا۔ "اور ڈپٹی صاحب" حاکم بالا دست ہو کر جو اتنی آؤ بھگت کرے تو اس کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ صاحب نے بندہ نوازی میں کچھ کمی نہ کی۔ آنکھیں چار ہوتے ہی اپنے مقابل میز کے دوسری طرف کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اپنے گھر یا آپس میں ایک دوسرے کے گھر کرسیوں پر بیٹھنا کہ ان نہیں جانتا لیکن میں تو اپنے سے زیادہ زیادہ تنخواہ کے ہندوستانی صدر الصدوروں اور ڈپٹیوں کا انگریزوں کے روبرو کرسی پر بیٹھنا دیکھے ہوئے تھا، کہنے کو تو کرسی پر بیٹھا۔ مگر حقیقت میں بید پر چوتڑ ٹکے ہوں، تو جیسی چاہو قسم لو، تم خدا کے بندے ہو یقین مانا بس ڈنڈے پر الگ تھلگ جیسے اڈے پر گلام! کرسی پر بیٹھنا ہی تھا کہ کمبخت چپراسی نے پیچھے سے ہاتھ جوڑ کر کہا "خداوند، سررشتہ دار حاضر ہیں" صاحب ہیں کہ میری طرف دیکھتے جلتے ہیں، اد

چپراسی سے فرمارہے ہیں "آجا آنے بولو، یعنی اچھا سررشتہ دار سے کہو چلے آئیں۔ سبحان اللہ،
سات برس اسسٹنٹ رہے نو برس کے قریب جنٹ اور اس سولہ برس میں صرف ایک بار ڈیڑھ
برس کے لئے ولایت گئے تھے۔ بارہ برس دلی میں رہے اور بھاڑ جھونکا، چودہ برس میں حضرت
نے اردو میں کیا حاصل کیا ہے" اچا آنے بولو" اب میں منتظر ہوں کہ صاحب کچھ پوچھیں تو جواب
دوں، اور سررشتہ دار مردود آگے آگے آپ، پیچھے لبستہ قلم دان لئے ہوئے چپراسی آہی گھسا،
سررشتہ دار کے روبرو مجھ سے پوچھتے ہیں " دل صاحب گرمی لوٹ "
میں گردن جھکا کر۔ ہاں خداوند گرمی کے تو دن ہی ہیں۔ میرے علاقے میں تو پولیس کی
رپورٹ سے ایسا معلوم ہوا، لو سے بھی کئی آدمی مرے" صاحب کو تو یہ جواب دے رہا ہوں اور
دل میں یہ کہہ رہا ہوں گرمی کا حال تو معلوم تھا ارے ظالم تجھ کو یہ بھی خدا کا ترس آیا کہ ایک بندۂ خدا
کو جس کو کچہری میں سرکار سے ایک ٹٹی ملتی ہے۔ ناظر اپنی بدذاتی سے تین برس کے پیانے خس کو بنوا دیتا
ہے تو وہ جانے اور اس کا ایمان، اور جس کو گھر پر بھی ٹٹی لگانے کا مقدور ہے اور جو واقع میں گرمی
بھر اپنے گھر ٹٹی میں رہتا ہے کتنی دیر سے برآمدے پر پڑا بھن رہا ہے، لاؤ سلام لے کر اس کو آزاد کر دوں
میں تو سمجھا تھا کہ آدمیوں کا لو سے مرنا سن کر چونک پڑے گا، اور ضرور پوچھے گا کہ کس تھانے سے رپورٹ
آئی، کتنے آدمی کب مرے، لو کا ہندوستانی کیا علاج کرتے ہیں، اور کوئی لاش ڈاکٹر صاحب کے
ملاحظہ کو بھی آئی یا نہیں، غرض آدمی کا دل بولنے اور بات کرنے کو چاہے تو بہتیرے حیلے ہیں۔ پر صاحب
تو کچھ پی سی گئے۔ نہیں معلوم دھیان سے نہیں سنا یا سمجھے نہیں، یا کالے آدمیوں کے مرنے کی پروا
نہیں کی، اب سررشتہ دار ہے کہ لبستہ کھول کا غذ پھیلا رہا ہے اور میری اور صاحب کی یہ تپاک کی
ملاقات ہو رہی ہے کہ دونوں چپ، جب سررشتہ دار کاغذ پھیلانے لگا۔ صاحب کا منہ دیکھئے تو صاحب
فرماتے ہیں " آپ کچھ کچھ .... " یعنی آپ کو کچھ کہنا ہے۔ یہ سنتے ہی میں تو یہ کہہ کر اٹھ کھڑا
ہوا کہ " نہیں میں تو صرف سلام کے لئے حاضر ہوا تھا، بہت دن ہو گئے تھے، جی ملنے کو چاہتا تھا پھر حاضر
ہوں گا میری اس آخیر بات میں اور باتیں ہی ایسی کون سی ہوئی تھیں کہ اس کو آخیر کہوں، بلکہ دوسری

بات میں جی ملنے کو چاہتا تھا، بالکل جھوٹ تھا۔ کس مسخرے کا جی ملنے کو چاہتا تھا۔ اور کس مسخرے کا جی اب ملنے کو چاہتا ہے "

انگریزی سیرتیں انگریزی سیرتیں ایک دوسرے کے بالکل متضاد پیش کی گئی ہیں، نوبل صاحب نیک سیرت، نیک طبیعت، والاحسب، احسان ماننے والے شریف وزذیل میں فرق کرنے والے، ابن الوقت کے سرپرست، انھوں نے جان بچانے کے عوض ابن الوقت کو اپنا اسسٹنٹ بنوایا، گاؤں دلوایا، عزت دلوائی اور انگریزوں سے ملوایا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ہر موقع پر اُن کے لئے سینہ سپر رہے اور بڑے اصرار سے ابن الوقت کو اس امر پر مستعد کیا کہ وہ انگریزی معاشرت اور تمدن اختیار کرے اور مسلمانوں کا ریفارمر بنے، اُن کے نزدیک ہندوستان کی آئندہ ترقی کے لئے یہ ضروری تھا کہ "جہاں تک ممکن ہو ہندوستانیوں کو انگریز بنایا جائے، خوراک میں، پوشاک میں، زبان میں، عادات میں، طرز تمدن میں، خیالات میں، ہر ایک چیز میں"؛ اور جب ابن الوقت مددگار رہنے کا وعدہ چاہتا ہے تو شدومد سے کہتے ہیں "نہ صرف میں بلکہ تمام کمیونٹی اور سرکار........"
ہمیں نوبل صاحب کے خیالات سے اتفاق ہو یا اختلاف، مگر ہم یہ ضرور کہیں گے کہ وہ واقعی نوبل اور شریف تھے۔

برخلاف اس کے شارپ صاحب کی سیرت ہے۔ وہ نہ تو نیک طبیعت تھے اور نہ نیک فطرت انھیں سب سے زیادہ اسی امر کا خیال تھا کہ کوئی ہندوستانی کسی صورت سے کسی انگریز کی برابری نہ کرسکے اُن کے نزدیک انگریزی کپڑے پہننا ہی انگریز کی توہین کرنا تھی۔ ابن الوقت سے وہ اسی وجہ سے جلتے تھے، پھر کان کے کچے بھی ایسے تھے کہ سررشتہ دار نے کہا، ابن الوقت کام نہیں کرتے، محکمہ غدر کی حالت بالکل ابتر ہے۔ بس اس سے کام نکال لیا، اتنا ہی نہیں شام کی سیر کے سلسلے میں خود پیدل تھے ابن الوقت گاڑی پر سوار تھا، خفا ہو گئے کہ ہم کو دیکھتے ہی گاڑی سے کیوں نہ اتر پڑا۔ ہاتھ جوڑ جوڑ کر حضور حضور کیوں نہ کہا۔ باقاعدہ جواب طلب کر بیٹھے۔ ان کی عجیب و غریب ذہنیت اس گفتگو میں خوب واضح ہوتی ہے جو اُن سے اور حجۃ الاسلام سے ہوئی دیکھئے فرماتے ہیں۔

"آپکے بھائی ہندوستانی ہوکر صاحب لوگ بننا چاہتے ہیں اور چاہے گستاخی کے ارادے سے، نہ ہو مگر ہم لوگوں کو ان کی تمام باتوں پر گستاخی کا احتمال ہوتا ہے۔ ان کی وجہ سے ہم کو دوسرے ہندوستانیوں سے ملنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ یہ لباس ہمارا قومی شعار ہے۔ اور اگر کوئی ہندوستانی ہمارے جیسے کپڑے پہنے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری نقل کرتا ہے، یا ہم کو چھیڑتا ہے اور چڑھاتا ہے۔ کوئی ہندوستانی ہمارے لباس کو جس میں اس کو کسی طرح کی آسائش نہیں ہے بے وجہ اختیار نہیں کرے گا۔ اور سوائے اس کے کہ اس کے دل میں ہمارے ساتھ برابری کا داعیہ ہو اور کیا وجہ ہوسکتی ہے، یہ ساری تدبیر انگریزوں کو ذلیل اور ان کی حکومت کو ضعیف اور اُن کے رعب کو بے قدر کرنے کی ہے؛ آپ لوگ بھی اپنے سے کم درجے والے کو برابری کی حالت میں نہیں دیکھنا چاہتے، تو ہم اپنی رعیت کو جسے ہم نے بزور شمشیر زیر کیا ہے کیوں اپنی برابری کرنے دیں گے آج کو تو ابن الوقت صاحب ہیں کل کو ایک محرر، پھر ایک چپراسی، پھر ایک قلی، سب ہماری نقل کریں گے۔ اس کے یہ معنی کہ ہم سلطنت سے دست بردار ہوکر ولایت کا راستہ لیں، نہیں، نہیں، ایسا نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ . . . . "

باوجود ان باتوں کے دل کا برا نہ تھا۔ حجۃ الاسلام سے ساری روداد سنی تو ابن الوقت کے پاس پھر سے مقدمات بھیج دیئے "روبکار میں استمالت کے الفاظ جس سے ایک طرح کی معذرت بھی مترشح ہوتی ہے، لکھوا دئے اور ابن الوقت کے نام ایک چٹھی الگ لکھی" مگر مرغ کی ایک ٹانگ انگریزی وضع ترک کرنے پر اس میں بھی شدید اصرار ہے ملاحظہ ہو۔

"آپ کے بھائی حجۃ الاسلام سے جو میں نے آپ کے حالات سنے میرے سارے شکوک دفع ہوگئے۔ اور میں آپ سے اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں اور اگر آپ اپنے بھائی حجۃ الاسلام کی سی وضع اختیار کریں جو آپ کی قومی وضع ہے اور جس میں آپ نے بھی اپنی عمر کا بڑا حصہ بسر کیا ہے، اور جو ایک ہندوستانی شریف کے لئے زیبا اور راحت بخش ہے۔ تو مجھ میں اور آپ میں ایسی دوستی قائم ہوگی جس کو میں ساری عمر نباہوں گا"

ایک غیرفانی زنانی سیرت

خدا جانے نوبل صاحب اس خط کے بارے میں کیا کہتے! عورتوں میں صرف ایک سیرت ابن الوقت کی پھوپھی کی دکھائی گئی ہے۔ ان سے قصے کے پلاٹ میں کوئی خاص کام نہیں لیا گیا ہے۔ گفتگو جو حجتہ الاسلام سے انھوں نے ابن الوقت کے انگریزی وضع اختیار کرنے اور نوبل صاحب کو اُن کو بہکاکر فرنگی بنا لینے کے بارے میں کی ہے وہ بہت ہی پرلطف ہے۔ حجتہ الاسلام سے یہ بڑی بی فرماتی ہیں :-

"ہائے ہے غدر کے دنوں میں کچھ ایسی گھڑی کا پیرا اس موئے فرنگی (نوبل صاحب کی یہ خاطر کی گئی ہے) کا آیا تھا کہ بچے (یہ مسٹر ابن الوقت سے اظہار محبت ہے) کی مت پھیر دی۔ ہم سے تو ایسا چھپایا، ایسا چھپایا کہ دن کو گورے شہر میں گھسے اور رات کو ہم نے جانا کہ سارے غدر ہمارے گھر میں فرنگی چھپا رہا۔ جس وقت فرنگی کو لائے تھے اگر ذرا بھی مجھ کو معلوم ہو تو میں اس کو کھڑا پانی نہ پینے دوں۔ خدا جانے کم بخت کہاں سے ہمارے گھر آ پڑا تھا، نہ آتا نہ بچہ ہاتھ سے جاتا۔ آخر میرا صبر پڑا، یہ پڑا، کسی کی آہ لینی اچھی نہیں ہوتی۔ خدا نے اس کے پیچھے ایسا روگ لگایا کہ سامنے سارے دن اٹواٹی کھٹواٹی لئے پڑا رہتا تھا، آخر کو جاتے ہی بن پڑی، کالا منہ! خدا کرے پھر آنا نصیب نہ ہو!"

جب داماد نے یہ سمجھایا کہ نوبل صاحب نے ابن الوقت کے ساتھ بھلائی ہی بھلائی کی اور کوئی برائی نہیں کی تو اس پر مصر ہیں کہ تم ان کی " بادشاہزادی کو لکھو کہ ان لوگوں نے میرے بچے پر جادو کرکے اس کی مت پھیر دی ہے، ذرا اس گفتگو کو سنیئے۔ کس سادگی سے فرماتی ہیں۔

ساس :- اچھا تو تم اُن کی بادشاہزادی کو لکھو۔

داماد ۔ کیا؟

ساس :- یہی کہ تمھارے فرنگیوں نے ایسا ظلم کر رکھا ہے کہ ہمارے آدمی کو بہکاکر فرنگی بنا لیا ہے۔ اگر وہ سچ مچ کی بادشاہزادی ہے تو ضرور ہماری خبر یاد لے گی۔ لیکن بعض آدمی کہتے ہیں کہ بادشاہزادی کو مت لکھو، کمپنی کو لکھواؤ، کمپنی اس کی بیٹی ہے اور بادشاہزادی نے یہ ملک

بیٹی کے جہیز میں دے ڈالا ہے۔ اب کمپنی کا حکم چلتا ہے سو تم کو تو اصل حال معلوم ہوگا، کسی ایسے کو لکھو کہ بس دیکھنے کے ساتھ ہی حکم کر دے، بھلا کہیں خدا کی خدائی میں ایسا بھی اندھیر ہوا ہے کہ آپ ہی تو فرنگیوں نے بلایا، اپنے میں ملایا، اور دوسرا فرنگی ایسا ظالم آیا کہ آنے کے ساتھ لگا دشمنی کرنے، دیکھنا تم بادشاہزادی کو یہ ساری باتیں لکھوانا، بھول نا مت، خدا یہاں کے فرنگیوں کی بھی تو حقیقت کھلے کہ کسی بھلے آدمی کو دھوکہ دینا ایسا ہوتا ہے۔ بادشاہی کیا گئی سارے فرنگی بے سرے ہو گئے!

خواہ آپ ان بڑی بی کی طرح فرنگیوں کے "جادوگیر" ہونے کے قائل ہوں یا مجنہ الاسلام کی طرح محض اُن کی عقل کے سحر کو مانیں۔ مگر آپ کو ہر حال میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ڈاکٹر نذیر احمد بلا کے جادو نگار تھے کہ انھوں نے اس مختصر سی گفتگو میں اس پوری ذہنیت و سیرت کی مرقع کشی کر دی ہے جو ہماری غیر تعلیم یافتہ بڑی بوڑھیوں کی اب تک خصوصیت ہے! حقیقت امر یہ ہے کہ زنانی سیرت و ذہنیت اور نسوانی طرز گفتگو کی جیسی مکمل تصویریں نذیر احمد نے باوجود مولوی ہونے کے اپنے ناولوں میں کھینچی ہیں ویسے کسی دوسرے اردو ناولسٹ سے ممکن نہ ہو سکیں! اور وہ اسی لئے بقائے دوام کے دربار میں کرسی مرصع اور تاج زرنگار کے مستحق ہیں!۔

اقبال کا فلسفۂ حیات

علامہ اقبال جہاں ایک بلند فکر فلسفی ہیں، وہاں ان کا درجہ شاعری میں بھی اس حد تک پہنچا ہے، جب شاعر پر "شاعری جزویست از پیغمبری" کا اطلاق ہوتا ہے، شاعر کے متعلق ہر زمانے میں ایک جماعت غلط فہمیوں میں مبتلا رہی ہے اور بڑے بڑے مفکر اور مصلح اس سے بدظن رہے ہیں اور ان کے نزدیک شاعر کا وجود دنیا کے لئے مضر ہے وہ جماعت کو آگے بڑھنے سے روکتا ہے اور دلوں میں افسردگی اور اضمحلال پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی ذات سے جماعت کے نظام میں خلل پڑ جاتا ہے اور وہ بچوں کی طرح ہر نئی چیز کو بگڑتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے غالباً اسی خیال سے متاثر ہو کر افلاطون نے اپنی عینی ریاست میں شاعر کو مردود قرار دیا ہے بلکہ خود قرآن کریم نے اس کو گمراہوں کا مرشد ٹھہرایا ہے[1]۔ شاعر کی مذمت کے لئے ان اقوال سے زیادہ مستند قول اور زوردار عبارت اور کیا ہوگی .... لیکن اگر ان اقوال کی مصلحت اور اُن کے سیاق و سباق سے بحث نہ کی جائے تو ہمارا موضوع بحث ہی غلط ہو جاتا ہے اور اس کے متعلق کچھ کہنا محض تضیعِ اوقات! اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصل موضوع پر بحث کرنے سے پیشتر شاعر کی ہستی پر تمہید کے طور پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

یہ عقیدہ ذرا غور کرنے سے بہ آسانی حل ہو جاتا ہے کہ شاعر کے نصیبے میں یہ ذلت و رسوائی اور راندے جانے کی سزا کیوں آئی۔ افلاطون نے اپنی ریاست کی بنیاد جماعت پر رکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ شاعر کبھی اپنے اوپر کسی قسم کی پابندی نہیں لے سکتا۔ فرد کو جماعت کے اندر رہ کر اس کی خرابیاں نظر نہیں آسکتیں، وہ جب تک آزادہ روی اور بے نیازی اختیار نہ کرے کسی چیز کے متعلق بے لاگ رائے نہیں دے سکتا۔ شاعر ہمیشہ جماعت سے الگ رہتا ہے اور دنیا سے بے پروا۔ اسی لئے اس کی نظریں

[1] وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوُونَ

باتوں کی تہ تک پہنچ جاتی ہیں۔ پھر شاعر کے لئے ناممکن ہے کہ وہ ایک چیز کو دیکھے اور خاموش رہے وہ بولے بغیر رہ نہیں سکتا، اور جب بولتا ہے تو سننے والوں پر جادو کر دیتا ہو۔ اس چیز سے بڑھ کر جماعت میں انتشار اور بے چینی کا محرک اور کیا ہوگا؟ افلاطون ان حقائق سے آگاہ تھا۔ وہ اپنے نظام میں اس قسم کے عناصر کو برداشت نہیں کر سکتا تھا اور جب یہ صورت ہو تو اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں رہتا کہ وہ شاعروں کو اپنی ریاست میں داخل ہی نہ ہونے دے کہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔

گو افلاطون نے ہر چند شاعر کی مذمت کی ہے اور اسے اپنے نظام ریاست سے جلا وطن تک کر دیا ہے۔ تاہم وہ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا، وہ خود ایک رنگین رقم ادیب تھا۔ اس کا تخیل بھی آسمانوں ہی میں رہتا تھا۔ اس نے شاعر کی مدح میں اپنی کتاب "ریاست" کے ایک باب کا بہت بڑا حصہ صرف کیا ہے[۵۱] ایک جگہ لکھتا ہے کہ "ہم میں سے بہترین شخص جب ہومر یا کسی اور الم نگار شاعر کا کلام سنتا ہے جس میں کوئی اپنے دکھ درد کی داستانِ طولانی دہرا رہا ہو، رو دھو رہا ہو، یا آہ وزاری اور سینہ کوبی میں مصروف ہو تو تم جانو اچھے سے اچھے کا دل پسیج جاتا ہے اور ہم اس شاعر کی خوبی پر سب سے زیادہ عش عش کرنے لگتے ہیں جو ہمارے جذبات کو سب سے زیادہ محرک کر دے"[۵۲]۔

وہ محض جماعت کی خاطر اپنے سب سے عزیز دوست (شاعر) کی قربانی کرتا ہے اور سینے پر پتھر رکھ کر اسے تیاگ دینے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ اس کی "ریاست" میں جلا وطن شاعر کا مقدمہ پیش ہو اور وہ مسند عدالت پر آنے سے پہلے اپنے ایک دوست سے اپنا درد دل یوں بیان کرتا ہے "اگر اس کا عذر ناکام رہا تو پھر محب عزیز! ہم اس شخص کی طرح جو ایک چیز کا دلدادہ ہے لیکن چونکہ اس کی آرزو اس کے اغراض کے منافی ہے لہذا اپنے اوپر جبر کرتا ہے۔ ہم بھی کہ دلدادگانِ شعر ہیں، اسے چھوڑ دیں گے، اگرچہ بلا کشمکش تو نہیں، ہم میں بھی تو آخر محبتِ شعر کی وہ روح موجود ہے جو شریف

۵۱ ریاست باب ۱۰ کے صفحات ۲۱۰ تا ۲۱۴ محض شاعر کی ساحری اور اس کی اہمیت کے اعتراف کیلئے وقف ہیں
۵۲ ریاست باب ۱۰ صفحہ ۲۱۲

ریاستوں کی تعلیم نے ہمارے اندر پھونکی ہے ![۵۳] ریاست میں جہاں افلاطون نے شاعر کو مردود قرار دیا ہے وہاں اس سے اپنی وابستگی کا اظہار بھی خوب دل کھول کر کیا ہے۔ اس کے ان متضاد خیالات آرا سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شاعر بذاتہ ایسا نہیں کہ اسے جماعت سے خارج کر دیا جائے۔ بلکہ شاعری کی وہ گمراہ کن اور ضرر رساں قسم ہے جو بادیوں اور مصلحوں کی مساعی تعمیر کو بیکار کر دیتی ہے اور اس کے سبب جماعتوں کو اطمینان و سکون کی زندگی نصیب نہیں ہوتی خود افلاطون بھی اس شاعر کو جس کا موضوع دیوتاؤں کی تسبیح اور مشاہیر کی مدح ہو، مذموم یا ضرر رساں قرار نہیں دیتا اور اسے اپنی ریاست میں داخل ہونے کی اجازت بھی دیتا ہے مگر وہ اس سے آگے ایک قدم بھی نہیں رکھنا چاہتا، اس لئے کہ جہاں روائی یا تمنائی شکل میں شعر کی شکریں دیوی کو ریاست میں داخل ہونے کی اجازت ہوئی کہ بس، بجائے عقل و قانون کی فرماں روائی کے جنھیں اجماع عالم نے بہترین حکمران تسلیم کیا ہے خطا و کرب اور مسرت و الم کا دور دورہ ہو گا۔[۵۴]

قرآن کریم نے بھی کم و بیش انھیں اسباب کی بنا پر شاعر کو مردود ٹھہرایا۔ تنزیل قرآن کے وقت اسلام کے سامنے جماعت انسانی کی تشکیل تھی۔ عربوں کی شاعری سے قبیلوں کی باہمی جھگڑوں میں جتنی خوں ریزیاں ہوئی ہیں ان سے کون ناواقف ہے؟ اس وقت اگر ان شعرا کی مذمت نہ کی جاتی تو شاید اخوت و مساوات کا وہ زرین اصول محض بے کار ثابت ہوتا جو اسلام کی تعلیم کو دوسری تعلیم سے ممتاز کرتا ہے۔

یہاں ایک چیز اور تشریح طلب ہے۔ قرآن کے طرز بیان سے اس کے قول کی عمومیت ثابت نہیں ہوتی، اس نے " والشعراء " کہا ہے جس سے شعرا کا کوئی خاص طبقہ مراد ہے نہ کہ شاعر بحیثیت شاعر یہیں یہ حقیقت بھی منکشف ہوتی ہے کہ شاعر بذاتہ مردود نہیں بلکہ اس قوم کا ایک خاص

[۵۳] "ریاست" باب ۱۰ صفحہ ۶۰۹

[۵۴] "ریاست" باب ۱۰ صفحہ ۶۱۳

معتوب ہوا ہے جو اپنے خداداد کمال سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہو۔ جماعت میں فتنہ پھیلاتا ہو انسانوں میں امتیاز کا جذبہ پیدا کرکے ایک دوسرے کا دشمن بناتا ہے۔ جماعت کے شیرازے کو منتشر کرنے کی فکر میں رہتا ہے غرض ہر وہ کوشش جس سے جماعت کی ترقی رک جاتی ہے اس کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اس معتوب" شاعر کا شعار ہوتا ہے، اس تاویل کی تائید خود قرآن کریم کی بعد کی آیت اِلَّا الَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا سے ہوتی ہے جس میں اس نے شاعر کے دونوں طبقوں کے درمیان حد فاصل قائم کر دی ہے اور معتوب طبقے سے مومنوں کو مستثنیٰ کر دیا ہے "یعنی مومن اگر شعر بھی کہے تو وہ ان باتوں کا مصداق نہیں ہوتا بلکہ کسی امر حق کا اظہار اشعار میں کرتا ہے وَانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا میں اشارہ ہو کہ جب انھیں بہت برا کہا جاتا ہے تو وہ کبھی کبھی مدافعت کے طور پر ظالم کے عیوب کا ذکر اشعار میں کر دیتے ہیں.............. اس سے معلوم ہوا کہ شعر کہنا منع نہیں اور مومن بھی شاعر ہو سکتا ہے مگر اس کی شاعری عام شاعروں کی بیہودگیوں سے پاک ہوتی ہے[۵]۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کی ذات سے بڑھ کر قرآن کی اور جامع تفسیر نہیں ہو سکتی شاعروں کو حکمت و دانش سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن کے پیش نظر اگر نفس شاعری کی تردید و تجویز ہوتی تو شاید رسول اللہ کے حلقہ نشینوں میں حسان بن ثابت جیسے جادو نگار شعرا کو جگہ نہ ملتی اور زبان مبارک سے اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً وَّاِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا نہ نکلتا

ہم شاعر کی ذات سے جو اس درجہ بدظن ہو گئے ہیں اور اس کے وجود کو قوم کی افسردگیوں اور پس ماندگیوں کا باعث ٹھہرانے لگے ہیں اس میں خود ہماری فہم کا قصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے سامنے اتفاق سے تصویر کا وہی رُخ ہے جو ایک زندگی طلب قوم کے لئے یقیناً مہلک ہے۔ لیکن اگر ذرا صبر سے کام لیا جائے اور کوشش کی جائے (مگر یہ کوشش اس قدر صبر آزما ہے کہ ہم اس

۵ بیان القرآن جلد نمبر ۲ صفحہ ۱۰۰-۱۰۱ (حاشیہ)

کے تصور سے بھی گھبرا اٹھتے ہیں) کو تہ ۔ ینہ دوسرا پہلو بھی نظر کے سامنے آجائے تو شاید یہ غلط فہمی نہ رہے۔ اور جماعت ۔ ین شاعر کے وجود کی اہمیت سمجھ میں آجائے۔

شاعر کی ذات کے متعلق ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ وہ طبعاً محتاج اور حریص ہوتا ہے یا بے نیاز اور مستغنی۔ اس ذیل میں مولانا حالی کی رائے ہے کہ جس طرح خوشامد اور نذر بھینٹ کا چٹخارہ رفتہ رفتہ ایک متلون اور راست باز جج کی نیت میں خلل ڈال دیتا ہے اسی طرح دربار کی واہ وا اور صلے کی چاٹ ایک آزاد خیال اور جذبیلے شاعر کو چپکے ہی چپکے بھٹئی، جھوٹ اور خوشامد یا ہزل و تمسخر پر اس طرح ڈالتی ہے کہ وہ اس کو کمال شاعری سمجھنے لگتا ہے[۱]۔ مولانا حالی جیسے نکتہ رس اور حقیقت شناس کی رائے سے کیسے انکار ہو سکتا ہے اور وہ بھی جب ان کی تائید متقدمین اردو کی زندگیوں سے ہوتی ہو۔ مگر یہ بھی اسی طرح استثنا کا محتاج ہو جس طرح خود شاعر کی ذات۔ واقعات شاہد ہیں کہ یہ رائے شعرا کے اسی طبقے پر صادق آتی ہے جسے افلاطون اور قرآن کریم نے مردود قرار دیا ہو جو شعر کو وجدان سے متاثر ہو کر نہیں کہتے بلکہ مخصوص واقعات کو کسی مصلحت کے پیش نظر نظم کر دیتے ہیں اور اس کے لئے داد و تحسین کے منتظر رہتے ہیں۔ حالی کی رائے کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں بھی "دربار" کے لفظ سے استثنا ثابت ہو جاتا ہے اور اس خیال کو بھی تقویت پہنچتی ہے کہ یہ رائے انھوں نے اردو کے ان شعراء کو نظر میں رکھ کر قائم کی ہے جن کا شعار بادشاہوں اور نوابوں کو اپنے اشعار سے خوش کر کے ان کی ادب نوازی سے مادی فائدے اٹھانا رہا ہے۔ مثال کے لئے انشا کا تمام دیوان پڑھ جائیے۔ بھرتی کے شعروں سے پر ہے۔ پھر اس شعر کو بھی پڑھئے جو انھوں نے دربار سے نکلنے کے بعد اپنی تنگ دستی سے متاثر ہو کر کہا تھا۔

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

اقبال کی حیثیت ان شاعروں سے بہت ممتاز اور بلند تر ہے۔ وہ طبیعت کی اس افتاد

[۱] مقدمہ شعر و شاعری

کا پابند نہیں اس کی شاعری کا مقصد راستے سے بھٹکے ہوؤں کو راہ پر لگانا ہے۔ ان میں مل جانا نہیں اس کے تصور میں شاعر ابراہیمی شان رکھتا ہے جس کے کلام سے اہلِ آذر کا دل آذر سرد ہو کر رہ جاتا ہے

شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں　　　کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آذری

آخر کیوں کر کہا جائے کہ اقبال بھی انھیں کاسہ لیس اور خود فروش شعرا کے زمرے میں آتا ہے جن کی طرف مولانا حالی کا اشارہ ہے .... اقبال جس کا مسلک ہے کہ

ناز شہاں نمی کشم زخم کرم نمی خورم　　　در نگرم اے ہوس فریب ہمت ایں گدائے را

اور جس کے نزدیک استغنا خدا کے پاک بندوں کا شانِ امتیازی ہے اور زندگی کی محافظ و نگہبان۔

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں　　　زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا

پھر اپنی درویشی پر فخر ہے۔

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی　　　کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

جن شاعروں کو سامنے رکھ کر حالی نے اپنی رائے قائم کی ہے۔ اقبال ان کی صف میں نہیں آتا۔ "انسان" اقبال کا ممدوح ضرور ہے مگر بہ حیثیت فرد یا بہ شکل طبقہ و ملت نہیں بلکہ بحیثیت مخلوق اس کا مذہب انسانوں میں رنگ نسل کے امتیاز کو حرام قرار دیتا ہے۔ اس کا پیغام کسی ایک قوم یا جماعت کے لئے نہیں بلکہ نوع انسان کے لئے ہے۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم　　　چمن زادیم و از یک شاخساریم

تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام ست　　　کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

مگر اس کے کلام کا بیشتر حصہ اسلام کی تعلیم کی روح کو نمایاں کرتا ہے اور ہر جگہ اس کا خطاب اور اشارہ مسلمانوں ہی سے ہے۔ اس کے کلام کی اسی خصوصیت کو دیکھ کر یورپ کے ایک مستشرق مسٹر نکلسن نے اس پر الزام لگایا تھا کہ اقبال کا فلسفہ یوں تو کسی خاص ملت یا جماعت کی حمایت نہیں کرتا۔ مگر اس کی تمام تر تعلیم مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص ہے اور وہ خطاب

بھی ان ہی سے کرتا ہے[۵۱] لیکن یہ رائے نتیجہ ہے ۔مسٹر ڈکنسن کی سطح بینی اور اقبال کے فلسفے سے سرسری مطالعے کا ۔ اقبال نے خود ۔اُن کے اس الزام کا جواب دیا ہے کہ" میرے نزدیک اسلام ہی میرے فلسفۂ انسانیت کی ترجمانی کرسکتا ہے ۔میں اسلام کو عرب و حجاز یا عراق و عجم کا مذہب تسلیم نہیں کرتا بلکہ وہ انسان کا دین ہے اور جب میں اسلام سے خطاب کرتا ہوں تو میرے ذہن میں مسلمان نہیں بلکہ تمام دنیا کے انسان ہوتے ہیں[۵۲]۔ حقیقت بھی یہی ہے ۔اقبال کا فلسفہ کوئی نیا فلسفہ نہیں ۔وہی اسلامی فلسفہ ہے جو تمام و کمال قرآن کریم کی الہامی زبان میں موجود ہے ۔اقبال اس کا محض مفسر ہے اور پھر اسے اصلی صورت میں لانا چاہتا ہے جو مسلمانوں کی کور باطنی کی وجہ سے بالکل مسخ ہو گئی ہے

مسلمانوں نے قرآن کو اسلام کے محض ابتدائی دور میں صحیح طور پر سمجھا تھا اور اس ماحول کا اثر زیادہ سے زیادہ خلافت راشدہ تک ۔ہا۔لیکن جب سے انھوں نے فتوحات اور ملک گیری کو اپنا مقصد بنالیا اور سمجھے کہ اُن کا منتہائے سفر یہی منزل ہے ۔تبھی سے اسلامی فلسفے کی روح مضمحل ہونی شروع ہوئی ۔ اطمینان وراحت کی زندگی نصیب ہوئی ۔شاہانہ ٹھاٹھ ہونے لگے تو توسنِ فکر کی جولانی کی باری آئی ۔ دلوں سے ایمان کی تازگی رخصت ہوئی اور ان کی جگہ عقل و تدبر کی الجھنوں نے لے لی اور پھر مسلمان اس میں ایسے پھنسے کہ جو کچھ پہلے سمجھ چکے تھے وہ بھی بھول گئے ۔اقبال نے بھی اسی حقیقت کی وضاحت اپنے ایک انگریز دوست کے خط کے جواب میں کی ہے اسلام کو جہاں ستائی اور کشور ستائی میں جو کامیابی ہوئی ۔میرے نزدیک وہ اس کے مقاصد حق میں بے حد مضر تھی ، اس طرح وہ اقتصادی اور جمہوری اصول نشو و نما نہ پاسکے ۔جن کا ذکر قرآنِ کریم اور احادیث نبوی میں جا بجا آتا ہے ۔یہ صحیح ہے کہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم

۵۱ اقبال کا ایک خط ،مطبوعہ نیرنگ خیال ۔ اقبال نمبر

۵۲ نیرنگ خیال ، اقبال نمبر

کرلی۔ لیکن ساتھ ہی اُن کے سیاسی نصب العین پر غیر اسلامی رنگ چڑھ گیا اور انھوں نے اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں کہ اسلامی اصولوں کی گیرائی کا دائرہ کس قدر وسیع ہے[۵]
مسلمانوں کو اقبال سے یہی شکایت ہے اور اپنے شعروں میں وہ اسی شکوے کو مختلف پیرایوں میں

[illegible]

جاتا ہے تو اپنی شعلہ نوائی سے آگ لگا دیتا ہے۔

آسٹریا کے نومسلم عالم مسٹر محمد اسد نے بھی مسلمانوں کی موجودہ پستی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب (ISLAM ON THE CROSSROAD) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے

> حقیقت یہ ہے کہ موجودہ اسلامی زندگی اور اسلام کی حقیقی تعلیم میں بہت بڑا بعد ہوگیا ہے اسلام کا عمل پیہم اور حرکت دوام کا زرّین اصول جمود وتعطل اور راحت طلبی میں تبدیل ہوگیا۔ اور مسلمانوں نے وسیع القلبی اور جذبہ ایثار کو چھوڑ کر کوتاہ نظری اور خود غرضی کو شعار بنالیا ہے[۵]

غرض مسلمان وہ مسلمان نہ رہے جن کا ذکر قرآن میں بارہا آیا ہے اور جن کا نمونہ رسول اللہ نے اپنی زندگی میں عملی طور پر پیش کیا تھا، اُن کی رگوں میں وہ خون اور خون میں وہ حرارت باقی نہ رہی جو مسلمان کو مسلمان بناتی ہے۔ جہاد تحفظ حق کے لئے بنا تھا۔ مگر اس سے ذاتی اغراض کی تکمیل میں کام لیا گیا، قرآن کو جو نہایت واضح اور صاف زبان میں نازل ہوا تھا کھینچ تان کر اپنے اغراض کے مطابق بنایا گیا۔ ایمان کی جگہ عقل اور حق وصداقت کی بجائے تدبیر وسیاست کو اصول زندگی بنایا گیا اور وہی لوگ جو دنیا کو امن وآشتی، محبت وخلوص، اور ایثار و قربانی کا سبق دینے کے لئے اٹھے تھے۔ خود باہمی جنگ وپیکار، بغض وعناد اور خود بینی

---

۵ دیباچہ (ISLAM ON THE CROSS ROAD)

و خود ستائی میں مبتلا ہو گئے .... اقبال انھیں چیزوں کو مسلمانوں کی پستی اور زوال کی وجہ قرار دیتا ہے اور اس کے علاج کے لئے وہ نسخہ تجویز کرتا ہے جس کے اجزائے ترکیبی ایمان خودی، عمل پیہم، سخت کوشی اور ذوق طلب ہیں۔ وہ جس زندگی کا پیغام دیتا ہے اس میں سکون کی جگہ تڑپ، قناعت کی جگہ طلب، تن آسانی کی جگہ سخت کوشی، عقل کی جگہ ایمان اور تقلید کی جگہ خودی ہے۔ اس کے سفر کا مقصود لطیف منزل نہیں۔ بلکہ ذوق خرام اور خلش آبلہ پائی ہے۔

مگو از مدعائے زندگانی ترا بر شیوہ ہائے او نگہ نیست
من از ذوق اثر آنگونہ مستم کہ منزل پیش من جز سنگ رہ نیست

اور تماشا یہ ہے کہ راہ نہایت پر خطر اور اندیشہ ناک اختیار کرتا ہے۔ جن قافلوں نے پرسکون اور راحت بخش شاہراہیں منتخب کی ہیں انھیں وہ نگاہ میں نہیں لاتا۔ اور ان کی پست ہمتی پر افسوس کرتا ہے۔

وائے آں قافلہ کز دونی ہمت می خواست رہگذارے کہ دو پیچ و خطر پیدا نیست

اور پھر اپنے قافلے کے راہ گیروں کی علو ہمتی پر فخر کرتا ہے جو قصداً اس راستے کو چھوڑ دیتے ہیں جس میں کسی کشمکش کا امکان نہیں، اور ایسی راہ تلاش کرتے ہیں جس میں قدم قدم پر مشکلات سے الجھنا اور خطرات سے لڑنا پڑے۔

مرد ہمت آں رہرو م کہ پا نہ گذاشت بہ جادہ کہ در و کوہ و دشت و دریا نیست

زندگی کے چار رخ

اقبال کے پیش نظر ایک مکمل انسان کی تعمیر و تخلیق ہے جو دنیا کو پیغام صلح و امن دے۔ حق کی حمایت میں باطل سے برسر پیکار ہو، اخوت و مساوات کا سبق دے اور فطرت انسانی سے جذبہ امتیاز کو مٹا دے۔ اس کا ایمان۔ اس کی طاقت، اس کی جان، اس کا مال اور اس کی ساری زندگی اپنی ذات کے لئے نہ ہو، بلکہ "انسانیت" کی نگہبانی، حق کا تحفظ، صلح و امن کی کوشش، اس کا شعار زندگی ہو۔ اس کی شخصیت

اس قدر نمایاں ہو کہ دنیا جب اپنی عقل کی زندگی کی الجھنوں سے اور بدمزگیوں سے گھبرا جائے تو خود بخود اس کی طرف جھکے اور اس سے اپنے درد کا درماں طلب کرے

باز در عالم بیار ایام صلح　　جنگ جویاں را بدہ پیغام صلح

وہ اپنے مکمل "انسان" کی زندگی کے چار اصول مقرر کرتا ہے۔ ایمان، خودی سخت کوشی و عمل، عالم گیر اخوت، اور یہی اس کے فلسفۂ حیات کی روح ہے۔ انسان زندگی میں اسی اصول پر کار بند ہو کر دنیا میں کامیاب اور آخرت میں سرخرو ہو سکتا ہے۔ اقبال کے شعروں نے جس قدر قالب اختیار کئے ہیں.......... مدح، ہجو، فخر، نسیب، طنز ..... ہر ایک میں یہی روح کار فرما نظر آتی ہے۔ تصوف اور معرفت اس کے کلام کا مخصوص رنگ ہے۔ مگر یہاں پہنچ کر بھی اس کے دردمند دل کو قرار نہیں ملتا، اور اسکی سکون ناآشنا فطرت بے چین ہی رہتی ہے۔ مگر یوں کہنا چاہئے کہ اس نے تصوف کو ذریعہ بنایا ہے بارگاہِ ایزدی کی باریابی کا جہاں جاکر وہ "مسند نشین بارگاہ" سے "شکوہ" کرتا ہے اور قوم کے لئے زندگی عمل کی بھیک مانگتا ہے

ایمان کامل اقبال زندگی کی بے کیفی اور زبوں حالی کی بنیادی وجہ ایمان پر "عقل" کے غلبے کو قرار دیتا ہے اس کے نزدیک عقل قلب و روح کی پژمردگی کا باعث ہے، اس باب میں اقبال مولانا جلال الدین رومیؒ کا مرید ہے اور ان ہی سے یقین و ایمان کا سبق لے کر عقل کو خدا حافظ کہتا ہے۔ اور کیوں نہ ہوتا ایمان نے اسے وہ درجہ عطا کیا جو عقل کی رہنمائی میں حاصل نہ ہوتا۔ کہتا ہے :-

سفالم را مئے او جام جم کرد　　درون قطرہ ام پوشیدہ یم کرد
خرد اندر سرم بت خانہ ریخت　　خلیل عشق دیرم را حرم کرد

وہ جب کسی مسئلے کو عقل کی روشنی میں حل کرنا چاہتا ہے تو الجھ کر رہ جاتا ہے۔ اپنی ایک نظم موسوم بہ "جلال و ہیگل" میں اس نے اپنی اس کمزوری کا نہایت خلوص سے اعتراف کیا ہے

نظم کا خلاصہ ہے کہ " ایک شب میں ہیگل کے فلسفوں پر غور کر رہا تھا۔ جوں جوں میرے خیالات کی پرواز بڑھتی جاتی تھی۔ میں الجھنوں اور کشمکشوں میں پھنستا جاتا تھا۔ اسی محویت کے عالم میں یکایک مرشد روم کی زیارت ہوئی۔ حضرت نے میری بے لبسی پہ ترس کھا کر مجھے تنبیہہ کی فرمایا:۔

گفت با من چہ خفتہ برخیز ۔۔۔ بہ سرائے سفینہ می رانی ؟

بہ خرد راہ عشق می پوئی ۔۔۔ بہ چراغ آفتاب می جوئی ؟

عقل حقیقت کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتی ۔ بلکہ انسان کو ہمیشہ دھوکے میں رکھتی ہے " بہ سرائے سفینہ می رانی ؟" کی معنویت ملاحظہ ہو ، تشنہ کام حقیقت کو اس سے ہمیشہ دھوکا ہوتا ہے اس کی تشنگی کبھی بجھ نہیں سکتی بلکہ وہ اضطراب کی حالت میں مارا مارا پھرے گا ، اور ایک وقت آئے گا کہ وہ اپنی حالت میں ناکام و نامراد چل بسے گا ۔ اقبال کو عقل و خرد سے بھی اندلیشہ تھا۔ اسے حقیقت کی جستجو تھی ، مگر جب عقل کے پھیر میں پڑ کر اپنی آرزو کو ناکام ہوتے دیکھا تو گھبرا کر پکار اٹھا

عطا اسلاف کا جذب دروں کر ۔۔۔ شریک زمرۂ لایحزنون کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں ۔۔۔ مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

عقل کی روشنی میں حقیقت کی تلاش بالکل ایسی ہی ہے جیسے شیطان کے نقش قدم پر چل کر جنت کی طلب اس لئے کہ عقل ابلیسی فطرت کی خصوصیت ہے۔ اس کا پایہ پکڑنا سراسر شیطان کی مریدی ہے ۔ حضرت رومی کا ارشاد ہے ۔

زیرکی ز ابلیس و عشق از آدم ست ۔۔۔ داند آں کو نیک بخت و محرم ست

ایمان کی کمزوری انسان کو کہیں کا نہیں رکھتی ۔ وہ دین میں حقیقت سے دور ہوتا ہے اور دنیا میں ناکام و ذلیل ۔ دین میں تو یہ چیز بنیاد ہے حق و صداقت کی اور اس کے بغیر کوئی اس منزل تک پہنچ ہی نہیں سکتا جس پر پیغمبر اور بی اسے لے جانا چاہتے ہیں ۔ دنیا میں بھی اگر یقین کی کارفرمائی نہ ہو تو اس کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے ، انسان ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور اس کی بے دینی

کی زندگی بھی عذاب ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ انسان کے ہر کام کا محرک یقین ہوتا ہے اور وہ اپنی سمجھ میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا جس کے صلے کے حصول میں اسے تذبذب معلوم ہوتا ہو یہی یقین جب جنون کی حد تک پہنچ جاتا ہے (جسے تصوف کی اصطلاح میں "جذب" کہتے ہیں) تو طالب سراپا مطلوب ہو جاتا ہے۔ جو کامیابی کی انتہائی منزل ہے۔ یہیں آکر انسان حضرت باری میں باریاب ہوتا ہے۔ خواہ اس کی لگن کفر سے ہو یا اسلام سے، اس کے بالمقابل تذبذب اور تشکیک انسان کو کہیں کا نہیں رکھتے اسلام ایسے شخص کو خواہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو منافق کہتا ہے اور دنیا اور عقبیٰ دونوں میں اس کی تذلیل کا حکم لگاتا ہے۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

ایمان کامل کا جیتا جاگتا نمونہ حضرت ابراہیم کی سیرت پاک میں موجود ہے۔ حضرت جس ماحول میں تھے اس میں ان کی توحید کفر تھی، مگر اس "کفر" کی فدائیت ملاحظہ ہو کہ آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے اُن کے یقین و ایمان کی گرمی کی تاب لانے سے قاصر رہتے ہیں اور آتش کدۂ آذر سرد ہو جاتا ہے اس فدائیت اور سوز عشق کے مقابلے میں دور حاضر کی عقلیت ہے۔ جس نے اہل دنیا کو تذبذب اور بے یقینی کی لعنت میں گرفتار کر کے جیتے جی عذاب میں ڈال رکھا ہے۔

یقین مثل خلیل آتش نشینی یقین اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار غلامی سے بتر ہے بے یقینی

حضرت امام فخر الدین رازیؒ نے قرآن کو فلسفے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن فہمی میں بے انتہا پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں۔ حضرت رازی حکمت و فلسفے کے امام تھے اور انھوں نے بہت سے مسائل کو سلجھایا، اور ان کا حل تجویز کیا ہے مگر اقبال کو اُن سے کوئی عقیدت نہیں اُن کے مقابلے میں وہ فقر حیدری کا سپاس گذار ہے جس کے نزدیک اسلام عقل کا پابند نہیں بلکہ ایمان پر مبنی ہے۔ اقبال عقل کو زوال عشق سے تعبیر کرتا ہے جس سے دلوں میں افسردگی اور روح میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے۔

کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدر　　زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

اپنے جوشِ ایماں کے آگے امام رازی کی پرواز خرد کو نگاہ میں نہیں لاتا اور اعلان کر دیتا ہے

ز رازی معنیٔ قرآن چہ پرسی　　ضمیر ما بآیاتش دلیل ست
خرد آتش فروزد دل بسوزد　　ہمیں تفسیر نمرود و خلیل ست

عقل کی رہنمائی کی ایک خاص حد ہے جس کے آگے کا رستہ اس کا دیکھا ہوا نہیں۔ عقل کی رہنمائی میں اس حد تک پہنچ کر بھی اگر راہ رو آگے بھی اسی کی رہنمائی میں چلنا چاہے تو یقیناً وہ بیچ میں بھٹک کر رہ جائے گا اور اس کی یہ مسافت رائیگاں جائے گی۔ اس حد پر پہنچ کر دوسرا ہادی ملتا ہے جو راہ رو سے ہادیِ خرد کی طرح یقینِ راہ کے متعلق بحث نہیں کرتا۔ بلکہ اس سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلا آتے۔ یہ ہادی ایمان ہے۔ راہ رو اپنے پہلے سفر کے رہنما (عقل) کی باتوں کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اس لئے اکثر وہ دوسرے ہادی کی خاموش رہنمائی سے گھبرا اٹھتا ہے۔ اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور پھر اسی نور کی طرف لپکتا ہے جس کی روشنی میں اس نے اب تک سفر کیا تھا۔ اقبال اس کھوئے ہوئے اور گم کردہ راہ مسافر کی تنبیہ کرتا ہے۔

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور　　چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

عقل کی شمع باہر روشنی ضرور کرتی ہے۔ مگر اندرونِ منزل اس کی شعاعیں نہیں پہنچ سکتیں نہ وہاں کے ہنگاموں کی اسے خبر ہوتی ہے۔

خرد سے راہ رو روشن بصر ہے　　خرد کیا ہے چراغِ رہ گذر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا　　چراغِ رہگذر کو کیا خبر ہے

ایمان کی لازوال دولت کو چھوڑ کر جن لوگوں نے عقل و خرد پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھی ہو اقبال کو ان سے کوئی وابستگی نہیں۔ اس کے حلقہ درس میں طالب شوق کو جو درجہ حاصل ہے طالب خرد کو نہیں وہ ان عقل پرستوں سے قطع تعلق کر لیتا ہے

گرفتم ایں کہ کتابِ خرد فرو خواندی　　حدیثِ شوق نہ فہمیدہ دریغ از تو

اور دل دادگان شوق کو درس عشق دیتا ہے۔

مسلمانان مرا عرفیست در دل
کہ روشن تر ز جان جبرئیل ست

نہانش در رم از آذر نہادان
کہ ایں سرے ز اسرار خلیل ست

بچشم عشق نگر تا سراغ او گیری
جہاں بچشم خرد سیمیا و نیرنگ ست

ز عشق درس عمل گیر و ہر چہ خواہی کن
کہ عشق جوہر ہوش ست و جان فرہنگ ست

خودی انسانی اخلاق کی بنیاد اقبال فلسفۂ خودی پر رکھتا ہے چنانچہ مثنوی اسرار و رموز زندگی کے انھیں دو عناصر (خودی اور بے خودی) کے لئے وقف ہے اس کے علاوہ اس کی دوسری تصانیف میں بھی یہی فلسفہ نمایاں ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ انسان کی طاقت کی بے پناہی کا راز۔ حساس خودی میں مضمر ہے، اور اس کا یہی جوہر اسے فرشتوں سے بھی ممتاز کرتا ہے۔ انسان بہ لحاظ تخلیق فرشتوں سے کمتر ہے۔ وہ نوری ہیں، یہ خاکی۔ وہ ہمہ تن نور ہیں، یہ سراپا ظلمت، مگر انسان کے خاکی پیکر میں خودی کے نور سے روشنی ہے جس میں وہ گرمی اور حرارت ہے کہ فرشتوں کو باوجود ان کی نوری تخلیق کے حاصل نہیں، اقبال کو اپنے اس امتیاز پر کس قدر ناز ہے۔ ملاحظہ ہو

بہ نوریاں ز من پا بہ گِل پیامے گوئے
حذر ز مشتِ غبارے کہ خویشتن نگرست

یہی امتیازی شان انسان کا سرمایۂ حیات ہے۔ اقبال اسی نغمے سے مست ہے۔ دوسروں کے راگ اُسے ایک نظر نہیں بھاتے۔

برکش آں نغمہ کہ سرمایۂ آب و گِل تُست
اے ز خود رفتہ تہی شو ز نوائے دگراں

واقعہ تو یہ ہے کہ انسانی سیرت کے جانچنے کا اصلی معیار خودی ہے۔ ہزار کوئی متقی ہو، پرہیزگار ہو، حقیقت کی تلاش میں سرگرداں اور حصول معرفت کے پیچھے در بدر مارا پھرے، مگر خودی کی دولت سے

محروم ہے تو اس کی یہ تمام خوبیاں ہیچ ہیں۔

طواف کعبہ زدی گرد دیر گردیدی　　نظر بخویش نہ پیچیدہ، دریغ از تو

اصل زندگی اپنی ذات پر بھروسا کرنا ہے۔ دوسروں پر تکیہ کرنا موت سے بھی بدتر ہے۔ اس جد وجہد میں انسان پر مصیبتیں بھی ضرور آتی ہیں۔ مگر یہی اس کی زندگی کی کسوٹی ہے جس پر وہ پرکھا جاتا ہے۔

خطر تاب و تواں را امتحان است　　عیار ممکنات جسم و جان است

مصیبتیں جھیل کر انسان انسان بنتا ہے۔ لوہا جب خوب تپایا جاتا ہے۔ تب کہیں جاکر اسے شمشیر براں بننے کا شرف حاصل ہوتا ہے اور آلہ جہاد ہونے کی ازلی راحت۔

انسان جب اپنی خود قدر کرتا ہے تو خدا اور تقدیر بھی اس کی مدد کرتے ہیں۔ جس کے پاس اپنا کچھ نہیں دنیا بھی اسے ٹھکرا دیتی ہے اور خدا بھی اس کی طرف سے آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ انسان کی کامیابی کے اس راز کو قرآن نے کس قدر موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ
اقبال نے اس باب میں جتنے اشعار کہے ہیں سب اسی آیت کریمہ کی تفسیر ہیں۔ مولانا حالی فرماتے ہیں:

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی　　نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

انجیل مقدس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دو لڑکوں کی تمثیل بیان کر کے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ

"پس جس کے پاس ہے اسے اور دیا جائے گا اور جس کے پاس خود کچھ نہیں اس سے وہ بھی لے لیا جائے گا جو اسے دیا گیا تھا۔"

گویا یہ قانون فطرت ہے جو غیر شعوری طور پر انسانی زندگی میں کارفرما ہے۔ جس نے اس سے روگردانی کی اس کی سزا قانون فطرت کے مطابق موت ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ پستی اور زبوں حالی کا سب سے بڑا سبب ترک خودی ہے۔ جب تک ان میں یہ جوہر موجود تھا وہ دنیا پر چھائے ہوئے تھے اُسے کھو دیا تو اب ذلت و پستی، تنگ نظری، غلامی غربت و افلاس کم حوصلگی کی لعنتوں میں گرفتار ہیں۔

بزم مسلم از چراغ غیر سوخت　　مسجد او از شرار غیر سوخت

از سوادِ کعبہ چوں آہو رمید ناوکِ صیاد پہلوکش درید

اقبال ان کی اس کس مپرسی اور زبوں حالی سے دل تنگ ہو، کہ جو لوگ کبھی موت کو نگاہ میں نہیں لاتے تھے اب وہی اس کے خوف سے پیلے پڑے جا رہے ہیں اس لئے کہ اپنی حقیقت کو بھول گئے۔ وہ انھیں خطاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر موت ہی کا خوف ہے تو اس سے نجات کی صورت یہ ہے۔

بخود باز آ، خودی را پختہ تر گیر اگر گیری، پس از مردن نہ میری

اور پھر مشورہ دیتا ہے کہ خود کو چھوڑ کر دوسروں پر بھروسا نہ کرو۔ احسان مندی اور منت کشی جیتے جی کا عذاب ہے

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہِ دیگراں رفتن عذاب است

تم نے اپنی بلند حوصلگی کھو دی تمھیں اپنے اوپر بھروسہ نہ رہا۔ یہی وجہ ہے کہ جنھوں نے تمھارے سامنے سرِ تسلیم خم کیا تھا، آج تم ان کے خوف سے لرزاں ہو۔ اپنی شیر افگن فطرت ترک کر دی۔ اور اب بکریوں سے ڈرنے لگے ہو۔ خود اعتمادی کی جگہ اب تمھارے دلوں میں اندیشۂ زیاں لے لی۔ ورنہ تم اس نوبت کو نہ پہنچتے۔

دلِ بے باک را ضرغام رنگ است دلِ ترسندہ را آہو پلنگ ست
(شیر) (بکری)
اگر بیمے نداری بحر صحرا است اگر ترسی بہر موجش نہنگ ست

مسلمانوں کی زرطلبی پر لعنت ہیں اور ان کو سیم و زر کی حقیقت سے آشنا کرتا ہے کہ جس کو تمھاری ذات سے شرف حاصل ہوا، تم خود اس کے مرید ہونا چاہتے ہو؟

اگر کردی نگہ بر پارۂ سنگ ز فیضِ آرزوئے تو گہر شد
بہ زر خود را مسنج اے بندۂ زر کہ زر از گوشۂ چشمِ تو زر شد

کائنات میں جہاں اور چیزیں تھیں، وہاں ذرا چمکتا ہوا پتھر کا ایک ٹکڑا یہ لعل بھی تھا جسے انسان کی نگاہ قدر شناس نے لعل بنایا اور اس کی قدر تسلیم کی، مگر انقلاب دیکھئے کہ وہی حقیر سا ٹکڑا اب خود انسان کو انسان بنانے کا مدعی ہے، کچھ نہیں انسان نے جب اپنی قدر کھو دی تو لازمی طور پر اسے دوسروں کا

محتاج ہونا پڑا

توقدر خویش ندانی ، بہار تو گیرد　　　دگر نہ لعل درخشندہ پارہ سنگ است

اقبال کے نزدیک شیوۂ مردانہ اپنی دنیا آپ تعمیر کرنا ہے ۔ غیروں کی ہمت و مردانگی پر اچھلنا کم حوصلگی ہے ۔ پھر دوسروں کا ٹھکانا ہی کیا ۔ آج کوئی دوست ہے ۔ ممکن ہے کل نہ رہے ۔ شمع کی گرمی سے حرارت زندگی آخر کب تک جس کی کل زندگی ایک رات سے سوا نہیں ۔ پروانے کو دیکھئے رات بھر خوب اچھلتا کودتا ہی صبح کو جب شمع بجھ جاتی ہے تو اس کی زندگی بھی ختم ہو جاتی ہے ۔ زندگی کی خواہش ہو تو خود جلنا سیکھئے اور اپنے سوز دروں سے حرارت حاصل کیجئے ۔ کہ یہ گرمی اپنی حیات تک نور ہے ۔

دلا نارائی پروانہ تا کے　　　نگیری شیوہ مردانہ تا کے
یکے خود را بسوز خویشتن سوز　　　طواف آتش بیگانہ تا کے

بطوف شمع چو پروانہ زیستن تا کے　　　ز خویش اے ہمہ بیگانہ زیستن تا کے

ایک دوسری جگہ چاند کی روشنی سے اپنی تاریک رات کو روشن کرنے کو معیوب قرار دیتا ہے یہاں بھی غیر کا اعتبار نہیں ، کہ چند دن ہے ، پھر نہیں ۔

اگر آگاہی از کیف و کم خویش　　　یکے تعمیر کن از شبنم خویش
دلا دریوزۂ مہتاب تا کے　　　شب خود را برافروز از دم خویش

خود شناسی جہاں دنیاوی زندگی کی کامیابی کا راز ہے وہاں حصول معرفت کا بھی واحد ذریعہ ہے اس نکتے کو تو اقبال ہی نے نہیں ۔ دوسرے شعراء نے بھی واضح کیا ہے ۔ سرمد و منصور کے جذب کو موضوع بنا کر جتنے بھی شعر اردو فارسی میں کہے گئے ہیں سب اسی حقیقت کے ترجمان ہیں ۔ فرق اتنا نظر آتا ہے کہ ان لوگوں کے یہاں حصول معرفت کا ذریعہ ترک خودی ہے اور اقبال کے نزدیک احساس خودی ۔ مگر حقیقت دونوں نظریوں کی ایک ہے اس لئے کہ احساس خودی کے بغیر کسی کو ترک خودی کا خیال نہیں آسکتا ۔

حضرت جگر کا ارشاد ہے ۔

ہزار جاں گرامی فدا بر ایں نسبت
کہ میری ذات سے اپنا پتہ دیا تو نے

شاعر کی زبان سے یہ شعر اس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک وہ اپنی ذات سے آشنا نہ ہوجائے۔
اصل میں طالب و مطلوب کے درمیان جو چیز حائل ہوتی ہے" ہوش و خرد ہے" اقبال کو ہر جگہ اس سے شکایت ہے۔ وہ حجابِ جلوہ کا باعث کبھی احساس خودی کو نہیں ٹھہراتا، وہ نالاں ہے اور پناہ مانگتا ہے تو عقل سے

مرا ز دیدۂ بینا، شکایتِ دگر ست
کہ چوں بہ جلوہ درآئی حجابِ من نظر ست

رہ عاقلی رہا کن کہ بہ او تواں رسیدن
بہ دل نیاز مندے بہ نگاہِ پاک بازے

ایک دوسری جگہ اسی نظریے کو کہ عین معرفت تلاش خودی ہے۔ ترکِ خودی نہیں۔ نہایت صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی
کہ او پیداست تو زیرِ نقابی

تلاش او کنی جز خود نہ بینی
تلاشِ خود کنی جز او نہ یابی

اتنا ہی نہیں بلکہ وہ حصولِ معرفت کو علامت قرار دیتا ہے احساسِ خودی کی

نظر بخویش فروبستہ را نشاں این ست
دگر سخن نہ سراید ز غائب و موجود

اپنی ذات کو سمجھ لینا عین معرفت ہے۔ اپنی ذات کو سمجھے بغیر اس کی تمنا کرنا گداگری ہے۔ سائل اگر بے نیاز نہیں، تو اس کے سوال کی تکمیل کا انحصار معطی کی رضا پر ہوتا ہے۔ لیکن ایک درویش جو اپنی ذات پر قانع ہے اور دوسروں سے بے نیاز، تو اسے در بدر بھٹکنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لوگ اس کے یہاں خود جاکر نذریں پیش کرتے ہیں۔ انہیں حضرت موسیٰ کو ان کی اسی گدایانہ آرزو نے دیدہ پر طعنہ دیتا ہے اور انسان کی معیاری سیرت کو چند الفاظ میں واضح کر دیتا ہے۔

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور
کہ جان تو ز خود نامحرمے ہست

قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

فلسفۂ حیات کے اسلامی پہلو کو " خدا ہم در تلاش آدمے ہست" میں کس خوبی سے واضح کیا ہے یہیں اسلامی

فلسفۂ زندگی کی روح لارہبانیت بھی نمایاں ہو جاتی ہے، عین عبادت دنیا و ما فیہا سے بے نیازی نہیں بلکہ وابستگی ہے اسی اجمال کی تفسیر ایک دوسرے شعر میں کی ہے۔

خودی تعمیر کن در پیکرِ خویش　　　چو ابراہیم معمارِ حرم شو

سخت کوشی و عمل

اقبال فلسفۂ سخت کوشی کا پیغمبر ہے اور اسے وہ انسان کی ذہنی، سماجی، فوجی تہذیبی اور ان تمام چیزوں کی نشو و ارتقا کا باعث ٹھہراتا ہے۔ جو موجودہ دور کو متمدن بناتی ہیں۔ اپنے ایک انگریز دوست کے خط کے جواب میں لکھتا ہے "تصادم انسان کی بقائے شخصی اور زندگی کے علو و ارتقا کے لئے نہایت ضروری چیز ہے۔ اسی لئے میں عمل کی تمام صور مختلف کو جس میں تصادم و پیکار بھی شامل ہے ضروری سمجھتا ہوں[۵۱]" یہاں سوال یہ اٹھتا ہے جیسا کہ یورپ کے ایک عالم مسٹر ڈکنسن کا خیال ہے کہ کیا اقبال کے نزدیک دورِ حاضر کی وہ تمام مادی جد و جہد مستحسن ہے جس نے دنیا کو عرصہ محشر بنا رکھا ہے؟ اس سوال کا جواب اقبال کے شعروں میں تو موجود ہی ہے کہ انسان کی جد و جہد اسلامی تخیل حیات کی پابند ہونی چاہیے۔ مزید وضاحت کے لئے خود اسی کا جواب سن لیجئے۔

"مسٹر ڈکنسن کے نزدیک میں نے اپنی نظموں میں جسمانی قوت کو منتہائے اعمال قرار دیا ہے۔ انہیں اس بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں روحانی قوت کا قائل ہوں لیکن جسمانی قوت پر یقین نہیں رکھتا جب ایک قوم کو حق و صداقت کی حمایت میں دعوتِ پیکار دی جائے تو میرے عقیدے کی رو سے اس دعوت پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے لیکن میں ان تمام جنگوں کو مردود سمجھتا ہوں جن کا مقصد محض کشور کشائی اور ملک گیری ہو[۵۲]"

اس کے پیام کے چند شعر ملاحظہ ہوں جو شاعر مشرق نے مغرب کو دیا ہے۔ اس میں اس نے یورپ کی تہذیب کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے

۵۱　نیرنگ خیال اقبال نمبر

۵۲　نیرنگ خیال اقبال نمبر صفحہ ۵

یورپ نے اپنی جاہلیت سے نجات پانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ قدرت تک کو تو اپنے قبضے میں کر لیا مگر اس کے نسخے اس کے درد کا درمان کر سکے؟ اقبال کے نزدیک اس کی زندگی تاریک سے تاریک تر ہو گئی اور اس کی تمام تدبیریں باطل اور بے سود

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری ۔۔۔ عجب این ست کہ بیمار تو بیمار تر ست

یورپ کی تمام جدوجہد کا حاصل یہ ہوا۔

عشق گردید ہوس پیشہ و ہر بند گسست ۔۔۔ آدم از فتنۂ او صورت ماہی در شست

رزم بر بزم پسندید و سپاہے آراست ۔۔۔ تیغ او جز بہ سر و سینۂ یاراں ننشست

رہزنی را کہ بنا کرد جہانبانی گفت ۔۔۔ ستم خواجگی او کمر بندہ شکست

بے حجابانہ بہ بانگ دف و نے می رقصد ۔۔۔ جامے از خون عزیزاں تنک آید بدست

مگر جدوجہد، عمل اور زندگی کا مقصد اقبال کے نزدیک وہ نہیں جو یورپ نے سمجھا ہے۔ بلکہ وہ انسان میں صولت اور شاہین جگری اس لئے دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ اپنے فرض منصبی کی تکمیل کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اس کا فرض کیا ہے۔ سنیئے۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر ۔۔۔ بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں

وقت آنست کہ آئین دگر تازہ کنیم ۔۔۔ لوح دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

دل از منزل تہی کن پا بہ رہ دار ۔۔۔ نگہ را پاک مثل مہر و مہ دار

متاع عقل و دیں با دیگراں بخش ۔۔۔ غم عشق از بدست افتد نگہ دار

بیا اے عشق اے رمز دل ما ۔۔۔ بیا اے کشت ما، اے حاصل ما

کہن گشتند این خاکی نہاداں ۔۔۔ دگر آدم بنا کن از گل ما

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا ۔۔۔ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اور اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر وہ مختلف پیرایوں میں زندگی کے اس اصول کو واضح کرتا ہے اس باب میں وہ ابلیس کے نظریے کو مستحسن قرار دیتا ہے۔ جس نے جنت کی بے عمل زندگی کے مقابلے میں دنیا کی پرخطر

زندگی کو ترجیح دی اور آدم کو بھی اسی راستے پر لایا۔ اقبال نے حقیقی زندگی کے اصولوں کو اس کی زبان میں کس خوش اسلوبی سے باندھا ہے

زندگی سوز و ساز بہ ز سکون دوام　　فاختہ شاہیں شود از تپش زیر دام
ہیچ نیاید ز تو غیر سجود نیاز　　خیز چو سرو بلند اے بعمل نرم گام
کوثر و تسنیم برد از تو نشاط عمل　　گیر ز مینائے تاک بادۂ آئینہ فام
زشت و نکو زادۂ وہم خداوند تست　　لذت کردار گیر گام بنہ جوئے کام
خیز کہ بنمایمت مملکت تازۂ　　چشم جہاں بین کشا بہر تماشا خرام
قطرۂ بے مایۂ گوہر تابندہ شو　　از سر گردوں بیفت گیر بدریا مقام
تیغ درخشندہ شو جان جہانے گسل　　جوہر خود را نما آئے بروں از نیام
بازوئے شاہیں کشا خون تذرواں بریز　　مرگ بود باز را زیستن اندر کنام
تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل　　چیست حیات دوام سوختن ناتمام

مگر ابلیس کا نظریہ بہرحال ابلیس کا نظریہ ہے۔ جس کا مقصد زندگی فریب دریاکاری ہو اس لئے اقبال زندگی کی اس بے پناہ قوت کے ساتھ "راہ صواب" کو شرط قرار دیتا ہے کہ غلط راستے پر پڑ کر انسان کے بھی ابلیس بن جانے کا امکان ہے۔ حضرت آدم نے حضور باری میں اپنی اسی غلطی (بے راہ روی) کا اعتراف کیا تھا۔ جو شیطان کی فریب دہی کا نتیجہ تھی۔

گرچہ فسونش مرا برد ز راہ صواب　　از غلطم درگذر عذر گناہم پذیر

اور پھر مدد کے لئے دعا مانگی تھی۔

رام نگردد جہاں تا نہ فسونش خوریم　　جز بکمند نیاز ناز نہ گردد اسیر
تا شود از آہ گرم ایں بت سنگیں گداز　　بستن زنار او بود مرا ناگزیر

جس زندگی میں محض راحت ہی راحت ہو۔ مشکلوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اقبال اس زندگی کو بے کیف اور اس دنیا کو رزدن کہتا ہے۔

فریبی اندر جہانے کور ذوقے   کہ انساں دارد و شیطاں نہ دارد

چنانچہ جنت کی بے عمل زندگی اسے نہیں بھاتی جہاں غم کی خلش مفقود ہے۔

واں عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے   نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

اس لئے ایسی کائنات ناصبور صبر۔ قرار نہیں چاہتا کہ یہ اس کے لئے موت ہے۔

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نسازد   دل ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوبروئے   تپد آں زماں دل من پئے خوبتر نگارے

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے   سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

طلبم نہایت آں کہ نہایتے نہ دارد   بہ نگاہ ناشکیبے بہ دل امیدوارے

اس ذیل میں بھی اقبال فرشتوں پر رشک کرتا ہے جنھیں "وصل" کا سکون حاصل ہے مگر وہ نہیں جانتے کہ اس سکون کی قدر وقیمت کیا ہے کہ اس کا معیار "ہجر" اُن کے یہاں نہیں۔

بگو جبریل را از من پیامے   مرا آں پیکر نوری ندادند

ولے تاب و تب ایں خاکیاں بیں   بنوری ذوق مہجوری ندادند

اسی طرح خضر کے مقابلے میں سکندر کی زندگی کو ترجیح دیتا ہے جس کی تمام زندگی خطرات کے مقابلے میں گذری جو لطف اس زندگی میں سکندر کو حاصل تھا۔ خضر کو کہاں نصیب!

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت   شریک سوز و ساز بحر و بر شو

تو ایں جنگ از کنار عرصہ بینی   بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

سخت کوشی اور جہد کا اصول اقبال کو عقاب کی زندگی میں اپنی اصل صورت میں نظر آتا ہے اور اس نے عقاب کی زندگی کو اپنی آئیڈیل زندگی سے ہم آہنگ دیکھ کر اسے بلبل کی جگہ اپنی شاعری کا ہیرو بنایا ہے اور جہاں زندگی دشوار کا مجسم نمونہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ وہاں عقاب کو مثال میں پیش کرتا ہے۔ جس کے نزدیک زندگی کا معیار یہ ہے

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام   سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزہ ہے اے پسر — وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

تن نرم و نازک بہ تیہو گذار — رگ سخت چوں شاخ آہو بیار

نصیب جہاں انچہ از خرمی ست — ز سنگینی و محنت پر دمی ست

چہ خوش گفت فرزند خود را عقاب — کہ یک قطرہ خوں بہتر از لعل ناب

خیابانیوں سے ہو پرہیز لازم — ادائیں ہیں ان کی بہت دلبرانہ

ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری — جواں مرد کی ضربت غازیانہ

یہ پورب یہ پچھم چکوروں کی دنیا — مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں — کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اور اس زندگی کا عکس یہ ہے۔

تنش از سایۂ بالِ تدروے لرزہ می گیرد — چو شاہیں زادہ اندر قفس با دانہ می سازد

اس استعارے میں مسلمان کی اصل زندگی اور اس کی موجودہ زندگی کی کیسی زندہ تصویر کھینچی ہے
زندگی حکمت و فلسفہ اور غور و فکر میں نہیں ملتی بلکہ اس کا اصل ماخذ سوز و تپش ہے۔
کتاب کے ایک کیڑے اور پروانے کا ایک مکالمہ ہے جس میں اس حقیقت کو نہایت موثر انداز
میں ادا کیا ہے۔

شنیدم شبے در کتب خانۂ من — بہ پروانہ می گفت کرم کتابی

بہ اوراق سینا نشیمن گرفتم — بسے دیدم از نسخۂ فاریابی

نہ فہمیدہ ام نکتۂ زندگی را — ہماں تیرہ روزم ز بے آفتابی

نکو گفت پروانۂ نیم سوزے — کہ ایں نکتہ را در کتابے نیابی

تپش می کند زندہ تر زندگی را — تپش می دہد بال و پر زندگی را

طلب اگر حقیقی ہو تو انسان جہاں جائے اور جس چیز کو دیکھے اسی میں مطلب نظر آتا ہے اقبال
زندگی کا طالب ہے اُسے کائنات کے ذرے ذرے میں زندگی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو موج دریا

سے زندگی کا سبق کس طرح اخذ کرتا ہے۔

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم | ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت | ہستم اگر می روم گر نہ روم نیستم

اور کچھ یہی سبق انسان کو دیتا ہے جس کی زندگی اس کی سکون طلبی سے بے کیف ہو گئی ہے

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا | نوائے زندگانی نرم خیز ست
بدریا غلط و با موجش در آویز | حیات جاوداں اندر ستیز ست
دوام ما ز سوزِ ناتمام است | چو ماہی جز تپش بر ما حرام ست
مجو ساحل کہ در آغوش ساحل | تپیدیک دم و مرگِ دوام ست

میدانِ عمل میں حصولِ جزا، افسردگی اور بے عملی کا محرک ہوتا ہے۔ اس سے انسان میں عمل کی وہ گرمی اور جستجو کی وہ تپش باقی نہیں رہتی جو زندگی میں تحریک پیدا کرتی ہے۔ بلکہ سکون اس کی بالیدگی کو روک دیتا ہے۔

دریں گلشن پریشاں مثل بوئم | نمی دانم چہ می خواہم چہ جوئم
برآید آرزو یا بر نیاید | شہیدِ سوز و سازِ آرزوئم

یہی حال سفر کا ہے کہ منزل ذوقِ خرام کو پامال کر دیتی ہے۔ مگر طلبِ منزل ہی سفر کی نشاط آمدی کی محرک ہوتی ہے۔ اس لئے اسے بحال رکھنے کے لئے اقبال قصداً ایسا رستہ اختیار کرتا ہے جو منزل کو جاتا ہی نہیں۔

مرا صاحب دلے خوش نکتہ گفت | ز منزل جادۂ پیچیدہ خوشتر

زیارت کعبہ کا شوق کسے نہیں ہوگا؟ مگر اقبال کو کیا کہئے کہ وہ اس سعادت کو اپنی جفا طلب فطرت پر قربان کر دیتا ہے۔ محض اس لئے کہ اس راہ میں خطرہ نہیں، جس سے الجھنا زندہ دلوں کا کیش ہے

بہ کیش زندہ دلاں زندگی جفا طلبی ست | سفر بہ کعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر ست

وہ سخت کوشی اور سوزِ دوام کی اسی نعمت غیر مترقبہ پہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور خوش ہے

شادم کہ عاشقاں را سوز دوام دادی — درماں نیا فریدی آزار جستجو را

اور پھر اسی لازوال دولت کے لئے حضور باری میں دست بدعا ہے۔

کانٹا وہ دے کہ جس کی کھٹک لازوال ہو — یارب وہ درد جس کی کسک لازوال ہو

اصول انسانیت آیت کریمہ الملک للّٰہ وہ ابدی قانون ہے جس کی روگردانی سے کشت و خون، فتنہ وفساد، بغض وعناد، غرض ہر وہ لعنت پھوٹ نکلتی ہے جو جماعت انسانی کے لئے ننگ ہے۔ تاریخ نے ہر دور میں اس تلخ حقیقت پر خون کے آنسو بہائے ہیں اور دنیا کو آج بھی جب کہ اسے علم و حکمت اور "تہذیب و تمدن" کی معراج حاصل ہے اس مہلک مرض سے نجات نہیں، اور زندگی کے ہر مرحلے میں جنگ و جدال کا خطرہ لگا رہتا ہے۔

اسی طرح انسان نے اسلام کے نظریۂ جماعت کُلُّ النَّاسِ مِنْ اَبْنَاءِ اٰدَمَ و آدم من طین کو بھی جس کی وضاحت معلم اخلاق حضرت سعدی نے "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" کے بلیغ الفاظ میں کی تھی، بھلا دیا۔ ارض اللہ کی تقسیم کے ساتھ ساتھ انسانوں میں بھی رنگ و نسل کے امتیازات پیدا ہوگئے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان باہم ہی نہیں، بھائی بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے اور یہ رنگ کچھ ایسا گہرا ہوا کہ ایک جماعت میں بھی آپس میں تنازعے شروع ہوگئے اور اب رنگ و نسل کی بجائے معیار امتیاز لباس اور طرز زندگی قرار پایا۔ اقبال اپنے "مکمل انسان" کی سیرت میں ایک ہمہ گیر نظریہ انسانیت (HUMANITY) کو بھی کارفرما دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کے بغیر اس کی نظر میں وسعت اور اس کے فیصلوں میں انصاف کا امکان پیدا نہیں ہوتا وہ وطنیت کے جذبات سے مبرا ہے اور نہایت صاف صاف الفاظ میں اپنی رائے کا اعلان کرتا ہے۔

ہنوز از بند آب و گل نہ رستی — تو گوئی رومی و افغانیم من

من اول آدم بے رنگ و بوئم — ازاں پس ہندی و تورانیم من

اس کی شریعت میں رنگ و بو کا امتیاز نہیں ہے۔ ایک گہوارے کے پلے ہوؤں میں باہم امتیاز کیسا؟

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم | چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است | کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

مسلمان کو کہ اس کا مذہب کسی "مسلمانستان" کا مذہب نہیں۔ بلکہ بنی نوع انسان کا مذہب ہے امتیاز نسل و نسب زیب نہیں دیتا۔ اقبال ایسے مسلمان کو کودک نفس کہتا ہے۔ اور اسے بتاتا ہے کہ "تیرا عربی و حجازی بننا خود عرب و حجاز کے لئے باعثِ شرم ہے۔ تیرا مسلک تو مسلمان بننا ہے۔

تو اے کودک منش خود را ادب کن | مسلمان زادہ ترکِ نسب کن
برنگِ احمر و خون و رگ و پوست | عرب نازد اگر ترکِ عرب کن

اقبال یورپ کی موجودہ مادی ترقیوں کا اسی وجہ سے مخالف ہے کہ اُن کے یہاں انسان بحیثیت انسان نہیں مانا جاتا۔ بلکہ بحیثیت قوم و وطن تسلیم کیا جاتا ہے۔ دوسری جگہوں کے انسان کو وہ انسان نہیں سمجھتے اور انھیں غلام اور مطیع کرنے میں انھیں قطعاً دریغ نہیں ہوتا وہ جمعیت اقوام کو جسے آج کل دنیا میں نظریہ انسانیت کی تبلیغ و اشاعت کا مشن کہا جاتا ہے۔ کفن چوروں کی ایک انجمن سمجھتا ہے جو مُردوں کو قبر میں بھی سانس نہیں لینے دیتے۔

برفتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کہن | دردمندانِ جہان طرحِ نو انداختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند | بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

ایک جگہ جماعت کے اسلامی تخیل اور مغربی نظریہ کو یوں ادا کیا ہے

عرب کے سوز میں سازِ عجم ہے | حرم کا راز توحید امم ہے
تہی وحدت سے ہے اندیشۂ غرب | کہ تہذیبِ فرنگی بے حرم ہے

یہ ہیں زندگی کے چار اصول جن پر اقبال انسان کی سیرت کی بنیاد رکھتا ہے اور اسے یقین ہے کہ اسی اصول پر چل کر انسان دنیا کو گوناگوں مصائب سے نجات دلا سکتا ہے۔ جس کے پرچم عمل پر لکھا ہوگا۔

یقیں محکم، عمل پیہم محبت فاتح عالم | جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال پیغمبر حیات ہے۔ اور حرمان و یاس سے ناآشنا۔

نا امید از آرزوئے پیہم ست   نا امیدی زندگانی را سم ست

زندگی را یاس خواب آور بود   ایں دلیل سستی عنصر بود

مگر ہے انسان اور وہ بھی ایک غلام قوم کا فرد۔ اس لئے امت کی غفلت شعاریوں سے کبھی کبھی مایوس بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہندوستان کے متعلق کہتا ہے۔

بہ خاک ہند نوائے حیات بے اثر ست   کہ مردہ زندہ نہ گردد ز نغمۂ داؤد

مگر اس وقت امید اس کی دستگیری کرتی ہے وہ پھر تازہ دم ہو جاتا ہے اور یوں گویا ہوتا ہے۔

مجھے فطرت نوا پر پے بہ پے مجبور کرتی ہے   ابھی محفل میں ہے شاید کوئی درد آشنا باقی

امثالُ القرآن

گذشتہ سے پیوستہ

الم تر کیف ضرب اللّٰہ مثلاً کلمۃً طیبۃً کشجرۃٍ طیبۃٍ اصلہا ثابتٌ وفرعہا فی السماء تؤتی اکلہا کل حینٍ باذن ربہا ویضرب اللّٰہ الامثال للناس لعلہم یتذکرون۔ (سورہ ابراہیم پارہ ۱۳)

تم نے دیکھا کہ اللہ تعالیٰ کس طرح پاک کلمہ کی مثال بیان کرتا ہے؟ اس کی مثال اس پاک درخت کی سی ہے جس کی جڑ مضبوط و پائدار ہو اور اسکی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں وہ اپنے رب کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسی طرح لوگوں کیلئے مثالیں بیان کرتا ہے کہ وہ عبرت و نصیحت حاصل کریں

آیہ مذکورہ بالا میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے کلمہ طیبہ کو شجرہ طیبہ کے ساتھ تشبیہ دی جیسے شجرہ طیبہ سے ثمرات نافعہ پیدا ہوتے ہیں اسی طرح کلمہ طیبہ سے اعمال صالحہ کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ کلمہ طیبہ جب کسی انسان کے دل میں متمکن و جاگزیں ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال صالحہ کو بھی بارگاہ الٰہی میں درجہ قبولیت و منظوری حاصل ہوتا ہے۔ اگر کلمہ طیبہ پر اعتقاد و یقین نہ ہو تو کسی عمل صالحہ کو بھی درجہ قبولیت حاصل نہیں ہوسکتا۔ ایمان ایک شجرہ کی مثل ہے۔ اخلاص اور للّٰہیت نے اس کی جڑوں کو قلب مومن میں راسخ اور مضبوط کر دیا ہے۔ اس کی شاخیں توحید، رضا، تسلیم، صبر و شکر وغیرہ ثمرات آسمان تک پہنچ رہے ہیں۔ انسانی عقائد چونکہ یکساں درجے پر نہیں ہوتے جسب قوت و ضعف ایمان و مشاہدہ براہین و دلائل سے ان میں تفاوت ہونا ازبس ضروری ہے۔ اس تفاوت اعتقادی کے باعث اعمال بنی آدم بھی متفاوت ہوں گے۔ اسی تفاوت کے باعث بروز قیامت اور دنیا میں اہل ایمان متفاوت درجے پر نمودار ہوتے ہیں اور ہوں گے جیسے درخت کی تکمیل کے لئے جڑوں۔ تنے۔ شاخوں۔ پتوں۔ پھولوں اور پھلوں کی ضرورت ہے۔ ایسے ہی

ایمان کے لئے بھی ان سب چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایمان کی جڑ علم۔ معرفت اور یقین ہے اور اس کا تنا اخلاص وللٰہیت اور اس کی شاخیں اور فروع اعمال صالحہ ہیں اور اس کے ثمرات وہ اخلاقِ حسنہ اور صفات حمیدہ ہیں جو علم اخلاق میں مفصل طور پر ذکر کئے گئے ہیں۔ جیسے شجرہ کے بقا کے لئے ایسے مادے کی ضرورت ہے جو اس کے تغذیہ اور تنمیہ میں ممد ہو۔ ایسے ہی شجرۂ ایمان کے لئے بھی علم نافع عمل صالح اور ذکر و فکر کی دائماً ضرورت ہوتی ہے۔

شجر ایمان کے شیریں ثمر | اگر درخت سے اس کے ممد حیات مادہ تنمیہ اور تغذیہ کو ہٹا دیا جائے تو وہ درخت کسی نہ کسی وقت خشک اور مردہ ہو جایا کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی شکل بظاہر درختوں سی نظر آتی ہے مگر جن عوائد و فوائد کی اس سے توقع رکھی جاتی تھی وہ سب کے سب نیست و نابود ہو گئے۔ ایسا درخت سوا جلانے اور بھاڑ میں جھونکنے کے کسی کام میں نہیں لایا جا سکتا۔ شجرۂ اسلام سے اگر علم نافع کی تجدید اور عمل صالح کی تعمیل اور ذکر اور فکر کا مشغلہ ہٹا دیا جائے تو وہ شجرۂ ایمان بالکل اس مردہ درخت کی طرح بے سود ہو جائے گا۔ مسند امام احمد حنبلؒ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے ایک روایت مروی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے ان الایمان یخلق فی القلب کما یخلق الثوب فجددوا ایمانکم۔ باغبان اور کھیتی والا اپنی کھیتی کی حفاظت اور نگہبانی نہ کرے تو وہ آفات ارضیہ وسماویہ سے تباہ و برباد ہو جائیں گی۔ مومن قانت کے لئے بھی ضروری ہے کہ ہمیشہ اپنے ایمان اور اسلام کے درخت کو آفات موذیہ اور مفسدہ سے بچاتا رہے۔ جب کوئی باغیچہ لگایا جاتا ہے، یا کھیتی نافع کو بویا جاتا ہے تو عادت اللہ کے مطابق بہت سے گھاس پات اور غیر مفید بوٹیاں اور درخت اس کے ارد گرد اس سے غذا بانٹنے کے لئے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگر باغبان اور زمیندار کھیتی کی نگرانی اور صفائی نہ کرے گا اور غیر ضروری بوٹیوں اور درختوں کو نہ کاٹے گا تو غیر مفید درختوں اور گھاسوں کا غلبہ ہو جائے گا اور اس کا شجرۂ مقصود اور زرع مطلوب کمزور کالعدم یا بالکل ہی معدوم ہو جائے گا جیسا کہ کھیتی اور باغیچہ کی حفاظت اور بقا کے لئے دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔ کہ ان تک ان کے مادۂ حیات کو

پہنچایا جائے اور اجنبی درختوں اور گھاس پات کو نکال کر زمین کو صاف کیا جائے اسی طرح ایمان اور اسلام کے شجرہ کے گرد اگرد قلب مومن کی زمین میں مختلف قسم کی خواہشات اور گوناگوں گناہوں اور قسم قسم کے وساوس اور شبہات بھی پیدا ہو جایا کرتے ہیں۔ مومن کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ ہمیشہ اس قسم کے خیالات باطلہ و فاسدہ کے قلع قمع میں ساعی اور کوشاں رہے تاکہ یہ چیزیں اسکے ایمان کو نقصان پہنچا کر برباد نہ کردیں۔

ایمان کے نتائج | جس قدر زمین زیادہ صاف ہوتی ہے اور اس کو زیادہ نرم کیا جاتا ہے اور بہترین پانی سے اس کو سیراب کر کے اچھا تخم بویا جاتا ہے۔ اسی قدر پھل اور فصل عمدہ حاصل ہوتے ہیں۔ اسی طرح قلب مومن کی حالت ہے کہ وہ ہمیشہ امداد اعمال اور تدبر و تفکر کے استمرار کرنے سے اعلیٰ ثمراتِ ایمانی و منافع اسلامی حاصل کرتا رہتا ہے۔ اور اس پر کوئی ایسا وقت نہیں گزرتا کہ جس میں اس شجرۂ ایمان پر ثمرات مفیدہ نمودار نہ ہوتے ہوں۔ صحابہ کرامؓ کی سیرت اور ان کے حالات کو جب پڑھا جاتا ہے تو ان کے ایمان کی تکمیل ثمرات و نتائج سے بخوبی روشن و ہویدا ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ بدعات اور وساوس و خطرات نفسانی سے کس قدر گریزو نفرت کیا کرتے تھے۔ جن چیزوں کو آج ہم معمولی خیال کرتے ہیں اور ہماری توجہ بھی ان کی اصلاح کی طرف منعطف نہیں ہوتی، انھوں نے ایسی چیزوں پر اس شد و مد سے انکار کیا۔ جیسا آج کل کفر پر بھی کوئی اس درجہ انکار نہیں کرتا۔ انہیں شجرۂ ایمانی کی حفاظت اور اثرات مخالفہ سے اس کو بچانا از حد مطلوب تھا۔ تاکہ حقیقی ایمان اور اسلام کے ساتھ متصف رہیں۔ مگر رفتہ رفتہ زمانے کی نیرنگی نے یہ وقت دکھایا کہ جب ہم اپنے شجرۂ ایمانی کی طرف نظر کرتے ہیں۔ تو بعض اوقات اجزا رہی سرے سے مفقود نظر آتے ہیں گویا اصلھا ثابتٌ ہی نہیں رہا۔ محض ظاہر داری اور نمائش پر کام چلائے جاتے ہیں۔ فرعھا فی السماء کا بھی کہیں پتہ نہیں۔ کیونکہ اعمال صالحہ کا نباہنا اور اس کی پابندی ہمارے لئے باعث تکلیف و کسر شان ہے۔ تؤتی اکلھا کل حین کا تو ذکر ہی کیا۔ مدت العمر ہم صورت اعمال کی مشق اور ورزش کرتے رہتے ہیں اور جن منافع کی ان اعمال سے توقع کی جاتی تھی انکا

کوئی بھی اثر ہم میں نمودار نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہم نے ایمان کو ایسا اہم اور ضروری نہیں سمجھا جیسا کہ سمجھنا چاہیئے تھا۔ اندریں حالات نہ تو ہماری نمازوں میں وہ رنگ رہا جو ان الصلوٰۃ تنھیٰ عن الفحشآء والمنکر میں مذکور ہے اور نہ ہمارے حج وزکوٰۃ وروزے میں وہ کیفیت رہی جو کیوم ولدتہ امہ کا مصداق ٹھہرے۔ علیٰ ہذا القیاس دوسرے اعمال کو بھی بے نتیجہ و بے ثمر دیکھتے رہتے ہیں۔ بھلا جس عمل کو ہم اپنی خواہش وہوس کے مطابق ادا کریں اسپر کوئی شرعی اثر کیونکر مرتب ہوگا۔

کلمۂ خبیثہ سے مُراد | ازاں بعد اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے کلمۂ خبیثہ کا ذکر فرمایا جس کو شجرۂ خبیثہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔ جس کی جڑ نہ تو زمین میں قائم ہے نہ تنا نہ شاخیں نہ سایہ نہ ثمر ایسا ہی کلمۂ خبیثہ شرک۔ بدعت بداعمالیوں کا حال ہے۔ نہ تو اس پر کوئی اثر مفید مرتب ہوتا ہے اور نہ کسی بھلی بات کی طرف وہ رہنمائی کرتا ہے اور نہ ہی اس سے کسی خیر ومنفعت وبرکت کی امید کی جاسکتی ہے۔

کلمۂ خبیثہ سے مراد یہاں شرک ہے جس کو شجرۂ خبیثہ کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔ شرک کے لئے کوئی دلیل نہیں۔ تمام عالم میں نظر دوڑائیے۔ زمین آسمان کا مطالعہ کیجئے۔ بر وبحر کے حالات کو دیکھئے۔ سورج چاند ستاروں کی حرکتوں کو ملاحظہ کیجئے۔ اختلاف لیل ونہار کا معائنہ کیجئے کیفیات ترقیٔ حیوانات ونباتات کا غور سے مطالعہ کیجئے غرضکہ جس طرف بھی آپ دھیان یا توجہ کریں، بزبان حال لآ الٰہ الا اللہ کی شہادت کا نقارہ بج رہا ہے پھر شرک کی دلیل ہو ہی کیسے سکتی ہے جو اسے جائز و صحیح قرار دے۔ مشرکین کے اعمال پر کوئی صحیح نتیجہ مرتب نہ ہوگا۔

وَقَدِمْنَا اِلیٰ مَا عَمِلُوا مِن عَمَلٍ فَجَعَلْنٰہُ ھَبَآءً مَّنثُوراً۔ شرک کا کوئی بھی عمل صالح مابعد الموت اس کے لئے مفید و ممد نہ ہوگا۔ من کان یرید الحیٰوۃ الدنیا وزینتھا نوفّ الیھم اعمالھم فیھا وھم فیھا لا یبخسون۔ اولٰئک الذین لیس لھم فی الاٰخرۃ الا النار وحبط ما صنعوا فیھا وَبَاطِلٌ مَّا کانوا یعملون کے مطابق انکے

سارے اعمال آخرت میں بیکار ثابت ہوں گے۔

شرک کے لئے عقلی دلیل تو ہو ہی نہیں سکتی۔ نقلاً بھی شرک کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ تمام انبیاءؑ کی طرف توحید کی وحی کی گئی۔ وَلقد اوحیَ الیك والی الذین من قبلك لئن اشرکت لَیَحْبطَنَّ عَمَلُكَ وَلتکُونن من الخاسرین۔ اس پر شاہد ناطق ہے۔

(۵) اللّٰہ نور السمٰوات والارض مثل نورہ کمشکوٰۃ فیھا مصباح المصباح فی الزجاجۃ الزجاجۃ کانّھا کوکب دریٌّ یوقد من شجرۃٍ مبارکۃٍ زیتونۃٍ لاشرقیۃٍ وَّلا غربیۃٍ یکاد زیتھا یضیٓءُ وَلولم تمسسہُ نار۔ نورٌ علیٰ نور یھدی اللّٰہ وَلنورہٖ من یشآءُ وَیضرب اللّٰہ الامثال للناس وَاللّٰہ بکل شیٍٔ علیم۔

اس مثل کی تشریح میں لوگوں نے از حد کوشش کی اور اپنے اپنے خیال کے مطابق جو کچھ کسی کی سمجھ میں آیا لکھ دیا۔ بہت سے لوگوں نے تو اُسے تشبیہ مرکب کے ذیل میں درج کیا اور بعض نے تشبیہ مفرد میں داخل کیا۔ جس قدر تفاسیر میری نظر سے گذری ہیں کسی میں کوئی ایسی معتد بہ و مفید شے نظر نہیں آئی۔ جس پر طبیعتِ متجسّس قانع ہو سکے۔ بڑے بڑے ائمہ جب اس مثل کی تشریح پر پہنچے ہیں۔ تو اپنے قلم کو روک لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ کی تمثیلات کی پوری تشریح کے کرنے کے باوجود اس مثل کو ادھورا ہی چھوڑ کر کوئی دوسرا مضمون شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے اقوال کو اگر یہاں بالاستیعاب ذکر کیا جائے تو ایک پوری کتاب کی شکل بن جائے گی، لہٰذا جو کچھ میرے ناقص فہم میں آتا ہے عرض کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر غلط ہو تو ارباب فضل و کمال سے اس کی تصحیح کی امید کی جاتی ہے۔

قرآن حکیم میں دو ایسی سورتیں پائی جاتی ہیں جن کا نہایت ہی جبروت و سطوت سے عنوان سے آغاز ہوا ہے۔ اول سورہ نور سورۃٌ انزلناھا وفرضناھا۔ دوسری سورہ توبہ براءۃ من اللّٰہ ورسولہ الخ

اس شان جلالی و ہیبت الٰہی کو دیکھتے ہوئے انسان کو خوف اور ڈر طاری ہو جاتا ہے

کہ نہایت ہی شاہی شان سے حکم دیا گیا ہے۔ جس کا طرز دوسری سورتوں سے بالکل ہی جداگانہ و نرالا ہے۔ اس شانِ جلالی کو شانِ جمالی سے آمیزش کرنے کی غرض سے واللہ اعلم بالصواب ہر دو سورہ میں ایک ایسی آیت نازل فرمائی گئی ہے جو اس ہیبت اور خوف کو کچھ کم کر دے۔ اور بشارت کا ایک اعلیٰ نمونہ دکھا کر جلال کے ساتھ جمال کو بھی ملا دے۔ توبہ میں لقد جاءکم رسول من انفسکم الخ کو لایا گیا۔ نور میں اللہ نور السمٰوٰت والارض الخ کو نازل فرمایا گیا۔ انسان جب اپنے اخلاق و اعمال کو درست اور مہذب کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا نور اور تجلیات الٰہی اس کے سامنے نہایت ہی ہویدا اور آشکارا طور پر تجلّی اور جلوہ افروز ہونے لگتی ہیں۔ اس کے نور کی دنیا کے اندر کوئی نظیر یا مثال حقیقی طور پر پیش نہیں کی جا سکتی۔ مگر بغرض افہام و تقریب الی العقل کے لئے چند اشارے پیش کئے جاتے ہیں۔ یعنی اگر ایک طاقچہ فرض کیا جائے جس میں ایک بتی رکھی جائے بتی شیشے کے اندر ہو اور شیشہ خود ہی ایسا روشن اور منور اور صاف ہو جیسے آسمان کا روشن ستارہ اور اس بتی کو زیتون کے اس درخت کے تیل سے جلایا جائے جو نہ پہاڑ سے مشرقی جانب ہو اور نہ مغربی جانب۔ کیونکہ مغربی جانب والے کو صبح کے وقت سورج کی گرمی نہیں پہنچ سکتی اس لئے اس کے پھل ناقص اور ناتمام رہتے ہیں اور مشرقی جانب والے کو بعد از دوپہر سایہ آجاتا ہے۔ سایہ کے باعث اس کے پھلوں کو پورے طور پر نشوونما اور پختگی حاصل نہیں ہوتی۔ جب عین پہاڑ کے وسط میں کوئی زیتون کا درخت ہوگا۔ تو تمام دن اسے باقاعدہ سورج کی گرمی اور مناسب ہوا پہنچتی رہے گی اور پہاڑ سے جانب شرق و غرب ہونے کے باعث جو حرارت کی حدّت و شدّت زمین کے اجزا ارکی آمیزش کی وجہ سے اسکو پہنچا کرتی تھی اس سے بھی وہ محفوظ رہے گا۔ ایسے درخت کا جب تیل نکالا جائے گا تو بغیر اس کے کہ اسے آگ سے سلگایا جائے خود بخود ہی روشنی کرنے پر آمادہ اور قابل ہوتا ہے۔ اگر اس کو آگ سے سلگایا جائے تو نور علیٰ نور کا کام دے گا جیسا منور چراغ ہر ذی بصر کو راہ دکھانے میں مدد دیتا ہے اور بھولنے بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا نور اور اس کی تجلیات دنیا

کو رہنمائی اور ہدایت کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ اجزائے مثل کو ممثل بہ کے اجزاء سے تطبیق دینے کی ضرورت نہیں اسے بطور تمثیل مرکب سمجھنا چاہیئے۔ جن لوگوں نے اس تکلیف میں پڑکر قسم قسم کی توجیہیں اور تاویلیں کیں ان کی چنداں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہر ایک مثال کے لئے ممثل بہ مخصوص کی تلاش کرنا بے سود ہے۔ غرض مثل کی طرف توجہ کرنے کی ازبس ضرورت ہے بعض اوقات انسان اس الجھن میں پڑکر اصلی مقصد سے دور ہو جاتا ہے۔ اہل تصوّف نے اس کی تشریح میں اپنے مسائل صوفیانہ کو کام میں لیا اور فلاسفہ نے مراتب نفس ناطقہ کی تشریح کو اس آیت سے ثابت کیا۔ جو غالباً کلام الہٰی کا مقتضاء اور منشاء نہ ہوگا۔ نورٌ علےٰ نور۔ کی تفسیر میں قرآن اور ایمان کا جو ذکر کیا گیا ہے اگرچہ وہ واقعہ کے بالکل موافق اور مطابق ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ نورٌ علیٰ نور۔ میں یہی مراد ہو۔ بہرحال اس کے اختلاف اور اشکال میں کسی کو کلام نہیں۔ ہر کسی نے اپنے فہم کے مطابق جو کچھ سمجھ میں آیا بیان کردیا۔ ہر شخص ہماری دعا اور ذکر بالخیر کا مستوجب و مستحق ہے۔

(۶) والذین کفروا اعمالھم کسراب بقیعۃ یحسبہ الظمآن ماءً حتیّٰ اذا جاءہٗ لم یجدہُ شیئاً ووجد اللہ عندہٗ فوفاہُ حسابہٗ واللہ سریعُ الحساب او کظلمات فی بحرٍ لجی یغشاہ موج من فوقہٖ موج من فوقہٖ سحاب بعضھا فوق بعض اذا اخرج یدہٗ لم یکد یراھا ومن لم یجعل اللہُ لہٗ نوراً فما لہٗ من نور۔

مذکورہ بالا آیات میں حق سبحانہ وتعالیٰ نے کافروں کے اعمال کے لئے دو مثالیں بیان فرمائیں ایک مثال بالسراب اور دوسری مثال ظلمات المتراکمہ۔ کیونکہ جو کافر ہدایت اور صراط مستقیم سے روگرداں ہوتے ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ اول وہ جو اس خیال میں مبتلاء ہیں کہ ہم ایک صحیح راستہ پر چل رہے ہیں۔ اور جو ہمارا مسلک ہے یہی مقصد تک موصل ہوگا لیکن جب حقیقت الامر کا انکشاف ہوتا ہے اور اشیا اپنے اصل رنگ میں نمایاں ہونے لگتی ہیں تو

انھیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم ایک غیر صحیح راستہ پر چل رہے تھے جو ہمارے مقصد اور غرض تک پہنچانے میں ہمیں مغالطہ میں ڈال رہا تھا جیسے کہ آجکل عام طور پر یہی حال ہے۔ اصحاب بدعت اور ہوا پرست لوگ اسی خیال میں مبتلا ہیں کہ ہم علم اور ہدایت کے طریق پر جادہ پیما ہیں مگر حقیقت کے انکشاف کے وقت انھیں یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ وہ کسی صحیح راستہ پر نہیں تھے اور ان کے اعمال و عقائد کی بعینہ یہی حالت ہو گی جیسے کسی چٹیل میدان میں کوئی پیاسا سراب کو دیکھ کر پانی خیال کرتا ہے اور اسی کو اپنا مادہ حیات اور زندگی تصور کرتا ہے۔ اور اسی تک پہنچنے کی سعی بلیغ کرتا ہے۔ مگر فی الحقیقت یہ خیال غلط اور بالکل غیر مطابق واقعہ ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ اسی طرح جو اعمال لغیر اللہ یا علیٰ غیر اللہ کئے جاتے ہیں عامل کے خیال میں وہ نافع اور مفید معلوم ہوتے ہیں حالانکہ وہ ایسے نہیں۔ ایسے ہی اعمال کے متعلق اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

وَقَدِمنا الیٰ مَا عملوا من عمل فجعلناہ ھبآءً منثورا

عمل کی قبولیت کے لئے دو شرطیں ہیں

(۱) اخلاص یعنی جو کام کیا جائے اس سے محض رضامندی و خوشنودی خداوندی مقصود ہو۔ ریاء و سمعہ مقصود نہ ہو۔ غیر اللہ کی رضامندی وغیرہ کا خیال نہ ہو۔

(۲) وہ کام مطابق لامر اللہ و موافق شرع شریف ہو اہل بدعۃ والجہل نے جو اعمال اپنے خیال ناقص میں صحیح سمجھے اور ان پر عمل پیرا ہوئے وہ رضائے الٰہی اور شریعت حقہ کے ماتحت نہ آسکے۔ لہٰذا ان کی وہ ہی مثال ہوئی جیسے کسی پیاسے نے سراب کو پانی تصوّر کر لیا۔ کفار دنیا میں اپنے مذاق کے مطابق عمل کر کے اس بات کے متوقع رہتے ہیں کہ ہمیں بعد از مرگ اپنے اعمال کی جزائے حسنہ ملے گی۔ مگر قیامت کے دن یا عالم برزخ میں نتیجہ بالکل اس کے برعکس برآمد ہو گا۔ ایک حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جہنم کو مخلوق کے سامنے لایا جائے گا۔ اس کی شکل بالکل سراب سی ہو گی۔ یہودیوں کے لئے کہا جائے گا۔ تم کس چیز کی پرستش کیا کرتے تھے وہ کہیں گے ہم عزیر ابن اللہ کی پوجا کیا کرتے تھے۔

جناب باری تعالیٰ کی طرف سے ارشاد ہوگا تم جھوٹ بولتے ہو اللہ کے لئے نہ کوئی بیوی ہے نہ کوئی اولاد ہے۔ پھر تم کیا چاہتے ہو وہ کہیں گے ہمیں پانی پلاؤ۔ پھر انھیں کہا جائے گا کہ پانی پی لو، تو وہ سب کے سب جہنم میں پانی کے خیال سے کود پڑیں گے۔ یہی حال عیسائیوں کے ساتھ بھی ہوگا۔ بعینہٖ اہل باطل کے اعمال بھی انھیں عین موقع پر دھوکا دے جائیں گے۔ جب اپنے اعمال کی پاداش کی انھیں اشد ضرورت ہوگی۔

(۳) دوسری مثال میں کفار کے اعمال کو ظلمات متراکمہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے حق اور ہدایت کو پہچانا۔ صحیح اور غلط راستے میں امتیاز کیا۔ باوجود واقفیت اور معرفت کے باطل راستے کو اختیار کیا۔ اس پر کئی قسم کے ظلمات چھاگئے۔ ظلمت طبع، ظلمت جہل ظلمت نفوس۔ ظلمت رسوم چاروں طرف سے انھیں تاریکیوں نے آکر گھیر لیا اور ہدایت کے راستے ان پر مسدود و بند کر دیئے گئے۔ جیسے کوئی شخص ایسے سمندر کی گہرائی میں ہو جس کا کوئی کنارہ نہیں۔ اور اوپر سے اسے آکر موجوں نے دبوچا ہو۔ اور پھر علاوہ اس کے اوپر سے بادلوں نے بھی تاریکی کے اضافہ کرنے میں امداد دی ہو۔ یہی حال ان کفار کا ہے جو جان بوجھ کر راہ خدا کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اور انھوں نے راہ ضلالت پر چل کر جو کام کیا وہ بغیر سرمایۂ حیات کے باطل کرنے کے کچھ فائدہ مند ثابت نہ ہوگا۔ کفار کی سابقہ دو قسموں سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اپنے اعمال کو جان بوجھ کر غیر صحیح طریق پر کرتا ہے یا بطور جہالت غیر صحیح اعمال کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسکے اعمال اسے کوئی فائدہ نہیں پہنچائیںگے۔

سورہ نور میں اللہ تعالیٰ نے گذشتہ مثال میں اپنے نور سے مستفیض ہونے کے لئے اصلاح اخلاق کا ایک نمونہ پیش فرمایا ہے۔ انسان بے انتہا اور بے پایاں کمالات اور اخلاق کا منبع اور مخزن ہے اس کے اخلاق سے ایک خلق عفت بھی ہے اس خلق کی تکمیل کے لئے سورہ نور میں تمام قوانین اور ضوابط بیان فرمائے ہیں جن مواقع سے انسان کی عفت کو نقصان یا صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ بطریق کمال ان کی بندش کر دی گئی۔ جیسا اس خلق کی تکمیل بطور نمونہ بیان

کی گئی ہے۔ اسی طرح جب انسان اپنے تمام اخلاق کو مکمل کر لیتا ہے۔ تو وہ اس قابل اور لائق ہو جاتا ہے کہ اب وہ نور الٰہی کے ساتھ اپنے تعلقات کو استوار کرے۔ خدا کے نور کی مثال اللہ نور السموات والارض الخ میں مومنین کے استبشار کے لئے پیش کی گئی ہے۔ جب نور الٰہی سے تعلق قائم ہو جاتا ہے تو اس وقت انسان میں یہ قابلیت پائی جاتی ہے کہ اسے خلافت الٰہیہ سے سرفراز کیا جائے۔ اسی مناسبت کے باعث اللہ تعالیٰ نے اسی سورہ نور میں فرمایا ہے وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا ومن کفر بعد ذالک فاولئک ھم الفاسقون۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں نے اپنے اخلاق کی درستی اور تکمیل سے جب بے اعتنائی کی خصوصاً خلق عفت اور اس کی حفاظت کو خیرباد کہہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی نعمت عظما، خلافت ارضی کو ان سے چھین لیا۔ باوجود اس مصیبت غلامی کے مسلمانوں کو تا حال اس کا انتباہ بھی نہیں ہوا۔ کہ وہ اپنے اخلاق کی درستی کی طرف متوجہ ہوں۔ وہ الٹا آزادی کی رو میں بہ کر یورپ کے عادات و اطوار میں اندھا دھند حصہ لے رہے ہیں جو دن بدن ان کو شاہراہ ترقی سے ہٹا کر قعر مذلت و غلامی کی زنجیروں میں جکڑ رہا ہے۔ اگر مسلمان صرف سورۂ نور ہی کے احکام اوامر و نواہی کے پابند ہو جاتے تو اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ پورا فرما کر انھیں خلیفۃ اللہ فی الارض سے سرفراز فرماتا۔ افسوس کہ ہمیں اپنی کھوئی ہوئی عظمت و اقتدار کا احساس بھی نہیں رہا اور نہ اس ذلت کے اسبابوں میں ہم نے کبھی غور کیا۔ جب مریض اپنے مرض سے تکلیف کو محسوس نہیں کرتا اور اسباب مرض کے زائل کرنے کا اسے خیال نہیں پیدا ہوتا۔ یا کسی ڈاکٹر و حکیم سے تشخیص مرض کے بعد نسخہ مناسبہ نہیں لیتا تو ایسے مریض کی صحت کا خدا ہی حافظ ہے۔ دنیا کے عقلمند ایسے نادان مریض کو کیا کہیں گے اور اسے کس لقب سے پکاریں گے۔ ہمارے پاس بھی

ایک نسخہ کیمیائی موجود ہے جس کو استعمال کر کے ہمارے اسلاف نے صحت کاملہ اور شفائے عاجلہ حاصل کر کے منازل ترقی کے ذروۂ اعلیٰ پر پہنچ کر اقوام عالم کو حیران و متعجب کر دیا. ایک ہم ہیں کہ وہی نسخہ ہمارے پاس موجود ہے اس کا استعمال کرنا تو بجائے خود رہا. اس کے پڑھنے سے بھی جی چراتے ہیں. اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرما کر ہمیں اپنے عیوب پر متنبہ فرما کر اصلاح کی توفیق بخشے۔

(۷) یا ایہا الذین آمنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم و لا تجسسوا و لا یغتب بعضکم بعضا ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتاً فکرھتموہ واتقوا اللہ ان اللہ تواب الرحیم۔ (سورہ حجرات پارہ ۲۶)

قیاس تمثیلی کی یہ بہترین مثال ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی ہتک عزت کر رہا ہے اور اس کی غیر حاضری میں اس کے متعلق ناپسندیدہ باتیں کر رہا ہے اور اس کے بھائی کو اس کا علم بھی نہیں کہ میرے بارے میں کیا کیا کہا گیا۔ اور وہ اپنی عزت بچانے کے لئے کوئی تدبیر کام میں نہیں لا سکتا۔ اس کی بعینہ یہی مثال ہے۔ جیسا کہ کوئی شخص اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا شروع کر دے۔ میّت کو نہ تو اپنے اجزاء کے کاٹے جانے کی خبر ہوتی ہے اور اگر بالفرض اسے علم بھی ہو تو وہ مدافعت پر قادر نہیں۔

اَخ کا لفظ بظاہر ترحم و مہربانی کو چاہتا ہے مگر گلہ کرنے والے نے اخوت کے مفہوم کو نہ سمجھا اور بے تحاشا درندوں کی طرح اپنے عزیز ترین رشتہ دار کو کاٹنا شروع کر دیا۔

لحم کے لفظ سے خاص بات کی طرف اشارہ ہے۔ عربوں کو لحم کے ساتھ بہ نسبت دوسری قوموں کے زیادہ محبت ہے۔ چنانچہ سیّد الطعام اللحم کا مقولہ اس پر شاہد ناطق ہے معتاب بھی غیبت کو نہایت ہی لذیذ اور دل پسند سمجھ کر اس کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیطان نے اس کے منہ میں کوئی لذیذ اور شیریں چیز ڈال دی ہے۔ جوں جوں غیبت میں بڑھتا جاتا ہے توں توں وہ گھل گھل کر اس کے پیٹ میں جاتی ہے۔

اور اس کی زبان اس سے چاشنی لیتی ہے۔ اگر مغتاب کو غیبت سے روکا جائے تو ایسا ہی اس کو بُرا معلوم ہوتا ہے جیسا کہ کوئی شخص رنگا رنگ کے مزے دار کھانوں سے ایسے وقت اٹھا دیا جائے جبکہ وہ اس کھانے سے سیر نہ ہوا ہو اور ابھی اس کی اشتہا باقی ہو۔ اس مثال میں غیبت کی کراہیت کو سامعین کے ذہن میں بٹھانا مقصود ہے۔ ایک محسوس مکروہ شے کو مشبہ بہ قرار دے کر غیر محسوس مُبصر کی کراہت کو ثابت کیا گیا۔ مشبہ بہ عام طور پر مسلم بین المتکلم والمخاطب ہوا کرتا ہے۔ یہاں پر بھی مردہ بھائی کا گوشت کھانا ایسا کریہہ اور ناپسندیدہ ہے جس میں کسی ذی فہم کو اختلاف نہ ہوگا۔

چونکہ غیبت ایک معمولی چیز سمجھی جاتی ہے۔ لوگ اسے کچھ بھی بُرا نہیں جانتے اگر روکا جائے تو کہہ دیتے ہیں کہ جو بات ہم فلاں شخص کی بابت کہہ رہے ہیں وہ واقعی اس میں موجود ہے وہ غیبت کا مصداق نہیں بن سکتی حالانکہ غیبت تو یہی ہے۔ اَنْ تَذْکُرَ اَخاکَ وراءَ الظھر وھو یکرھُہٗ ۔

اگر وہ شے اس میں نہ پائی جائے تو اس کو شریعت میں بہتان کہا جاتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں اس کی تصریح موجود ہے۔ اس عام غلطی کے ازالے کے لئے اللہ سبحانہ وتعالےٰ نے اس مثل کو ذکر فرمایا کہ اس کی کراہیت بھی مخاطبین کے ذہن میں بیٹھ جاوے۔

مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کا مسئلہ اگرچہ بظاہر غیبت کے رنگ میں ایک تمثیل سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا مگر ارباب بصیرت کے نزدیک تو یہ خود گوشت کی شکل میں حقیقۃً متشکل ہو جایا کرتا ہے۔ چنانچہ ایک حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرتؐ کے پاس دو عورتیں آئیں آپؐ نے فرمایا کہ تم سے گوشت کی بو آ رہی ہے۔ انھوں نے عرض کیا کہ ہم روزہ دار ہیں ہم نے گوشت نہیں کھایا۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا کہ تم نے ضرور گوشت کھایا ہے۔ آپؐ نے اُن سے جب قے کروائی تو ان کے پیٹ سے گوشت کی بوٹیاں نکلیں۔ بغرضِ مُسلم کو جب انھوں نے تناول کیا تھا وہ باتیں عالم مثال میں بصورت لحم متشکل ہو گئیں۔

جب کسی کے پاس صرف یہ تمثیل پیش کی جاے۔ تو اس کی غیبت کی کراہیت کا اعتقاد ہو جاتا ہے اگر کسی کو اس کا بھی یقین ہو جاے کہ عالم مثال میں یہ صورت بھی اختیار کرےگی تو وہ اعتقاد بالضرور حق الیقین کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔

(۸) ضرب اللہ مثلاً للذین کفروا امرأۃ نوح وامرأۃ لوط کانتا تحت عبدین من عبادنا صالحین فخانتاھما فلم یغنیا عنھما من اللہ شیئاً وقیل ادخلا النار مع الداخلین وضرب اللہ مثلاً للذین آمنوا امرأۃ فرعون اذ قالت رب ابن لی عندک بیتاً فی الجنۃ ونجنی من فرعون وعملہ ونجنی من القوم الظالمین ومریم ابنۃ عمران التی احصنت فرجہا فنفخنا فیہ من روحنا وصدقت بکلمات ربھا وکتبہ وکانت من القانتین۔ (سورہ تحریم پارہ ۲۸)

کافروں کے لئے اللہ تعالیٰ نوح اور لوط (علیہما السلام) کی عورتوں کی مثال بیان کرتا ہے۔ یہ دونوں، ہمارے دو نیک بندوں کے تحت میں تھیں پس انھوں نے خیانت کی اور کسی چیز نے ان کو اللہ کی گرفت سے نہ بچایا اور ان سے کہا گیا کہ آگ میں داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی داخل ہو جاؤ۔ اسی طرح ایمان والوں کے لئے بھی اللہ تعالیٰ فرعون کی عورت کی مثال بیان کرتا ہے کہ اس نے کہا اے میرے پروردگار! تو اپنے فضل سے جنت میں میرا گھر بنائے اور مجھے فرعون اور اس کی بدکرداریوں سے نجات دے اور ظالموں سے مجھے بچا۔ اور عمران کی بیٹی مریم جس نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا پس ہم نے اس کو اپنی روح عنایت کی اور اس نے اپنے رب کے کلمات اور کتابوں کی تصدیق کی اور وہ اطاعت گزاروں میں سے تھی۔

آیات مذکورۂ بالا میں تین مثالیں ذکر فرمائی گئی ہیں۔ ایک کفار کے لئے اور دو مومنین کے لئے۔ کفار کی مثال سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ کفار تو اپنے کفر باللہ و بالرسول اور اس کے دوستوں سے عداوت رکھنے کے باعث بہرحال معذب اور سزایاب ہوں گے۔ انکا مومنین کے ساتھ اگر کوئی رشتہ یا پیوند یا ناطہ داری کا کوئی تعلق ہو تو وہ بروز قیامت کوئی فائدہ نہ دیگا۔

اگر رشتے ناطے کے تعلقات یا نکاح کا پیوند باوجود عدم ایمان مفید ہوتا تو نوح علیہ السلام، اور لوط علیہ السلام کی بیویوں کو ضرور نفع پہنچتا۔ جب ان اولوالعزم نبیوں کے ساتھ تعلق ہوتے ہوئے انھیں کوئی نفع نہ پہنچ سکا تو کسی دوسرے کو کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ کسی بزرگ یا کسی رشتہ دار کے نیک ہونے پر اعتماد کر کے اپنی اصلاح اور بہبودی کو فراموش کر دے کہ مجھے اعمال صالحہ یا اصلاح کی ضرورت نہیں کیونکہ میرے اسلاف اور متعلقین خیرات مبرات یا اعمال صالح کے بہت سے ذخائر پیش کر چکے ہیں۔ ان حالات میں اپنی رشتہ داری کے تعلقات کے باعث مجھے نجات دلائے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مثال سے اس امید خام کو غلط اور غیر درست قرار دیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے اس کو غرق ہوتے دیکھا شفقت پدری کے باعث جذبۂ فطرتی سے متاثر ہو کر اللہ سبحانہ تعالیٰ سے سوال بھی کیا مگر وہاں سے صاف جواب ملا إِنَّهُ لَيْسَ مِنْ أَهْلِكَ إِنَّهُ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ متعدد آیات میں مضمون فرمایا گیا۔ لن تنفعكم ارحامكم ولا اولادكم الى يوم القيامة يفصل بينكم يوم لا تملك نفس لنفس شيئا واتقوا يوما لا تجزي نفس عن نفس شيئا واخشوا يوما لا يجزي والد عن ولده ولا مولود هو جاز عن والده شيئا۔

مومنین کے لئے دو مثالیں | ان تمام مذکورہ بالا آیات نے مشرکین کی ان باطل طمعوں کا قلع قمع کر دیا جو ہمیشہ ان کے دلوں میں موجزن رہا کرتی تھیں، کہ ہم بزرگوں کی اولاد ہیں ہمیں ان کی شفاعت دین و دنیا و آخرت میں نجات دلا دے گی جس طرح ان مشرکین میں وہ طمع پائی جاتی تھی کہ ہمارے اسلاف ہمیں نجات دلا دیں گے۔ اسی طرح موجودہ زمانے میں سادات اور بزرگوں کی اولادیں اس قسم کے زعم باطل پائے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں انبیاء سابقین کے قصے بیان فرما کر ہمیں متنبہ فرمایا کہ اس قسم کے بیہودہ خیالات اور اعتقادات سے اپنے دل و دماغ کو پاک صاف رکھو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی لخت جگر فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کو ارشاد فرمایا اغنی عنك من الله شيئا انقذي نفسك من النار۔

مومنین کے لئے بھی دو مثالیں ذکر فرمائی گئیں۔ پہلی امرأۃ فرعون کی جس میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا کہ مومن کا اتصال بالکافر اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا بشرطیکہ وہ اس کے کفر اور عمل غیر صالح سے بعید اور مفارق رہے۔ دوسرے کے گناہ سے آخرت میں کوئی

مضرت اور نقصان نہ پائے گا۔ اور مثل ثانوی میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر نہ ہو۔ نہ مُسلم نہ غیر مُسلم۔ تو اندریں حالات وہ خود نیک اور پارسا ہو تو اسے عدم تعلق کوئی مضر نہیں ہوتا۔ عقلی طور پر عورتوں کی چار قسمیں بن سکتی ہیں۔

اوّل عورت مسلمہ اور شوہر کافر جیسے کہ امرأۃ فرعون۔ اور فرعون کے اس تعلق نے بصورت افتراق و بیزاری عورت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔

دوم عورت غیر مسلمہ اور مرد صالح پارسا بلکہ نبی جیسے امرأۃ نوح اور امرأۃ لوط۔ عدم اسلام کی صورت میں اس تعلق نے ان کو کوئی نفع نہ پہنچایا۔

سوم۔ عورت ایم غیر ذات زوج۔ عدم تعلق زوجیت نے اسے اپنی صلاحیت کی صورت میں کوئی نقصان نہ دیا جیسے مریمؑ بنت عمران۔

چہارم۔ عورت مسلمہ قانتہ اور مرد بھی مسلم اس کے کامیاب اور فائز المرام ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ امرأۃ نوح و لوط علیہما السلام کی مثال ذکر کرنے سے واللہ اعلم بالصواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ازواج مطہرات کو تنبیہ مقصود ہے کہ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تظاہر نہ کریں۔ اور اس خیال میں نہ پڑ جائیں کہ ہمارا تعلق سید الاولین والآخرین خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ قائم ہے۔ ہمیں کوئی فرو گزاشت نقصان نہ پہنچا ئیگی بطور اشارہ تنبیہ کی گئی کہ امرأۃ نوح و لوط علیہما السلام سے عبرت حاصل کرو۔

مثل کی حقیقت اور نقلی حیثیت تب منکشف ہو سکتی ہے۔ جب قیاس کے معنی اور حجیت کی تشریح اور استدلال کے اقسام پورے طور پر بیان کئے جائیں۔ کیونکہ جس قدر بھی امثال ہیں ساری کی ساری قیاسات عقلیہ میں داخل ہیں۔ قرآن حکیم میں پچاس کے قریب امثال ذکر کی گئی ہیں سب میں یہ امر مشترک پایا جاتا ہے کہ ایک شے کو اس کی نظیر کے ساتھ تشبیہ دے کر دونوں پر ایک حکم لگایا گیا ہے جو وصف علۃ للحکم ایک شے میں پائی جاتی تھی۔ وہی وصف موجب للحکم دوسری شے میں بھی موجود ہے۔ اب دونوں کا حکم ایک ہوگا۔ یا دو چیزوں میں کسی

مثل کے ذریعے فرق ظاہر کیا جاتا ہے۔ اور دونوں کے حکم میں بھی اختلاف دکھایا جاتا ہے جو وصف علتہ للحکم ایک میں موجود تھی جب وہ دوسری میں منتفی ہے تو اتحاد حکم کیونکر متصور ہو سکتا ہے عقلاً محال سمجھا جاتا ہے۔ کہ دو متضاد چیزیں ایک حکم کی مقتضی ہوں اسی بنا پر ارشاد ہوا۔

وتلك الامثال نضربها للناس وما يعقلها الا العالمون۔

امثال کے مفید نتیجہ ہونے پر تمام امم کا اتفاق ہے۔ کسی فرقہ اسلامی نے مثل کے فائدے یا صحت سے انکار نہیں کیا۔ مثل درحقیقت ایک قسم کا قیاس ہے۔ تو لازمی طور پر قیاس کو دلیل شرعی ماننا پڑے گا۔ ہاں شرائط وغیرہ میں اگر علمائے مجتہدین کا باہم کوئی اختلاف ہو تو اس سے قیاس کے علم ہونے میں کوئی شبہ پیدا نہیں ہوتا۔ قیاس کے دلیل شرعی ہونے پر قریباً تمام صحابہ کا اجماع و اتفاق تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے اس مکتوب گرامی سے جو انھوں نے ابوموسےٰ اشعریؓ کے نام روانہ فرمایا تھا، یہی مفہوم ہوتا ہے۔

خط کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

ثم الفهم الفهم فيما ادلي اليك مما ورد عليك مما ليس في قرآنٍ ولا سُنّةٍ ثُمَّ قايس بين الامور عند ذالك واعرف الامثال ثم اعمد فيما ترىٰ الىٰ احبّها الى الله واشبهها بالحق۔

اس خط پر کسی صحابی سے انکار یا اختلاف منقول نہیں۔ اصول شرعیہ میں سے قیاس بھی ایک بھاری اصل ہے۔ کوئی فقیہ اس سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے اسے جابجا استعمال فرمایا ہے اور بطور حجت خصم پر پیش کیا ہے۔ منکرین احکام پر تمثیلات اور قیاسات سے ان کے شبہات کا ازالہ کرنا صراحۃً اس امر پر دال ہے کہ قیاس ایک حجت مسلمہ اور اصل شرعی ہے۔ ورنہ اللہ تعالیٰ ان کے اعذار کو امثال و ادلہ کے ذریعے زائل کرنے کی تکلیف گوارا نہ فرماتا۔ بطور تمثیل چند آیات پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں مخالفین کو بذریعہ قیاس قائل کرنا مقصود ہے۔ جو لوگ موجودہ زندگی کے قائل ہیں اور نشأۃ ثانیہ کے منکر ہیں، اُن پر

امکان اور وقوع زندگی اول سے امکانِ حیات ثانیہ پر بطور حجت پیش کیا گیا ہے۔ قیاس میں درحقیقت چار چیزیں ہونی ضروری ہیں۔

اول مقیس۔ دوم مقیس علیہ۔ سوم وصف موثر۔ چہارم حکم۔

زندگی اول مقیس علیہ نشأۃ ثانیہ مقیس۔ امکان وصف موثر۔ وجود تحقق حکم۔

آیت ذیل میں نشأۃِ اولیٰ پر نشأۃِ ثانیہ کو قیاس کیا گیا ہے۔ وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ۔ اور کسی جگہ حیات بعد الموت کو یقظہ بعد النوم پر قیاس کیا گیا ہے کیونکہ نیند اور موت دونوں کو لفظ توفی کے ساتھ قرآن کریم میں تعبیر کیا گیا ہے۔ هُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ سے مراد نوم ہے۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْأَنفُسَ حِينَ مَوْتِهَا سے مراد اختتام زندگی ہے اور کسی موقع پر خلق السموات والارض کو ذکر فرما کر سمجھایا گیا کہ جس طرح زمین آسمان جیسی بڑی ہستی کو پیدا کرنے پر اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے اسی طرح مردوں کو زندہ کرنے پر بھی وہ قادر ہے اور کہیں احیاءِ موتیٰ کے ثبوت کے لئے زمین مردہ کے زندہ کرنے کو بطور دلیل پیش کیا گیا۔ اِنَّ الَّذِي أَحْيَاهَا لَمُحْيِي الْمَوْتَىٰ إِنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ وَأَحْيَيْنَا بِهِ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذَٰلِكَ الْخُرُوجُ۔

اس قسم کی جتنی مثالیں قرآن حکیم میں مذکور ہیں یا احادیث صحیحہ میں مروی ہیں تمام قیاسات عقلیہ کی مثالیں ہیں۔ سب کا خلاصہ اور لب لباب یہی معلوم ہوتا ہے کہ دو چیزوں میں ایک وصف مشترک پایا جاتا ہے جس پر حکم کا مدار ہے اور اسے علت للحکم کہنا جائز ہے وہی وصف موجب للحکم جب کسی دوسری شے میں پایا جاتا ہے تو لامحالہ دونوں کا حکم ایک ہی ہوگا۔

یا دو چیزوں میں اشتراک وصف موثر فی الحکم نہیں پایا جاتا تو ان کے احکام میں بھی اختلاف ہوگا۔ تو اب استدلال کا مدار تسویہ بین المتماثلین وفرق بین المختلفین پر ہوا۔ کوئی دانشمند اس بات کو قبول نہیں کر سکتا کہ علت مشترکہ پائے جانے کے باوجود اس حکم نہ ہو یا اختلاف اوصاف موثرہ کے ہوتے ہوئے حکم کا اتحاد ہو۔ استدلال کی کئی قسمیں ہو سکتی ہیں یا تو ایک معین شے سے دوسری

معین شے پر دلیل پیش کی جاتی ہے۔ یا معین سے عام پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔ یا عام سے معین پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔ یا عام سے دوسرے عام پر دلیل قائم کی جاتی ہے۔

استدلال بالمعین علےٰ المعین کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ استدلال بوجود الملزوم علےٰ وجود اللازم۔ اس لئے کہ ہر ملزوم اپنے لازم کے وجود کے لئے دلیل ہوا کرتا ہے۔ اگر تلازم جانبین سے ہو تو ہر ایک دونوں میں سے دلیل اور مدلول بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اقسام ثلاثہ یہ ہیں :۔

(۱) استدلال بالمؤثر علے الاثر۔

(۲) استدلال بالاثر علے المؤثر۔

(۳) استدلال باحد الاثرین علے الآخر۔

پہلے کی مثال جیسے آگ سے جلانے پر دلیل قائم کی جائے۔ دوسری کی مثال جیسے جلانے کو آگ پر دلیل بنایا جائے۔ تیسری جیسے جلانے سے دھوئیں وغیرہ آثار نار پر دلیل قائم کی جائے۔

اگر اس سلسلۂ استدلال کا انکار کیا جائے تو کسی شے کے وجود پر کوئی دلیل قائم نہیں ہو سکتی۔ مدار استدلال تلازم اور تسویہ بین المتماثلین پر ہے۔ جیسے کہ ایک اثر سے دوسرے اثر پر دلیل قائم کی جائے۔ یا قیاس فرق پایا جائے۔ جس کی مدار ایک اثر کے انتفاء سے دوسرے کے انتفاء پر استدلال کیا جائے۔ یا انتفاء لازم سے انتفاء ملزوم پر حجت قائم کی جائے۔

استدلال بالمعین علے العام اسی صورت میں ہو سکتا ہے، جب ہر دو متماثلین میں مساوات مانی جائے۔ ورنہ معین کا عام پر دلیل ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ قرآن حکیم میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ جہاں معین سے عام پر استدلال کیا گیا ہے۔ سورۂ قمر میں امم سابقہ کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا گیا۔ اکفارکم خیرٌ من اولٰئکم ام لکم براءۃٌ فی الزبر۔

اس آیت سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جس علت کے باعث امم سابقہ کو سزا

دی گئی۔ وہی علت اگر کسی دوسرے گروہ یا جماعت میں پائی جائے گی تو وہ بھی لامحالہ اسی سزا کی مستوجب و مستحق ہوگی اسی طرح سورۂ احقاف میں قوم عاد کا تذکرہ فرمایا گیا کہ انھیں باد صرصر سے تباہ کیا گیا۔ فقالوا ھٰذا عارضٌ ممطرنا بل ھو ما استعجلتم بہ ریحٌ فیھا عذابٌ الیم تدمر کل شیءٍ بامر ربھا فاصبحوا لا یُرىٰ الا مساکنھم کذالک نجزی القوم المجرمین ولقد مکنّٰھم فیما ان مکنٰکم فیہ وجعلنا لھم سمعاً وابصاراً وافئدۃ فما اغنیٰ عنھم سمعھم ولا ابصارھم ولا افئدتھم من شیءٍ اذ کانوا یجحدون بآیات اللہ وحاق بھم ما کانوا بہ یستھزءون۔

آیت مسطورہ بالا میں غور کرنے کے بعد صاف معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا اور ان کا حکم ایک ہے۔ انھوں نے انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کی۔ سامان تعیش کی فراوانی اور کثرت نے انھیں خدائی عذاب سے بچانے میں کسی قسم کی امداد نہ دی۔ اگر تم بھی سامان عیش وعشرت کے بہم پہنچنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف رہو گے تو تم بھی ویسے ہی سزا کے مستوجب ہو گے جیسے کہ وہ تھے۔ قرآن کریم میں متعدد آیات میں سیروا فی الارض کا حکم دیا گیا اور ان کی توجہ مکذبین کے انجام کو سوچنے کی طرف منعطف کرائی گئی جس کا مقتضا یہ ہے کہ ہم ان کی تباہی و بربادی کو دیکھ کر عبرت و نصیحت حاصل کریں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم بھی انھیں کی روش کو اختیار کرنے کے بعد سزا کے مستوجب بنیں جیسے کہ وہ سزایاب ہوئے۔ سیر سے مراد صرف سیر علی الاقدام ہی نہیں بلکہ سیر قدمی اور سیر فکری و اعتبار معنوی کو بھی شامل ہے اگر ایک نظیر کا حکم دوسری نظیر جیسا نہ ہوتا تو عقلمندوں کو سیر فی الارض پر نتائج اخذ کرنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ جیسے تسویہ بین المتماثلین کا حکم دیا گیا ویسے ہی تفریق بین المختلفین کے لئے بھی ہدایت فرمائی گئی۔ فطرت انسانی ہرگز اس بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں کہ باوجود اختلاف اوصاف موثرہ دونوں چیزوں پر ایک حکم کیا جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

افنجعل المسلمین کالمجرمین مالکم کیف تحکمون۔ (سورہ نٓ پارہ ۲۹)

سورہ جاثیہ میں بھی اسی مضمون کو زیادہ توضیح سے بیان فرمایا گیا۔ ام حسب الذین اجترحوا السیّات ان نجعلھم کالذین آمنوا وعملوا الصالحات سواءً محیاھم ومماتھم ساء ما یحکمون۔

اور سورہ ص میں ارشاد ہوا ہے۔ ام نجعل الذین آمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار۔

ہر سہ مذکورہ بالا آیات سے اللہ تعالیٰ نے عقلمندوں کو متنبہ فرمایا کہ شے اور اسکے مخالف کا حکم ایک نہیں ہوتا۔ مجرموں کی سزا کی بنا جرم پر تھی۔ مسلم۔ مومن۔ متقی میں چونکہ جرم کا فقدان تھا۔ اب وہ مجرم یا مفسد کی سزا کے کیونکر مستوجب ہو سکتے ہیں۔ اسی کا نام میزان ہے جیسے کہ میزان حسی موزونات مادیہ میں مساوات یا عدم مساوات کو ظاہر کرتی ہے۔ ویسا ہی میزان قیاسی متماثلین میں اتحاد و مساوات فی الحکم کا اظہار کرتی ہے اور مختلفین فی الاوصاف میں اختلاف فی الاحکام کو بیان کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جیسے کتاب نازل فرمائی ویسے ہی اس کے ساتھ میزان کو بھی نازل فرمایا۔ جیسا سورہ شوریٰ کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے اللہ الذی انزل الکتٰب بالحق والمیزان۔ اور سورہ حدید کی آیت مندرجہ ذیل میں اس کو زیادہ واضح کیا گیا ہے۔ لقد ارسلنا رسلنا بالبینٰت وانزلنا معھم الکتٰب والمیزان لیقوم الناس بالقسط۔

سورہ رحمٰن کے آغاز میں الرحمٰن علم القرآن کا ذکر فرمانے کے بعد والسماء رفعھا ووضع المیزان کا بھی امتنان فرمایا۔ میزان سے مراد انصاف اور وہ ترازو ہے جس کے ذریعے انصاف اور ظلم میں تمیز کی جا سکے۔ قیاس صحیح اور میزان کا مفہوم دراصل ایک ہی ہے بجائے قیاس کے اگر میزان کا لفظ استعمال کیا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ میزان ہر جگہ پر ممدوح سمجھا گیا ہے اور قابل ستائش موقع پر اس کا استعمال ہوا ہے۔ مذکورہ بالا ہر دو آیات میں کتاب کی تنزیل کے ساتھ میزان کے نازل کرنے کا بھی امتنان ظاہر فرمایا گیا ہے اور

قیاس کسی جگہ صحیح اور کسی جگہ فاسد بھی ہوتا ہے۔ صحیح کو تو لفظ میزان شامل ہے اور قیاس فاسد کی اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہوں پر مذمت فرمائی۔ چنانچہ کفار نے جب انما البیع مثل الربوٰا کہا تو اللہ تعالےٰ نے احل اللہ البیع وحرم الربوٰا ویمحق اللہ الربوٰا و یربی الصدقات فرما کر ان کے خیال باطل کی تردید فرمائی۔ ایسا ہی کفار نے میتہ اور مذبوحہ کو یکساں قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی تردید فرمائی۔ حرمت علیکم المیتۃ الخ وَلاتا کلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ نازل فرما کر ان کی تردید کی۔

سلف صالحین سے جن لوگوں نے قیاس کی مذمت یا برائی بیان فرمائی ہے ان کا ہرگز یہ مُدعا نہ تھا کہ وہ قیاس صحیح کو غلط قرار دیں بلکہ انھوں نے غلط قیاس کے مذموم ہونے کے وجوہات بیان کئے اور اس کے استعمال سے لوگوں کو منع کیا۔ صحیح قیاس کی تردید کسی عقلمند یا اہل علم سے متصور نہیں ہوسکتی۔ فطرت انسانی و وجدان نفسانی و آیات قرآنی و احادیث نبویہ علےٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ اس کے ثبوت کے لئے لاتعد ولا تحصےٰ موجود ہیں۔ اندرین حالات کسی اہل علم یا عقلمند سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اس کی تردید کرے جن لوگوں کی طرف قیاس کی تردید منسوب کی جاتی ہے وہ خود اپنی تصنیفات میں قیاس کا استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے یا تو اس قیاس کی تردید کی ہے، جو نص کے مقابلے میں پیش کیا جاتا ہے، یا مورد نص میں قیاس کے غیر مفید یا غیر معتد بہ ہونے کا ذکر کیا ہوگا، ورنہ صحیح قیاس کی کون تردید کرسکتا ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قیاس کی قسمیں ذکر کرکے صحیح اور غیر صحیح کا امتیاز کردیا جائے۔ عموماً قیاس کا استعمال تین طرح پر آیا کرتا ہے۔

(۱) قیاس علت (۲) قیاس دلالت (۳) قیاس شبہ

ان ہرسہ اقسام کا ذکر قرآن حکیم میں فرمایا گیا۔ خواہ وہ صحیح ہوں یا غلط تفصیل آئندہ سے پتہ چل جائے گا۔ قیاس علت کو قرآن حکیم میں کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ قیاس صحیح کا مدار چار چیزوں پر ہے۔

اصل[1] . فرع[2] . علت[3] مشترکہ و حکم[4]

مثال میں جاری کرنے کے بعد اس کی پوری حقیقت ذہن نشین ہوسکے گی ۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۔ اِنَّ مَثَلَ عِیْسٰی عِنْدَ اللّٰہِ کَمَثَلِ اٰدَمَ خَلَقَہٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ۔ (سورہ اٰل عمران پارہ سوم)

عیسیٰ ؑ کو اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم ؑ کے بطن سے بلا اَب پیدا کیا ۔ ان کی انوکھی پیدائش کے باعث بعض جہال کو ان کی الوہیت یا ثالث ثلاثہ ہونے کا گمان ہوا ۔ ان کی تعظیم میں انھوں نے غلو سے کام لیا ۔ ان کے مقابل میں ایک دوسری جماعت خلاف معتاد پیدائش پر نکتہ چینی کرنے لگی ۔ حضرت مریم ؑ صدیقہ کے شان میں انھوں نے افتراء پردازی تک نوبت پہنچائی ۔ ہر دو فریقین کی تردید کے لئے اللہ تعالیٰ نے آیت بالا نازل فرماکر عیسےٰ ؑ کی حقیقت کو اور حضرت مریم ؑ کی پاک دامنی کو واضح کردیا ۔ آدم ؑ کو جب اللہ تعالیٰ بلا اَب و اُم پیدا کرنے پر قادر ہے تو عیسےٰ ؑ کو بلا اَب پیدا کرنے میں کونسی دشواری اور استحالہ پیش آتا ہے ۔ مٹی میں نہ تو حیات تھی ، نہ حس و حرکت اس سے آدم ؑ کی پیدائش کو مان کر عیسےٰ ؑ کی پیدائش پر بیہودہ نکتہ چینی کرنے کا کونسا موقع ہے ۔ آدم ؑ مقیس علیہ ۔ عیسےٰ مقیس اور امکان اور مشیئت الٰہی کے احاطہ کے اندر ہونا وصف مشترک اب جو حکم مقیس علیہ کا ہوگا وہی مقیس کے لئے ماننا پڑے گا ۔ یہ تو تفریط والوں کی تردید ہوئی اور جن لوگوں نے افراط و غلو کیا تھا ان کی تردید اگرچہ ہمارے موضوع مقالہ سے من وجہ خارج ہے مگر من وجہ اصل مقصود کے ساتھ اس کا ارتباط پیدا ہوسکتا ہے چند الفاظ اس کے متعلق بھی لکھے جاتے ہیں ۔ عیسیٰ ؑ کی خلاف قانون پیدائش کی بنا پر تم ان کی الوہیت یا ثالث ثلاثہ ہونے کے قائل ہوگئے ۔ اگر خرق عادت کی پیدائش اس منصب کے لئے مقتضی ہے تو آدم ؑ کو بطریق اولےٰ یہ درجہ ملنا چاہیئے تھا ۔ جب خارق در خارق میں الوہیت کا شائبہ نہیں تو خلاف عادت مخلوق کو کیونکر اِلٰہ کہہ سکتے ہو ۔ معلوم ہوا کہ وہ معبود یا اِلٰہ نہیں ۔ یہاں بھی قیاس علت اسی طرح جاری ہوسکتا ہے ۔

قد خلت من قبلکم سننٌ فسیروا فی الارض فانظروا کیف کان عاقبۃ المکذبین۔ (آل عمران پارہ چہارم)

تم سے پہلے تمہارے جیسی کئی امتیں دنیا میں گزریں۔ ان کے بُرے انجام کی طرف توجہ کرو اور سوچو کہ ان کی ہلاکت و تباہی کا سبب کیا تھا۔ انھوں نے آیات الٰہی کی تکذیب کی۔ اور رسولوں کو جھٹلایا۔ یہاں پر بھی وہی چاروں چیزیں پائی جاتی ہیں جن پر قیاس علت کا مدار تھا امم سابقہ اصل مخاطبین فرع علت جامع تکذیب اور حکم ہلاکت۔ علت موثرہ ایک جگہہ جب موجب للحکم بن چکی ہے تو لامحالہ جہاں کہیں بھی وہ پائی جائے گی حکم کا ترتب اس پر لازمی و ضروری ہوگا۔ ورنہ علت علت نہ رہے گی۔ اذا وجدت العلۃ وجد المعلول۔

جب امم سابقہ کو تکذیب کے بعد بُرے نتائج اور انتقام الٰہی سے نجات نہ ملی تو تم موجودہ اشخاص یا اقوام باوجود تکذیب بآیات اللہ و رُسُلِہٖ انتقام الٰہی سے کیونکر بچ سکو گے۔ اکفارکم خیرٌ من اولٰئکم ام لکم براءۃٌ فی الزبر۔

ایک اور موقع پر یوں ارشاد ہوتا ہے اَلَم یَرَوا کم اھلکنا من قبلھم من قرنٍ مکنا ھم فی الارض مالم نمکن لکم وارسلنا السمآء علیھم مدرارًا وجعلنا الانھار تجری من تحتھم فاھلکنا ھم بذنوبھم وَانشأنا من بعد ھم قرنًا اٰخرین۔ (سورہ انعام پارہ ۷)

جناب باری تعالیٰ نے قرون سابقہ کے اہلاک کا ذکر فرمایا اور اس کی علت بھی ذکر فرمائی کہ وہ گناہگار تھے۔ امم سابقہ کو اصل سمجھو اور مخاطبین کو فرع اور ذنوب علت جامع اور اہلاک حکم قیاس کی تکمیل تو اتنی بات سے ہو جاتی تھی مگر مزید تاکید و استحکام قیاس کے لئے ایک اور اضافہ کر دیا گیا کہ امم سابقہ تم سے زیادہ قوی اور توانا تھیں۔ انکی قوت اور زور آوری نے علت ہلاکت کے موجود ہونے کے وقت عذاب کے ٹالنے میں انھیں کچھ امداد نہ دی باوجودیکہ وہ کہا کرتے تھے من اشد منا قوۃ ایسے توانا و قوی لوگ جب نہنگ ہلاکت کا لقمہ بن چکے

توہمارے جیسے کمزوروں کی کیا بساط کہ ہم اس سے محفوظ رہ سکیں۔

اسی عنوان کے ماتحت آیت ذیل بھی پیش کی جاسکتی ہے۔ کالذین من قبلکم کانوا اشد منکم قوۃً واکثر اموالاً واولاداً فاستمتعوا بخلاقھم فاستمتعتم بخلاقکم کما استمتع الذین من قبلکم بخلاقھم وخضتم کالذی خاضوا اولٰئک حبطت اعمالھم فی الدنیا والاٰخرۃ واولٰئک ھم الخاسرون۔ (سورہ توبہ پارہ ۱۰)

امم سابقہ کو اصل اور مخاطبین کو فرع علت حکم استمتاع بالنصیب والحظ اور حکم حبط اعمال وخسارہ فی الدارین۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو جو قوائے فطرتی یا ملکات اکتسابی عطا فرمائے تھے انھوں نے اُنسے حسب مقسوم فائدہ اٹھایا۔ یہی قوائے وملکات اگر وہ حصول آخرت کے لئے استعمال کرتے۔ تو فائز فی الدنیا والاُخرہ ہوجاتے۔ مگران کی بدنصیبی وبدبختی نے انھیں ہوا وہوس کا پیرو بناکر اکتساب دنیا اور منفعت حیات عاجلہ کی طرف لگادیا۔ مفاد اُخروی سے وہ بالکل محروم ہوگئے۔ ان کی قوت کی زیادتی اوراموال واولاد کی کثرت نے انھیں کوئی نفع نہ پہنچایا بلکہ بحکم آیہ شریفہ فلا تعجبک اموالھم ولا اولادھم انما یرید اللّٰہ لیعذّبھم بھا فی الحیوٰۃ الدنیا وتزھق انفسھم وھم کٰفرون (سورہ توبہ پارہ ۱۰)

بجائے اس کے کہ یہ اموال واولاد ان کو مفید پڑتے الٹے ان کو دنیا کی الجھن میں پھنسا کر خدا سے غافل کردیا اور آخرت کی بہتری کو وہ فراموش کر بیٹھے۔ اسی طور پر جو لوگ اس قسم کے سامان معیشت وکثرت تعداد پر غرہ ہوکر اللہ تعالیٰ کو بھول جاتے ہیں اور آخرت کی تیاری کے واسطے کوئی کوشش نہیں کرتے تمامتر ہی خواہشات نفسانی میں منہمک ہوجاتے ہیں وہ بھی عذاب الٰہی کی زد سے بچ نہیں سکتے۔ ان ھالکین میں دو امر موجب تباہی تھے (۱) استمتاع بالخلاق (۲) خوض بالباطل۔ ہمیشہ یہی دو امر موجب ہلاکت ہوا کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو قوتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ (۱) قوت علمی۔ (۲) قوت عملی۔

استمتاع بالخلاق سے انھوں نے اپنی قوت عملی کو غیر موزوں طریق و موقع پر استعمال کیا اور خوض بالباطل سے قوت علمی کو بھی برباد کر دیا۔ انسان جب اپنی تمام مایۂ حیات کو غیر مفید موقع پر صرف کر دے تو وہ ہلاکت سے کب نجات پا سکتا ہے۔ یہ اسباب جہاں کہیں بھی پائے جائیں گے ان کے نتائج ضرور ہی مرتب ہو کر رہیں گے۔

استمتاع بخلاق اور خوض بالباطل تمام مفاسد کا منبع اور تباہیوں کا موجب ہے، احادیث وچیزوں کو مختلف طریقوں پر مختلف الفاظ میں ادا کیا گیا۔

کریں۔ المغضوب علیھم وہی لوگ ہیں جو حق کو جان کر اس کے خلاف عمل کرتے ہیں الضالین سے وہ لوگ مراد لئے جاتے ہیں جنھوں نے صحیح علم حاصل کرنے میں غلطی کی۔ انسان کا اعتقاد جب خراب ہوتا ہے تو وہ خوض بالباطل سے اور جب عمل خراب ہوتے ہیں تو وہ استمتاع بالخلاق۔ ایک کو بدعت کہا جاتا ہے اور دوسرے کو اتباع ہوا سلف صالحین فرمایا کرتے تھے احذروا من الناس صنفین صاحب ھوآء فتنتہ ھواہُ وصاحبُ دنیا اعجبتہ دنیاہُ احذروا فتنۃ عالم الفاجر والعابد الجاھل فانّ فتنتھما فتنۃٌ لکلّ مفتونٍ جن لوگوں نے ان دونوں چیزوں سے اپنے آپ کو محفوظ رکھا انھیں ائمۃ المتقین کا خطاب دیا گیا۔ وجعلنا ھم ائمّۃ یھدون بامرنا لما صبروا وکانوا بایاتنا یوقنون۔ صبر سے انھوں نے ترک شہوات کا مقابلہ کیا اور یقین سے شبہات کو دفع کیا۔ مذکورہ بالا آیات وشواہد سے بالتصریح معلوم ہو چکا کہ شریعت اسلامی نے قیاس علت کو ایک نہایت ہی مستند دلیل قرار دیا ہے۔ اس کے نظائر و شواہد قرآن حکیم واحادیث میں کثرت سے ملتے ہیں جنکا بالاستیعاب یہاں ذکر کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے مشتے نمونہ از خروارے مذکورہ شواہد پر اکتفا کی جاتی ہے۔

(۲) قیاس دلالت۔ قیاس دلالت کا مدار اس امر پر ہے کہ اصل اور فرع کو دلیل علت

میں جمع کیا جائے۔ قیاس علت میں اصل فرع کی ایک علت ہوا کرتی تھی۔ یہاں علت ایک نہیں۔ مگر دلیل علت دونوں میں مشترک ہے۔ اس کے باعث دونوں کا حکم بھی ایک ہی ہوگا اس کا حاصل یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل ایک علت سے معلول ہے اور فرع بھی ایک دوسری علت سے معلول ہے اور دونوں علتوں کی دلیل ایک ہے۔ جس کے باعث دونوں کا حکم ایک ماننا پڑے گا۔

آیت ذیل سے اس کی تشریح و توضیح ہو سکتی ہے۔ ومن اٰیاتہٖ انک تری الارض خاشعۃً فاذا انزلنا علیھا الماء اھتزت وربت ان الذی احیاھا لمحی الموتیٰ انہ علیٰ کل شیءٍ قدیر۔

اس آیت میں دو زندگیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

(۱) زمین کی زندگی۔ جب قحط سالی ہوتی ہے اور باران رحمت کا نزول رک جاتا ہے تو اس وقت زمین خشک و بے رونق ہو جایا کرتی ہے۔ کسی قسم کا سبزہ و تازگی اس پر نمودار نہیں ہوتی اس وقت زمین کو مردہ کہا جاتا ہے۔ جب باران رحمت کا نزول ہوتا ہے اور زمین کے قوائے مولدہ و نامیہ اپنے مواد محفوظہ میں کام کرنے کے بعد زمین کو سرسبز و شاداب کر دیتے ہیں تو یہ زمین کی زندگی ہے۔

دوسری زندگی ان لوگوں کی ہے جو اس عالم سے فانی ہو کر عالم برزخ میں جا پہنچے ان کی پہلی زندگی تو ہر شخص تسلیم کرتا ہے مگر کفار کو دوسری زندگی سے انکار ہے۔ اب ان کے سمجھانے کے لئے کہ مرنے کے بعد تم دوسری زندگی میں اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنا حساب کتاب دو گے اور ہر نفس کے روبرو اس کے کارنامے پیش ہوں گے۔ حسنات کی زیادتی کی صورت میں وہ مستوجب رحمت و جنت ہوں گے۔ اور سیئات کے زیادہ ہونے کی بنا پر انھیں جہنم رسید کیا جائے گا۔ احیاء ارض کی علت نزول باراں تھی، اور احیائے موتیٰ کی علت ارادۂ الٰہی۔ اب دونوں کے درمیان جو امر مشترک ہے وہ عموم قدرت و کمال قدرت ہے جو احیائے ارض کی علت و احیائے موتیٰ کی

علت دونوں کو شامل ہے۔

قیاس دلالت کو اور بھی کئی موقعوں پر استعمال فرما کر ہماری رہنمائی فرمائی گئی آیۂ ذیل کا مطالعہ اسی قاعدے کے ماتحت کیا جائے۔

یا ایہا الناس ان کنتم فی ریب من البعث فانا خلقناکم من ترا ثم من نطفۃ ثم من علقۃ ثم من مضغۃ مخلقۃ وغیر مخلقۃ لنبین لکم ونقر فی الارحام ما نشاء الیٰ اجل مسمی۔ ثم نخرجکم طفلاً ثم لتبلغوا اشدکم ومنکم من یتوفی ومنکم من یرد الیٰ ارذل العمر لکیلا یعلم من بعد علم شیئاً الخ (سورہ حج پارہ ۱۷)

اگر تمہیں قیامت کے بارے میں تردد و شک ہے تو اپنے مخلوق ہونے میں اور درجہ بدرجہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونے میں اور درجۂ کمال تک پہنچکر سن شیخوخت تک پہنچکر مرنے میں تو تردد نہیں۔ بعث بعد الموت بھی اسی زندگی کی نظیر ہے کیونکہ دونوں ممکن الوقوع ہیں۔ اگر نشأۃ اولیٰ ممکن نہ ہوتی تو انسان کبھی زندگی کا جامہ نہ پہنتا۔ اس نشأۃ کے ختم ہونے کے بعد کوئی ایسا استحالۂ عقلی قائم نہیں ہوا جو دوبارہ زندگی کو روک دے۔ جس طرح ایک کاریگر کسی چیز کو بناتا ہے دوبارہ اس کا بنانا بہ نسبت پہلے کے زیادہ آسان اور سہل ہوا کرتا ہے۔ پیدائش اولین کے مشاہدہ کرنے کے بعد احیائے ثانوی سے تم کیونکر منکر ہو سکتے ہو۔ اس کی قدرت ہمیشہ یکساں ہے۔ جیسے کہ اس کی ذات لازوال و غیر متغیر ہے ایسے ہی اسکی صفات بھی غیر متبدل و غیر زوال پذیر ہیں۔ احیائے اول اپنے اسباب اور علل سے متحقق ہوتا ہے، اور احیائے ثانی کا تحقق بھی اپنے علل و اسباب سے ہوگا مگر ہر دو نشأتوں کی علت العلل امکان قابل و قوع دونوں میں مشترک ہے۔ لہٰذا دونوں کا حکم بھی مشترک ہوگا۔

قولہ وضرب لنا مثلاً ونسی خلقہ قال من یحی العظام وھی رمیم قل یحییھا الذی انشأھا اول مرۃ وھو بکل خلق علیم ن الذی جعل لکم من الشجر الاخضر

ناراً فاذا انتم منہ توقدون اولیس الذی خلق السمٰوات بقادر علیٰ ان یخلق مثلہم بلیٰ وھو الخلاق العلیم۔ انما امرہٗ اذا اراد شیئاً ان یقول لہٗ کن فیکون فسبحٰن الذی بیدہٖ ملکوت کل شیٔ والیہ ترجعون۔ بھی اسی سلسلے میں مندرج ہے۔

ان آیات میں احیاء بعد الموت پر کئی وجوہ سے روشنی ڈالی گئی ہے جو حسب ذیل ہے۔

(۱) اول اَوَلَمْ یَرَی الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنَاہُ سے انسان کو اس کا مبداءِ خلقت یاد دلا کر نشأۃ ثانیہ کا قائل کیا جاتا ہے۔ پھر

(۲) دوم۔ ضرب لنا مثلاً ونسیَ خلقہ میں اس بات کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کہ کیا منکر احیائے ثانی کو اللہ تعالیٰ کی پہلی نعمتِ حیات جس سے وہ اس عالم میں مستفید و متمتع ہو رہا ہے۔ فراموش ہو گئی۔ اگر وہ اس زندگی کے حالات اور اس کے اطوار کو اپنی قوت حافظہ میں محفوظ رکھتا تو کبھی بھی اسے جرأت نہ ہوتی کہ احیاءِ بعد الموت کا انکار کرتا۔

(۳) سوم۔ قل یحییہا الذی انشأھا اول مرۃ میں اس کے اعتراض من یحیي العظام وھی رمیم کا صراحۃً حکم فرمایا گیا۔ جس ذات نے اسے پہلے پیدا کیا تھا۔ اب بھی وہ اس کے پیدا کرنے پر قادر ہے اور قادر رہے گی۔

(۴) چہارم۔ وھو بکل خلق علیم سے اپنی عمومِ قدرت اور وسعت علم کو بطور دلیل پیش کر کے منکر کے شک کو زائل کیا گیا ہے۔ کیونکہ اعادہ موتیٰ کا تعذر دو امروں پر مبنی ہو سکتا ہے۔ قصورِ علم یا قصورِ قدرت۔ وھو بکل خلق علیم سے ہر دو کا ثبوت پیش کیا گیا۔ اس کی قدرت کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ تمام مقتدر ہستیوں سے اس کی ہستی بالاتر ہے۔ خلق السمٰوات والارض اس کی قدرت کے لئے ہر دم شہادت دے رہے ہیں۔ کسی معدوم کے اعادہ کے لئے اسے چنداں سامان و اسباب مہیا کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف کلمہ کُنْ سے جس چیز کو چاہے فوراً اسے بے تیر پیدا کر سکتا ہے۔ ہر شے پر اس کو حکمرانی حاصل ہے۔ احیائے موتیٰ کا خلق السمٰوات والارض کے ساتھ اگر مقابلہ کیا جائے تو ایک معمولی سا کام معلوم ہوتا ہے۔

اندریں حالات منکرین کی عقلوں پر کیوں پتھر پڑ گئے۔

(۵) پنجم. اللہ تعالیٰ نے احیاء اموات پر ایک ایسی دلیل قاطع بیان فرمائی جس کے سمجھنے کے بعد کوئی ذی عقل زندگی ثانی کا منکر نہیں رہ سکتا۔ الذی جعل لکم من الشجر الاخضر نارا اللہ تعالےٰ کی کمال قدرت اور اخراج الاموات من القبور پر صراحۃً دال ہے اور منکرین کے اس شبہ کا بھی جواب ہے جو نشأۃ ثانیہ کے انکار کے لئے پیش کیا کرتے ہیں. موت کی طبیعت بارد یابس ہے اور طبع حیات حار رطب. بارد یابس اور حار رطب کے درمیان تقابل تضاد ہے جب ان میں سے ایک چیز کسی محل میں حلول کرجائے تو دوسری کا آنا محال ہے۔ ورنہ تضاد قائم نہ رہے گا۔

اس کی یوں تردید کی گئی. شجر اخضر بھی حار رطب ہے اور نار حار یابس. جب ایک حار یابس کا حار رطب سے پیدا ہونا ممکن ہے تو بعد الموت زندگی کا آنا کیوں محال اور ممنوع ہے۔ روزمرّہ ہم دیکھتے ہیں کہ درختوں سے آگ نکلتی ہے۔ درختوں کی رطوبت حار یابس کے وجود کو فنا نہیں کرسکتی. اسی طور پر یُبسِ موت اور رطوبت حیات میں بھی کوئی رکاوٹ اور بندش نہیں ہوسکتی۔ اس کے علاوہ متضادین کا ایک وقت ایک محل میں ایک حیثیت سے جمع ہونا محال ہے۔ اور متضادین کا علےسبیل التبادل ایک محل میں آنا ممنوع نہیں جس طرح عدم ملکہ میں محل عدمی کا وجودی کے لئے قابل ہونا ضروری ہے اسی طرح تقابل تضاد میں ہر ایک کا محل دوسرے کی قابلیت رکھتا ہے صورتِ متنازعہ فیہ میں موت وحیات کو ایک محل میں جمع نہیں کیا گیا بلکہ بعد از زوالِ حیات موت آجاتی ہے اور موت کے ارتفاع کے بعد اسی مادّے میں حیات کا ظہور ہوجاتا ہے لہٰذا کوئی اعتراض ہی نہ رہا. ان وجوہات خمسہ کے علاوہ اس آیت سے اور بھی کئی طریقوں سے استدلال کیا جاسکتا ہے مگر سردست ان ہی پانچوں پر اختصار کیا جاتا ہے۔ واللہ اعلم

(۳) سوم. قیاس شبہ. اس کا اللہ تعالیٰ نے جہاں کہیں بھی قرآن کریم میں ذکر فرمایا ہے. کسی قابلِ مدح صورت میں اسکو بیان نہیں فرمایا. قیاس شبہ کا استعمال کرنے والے عام طور پر مبطل ودکاذب

ہوتے ہیں۔ سورۂ یوسف میں وارد ہے اِنْ یسرق فقد سرق اخٌ لہٗ من قبل۔ یہاں اصل فرع میں کوئی علت جامع بیان نہیں کی گئی اور نہ ہی دلیل علت میں اجتماع ہے۔ بغیر کسی علت جامع اصل فرع کا حکم ایک گردانا گیا۔ جو کسی عقلمند کے نزدیک قابل قبول نہیں۔ اس کی صورت تو صورت قیاس کی ہے مگر معنیٔ قیاس سے خالی ہے اس قسم کے قیاسات کو قیاس فاسدہ کے ساتھ ملقّب کیا جاتا ہے ایک شخص کا دوسرے کے لئے بھائی ہونا اس امر کو نہیں چاہتا کہ جو وصف کمال یا نقص ایک میں پایا جائے وہ خواہ مخواہ دوسرے میں بھی موجود ہو۔ یوسفؑ اور بن یمین کا باہم بھائی ہونا اس کا مقتضی نہیں کہ جو نقص و کمال ایک میں پایا جائے دوسرے میں بھی موجود ہو۔ اسی قیاس شبہ کی بنا پر کفار نے انبیاؑ کو یہ کہہ دیا مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا۔ مجرد صورت انسانی اور شکل آدمیت میں شرکت کے باعث انکی نبوّت رسالت کے منکر بن گئے۔ کیا روزمرّہ کے مشاہدات میں اس قسم کے نظائر و امثال کا مشاہدہ نہیں کیا جاتا۔ کہ ایک ہی گروہ اور فرقے کے بعض لوگ نہایت ہی باکمال ہو کر بام ترقی پر پہنچ جاتے ہیں۔ اور بعض ناقص الفہم کمزور عدیم الاستطاعت نہایت ہی بیکار اور ردّی ہوتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ نوع انسانی میں سے کسی فرد کو خلعتِ خلّت سے مشرف فرما کر باعث ہدایت بنائے تو اس میں کون استحالہ و استعجاب ہے۔

ایسا ہی کفار کا دوسرا قول اسی قیاس شبہ کی مثال بن سکتا ہے۔ وقال الذین کفروا وکذبوا بلقآء الاٰخرۃ واترفنٰھم فی الحیٰوۃ الدنیا ما ھٰذا الا بشرٌ مثلکم یاکل مما تاکلون منہ ویشرب مما تشربون۔

کفار نے صرف مساوات فی البشریت وخواص بشریت کو مشاہدہ کرتے ہوئے انبیاؑ کی نبوت ورسالت کا انکار کر دیا۔ ان کی نبوت و رسالت اس امر کو نہیں چاہتی کہ ان سے بشریت و خواصِ بشریت زائل ہو جائیں۔ نبوت ایک مخصوص تعلق باللہ کا نام ہے۔ جو انسانوں میں سے کسی خاص فرد کے لئے بطور خلعت انعامی طور پر مرحمت فرمایا جاتا ہے۔ کسبُ اکتساب سے اسکو کوئی تعلق نہیں نبی کی زندگی تمام لوگوں کی زندگی سے نہایت اعلیٰ وارفع اور پاکیزہ ہوتی ہے۔ اس کی تعلیم میں جاذبیت خاصہ پائی جاتی ہے۔ جو کسی دوسرے بشر کی تعلیم میں نہیں ہوتی۔ اس کے اخلاق

نہایت ہی پسندیدہ اور سنجیدہ ہوتے ہیں۔ اس کے افعال اور معاملات و امور معاشرتی کا معیار دوسرے لوگوں سے نہایت ہی بلند ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی صورت صورتِ بشری ہے اور خواص بشری سے بھی وہ متصف ہے مگر اس کے روحانی کمالات و باطنی ترقیات کی کوئی حد و انتہا نہیں۔ ظاہر بیں لوگوں نے صرف قیاس شبہ کی بنا پر ان کی نبوت کا انکار کر دیا۔ جہاں کہیں بھی قرآن کریم میں قیاس شبہ کا استعمال ہوا ہے مذموم رنگ میں اسے پیش کیا گیا ہے۔ فی الحقیقت قیاس کی پہلی دو قسمیں قابل توجہ و التفات ہیں۔ ہمارے علمائے اصول نے اثبات قیاس کیلئے قرآن حکیم کی صرف ایک آیت کو پیش کیا ہے فاعتبروا یا اولی الابصار۔ اگر صرف اسی آیت پر نظر ڈالی جائے، تو بھی قیاس کا اثبات تو ہو سکتا ہے مگر قیاس کی جس قدر اہمیت اور ضرورت ہے وہ ضرور اس بات کی مقتضی ہے کہ اسے متعدد آیات اور مختلف مثالوں سے واضح کیا جائے۔ آیاتِ امثال جس قدر بھی قرآن حکیم میں آئی ہیں یا امم سابقہ کی تخریب و تعمیر کے متعلق جو قصص مذکور ہوئے ہیں وہ سارے کے سارے قیاس کے ثبوت کے لئے شواہد صادقہ و ادلۂ قطعیہ ہیں۔

باوجود اس قدر دلائل پائے جانے کے جن لوگوں نے قیاس صحیح کا انکار کیا ہے انھوں نے غالباً قرآن کریم کی ان آیات یا امثال کو کما ینبغی مطالعہ نہیں فرمایا۔ اس موضوع پر جس قدر بھی لکھا جائے کم ہے۔ مگر بغرض کفایت و خوفِ ملامتِ سامعین اس وقت اسی پر اکتفا کی جاتی ہے۔ جس طرح امثال کے چند نمونے قرآن حکیم سے پیش کئے گئے ہیں اور بہت سے باقی ہیں اسی طور پر احادیث صحیحہ میں بھی امثال کا استعمال فرمایا گیا ہے۔ بلکہ تعبیر رؤیا بھی فن امثال کا ایک شعبہ ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے توفیق مرحمت فرمائی تو کسی دوسرے مقالہ میں امثال احادیث و تعبیر رویائے کے متعلق انشاء اللہ ایک مقالہ لکھا جائے گا۔

وَاٰخرُ دعوٰنا ان الحمدُ للہِ ربِّ العٰلمین وَصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خَلقِہ سیّدنا ومولٰنا محمدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحابِہٖ اَجْمَعِیْن۔

پولینڈ کی خارجی حکمت عملی

صلحنامہ ورسائی نے مشرقی یورپ میں ریاستوں کا جو نظام بنا کر کھڑا کیا وہ ایک محراب ہے جس کی ڈاٹ پولینڈ ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے اگر ہم یورپ کے نقشے کو ذرا پلٹ دیں اور شمال کے بجائے مشرق کو اوپر کی طرف رکھیں۔ تب ہم دیکھیں گے کہ ایک طرف اسکنڈے نیویا، فن لینڈ، بحر بالٹک کے ساحل کی جمہوری ریاستیں اور دوسری طرف چیکوسلواکیا، ہنگری، رومانیا، بلغاریہ اور یوگوسلاویا کی ریاستیں مل کر ایک محراب بناتی ہیں جو سوویٹ روس کا سارا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور جرمنی کو دبائے بھی ہے۔ اس محراب میں مرکزی حیثیت پولینڈ کی ہے۔ اور یہ ڈاٹ ایسی ہے کہ اگر کسی طاقت نے اسے اپنی جگہ سے ذرا بھی سرکا دیا تو ساری عمارت گر جائے گی۔ اگر پولینڈ کو ملک کی حیثیت سے دیکھیے تو وہ نہ مشرق کی طرف محفوظ ہے نہ مغرب کی طرف اور اس کے پڑوسی اس کو اپنا میدان جنگ بنانا چاہیں تو ان کے رستے میں کوئی قدرتی رکاوٹ حائل نہ ہوگی۔

اس حالت میں تو بحث کی گنجائش نہیں کہ پولینڈ والے ہر حالت میں اور ہر صورت سے اپنی آزادی اور خودمختاری قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ملک کے جغرافیہ اور یورپ کی سیاسیات کو دیکھتے ہوئے پولینڈ کی خارجی حکمت عملی مندرجہ ذیل اصولوں کی پابندی پر مجبور ہے:-

(۱) جہاں تک ممکن ہو بچا جائے کہ روس اور جرمنی پولینڈ کے خلاف متحد نہ ہونے پائیں۔

(۲) پولینڈ روس اور جرمنی کے درمیان توازن قائم کرکے ان میں سے کسی ایک کا اثر حد سے زیادہ نہ بڑھنے دے۔

(۳) پولینڈ کی اپنی طاقت اتنی ہو کہ اس کے پڑوسی اسے اپنا میدان جنگ نہ بنا سکیں۔ جن لوگوں کو امیدوں اور حوصلوں پر اعتماد نہیں ہوتا وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ پولینڈ کو بس اس کا انتظار رہتا ہے کہ وہ اپنی قسمت کو روس یا جرمنی کے ساتھ وابستہ کر دے۔ لیکن اس تدبیر پر

عمل نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ پولینڈ اپنی آزادی محفوظ رکھنا چاہتا ہے، اور اگر وہ کسی فریق کے ساتھ مل کر جنگ میں کامیاب بھی ہوا تو اس کا انجام یقیناً یہ ہوگا کہ اس کا زبردست دوست اسے ہڑپ کر جائے گا۔

مندرجہ بالا تین اصولوں میں ایک چوتھے اصول کا اضافہ کرنا ضروری ہے، اور وہ یہ کہ پولینڈ کبھی "زمین بند" ہونا گوارا نہ کرے گا۔



صلح نامہ ورسائی نے پولینڈ کو اس کا قدیمی صوبہ پومورز، جو بحر بالٹک کے کنارے پر تھا، اسے واپس دیدیا۔ یہی وہ "پولینڈ کا برآمدہ ہے" جس پر جرمنی لالچ کی نظریں ڈال رہا ہے۔ پولینڈ والے کبھی اس سے دست بردار نہ ہوں گے، اس لئے کہ سمندر کا یہ رستہ، جو ان کے ملک کو دنیا کی بڑی تجارتی شاہ راہوں سے ملا دیتا ہے ان کی معاشی آزادی ہی نہیں بلکہ ان کی سیاسی آزادی کی علامت اور اس کا ضامن ہے۔

ہم نے جو اصول بیان کئے ہیں وہ اس درجہ اہم ہیں کہ پولینڈ کے مدبران سے ہٹ نہیں سکتے، ور انفرادی طور پر محض غیر اہم تفصیلات میں اپنی شخصیت اور خیالات کو ظاہر کر سکتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہیں کہ ان کی پالیسی پر فرداً فرداً بحث کی جائے۔ پولینڈ کی قومی پالیسی ایک ہی ہو سکتی ہے، اور اس میں رد و بدل کی گنجائش نہیں۔

۱۹۲۱ء میں روس اور جرمنی کے درمیان ریاپولو کا صلح نامہ ہوا تو پولینڈ کے لئے بڑا خطرہ پیدا ہو گیا، کیونکہ اس میں اس اتحاد کے آثار تھے جو پولینڈ کے لئے یقیناً مہلک ہوگا۔ ایک سال پہلے روسی فوجیں وارسا کے دروازوں تک پہنچ گئی تھیں، اور مشرقی پرشیا کے جرمن "برآمدے" کے بنائے جانے سے اتنے خفا تھے کہ وہ روسیوں کا خیر مقدم کرنے کو تیار تھے۔ پولینڈ کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت جرمنی کی فوج لڑنے کے قابل نہیں تھی، اور مارشل پلسوڈسکی نے بولشویک حملہ آوروں کو سخت شکست بھی دیدی۔ بعد کو جب روس کے وزیر خارجہ لتوی نوف اور جرمنی کے وزیر راتھے ناؤ نے ریاپولو کا معاہدہ کیا تو فرانسیسی فوجیں جرمنی کو ڈرائے دبائے ہوئے تھیں، اور پولینڈ کو فرانس کی دوستی میں بڑا سہارا اور اطمینان ملا۔ لیکن "برآمدے" کے خلاف جرمن پروپیگنڈا کر کے پولینڈ والوں کو ستاتے رہے۔

جرمنی کی سرکاری فوج اور بولشویک سپاہ کا اتحاد عمل اور دوسری طرف رائن کے علاقے میں فرانسیسی فوجوں کی قوت میں کمی پولینڈ کی مختاری کے لئے ایک بڑھتا ہوا خطرہ تھا جب قسمت نے ہٹلر کو برسر اقتدار کر دیا۔ ہٹلر کو بولشویکوں سے جو نفرت تھی اس کو اس نے قومی مذہب بنا دیا، اور ادھر روس نے جرمنی کو قومی دشمن نمبر ا کا مرتبہ دیدیا۔ پولینڈ والوں کی جان میں جان آگئی۔ اب بس اتنی فکر باقی تھی کہ جرمنی اور روس کی قوت کا توازن قائم رہے۔

پولینڈ کے نزدیک اس کے دونوں پڑوسی ایک سی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان میں اور روسیوں میں مشترک خصوصیات کم ہیں، اور گذشتہ زمانے میں دونوں کے درمیان گہری عداوت ہی رہی ہے۔ لیکن اس وقت ان میں سے کوئی دوسرے پر حملہ کرنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ اس کے برخلاف پولینڈ اور جرمنی سرکاری طور پر ایک دوسرے کے ساتھ چاہے جتنی خیر خواہی کا اظہار کریں، پولینڈ والوں کے دل

"میں جرمنی کا مشرق کی طرف بڑھنے کا حوصلہ کدورت پیدا کرتا رہتا ہے" اور خود جرمن بھی اس کا ذکر چھیڑ کر کہ انھیں اوکرائن (یعنی مغربی روس) پر قبضہ کرنا چاہیئے بے چینی اور فکر کو بڑھاتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ڈانٹزگ سے ہیر نازی پارٹی کے لوگ مسلسل کوشش کیتے رہتے ہیں کہ اس شہر کو بین الاقوامی اتحاد کے اثر سے نکالیں، اور پولینڈ والے جانتے ہیں کہ چاہے اس وقت بین الاقوامی اتحاد کی مخالفت کی جا رہی ہو، آخر میں نقصان خود ہی اٹھائیں گے۔

پولینڈ والے یہ نہیں چاہتے کہ وہ اور روسی ایک دوسرے سے نمٹنے کے لئے چھوڑ دئے جائیں، لیکن جرمنی کو گھیرے رہنے کی تدبیریں کی جاتی ہیں اور پولینڈ اگر جرمنی کے خلاف کسی کے ساتھ شریک نہ ہو تو اسے حق ہے کہ وہ اس غیر جانب داری کے پورے پورے دام وصول کرے۔ ۱۹۳۴ء میں جب پولینڈ کی فوج جرمنی کی سرکاری فوج سے بہتر حالت میں تھی اور اس کا بھی ڈر نہیں تھا کہ روسی پشت ماریں گے، تو مارشل پلسودسکی کو اس سلسلے میں ایک کارروائی کرنے کا موقع ملا۔ ڈانٹزگ کے آزاد شہر میں نازی اپنی قوت کا بیجا مظاہرہ کر رہے تھے اور نازی حکومت نے ان کی بیجا ہمت افزائی کی۔ نازی اس کی کوشش کر رہے تھے کہ ایک علاقے پر جو صلح نامے کے ذریعے سے پولینڈ کے سامان جنگ وغیرہ جمع رکھنے کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے قبضہ کر لیں۔ مارشل پلسودسکی نے ایک دستہ اس علاقے میں بھیج دیا، سرحد پر ایک فوج کھڑی کر دی، اور سفیر کے توسط سے ہٹلر سے دریافت کیا کہ وہ صلح چاہتا ہے یا جنگ۔ لڑنا اس وقت ہٹلر کے بس کی بات نہ تھی، اس وجہ سے اس نے ایک معاہدہ پیش کیا جس میں "برآمدہ" کے خلاف دس برس کے لئے ہر قسم کا پروپگنڈا اور ڈانٹزگ میں پولینڈ کے خلاف کارروائیاں بند کرنے کی تجویز تھی اور اس کے ساتھ یہ شرط کہ دونوں فریق میں سے کوئی بھی دوسرے سے جنگ نہ چھیڑے۔ یورپ میں سب کو خیال ہوا کہ جرمنی اور پولینڈ کے درمیان اتحاد ہوا ہے لیکن خود مارشل پلسودسکی کو کسی طرح کی غلط فہمی نہیں تھی، وہ جرمنی کی کمزوری سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔

خاص پولینڈ کے مفاد کو دیکھا جائے تو مارشل پلسودسکی کی چال کامیاب ثابت ہوئی، اور جرمنی؟

دباؤ پولینڈ پر ڈال رہا تھا وہ ہر طرف کم پڑ گیا۔ اس کے بجائے جرمنی نے آسٹریا کی طرف رجوع کیا۔ وہاں کے معاملات سے ہمیں بحث نہیں، لیکن جرمنی کے طرزِ عمل کا نتیجہ یہ ہوا کہ اٹلی، انگلستان اور فرانس نے شسٹریزا میں گفت گو کر کے جرمنی کی مخالفت کا ارادہ کیا۔ پولینڈ کے لئے جرمنی کا جنوب کی طرف بڑھنا مضر نہیں تھا، مگر جو رکاوٹ جرمنی کے لئے آسٹریا میں شسٹریزا کے اتحاد نے پیدا کی وہ دوسری طرف چکوسلوواکیا اور روس کے اتحاد کی صورت میں پہلے سے موجود تھی۔ لہٰذا یورپ کو جرمن جنگجوئی سے محفوظ رکھنے کے لئے اٹلی اور روس میں سمجھوتے کی کسر رہ گئی۔

جنوب اور جنوب مشرق میں مورچہ بندی ہو جانے کا یہ نتیجہ ہو سکتا تھا کہ جرمنی مشرق کی طرف پھٹ پڑے لیکن پھر جینیوا میں حبش کے معاملے پر جھگڑا ہو گیا، اور اٹلی پر جو معاشی پابندیاں عاید کیں انھوں نے شسٹریزا میں قایم کئے ہوئے اتحاد کو توڑ دیا۔ جرمنی نے اٹلی کی آڑے وقت میں دست گیری کی اور انحاد بین الاقوامی کی نمائندہ قوتوں نے جو معاشی ناکہ بندی کی تھی اس کا مقابلہ کرنے میں مدد کی۔ انگلستان اور فرانس میں اس بات پر جوتی پیزار چل رہی تھی کہ اٹلی کے معاملے کا فیصلہ کیوں کر کیا جائے، جرمنی کو اپنے پھیلاؤ کا سارا زور مغرب کی طرف منتقل کرنے کا موقع مل گیا، اور ۷ مارچ ۱۹۳۶ء کو جرمن فوج رہائن کے اس علاقے میں داخل ہو گئی جہاں صلح نامہ ورسائی کے رو سے فوج رکھنے کی ممانعت تھی۔ انگریزی فرانسیسی اتحاد کی طرف سے اس چال کا کوئی جواب نہیں دیا گیا، جرمنی ان میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرتا رہا اور اٹلی اس منظر کو الگ سے ایک تماشا سمجھ کر دیکھتا رہا۔

جرمنی کا دباؤ مغرب کی طرف منتقل ہو جانے پر پولینڈ کی سیاست خارجہ کو پھر ہاتھ پیر ہلانے کی آزادی مل گئی۔ اب پولینڈ کا پوزیشن اس وجہ سے اور بھی مضبوط ہو گیا تھا کہ فرانس کو اس فوجی اتحاد کو تازہ کرنے کی فکر تھی جو پہلے ان دونوں قوتوں کے درمیان ہوا تھا، اور پولینڈ کو اس طرح جنگی سامان کی تجدید کے لئے وہ سرمایہ مل گیا جو وہ ایک مدت سے مانگ رہا تھا۔ جرمنی اس کارروائی کو تیکھی نظروں سے دیکھتا رہا۔ مگر کچھ کر نہ پایا۔ کیونکہ ہٹلر نے نورن برگ میں بولشویکوں کے خلاف جس

جہاد کا ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کیا تھا وہ کوئی عملی صورت اختیار نہ کرسکا تھا، اور پولینڈ پر یہ جتانے کی ذمہ داری نہ رہی تھی کہ جرمنی اور روس میں چل گئی تو وہ کس کا ساتھ دے گا۔ پولینڈ کی خارجی حکمت عملی کے مقاصد کو دیکھتے ہوئے پچھلے سال خزاں میں کرنل بک نے لندن کا جو سفر کیا وہ بہت کامیاب ہوا۔ اس وقت پھر اس مسئلے پر بحث کی جاسکتی تھی کہ پولینڈ فرانسیسی انگریزی اتحاد میں شامل ہو جائے، پولینڈ یہ ظاہر کرکے کہ یورپ میں وہ کسی کی طرفداری نہ لے گا انگریزی پالیسی سے قریب تر ہوگیا، اور اس کا بھی اسے بہت جلد ایک موقع مل گیا کہ اس معاملے میں اپنا خلوص بھی ثابت کردے۔ جب جرمنی اور جاپان کے درمیان معاہدہ ہوا تو جرمنی کی طرف سے یہ دریافت کیا گیا کہ پولینڈ بولشویکوں کے خلاف محاذ قائم کرنے کی دعوت قبول کرے گا یا نہیں، اور پولینڈ نے یہ واضح کردیا کہ وہ کسی ایسی فرقہ بندی میں شریک نہ ہوگا۔ اس انکار پر انگلستان میں بہت اطمینان ظاہر کیا گیا، سٹاک ایکسچینج کا نرخ بڑھ گیا، کیونکہ سب یہ جانتے ہیں کہ جب تک پولینڈ کسی ایک فریق کے ساتھ مل نہ جائے ہٹلر اور سٹالن ایک دوسرے کو چلا چلا کر گالیاں چاہے دیتے رہیں سچ مچ لڑنا نہیں شروع کرسکیں گے۔

بین الاقوامی سیاست کا یہ مختصر خاکہ یہ دکھانے کی غرض سے پیش کیا گیا ہے کہ پولینڈ کی حکمت عملی کا یہ بنیادی اصول ہے کہ جرمنی اور روس کے درمیان توازن قائم رکھے۔ لیکن اس پر وہ اس طرح عمل نہیں کرسکتا کہ شبہے اور شک کی گنجائش نہ ہو۔ اس کا سبب چند رکاوٹیں ہیں جن میں سے بعض خود پولینڈ والوں نے اور بعض موجودہ حالات نے پیدا کی ہیں۔

یہ تو سمجھنے کی بات ہے کہ ضرورت کے وقت جرمنی کے خلاف روس کی مدد کرنے کی دھمکی پولینڈ کے لئے موجودہ سیاسی بازی کی ترپ چال ہے، لیکن روس میں ایک طرح کی دوئی ہے جو اس چال کو مشکل کرتی رہتی ہے۔ سٹالن ایک مطلق العنان قومی سردار بنتا جاتا ہے، لیکن وہ اس انقلابی بولشوزم کا صدر پرویہست بھی ہے جو دنیا میں اپنا مذہب پھیلانا چاہتی ہے، لتوی نوف کی قومی پالیسی میں بین الاقوامی کو سیونسٹ اتحاد کی اغراض دخل دیتی رہتی ہیں، اور ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنا دشوار ہو جایا کرتا ہے۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ پولینڈ کے موجودہ رہبر مارشل پلسوڈسکی کے پیرو ہیں، پچھلی جنگ میں

وہ روسیوں کے خلاف لڑے تھے اور روسیوں کو پولینڈ کے جانی دشمن سمجھنا ان کی گھٹی میں ملا ہے۔
۱۹۲۰ء میں بولشویک فوجوں سے سخت جنگ ہوئی تھی اور قوم کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ ان سب باتوں نے ایک عداوت پیدا کر دی ہے جو حق بجانب ہے، مارشل پلسودسکی روسیوں کو ناپسند کرتا تھا، مگر قومی اغراض اور مفاد کو پہچاننے کی اس میں اتنی صلاحیت تھی کہ وہ عداوت کے اس جذبے کو دبا سکا۔ اس کے وارث بھی یہی سبق سیکھ رہے ہیں، مگر اسے ذہن نشین کرنے میں انھیں ابھی کچھ دیر لگے گی۔

پھر چکوسلوواکیا کا معاملہ ہے۔ پولینڈ اور چکوسلوواکیا کا اصل مفاد دوستانہ تعلقات قائم رکھنے میں ہے، لیکن ان کے درمیان تیشن کے علاقے کا جھگڑا صلح و رسائی کے زمانے سے بگاڑ پیدا کرتا چلا آرہا ہے۔ اس کا ذمہ دار دونوں ملکوں میں سے کوئی ایک بھی نہیں، مگر اس کو کیا کہیئے کہ ابھی حال تک دونوں نے سفارت کے لئے ایسے نمائندوں کا انتخاب کیا جو تیز مزاج اور طبیعتاً تعلقات کو خراب کرنے کی طرف زیادہ مائل تھے۔ (تلخیص۔ Slavonic Review)

تاریخ الامت

ابتدائے رسالت سے آخر زمانۂ خلافت عثمانیہ تک تمام ضروری معلومات اور مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر نہایت سلیس اور دلچسپ عبارت میں کیا گیا ہے۔

اسلامی تاریخ کا یہ سلسلہ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے بڑی جانفشانی اور تحقیق سے مرتب فرمایا ہے ملک کی متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہے۔ بالخصوص ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلبا کے لئے نہایت مفید ہے طباعت وکتابت نہایت عمدہ۔

حصہ اول	سیرۃ الرسولؐ	قیمت	[illegible]	مجلد	[illegible]
حصہ دوم	خلافت راشدہ	قیمت	[illegible]	"	[illegible]
حصہ سوم	خلافت بنی امیہ	قیمت	[illegible]	"	[illegible]
حصہ چہارم	خلافت عباسیہ	قیمت	[illegible]	"	[illegible]
حصہ پنجم	عباسیہ بغداد	قیمت	[illegible]	"	[illegible]
حصہ ششم	عباسیہ مصر	قیمت	[illegible]	"	[illegible]
حصہ ہفتم	خلافت عثمانیہ	قیمت	[illegible]	"	[illegible]

نوٹ۔ جو صاحب یہ مکمل سلسلہ بہ یک وقت طلب فرمائیں گے ان کو پورا سٹ مجلد پیش کیا جائے گا۔ اور قیمت غیر مجلد کی لی جائے گی۔ جلدیں نہایت اہتمام کے ساتھ اچھے مضبوط کپڑے کی تیار کرائی گئی ہیں جس پر کتاب اور مکتبہ جامعہ کا نام بلاک سے چھپوایا گیا ہے۔ جلد پر ایک خوشنما کاغذ کا کور ہے۔ اس کی طباعت بھی بلاکوں سے کی گئی ہے۔

حصص اول و دوم طلبا کی ضروریات کے خیال سے چھوٹے سائز پر بھی شائع کئے ہیں اور ان کی قیمت ہر ایک کی ایک ایک روپیہ ہے۔

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

باسمہ

جامعہ

زیر ادارت ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی

جلد ۲۷	اپریل سنہ ۱۹۳۷ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

۱	ہمارے مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم	ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب استاذ جامعہ عثمانیہ	۲۵۹
۲	روسو	پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے آکسن استاذ جامعہ	۲۷۱
۳	رفتار عالم	....	۲۹۷
۴	التفہیمات الالٰہیہ	مولانا اسلم جیراج پوری	۳۰۳

ضمیمہ۔ جدید دستور کا خاکہ ..... از ۱ تا ۳۰

قیمت سالانہ عہ | فی پرچہ ۸

پرنٹر پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) نے محبوب المطابع برقی پریس میں چھپوا کر شائع کیا

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شایع کی ہیں جو حضرات جس خاص مضمون یا شعبے سے دلچسپی رکھتے ہوں، ازراہِ کرم مطلع فرمائیں مطبوعہ فہرست فوراً حاضر کی جائے گی۔ چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں:۔

۱) **مطبوعاتِ جامعہ** ۔ جامعہ کی شایع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست۔

۲) **ناشرینِ اُردو** ۔ جامعہ کے علاوہ اُردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ۔

۳) **مصنفینِ اُردو** ۔ مشہور مصنفین، مترجمین و مولفین اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

۴) **بچوں کی کتابیں** ۔ بچوں کے لئے اُردو کی کتابوں کی فہرست۔

۵) **عورتوں کی کتابیں** ۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابیں۔

۶) **مختصر فہرستِ کتب** ۔ کتبِ اُردو کی تقریباً ایک ہزار مشہور کتابوں کی فہرست۔

۷) **ادبی کتابیں** ۔ تاریخ و تنقیدِ ادب، مقالات و انشا، ناول، افسانہ، نظم، ڈراما، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اُردو کتابوں کی مکمل فہرست۔

۸) **مذہبی کتابیں** ۔ ڈھائی سو منتخب مذہبی کتابوں کی فہرست۔

۹) **تاریخی کتابیں** ۔ پانچسو منتخب تاریخی کتابوں کی فہرست۔

۱۰) اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاقیات، طبیعات، کیمیا، طب، حفظانِ صحت، زراعت اور صنعت و حرفت پر اُردو کی تمام کتابوں کی مکمل فہرست زیرِ طبع ہے۔ عنقریب شایع ہوگی۔

جامعہ اسلامیہ دہلی

ہمارے مدارس میں تاریخ ہند کی تعلیم

اس زمانے کے ایک مشہور فلسفی مورخ کروچے کا خیال ہے کہ ماضی کی تاریخ بڑی حد تک حال کی تاریخ سے عبارت ہوتی ہے۔ اسی خیال کو ہمارے الہامی شاعر غالب نے کس خوبی اور لطف سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

بنام وآئینہ حرف جم وسکندر چیست
کہ ہرچہ رفت بہر عہد در زمانۂ تست

یہ تاریخی حقایق کو سمجھنے کا خالص موضوعی (SUBJECTIVE) نقطہ نظر ہے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ کی حیثیت محض آرٹ کی رہ جاتی ہے جسے معروضی (OBJECTIVE) حقایق سے زیادہ ذہن انسانی کی کارفرمائی سے تعلق ہے۔ لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ معروضی حقایق کی طرف سے آنکھ بند کرکے تاریخ کو افسانوی حیثیت دے دی جائے۔ دراصل تاریخ کی تحقیق میں موضوعی اور معروضی دونوں طریقے استعمال ہونے چاہئیں۔ جس طرح ماضی حال سے بالکل علیحدہ نہیں ہوسکتا بلکہ اس کے اندر مضمر رہتا ہے اسی طرح مورخ بھی حقایق کا تصور بغیر اپنی ذہنی کیفیات کے رنگ کے نہیں کرسکتا۔ لیکن باوجود آرٹ ہونے کے تاریخ بعض اٹل قوانین کی پابند ہوتی ہے۔ وہ قوانین ویسے ہی اٹل ہوتے ہیں جیسے طبیعات کے قوانین چونکہ تاریخ کا موضوع حرکت انسانی اجتماعی زندگی کا نشیب و فراز ہے اس واسطے اس کے قوانین بھی انسانی اور اخلاقی حیثیت رکھتے ہیں۔ قوموں کا عروج و زوال، بعض گروہوں کا ابھرنا اور بڑھنا اور دوسروں کا گرنا، گھٹنا ایسے اجتماعی مظاہر ہیں جن کی توجیہ اخلاقی قوانین کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ کیا یونہی بلا کسی سبب کے ہے کہ بعض اقوام تمدن کی سربراہی اور سرفرازی حاصل کرتی ہیں اور دوسرے ان کا تتبع کرنے پر مجبور ہوتے ہیں؟ نہیں، ان اجتماعی مظاہر کے قوانین ہونے چاہئیں اور ہمیں مورخ کا فرض ہے کہ ان کی

تحقیق کرے اور انھیں اجاگر کرے۔ موضوعی اور استخراجی طریق تحقیق کے یہ معنی ہرگز نہ سمجھے جائیں کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے واقعات کی توجیہہ کرے۔ اس کے لئے بھی بعض کلیات کی پابندی ضرور ہوگی ورنہ ذہنی انتشار کا خطرہ ہے۔

واقعات کی توجیہہ اور ان کی چھان بین نہایت مشکل کام ہے جس کے لئے خاص سلیقہ کی ضرورت ہے۔ مورخ کو اس میں بڑی دشواری پیش آتی ہے کہ وہ واقعات کے انبار میں سے کیا چنے اور کیا چھوڑے اور کس واقعہ کو زیادہ اہمیت دے اور کس کو کم۔ بالخصوص ہندوستان جیسے ملک کی تاریخ میں یہ کام اور زیادہ دشوار ہو جاتا ہے اس لئے کہ یہاں کی تاریخ مختلف نسلوں، قبیلوں، مذہبوں اور تہذیبوں کے باہمی تصادم و تعاون کا نتیجہ ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تاریخ ہند میں ہم اہم اور غیر اہم کا فیصلہ کس اصول پر کریں؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کے انتخاب میں مورخ کی ذاتی رائے اور اس کے ذہنی رجحان کا رنگ غالب آجائے گا۔ ہمارے نزدیک اشخاص کو زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہئے یا مجرد واقعات کو؟ یہ سوال بھی بہت مشکل ہے۔ تاریخ ہند کا ہر محقق جانتا ہے کہ اس ملک کے نشو و نما میں بادشاہوں، سرداروں، مدبروں، اور مہاتماؤں سب ہی نے حصہ لیا ہے۔ اس لئے مجرد واقعات کو بغیر اشخاص کے حالات معلوم کئے سمجھنا ناممکن ہے۔ تاریخی واقعات اشخاص ہی کی تخلیقی کوششوں سے پیدا ہوتے ہیں، ان ہی کی مساعی سے زمانہ کی رفتار بدلتی ہے اور اجتماعی جسم میں اشخاص ہی کا نفس گرم زندگی کی نئی روح پھونکتا ہے۔ میں روح عصر کا منکر نہیں جو اشخاص کو اپنے مقاصد کا آلہ کار بناتی ہے لیکن اس کے تسلیم کرنے سے خود اشخاص کی اہمیت مورخ کے لئے کسی طرح بھی کم نہیں ہو جاتی۔ اشخاص تاریخ میں نشان منزل کا کام دیتے ہیں۔ بغیر ان کے تاریخی واقعات کا انبار طالب علم کے لئے بے معنی چیز ہے۔

بعض اوقات جماعتیں اور گروہ اپنے مخصوص مفاد کے تحفظ کے لئے غلط واقعات کو حقائق تسلیم کرکے ان کی توجیہہ سے اپنی اغراض وابستہ کر لیتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ہمارے مدارس میں انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخیں پڑھائی جاتی تھیں جو حکمراں طبقہ کے مخصوص نقطہ نظر سے لکھی گئی تھیں۔ مثلاً ہماری

تاریخوں میں کلکتہ کی "کالی کوٹھری" کا واقعہ عام طور پر ملتا ہے ۔ جدید معروضی تحقیق نے پورے طور پر ثابت کر دیا ہے کہ یہ واقعہ غلط ہے ۔ لیکن ابتدائی انگریزی استعماریت کو اس ملک میں اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لئے اس قسم کے افسانوں کو بار بار دہرانا اور ان کی نشر و اشاعت کرنا ضروری تھا تاکہ ہندوستان آنے والے انگریزوں کی قومی عصبیت کمزور نہ ہونے پائے ۔ اسی طرح انگریزوں کی لکھی ہوئی تاریخوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی کشیدگی کو بہ نسبت ہم آہنگی کے زیادہ اجاگر کر کے دکھایا گیا ہے ۔ یہ بات بھی محض اتفاقیہ نہیں ہے بلکہ اس کی تہ میں شہنشاہی مقاصد کام کر رہے ہیں ۔

غرضکہ تاریخ ہند میں ان سب باتوں نے اس لئے راہ پائی کہ معروضی حقائق سے دیدہ و دانستہ چشم پوشی کی گئی اور رائے یا خواہش کو حقیقت سمجھ لیا گیا ۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ تاریخ ہند لکھنے والے کو دنیا کے کسی دوسرے ملک کی تاریخ لکھنے والے کی طرح یہ دشواری پیش آتی ہے کہ ایک واقعہ کی اس کو مختلف شہادتیں ملتی ہیں جو آپس میں متضاد ہوتی ہیں ۔ اس وقت اس کا یہ فرض ہے کہ نہایت دیانتداری کے ساتھ چھان بین سے کام لے اور عام حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے حتی المقدور معروضی حقایق کی بنا پر اپنے نتائج اخذ کرے ۔ تاریخ کا بہترین طریقہ تحقیق وہ ہے جس میں معروضی اور موضوعی دونوں طریقوں سے کام لیا جائے ۔ جس طرح موضوعی تاریخ میں خیالی واقعات کے راہ پانے کا اندیشہ ہے وہاں معروضی تاریخ میں یہ خطرہ مضمر رہتا ہے کہ خشک اور ایک دوسرے سے بے تعلق واقعات ساری بحث کو بے معنی نہ بنا دیں جن میں زندگی کا ربط اور نام کو نہ ہو ۔ بلاشبہ تاریخ کی بنیاد معروضی حقایق ہیں جو عالم وجود میں آ چکے ہیں لیکن ان کی تاویل و توجیہ میں موضوعی طریقہ تحقیق سے کام لئے بغیر چارہ نہیں ۔ انسانی حقایق کو اسی وقت سمجھا جا سکتا ہے جبکہ انہیں کسی نقطۂ نظر یا خاص تصورات کے تحت سمجھنے کی کوشش کی جائے ۔ یا یوں کہیے کہ تاریخ میں کوئی نہ کوئی انسانی مقصد پوشیدہ رہنا چاہیے ۔

بدقسمتی سے ہمارے مدارس میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں وہ زیادہ تر واقعات و سنین کا ایک بے ربط انبار ہوتی ہیں ۔ ان میں کوئی مقصد نہیں ہوتا ۔ طالب علم ہر واقعہ کو اس کے پس منظر سے علیحدہ کر کے اپنے تصور میں جگہ دیتا ہے ۔ استاد کا فرض ہے کہ وہ بتائے کہ اجتماعی زندگی کے مختلف

واقعات میں ایک طرح کا ربط پنہانی پایا جاتا ہے۔ ان کے اسباب و علل پر اگر غور کیا جائے تو وہ سب ایک زنجیر کی کڑیاں نظر آئیں گی۔ انہی واقعات کے تانے بانے سے جسدِ قومی کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنی زندگی میں رخنوں کو راہ دیتے ہیں۔

تاریخ ہند کی ہندو مسلم اور برطانوی عہدوں میں جو تقسیم کی گئی ہے وہ جدید تاریخی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں۔ اس کے بجائے قدیم، متوسط اور عہدِ جدید کی تقسیم بہتر ہے تاکہ طالب علم کے ذہن میں زمانے کا تصور فرقہ وارانہ یا نسلی تعصب کے ساتھ نہ پیدا ہو۔ زمانے کی ادوار میں تقسیم مورخ کی خود اختیاری ہوتی ہے اس واسطے کہ قطعی تقسیم تو محال ہے۔ مثلاً آپ کوئی لمحہ یا تاریخ ایسی نہیں بتا سکتے جس وقت سے کہ انگریزی راج شروع ہوا۔ بعموم ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی یا ۱۷۶۴ء کی جنگ بکسر کے بعد سے برطانوی عہد کو شروع کرتے ہیں۔ حالانکہ آپ جانتے ہیں کہ یہ دونوں مذکورہ بالا تاریخی واقعات اس تاریخی رجحان کے مظاہر ہیں جو بہت پہلے سے ہندوستان میں موجود تھا اور جو ان واقعات کے بعد سے زیادہ شدید اور قوی ہو گیا۔ اسی طرح اسلامی عہد کی تاریخ کا آغاز محمود غزنوی کے حملوں سے ہونا چاہئے یا ۱۲۰۶ء سے جبکہ قطب الدین ایبک نے دلی میں ایک مرکزی حکومت کی بنا ڈالی اور اسلامی ہند کی سیاست کو عملی حیثیت سے بیرونی اثرات سے آزاد کرا لیا۔ بہرحال زمانے کی تقسیم سے مطالعہ میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے اس واسطے کہ ماضی کی گرفت کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کے ٹکڑے کر دیے جائیں۔ ازمنۂ وسطیٰ کا نام سنتے ہی ہمارے ذہن میں معاً ایک ایسا جامع تصور آجاتا ہے جو اس زمانے کی پوری حیات اجتماعی پر حاوی ہوتا ہے۔ جاگیرداری، 'کلیسا' اور تمدن و معاشرت کی ایک جیتی جاگتی تصویر زندگی کے سارے خط و خال کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ ادوار کی تقسیم در اصل تاریخ میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔ زندگی میں یکایک تغیرات پیدا نہیں ہوتے۔ ہاں، اہم رجحانات پیدا ہوتے رہتے ہیں جن کی نشان دہی طالب علم کو کرانا ضروری ہے تاکہ وہ واقعات کے تانے بانے کا کھوج لگا سکے۔ جس طرح انفرادی تجربات کے نقوش انسان کے حافظہ میں محفوظ رہتے ہیں اسی طرح اجتماعی اعمال کے نقوش زمانے کے موقلم سے قرطاس تاریخ پر بنائے جاتے ہیں۔ ایک طرف

اجتماعی زندگی کے رجحانات اور دوسری طرف اشخاص کی قوت ارادی کی کارفرمائی ان نقوش کے لیے رنگ و روغن کا کام دیتے ہیں۔

ہر زمانے کی تاریخ نویسی کا ایک مخصوص انداز ہوتا ہے۔ آج کل تاریخ کا مطمح نظر محلات کی سازشوں، جانشینی کے جھگڑوں اور لشکروں کی نقل و حرکت کی تفصیلات کے ماسوا اور بھی کچھ ہے۔ اب لشکر گاہوں کی شان و شوکت سے زیادہ عوام الناس کی زندگی کی طرف مورخ توجہ کرتا ہے اس لئے کہ اسے سمجھے بغیر کسی گروہ کی سیاست، معاشرت یا اقتصادی نظام کا آپ پتہ نہیں لگا سکتے۔ تاریخ ہند میں بھی اس کی ضرورت ہے، کہ قومی نظم، تربیت اور تہذیب و تمدن کو بہ نسبت جدال اور لشکرکشیوں کے زیادہ اہمیت دی جائے۔ دراصل اس وقت ہم تاریخ کو جس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں چند صدی قبل کا مورخ اس نقطہ نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔ ہمارے اخلاقی اور ذہنی معیار بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ ہم اگلے زمانے کی تاریخ نویسوں پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ وہ بہت ہی معمولی اور جزوی باتوں پر تو صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالتے ہیں لیکن اپنے زمانے کے طور طریقوں، صنائع اور فنون اور تمدن و معاشرت کے متعلق کچھ نہیں لکھتے۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو معلوم ہو کہ ہم جن واقعات کی تفصیل کی پرانے مورخوں سے توقع کرتے ہیں وہ بیجا ہے۔ دراصل ہماری یہ توقع عکس ہے ہماری اپنی زندگی کا۔ ہمارے زمانے میں اجتماعی زندگی نے انفرادی زندگی پر بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اب معاشرہ کو خود اپنے وجود کا احساس ہو گیا ہے۔ آج کسی ایک فرد کی زندگی، چاہے وہ فرد کتنے ہی بڑے مرتبہ کیوں نہ ہو قومی تاریخ سے عبارت نہیں ہو سکتی۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ قومی تاریخ کے ایک کسی گوشہ کو وہ اجاگر کر سکتی ہے۔

ہمارے مدارس کی مروجہ تاریخوں میں تصادم اور جنگوں کا اس شان سے ذکر ہوتا ہے کہ طالب علم کے ذہن و حافظہ میں سوائے ان کے اور کوئی نقوش مشکل ہی سے باقی رہ سکتے ہیں۔ ہماری تاریخوں سے بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے تھے۔ امن کے مشاغل گویا اس ملک میں کبھی پنپے ہی نہیں۔ لیکن یہ سراسر غلط ہے۔ جنگ اگرچہ ایک تلخ اور ناگزیر حقیقت ہے لیکن تاریخ صرف اسی سے عبارت نہیں ہو سکتی۔ بالخصوص ہندوستان کی عہد وسطیٰ کی تاریخ میں سوائے جنگوں کے اور کچھ

طالب علم کو بتایا ہی نہیں جاتا۔ بلاشبہ مسلمانوں نے ہندوستان میں فتوحات حاصل کیں۔ لیکن اس کے ساتھ انھوں نے اس ملک کو اپنا وطن بنایا۔ اس کی خاطر اپنا خون بہایا۔ اس ملک کے عام نراج میں ایک مستحکم مرکزی حکومت قایم کی۔ یہ سب حال ہمیں مروجہ تاریخوں میں نہیں ملتا۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اشوک اعظم کے بعد مسلمانوں ہی کی بدولت ہندوستان کو سیاسی وحدت نصیب ہوئی۔ انھوں نے یہاں ایک بین ہندی تمدن کی بنا ڈالی اور ایک بین ہندی زبان نے ان ہی کے آغوش میں نشو ونما پائی جو آج ہماری قومی زبان کہلاتی ہے۔ نظم ونسق اور فنون وصنائع کے شعبہ میں ان کی وجہ سے ترقی ہوئی۔ ان کی بدولت اس ملک کی اجتماعی زندگی کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا اور ہندوستان دنیا کے اہل علم و کمال کا مرکز بن گیا ان ہی کے توسط سے ہندوستان نے دنیا کے اور دوسرے ممالک کے ساتھ روابط استوار کئے۔ یہ سب باتیں ہمارے طالب علم کو معلوم ہونی چاہیں لیکن ہماری تاریخوں میں ان کا ذکر یا تو بالکل نہیں ملتا اور اگر ملتا ہے تو نہایت اجمال سے۔

میں نے ابھی اس امر کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہماری تاریخ ایک بے مقصد تاریخ ہے۔ اس بے مقصدی کی وجہ سے ہماری تاریخ کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اُکھڑی اُکھڑی باتیں کرے جن میں کوئی ربط نہ ہو اور یہ بھی پتہ نہ چلے کہ آخر گفتگو کرنے والا کہنا کیا چاہتا ہے۔ یورپ کے مدارس میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں کوئی نہ کوئی اجتماعی مقصد ضرور پیش نظر رکھا جاتا ہے تاریخ کے ذریعہ سے ہوشمند مملکتیں اپنی آئندہ نسلوں کو قومی ذمہ داریوں کے لئے تیار کرتی ہیں۔ اگر حقایق کو پس پشت نہ ڈالا جائے تو میرے خیال میں اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ آپ اپنے نوجوانوں کے سامنے قومی ضروریات اور مصالح کے تحت ایک خاص مطمح نظر پیش کریں۔ دراصل ہمارے ملک کی تاریخ میں متحدہ قومیت کا تخیل پیش کرنا مورخ کے لئے بہت ضروری ہے۔ اتحاد و یکجہتی کے جو رجحان ہماری ازمنۂ وسطیٰ اور زمانۂ حال کی تاریخ میں ملتے ہیں ان کو اجاگر کرکے دکھانا چاہئے۔ لیکن یہ کام نہایت دشوار ہے اور اس کے لئے بڑے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ تاریخ کا کام یہ نہیں کہ وہ کسی خاص مسلک یا نقطۂ نظر کا پروپگنڈا کرے اپنے خیال کو پیش کرنے میں اسی لئے مورخ کو بڑی احتیاط لازم ہے۔ جتنی زیادہ اس کی نظر وسیع ہوگی اتنا ہی اس کو

اس کا سلیقہ حاصل ہوگا کہ وہ تعمیری تصورات کو جو قومی زندگی کے لئے بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور اس کو فروغ دینے میں مدد معاون ہوتے ہیں، نوجوانوں کے سامنے پیش کرسکے۔

ہندوستان کی تاریخ میں مرکز پسند اور مرکز گریز قوتوں کا تعامل ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ دونوں قوتیں ہماری اجتماعی زندگی میں شروع سے آج تک برابر کارفرما رہی ہیں اور دونوں کے پیش نظر بعض نہایت اہم مقاصد رہے ہیں۔ ان قوتوں کی توجیہ کے ذریعہ ہم بعض نہایت پیچیدہ تاریخی مسائل کو علمی حیثیت سے سلجھا سکتے ہیں۔ مثلاً اشوک اعظم کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نے سیاسی حیثیت سے مرکز گریز قوتوں کو کمزور کرکے سارے ہندوستان کو سیاسی وحدت میں منسلک کیا اور اس کے ساتھ بدھ مت کے ذریعہ مذہب و معاشرت کی مرکز گریز قوتوں کا خاتمہ کیا۔ معاشری اعتبار سے برہمنیت ایک مرکز گریز قوت ہے اس لئے کہ وہ معاشرہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرالتی ہے اور ذاتوں میں اس کو تقسیم کردیتی ہے۔ بدھ مت کے انسانی مساوات کے اصول کو ہم مرکز پسند قوت سے تعبیر کریں گے۔ مسلمانوں کے زمانے میں سیاسی حیثیت سے مرکز پسند قوتوں کو فروغ حاصل ہوا لیکن چونکہ انھوں نے اس ملک کے لوگوں کے مذہبی، معاشری معاملات میں دخل اندازی نہیں کی اس لئے معاشری اعتبار سے مرکز گریز قوتوں کو نشو ونما پانے کا پورا موقع ملا۔ کم وبیش ہمارے عہد جدید کی تاریخ میں بھی آپ یہی حالت پائیں گے۔ اگرچہ مسلمانوں کے زمانے میں ہندو سماج میں بعض ایسی معاشری تحریکیں وجود میں آئیں جو سماج میں ہم آہنگی قایم کرنا چاہتی تھیں لیکن پورے طور پر انھیں کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

تاریخ ہند میں آپ نے اکثر پڑھا ہوگا کہ اورنگ زیب اچھا حکمراں نہیں تھا یا یہ کہ سیواجی اچھا شخص تھا یا برا حکمراں تھا۔ لیکن اس قسم کی رائے کا اظہار میرے خیال میں ذہنی تنگ نظری پر دلالت کرتا ہے۔ ہم اپنی رائے کے اظہار میں اکثر اپنے تعصب کو راہ دیتے ہیں۔ اس خصوص میں اگر ہم واقعات کا علمی تجزیہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہماری قومی زندگی کی وسعت اورنگ زیب اور سیواجی دونوں کو امتیازی اور موزوں جگہ دینے کو تیار ہے۔ اورنگ زیب نے سوائے اس کے کیا کیا کہ اس لے سا

ہندوستان کو ایک سیاسی وحدت کے تحت لانے کے لیے اپنی پوری عمر صرف کر دی۔ وہ ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے اس پرانے مرض کا علاج کرنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے ہمارے ملک کو صدیوں دوسروں کی غلامی برداشت کرنا پڑی۔ ہندوستان کو وہ اسی قدر اپنا وطن سمجھتا تھا جتنا کہ کوئی دوسرا سمجھ سکتا ہے۔ اس کی سرحدی حکمتِ عملی کا اگر مطالعہ کیا جائے تو بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس نے ہندوستان کی حفاظت کے لیے جو تدابیر اختیار کیں وہ کس قدر دور اندیشی پر مبنی تھیں۔ اس نے یوسف زئیوں کی بغاوت کو اسی سختی سے فرو کیا جس طرح وہ دکن کی مرکز گریز مرہٹہ قوت کے ساتھ پیش آیا۔ اس بارے میں اس نے ہندو اور مسلمان کا کوئی فرق نہیں کیا۔

جغرافی حیثیت نے ہمارے ملک کے لیے یہ مقدر ہو چکا ہے کہ ہم ایک سیاسی وحدت کے سینے میں زندگی بسر کریں۔ ہماری تاریخ میں عروج کا زمانہ وہی ہوا ہے جبکہ ایک سیاسی مرکزی نظام ملک کے مختلف گوشوں میں یکسانیت کے ساتھ موثر ہوا۔ اس اعتبار سے اورنگ زیب کو ہماری تاریخ میں وہی مرتبہ ملنا چاہیے جس کا وہ مستحق ہے۔ اگر ہم تاریخی شواہد کی روشنی میں اس کی سیرت کے خد و خال کو سمجھیں تو صاف طور پر معلوم ہو جائے گا کہ اس پر تعصب کا الزام ایک غلط اور بے بنیاد الزام ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو مملکت کے ساتھ اپنی زندگی کو وابستہ کر لیتے ہیں اور اس کے مفاد کی راہ میں جو رکاوٹ آئے اسے بلا تامل ہٹا دیتے ہیں۔ اس میں یہ نہیں دیکھتے کہ ان کی راہ میں آنے والا کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے اور نہ یہ دیکھتے ہیں کہ وہ اجنبی ہے یا قرابت دار۔ اس نے راجپوتانہ کے راجاؤں کا مقابلہ اسی طرح کیا جبکہ وہ مرکزی حکومت سے اپنا رشتہ توڑ لینا چاہتے تھے جس طرح دکن کے سلاطین کا۔ اس کے سامنے بس ایک نقطۂ نظر تھا وہ سب کچھ کرنے میں مطلق پس و پیش نہ کیا جسے عام طور پر مروجہ اخلاق کے معیار کے خلاف تصور کیا جائے گا۔ لیکن وہ جن کے ہاتھوں میں قوموں کی زندگی کی باگ ہوتی ہے ان کا اخلاق ایک شخصی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور ان کے نصب العین کو مروجہ معیار سے جانچنا درست نہیں۔ اس کے خطوط کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے مقاصد میں کس بلا کا انہماک تھا۔ اس کی زندگی بے لوثی، سادگی اور پاکبازی کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کرتی ہے جس کے متعلق ہمارے نوجوانوں کو علم ہونا چاہیے۔

اسی طرح سے سیواجی کی زندگی بھی ایک خاص مقصد کی ترجمان تھی۔ جس طرح ہماری قومی زندگی میں یہ ضروری ہے کہ سیاسی مرکزیت کا نصب العین ہمارے سامنے رہے، اس طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ہماری مقامی آزادیاں برقرار رہیں۔ سیاسی مرکزیت مشترک مفاد کے لئے ہونی چاہئے اور اس کے ساتھ مقامی گروہوں کو اپنی زندگی کی تشکیل کی پوری آزادی ہونی چاہئے۔ سیواجی نے مقامی آزادی کے نصب العین کی ترجمانی کی اور مقامی خصوصیات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ دراصل اس ملک کا مفاد یہی ہے کہ مرکز گریز اور مرکز پسند قوتوں کے باہمی تعامل و امتزاج سے ایک ایسی معتدل صورت حال پیدا ہو جو اس ملک کی اجتماعی زندگی کے لئے قابل قبول ہو۔ ہمارا ملک یورپ کے ممالک کی طرح اتنا چھوٹا نہیں کہ یہاں کی مقامی خصوصیات کو پس پشت ڈال دیا جائے۔ یہ دراصل ایک براعظم ہے۔ اور باوجود اس امر کے کہ جغرافی اور تہذیبی عناصر اس ملک کے ہر گوشہ کو ایک مرکز کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتے ہیں لیکن مقامی خصائص، قومی زندگی کے تانے بانے میں ایسے پیوست ہیں کہ انھیں دبانا ناممکن ہے۔

تاریخ ہند کے مختلف ادوار میں جن گروہوں نے فوقیت حاصل کی اس کی توجیہ اس طور پر کرنا چاہئے کہ ہماری آبادی کے مختلف عناصر میں سے کسی کو وہ ناگوار نہ گذرے۔ ہماری قومی زندگی میں مختلف گروہوں کے توسط سے نیا خون مختلف زمانوں میں آتا رہا۔ ان گروہوں کی فوقیت کے اسباب تاریخی قوانین کے تحت بیان ہونے چاہئیں۔ گروہوں کی فوقیت کے اسباب میں سے ایک سبب ان کے طریق جنگ کی برتری ہوتا ہے۔ آپ قدیم زمانے سے آج تک کی تاریخ پر ایک نظر ڈال جائیے، اس حقیقت کے بہت سے ثبوت آپ کو ملیں گے۔ سکندر اور پورس کی جنگ میں اور اسی طرح عہد اسلامی اور عہد جدید کی جنگوں میں آپ دیکھیں گے کہ کامیاب گروہ کا طریق جنگ مفتوح کے طریق جنگ کے مقابلے میں اعلیٰ اور زیادہ سائنٹفک تھا۔ عہد عالیہ اور عہد متوسط کی بعض جنگوں کی تفصیلات ہمارے پاس موجود ہیں۔ ۱۵۷۰ء میں عادل شاہیوں اور نظام شاہیوں کی متحدہ دل کھ کی جمعیت نے گوا کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ دس مہینے تک برابر جاری رہا۔ لیکن صرف چار ہزار پرتگالیوں نے اس بڑے لشکر کی ایک نہ چلنے دی اور بالآخر اس پر مجبور کیا کہ محاصرہ اٹھا لیا جائے۔ اس محاصرہ میں جدید فوجی نظم و انضباط کا مقابلہ قدیم طرز کی افواج سے ہوا اور دس دل کی

کوشش اور تعداد سپاہ کی زیادتی کے باوجود قدیم کو جدید پر کامیابی نہیں ہوئی۔ یہ واقعہ ہمارے اس زمانے کے فرمانرواؤں کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی تھا۔ پرتگالی لوگ بھی انسان تھے اس ملک میں اجنبی تھے اور محصور ہونے کے باوجود اپنے طریق جنگ کی برتری کے سبب سے کامیاب رہے۔ میں اپنے مطلب کو ایک اور دوسری مثال سے واضح کردوں۔ کرناٹک کے نواب انورالدین خاں اور فرانسیسیوں میں ۱۷۴۶ء میں جب ناچاقی ہوئی تو نواب موصوف نے اپنے بڑے لڑکے محفوظ علی خاں کی ماتحتی میں ۱۰ ہزار کا لشکر ساز و سامان سے آراستہ کرکے فرانسیسیوں کے خلاف روانہ کیا۔ فرانسیسی فوج کی تعداد بہت کم تھی لیکن باوجود اس کے اس نے نواب کی فوج کے مقابلے میں کامیابی حاصل کی اور اسے پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ اس کامیابی سے ڈوپلے کو چند باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو یہ کہ اگر یورپین فوج تھوڑی سی بھی ہو اور جدید نظم و انضباط کے اصولوں سے واقف ہو تو ہندوستانیوں کے ٹڈی دل لشکر پر بھاری رہے گی۔ اس سے بھی بڑھ کر اس نے یہ بات معلوم کی کہ اہلِ ہند کو اگر یورپین طریق جنگ کی مشق کرائی جائے تو کچھ عرصے میں اپنی ذہانت سے یہ لوگ خود اہلِ یورپ کے مثل جنگ کرنے کی قابلیت رکھتے ہیں۔ ان دونوں باتوں سے بڑھ کر اس کو یہ معلوم ہوا کہ اہلِ ہند کا کوئی اصول وفاداری نہیں۔ انھیں بدیسی قوت سے تعاون عمل کرکے خود اپنے اہلِ وطن کے خلاف تلوار اٹھانے میں کوئی باک نہیں۔ اس پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہیئے کہ ایک اجنبی شخص نے ہماری نفسیاتی حالت کو ہم سے بہتر سمجھا۔ ہماری تاریخ کا یہ وہ زمانہ ہے جبکہ زندگی کی تمام اعلیٰ قدریں نامرادی کے ہاتھوں مسمار ہو چکی تھیں۔ کسی قسم کی وفاداری کا جذبہ لوگوں کے دلوں میں باقی نہیں رہا تھا۔ ملک کے ہر گوشہ میں بدامنی اور نراج کا دور دورہ تھا۔ زبردست کمزوروں پر ظلم کرنے اور استحصال و زیادہ ستانی میں مطلق تامل نہیں کرتے تھے۔ وفاداری کا نرم نازک پودا وہیں نشوونما پاتا ہے جہاں عدل و انصاف کی سازگار فضا اسے میسر آئے۔ جس مملکت میں انصاف نہیں وہاں وفاداری کی توقع کبھی پوری نہیں ہو سکتی۔ آپ ایک ایسے شخص سے وفاداری کی کیا توقع کرتے ہیں جو شہری زندگی کے معمولی حقوق تک سے محروم ہو، جسے آپ اپنے قریب سے گذرنے بھی نہ دیں، جسے یہ اجازت بھی نہ ہو کہ وہ اپنے لئے اسی کنوے سے پانی بھرے جہاں سے آپ کے لئے پانی آتا ہے اور اگر اس کا سایہ کبھی اتفاق سے آپ پر پڑ جائے تو آپ

اپنے میں ناپاک تصور کریں اسی طرح آپ کسی ایسے گروہ سے وفاداری کی توقع نہیں رکھ سکتے جو بدامنی کا شکار ہو، جس کی فلاح وبہبود کا مملکت کو خیال نہ ہو اور جس کے ساتھ مملکت صرف اتنا تعلق قایم رکھنا گوارا کرے کہ اس کی گاڑھی کمائی میں سے ایک بڑا حصہ اپنے لئے حاصل کرے آپ ان لوگوں سے کیسے وفاداری کی توقع کرسکتے ہیں جن کے پسینہ کی گاڑھی کمائی کی حفاظت کے آپ ضامن نہیں ہوسکتے۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے وقت ہمارے بدنصیب ملک کی یہی حالت تھی۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی فوجوں میں خود ہمارے اہل وطن جوق در جوق بھرتی ہوئے اور اپنے نئے آقاؤں کے لئے اپنے ملک کو فتح کیا۔

ہندوستان کی تاریخ کے یہ واقعات ہماری آئندہ نسلوں کے لیے سبق آموز ہیں۔ عہد قدیم سے آپ دیکھیں گے کہ عوام الناس نے بیرونی فاتحوں کا ساتھ اس وقت دیا جبکہ وہ اپنے ملک میں عدل وانصاف سے محروم ہوگئے۔ اسلامی سلطنت کے آغاز اور انگریزی حکومت کے ابتدائی زمانے میں یہ حقیقت نہایت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ تاریخ کے ذریعہ ہمیں اپنے نوجوان شہریوں کو بتانا چاہیئے کہ اجتماعی نظام بغیر اخلاقی محرکات کے قایم نہیں رہ سکتا۔ جب تک کہ مملکت اور سماج کے ساتھ عوام الناس کو جذباتی تعلق نہ پیدا ہو اس وقت تک دونوں کی بنیادیں کمزور رہتی ہیں۔ یہ اس وقت ممکن ہے جبکہ عام مفاد مملکت کا نصب العین ہو۔ اگر ہم اپنی نصابی تاریخوں کے ذریعہ اپنے نوجوان شہریوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھادیں تو سمجھئے کہ ہم نے بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔

روسو

روسو ۱۷۱۲ء میں شہر جنیوا میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک غریب گھڑی ساز تھا، جس کا دل ہر وقت عالم خیال کی سیر میں محو رہتا تھا۔ روسو جب پانچ چھ برس کا ہوگیا تو باپ بیٹے دونوں رات کو لیٹ کر موم بتی کی روشنی میں ناول پڑھا کرتے تھے، اور یہ معمول اتنے دنوں تک جاری رہا کہ بیٹا بھی باپ کی طرح تخیل پرست ہوگیا۔ یہ صفت بجائے خود بہت مبارک تھی، مگر اس نے روسو کی سیرت کے توازن کو بچپن ہی سے بگاڑ دیا۔ باپ اسے بہت جلد چھوڑ کر بھاگ گیا اور اس کے فرار ہونے کے بعد روسو کی پرورش عزیزوں اور ہمسایوں کے ذمے رہی۔ ان لوگوں میں اس کی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اس کی طبیعت کی افتاد معلوم کرکے اس کے مطابق اسے تعلیم دیں، اور ان میں یہ صلاحیت ہوتی بھی تو روسو میں بظاہر کوئی ایسی صفت نہیں تھی کہ وہ خاص توجہ کا مستحق سمجھا جاتا۔ پہلے وہ کچھ دنوں ایک پادری کے یہاں رہا، پھر ایک سنگ تراش کے پاس کام سیکھنے کے لئے رکھا گیا۔ سنگ تراش سخت آدمی تھا، مگر اس کی سختی کا روسو پر الٹا اثر ہوا۔ اس کے مزاج میں تلون پہلے سے تھا، اور کام سے وہ ہمیشہ جی چراتا تھا، سنگ تراش کی شاگردی کے زمانے میں اس کی عادتیں بہت بگڑ گئیں اور وہ چوری تک کرنے لگا۔ استاد کی سزاؤں سے اس کی طبیعت کی خلقی وحشت اور بڑھ گئی اور ایک مرتبہ جب وہ شہر کے باہر گیا اور واپسی میں اتنی دیر کردی کہ شہر کے دروازے بند ہوگئے اس نے وطن کو خیرباد کہی اور دنیا کی سیر کو نکل کھڑا ہوا۔ ان دنوں اس کی عمر قریب سولہ سال تھی۔ اس وقت سے آخر دم تک وہ آوارہ گردی کرتا رہا۔ اگر کہیں زیادہ عرصے تک قیام بھی رہا تو وحشت نے اسے بے چین رکھا۔ گھریلو، کام کاجی زندگی اسے کبھی میسر نہ ہوئی اور ہوتی بھی تو وہ اسے برداشت نہ کرسکتا۔ آوارہ گردی کے سلسلے میں اس نے بہت کچھ برائی بھلائی دیکھی، ہر قسم کے لوگوں کی صحبت میں رہا، بہت سی کمینہ پن کی حرکتیں کیں، شرمندگی اور بے عزتی کے دکھ سہے۔ ادبی شہرت اسے پہلے پہل ۱۷۵۰ء میں حاصل ہوئی، جب وہ ۳۸ سال کا تھا۔ اس سے قبل وہ لوگوں کی سرپرستی کا

محتاج رہا' اور سوا ان چند سالوں کے جو اس نے اَن سیؔ[1] کے قصبے میں ایک خاتون مدام وارنؔ[2] کے ساتھ گزارے' اس کی ساری زندگی بڑی مصیبت اور تکلیف میں بسر ہوئی اور اس کی مزاجی کیفیت بگڑتی گئی۔ علم حاصل کرنے کا اسے کبھی شوق نہیں تھا' اس کا مطالعہ آخر تک بہت محدود رہا۔ لیکن جب اس نے لکھنے کو قلم اٹھایا تو وہ حوصلے اور آرزوئیں جو اب تک صرف وحشیانہ انداز اور ناشائستہ حرکتوں میں ظاہر ہو سکی تھیں اس طرح پھوٹ نکلیں جیسے ایک چشمہ پہاڑ کے سینے سے ابلتا ہے' اور جس طرح وادیاں چشمے کے شور سے گونجتی ہیں' اور وہ سیلاب بن کر میدان میں پہنچتا ہے تو بہت سے خطوں کو ویران کر دیتا ہے مگر ہر جگہ زندگی کے بیج بھی بوتا جاتا ہے' روسو کی صریر قلم نے سارے فرانس کو ہلا دیا۔ اس کے خیالات کے تموج نے بہت سی بستیاں اُجاڑ دیں' مگر ہر جگہ نئی بستیوں کے بسنے کا سامان بھی کرتا گیا۔

روسو کے فلسفے کو جو گہرا تعلق اس کی طبیعت سے اور اس کی زندگی سے ہے وہ اس کی پہلی تصنیف سے ظاہر ہو جاتا ہے' جس کا موضوع یہ ہے کہ "آیا علوم و فنون کے احیا سے اخلاق کو ترقی ہوئی ہے یا نہیں"۔ روسو علوم و فنون میں بہت کم استعداد رکھتا تھا' اس کی اخلاقی زندگی سے دوسرے عبرت کے سوا کچھ حاصل نہ کر سکتے تھے' لیکن اس نے علمی اور فنی ترقی کے مقابلے میں ایسے اخلاقی معیار پیش کئے ہیں جن سے اسے دلی محبت تھی اور ایک ایسی معاشرت کا خاکہ کھینچا ہے جس کے وہ بچپن سے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنی بحث میں اپنے دل کے سارے درد اور حسرت اور آرزو کو اپنا وکیل بنایا ہے اور مضمون کیا لکھا ہے' ایک دکھ اور شوق بھری کہانی سنا دی ہے۔ یہی مضمون ایک لحاظ سے اس کی پہلی سیاسی تصنیف بھی ہے' کیونکہ وہ عقیدے جن پر اس کی سیاسی تعلیم کا انحصار تھا سب سے پہلے اسی میں بیان ہوتے ہیں' اور وہ رنگ جس میں اس کا تصور ڈوبا رہتا تھا سب سے پہلے اسی میں نظر آتا ہے۔

علوم و فنون کی اخلاقی قدر پر بحث کرتے ہوئے روسو کا انداز زیادہ تر شکایت کا ہے۔ وہ اس سے

(۱) Annecy.
(۲) Mme. Warens.

انکار نہیں کرتا کہ انسان کی ترقی کا خیال یعنی انسان کا فطرت زیر کرکے اس سے کام لینا، عقل کی روشنی سے اس تاریکی کو دور کرنا جس نے دنیا کو گھیر رکھا ہے، زمین اور آسمان کو اپنے عمل کا میدان بنانا، اور اس کے ساتھ ہی اپنے نفس کا مشاہدہ کرکے اپنی سیرت اور سرشت، اپنے فرائض اور اپنے انجام کے راز معلوم کرنا، ایک نہایت دلکش خیال ہے۔ لیکن اس کے نزدیک اس میں بھی شبہہ نہیں کہ "جس قدر ہمارے علوم اور فنون درجۂ کمال کی طرف بڑھے اسی قدر ہمارے اخلاق بگڑتے گئے"۔ حقیقت کی تلاش میں انسان ہزاروں غلط باتیں مان لیتا ہے، اور ان غلطیوں سے جو نقصان ہوتا ہے وہ اس فائدے سے کہیں زیادہ ہوتا ہے جو حقیقت کے علم سے ہوتا۔ اس لئے کہ حقیقت تو محض نظری اور ذہنی ہوتی ہے، مگر اس کی راہ میں انسان جو ٹھوکریں کھاتا ہے ان کا سیرت اور اخلاق پر برا اثر ہوتا ہے۔ علمی جد وجہد سے بھی زیادہ مضر روسو کے نزدیک فنون اور صنعت وحرفت کی ترقی یعنی متمدن زندگی ثابت ہوتی ہے۔ دولت ہر دلعزیزی کی ہوس، شہرت کا چسکا، دکھاوے کی خواہش، اور سب سے زیادہ آرام طلبی انسان کے اخلاقی معیار کو پست کر دیتی ہے، "لوگ ہمیشہ رسم ورواج کی پابندی کرتے ہیں، اپنے ذاتی مذاق کا کبھی لحاظ نہیں کرتے، ان میں اتنی ہمت نہیں رہتی کہ اپنی اصل صورت میں نظر آئیں"۔ مصر، یونان، روما، سب اپنی ابتدائی حالت میں قابل رشک ملک تھے، لیکن جب سے انھوں نے علوم وفنون کی طرف توجہ کی ان کی ساری خوبیاں رخصت ہوگئیں، عیش پرستی اور آرام طلبی نے انسان کی عظمت کو خاک میں ملا دیا اور انھیں کسی کام کا نہیں رکھا۔

ہم کو یہ نہ فرض کر لینا چاہیئے کہ روسو یہاں اس فطری زندگی کی مدح سرائی کر رہا ہے جس کو اس سے قبل کے سیاسی فلسفے میں اس قدر نمایاں حیثیت حاصل ہے اور جس کی ہر فلسفی نے اپنی مصلحت کے مطابق دلکش یا وحشت انگیز تصویر کھینچی ہے۔ وہ اس قوم جس نے اپنی انسانیت ظاہری نفاست اور شائستگی پر نثار کر دی تھی ایک زمانہ یاد دلا رہا ہے جب اس کا اخلاقی معیار سادہ مگر بہت اعلیٰ تھا، جب آسائش اور آرام کا سامان بہت کم تھا، مگر دلی مسرت میسر تھی، جب اس نے اپنے ذہن کو علم سے روشن نہیں کیا تھا مگر علم کی دھندلی روشنی میں چلنے کی کوشش کرکے ٹھوکریں بھی نہیں کھائی تھیں۔

روسو کی اس پہلی تصنیف سے اس کی ساری ذہنی خصوصیات واضح ہو جاتی ہیں ۔ ہم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا معیار علمی نہیں اخلاقی ہے، اس کا فلسفہ آرزوں اور حسرتوں کا فلسفہ ہے، وہ مصلح نہیں ہے، " فن زندگی " پر طبع آزمائی کر رہا ہے ۔ اس کی طبیعت ایسی تھی کہ ایک گذشتہ زمانے کی یاد ہی اس کی مسرت کا سامان ہو سکتی تھی (۱) ۔ جو خوبیاں اسے اپنے زمانے میں نظر نہ آئیں، جس طرح کے انسان، جس طرز کی معاشرت اور اخلاق دنیا میں دیکھنا اسے نصیب نہ ہوا، ان سب کو اس نے ایک گذشتہ زمانے میں موجود فرض کر لیا ۔ یہ اس کے تخیل کا اعجاز ہے کہ ایک افسانہ جس سے انسان زیادہ سے زیادہ اپنا جی بہلا سکتا تھا ایک دلفروز اور ہمت افزا حقیقت بن گیا ۔ لیکن یہ خواب کی باتیں، خواہ وہ علم سے بدتر مرتبہ رکھتی ہوں، علم کی تعریف میں نہیں آ سکتیں اور علمی اخلاق پر ایسی خیال آرائیوں کا چاہے جتنا اچھا اثر پڑے، ہم انھیں اخلاقیات میں شامل نہیں کر سکتے، اس لئے کہ ان میں عقل اور منطق کو ذرا بھی دخل نہیں ۔
روسو کی تعلیم کا کسی علم سے تعلق نہیں، عالم کے لئے جو ذہنی خصوصیات لازمی ہیں ان میں سے ایک بھی اس میں موجود نہ تھی، اور اس نے مطالعے کے ذریعے سے جو تھوڑی بہت معلومات حاصل کی تھیں انھیں ہم مروت میں بھی علم نہیں قرار دے سکتے ۔ لیکن خود روسو اور اس کے تمام حامی اور مخالف اس غلطی میں مبتلا رہے کہ وہ عالم ہے اور اس کا فلسفہ علم کی حیثیت رکھتا ہے ۔ اس کا سبب یہ تھا کہ روسو نے جو بات کہی وہ زیادہ تر لوگوں کو سچی معلوم ہوئی، اس کی طرح ہزاروں لاکھوں ایسے تھے جنھیں اپنے ماحول سے وہی شکایتیں تھیں جو اس کو تھیں، جن کے دلوں میں وہی آرزوئیں تڑپ رہی تھیں جنھوں نے اس کو دیوانہ کر دیا تھا ۔ روسو نے علم اور نظریۂ اخلاق کے بھیس میں جو تعلیم پیش کی وہ فن زندگی کا ایک نیا اصول تھی، جس میں اتنی قوت تھی کہ وہ نظام معاشرت کا نقشہ بدل دے اور ایک نئے دور تمدن کی بنیاد ڈالے ۔ علوم و فنون اور تہذیب کی ہمت شکن اور دل کو بجھا دینے والی فضا سے اکتا کر اس نے " رجوع بر فطرت " کی صدا بلند کی ۔

---

(۱) Spranger: Kultur u. Erziehung روسو کی سیرت اور فلسفے پر میری نظر میں اس سے بہتر اور کوئی مضمون نہیں ۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ انسان کو جانوروں کی سی زندگی بسر کرنا چاہیے ۔ روسو کی آرزو تھی
کہ تہذیب ان امراض سے پاک کر دی جائے جو اس میں پیدا ہو گئے ہیں، وہ زنجیریں توڑ دی جائیں
جنھوں نے انسان کو اور اس کی طبیعت کو بالکل جکڑ دیا ہے ۔ اسی نیت سے اس نے پہلے
تہذیب پر حملہ کیا اور پھر نئے سرچشموں سے اسے تازگی اور قوت پہنچائی (۱) اس کے فرانسیسی
مداحوں اور پیرووں کے نزدیک فطری حالت کی طرف واپس جانے کے معنی یہ تھے کہ زندگی کے
نئے اور بہتر اصول اختیار کئے جائیں، انسانوں کی تقسیم خواص اور عوام میں نہ کی جائے، شہریوں
کی حیثیت سے سب کا مرتبہ برابر ہو' اور سیاسی زندگی کے معنی شرفا اور درباریوں کی خوشامد
اور حاکموں کی زیادتیوں کو برداشت کرنا نہ ہو بلکہ ایک اجتماعی جد و جہد میں شریک ہونا اور فرائض
عامہ کو انجام دینا۔ جس آزادی اور مساوات کے روسو نے گن گائے اسی کی ہر روشن خیال فرانسیسی
کو تمنا تھی، جس معاشرت اور سیاسی زندگی کو روسو نے انسانیت کا تقاضا سمجھا اس کا اپنے اپنے
رنگ میں سب کو حوصلہ تھا۔ روسو سے ہر بات میں اتفاق کرنے والے بہت کم تھے، لیکن اس
کی تصانیف میں ہر شخص کو کہیں نہ کہیں اپنے دل کی بات اس طرح کہی ہوئی مل گئی کہ وہ روسو کا معتقد
اور گرویدہ ہو گیا اور اسے اپنی تمام خواہشوں کا ترجمان سمجھنے لگا۔

روسو کی دوسری تصنیف، "انسانوں میں عدم مساوات کا آغاز" (۱۷۵۴) موضوع کے
لحاظ سے سیاسیات سے زیادہ تعلق رکھتی ہے اور اس میں سیاسیات کے چند اہم مسائل
جیسے قانون فطرت، سیاسی زندگی کی ابتدا اور سیاسی مظاہرہ کی پہلی شکلوں پر بحث بھی کی گئی ہے
لیکن یہاں بھی اس کے خیالات میں منطق اور تاریخ اور شاعرانہ تخیلات کی وہی عجیب و غریب آمیزش
ہے جو اس کی پہلی تصنیف میں ملتی ہے۔ اپنے مقابلے کا مقصد اس نے یہ بتایا ہے کہ انسانی
زندگی کی نشو و نما میں "وہ وقت معین کیا جائے جب حق کے بجائے طاقت کا دور دورہ ہو گیا اور

---

(۱) Spranger تصنیف مذکورہ۔

خود فطرت انسانی قانون کے ماتحت کر دی گئی اور یہ بتایا جائے کہ کیا کیا سبز باغ دکھا کر زور آور کمزوروں کی فرماں برداری پر آمادہ کر لئے گئے ' اور لوگوں نے سچی مسرت کے بدلے ایک فرضی سلامتی خریدلی'' عدم مساوات کے آغاز کے متعلق اپنا نظریہ بیان کرنے کے لئے روسو نے ضروری سمجھا کہ خالص حیوان سے مہذب انسان ہونے تک انسانی نشو و نما کے تمام مدارج ' فطری معاشرت اور اس معاشرت کے سیاسی اور تمدنی زندگی میں تبدیل ہونے کا طریقہ دکھایا جائے۔ وہ فطری زندگی کو ہوبز' سپی نوزا اور لوک کی طرح ایک تاریخی مظہر نہیں قرار دیتا۔" انسان کی فطرت میں اصلی اور مصنوعی کا فرق کرنا آسان کام نہیں ہے ' یا ایسی حالت کے متعلق کما حقہ علم رکھنا جواب موجود نہیں' بلکہ شاید کبھی موجود نہ تھی اور نہ کبھی وجود میں آئے گی' لیکن جس کے متعلق صحیح خیالات رکھنا ضروری ہے' تاکہ ہم اپنی موجودہ حالت کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کر سکیں''۔ یعنی روسو کے نزدیک فطری زندگی کو ایک تاریخی حالت سمجھنا غلط ہے' فطری زندگی محض ایک معیار کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ بھی ایک شاعرانہ معیار ہے۔ لیکن روسو خود اس بات کو بھول جاتا ہے اور شروع کے اس ایک جملے کے سوا اور کہیں نہ یہ محسوس ہوتا ہے اور نہ روسو خود ظاہر کرتا ہے کہ اس کی نیت عدم مساوات کے مسئلے پر خالص علمی اور تاریخی بحث کرنا نہیں ہے۔

پہلے تو وہ ان مصنفوں پر اعتراض کرتا ہے جنھوں نے انسانی سیرت کو صحیح طور پر سمجھے بغیر قانون فطرت پر رائے زنی کی ہے۔ ہر ایک اس کی تعریف اپنے فلسفے کے مطابق کرتا آیا ہے" اور اس کی بنیاد ایسے مافوق الطبیعی اصولوں پر منحصر کی گئی ہے کہ جنھیں دریافت کرنا درکنار ہم لوگوں میں بہت کم ایسے ہیں جو انھیں سمجھ بھی سکیں''۔ یہ خیال کرنا کہ انسان اپنی فطری حالت میں ان دقیق قاعدوں اور اصولوں کو دریافت کر سکتا تھا گویا یہ فرض کرنا ہے کہ آدمی انسان بننے سے پہلے ہی فلسفی ہو گیا تھا۔ فطری زندگی کے بارے میں بھی ان لوگوں کی رائے غلط ہے' سب نے' فکر' لالچ' ظلم' ہوس اور غرور کا ہر وقت ذکر کرتے کرتے فطری زندگی میں ان تصورات کا وجود فرض کر لیا ہے جو ابھی انھوں نے معاشرتی زندگی پر قیاس کر کے قائم کئے ہیں۔" وہ ذکر کرتے ہیں وحشی کا اور تصویر بناتے ہیں مہذب آدمی کی''۔ خود روسو کے خیال میں عقل سے بہت پہلے انسان کی رہبر دو جبلتیں ہوتی ہیں' ایک تو اپنی سلامتی اور بہبودی کی خواہش

اور دوسری اپنے ہم جنس کو تکلیف میں دیکھنے سے نفرت ' انسان جب وحشی جانوروں کی طرح رہتا تھا تو اس میں اپنی جان محفوظ رکھنے کی پوری صلاحیت تھی ۔ وہ مضبوط ' پھرتیلا اور چالاک ہوتا تھا ۔ مگر ہم کو یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسے اپنی حفاظت کے لئے ہر وقت برسرپیکار رہنا پڑتا تھا ۔ چونکہ انسان کے اس حالت میں نہ اخلاقی تعلقات ہوتے ہیں نہ معینہ فرائض ' اس لئے وہ نہ اچھا ہو سکتا ہے نہ برا ۔ اس میں نہ خرابیاں ہو سکتی ہیں نہ خوبیاں ۔" "ہمیں ہوبز کی طرح یہ نہ طے کر لینا چاہیئے کہ نیکی کا کوئی تصور نہ ہونے کی وجہ سے انسان لازمی طور پر برا ہوتا ہوگا ۔" انسان آزاد تھا ' بے پروا تھا ' نہ دکھ سہتا نہ دکھ پہنچاتا تھا ۔ وہ درخت کے نیچے بیٹھ کر خوب پیٹ بھر کھاتا ' قریب کے چشمے میں اپنی پیاس بجھاتا ' پھر اسی درخت کے تلے پڑ کر سو جاتا اور اس طرح اس کی کل ضروریات پوری ہو جاتیں ۔ لیکن وہ اس حالت پر قائم نہیں رہ سکتا تھا ۔
انسان اور حیوان میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ انسان صاحب اختیار ہوتا ہے ۔ جبلی خواہشوں کے علاوہ اس میں اپنا ارادہ ہوتا ہے اور انفرادی اور مجموعی حیثیت سے ترقی کرنے اور درجہ کمال تک پہنچنے کی استعداد آب و ہوا اور دوسرے فطری محرک انسانوں کو اپنی قوت ایجاد کام میں لانے اور اپنی زندگی کے طریقے کو بہتر بنانے پر مجبور کرتے ہیں ' رفتہ رفتہ وہ باہمی امداد کی قدر پہچاننے لگتے ہیں ' خاندانی زندگی شروع ہو جاتی ہے اور اس کے ساتھ مردوں اور عورتوں میں فرائض اور ذمہ داریوں کی تقسیم ۔ انسان میں اب آزادی اور تنہائی کی خواہش کے بجائے محبت اور ایثار کا جذبہ بیدار ہوتا ہے ' اور ملکیت کا دستور بھی عام ہو جاتا ہے ۔ " معاشرے کا اصل بانی وہ پہلا شخص تھا جس نے زمین کے ایک ٹکڑے کے چاروں طرف باڑہ لگا کر یہ کہنے کی ہمت کی کہ یہ میرا ہے ' اور جسے ایسے سادہ لوح لوگ مل گئے کہ انھوں نے اس کی بات مان لی ۔" لیکن شروع شروع میں اپنے اور پرائے کا احساس بہت قوی نہیں تھا ' فرائض کی تقسیم سے فرصت کا وقت بڑھ گیا تھا ' لوگوں کو آسائش اور آرام کی قدر ہو گئی تھی ' مگر اس کے لئے سامان کافی نہ تھا ' اور گو اس زمانے میں ان خرابیوں کے آثار موجود تھے جو بعد کو نمودار ہوئیں ' پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ " دنیا کے شباب کا زمانہ " تھا ۔

ہوبز ' سپی نوزا اور لوک پر اعتراض کرنے کے باوجود ' روسو نے فطری زندگی کا نقشہ بنانے میں

وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو ان فلسفیوں نے کیا تھا۔ اس نے اس حد تک تو مبالغے سے پرہیز کیا ہے کہ انسان کو اس حالت میں کسی دقیق فلسفہ قانون کا موجد نہیں قرار دیا۔ لیکن اس کا فطری انسان بھی محض تصور کی ایجاد ہے خواہ اس ایجاد سے روسو کا مقصد کچھ بھی ہو۔ انسان جب جانوروں کی سی زندگی بسر کرتا تھا تو وہ بالکل جانور رہا ہوگا، اور اس کی حالت قابل رشک نہیں قابل رحم ہوگی۔ اس مسئلے پر عملی بحث کرنا فضول ہے کیونکہ اس کے متعلق ہمیں کوئی معلومات نہیں ہیں۔

انسانی زندگی کا حال عالم شباب تک بیان کرکے روسو نے عدم مساوات کے آغاز پر بحث شروع کی ہے۔ جب سے انسان دوسرے کی مدد کا محتاج ہو جاتا ہے اور وہ ذخیرہ اور سرمایہ جمع کرنے کے فوائد محسوس کرتا ہے، مساوات غائب ہو جاتی ہے، ملکیت اور اس کے ساتھ محنت کا رواج ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے تمدن کے مداح اس نئے رواج کو بہت مبارک سمجھیں، کیونکہ تمدن کا انحصار انھیں پر ہے، "فلسفی کے لئے لوہا اور اناج وہ چیزیں ہیں جنھوں نے انسان کو متمدن کر دیا اور نوع انسانی کو تباہ کر دیا۔" یہ وہ چیزیں ہیں جو دولت کو بڑھاتی ہیں، دولت بڑھنے سے فساد پیدا ہوتا ہے، اور دولتمند لوگ اس فساد سے فائدہ اٹھاکر غریبوں کو بہکاتے ہیں، اور انھیں معاشرے کی بنا ڈالنے اور ملکیت کے حق کو محفوظ رکھنے کے لئے قانون وضع کرنے پر آمادہ کر لیتے ہیں۔ اس معاشرے اور اس حکومت کی نہ کوئی معین شکل ہوتی ہے اور نہ اس کی بنیاد قوی ہوتی ہے، لیکن وہ حاکموں کی مطلق العنانی اور رعایا کی غلامی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ "جن عیوب کی وجہ سے معاشرتی ادارے ناگزیر ہو جاتے ہیں انھیں کے وجہ سے ان اداروں کا صحیح استعمال ناممکن ہو جاتا ہے" دولت پیدا ہونے کے بعد فضائل کی سچی قدر نہیں رہتی اور جیسے جیسے آرام طلبی اور عیش پرستی لوگوں کی سیرت کو بگاڑتی ہے، ان کے حاکموں کا تسلط بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک طرف قوم میں خودداری کا احساس اور آزادی کا مبارک شوق نہیں رہتا اور دوسری طرف حاکم اپنے فرائض کو بالائے طاق رکھ کر اپنے حقوق کو تسلیم کرانا اور قوم کو غلامی میں مبتلا رکھنا اپنا اصل مقصد سمجھنے لگتے ہیں۔ روسو کا اصل موضوع عدم مساوات کے آغاز کو سمجھانا تھا، اور جیسا کہ وہ ایک جگہ پر کہتا ہے سیاسی مظاہر کا ذکر اس نے محض ضمناً کیا ہے۔ لیکن اس ضمنی بحث میں اس نے بہت سے نظریے پیش کئے ہیں

جن کا وہ کوئی معقول ثبوت نہیں دیتا۔ وہ یہ صاف صاف نہیں بیان کرتا کہ اس کے نزدیک سیاسی زندگی کیونکر شروع ہوئی اور ریاست اور سیاسی معاشرے کی بنا کیا سمجھی جانا چاہیئے۔ کہیں کہیں پر تو وہ معاہدہ اجتماعی کی طرف اشارہ کرتا ہے، مگر اس کا مستقل خیال یہ معلوم ہوتا ہے کہ ریاست اور سیاسی اداروں کو امیروں کے فریب کا نتیجہ سمجھنا چاہیئے۔ ہم کو قطعی طور پر صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ لوگ آزادی کی حالت سے یکبارگی مطلق العنان حاکموں کے ماتحت نہیں ہوگئے۔ انھیں اپنی آزادی عزیز تھی اور یہ بات بالکل بعید از قیاس ہے کہ انھوں نے اپنی مرضی سے مطلق العنان حکومت قایم کی ہوگی۔ لیکن روسو نے ان مسائل پر محض ایک سطحی نظر ڈالی ہے، اور اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لئے دلیلوں کے بجائے خطابت سے کام لیا ہے۔ فلسفی " انسانوں کی طرف غلامی سے ایک طرح کی رغبت منسوب کرتے ہیں کیونکہ وہ لوگ جوان کی نظروں کے سامنے ہوتے ہیں اپنی غلامی کو صبر سے برداشت کرتے ہوتے ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ آزادی کا وہی حال ہے جو معصومیت اور نیکی کا۔ جب تک یہ چیزیں ہم میں موجود ہوں ہم ان کی قدر پہچانتے ہیں، لیکن جب وہ جاتی رہیں تو ان کا شوق بھی غائب ہو جاتا ہے"۔ جو خود غلام ہو جیسے کہ روسو کے خیال میں سیاسی فلسفی عام طور سے تھے، اس کے تو ذہن میں آزادی کا تصور تایم ہونا دشوار ہے۔ "جب میں ننگے وحشیوں کے گروہوں کو یورپ کے سامان آسائش پر حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے اور اپنی آزادی کو محفوظ رکھنے کے لئے بھوک، آگ، قید کی زنجیریں اور موت کی مصیبتیں دلیرانہ برداشت کرتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ آزادی پر بحث کرنا غلاموں کا کام نہیں"۔

روسو کی سب سے مکمل تصنیف " معاہدۂ اجتماعی " ہے، جو ۱۷۶۲ء میں شائع ہوئی۔ اس تصنیف میں وہ اپنی بحث نہایت ٹھنڈے دل سے شروع کرتا ہے، مگر پھر اس کا جوش یکایک اُبل پڑتا ہے۔ " انسان آزاد پیدا ہوا ہے، مگر ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا نظر آتا ہے۔ بہتیرے اپنے آپ کو دوسروں کے آقا سمجھتے ہیں، حالانکہ دراصل ان سے بھی بڑھ کر غلام ہوتے ہیں۔ یہ تبدیلی کیسے ہوئی؟ مجھے نہیں معلوم۔ یہ حق بجانب کیونکر ثابت کی جاسکتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ میں اس مسئلہ کو حل کر سکتا ہوں"۔

روسو کا یہ کہنا کہ اسے نہیں معلوم کہ آزاد انسان غلام کیسے ہوگئے ایک عجیب بات ہے، اس لئے کہ اس نے

"عدم مساوات کے آغاز" میں اسی پر بحث کی تھی اور اسی کے متعلق ایک نظریہ پیش کیا تھا۔ لیکن یہاں پر اس کا مقصد شکایت نہیں ہے، یہاں وہ سیاسی نظام کو حق بجانب دکھانا چاہتا ہے۔ "عدم مساوات کے آغاز" میں اس نے لوگوں کی جس ابتدائی غلطی کا دکھڑا رویا تھا اس کی وہ یہاں پر تلافی کرنا اور ایک ایسے نظام کا خاکہ کھینچنا چاہتا ہے جو شہریوں کی آزادی اور عزت کو محفوظ رکھے۔ روسو کا ارادہ سیاسی یا متمدن زندگی کی مخالفت کرنا نہیں تھا، "معاہدۂ اجتماعی" میں سیاسی زندگی کو جو مرتبہ دیا گیا ہے وہ یونانیوں کے سوا اور کسی نے اسے نہیں عطا کیا۔ لیکن یہ پڑھ کر کہ "انسان آزاد پیدا ہوتا ہے مگر ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا نظر آتا ہے" خواہ مخواہ اندیشہ ہوتا ہے کہ روسو نے ساری دنیا کو تہ و بالا کر دینے کی ٹھان لی ہے۔ ایسے ہی جملوں کی بدولت آزادی کو ترسی ہوئی فرانسیسی قوم میں روسو کے فلسفے کا بہت بڑا چرچا ہو گیا اور ایک اُمنگ نے جو سب کے دل میں اُٹھ رہی تھی الفاظ کا جامہ پہن لیا۔ مگر روسو کا مطلب وہ نہیں تھا جو بظاہر اس کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔ انسان آزاد ہرگز نہیں پیدا ہوتا، اسے آزادی صرف صحیح قسم کی سیاسی زندگی میں اور سچے سیاسی اصولوں پر عمل کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے، ورنہ وہ ہوس اور غرض کا بندہ رہتا ہے۔ انسان زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، اس سے تو انکار کرنا مشکل ہے، لیکن یہ زنجیریں اس کی تنگ نظری، خود غرضی اور نفس پرستی نے ڈھالی ہیں، ان سے وہ رہا اس صورت میں ہو سکتا ہے جب وہ اپنے دل کو پاک کرے، راست بازی کو اپنا مسلک بنائے، اور اس حقیقت کو جو اس کی نظروں سے کبھی چھپی نہیں رہتی اپنا رہبر بنائے۔ یہ سب روسو نے بعد کو بیان کیا ہے، اور اس میں گو شاعری بہت ہے، مگر وہ سچی شاعری ہے، اس کا مقصد تعمیر ہے، اس طرح کی وحشت ناک تخریب نہیں جس نے فرانسیسی انقلاب میں خون کے دریا بہائے۔

یہ بتا کر کہ وہ سیاسی نظام کو برحق ثابت کرنے کی تدبیر نکالنا چاہتا ہے، روسو ان نظریوں پر غور کرتا ہے جو ریاست کے آغاز کی نسبت پیش کئے گئے ہیں۔ ریاست کو محض زور آوروں کے زور پر منحصر کرنا غلط ہے، کیونکہ زبردستی سے کوئی حق نہیں پیدا ہوتا اور ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ محکوموں کو اس کا حق ہے کہ جب ممکن ہو وہ حاکموں کے پنجے سے نجات حاصل کر لیں۔ یہ بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ سیاسی اقتدار

خدا کی دین ہے' اور اس وجہ سے فرماں برداری ہمارا فرض ہے' جیسا کہ بوسوئے اور فلمر کا خیال تھا' کیونکہ اگر اقتدار خدا کی دین ہے تو سب بیماریاں بھی اسی کی دین ہیں' اور اگر ہم بیماری کا علاج کراتے ہیں تو ہمیں سیاسی نظام کی اصلاح کرنے کا بھی حق ہے۔ چونکہ سیاسی نظام نہ خود بخود وجود میں آیا نہ خدا کے حکم سے' اس لئے بس یہی صورت رہ جاتی ہے کہ ہم انسان کو اس کا موجد اور بانی سمجھیں۔ گروشیئس نے فرماں روائی کی بنیاد ایک معاہدے کو قرار دیا تھا جس کے رو سے محکوم تمام حقوق بادشاہ کی طرف منتقل کر دیتے ہیں' جیسے غلام اپنے آقا کو اپنی ذات اور ملکیت پر پورا اختیار دیدیتا ہے۔ لیکن روسو کو ایسا معاہدہ بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے جس میں ایک فریق کا سراسر نقصان ہو اور دوسرے کا ہر طرح سے فائدہ۔ " اپنی آزادی سے دست بردار ہونا اپنی انسانیت اور تمام انسانی فرائض سے دست بردار ہونا ہے۔ ایسے شخص کے لئے جو ہر چیز سے دست بردار ہو جائے کوئی معاوضہ ممکن نہیں ایسی دست برداری انسانی فطرت کے سراسر خلاف ہے' کیونکہ انسان سے ارادے کی تمام آزادی لے لینا اس کے افعال و اعمال کو اخلاقی معنی سے خالی کر دینا ہے۔ مختصر یہ کہ ایسا معاہدہ جس میں ایک طرف مطلق اقتدار کا مطالبہ اور دوسری طرف کامل فرماں برداری کا وعدہ ہو مہمل اور متناقض ہے کوئی قوم جنگ میں مغلوب ہونے پر بھی معاہدے کے ذریعے سے غلام نہیں بنائی جا سکتی۔ فاتح جان بخشی کے بدلے میں غلامی پر مجبور نہیں کر سکتا ہے' اس لئے کہ فاتح کو اس کا حق نہیں ہوتا کہ جن لوگوں پر وہ غالب آئے ان سب کو مار ڈالے اور اگر وہ جبراً حکومت کرے تو بھی محکوم قانون اور اخلاق کے رو سے اس کی اطاعت پر مجبور نہیں۔ اس طرح روسو یہ ثابت کر دیتا ہے کہ سیاسی اقتدار صرف محکوموں کی رضامندی سے قائم ہو سکتا ہے اور اس کا انحصار ہمیشہ انھیں کی رضامندی پر رہتا ہے اس کے بعد وہ اپنے نظریے پیش کرتا ہے۔

" عدم مساوات کے آغاز " میں روسو نے اس آزاد فطری زندگی کو جب کہ انسان نے پہلے پہل اجتماعی طرز معاشرت اختیار کیا دنیا کا عالم شباب قرار دیا تھا۔ لیکن " معاہدۂ اجتماعی " کی تصنیف تک اس کے خیالات بہت کچھ بدل گئے تھے۔ یہاں " عالم شباب " کا دور بالکل بے ثبات قرار دیا

جاتا ہے، اور معاشرے کا قائم ہونا صرف ایک ترقی کی صورت ہی نہیں بلکہ حفاظت کا واحد طریقہ مانا جاتا ہے۔ "معاہدہ اجتماعی" میں روسو فطری زندگی کو تاریخی واقعے کی نوعیت نہیں دیتا، اس طرح وہ اس اعتراض سے بچا رہتا ہے جو لوک پر کیا جا سکتا ہے، کہ اس نے ایک واقعہ کو تاریخی قرار دیا ہے جس کا پتہ تاریخ میں کہیں نہیں ملتا۔ ہوبز کی طرح اس نے فطری زندگی اور معاہدہ اجتماعی کی ڈوریوں سے منطق کا جال بھی نہیں بُنا ہے۔ معاہدے کا ذکر کرنے سے پہلے وہ یہ ثابت کر چکا ہے کہ ریاست زبردستی قائم کی جائے تو چاہے وہ صدیوں قائم رہے اسے ریاست کہنا اور اس کے ماتحتوں کو شہری اور آزاد سمجھنا غلط ہے۔ لوگ غلام بنتے ہیں اور بنائے جاتے ہیں، تلوار کی دلیل کو رد کرنے کی اکثر لوگوں میں ہمت نہیں ہوتی۔ لیکن روسو جس ادارے کو ریاست اور جس معاشرے کو سیاسی معاشرہ سمجھتا ہے وہ اس طرح قائم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لئے رضامندی کی شرط ہے اور یہ شرط اسی حالت میں پوری ہو سکتی ہے جب لوگ اپنے ادارے سے مناسب معاہدہ کریں۔ اس معاہدے کے مختلف ضابطے "گو وہ شاید کبھی باقاعدہ بیان نہیں کئے گئے ہیں، ہر جگہ ایک سے ہیں، ہر جگہ تسلیم کئے جاتے ہیں": "ہم میں سے ہر ایک سب کے ساتھ مل کر اپنی ذات اور اپنی تمام قوت کو ارادۂ عامہ کے بالکل تحت کر دیتا ہے، اور اس کے بدلے میں ہم ہر ایک کو اجتماعی ہستی کا ایک جزو تسلیم کرتے ہیں"۔ یہ معاہدہ افراد کو ایک مربوط جماعت بنا دیتا ہے، " اس سے ایک اخلاقی اور اجتماعی ہستی پیدا ہوتی ہے جس کے اتنے ہی اجزا ہوتے ہیں جتنے کہ افراد جماعت میں شریک ہیں، اور جسے اسی معاہدے کے ذریعے سے ربط و اتحاد، مجموعی شخصیت، جان اور ارادہ حاصل ہوتا ہے"۔ افراد کے لئے معاہدے میں شریک ہونا گویا اپنے آپ کو جان اور مال سمیت معاشرے اور ریاست کے حوالے کر دینا ہے۔ اس کے بعد وہ کسی حق کی نسبت یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ وہ معاشرے یا ریاست کے اختیار سے باہر ہے۔ لیکن روسو یہ ظاہر کر دیتا ہے کہ اس سے کسی کا نقصان نہیں ہوتا۔ چونکہ ہر ایک یکساں اپنے حقوق سے دست بردار ہو کر ریاست کو ان کا محافظ بنا دیتا ہے، اور شرائط سب کے لئے ایک سے ہوتے ہیں۔ اس لئے کسی زیادتی کا اندیشہ نہیں رہتا اور اتحاد اور ربط میں بھی کوئی کمی نہیں رہتی۔" مختصر یہ کہ ہر شخص

چونکہ اپنے آپ کو اور سب کے حوالے کر دیتا ہے، اس لئے وہ (دراصل) اپنے آپ کو کسی کے بھی حوالے نہیں کرتا،
اور چونکہ معاہدہ کرنے والوں میں سے کوئی ایسا نہیں ہوتا جس پر ہم کو وہ حقوق نہ حاصل ہو جائیں جو ہم خود اسے
دیتے ہیں، اس لئے ہم جتنا کھوتے ہیں اتنا ہی ہمیں واپس بھی مل جاتا ہے اور جو کچھ ہمارے پاس ہوتا ہے
اسے محفوظ رکھنے کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔" انفرادی حقوق کے طرفداروں کو یوں اطمینان دلا کر روسو ان
فائدوں کو بیان کرتا ہے جو انسان کو معاشرے اور ریاست کے قائم ہونے سے میسر ہوتے ہیں۔ یہاں پر
ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ سچی سیاسی زندگی کا کس درجہ قائل تھا، اور وہی فطری معاشرت جس کی اس نے
پہلے اتنی تعریف کی تھی، اگرچہ محض بگڑے ہوئے تمدن اور تہذیب کی ضد میں، "معاہدہ اجتماعی" کی تصنیف
کے وقت، یعنی جب وہ سچی سیاسی زندگی کا نقشہ کھینچ رہا ہے، اسے کتنی حقیر معلوم ہونے لگی تھی۔ سیاسی
معاشرے اور ریاست میں داخل ہو کر انسان اپنی فطری آزادی سے اور اس حق سے ہاتھ دھوتا ہے
جو اسے ہر چیز پر جو اسے ملی ہوتی حاصل تھا۔ لیکن اس کے بدلے میں اسے ملکیت اور ملکیت کا حق ملتا ہے
اور معاشرے کے ارادۂ عامہ کے سوا اس کے حقوق میں دست اندازی کرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ یہ فائدہ
خود روسو کے نزدیک اور فوائد کے مقابلے میں بہت ادنیٰ ہے۔ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس نے سیاسی
معاشرت کا وجود میں آنا نوع انسان کی سلامتی کے لئے ناگزیر فرض کیا تھا۔ اب وہ کہتا ہے کہ "فطری
حالت سے گزر کر سیاسی نظام میں داخل ہونے سے انسان میں ایک حیرت انگیز تبدیلی ہو جاتی ہے،
کیونکہ اس کے عمل میں جبلت کی جگہ انصاف کا معیار کارفرما ہو جاتا ہے اور اس کے افعال میں وہ اخلاقی
صفت پیدا ہو جاتی ہے جو پہلے موجود نہ تھی۔ اس وقت جسمانی خواہش کے بجائے فرض کا احساس،
ہوس کی جگہ حق کا احساس، انسان کے عمل کا محرک بن جاتا ہے، اور انسان، جو اب تک اپنے سوا کسی
کا خیال نہیں کرتا تھا، خود کو دوسرے اصولوں کے مطابق چلنے پر مجبور پاتا ہے، اور اسے نفس کا کہنا
ماننے سے پہلے عقل کے مشورے پر چلنا پڑتا ہے۔ اگرچہ اس حالت میں وہ بہت سے اختیارات
کھو بیٹھتا ہے جو اسے فطرت کی طرف سے عطا ہوئے ہیں، لیکن ان کے بدلے میں اسے اتنے ہی بڑے
فوائد بھی پہنچتے ہیں۔ اس کے قویٰ استعمال میں آتے ہیں، اس کے خیالات وسیع، اس کے احساسات لطیف

اور اعلیٰ ہو جاتے ہیں، اس کی ساری شخصیت بلندی کے اس درجے پر پہنچ جاتی ہے کہ اگر اس نئی حالت میں خود اس کی زیادتیاں اور دستور کی برائیاں اسے اس کی قدیم حالت سے بھی زیادہ نیچے نہ کر دیتیں، تو اس کا فرض ہو جاتا کہ ہمیشہ اس مبارک لمحے کو دعا دیتا رہے جب وہ فطری زندگی کی قید سے رہا ہوا اور ایک بیوقوف اور جاہل جانور سے ایک ذی عقل ہستی، ایک انسان بن گیا۔"

اس میں شک نہیں کہ روسو کا معاہدہ اجتماعی ایک عینی تصور ہے، اور اس طرح ایک آن میں انسان کی کایا پلٹ جانا شاعرانہ مبالغہ ہے۔ تاریخ بھی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ سیاسی حقوق اور فرائض کا احساس رفتہ رفتہ پیدا ہوا۔ لیکن تاریخ کے رو سے بھی ہم روسو پر صرف یہ اعتراض کر سکتے ہیں کہ اس نے انداز بیان کسی قدر غلط اختیار کیا، اس کا دعویٰ دراصل صحیح ہے۔ انسان کا حیوانی عنصر اسے فطرت کی طرف سے ملا ہے، اس عنصر میں خوبیاں بھی ہیں اور خرابیاں بھی۔ لیکن اسی وجہ سے کہ آدمی میں انسانی عنصر بھی شامل ہے، اُس کے لئے حیوانی زندگی خطرناک ہو جاتی ہے، اور خطروں سے نجات پانے کی صورت یہی ہے کہ وہ اپنے فطری عنصر کو انسانی عنصر کے ماتحت کر دے، یعنی سیاسی معاشرہ قائم کرے، کیونکہ انسانی عنصر کو نشو و نما کے لئے جو ماحول درکار ہے وہ صرف سیاسی معاشرے میں میسر آسکتا ہے۔ سیاسی معاشرہ اگر ویسا نہ ہو جیسا کہ اسے ہونا چاہئے تو انسان کا حیوانی یا فطری عنصر غالب رہتا ہے، جسے روسو اپنی اصطلاح میں "فطری حالت کی طرف واپس جانا" کہتا ہے، اور اصطلاح تاریخ میں یہی کیفیت حالت تنزل یا بگڑی ہوئی نشو و نما کہلائے گی۔ فطری عنصر کا غالب رہنا انسان کی شان کے خلاف ہے کیونکہ عقل اور اخلاقی احساس، جو انسانی سیرت اور سرشت کے زیور ہیں، ناموزوں فضا میں کبھی فروغ نہیں پا سکتے، اور انسان کو نشو و نما کی وہ آزادی نہیں مل سکتی، اس کے حوصلوں میں بلند پروازی کا وہ شوق پیدا نہیں ہو سکتا جو روسو اور نوع انسانی کے دوستوں اور قدردانوں کی نظر میں انسان کا خداداد حق ہے۔ سیاسی آزادی کے متعلق خیالات میں اختلاف ہو سکتا ہے اور انفرادیت کے حامی روسو پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس نے ریاست کو اس قدر وسیع اور ہمہ گیر اختیارات دیدئے کہ اس کی ریاست اور ہوبز کے حاکم مطلق بادشاہ میں صرف نام کا فرق رہ جاتا ہے۔ روسو نے واقعی ریاست کو مختار کل بنا دیا ہے، اور ارادۂ عامہ کی فرمانروائی پر

جو معاہدۂ اجتماعی کے بعد خود بخود قائم ہو جاتی ہے، کسی طرح کی پابندی عاید نہیں کی گئی ہے۔ روسو کا دعویٰ یہ ہے کہ ارادۂ عامہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا، اس لئے کہ ہر شخص اپنی بھلائی چاہتا ہے اور ارادۂ عامہ صرف اس عام خواہش کا اظہار کر سکتا ہے۔ اس کی ریاست میں حاکم اور محکوم کا وہ فرق جو محکوموں کے حقوق کو جوکھم میں ڈال دیتا ہے، پیدا نہیں ہو سکتا۔ ریاست کے تمام شہری خود ہی فرماں روا بھی ہیں اور فرماں بردار بھی؛ حاکم بھی، محکوم بھی۔ ریاست کا ربط جبراً قائم کیا ہوا نہیں، شہریوں کے اپنے معاہدے کا نتیجہ ہے، شہریوں کے امن اور اطمینان کی ذمہ دار کوئی غیر قوت نہیں، بلکہ اغراض اور مقاصد کی وہ ہم آہنگی جو سیاسی معاشرے کے وجود میں آتے ہی لوگوں کے دلوں میں جلوہ افروز ہو جاتی ہے۔ روسو کی ریاست محض ظاہری اتحاد نہیں، وہ ایک جسم نامی ہے جس کے اجزا کل میں محو ہو جاتے ہیں۔ اس کے مدنظر یہ نہیں ہے کہ فرد اور معاشرے یا ریاست کے درمیان حقوق اور اختیارات کی تقسیم کر کے کوئی نازک توازن قائم کرے، بلکہ وہ ریاست میں کامل جسم نامی کے اوصاف پیدا کرنا چاہتا ہے۔ "جس طرح فطرت ہر انسان کو اپنے اعضا پر پورا اختیار دیتی ہے، اسی طرح معاہدۂ اجتماعی سیاسی معاشرے کو اپنے تمام اراکین پر کامل اختیار دیتا ہے، اور اسی اختیار کو ہم فرماں روائی کہتے ہیں"۔ جب ارادۂ عامہ اس کا رہبر ہو، ارادۂ عامہ کے حامل اور ریاست کے فرماں روا خود شہری ہوتے ہیں، اس لئے روسو انھیں کسی طرح سے پابند کرنا مہمل سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ اندیشہ بھی بے جا ہے کہ شہری ایسا طرزعمل اختیار کریں گے جس سے خود انھیں نقصان پہنچے۔ دراصل اس کا منشا یہ ہے کہ چونکہ ریاست ایک نامی جسم ہے، اس لئے شہریوں کے کوئی ایسے حقوق نہ ہونا چاہئیں، فرماں روائی پر کوئی ایسی قید نہ ہونا چاہئے، جس سے ریاست کی نشوونما میں خلل پڑ سکے اور اس کے وجود میں آنے کا مقصد فوت ہو جائے۔

اور مسائل کی طرح اس میں بھی روسو نے واقفیت اور ذہنیت کی ایسی آمیزش کر دی ہے جس نے خود اسے اور اس کے اکثر پیرووں کو غلط فہمی میں ڈال دیا۔ اس کا یہ نظریہ کہ ریاست ایک جسم نامی ہے بالکل صحیح ثابت کیا جا سکتا ہے، اور فرد اور جماعت میں جو ربط وہ پیدا کرنا چاہتا تھا اس کی اہمیت اور ضرورت ظاہر ہے۔ لیکن اغراض کی وہ ہم آہنگی، مقاصد کی وہ یکجہتی جو روسو نے فرض کی ہے سیاسی

زندگی کا پہلا قدم نہیں ہے بلکہ ترقی اور نشوونما کی آخری منزل، کمال کا انتہائی درجہ۔ روسو نے ہر اس حالت کو جو اس کے سیاسی فلسفے کے مطابق نہ ہو، معاشرے اور ریاست کی بگڑی ہوئی شکل قرار دے کر بحث سے خارج کر دیا ہے، اگرچہ وہ خود بھی محسوس کرتا ہے کہ سیاسی اخلاق کا اس بلندی پر قائم رہنا جس پر وہ اسے دیکھنا چاہتا تھا بہت دشوار ہے۔ اس کا سیاسی فلسفہ ایک بہت اعلیٰ معیار ہے جس پر ہر قوم کو اپنا سیاسی نظام جانچتے رہنا چاہئے، لیکن اس معیار کے حصول کو قبل از وقت ممکن سمجھ لینا بڑی خرابی کا باعث ہو سکتا ہے۔ روسو پر اس کا الزام نہ لگانا چاہئے کہ اس نے اپنے تخیل کو دنیا کے جزوی "واقعات" کا پابند نہیں کیا۔ اس کی غلطی یہ تھی کہ اس نے واقعیت اور عینیت کی درمیانی کڑیاں توڑ دیں۔

روسو سے پہلے بھی سیاسی فلسفیوں نے قوم کی فرماں روائی کا دعویٰ کیا تھا۔ ریاست کو ایک جسم نامی قرار دینے میں بھی اس نے کوئی جدت نہیں کی۔ لیکن اس سے پہلے کوئی بھی جمہوریت کا سچا معتقد نہیں تھا، کسی کو اس کا یقین نہیں تھا کہ عوام، یعنی سیدھے سادے غیر مہذب لوگ، ریاست کا بیڑا پار لگا سکتے ہیں۔ یہ عقیدہ روسو کے دل میں سوئٹسان کی سیاسی زندگی نے پیدا کیا اور روم اور یونان کی تاریخ کے مطالعے نے اسے اور پختہ اور گہرا کر دیا۔ لیکن اس عقیدے کا انحصار ایک اور نظریے پر ہے جسے روسو کے ذہن کی خاص ایجاد اور اس کے فلسفے کا جوہر سمجھنا چاہئے، اور وہ اس کا "ارادۂ عامہ" کا نظریہ ہے۔ روسو نے کہیں ارادۂ عامہ کی تعریف وضاحت سے نہیں کی ہے، مگر ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ ان جبلی خواہشوں اور حوصلوں کی طرح جو فطرت نے ہر نامی جسم کو دئے ہیں، ریاست بھی بہ حیثیت ایک جسم نامی کے ایک ارادہ رکھتی ہے، جو ایک غیر محسوس طریقے سے اس کو خطروں سے بچاتا اور منزل مقصود کی طرف مائل کرتا ہے۔ شہری اس سیاسی جسم نامی کے اجزا ہیں، اس لئے وہ ارادۂ عامہ کے حامل ہوتے ہیں۔ "جب تک کہ انسانوں کی ایک متحد جماعت اپنے آپ کو ایک جسم سمجھتی رہے، اس کا عام حفاظت اور بہبودی کے متعلق ایک ارادہ رہتا ہے۔ اس وقت ریاست کے تمام قویٰ چست اور سادہ ہوتے ہیں اور اس کے سیاسی اصول صاف اور روشن۔ اس میں اغراض کی پیچیدگیاں اور تضاد

نہیں پایا جاتا ۔ عام مفاد حاصل کرنے کی صورت ہر جگہ بالکل واضح ہوتی ہے اور اسے دریافت کرنے کے لئے صرف تھوڑی سی عقل سلیم درکار ہوتی ہے ۔" لیکن اگر سیاسی زندگی کا معیار پست ہو جائے اور انفرادی اغراض کے سوا ریاست کا اور کوئی رہبر نہ ہو، تو ارادۂ عامہ بگڑتا نہیں اور معدوم نہیں ہو جاتا ۔ وہ ہمیشہ ایک سا رہتا ہے اور ہمیشہ خالص، ہمیشہ شہریوں کو صحیح رستے پر چلاتا ہے اور عام مفاد کی طرف مائل کرتا ہے ۔ اگر وہ ظاہر نہ کیا جائے تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ شہریوں کے دل میں موجود نہیں ۔ وہ صرف معطل ہو جاتا ہے، کیونکہ اس کا سننے اور ماننے والا کوئی نہیں ہوتا روسو نے خود یہ بات صاف طور پر کہی نہیں ہے، لیکن اس کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ ریاست اور ارادۂ عامہ ایک ساتھ وجود میں آتے ہیں، اور جب تک ریاست نیست و نابود نہ ہو جائے، اس میں ارادہ عامہ موجود رہتا ہے ۔ گویا دونوں کا تعلق جسم اور جان کا سا ہے ۔

ارادۂ عامہ کا نظریہ پیش کرکے روسو نے قوموں اور ریاستوں کی تاریخ کو زندہ کر دیا اور ان کی جدوجہد کی ایسی روشن اور ہمت افزا تعبیر کر دی جو محض تاریخی مطالعے یا وطن پرستی کے برتے پر نہیں کی جا سکتی تھی ۔ لیکن اس نے اپنے نصب العین کو عملی صورت دینے کی کوشش بھی کی اور اس میں اسے سخت ناکامی ہوئی ۔ اس کا یہ فرض کرنا کہ ہر مسئلے کے متعلق ارادۂ عامہ معلوم کیا جا سکتا ہے خود ایک غلطی تھی، اسے معلوم کرنے کی تدبیریں بتا کر اس نے اپنے فلسفے کو مضحک بنا دیا ۔ ارادہ عامہ ہر شہری کے دل میں ایک پاک جذبے کی شکل میں ہر وقت موجود ہوتا ہے، لیکن شہری خواہ کتنے ہی نیک نیت اور نیک سیرت، جوش حمیت اور جوش ایثار سے معمور ہوں، وہ ہر معاملے میں محض اپنی ذاتی رائے دے سکتے ہیں، اور اس کا ہمیشہ امکان رہتا ہے کہ ان کی رائے غلط ہو ۔ رائے شماری کے ذریعے سے ارادۂ عامہ کسی صورت سے دریافت کیا ہی نہیں جا سکتا ۔ اس کا اقلیت اور اکثریت کی رائے سے کوئی تعلق نہیں اور نہ اس کا کسی ایک مسئلے پر اظہار ہو سکتا ہے ۔ وہ تاریخ کے خزانے میں ایک بیش بہا جوہر کی طرح محفوظ رہتا ہے اور اسی کو مل سکتا ہے جو صدق دل اور خلوص سے اس کو تلاش کرے ۔ روسو کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ اگر شہریوں کی نیت بری ہو، ریاست میں فرقے

پیدا ہو جائیں اور ذاتی اغراض ریاست کی ضروریات سے زیادہ اہم سمجھی جانے لگیں تو ریاست کا ترقی کرنا اور اپنے مقاصد حاصل کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ "اگر شہری کافی معلومات حاصل کرنے کے بعد، مگر ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات کئے بغیر کوئی فیصلہ کریں تو چھوٹے چھوٹے اختلافات کی کثیر تعداد کا فرق نکال کر ارادۂ عامہ ہمیشہ معلوم ہو سکتا ہے" یا یہ کہ "مجلسوں میں جتنی ہم آہنگی ہو، یعنی رائے شماری میں جس قدر اتفاق رائے ظاہر ہو، اسی قدر ارادۂ عامہ غالب رہتا ہے"۔ ارادۂ عامہ ریاست اور سیاسی معاشرے کا رہبر ہوتا ہے، مگر یہ کہنا محض ابلہ فریبی ہے کہ "جو شخص ارادہ عامہ کی فرماں برداری سے انکار کرے اسے باقی سب فرماں برداری پر مجبور کریں گے، جس کے معنی صرف یہ ہیں کہ وہ آزاد ہونے پر مجبور کیا جائے گا"۔ اسی طرح روسو نے ایک جگہ اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر کوئی شخص عام رائے کو اپنے خلاف پائے تو اسے سمجھنا چاہیئے کہ اس نے ارادۂ عامہ کی نسبت غلط اندازہ لگایا ہے، اور اس کی رائے مان لی جاتی تو وہ خود اس کے حقیقی ارادے کے خلاف ہوتی، (۱) اور اس لحاظ سے وہ آزاد نہ ہوتا، کیونکہ آزادی صرف ارادۂ عامہ کی فرماں برداری سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسی منطقی بازیگری روسو کے فلسفے کی شان کے بہت خلاف ہے اور اگر اس کے ذہن میں واقعیت اور عینیت میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ہوتی تو اسے ایسی دلیلوں سے کام لینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ اختلاف رائے خلوص کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے، اس میں کوئی اندیشے کی بات نہیں۔ غلطیاں کرنا اور بھٹکنا آزادی کی شرط ہے، کیونکہ اس کے بغیر تجربے کا وہ ذخیرہ فراہم نہیں کیا جا سکتا جو آزادی کو ایک حقیقت بنانے کے لئے ناگزیر ہے۔ لیکن روسو کی عینیت پرستی اور رومانیت نے اسے گوارا نہ کیا کہ انسان کسی اعلیٰ مصلحت کی بنا پر بھی اپنی اصل سے ورا ہو

---

(۱) ۔ ہر شہری روسو کے نزدیک حقیقت میں وہی چاہتا ہے جو ارادۂ عامہ چاہتا ہو، اور ارادۂ عامہ سے بے جانے یا جان بوجھ کر اختلاف کرنا گویا اپنے اصلی مقصد سے

یعنی زندگی کی کسی نعمت سے محروم رکھا جائے۔

جہاں تک سیاسی نظام کا تعلق ہے، روسو کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ریاست چھوٹی ہونا چاہیئے۔ جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے اس کی اور تجویزیں سب بیکار ہو جاتی ہیں۔ رسم پوری کرنے کے لئے اس نے حکومت کے مختلف طریقوں پر بحث کی ہے، اور جابجا مونٹس کیو کی نقل کر کے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ وہ سیاسی مسائل کے اس پہلو سے غافل نہیں جس کی طرف مونٹس کیو نے توجہ دلائی تھی۔ مگر یہ سب محض دکھانے کے لئے ہے۔ روسو کا دل اس نظام اور انھیں سیاسی اصولوں میں اٹکا ہے جو یونان اور روما میں رائج تھے۔ اس کے نزدیک فرماں روائی کا حق نہ کسی کو دیا جا سکتا ہے نہ کوئی اس میں حصہ لگا سکتا ہے، شہری اگر اس مقدس حق کو اپنے ارادے سے محدود کر دیں تو وہ بنیادی معاہدہ جس نے ان سب کو ایک ریاست اور سیاسی معاشرے کی شکل دی تھی خود بخود ٹوٹ جاتا ہے اور وہ پھر منتشر افراد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ غرض فرماں روائی کی تمام شرائط پوری کرنا شہریوں کا فرض ہے اور اس فرض سے وہ کسی حالت میں سبکدوش نہیں ہو سکتے، خواہ وہ حکومت کا کوئی طریقہ بھی اختیار کریں۔ فرماں روائی کا سب سے اہم فرض قانون وضع کرنا ہے، لو قانون روسو کے نزدیک احکام نہیں بلکہ "اتحاد کے ضابطے" ہیں جنھیں وہی لوگ وضع کر سکتے ہیں جو اس اتحاد میں اراکین کی حیثیت سے شریک ہوں۔ قانون کا تعلق صرف کُلی اصولوں سے ہوتا ہے، جزوی معاملات سے فرماں روا کا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ لیکن اگر حکومت اس قسم کی جمہوریت ہو جیسے کہ ایتھنز میں تھی، یعنی اگر شہری حاکم بھی ہوں، تو وہ جزوی امور میں بھی حاکموں کی حیثیت سے احکامات جاری کر سکتے ہیں۔ قانون وضع کرنے کے علاوہ فرماں روا کا ایک اور فرض یہ ہے کہ حکومت کا طریقہ معین کرے۔ روسو نے لاک کی طرح حاکم شخص یا جماعت اور فرماں روا، حکومت اور ریاست میں فرق کیا ہے، مگر وہ لوک کے اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتا کہ حاکموں اور محکوموں میں معاہدہ ہوتا ہے اور حکومت ایک قسم کی امانت ہے جو قوم کی طرف سے کسی خاص شخص یا جماعت کے سپرد کی جاتی ہے۔ روسو ایسے نظام کو معاہدۂ اجتماعی کی خلاف ورزی سمجھتا ہے جس میں قوم کی فرماں روائی بلا واسطہ ہو، اور حکومت کا حق، جس میں لوک نے قانون سازی کو بھی شامل کیا ہے، قوم کی رضامندی یا خواہش سے بھی کسی کو نہیں دیا جا سکتا۔

روسو کے اصول کے مطابق قوم ہی کو مقرر کرتی ہے، اور تمام وہ اصول اور قاعدے تجویز کرتی ہے جن پر حاکموں کو عمل کرنا چاہیئے۔ جس طرح فرداً، واجزوی مسائل پر رائے نہیں دے سکتا، اسی طرح حاکم کلی قانون نہیں بنا سکتے ان کا کام صرف قانون پر عمل کرنا اور مخصوص مسائل میں ان کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ روسو اس تقسیم عمل کو بھی رد کر دیتا ہے جس کے لحاظ سے حکومت کے تین وظائف ہوتے ہیں، مقننہ، عدالت اور عاملہ مونتسکیو نے قومی آزادی کو اس پر منحصر کیا تھا کہ مقننہ، عدالت اور عاملہ کے اقتدار میں توازن قائم رہے، لیکن روسو اس سے بھی مطمئن نہیں۔ وہ حاکموں کی طرف سے بہت بدظن ہے اور اس کے نزدیک قوم کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ ان سے باز پرس کرتی رہے اور ان کے دل میں ذاتی اغراض کو فرائض کے احساس پر غالب نہ آنے دے۔ اس سلسلے میں وہ رومی دستور کے چند اداروں پر بحث کرتا ہے جن کا مقصد حاکموں کو قابو میں رکھنا تھا، اور اس کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر قوم کو ایسے ہی ادارے قائم کرنے چاہئیں۔ نمائندوں کے ذریعے سے آزادی کی حفاظت کرنے کا بھی روسو قائل نہیں۔ اسے یقین ہے کہ اگر طریقہ بہت نقص نہ ہوتا تو یونان اور روما کے مدبر اسے ضرور کام میں لاتے۔ نمائندگی کے رواج کو وہ نظام جاگیری کا ایک ترکہ سمجھتا ہے، اور اس وجہ سے اس کی نظروں میں اس رواج کی وقعت اور بھی گھٹ جاتی ہے۔ یہاں تک کہ انگلستان کا دستور اور نظام نمائندگی بھی اسے پسند نہیں۔ اس کی رائے میں انگریز صرف اس تھوڑی سی مدت کے لئے صحیح معنوں میں آزاد ہوتے ہیں جب وہ اپنے نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں،" اور اپنی آزادی کے لمحوں کو وہ جس طرح استعمال کرتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسی قابل ہیں کہ ان کی آزادی چھین لی جائے۔" لیکن روسو دراصل اس غلط فہمی میں تھا کہ نمائندے محض جمہور کی کاہلی اور آرام طلبی کی وجہ سے منتخب کئے جاتے ہیں، اور اسی بنا پر اس کی یہ رائے قائم ہوئی کہ "جس وقت کوئی قوم نمائندے مقرر کرتی ہے وہ آزاد نہیں رہتی، بلکہ یہ کہنا چاہیئے فنا ہو جاتی ہے،" واقعات کی شہادت اس کے بالکل خلاف ہے۔ دنیا میں شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ نمائندے منتخب کرنے کی رسم کاہلی یا آرام طلبی کے سبب سے اختیار کی گئی ہو۔ ہر قانون کے متعلق پوری قوم کی رائے لینا عملاً ناممکن ہے، اور پھر ہر شخص ہر معاملے میں رائے دینے کا اہل بھی نہیں ہوتا، اس لئے قوم میں سے ایسے لوگ جو معتبر، ہوشیار اور سمجھدار ہوں اور جن کے خیالات سے قوم کی اکثریت کو اتفاق ہو

نمائندگی کے لئے منتخب کرلئے جاتے ہیں۔ خواہ نمائندے جزوی امور میں کوئی خاص رائے دینے کے پابند کئے جائیں یا نہ کئے جائیں، جمہور کی کثرت تعداد ایک ایسی دشواری ہے جو ان کی بلاواسطہ فرماں روائی کو ناممکن کردیتی ہے، اور نمائندوں کے ذریعہ سے رائے ظاہر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہتا۔ اور اگر قوم میں ذرا بھی سیاسی حس اور امور عامہ سے دلچسپی ہے تو نمائندوں کا توسط اختیار کرنے سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہوسکتا روسو نے یہ فرض کرکے کہ جس طرح قوم فرماں روائی سے دست بردار نہیں ہوسکتی ویسے ہی وہ اسے نمائندوں کے ذریعے سے عمل میں نہیں لاسکتی، نمائندگی کے رواج کو اپنے نزدیک اصولاً غلط ثابت کردیا ہے، لیکن اگر قوم اپنے معاملات کی طرف سے بے پروانہ ہو تو نمائندوں کے دغا دینے کا کوئی اندیشہ نہیں، اور وہ اس پر مجبور ہوں گے کہ رائے عامہ اور ارادۂ عامہ کا اظہار کریں۔ زیادہ خطرہ تو ان ریاستوں میں ہوتا ہے جہاں ایتھنز کی جمہوریت کی طرح عوام خود حکومت کرتے ہیں، اور وہ لوگ جن کے حوصلے قومی نمائندے بننے سے پورے ہو جاتے عوام کو بیجا اور بے جا طریقوں پر اپنے اثر میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ روسو نے اگر ذرا غور کیا ہوتا تو نمائندگی کے رواج کی مصلحت اس کی سمجھ میں آجاتی، کیونکہ انگلستان میں بھی قوم کے بہت سے ایسے نمائندے تھے جو اسے فائدہ پہنچا رہے تھے اور جن کی جدوجہد کا محرک وہی ارادۂ عامہ تھا جس کی حکمرانی روسو کا نصب العین تھی۔ لیکن روسو صرف اپنے زمانے کی تہذیب سے بیزار نہیں تھا بلکہ تمام سیاسی نظام سے بھی، اور قدیم روسی اور یونانی مثالیں ایسی دل فریب تھیں کہ اپنے زمانے کی دشواریوں کو حل کرنے کے لئے روسو نے ان کی نقل کرنے کے سوا اور کوئی تجویز پیش کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ایک اعلیٰ سیاسی معیار، سادی زندگی، ''اخلاقی فضائل کی سچی قدر، اس کے ساتھ چھوٹی ریاستیں جن میں شہری خود فرماں روائی کے فرائض انجام دے سکیں اور حاکموں پر نگرانی کرسکیں، یہ اس کے نزدیک سیاسی فلاح کی صحیح تدبیریں تھیں۔

فرد اور معاشرے کا ربط قائم رکھنے کے لئے مذہب بھی بہت ضروری ہوتا ہے، اور روسو نے اسے نظر انداز نہیں کیا۔ وہ رومی کلیسا کے نظام اور مذہب کی اس شکل سے جو عیسائیت نے یورپ میں اختیار کی تھی بہت نفرت کرتا تھا، اور اس وجہ سے اس نے مذہب کے مسئلے پر بالکل نئے نقطہ نظر سے غور کیا اور اس کے متعلق ایک بالکل نیا نظریہ پیش کیا ہے۔ قدیم زمانے کے مذہب معاشرے میں ربط تو پیدا کرتے تھے،

مگر ان میں تنگ نظری بہت تھی، غیروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ان کی تعلیم میں شامل نہیں تھا اور وہ خدا کی سچی پرستش کو مہمل رسموں کے پردے میں چھپا کر لوگوں کو اوہام پرست بنا دیتے تھے۔ قدیم مذہبوں کی جگہ دین عیسوی نے لی تو پرانی خرابیاں سب باقی رہیں اور بہت سی نئی خرابیاں پیدا ہوگئیں۔ عیسائیت نے ایک طرف تو اس کی تعلیم دی کہ دین اور دنیا، سیاسی اصول اور مذہبی عقیدے جداگانہ چیزیں ہیں، جس سے لوگوں کے دلوں میں سیاسی فرائض کی اہمیت بہت گھٹ گئی، اور دوسری طرف ریاست کے مقابل ایک کلیسائی نظام قائم کیا جو قوت اور اقتدار میں یورپ کی تمام ریاستوں سے بڑھ کر تھا۔ روسو فطرتاً کسی خاص مذہب کی پیروی سے معذور تھا، اس نے خود بخود اپنے اصلی عقیدے کو بدلے ہوئے دو بار تبدیل مذہب کیا، اور جس روحانی تسلی کی اسے تلاش تھی وہ کسی مذہب میں نہیں حاصل ہو سکتی تھی۔ اس نے اپنی تسکین قلب کے لئے ایک نیا فلسفہ حیات بنایا تھا، جسے اس کے جوش عقیدت نے ایک مذہب کی شکل دیدی تھی، اور اسی کی اس نے اپنے سیاسی فلسفے میں ترجمانی کی ہے۔ مذہب کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک ذاتی، دوسرا معاشرتی۔ ذاتی مذہب کے عقائد بشرطیکہ وہ انسان کو ایک ناقص شہری نہ بنا دیں، فرماں روا کے دائرہ اثر سے باہر ہیں، اور ریاست ان میں دخل دینے کی مجاز نہیں، کیونکہ معاہدہ اجتماعی فرماں روا کو جو اختیارات دیتا ہے وہ مفاد عامہ کے معاملات تک محدود ہیں۔ لیکن اسی ذاتی مذہب کے ساتھ ایک سیاسی یا معاشرتی مذہب بھی ضروری ہے، جس کے عقائد طے کرنا فرماں روا کا فرض ہے۔ یہ عقائد دراصل بالکل مذہبی عقیدوں کی طرح نہ ہونے چاہئیں، بلکہ "نیک چال چلن کے عقائد"، جن کے بغیر اچھا یا فرماں بردار شہری ہونا ناممکن ہے۔ ریاست کو اس کا اختیار نہ ہونا چاہئے کہ ہر شخص کو اس سیاسی مذہب کے تسلیم کرنے پر مجبور کرے لیکن وہ انکار کرنے والوں کو ملک بدر کر سکتی ہے، اس بنا پر نہیں کہ وہ مشرک یا منافق ہیں، بلکہ اس بنا پر کہ وہ خلوص کے ساتھ قانون اور انصاف کے قائل نہیں ہو سکتے اور ان سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ ضرورت کے وقت ریاست پر جان و مال نثار کر سکیں گے۔ سیاسی مذہب کے عقیدے بہت سادے اور سلجھے ہوئے ہونا چاہئیں، اور تعداد میں بہت کم۔ خدا کی ذات، اس کی قدرت، انصاف اور علم غیب پر ایمان لانا، موت کے بعد زندگی، نیکی اور بدی کا اجر، اور معاہدۂ اجتماعی کے تقدس کا معتقد ہونا

کافی ہے۔ نوابی میں صرف نارواداری ہونا چاہیئے، کیونکہ یہ بڑی فتنہ انگیز چیز ہے۔

روسو نے اپنے نزدیک مذہب کا مسئلہ اس طرح کر دیا ہے کہ دین اور دنیا دونوں کے تقاضے پورے ہو جائیں۔ لیکن سیاسی مذہب، خواہ وہ کتنا ہی سادہ اور سلجھا ہوا ہو، یقیناً ذہنی تشدد کا ایک بہانہ ہو جائے گا اور اس لئے روسو کے سیاسی مذہب اور کلیسا کے اس نظام میں جس سے وہ نالاں تھا صرف نام کا فرق رہ جاتا ہے۔ پھر بھی روسو کا کلیسا کو نظام معاشرت سے خارج کر دینا مصلحت وقت کے لحاظ سے بہت مناسب تھا۔ مذہبی رہنماؤں اور اداروں سے لوگ عام طور پر شاکی تھے، یورپ کی اکثر ریاستوں میں کلیسا کی بیجا طرفداری کی جاتی تھی اور اس کے علاوہ کلیسا ذہنی آزادی اور ترقی میں حائل ہو رہا تھا۔ سیاسی مذہب کی تجویز تو کہیں پسند نہیں کی گئی اور اسے عمل میں لانے کی صرف ایک مرتبہ فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں) کوشش ہوئی، لیکن روسو کے اس عقیدے کا بہت چرچا ہوا کہ مذہب ایک ذاتی چیز ہے اور اس کا انحصار ایسے جذبات پر ہے جو اداروں اور رسموں سے بے نیاز ہیں۔ "معاہدۂ اجتماعی" میں روسو نے اس عقیدے کو تفصیل سے نہیں بیان کیا ہے اور اس کا اثر بھی سیاسیات سے زیادہ یورپ کے عام فلسفۂ حیات اور ادب پر ہوا۔ پھر بھی ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ سیاسی ذہنیت میں ہیجان اور تعمیری حوصلے پیدا کرنے کے علاوہ روسو نے مذہب کو لوگوں کے تصور میں ایک نیا رنگ دیدیا، کیونکہ رومانیت کی تحریک اسی کی تصانیف کے ساتھ شروع ہوتی ہے۔

روسو کے سیاسی فلسفے پر نکتہ چینی کرنے کی بہت گنجائش ہے، اور اگر کوئی چاہے تو اسے بالکل مہمل اور اس کے نظریوں کو ایک دوسرے کی ضد ثابت کر سکتا ہے۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ روسو کا اتنا گہرا اثر کیوں پڑا۔ اگر ہم فرانسیسی انقلاب کو محض مجنونانہ فعل قرار دیں تب بھی یہ ایک معمہ رہ جاتا ہے کہ کانٹ (۱) جیسا فلسفی، گوئٹے (۲) جیسا شاعر، فشٹے (۳) جیسا قوم پرست، روسو کا معتقد کیونکر ہوا۔

---

(۱) Kant-

(۲) Goethe-

(۳) Fichte-

روسو، اصل فطرت کا ایک عجوبہ تھا۔ ہمیں اس کے سیاسی فلسفے پر تنقید کرتے وقت یہ ضرور یاد رکھنا چاہیئے کہ اس نے سیاسی مسائل پر بحث ایک عالم کی حیثیت سے نہیں کی بلکہ اس شخص کے نقطۂ نظر سے جو آوارہ گردی کرتا رہا تھا، دن رات خیالی باتوں میں محو رہا تھا، جو ہم جنسوں کی قدردانی سے مایوس ہو گیا تھا اور مناظر فطرت سے محبت کرکے دل کا شوق پورا کرتا رہا تھا۔ غریبوں کی مصیبتیں دیکھ کر اسے غربت سے لگاؤ پیدا ہو گیا، مبلغوں کے ساتھ رہ کر اسے دکھاوے کے مذہب اور مذہبی اختلافات کی حقیقت معلوم ہو گئی اور اپنا بچپن اور تعلیمی زمانہ یاد کرکے اس نے تعلیم کا نیا اصول ایجاد کیا، جس میں بچوں کا زیادہ احترام مدنظر ہے اور ان کی طبیعت کی افتاد کا زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔ سیاسیات کی علمی اور فلسفیانہ باریکیوں کی طرف سے اس نے بہت بے توجہی برتی، تاریخ کو اس نے نظرانداز کیا، اور اپنے عہد کی زندگی کا مطالعہ بالکل فضول سمجھا، اس لئے کہ یہ سب باتیں اس کے اصل مقصد سے دور تھیں۔ وہ اصلاح نہیں چاہتا تھا، اس کی آرزو تھی ایک ایسا شدید انقلاب پیدا کرنا جو لوگوں کی طبیعتوں کو بدل دے، اور انھیں ان مصیبتوں سے نجات دلائے جن میں انھوں نے اپنے آپ کو مبتلا کر دیا تھا۔ ایسی صورت میں روسو کے متعلق صرف ایک سیاسی فلسفی کی حیثیت سے بحث کرنا، جیسا اس کے انگریزی نقادوں نے کیا ہے، صحیح نہیں۔ سیاسی حوصلے اور نصب العین محض علم کی بنیاد پر نہیں قائم کئے جا سکتے۔ اگر روسو کی علمی غلطیوں نے یورپ کی سیاسی زندگی میں نئی امنگیں پیدا کر دیں، اور سیاسی جدوجہد میں نئی جان ڈال دی تو وہ نہایت مفید غلطیاں تھیں۔

روسو کا اثر لوگوں کے جذبات پر سب سے زیادہ فرانس میں ہوا، اس کے سب سے قابل قدر علمی پیرو اور اس کے نظریوں کے مفسر جرمنی میں کانٹ، فشٹے اور ہیگل (۱) تھے، اور انگلستان میں بہت دن بعد گرین (۲) بریڈلے (۳) اور بوزین کوئٹ (۴) ہوئے۔ فرانس میں جس طرح سے

---

(۱) Kant, Fichte, Hegel (۲) Green
(۳) Bradley (۴) Bosanquent

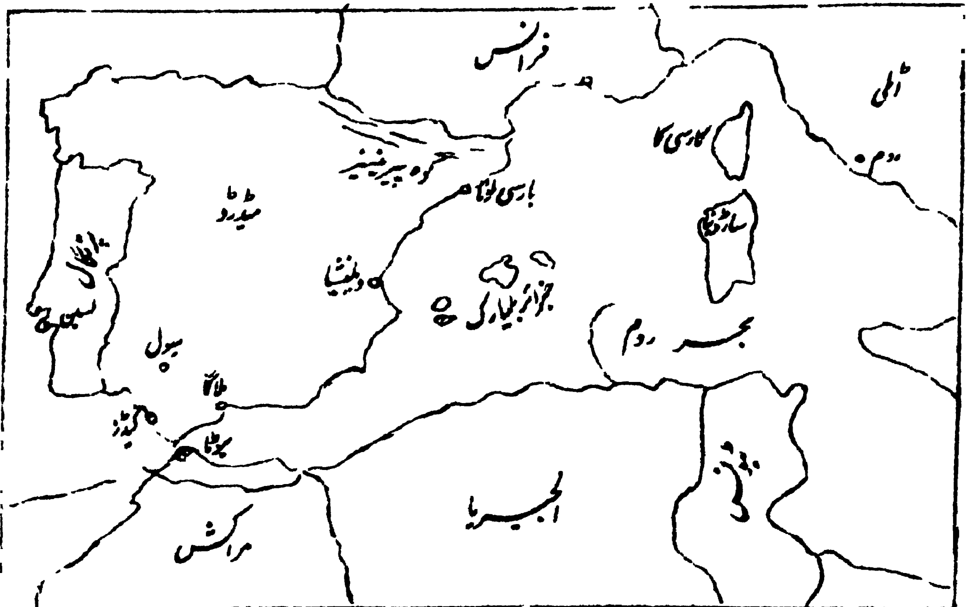
روسو کی تعلیم کا چرچا ہوا اور اس کا جو غلط استعمال کیا گیا وہ اس کے حق میں بہت مضر تھا، اور اس نے متین اور محتاط لوگوں کو روسو کی طرف سے بہت بدظن کر دیا۔ روسو کی تعلیم گلی کوچوں کے فتنہ انگیز مقرروں اور مدبروں کی خاص چیز سمجھی جانے لگی، اور اس پر ان خوں ریزیوں کا بھی الزام لگایا جانے لگا جن کی بدولت فرانسیسی انقلاب کو، جو بڑی امیدوں کے ساتھ شروع ہوا تھا اور جس سے یورپ کے تمام روشن خیال لوگوں کو بہت ہمدردی تھی، بے لگام اور بے باک قومی فرماں روائی کی ایک عبرت ناک مثال بن گیا۔ انقلاب کے بعد نپولین کی جنگوں نے یورپ کی اکثر قوموں میں فرانس کی طرف سے ایک دلی نفرت پیدا کر دی، جس طرح پہلے انقلابیوں کی زیادتیوں اور خصوصاً لوئی سیزدہم کے قتل نے بادشاہوں اور شرفا کو اس کا دشمن بنا دیا تھا۔ روسو کی اصلی تعلیم سے نہ انقلاب کی خوں ریزیاں جائز ثابت کی جا سکتی تھیں نہ نپولین کی وہ لڑائیاں جنھوں نے بہت سی قوموں کی آزادی چھین لی اور سب کو مصیبت میں ڈال دیا۔ روسو خود قتل خون، بلکہ ہر قسم کے تشدد کے خلاف تھا، اور آزادی کو سب سے بڑی نعمت سمجھتا تھا۔ اس وجہ سے عین انقلاب کے زمانے میں بھی اسے فرانس کے باہر کانٹ اور فشٹے جیسے قدر دان ملے، اور پھر جب انقلاب کا دور ختم ہو گیا اور قدامت پسند مدبروں نے صرف فرانس میں بادشاہی نہیں قائم کر دی بلکہ ان کے خیالات کی جگہ جو انقلاب نے رائج کر دیے تھے پرانا شاہ پرستی اور حکومت پرستی کا فلسفہ جبراً تسلیم کرانا چاہا تو آزادی اور قومی فرماں روائی کے بہت سے حامی پیدا ہو گئے اور سیاسی اصلاح کی ایک عام تحریک شروع ہو گئی جو زیادہ سنجیدہ اور محتاط لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔

رفتارِ عالم

برطانیہ کیساتھ مسولینی کا سمجھوتہ | شروع جنوری میں برطانیہ اور اٹلی کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا اُس کی بنا پر دونوں قوموں نے طے کیا کہ بحرِ روم کے علاقہ میں معاملات سیاسی کو جوں کا توں رکھا جائے ۔ اس کا مطلب بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسولینی اسپین کے باغیوں کی امداد بند کردے گا ۔ لیکن اٹلی نے اس سمجھوتے کی تاویل اس سے بالکل مختلف کی ہے ۔ اطالیہ کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ حکومت برطانیہ اسپین میں ردی تر نہ بڑھنے دیگی ۔ معلوم نہیں حقیقت کیا ہے ۔ لیکن قرائن سے ، طالیہ کی تاویل صحیح ثابت ہورہی ہے اس لئے کہ برطانوی تاویل اگر صحیح سمجھ لیجائے تو اطالیہ پر لازم ہے کہ اسپین کے وہ علاقے جو اسی وقت اس کی فوج کے قبضے میں ہیں خالی کردئے جائیں ۔ لیکن اب تک ایسے کوئی آثار نظر نہیں آتے ۔ جزائر بیارک میں اطالوی فوج بدستور موجود ہے ۔ غریب ہسپانیہ کو تو اس سمجھوتے سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے ۔ اگر کچھ حاصل ہوا ہے تو انگریزوں کو جنھیں حبش اور اطالیہ کی جنگ کے زمانہ میں اپنا تمام بحری بیڑہ مجبوراً بحرِ روم میں اکٹھا کرنا پڑا تھا اور اب اس سمجھوتے کے بعد وہ پھر مسولینی کی طرف سے مطمئن ہوکر اپنے بیڑے کی از سرِ نو تقسیم کر رہے ہیں ۔

اسپین میں جرمنی اثر | موجودہ صورت حال کا دوسرا پہلو بھی نظر انداز کرنے کے لائق نہیں باغیوں کی امداد کے لئے جرمنی سے سامان جنگ اور رضاکاروں کی آمد برابر جاری ہے کیا اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ برطانیہ کے ساتھ اٹلی کا یہ معاہدہ جرمنی کے لئے مفید ثابت ہوگا ——— اٹلی کو حبش کے مفتوح علاقے میں ابھی بہت کچھ کرنا ہے اُسے پوری توجہ اور ایک بڑے سرمایہ کی ضرورت ہے اسی لئے خیال ہے کہ اٹلی کوئی عملی امداد باغیوں کو نہ دے گا بلکہ جرمنی کا وہ خواب پورا ہوگا جو فرانس کے لیے خطرناک ہے ۔ جرمن اسپین کو فتح کرنا تو نہیں چاہتا البتہ یہ خواہش ضرور ہے کہ اسپین میں ایسی حکومت کا قیام

رہے جو ضرورت کے وقت جرمنی کے کام آتے۔ جرمنی کی خواہش ہے کہ فرانس سے جنگ کی صورت میں اسپین کی افواج فرانس کے جنوب و مغرب (پیرے نیز) سے دھاوا کریں اور شمال و مشرق میں جرمنی کے خلاف فرانس کی مدافعت کو کمزور کر دیں اس کے علاوہ اسپین کے بندگاہ۔ اسپینی مراکش اور جزائر بلیارک سے بھی پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اسپین کے بندرگاہوں پر اس وقت بھی جرمنی کا اثر موجود ہے۔ بغاوت سے پہلے تجارت کا مال اسپین کے جہاز ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتے تھے اب اس بہانے کی آڑ میں اسپین کے جہازوں کو دشمن کا خطرہ ہے یہ کام جرمن جہازوں کو مل گیا ہے اور نہ صرف رسل و رسائل کا کام جرمن کمپنیوں کو مل رہا ہے بلکہ درآمد و برآمد کا کام بھی وہی انجام دے رہی ہیں۔ ہمسا ایک جرمن کمپنی ہے جو اسپین میں بغاوت سے پہلے Valencia اور Sevilla کے درمیان حرف کے فرائض انجام دیتی تھی اب اس کا کام اتنا بڑھ گیا ہے کہ یورپ کے کسی دوسرے ملک کی جہاز راں کمپنیوں کو دخل نہیں رہا۔ خریدار کو بس یہ کہہ دینے کی ضرورت کہ فلاں چیز درکار ہے۔ ہمسا جرمن بندرگاہوں سے بلا توقف مال لاکر حاضر کر دیگی۔ فوجی قوت اُس کی پشت پر ہے۔ اُسے یہ بھی دریافت کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ دام نقد ملیں گے یا مال کے عوض مال دیا جائے گا۔



جرمنی کا معاشی اثر اسپین میں جس تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے اس کی ایک اور مثال سنئے۔
گذشتہ ایام میں کوئی سوا لاکھ لوہے کے پیپے زیتون کے تیل کے لئے جرمن کارخانوں کو مہیا کرنے کا آرڈر ملا تھا جس میں نصف کے قریب وہاں پہنچائے بھی جا چکے ہیں۔ پہلے یہ پیپے ہالینڈ یا فرانس سے آتے تھے اور نسبتاً کم قیمت میں مل جاتے تھے اب جرمنی سے لئے گئے اور زیادہ دام دے کر لئے گئے۔
اسی طرح کاغذ کے کاروبار کا حال ہے۔ یہ بھی اسپین کو سویڈن یا فن لینڈ سے براہ راست نہیں پہنچتا بلکہ ہمبرگ کے ذریعہ ملتا ہے اور ظاہر ہے کہ قیمت میں کسی قدر اضافے کے ساتھ ہی ملتا ہوگا۔
دوسری جانب وہ چیزیں جن کی جرمنی کو ضرورت ہے اور اسپین سے مل سکتی ہیں آسانی سے جرمنی کو مہیا ہو رہی ہیں۔ اون اور کارک بہت بڑی مقدار میں جرمن ایجنٹ خرید رہے ہیں اور مراکش میں اسپین کی کانوں سے لوہا اس سے بہت زیادہ مقدار میں نکالا جا رہا ہے جو پہلے نکالا جاتا تھا۔ کوئی تیس ہزار ٹن زیتون کا تیل بھی اسپین سے خریدا گیا ہے جس میں جرمنی کو بہت نفع کی توقع ہے۔ یہ سب کاروبار اسپین کو جرمنی کا پابند کر رہا ہے اور ہٹلر بھی مجلس اقوام کو مجہول محض سمجھ کر کھلم کھلا باغیوں کی امداد کر رہا ہے تاکہ فتح کی صورت میں وہ اپنی اس رفاقت کی پوری قیمت وصول کر سکے۔

۱۹۳۷ء کا بین الاقوامی زاویہ نگاہ ۱۹۳۶ء کے بارہ میں نجومیوں نے طرح طرح کی تباہیوں اور ہولناکیوں کی پیشین گوئیاں کی تھیں لیکن غنیمت ہے کہ وہ سال ختم ہو گیا اب سوال یہ ہے کہ آیا ۱۹۳۷ء میں امن و امان کا دور دورہ ہوگا یا بے چینی اضطراب اور بدامنی پھیلے گی۔ اس میں شک نہیں کہ بین الاقوامی سیاست کی متعدد گتھیاں ایسی ہیں جن کا سلجھنا باقی ہے۔ مثلاً ہسپانیہ کا مسئلہ۔ چین و جاپان کی کشمکش۔ معاہدہ لوکارنو پر دستخط کرنے والی حکومتوں کا سوال۔ تجارتی توازن کا برقرار رکھنا۔ عام اقتصادی حالت کی درستگی وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو بڑے خطرناک ہیں۔ تاہم جہاں تک عسکری تیاریوں کا تعلق ہے مختلف حکومتیں اپنے اپنے تناسب کے اعتبار سے رفتہ رفتہ باہم توازن قائم رکھنے کی فکر میں ہیں اور معاشی حالت کی اصلاح میں کوشاں ہیں۔
لیکن کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ سال نو امن و امان کا پیام لایا ہے؟ ممکن تو یہ بھی تھا لیکن

جبتک زیادہ اہم حکومتیں باہم وگر رعایات دینے کے لئے تیار نہ ہوں کامل امن وسکون کی فضا پیدا نہیں ہوسکتی ——— اور ان بڑی سلطنتوں میں سے امن کا انحصار بالخصوص جرمن پر ہے۔

کسی سلطنت کی بیرونی سرگرمیوں کی حد کلی یا جزوی طور پر مندرجہ ذیل تین امور پر مبنی ہے:۔

(۱) اس کی فوجی تیاریاں مکمل ہیں ؟

(۲) آیا اندرونی خلفشار اسے اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کے علاج کے لئے بیرونی ممالک کی طرف رُخ کرے۔

(۳) آیا اہم بین الاقوامی مسائل اسی طور پر سامنے آتے ہیں کہ اُن کا فوری فیصلہ ضروری ہو ؟

اگر حق بات پوچھئے تو بڑی سلطنتوں میں صرف جرمنی ہی ایک ایسی طاقت ہے جہاں ان تینوں صورتوں کو بڑے غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جرمنی کے بحری بیڑے کو اگر مستثنیٰ کر دیا جائے ——— کیونکہ وہ برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ معاہدہ کے مطابق معین حد سے آگے نہیں بڑھا ہے ——— تو اس کی فوجی تیاریاں اس حد تک پہنچ چکی ہیں جو کسی دوسرے ملک کو میسر نہیں۔ اس کی بری فوج۔ فضائی بیڑہ۔ کیمیاوی ساز و سامان آلات جنگ ذرائع نقل وحمل غرض کہ جملہ تیاریاں زمانہ جنگ کی ضروریات کے عین مطابق ہیں۔ ان جنگی تیاریوں میں جرمن قوم کو بہت زیادہ اخراجات برداشت کرنا پڑے یہاں تک کہ باشندوں کے لئے ضروریات معیشت خریدنا مشکل ہوگیا۔ جرمنی کی ان آئے دن کی مشکلات نے اُسے دوسرے ممالک کی طرف حریصانہ نگاہ ڈالنے پر مجبور کیا۔ ہسپانیہ میں عدم مداخلت کا مسئلہ۔ چین اور جاپان کی چپقلش۔ معاہدہ لوکارنو۔ عالمگیر معاشی استحکام۔ یہ چاروں اہم مسائل بیک وقت جرمنی کے سامنے آگئے ہیں جس سے وہ شدت کے ساتھ یہ محسوس کر رہا ہے کہ ان کو حل کرنے کے لئے کوئی نہ کوئی فاعلی اقدام لازم ہے۔ اس وقت کسی دوسری سلطنت کو اس ضرورت کا سامنا نہیں۔

ترازو جرمنی کے ہاتھ میں ہے اور ہٹلر جس جانب چاہے اُسے جھکا سکتا ہے۔

چین کی بغاوت | چانگ ہو لیانگ اور اس کے ہمراہیوں نے چین کی مرکزی حکومت کے خلاف

علم بغاوت بلند کر کے نہ صرف چینیوں کے اتحاد کو تباہ کر دیا بلکہ قومی طاقت کو بھی کمزور کیا اور ہر قسم کی ترقی کو رک دیا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ بعض نوجوان اس باغی جنرل کی تائید و حمایت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز ان نوجوانوں کی نادانی اور بے خبری کی دلیل ہے۔ بہرکیف ہمیں اس طبقے سے سروست کوئی سروکار نہیں جو اپنے ذاتی اغراض کی خاطر بد امنی کی فضا پیدا کرتے ہیں۔ افسوس ان نوجوانوں کی حالت پہ ہوتا ہے جو یہ خیال رکھتے ہیں کہ مرکزی حکومت اس قدر کمزور ہے کہ دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتی اس لئے اس کی جگہ کوئی مضبوط اور طاقت ور حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے نوجوانوں کے ارادے نیک ہیں اور ان کے دلوں میں حُبِ وطن کے جذبات بھی موجزن ہیں لیکن وہ اپنے جوش و خروش اور ناپختگی کی بنا پر حقائق کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کیا انھیں معلوم نہیں کہ مرکزی حکومت گذشتہ چار پانچ برس سے جنگ سے پہلو تہی کر رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اندرونی ملکی اتحاد کے لئے کوشاں ہے۔ اس کی یہ آرزو ہے کہ آیندہ اگر ہم کو دشمن کے مقابلہ کے لئے میدان جنگ میں جانا پڑے تو ہم سب متحدہ طاقت اور مکمل نظام کے ماتحت اقدام کریں۔ ممکن ہے جلد باز اور جوشیلے نوجوان اس کا احساس نہ رکھتے ہوں۔ لیکن جاپان نے اسے خوب سمجھ لیا ہے۔ اس کے ثبوت کے لئے "ٹائمس" کا ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو جس میں صاف صاف اعلان ہے کہ " چانگ کیشک اور اس کی جماعت ایک طرف اور جاپان کی شہنشاہیت دوسری طرف۔ تو کیا جاپان کی شہنشاہیت فریق ثانی کے سامنے جھک جائے گی یا آپ پورے طور پر کچل کر رکھ دے گی ؟"

نوجوانوں کو ان الفاظ پر غور کرنا چاہیئے۔ جاپان نے اس حقیقت کو محسوس کر لیا ہے کہ چانگ کیشک اور اس کی جماعت ایک زبردست اور طاقت ور حکومت ہے اور اس لئے جاپان نے اپنی توجہات اس کی تباہی پر مرکوز کر رکھی ہیں۔ کوئی ایسی حرکت جو چانگ کیشک کی حکومت کے لئے ضرر رساں ثابت ہو چین کی متحدہ طاقت کے لئے تباہ کن اور جاپان کے جارحانہ اقدام میں مدد معاون ہوگی۔

چانگ کیشک کی فوجیں جنگ کے لئے سویان کی طرف بڑھ چکی تھیں اور متحدہ مرکزی حکومت کی طرف سے دشمن کے مقابلہ میں یہ سب سے پہلا اقدام تھا جس کے تین مقاصد تھے۔ اول یہ کہ دشمن کو شمالی اور



مشرقی سویان سے نکال باہر کیا جائے۔ دوم یہ کہ شمالی اور مشرقی چاہار کا علاقہ واپس لیا جائے۔ سوم مشرقی ہوپیاتی پر قبضہ جمایا جائے۔ لیکن عین اُس دن جبکہ نائب وزیر جنگ چنگ کو فوجوں کی کمان کا حکم مل چکا تھا اور ابھی پہلا مقصد بھی حاصل نہ ہونے پایا تھا کہ یکایک چانگ ہولیانگ اور اس کی جماعت نے غداری کی اور چانگ کیشک کو گرفتار کر لیا ——— وہ چانگ کیشک جس کی ذات حکومت اور تمام اہل چین کی حفاظت کی ضامن ہے۔ اس بغاوت کے متعلق یہ کہنا کہ یہ دشمن کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی غرض سے کی گئی تھی عقل و خرد کی توہین ہے ؏

(اقتباسات)

تفہیمات الالٰہیہ

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کتاب جو عربی و فارسی میں ملی جلی ہے۔ مجلس علمی ڈابھیل ضلع سورت نے دو جلدوں میں مع فہرست کے شائع کی ہے اور میرے پاس اس غرض سے بھیجی ہے کہ اس پر تبصرہ لکھوں اس لئے مجھے اس حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔

یہ کتاب آج سے ۲۵ ، ۲۶ سال پہلے میں نے مطالعہ کی تھی اس وقت اس کی طرف سے میری روح میں سخت بغاوت پیدا ہوئی تھی اور جس طرح شیخ اکبر علامہ محی الدین ابن عربی[ل] کی فتوحات اور فصوص کے مطالعہ کے بعد ان کو بند کر کے میں نے قطعاً اُن سے صرف نظر کر لیا تھا۔ وہی معاملہ اس کے ساتھ بھی کیا، مگر باوجود اس کے ان دونوں بزرگوں کی عقیدت میرے دل میں قائم رہی اور میں اُن کی علمیت اور ولایت سے منحرف نہیں ہوا۔ تاآنکہ ایک مدت کے بعد مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ یہ حضرات اہل حال ہیں۔ اس کے بعد میری اجنبیت جاتی رہی اور میں نے دوبارہ اُن کی تصانیف کو جس قدر پڑھا اسی قدر محظوظ ہوا۔

لیکن تاہم میری یہ رائے حتمی تھی اور اب بھی ہے کہ یہ کتابیں عوام کے لئے جن میں وہ علماء فقہا بھی شامل ہیں جو اہل ظاہر ہیں اور لفظوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ہرگز مفید نہیں بلکہ تشویش خاطر کا باعث ہیں۔ اس لئے ان کی اشاعت اسی حلقے میں محدود رہنی چاہیئے جو ان کو سمجھتے اور ان سے بہرہ ور ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

[ل] اس کتاب میں جا بجا شیخ اکبر کو ابن العربی الف لام کے ساتھ لکھا گیا ہے اور تصحیح نہیں کی گئی۔ حالانکہ اہل علم میں یہ متعین ہے کہ ابن العربی شیخ ابوبکر ہیں جو فقہاء شافعیہ میں سے ہیں اور جن کی کتاب احکام القرآن علماء میں بہت مقبول ہے اور ابن عربی بلا الف لام کے شیخ اکبر علامہ محی الدین ہیں۔

شاہ صاحب پر جو فیوض اور عطیات الٰہی ہوئے منجملہ اُن کے وہ شرح صدر بھی ہے جس کی بدولت اسرار و رموز کے بیان پر اُن کو ایسی قدرت بخشی گئی جو آج تک کسی ولی کو نصیب نہیں ہوئی، اس کتاب میں انھوں نے سینکڑوں حقائق شرعیہ صوفیانہ، متکلمانہ، اور فلسفیانہ زبان میں بیان کئے ہیں جن کو سمجھنے کے لئے اِن علوم کے ساتھ قرآنی بصیرت کی بھی ضرورت ہے جو لوگ صرف تفسیروں کی عینک سے قرآن کو دیکھنے کے عادی ہیں وہ ان حقائق تک نہیں پہنچیں گے، اور یا تو اِن سے بیزاری کا اظہار کردیں گے، یا اضطراب کے گرداب میں پھنس کر حیرت میں پڑجائیں گے۔ کیونکہ شاہ صاحب کے بیانات معنوی مشاہدات پر مبنی ہیں اور دلائل و براہین سے جن سے کہ اہل ظاہر قانع ہوتے ہیں جیستہ ماری۔ دو ایک باتیں مثال کے طور پر پیش کرتا ہوں،

فنا انسانی معاد کے متعلق اہل ظاہر یہ سمجھتے ہیں کہ ہر فرد مرنے کے بعد قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔ اور اپنے نامہ اعمال کے مطابق جزا یا سزا پائے گا اور ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہے گا یا دوزخ میں، اس مدت کا کبھی خاتمہ نہ ہوگا۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "رحمٰن" کا اسم رحموت کی جہت سے جملہ فعلیات پر حائز ہے اور ازل خالص سے اس کی امتیازی خصوصیت صرف اسی فعلیت سے قائم ہے۔ ورنہ حقیقت ایک ہی ہے جس کا اس آیت میں ذکر کیا گیا ہے۔

فادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن ایاماً تدعوا فلہ الاسماءُ الحسنیٰ

اسی "الرحمٰن" کی تجلیات کے فیضان سے "انسان اکبر" کا ظہور ہوا، یہ انسان اکبر انسان اصغر کے ساتھ حقیقتاً متحد ہے۔ ان میں باہم کلی اور جزئی کی تفریق کرنا منطقی عقل کا قصور نظر ہے۔ کیوں کہ ان دونوں کی ساخت ایک ہی ہے اور ایک ہی کلمہ سے ہے۔ اسی انسان اکبر پر جس میں اس کے اجزا (افراد) مضمحل اور محو ہوتے رہتے ہیں فساد طاری ہوگا[ف] اور بالآخر

[ف] غالباً آیت کریمہ وما خلقکم ولا بعثکم الا کنفس واحدۃ سے اس امر کا سراغ لگایا ہے۔

نہ صرف وہ بلکہ جملہ حیوانات و نباتات بھی فنا ہو جائیں گے۔ یہاں تک کہ نہ کوئی عنصر باقی رہے گا نہ کوئی فلک، اور عدم کی آندھیوں کے جھکڑ، عرش اور پانی پر چلنے لگیں گے۔ جس سے وجود کی دنیا سرتاسر ویران ہو جائے گی۔ اس کے بعد پھر الرحمٰن کی تجلیات کا آغاز ہوگا جن کی وجہ سے عالم ہستی کا نیا دور شروع ہو جائے گا۔

اس قسم کے کتنے دور گذر چکے ہیں؟ اُن کا کوئی حساب انسان کے تو کیا خود آسمانوں کے بھی حاشیہ خیال میں نہیں ہے بلکہ گذشتہ دور کی یاد بھی نئے دور میں باقی نہیں رکھی جاتی۔

عرش | اہل ظاہر عرش کو اس طرح سمجھتے ہیں کہ اس کی نوعیت ایک تخت کی ہے جس پر اللہ مستوی ہے اور وہ وہاں سے عالم پر اپنے احکام جاری کرتا ہے۔ قرآن میں یہ بھی ہے کہ "کان عرشہ علی الماء" جس کی تشریح حدیث میں اس طرح کی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کا فاصلہ ۷۱، ۷۲، یا ۷۳، سال کی راہ ہے اور آسمان سات ہیں، جن میں سے ہر ایک سے دوسرے کا فاصلہ اسی قدر ہے، ساتویں آسمان کے اوپر ایک سمندر ہے جس کی گہرائی بھی اتنی ہی ہے۔ اس کے اوپر سات پہاڑی بکرے ہیں جن کے کھروں سے گھٹنوں تک کے فاصلے بھی اسی قدر ہیں، ان بکروں کی پشت پر عرش ہے جس کی موٹائی اسی قدر ہے۔ (ترمذی کتاب التفسیر باب سورۃ الحاقہ)

یعنی سات آسمان ہیں جن کے اوپر فلک محدد ہے جو پانی ہے۔ اس کے اوپر سات حاملین عرش جو پہاڑی بکروں سے تعبیر کئے گئے ہیں عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں۔

اور شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ وحدت کبریٰ اور وجود اقصیٰ کی پیہم تجلیات کا مآل کار ایک ایسی تجلی پر ہوا جو زبان شرع میں "الرحمٰن" کے نام سے موسوم ہوئی اس تجلی کے فیضان سے ایک ناسوتی موجود کا ظہور ہوا جو دو چیزوں کا مجموعہ ہے۔ ایک عرش جس پر الرحمٰن مستوی ہے اور دوسرا پانی[1]

---

[1] غالباً مراد ہے آیۃ کریمہ "وجعلنا من الماء کل شیٴ حی" میں نے اپنی کتاب تعلیمات قرآن میں وہ آیتیں بھی نقل کی ہیں جنمیں عرش کے پانی پر اور پانی کے مبداء حیات ہونے پر غایت تخلیق کا انحصار ظاہر کیا گیا ہے۔

جو عالم امکان کا مبدار ہے۔ جملہ کائنات کی صورتیں عرش میں ہیں اور جو اس سے خارج ہیں وہ عدم محض ہے۔ اس طرح پر عرش مع اپنے مشمولات کے بمنزلہ شخص واحد کے ہے، جس کے آنکھ بھی ہے اور وہ "الرحمٰن" ہے۔ اسی کو اصطلاح فلسفہ میں عقل فعّال کہتے ہیں۔ اور جس کے نفس ناطقہ بھی ہے جو عین اس کی ذات ہے اور جس کی جان بھی ہے جو اس کے تمام اعضاء یعنی افلاک و عناصر میں ساری ہے اور جس میں قلبی قویٰ بھی ہیں جن سے امور جزئیہ کا صدور ہوتا ہے۔

شاہ صاحب کے بیان کے مطابق عرش و مار دونوں میں چار چیزیں مختلط ہیں، یہاں وہاں[۵]، آج اور کل، کون و فساد اور بالفعل و بالقوہ، ناسوتی عقل نے ان کے لئے مکان و زمان وهیو سے ان و صورت کے نام تراشے ہیں۔ ان مثالوں سے میرا مدعا یہ ہے کہ شاہ صاحب کا بیان بلند اور لطیف سہی لیکن جمہور مسلمانوں کے لئے کس قدر بعید الفہم ہے۔

ظہور خودی | راہ عرفان میں جس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ عارف کے اوپر خود اس کے نفس کے مراتب کا بھی ظہور ہوتا ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب میں اپنے ان مراتب کو جابجا بیان فرمایا ہے میں ان کو نہایت اختصار کے ساتھ اپنے الفاظ میں لکھتا ہوں۔

(۱) اللہ نے مقام کریم اور مرتبہ عظیم سے مجھ کو سرفراز فرمایا جس پر بزرگوں کو بھی رشک ہوگا۔ لوگو میں تم میں اجنبی ہوں تم مجھ کو نہیں جانتے۔ میرے سر پر تاج ہے اور ہاتھ میں قلم۔ میرا قلب حلیم ہے اور زبان شیریں (صفحہ ۵۷، ج ۲)

(۲) دو گوہر گراں بہا بمن دادہ اند، یکے اتمام دورۂ کمال، دیگر وصایۂ آنکہ مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ ہمہ جوشش او میزد،

نفحۂ از ریاض قدسیہ مرا سخت در بر گرفت ——— ہمہ روئے من می بیند و شیوہ من می نگرند
جہانیاں بمن آیند و ہمتے طلبند ——— ازاں سبب کہ منم این زماں مطاع جہاں

---

[۵] نہ صرف یہی بلکہ فلسفیوں کے مقولات عشرہ بھی اہل حقیقت کے نزدیک سراسر موہومات ہیں۔

کنوں وہی رسوم خسروانہ دار علوم — بدست ماست کنوں خیرو انتفع جہاں[1]

(ص ۱۴ ج ۲)

۱. مجھ سے کہا گیا کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو جنت میں بلا حساب داخل کر دئے جائیں گے[2]

(ص ۹۱ ج ۲)

(۴) اللہ سبحانہ نے مجھے مجددیت کا خلعت پہنایا۔ کیوں کہ میرے اوپر حکمت کا دور ختم ہو گیا

ص ۱۳۱، ج ۲

(۵) میں اللہ کی کس زبان سے حمد کروں اور کن لفظوں میں اس کی صفت بیان کروں جس نے مجھ کو سارے کمالات عطا کر دئے۔ (ص ۱۴۳، ج ۲)

(۶) مجھے صحابہ کرام، اولیاء عظام اور علماء اسلام کے مقامات ملے، پھر وصایت، ارشاد اور مجددیت کے مناصب عطا ہوئے۔ (ص ۱۴۴، ج ۲)

(۷) چہ گوئی درحق کسیکہ منسلخ است بسوئے وحدت کبریٰ ہرچہ ہست دلیست، وہرچہ ہست تفصیل ولیست (ص ۱۹۳، ج ۲)

(۸) مجھے معلوم ہے کہ قبر میں کون سی تجلی ہوگی اور کون سی حساب کے دن، اور کون سی جنت میں یہ جملہ تجلیات میرے سامنے حاضر بلکہ میرے قلب میں موجود ہیں۔ میں افلاک، معادن، اشجار، بہائم، ملائکہ، جن، لوح، قلم، اسرافیل بلکہ ہر اس شئ کے کمال کا کامل احاطہ کئے ہوں جو وجود کے تحت میں ہے۔ (ص ۷۰، ج ۲)

(۹) اس نے مجھے اہل طریقت کا امام بنا دیا اور حقیقت قرب تک پہنچنے کے سارے رستے بجز میری پیروی کے بند کر دئے، اب اہل مغرب و مشرق سب میری رعایا ہیں اور میں ان کا امام۔ خواہ جانیں یا نہ جانیں۔ (ص ۱۲۵، ج ۲)

---

[1] غالباً شاعری کا کمال شاہ صاحب کو نہیں عطا ہوا۔ کیونکہ کمالات بزرگانہ میں اس کا شمار نہیں ہے

[2] اس کا مآخذ یہ آیت ہو سکتی ہے۔ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا الآیۃ

(۱۰) امرار اور ملوک میری زیارت کو آئیں گے، علما ر صلحا ر مجھ سے استفادہ کریں گے۔ میرے اوپر ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی جائیں گی۔ میرے اصحاب اور ذریت میں برکت ہوگی۔ میں اگر نہ ہوتا تو دنیا بھی نہ ہوتی۔ (ص ۱۰۰ ج ۱)

(۱۱) امید آنست کہ اگر خدا خواستہ بر دست من، زمانہ تازہ شود۔ (ص ۸، ج ۱)

(۱۲) میری پیروی دو جماعتیں کریں گی۔ ایک میں سابقین کی استعداد ہوگی۔ ایک میں اصحاب یمین کی (ص ۸، ج ۲)

یہ اور اسی قسم کے بہت سے مراتب تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں موجود ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کا کوئی صحیح محمل آیات یا احادیث سے نکل نہ سکے یا اہل ظاہر کو اس سے وحشت ہو۔

شاہ صاحب کے مجددیت کے دعوے پر اعتراض نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ ان کے ذریعے سے ہندوستان کے مسلمانوں میں قرآن اور بالخصوص حدیث کا علم پھیلا۔ اور جیسا کہ انھوں نے فرمایا ہے دو گروہ خصوصیت کے ساتھ اس کی نشر و اشاعت میں مصروف ہو گئے یعنی اہل حدیث و علمار دیوبند اہل حدیث حنفار کی جماعت ہے جنھوں نے تقلید کا قلادہ توڑ کر پھینک دیا اور کتاب و سنت کی ترویج اور شرک و بدعت کے مٹانے میں بلا خوف لومۃ لائم علماً و عملاً ایسی کوششیں کیں کہ سارے ہندوستان میں اُن کی روشنی پھیلی اور توحید کا منارہ بلند ہوا۔ اگرچہ اب لامرکزیت کی وجہ سے ان میں اضمحلال پیدا ہو گیا ہے اور وہ ولولہ اور جوش جو پہلے تھا باقی نہیں رہا۔ پھر بھی ان کی دینی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

دیوبندی جماعت۔ مرتفقین کا گروہ ہے جو عوام کے ساتھ ملا جلا رہا۔ اس نے تقلید کو بھی قائم رکھا اور فروعی امور میں امتیازی خصوصیت اختیار کر کے اپنا فرقہ الگ نہیں بنایا مگر اصولی اصلاح یعنی محو شرک و بدعت اور اشاعت کتاب و سنت میں پوری جد و جہد سے کام لیا۔ یہاں تک کہ اپنی اسلامی خدمات کی بدولت ہندوستان کے جمہور مسلمانوں پر ان کا اثر غالب آگیا اور اب تک

مدرسہ دیوبند کی وجہ سے چونکہ ان میں ایک مرکزیت باقی ہے اس لئے اُن کی کوششوں کا سلسلہ جاری ہے ۔ یہی جماعت اس وقت اسلامی ہند میں مذہب کی علمبردار ہے ۔

یہ دونوں گروہ شاہ صاحب کو اپنا مقتدا اور پیشوا تسلیم کرتے ہیں ۔ کیا یہ بات اُن کی مجددیت کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے ؟ ۔ ہاں اپنی ذریت کے متعلق انھوں نے برکت کی جو خبر دی تھی وہ صرف تھوڑے زمانے تک صحیح ثابت ہوئی ۔ پھر ان کی اولاد منقرض ہو گئی ۔ مجھے یاد ہے کہ سنہ ۱۹۱ء میں مولانا عبد الحق صاحب محدث دہلوی کے خاندان میں ایک شادی تھی جس کی شرکت کے لئے میں دہلی آیا تھا ۔ اس وقت ایک شخص سید احمد نامی جو اپنے آپ کو ولی اللہی کہتے تھے مجھ سے ملے تھے ، ان کا قد چھوٹا تھا اور داڑھی بڑی وہ اسی کتاب یعنی تفہیمات کو طبع کرانے کی فکر میں تھے ۔ اس کے ۱۶ صفحے چھپے ہوئے مجھے دکھلائے بھی تھے ۔ میں نے اس کی بابت ان کو کچھ مشورے بھی دئے مگر اس کے تھوڑے ہی زمانے کے بعد وہ انتقال کر گئے ۔ اب جہاں تک مجھے علم ہے شاہ صاحب کی ذریت میں کوئی باقی نہیں ہے ۔

لطیفہ | حافظ حمید الدین فراہی مرحوم نے جو قرآن سے اکثر علمی لطائف نکالا کرتے تھے ۔ ایک بار مجھ سے کہا کہ اس آخری دور میں اللہ نے دو شخصوں کو خدمت قرآن کے لئے چنا جن کی خبر اس آیت میں دی ہے ۔ وھو الذی ینزل الغیث من بعد ما قنطوا وینشر رحمتہ وھو الولی الحمید یعنی شاہ ولی اللہ اور حمید الدین ۔ ایسا ہی ایک اشارہ اس کتاب میں بھی مجھے ملا ۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں

صوفی لہ وزسمیت از اسمار حسنٰے کما قال قولہ الحق " وہو الذی ینزل الغیث الایۃ "
ہیچ میدانی کہ ایں کجا صورت خواہد بست ۔ جائیکہ کس بگوید کہ یہ دلی فلانست و مادرش فلانہ ۔ (ص ۱۸ ج ۲)

مجددیت | یہاں یہ ذکر بے موقع نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں دو منصب ، مجددیت اور مہدویت کے احادیث کی رو سے مسلم چلے آتے ہیں ۔ پہلا مجدد جو دوسری صدی ہجری کے سرے پر ہوا لوگوں نے خلیفہ عمر بن عبد العزیز کو قرار دے دیا ۔ لیکن اس کے بعد سے یہ رتبہ علمار و صلحا کے حصے میں آگیا ۔ ہر ہر صدی

میں مختلف جماعتیں مختلف اسلامی ممالک میں اپنے اپنے معتمد علیہ اکابر کو مجدد گردانتی رہیں۔ جس کا سلسلہ اب تک برابر چلا جاتا ہے۔ چونکہ مجددیت کا مدار عمل سے زیادہ ذاتی وجاہت پر ہے اس لئے اس کے واسطے میدان بہت وسیع ہے۔ مہدی کا منصب اہل سیف کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ کیوں کہ اس کے فرائض علماء وصلحا کے حیطۂ قدرت سے باہر تھے، اور روایات کی بنیاد پر چونکہ یہ غیر اہل بیت سے نہیں ہو سکتا تھا اس لئے انھیں کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔ دوسرے خادمانِ ملت: حامیانِ دین جنھوں نے جہاد و اعلاء کلمتہ الحق میں اپنا خون اور پسینہ ایک کہ جیسے سلطان محمود غزنوی، سلطان نور الدین زنگی شہید، سلطان صلاح الدین اور سلطان محمد فاتح، وغیرہ اُن کے واسطے نہ مجددیت رہی نہ مہدویت۔

اہل عرفان | قرآن میں وارثین کتاب کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں: "سابق، مقتصد، اور ظالم لنفسہ" ان کی تفصیل مختلف سورتوں میں ہے۔ جن کی تشریح کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں اہل عرفان کا مقام معلوم کرنے کے لئے تاریخی ادوار کے لحاظ سے انھیں ناموں کے ساتھ مسلمانوں کے طبقات کو مختصراً بیان کرتا ہوں

(۱) سابق:- یہ وہ طبقہ ہے جس کو ایسا امام متفق علیہ[1] نصیب ہوا۔ جو خالص اللہ کی مرضی اور اس کے احکام کے مطابق چلنے والا تھا۔ مرکزیت کی بدولت اُن کے اجتماعی مقاصد متعین تھے۔ اور ان کے سامنے سوائے اللہ اور اس کی رضا کے کچھ نہ تھا۔ یہی مقربین بارگاہ ہیں۔ "السابقون السابقون اولئک المقربون"۔ ان کو عرفان کی جستجو کی ضرورت نہ تھی۔ کیوں کہ صداقت مجسم ان کے سامنے تھی اور عمل بالقرآن نے خود ان کو سراسر عرفان بنا دیا تھا۔ افسوس ہے کہ ان کا زمانہ نبوت کے بعد صرف ۳۰ سال تک رہا۔

(۲) مقتصد:- اپنے امرار کے تغلب سے یہ طبقہ امام متفق علیہ سے محروم ہو گیا اور براہِ راست

---

[1] امام منصوص نہیں۔ کیوں کہ قرآن سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ اگر امام منصوص کوئی ہے تو صرف رسول ہے جو امام متفق علیہ میں داخل ہے۔

احکام الٰہی کی ماتحتی سے اُن کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ اُن کے مرکزی مقاصد میں استبدادی اغراض شامل ہو گئے تھے۔ اس لئے اُن میں سے بہت سے لوگ جزئی جماعتوں میں یا انفرادی طور پر اپنی اپنی نجات کی راہیں نکالتے تھے انھیں میں سے کچھ لوگوں نے ترک دنیا اور زہد کا طریقہ اختیار کیا یہی لوگ اہل عرفان یا اہل تصوف کہے گئے۔

۳۔ ظالم لنفسہ ا۔ مقتصدین نے جب ایک مدت تک کی مہلت پا کر بھی اپنی حالت کی اصلاح کی کوشش نہیں کی اور اپنے امراء کی غلامی پر قانع رہ کر حکومت الٰہی کو بھلا بیٹھے تو اس کی سزا میں وہ اور اُن کے اُمراء سب کے سب کفر کی محکومیت کے جہنم میں ڈال دئے گئے۔ اُن کے لئے نہ صرف اجتماعی بلکہ بہت سے انفرادی راستے بھی نجات کے بند ہو گئے۔ لیکن پھر بھی مختلف راہیں مقبولیت کی کھلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے بھی کچھ لوگ تصفیہ باطن کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور سلوک کے مقامات طے کر کے نجات کی اُمید رکھتے ہیں۔

اگرچہ اہل نظر میں ابھی یہی مسئلہ زیر بحث ہے کہ یہ نجات اور مقبولیت کا ذریعہ بھی ہے یا نہیں۔ کیوں کہ باطنی ریاضتوں سے یہی مدارج غیر مسلم کو بھی حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اس بحث سے قطع نظر کر کے نفس طریقت یا تصوف کو دیکھا جائے تو تاریخی حیثیت سے اس امر میں بہت کم شبہ کی گنجائش ہے کہ مسلمانوں میں یہ چیز عہد غلامی کی پیداوار ہے۔

ان اہل عرفان میں بہت سے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ اگر ان کو متفق علیہ امام مل جائے تو وہ بھی سابقین کے رتبہ تک پہنچ جائیں۔ مگر اجتماعی اعمال نجات کی راہیں بند پا کر ان کا سارا رجحان باطنی اصلاح کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس راہ میں آسانیوں سے زیادہ دشواریاں ہیں اور ایسے مقامات آتے ہیں کہ اگر حبل اللہ یعنی قرآن کا دامن دونوں ہاتھوں سے مضبوط نہ پکڑے ہوئے رہیں تو قدم اپنی جگہ سے اکھڑ جاتا ہے۔ اور پھر حیرت میں سرگرداں ہونے لگتے ہیں۔

ان حضرات میں سے بعض ایسے ہوتے ہیں جن پر حال کا غلبہ ہو جاتا ہے اور ان کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں۔ مگر بعض کی نسبت علمی حال پر غالب رہتی ہے۔ وہ ان قلبی واردات کو بیان

کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن کے لئے نہ زبان ہے نہ الفاظ ، اس وجہ سے بالعموم ان کے کلام میں ابہام پایا جاتا ہے۔ علاوہ بریں یہ کلام بھی خالص صحو میں نہیں ہوتا بلکہ فی الجملہ سکر کی کیفیت اس میں شامل رہتی ہے۔ ان بیانات کو زیادہ سے زیادہ وجدانیات اور ذوقیات کہہ سکتے ہیں۔ ورنہ بعض اہل علم نے تو ان کو سراسر شطحیات قرار دیا ہے۔

ان بزرگوں میں سے جنھوں نے ان کیفیات کو لکھا ہے۔ شیخ اکبر اور شاہ صاحب ممتاز ہیں شاہ صاحب کا قدم جادۂ شرع سے کہیں ہٹنے نہیں پایا ہے۔ مگر شیخ اکبر نقطۂ اتصال پر پہنچ کر جہاں حظیرۂ قدس کی تجلیات کا ظہور ہوتا ہے اتحاد کی طرف جھک گئے اور اپنی کتاب فتوحاتِ مکیہ کا پہلا فقرہ یہ لکھا کہ

سبحان الذی خلق الاشیاء وھو عینھا۔

اور پھر زندگی بھر اسی کی تشریح کرتے رہے۔

مجھے امام ابن تیمیہ جیسے شخص پر جو اس قایل ہیں کہ امت اُن کے اوپر فخر کرے تعجب آتا ہے کہ انھوں نے حال کا کوئی لحاظ نہیں رکھا ، اور شیخ اکبر جیسے شخص کو جو قدوۃ الاولیا ہیں طاغوت اکبر کہہ دیا۔ بجز اس کے کیا کہا جائے کہ یہ وہی اہل باطن وظاہر کا مقابلہ تھا ، جو اس سے پہلے شیخ عبدالقادر جیلانی اور امام ابن جوزی میں پیش آچکا تھا۔

باوجود اس کے کہ شاہ صاحب نے غلبہ حال میں بھی ظاہر شرع کا لحاظ رکھا ہے اور اس سے تجاوز نہیں کیا ہے پھر بھی وہ اپنے اس کلام سے خوش نہیں ہیں۔ بلکہ اس سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

یہ بیان میری فطرت کی قوت ممیزہ کے باعث ہے عنقریب اس کو قتل کرکے ایک گہرے کنوئیں میں دفن کردوں گا۔ (ص ۱۵ ج ۲)

آخر میں پھر یہ حقیقت بیان کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس قسم کے وجدانی بیانات اور صوفیانہ تصانیف سے ممکن ہے کہ اہل نظر کچھ لطف یا فائدہ اٹھاسکیں مگر عوام کے لئے ان میں کوئی نفع نہیں ہے بلکہ الٹا نقصان ہے کیونکہ بعض لوگ ان کو دیکھ کر اس قسم کے بلکہ ان سے بھی بڑے بڑے دعوے کر بیٹھتے ہیں اور امت میں افتراق اور تشتت پیدا کرنے کے موجب ہوتے ہیں

ہندوستان کا جدید دستور

ہندوستان کے موجودہ سیاسی مسائل میں آج جدید دستور کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے، ملک کی ہر سیاسی جماعت نے شدت کے ساتھ اس کی مذمت کی ہے اور اس کا نام 'دستور استبداد' رکھا ہے اس لئے کہ اس کے ذریعے ہندوستان کی سیاسی اور معاشی غلامی کی زنجیروں کو اور زیادہ مستقل اور مضبوط بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود سامراج پسند برطانیہ باشندگان ہند کے ہر طبقے کی رائے اور مرضی کے خلاف یہ دستور ہندوستان پر مسلط کرنے کے لئے تلی ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس نے بہرحال اس دستور کا قلع قمع کرنے کی قسم کھالی ہے اس لئے یہ بتلا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس نئے دستور کا مقصد کیا ہے اور اس کا کیا اثر ملک کے عوام الناس پر پڑے گا۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ شدید احتجاج اس کی مخالفت میں پیدا اور مرکوز کیا جائے۔

۱۸۹۸ء میں لارڈ کرزن نے یہ فرمایا تھا کہ "ہندوستان ہماری سلطنت کی اصل جان ہے اگر ہماری سلطنت کے ممالک محروسہ میں سے کوئی ملک ہماری سلطنت سے علیحدہ بھی ہو جائے تو ہماری سلطنت اس کے باوجود قائم رہے گی۔ لیکن اگر ہم نے ہندوستان کو کھو دیا تو پھر ہماری شاہنشاہیت کا آفتاب گویا غروب ہو جائے گا۔"

چنانچہ برطانیہ کے حکمران طبقے ہمیشہ کی طرح آج بھی اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ ان کی شاہنشاہیت کا آفتاب نہ ڈوبنے پائے۔ اور وہ یہ خوب سمجھتے ہیں کہ اگر ہندوستان ان کے ہاتھ سے نکل گیا تو ان کی سلطنت ہی بیٹھ جائے گی۔ ایک طرف واقعات عالم روز بروز سنگین اور نازک ہوتے جاتے ہیں۔ دوسری طرف حکومت کے تسلط کے خلاف باشندگان ملک کی مخالفت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے اور یہ دونوں باتیں ان کو مجبور کر رہی ہیں کہ اپنی قوت کے اس نظام کو جبر یہ

ہندوستان میں ان کی حکومت قائم ہے اور زیادہ مضبوط اور مستحکم بنائیں۔ برطانوی سامراج پسند جماعت کے ایک بہت ہی صاف گو نمائندے لارڈ برنٹفورڈ نے ایک موقع پر بڑے پتہ کی بات کہی تھی کہ "ہم نے تلوار کے زور سے ہندوستان کو فتح کیا ہے اور اسی کے بل بوتے پر اس کو اپنے قبضہ میں رکھیں گے۔ ہم نے اس پر اس لئے قبضہ کیا ہے کہ برطانوی سامان اور خصوصاً لنکاشائر کے مال کی نکاسی کا وہ بہترین ذریعہ ہے۔" چنانچہ اب موجودہ بین الاقوامی سیاست کی کشمکش میں برطانیہ عظمےٰ اس طرف سے اطمینان حاصل کرنا چاہتی ہے کہ عند الضرورت جملہ وسائل کی فراہمی کے لئے آیندہ بھی ہندوستان اس کا ماویٰ اور ملجا بنا رہے۔

جدید دستور میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس ملک کے رجعت پسند اور جاگیر وار طبقوں کی مدد سے مثلاً بڑے بڑے زمیندار، راجے اور مہاراجے جنھیں اس دستور میں خاص اہمیت دی گئی ہے اور جن کے ساتھ عدیم المثال رعایتیں کی گئی ہیں۔ ہندوستان پر سامراجی قبضہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھا جائے۔ وفاق یعنی فیڈریشن میں رائے عامہ کی مخالفت کے لئے دیسی راجاؤں کو اصل آڑ بنایا گیا ہے اور چند صوبجات میں اعلےٰ ایوان کو جس میں بڑے بڑے زمینداروں اور روپے پیسے والوں کی نمائندگی ہے، عام باشندگان کی نمائندہ لیجسلیٹیو اسمبلی کے مساوی اختیارات اس لئے دیئے گئے ہیں تاکہ اس کے ذریعے رائے عامہ کا توڑ کیا جائے اور اس کو شکست دی جائے۔

یہ جدید دستور اس تشدد آمیز طرز عمل کا لازمی نتیجہ ہے جس پر برطانوی سامراج اس وقت تک کاربند ہے۔ اور اسی چیز نے ایک طرف ملک کی معاشی نشو ونما اور ترقی کو روک دیا ہے اور دوسری طرف قوم کو شخصی آزادی سے محروم کر دیا ہے۔ اس تمام عرصے میں محض سامراجی لوٹ مار کی خاطر ہندوستان کی قومی معیشت کا بالکل ہی ستیاناس کر دیا گیا۔ ہندوستان نے برطانوی مال کے لئے ایک وسیع بازار، برطانوی سرمایہ کے لئے

ایک نفع بخش میدان اور برطانوی صنعتوں کے لئے بہت ہی سستی خام پیداوار کا ایک ذریعہ فراہم کر دیا ہے۔ چنانچہ اول دیسی مصنوعات اور دستکاریوں کی بربادی اور اس کے بعد جدید قسم کے صنعتی کاروبار کی ترقی کی راہ کی رکاوٹوں نے ملک کے اندر دیہاتیوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ کر دیا ہے اور کل آبادی کا ۷۳ فی صدی زراعت پیشہ بن گیا ہے۔ یہاں تک کہ آج اس سرزمین میں زراعت پیشہ آبادی کی اتنی کثرت ہو گئی ہے کہ اکثر کاشتکاروں کے کھیت غیر معاشی بن گئے ہیں۔ کسانوں کا خوفناک افلاس اور قرضہ، حقیت اراضی اور مال گذاری کا تشدد آمیز نظام جس نے کاشتکاروں کو بڑے بڑے زمینداروں اور ساہوکاروں کے قبضہ اور گرفت میں ڈال دیا ہے۔ ان سب باتوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں جن میں کروڑوں انسان ہمیشہ ہمیشہ بھوکے اور ننگے رہتے ہیں۔ تقریباً ساڑھے تین کروڑ کسانوں کے پاس اپنی کوئی زمین نہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ تعداد ان کی ہے جو مہاجنوں کے واقعی غلام بن گئے ہیں۔ شہروں اور قصبات کے رہنے والوں کی حالت بھی کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے۔ شہر کے غربا کی حالت بہت زیادہ زار و زبوں ہے۔ اور دنیا میں سب سے کم اجرت پانیوالے ہندستان کے مزدور طبقے کے لوگ ہیں۔ ادنیٰ متوسط طبقے بیکاری کی وجہ سے تباہ حال ہیں اور ان کا معیار زندگی روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ غرض مجموعی حیثیت سے سارے ہندوستانی سامراجی لوٹ ار کے شدید نتائج میں مبتلا ہیں۔ یہاں تک کہ سائمن کمیشن نے بھی یہ لکھا تھا کہ "اگر زیادہ سے زیادہ خوش آئند تخمینہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تب بھی ۱۹۲۹ء میں ہندوستان کی فی کس آمدنی کا اوسط اس وقت کے موجبہ شرح تبادلہ کے حساب سے ۸ پونڈ سے بھی کم نکلتا تھا۔ اس کے مقابلے میں برطانیہ عظمیٰ کے اعداد ۹۵ پونڈ تھے اگر ضروریات اور احتیاجات زندگی کا فرق نکال بھی دیا جائے تب بھی یہ موازنہ چونکا دینے والا ہے" برطانوی سامراج نے باشندگان ہند کو نہ صرف غربت اور افلاس میں ڈال رکھا ہے بلکہ ناخواندہ اور جاہل بھی بنا دیا ہے۔ ۳۵ کروڑ ۳۰ لاکھ میں سے ۳۲ کروڑ انسان نہ پڑھ سکتے

ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔ بیماریوں اور وباؤں کی بھینٹ بھی خوفناک ہے۔ قابل علاج امراض میں کروروں جانیں ہر سال ضائع ہو جاتی ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ اموات زچگان کی اور معصوم بچوں کی ہندوستان ہی میں ہوتی ہیں۔

برطانیہ عظمیٰ نے اپنے سامراجی طرز عمل کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لئے ہندوستان میں ایک بہت زیادہ دفتری قسم کا سیاسی نظام حکومت ہمیشہ سے قائم کر رکھا ہے، جو باشندگان ملک کی رائے اور مرضی کا پابند نہیں ہے۔ گورنر جنرل اور گورنران کو مجالس قانون ساز کے فیصلوں کو رد کر دینے کے غیر محدود اختیارات تفویض کئے گئے ہیں۔ وہ چاہیں تو کسی منظور شدہ قانون کو نامنظور کر سکتے ہیں اور خزانہ عامرہ کو اپنے ملک پر برطانوی تسلط کے مفاد کے لئے استعمال کر سکتے ہیں۔ افلاس زدہ آبادی پر حد سے زیادہ محصولات اور ٹیکس اس لئے عائد کئے گئے ہیں کہ فوجی مصارف کسی طرح پورے ہوں۔ جن محکموں کا تعلق ملک کی ترقی اور تعمیر سے ہے مثلاً حفظان صحت اور تعلیم، اس کے حصہ میں سے کاٹ کر پولیس اور عدالت کا منہ بھرا جاتا ہے۔ جس میں ضرورت سے زیادہ انتظام اور اہتمام کیا گیا ہے۔ چنانچہ جہاں ملک کے کل مداخل کا ۲۵ فی صدی فوج پر صرف کیا جاتا ہے اور تقریباً اسی قدر عدالت اور پولیس پر، وہاں کل ۶ فی صدی تعلیم پر صرف ہوتا ہے اور شاید ۲ فی صدی حفظان صحت پر۔

یہ جدید دستور ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کے مقابلے میں اس لحاظ سے تو یقیناً بدتر ہے کہ سابقہ دستور کی بہت سی باتوں کو جو بین السطور میں تھیں اس نے بالکل صاف اور واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے، بالخصوص جہاں تک کہ وائسرائے اور گورنران کے اختیارات کا تعلق ہے کہ آئندہ ان لوگوں کو مطلق العنانی کے غیر محدود اختیارات حاصل ہوں گے جن کا نام رکھا گیا ہے "مخصوص ذمہ داریاں"۔ منظور شدہ قوانین کو نامنظور کرنے کے اختیارات کے علاوہ انھیں از خود اور بلا مشورہ مجالس قانون ساز وضع قانون کا اختیار بھی دیا جائے گا جو ۱۹۱۹ء کے دستور کے ماتحت انھیں حاصل نہ تھا۔ مالیات کے متعلق جملہ معاملات میں

یہ جدید دستور موجودہ پابندیوں کو برقرار رکھنے کے علاوہ چند مزید پابندیاں ایسی وضع کرتا
ہے کہ جس سے حکومتِ ہند کو قانون سازی کے لئے یہ ناممکن ہو جائے گا کہ ملکی صنعت و تجارت
کی ترقی اور امداد کے لئے کچھ کر سکے۔ یہ دستور اس ملک میں صرف برطانوی تجارت اور سرمایہ
کے لئے کافی مراعات کی ضمانت کرتا ہے اور اس پردہ میں کہ ہندوستان کی مجالس قانون ساز
ان کے ساتھ کوئی نقصان رساں امتیازات نہ کرنے پائیں۔ جدید دستور کی مالیاتی اسکیم
نے نہ تو موجودہ غیر منفعت بخش فوجی اور سول مصارف پر کوئی توجہ کی ہے اور نہ قومی ترقی
اور تعمیر کے لئے کوئی نیا ذریعۂ آمدنی فراہم کیا ہے۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ جدید دستور
دیسی ریاستوں اور بڑے بڑے زمینداروں کے اثر و اقتدار کو مستحکم کرنا چاہتا ہے اور ہندوستان
کی سیاسی زندگی پر ان لوگوں کو ایک خاص اہمیت دینے کی کوشش کرتا ہے۔

غرض جس نقطۂ نظر سے بھی دیکھئے یہ جدید دستور باشندگان ہند پر ایک سامراجی
حملہ ہے جو بالارادہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان پر برطانوی سامراج کی اسی گرفت کو یہ اور
مضبوط کرنا چاہتا ہے بلکہ اس ملک کے لئے غلامی کی نئی زنجیریں گڑھتا ہے، اس لئے
سامراج کے مخالف ہندوستان کے عام باشندگان کا یہ فرض ہے کہ اس کے خلاف شدت
کے ساتھ جدوجہد کریں اور قبل اس کے کہ وہ ہمیں دھکا دے کر غلامی کی دلدل میں اور
زیادہ نیچے گرائے ہم اسے جڑ سے کھود کر نیست و نابود کر دیں۔

برطانوی پارلیمنٹ کی فرمانروائی | ہر دستور اساسی میں فرمانروائی کا سوال بنیادی حیثیت
رکھتا ہے اس لئے کہ اہم ترین سیاسی فرمانروائی کی خصوصیات کا رنگ پورے دستور میں
بلکہ اس کی تفصیلات میں نظر آتا ہے۔ ہر آزاد اور جمہوری ملک میں فرمانروائی ساری
قوم کی ہوتی ہے اور اس کی تشکیل جمہور کی منتخب کردہ ایک جماعت کے ذریعے ہوتی ہے
جہاں سے حکومت کے تمام پرزے قوت اور اختیارات حاصل کرتے ہیں۔ ہندوستان
چونکہ برطانیہ عظمیٰ کا محکوم اور ماتحت ہے اس لئے ہندوستان میں فرمانروائی [illegible]

کی نہیں بلکہ برطانوی پارلیمنٹ کی ہے۔ یہی پارلیمنٹ اس بات کا فیصلہ کرتی ہے کہ ہندوستان میں کس طرح کی حکومت ہونا چاہیئے۔ اور اس کے بعد وزیر ہند کے ذریعے جس کو ہندوستان کے انتظام و انصرام حکومت کے معاملات پر مداخلت کے غیر محدود اختیارات حاصل ہیں ہندوستان کے جملہ معاملات کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتی ہے۔ تمام اہم معاملات میں وزیر ہند حکومت ہند کی پالیسی کو طے کرتا ہے۔ اور اس کی ہدایت کرتا ہے۔ ہندوستان کی مالیات پر اس کا پورا دباؤ ہے۔ ہندوستان کی دفتری حکومت کی اعلیٰ فوجی اور سول ملازمتوں کے لئے وہی تقررات کرتا ہے۔ نیز ملازمت کے متعلق شرائط طے کرتا ہے اور گورنر جنرل جو ہندوستان کا احکم الحاکمین ہے براہ راست اس کے سامنے جوابدہ ہے۔

یہ جدید دستور کسی طور پر ہندوستان میں برطانوی پارلیمنٹ کی اس فرمانروائی کو ہاتھ سے بھی نہیں چھوڑنے دیتا ہے۔ اس دستور اساسی کی دفعہ ۲ کا صاف یہ مطلب ہے کہ پارلیمنٹ ہی ہندوستان کی اعلیٰ فرمانروا رہے گی اور اس کے بعد دفعہ ۱۱۰ خاص طور پر یہ بتلاتی ہے کہ :-

۱۔ اس قانون میں کسی چیز سے ایسا مطلب نہ لیا جائے جس سے کہ

(الف) برطانوی ہند یا اس کے کسی حصہ پر پارلیمنٹ کے اختیارات قانون سازی پر کوئی اثر پڑے، یا

(ب) وفاقی مجالس قانون ساز یا کسی صوبجاتی مجالس قانون ساز کو یہ اختیار دیا جائے، کہ

(۱) کوئی ایسا قانون بنائے جس کا اثر فرمانروا یا شاہی خاندان پر یا بادشاہ کی جانشینی اور وراثت پر، یا ممالک محروسہ کی فرمانروائی پر یا ہندوستان کے کسی حصہ پر بادشاہ کی سیادت پر یا برطانوی قومیت کے متعلق قوانین پر یا قوانین متعلق برّی فوج وہوائی فوج یا قانون نظم وضبط بحری فوج پر یا سمندری قانون اور سمندری،

سمندری عدالتوں پر پڑے۔

علاوہ بریں دفعہ ۳۰۸ نے یہ بات بالکل صاف کردی ہے۔ مجالس قانون ساز ہند کو اس دستور میں کسی تبدیلی کا اختیار نہیں ہے۔ وہ صرف اس قسم کے معاملات میں مثلاً حق رائے دہندگی میں توسیع یا طریق انتخاب یا ایوانات میں اراکین کی تعداد اور اسکی ساخت وغیرہ کے متعلق قرارداد کے ذریعہ ترمیمات کی سفارش کرسکتی ہے۔ اور وہ بھی اس دستور کے نفاذ کے دس سال بعد۔ لیکن اس دستور میں کسی قسم کی تبدیلی کے لئے برطانوی پارلیمنٹ کی منظوری بہرحال ضروری ہے۔

چنانچہ پارلیمنٹ کی فرمانروائی ان اختیارات کے ذریعے سے قائم رکھی جائے گی جو ہندوستان کے معاملات کی "نگرانی، ہدایت، اور ان پر دباؤ رکھنے کے لئے" وزیر ہند کو تفویض کئے گئے ہیں اور وزیر ہند آئندہ بھی ان تمام اختیارات کو استعمال کرنے کا ذمہ دار ہوگا جو ملک معظم کو ہندوستان کے متعلق حاصل ہیں۔ گورنر جنرل براہ راست اس کے ماتحت ہوگا اور لازماً اس کی ہدایات کی تعمیل کرے گا۔

اس سے یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستان اور برطانیہ عظمیٰ کے بنیادی سیاسی تعلقات پر یہ جدید دستور کسی طرح پر بھی کوئی اثر نہیں ڈالتا۔ اس ملک پر سامراجی تسلط برقرار رہے گا اور ایک غلام ملک کی حیثیت سے ہندوستان پر ایک اجنبی سامراجی حکومت آئندہ بھی قائم رہے گی اور لوٹ مار کرتی رہے گی۔

<u>وفاق</u> | جدید دستور نے سارے ہندوستان کا ایک وفاق بھی تیار کیا ہے جو برطانوی ہند کے صوبجات اور دیسی ریاستوں پر مشتمل ہوگا۔ اس وفاق کے دو ایوان ہوں گے یعنی فیڈرل اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ۔ اس وفاق کی قوت عاملہ کا نفاذ ملک معظم کی طرف سے گورنر جنرل کیا کرے گا۔

<u>وفاقی مجالس قانون ساز کی ساخت</u> | فیڈرل اسمبلی میں برطانوی ہند کے ۲۵۰ نمائندے ہوں گے

اور دیسی ریاستوں کے زیادہ سے زیادہ ۲۵۰ نمائندے۔ اور کونسل آف اسٹیٹ میں برطانوی ہند کے ۱۵۶ نمائندے اور دیسی ریاستوں کے زیادہ سے زیادہ ایک سو چار۔

کونسل آف اسٹیٹ کے انتخاب کا حق ان جائداد کی بنیاد پر چند قیود کے ساتھ ہوگا اس لئے صرف دولتمند زمیندار، کارخانہ دار اور تاجروں کے طبقے کی اس میں نمائندگی ہوگی اور فیڈرل اسمبلی دوسرے عام باشندگان کی نمائندگی کرے گی۔

دونوں ایوانوں میں برطانوی ہند کی نشستوں کی تقسیم فرقہ وارانہ اصول پر ہوگی۔ ہندو، مسلمان، سکھ، ہریجن دیسی عیسائی، اینگلو انڈین اور یورپین سب کو جداگانہ انتخاب کا حق ملے گا صنعت و حرفت اور تجارت پیشہ، نیز زمیندار اور مزدور پیشہ اور مستورات کی مخصوص نمائندگی کے لئے چند نشستیں مخصوص کر دی جائیں گی۔

فیڈرل اسمبلی کی جملہ نشستوں کی خانہ پُری بالواسطہ طریق انتخاب سے ہوگی، یعنی وہ لوگ اس میں آئیں گے جن کا انتخاب صوبجاتی مجالس قانون ساز کے اراکین کریں گے، اور اس میں ہر فرقہ یا جماعت کے لوگ علیحدہ علیحدہ رائے دیں گے۔ البتہ کونسل آف اسٹیٹ میں برطانوی ہند کے نمایندوں کا انتخاب براہ راست ان حلقہائے انتخاب سے ہوگا، جن میں حق رائے دہندگی بہت ہی محدود اور صرف ملکیت و جائداد کی بنیاد پر حاصل ہوگا۔ دیسی ریاستیں خود اپنے نمائندے مقرر کریں گی جن کی نامزدگی ریاست کا فرمانروا کیا کرے گا۔ چھ سو ریاستوں پر نشستوں کی تقسیم ہر ریاست کی اہمیت اور اس کے مرتبہ کے لحاظ سے کی جائے گی۔

یہاں غور طلب اور اہم بات یہ ہے کہ ان فیڈرل ایوانات کی ساخت کچھ ایسی رکھی گئی ہے کہ یہ اس ملک کی تمام رجعت پسند قوتوں کا ایک قلعہ بن جائیں گے۔ فرقہ وارانہ اصول پر نشستوں کی تقسیم، فیڈرل اسمبلی کے لئے اراکین کا بالواسطہ انتخاب، اور کونسل آف اسٹیٹ میں صرف صاحب جائداد طبقوں کی نمائندگی اور پھر دونوں ایوانات میں دیسی ریاستوں کی اتنی کثیر تعداد نمائندگی سے وفاقی مجالس پر ان عناصر کا غلبہ یقینی ہے جو سامراج کے حامی اور ترقی کے دشمن ہیں۔

نشستوں کی فرقہ وارانہ تقسیم اس عام پالیسی سے تعلق رکھتی ہے کہ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو"۔ لیکن ہندوستان میں برطانوی سامراج کا یہ کوئی نیا اصول نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس ملک پر برطانوی حکومت کو قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ اسی اصول سے کام لیا گیا ہے۔ حکومت قصداً فرقہ وارانہ سوالات اٹھاتی رہی ہے اور ان کی سرپرستی بھی کرتی رہی ہے، نیز ضروریات وقت کے لحاظ سے مختلف فرقوں کو ایک دوسرے سے لڑایا گیا ہے۔ چنانچہ یہی نہیں کہ اس دستور میں فرقہ وارانہ تفرقہ اندازیاں اور زیادہ کثرت سے موجود ہیں بلکہ انہیں اس طریقہ سے داخل کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے متوسط طبقے میں جو فرقہ وارانہ جذبات اس وقت موجود ہیں وہ اور زیادہ بھڑک جائیں۔ اس کی وجہ سے یقیناً بیماری ہندوستان میں اور زیادہ بڑھے گی اور اس طریقہ سے مجالس قانون ساز کو فرقہ وارانہ جھگڑوں کے لئے گویا میدان جنگ بنانے کا ایک اسٹیج قائم کیا جارہا ہے اس لئے کہ صرف جداگانہ طریق انتخابات کے سایہ میں تمام فرقوں کے رجعت پسند عناصر پھلتے پھولتے ہیں اور انھیں عوام الناس پر اپنے اثر اور اقتدار کو پھیلانے کا موقع ملتا ہے۔

ایوان ادنیٰ یعنی فیڈرل اسمبلی کے لئے بالواسطہ انتخاب اور ایوان اعلیٰ یعنی کونسل آف اسٹیٹ کے لئے براہ راست انتخاب کا جو نرالا اور دلچسپ طریقہ اختیار کیا گیا ہے اس میں بھی ایک مقصد پوشیدہ ہے۔ دنیا کی جمہوری حکومتوں کا یہ ایک ابتدائی اصول ہے کہ ایوان ادنیٰ کا انتخاب براہ راست عام باشندگان کو کرنا چاہئے، جن کی کہ وہ نمائندگی کرتا ہے اور ایوان اعلیٰ کا انتخاب چونکہ وہ مستقل حقوق رکھنے والوں کی نمائندگی کرتا ہے اس لئے خواہ براہ راست کیا جائے یا نہ بھی کیا جائے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اس میں سرے سے کسی انتخاب ہی کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کی ایک مثال برطانیہ عظمیٰ میں دارالامرا موجود ہے۔ لیکن برطانوی سامراج تو ہندوستان کے جمہور کی رائے سے خوف زدہ ہے۔ جمہور کے اثر اور دباؤ سے کچھ مجبور ہو کر صوبجاتی مجالس قانون ساز میں براہ راست طریق انتخاب کا حق دیا ہے، لیکن

وہ چاہتی ہے کہ ملک میں سامراج کی مخالف تحریک کے روز افزوں اثرات سے وفاقی مجالس کا ہر طرح تحفظ کیا جائے۔ چنانچہ بالواسطہ طریق انتخاب کا صاف و صریح مقصد ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کو فیڈرل اسمبلی پر قبضہ کرنے سے روکا جائے۔ اگر قوم کو براہ راست حق رائے دیا جاتا تو فیڈرل اسمبلی میں کانگریس کی نمائندگی بہت قوی ہو جاتی بلکہ اکثریت ہو جاتی لیکن بالواسطہ انتخاب میں کانگریس امیدوار صرف انھیں صوبجات سے فیڈرل اسمبلی کے لئے منتخب ہوں گے جہاں صوبجاتی مجالس میں کانگریس کی اکثریت ہے یا کم از کم وہ خاصی تعداد میں ہیں اور اصل بات یہ ہے کہ اگر ان نشستوں کے لئے کھلا ہوا مقابلہ کانگریس اور دوسری رجعت پسند جماعتوں کے درمیان ہو تو کانگریس عام باشندگان پر اپنے غالب اثر کی وجہ سے یقیناً زیادہ کامیاب ہو گی، لیکن مجالس قانون ساز کے اندر جہاں حق رائے صرف چند سو افراد تک محدود ہے، رجعت پسند عناصر حکومت کی امداد و اعانت سے ایسی ترکیبیں کر سکتے ہیں کہ انھیں فیڈرل اسمبلی میں اس سے زیادہ نمائندگی مل جائے جتنی کہ براہ راست طریق انتخاب کی صورت میں وہ حاصل کر سکتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ بالواسطہ طریق انتخاب کا پورا خاکہ کچھ اس انداز کا بنایا گیا ہے کہ اس ملک میں کسی سامراج کی مخالف جماعت کو سب سے اعلیٰ مجالس قانون ساز میں غلبہ حاصل کرنے سے روکا جائے۔ اس ملک کے مستقل حقوق رکھنے والے لوگ کونسل آف اسٹیٹ میں مستحکم طور پر داخل ہونے کے بعد فیڈرل اسمبلی کے ترقی پسند اراکین کی راہ میں بھی ایک رکاوٹ بن جائیں گے، اس لئے کہ کونسل آف اسٹیٹ کو بالکل وہی اختیارات قانون سازی و مالیات حاصل ہوں گے جو فیڈرل اسمبلی کو دیئے گئے ہیں۔ کونسل آف اسٹیٹ جیسے ایوان اعلیٰ کا وجود جس میں کہ اعلیٰ طبقہ کے سرمایہ دار اور زمینداران کی نمائندگی ہو اور اسے ایوان ادنیٰ کے مساوی اختیارات دیئے جائیں جمہوریت کے مبادی اور اصول کے بالکل خلاف ہے۔ لیکن برطانوی سامراج جمہور ہندوستانیوں کو جنھیں وہ بڑی بے رحمی سے لوٹ رہی ہے، عام طور پر اپنا دشمن بنانے کے بعد اب یہ چاہتی ہے، کہ اس

ملک کے مستقل حقوق رکھنے والے لوگوں کے ساتھ اتحاد قائم کرے اس لئے کہ ان کا وجود بھی سامراجی نظام پر منحصر ہے اور اس نظام کو اگر شکست ہوئی تو ان لوگوں کا اس میں بھی بہت کچھ نقصان ہوگا۔ یہی مقصد تھا جس نے برطانوی پارلیمنٹ کو اس بات پر آمادہ کر دیا، کہ دیسی ریاستوں کو وفاق میں غیر معمولی اہمیت عطا کرے۔ چنانچہ فیڈرل اسمبلی میں کل نشستوں کی ۳۳ فی صدی دیسی ریاستوں کے قبضہ میں ہوں گی اور کونسل آف اسٹیٹ میں انکی نمائندگی ۴۰ فی صدی ہو جائے گی۔ مجموعی حیثیت سے گویا وفاقی مجالس میں ۴۰۶ اراکین برطانوی ہند کی نمائندگی کریں گے اور ۲۲۹ دیسی ریاستوں کی۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ وفاقی مجالس سے یہ بعید ہے کہ وہ ترقی پسند ہو یا قوم کی رائے کی نمائندگی کرے۔ اس میں رجعت پسند جاگیردار اور فرقہ پرست عناصر کا غلبہ ہوگا جو سامراج کی حمایت میں ایک جتھا بنالیں گے اور اس طریقہ سے گورنر جنرل کو موقع دیں گے کہ وہ اپنے غیر محدود اور مطلق العنان اختیارات کو قوم کے خلاف استعمال کرے۔

وفاقی مجالس کے اختیارات باوجود اس ضمانت کے کہ وفاقی مجالس میں اکثریت ہمیشہ رجعت پسندوں کی رہے گی۔ برطانوی سامراج پھر بھی یہ محسوس کرتی ہے کہ اس جماعت کو مالیات یا قانون سازی کے حقیقی اختیارات دے دینا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ چنانچہ پہلے تو محکمہ فوج اور محکمہ معاملات خارجہ کہ سیاسی حیثیت سے دونوں سب سے زیادہ اہم محکمے ہیں وفاقی مجالس کے حدود سے اثر و اقتدار سے خارج ہوں گے، اور ان محکموں کے متعلق نہ وہ کوئی قانون بنا سکتی ہیں اور نہ ان محکموں کے مصارف متعین کرنے میں وہ کوئی رائے دے سکتی ہیں۔ گورنر جنرل "خود محکمہ جات فوج، معاملات خارجہ اور ملکیت کا ذمہ دار ہوگا اور ان کی نگرانی کرے گا" دوسرے یہ کہ گورنر جنرل کی منظوری حاصل کئے بغیر کوئی مسودہ قانون نہیں بن سکتا۔ تیسرے یہ کہ گورنر جنرل کی سابقہ اجازت حاصل کرنا ضروری ہے اگر وفاقی مجالس کے کسی ایوان میں کوئی ایسا مسودہ یا ترمیم پیش کی جائے جو:-

(۱) پارلیمنٹ کے کسی قانون کی کسی دفعہ کو درآنحالیکہ وہ برطانوی ہند پر حاوی ہو مسترد کرے یا اس میں ترمیم کرے یا اس کے مخالف ہو۔

(۲) گورنر جنرل کے کسی قانون یا اس کے نافذ کردہ کسی آرڈیننس کو مسترد کرے یا اس میں ترمیم کرے یا اس کے منافی ہو۔

(۳) اثر انداز ہو ان معاملات پر جن کے متعلق گورنر جنرل کو اپنی رائے سے عمل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

(۴) پولیس کے سپاہی یا یوروپین برطانوی رعایا کے متعلق ضابطہ فوجداری کو مسترد کرے یا اس میں ترمیم کرے یا اس پر اثر انداز ہو۔

(۵) ایسے اشخاص پر جو ہندوستان میں نہیں رہتے ان لوگوں کے مقابلہ میں جو ہندوستان میں رہتے ہیں زیادہ شرح سے محصولات عائد کرے یا ان کمپنیوں پر نسبتاً زیادہ محصول عائد کرے جن کا انتظام اور اہتمام کلیتہً بیرونی ہند میں نہیں ہوتا ہے۔

(۶) اثر انداز ہو، وفاقی محصول آمدنی کی کسی ایسی رعایت پر جو اس وجہ سے عطا کی گئی ہو کہ اس آمدنی پر مملکت انگلستان میں بھی محصول لگایا جاتا ہے۔

غرض اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وفاقی مجالس کو بالکل کوئی اختیارات نہیں ہیں۔ اس ملک کی فوج اور بیرونی تعلقات کے متعلق اس کو کسی قسم کی رائے اور مشورے کا نہ کوئی حق حاصل ہوگا اور نہ بغیر گورنر جنرل کی سابقہ اجازت کے کسی اہم معاملہ کے متعلق وہ کوئی قانون بنا سکتی ہے۔ اور جن امور میں اس قسم کی سابقہ اجازت ضروری نہیں ہے، وہاں گورنر جنرل خود اپنی رائے پر عمل کر کے مجالس قانون ساز کے کسی فیصلہ کو اپنے اختیارات 'وٹو' کو استعمال کر کے مسترد کر سکتا ہے*۔

(امور متعلقہ مالیات پر وفاقی مجالس کے اختیارات اور بھی زیادہ محدود ہوں گے۔ سالانہ

---

* وفاق کے منظور کردہ قانون کو تاریخ منظوری کے بعد بارہ مہینہ کے اندر بادشاہ منسوخ کر سکتا ہے۔

مصارف دو حصوں میں تقسیم کردئے جائیں گے۔ یعنی (۱) وہ مصارف جو وفاق کی آمدنی سے ادا کردئے جائیں گے۔ (۲) وہ مصارف جن کی ادائیگی وفاق کی آمدنی میں سے کرنے کی تجویز کی جائے گی۔ اول الذکر کے لئے وفاقی مجالس کی منظوری کی ضرورت نہ ہوگی اور ان میں حسب ذیل مصارف شامل ہیں۔

(۱) گورنر جنرل کی تنخواہ و بھتہ اور ان کے دفتر کے متعلق دیگر مصارف۔

(۲) مطالبات قرض جن کی ذمہ داری وفاق پر ہے۔ بشمولیت، سود، ذخیرہ ادائی مطالبات اور ذخیرہ ادائی قرض وغیرہ۔

(۳) وزراء، اراکین کونسل، مشیر مال، سرکاری وکیل اور چیف کمشنران وغیرہ کی تنخواہیں اور بھتے۔

(۴) وفاقی عدالت کے ججوں کی تنخواہ، بھتے اور پنشن نیز ہائی کورٹ کے ججوں کی پنشن جو واجب الادا ہے۔

(۵) محکمہ فوج، معاملات خارجہ اور محکمہ کلیسا کے مصارف۔

(۶) دیسی ریاستوں کے ساتھ ملک معظم کی طرف سے تعلقات قائم رکھنے کے سلسلہ میں جو مصارف ہوں۔

(۷) اس کے علاوہ اور کوئی مصارف جو گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ وفاق کی آمدنی سے منظور کرے۔

دوسری قسم کے مصارف کے لئے جو وفاق کی آمدنی سے تجویز کئے جائیں گے وفاقی مجالس کی منظوری حاصل کی جائے گی۔ لیکن گورنر جنرل کو چونکہ منظوری کا اختیار حاصل ہوگا اس لئے وہ سالانہ میزانیہ میں ایسی رقوم داخل کرسکتا ہے جو وفاقی مجلس نے نامنظور کردی تھیں یا ان میں تخفیف کردی تھی۔

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ میزانیہ کا وہ حصہ جس کے لئے وفاق کی رائے کی ضرورت

نہیں ہے، وفاق کے کل مصارف کے کم از کم اسی فی صدی پر مشتمل ہے۔ پھر بھی باقی ماندہ بیس فی صدی بلکہ اس سے بھی کم پر وفاقی مجالس کو اختیارات کلی حاصل نہ ہوں گے، اس لئے کہ گورنر جنرل خود اپنی رائے سے ہر دو ایوانوں کے کسی فیصلہ کو جو مالیات سے متعلق ہو مسترد کرسکتا ہے۔

اس لحاظ سے تو جدید دستور نے ۱۹۱۹ء کے انتظامات کو ضرور قائم رکھا ہے لیکن بعض دیگر معاشی اور مالیاتی امور میں اس نے جدید قیود اور پابندیاں وفاقی مجالس پر عائد کردی ہیں جن میں سب سے زیادہ قابل غور وہ ہیں جو مجالس قانون ساز ہند کو اس قسم کے قوانین منظور کرنے سے منع کرتی ہیں جو براہ راست یا بالواسطہ اس ملک میں برطانیہ کی تجارت اور مالیات کے مفاد کے لئے نقصان رساں معلوم ہوں۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی دفعہ ۱۲ نے گورنر جنرل کی دیگر خصوصی ذمہ داریوں میں ایک یہ بھی قرار دی ہے کہ ہر اس کارروائی کو روکے جس کے تحت ہندوستان میں برطانیہ کے مال کی درآمد کے ساتھ امتیازی یا تعزیری برتاؤ کیا جائے۔ خصوصی ذمہ داریوں کے مقابلے میں گورنر جنرل خود اپنی رائے اور اختیار تمیزی پر عمل کرے گا۔ اور جہاں تک کہ اس ذمہ داری کا تعلق محصولات درآمد و برآمد سے ہے اس میں امتیازات خواہ براہ راست کئے جائیں یا بالواسطہ کسی تدبیر سے، دونوں صورتوں میں اس کا اطلاق ہوسکے۔ اس کی وجہ سے گورنر جنرل کو یہ اختیار بھی حاصل ہوگا کہ اگر مجلس کے کسی قانون کا منشا برطانوی مال کے مقابلہ میں ہندوستانی مصنوعات کی تائید کرنا ہو تو وہ اس کو خلاف قاعدہ قرار دے کر مسترد کرسکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس دفعہ کے تحت مجالس قانون ساز ہند کی تجارتی پالیسی گورنر جنرل کے ارشاد و ہدایت کے مطابق مقرر ہوا کرے گی۔

دفعہ ۱۱۱ مجالس قانون ساز ہند کو اس قسم کا کوئی قانون منظور کرنے سے منع کرتی ہے جس سے کہ برطانوی نژاد برطانوی رعایا کے ہندوستان میں داخلہ پر یا ان کے لئے جائداد کی

خرید و فروخت اور اس پر قبضہ یا سرکاری ملازمت یا کوئی دوسرا مشغلہ، تجارت، کاروبار اور پیشہ اختیار کرنے پر قیود اور پابندیاں عائد ہوں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس ملک کی معاشی زندگی میں برطانیہ کو جو خاص حقوق اور مراعات حاصل ہیں ان کو مجالس قانون ساز ہند چھو نہیں سکتی۔

برطانوی کمپنیاں جو ہندوستان میں تجارت کر رہی ہیں مجالس قانون ساز ہند کے اثر اور دباؤ سے کلیتہً آزاد ہوں گی اور اس ایکٹ کی دفعہ ۱۱۳ کے مطابق کسی کمپنی کو جو برطانوی قوانین کے تحت قائم ہوئی ہو۔ ہندوستان نے کمپنی ایکٹ کی پابندی پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ مجالس قانون ساز ہند کو ہرگز یہ اختیار نہ ہوگا کہ اس قسم کی کمپنیوں کو قوانین ہند کے مطابق قائم کرنے کا مطالبہ کرے یا اس کے دفتر کی رجسٹری، اس کے سرمایہ، یا قومیت، یا مستقل سکونت یا بود و باش وغیرہ پر یا مجلس نگران کے اراکین، یا حصہ داران، عہدہ داران ایجنٹ اور ملازمین پر کوئی پابندیاں عائد کرے۔

دفعہ ۱۱۲ نے یہ قرار دیا کہ محصولات کے معاملہ میں برطانوی اور ہندوستانی کمپنیوں کے ساتھ ایک ہی قسم کا برتاؤ کیا جائے گا۔ اور دفعہ ۱۱۶ میں ایک اہم شرط یہ بھی داخل کی گئی ہے کہ ہندوستان میں جو برطانوی کمپنیاں قائم ہیں وہ بھی اسی حد تک حکومت کے عطیہ، امداد اور اعانت کی مستحق ہوں گی جس طرح کہ ہندوستانی کمپنیاں۔

آخر میں یہ ایک شرط اور رکھی گئی ہے (دفعہ ۱۱۵) کہ "مالک برطانیہ کے اندر رجسٹر شدہ کسی جہاز کے ساتھ وفاقی یا صوبجاتی قانون کے ذریعہ یا اس کے تحت کوئی ایسا طرز عمل نہیں اختیار کیا جائے گا جس کا اثر خود جہاز پر، یا اس کے مالک، افسران، ملاح، یا اس کے تجارتی مال و اسباب پر پڑے۔ درآنحالیکہ برطانوی ہند کے اندر رجسٹر شدہ جہازوں کے حق میں اس کی وجہ سے کوئی رعایت بھی ہوتی ہو۔"

ان تمام دفعات پر باقاعدہ عمل درآمد کرانا بھی گورنر جنرل کی مخصوص ذمہ داری میں داخل ہے۔

اس کے علاوہ ایک چیز اور بھی غور طلب ہے کہ وفاقی مجالس کو ریزرو بنک اور ہندوستانی ریلوں پر بہت کم اثر اور اختیار حاصل ہوگا اس لئے کہ ان میں برطانوی سرمایہ بہت زیادہ لگا ہوا ہے۔ گورنر جنرل خود اپنی رائے اور تمیز سے ریزرو بنک کے گورنر اور ڈپٹی گورنر کا تقرر کرے گا اور وہ ان کو برخاست بھی کرسکتا ہے۔ اس کو یہ اختیار بھی ہوگا کہ مرکزی بورڈ کو برطرف کرنے یا بنک کے حساب کو چکانے کے لئے جو کارروائی چاہے کرے۔ ریلوں کا انتظام اور نگرانی ایک مخصوص جماعت کے سپرد ہوگی جس کا تقرر آئین پارلیمنٹ کے ذریعہ کیا جائے گا۔ اور اس کا نام ریلوے اتھارٹی ہوگا۔ اس جماعت کے جملہ سات اراکین میں سے کم از کم تین اراکین کا تقرر گورنر جنرل کرے گا۔ اور خصوصی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں جو اختیارات گورنر جنرل کو حاصل ہیں ان کا اطلاق ریلوے اتھارٹی پر بھی ہوگا۔

ہندوستان میں برطانیہ کو جو زبردست مستقل حقوق حاصل ہیں انھیں اگر پیش نظر رکھا جائے تو پھر ان آئینی قیود اور پابندیوں کی حقیقی اہمیت سمجھ میں آسکتی ہے۔ ہندوستان میں برطانیہ نے جو سرمایہ لگا رکھا ہے اس کی مجموعی رقم تیرہ ارب روپے کے قریب ہوتی ہے ۳۲-۱۹۳۱ء میں برطانوی کمپنیوں کی تعداد جو ہندوستان میں کاروبار کررہی تھیں ۹۱۱ تھی۔ اور وصول شدہ سرمایہ ۵۶ ۷ ملین پونڈ یعنی ۱۰ ارب ۸ کروڑ روپیہ تھا۔ ان میں سب سے زیادہ اہم کمپنیاں بنکوں کی ہیں اور بیمہ کمپنیاں، ریل اور ٹریم کی کمپنیاں، تجارتی اور صنعتی کمپنیاں، سن کے کارخانے اور کانیں ہیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ کم از کم ایک ارب ۶۱ کروڑ روپیہ ہر سال برطانوی سرمایہ کے سود یا برطانوی کمپنیوں کے منافع کی صورت میں ہندوستان سے انگلستان چلا جاتا ہے۔ ہندوستان کی بحری تجارت کا بہت بڑا حصہ برطانوی جہازات پر جاتا ہے۔ بحری تجارت پر ہندوستانی جہازات کا حصہ بمشکل ۲ فی صدی ہے اور ساحلی تجارت پر تقریباً ۱۵ فیصدی۔

یہ تجارتی اور صنعتی حقوق رکھنے والے برطانوی نہ صرف یہ کہ اس ملک کے معاشی وسائل پر حاوی اور قابض ہیں بلکہ کھلم کھلا ہندوستانی کمپنیوں اور تاجروں کے خلاف نقصان رساں

طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہندوستان کی صنعت اور تجارت کو ترقی دینا ہے تو ان طاقتور بدیسی دشمنوں سے اس کا تحفظ کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن جدید دستور نے یہ بالکل ہی ناممکن بنا دیا ہے، اس لئے کہ اگر برطانیہ کے تجارتی اور کاروباری مفاد کو نظر انداز کر کے صرف ہندوستان کی صنعت و تجارت کی امداد اور سرپرستی کے لئے کوئی تدبیر اختیار کی جائے گی تو گورنر جنرل اس کو بھی خلاف قاعدہ قرار دے کر مسترد کر دے گا اور ہر معاملے میں اس کا فیصلہ آخری ہو گا جس میں کوئی حجت نہیں ہو سکتی۔ غرض اس طریقہ سے برطانوی سرمایہ کا پھندا ہندوستان کے گلے میں، سی قدر مضبوط پڑا رہے گا جیسا کہ ہمیشہ سے تھا اور یہ ملک اسی طرح ہمیشہ معاشی حیثیت سے پست اور غیر ترقی یافتہ رہے گا۔

گورنر جنرل کے اختیارات اگر ایک طرف وفاقی مجالس کمزور اور بے بس جماعت بنا دی گئی ہیں تو دوسری طرف تمام اختیارات وائسرائے کے ہاتھوں میں دیدئے گئے ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے جیسا کہ اس سے قبل بھی بتلایا جا چکا ہے کہ محکمہ جات فوج، معاملات خارجہ اور قبائل کی نگرانی اور ہدایت خود گورنر جنرل کیا کرے گا اور جہاں تک ان محکموں کا تعلق ہے وہ براہ راست وزیر ہند کے سامنے جواب دہ ہو گا۔ مزید براں اس کو حسب ذیل اختیارات حاصل ہوں گے۔

(۱) اگر ضرورت سمجھے تو مجلس قانون ساز کے منظور کردہ مسودہ کو قبول کرنے سے انکار کر دے اور اس کو قانون نہ بننے دے۔

(۲) بعض قسم کے قوانین مجلس میں پیش کرنے کے لئے سابقہ منظوری کا عطا کرنا۔

(۳) کسی مسودہ قانون کو ملک معظم کی منظوری کے لئے روک لینا۔

(۴) مالیات کے متعلق مجالس قانون ساز کے کسی فیصلہ کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کرنا۔

(۵) خاص احکامات یعنی آرڈیننس کا کسی وقت نافذ کرنا۔

(۶) مجالس قانون ساز کے بغیر خود ہی "گورنر جنرلی ایکٹ" کے نام سے قوانین بنا دینا۔

(۷) مجالس قانون ساز کی طلبی، برخاستگی اور التوا۔

(۸) مجالس قانون ساز کے ہر دو ایوانات کا مشترک اجلاس طلب کرنا۔

(۹) مجالس قانون ساز میں کسی معاملہ پر بحث کو روک دینا۔

(۱۰) مجالس قانون ساز کی رائے کے باوجود کوئی کارروائی کرنا۔

(۱۱) ایسی حالت میں کہ آئینی انتظامات بالکل موقوف اور منقطع ہو جائیں جملہ اختیارات کو اپنے قابو میں کر لینا۔

ان سب پر مستزاد یہ ہے کہ گورنر جنرل پر چند "خصوصی ذمہ داریاں" عائد کی جائیں گی جن سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اس کو اختیارات مطلق حاصل ہوں گے۔ اور یہ خصوصی ذمہ داریاں حسب ذیل ہونگی۔

(۱) ہندوستان یا اس کے کسی حصّہ کے امن و امان کے لئے کسی شدید خطرہ کا انسداد کرنا۔

(۲) وفاقی حکومت کے قرضہ اور مالیات کا تحفظ کرنا۔

(۳) اقلیتوں کے جائز حقوق کا تحفظ کرنا۔

(۴) جو حقوق قانون نے سرکاری ملازمین کو دئے ہیں ان کی ضمانت کرنا اور ان کے ... رنا۔

(۵) ایسی کارروائی کو روکنا جس سے ہندوستان میں برطانوی مال کی درآمد کے ساتھ کوئی امتیازی یا تعزیری برتاؤ کیا جائے۔

(۶) برطانیہ کے تجارتی اور کاروباری مفاد کے خلاف امتیازات قائم کرنے سے روکنا۔

(۷) کسی دیسی ریاست کے حقوق اور اس کے فرمانروا کے حقوق اور مرتبہ کا تحفظ۔

(۸) جو محکمہ زیر اہتمام اور زیر نگرانی ہے اس کے متعلق اپنی ذمہ داریوں سے کما حقہٗ عہدہ برآ ہونے کا انتظام کرنا۔

دستور میں یہ لکھدیا گیا ہے کہ "جہاں تک کہ گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داریوں کا تعلق ہے وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں خود انفرادی طور پر فیصلہ کرے گا کہ کیا کارروائی کی جائے" اس کے علاوہ یہ شرط بھی رکھی گئی ہے کہ ہر اس معاملہ میں جس کا تعلق گورنر جنرل کی

خصوصی ذمہ داری سے ہے اس کا فیصلہ آخری سمجھا جائے گا اور اس قسم کے فیصلہ کی صحت کے متعلق اس بنیاد پر کوئی اعتراض نہیں کیا جائے گا کہ اسے اپنے اختیار تمیزی سے کام لینا چاہیئے تھا یا نہیں یا یہ کہ اسے اپنے شخصی فیصلے سے کام لینا چاہیئے تھا یا نہیں' اور نہ اس بنیاد پر اس کی صحت کے متعلق کوئی اعتراض کیا جائے گا کہ وہ کسی محولہ دفعہ کے شرائط کے مطابق نہیں کیا گیا ہے اور ان تمام معاملات میں جس کا تعلق اس کی خصوصی ذمہ داریوں سے ہے وزیر ہند گورنر جنرل کی عمومی نگرانی کرے گا۔

یہ بات بھی قابل لحاظ ہے اور اہمیت رکھتی ہے کہ یہ خصوصی ذمہ داریاں اس قدر مختلف النوع ہیں اور ان میں اتنی وسعت اور لچک ہے کہ گورنر جنرل ہر وقت مجالس قانون ساز کی رائے کو نظر انداز کر کے کسی ایک تدبیر میں کام نکال سکتا ہے۔ اور گورنر جنرل کی ذات کو جو مطلق اختیارات دئے گئے ہیں وہ اتنے مکمل اور ہر لحاظ و جہت سے بالا ہیں کہ اس کے مقابلہ میں مشرق کی مطلق العنان سے مطلق العنان حکومت بھی ماند ہے۔

خصوصی ذمہ داریوں کی اصل اہمیت کو بہر حال نظر انداز کرنا چاہیئے۔ امن و امان کو خطرات سے محفوظ رکھنے کی خصوصی ذمہ داری سے یقیناً اس ملک کی تحریک آزادی کو شکست دینے کا کام لیا جائے گا۔ اور قانون اور ضابطے کے نام پر سامراج کے متعلق عام باشندگان کے مخالفانہ جوش اور جذبات کو دبایا جائے گا۔

اس ملک کے مالیاتی استحکام کے تحفظ کی ذمہ داری کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے معتدبہ سرکاری قرضہ کے اس بار کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم رکھا جائے جو گذشتہ سو سال کے اندر حکومت نے صرف برطانیہ کے مفاد کی خاطر غیر منفعت بخش جنگوں پر خرچ کرنے کے لئے فضول قرض لے لے کر اکٹھا کر دیا ہے۔ ۱۹۳۴ء میں حکومت ہند کے کل قرضہ کی میزان ۱۲ ارب ۱۲ کروڑ روپیہ تھی۔ جس میں ۵ ارب ۱۲ کروڑ روپیہ برطانیہ میں قرض لیا گیا تھا چنانچہ محصول ادا کرنے والے ہندوستانیوں پر یہ ایک بہت ہی بڑا بار ہے کہ اس کو کروڑوں روپے

سالانہ اس قرض کا سود ادا کرنا پڑتا ہے۔ اور چونکہ اس قرض کا بیشتر حصہ ان مصارف کے لئے لیا گیا ہے جن سے ہندوستان کو کسی نوع سے فائدہ نہیں پہنچا۔ بلکہ اس کے برخلاف اس ملک پر برطانیہ کا تسلط اور زیادہ مستحکم ہو گیا ہے۔ نیز مشرق میں برطانیہ کے سامراجی مقاصد کو فائدہ پہنچا ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہندوستان کی آمدنی پر آئندہ اس کا بار کیوں پڑتا ہے روز بروز یہ خیال اس ملک میں ترقی پا رہا ہے کہ سرکاری قرضہ کے پورے مسئلہ کو از سر نو جانچنا چاہیئے اور صرف انھیں قرضوں کو باقی رکھنا چاہیئے جو انصافاً ہندوستان کے لئے درست اور صحیح ہیں۔ لیکن برطانیہ کے حکمران طبقہ نے جو لاکھوں پونڈ قرض دئے ہیں ان کے مفاد کی خاطر برطانوی سامراج اس قرضہ کو دوبارہ جانچنے کی اجازت نہیں دے سکتی ہے۔ چنانچہ جدید دستور کے ماتحت سرکاری قرضہ کا بوجھ بدستور قائم رہے گا۔ اور ہندوستان کے مفلس کسان اور دوسرے محصول ادا کرنے والے لوگوں پر ضرورت سے زیادہ محصول محض برطانوی سرمایہ داروں کے فائدہ کے لئے آئندہ بھی جاری رہے گا۔

برطانوی تجارت اور مصنوعات کے خلاف مضرت رساں برتاؤ کرنے کے متعلق گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داری کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی معاشی زندگی پر برطانوی سرمایہ اور تجارتی مفاد کا تسلط قائم رکھا جائے اور ہندوستان کی تجارت، صنعت اور جہازرانی کو خاص طور پہ ترقی دینے اور اس کا تحفظ کرنے سے مجالس قانون ساز کو روکا جائے۔

دیسی ریاستوں اور اس کے فرمانرواؤں کے حقوق کے تحفظ کی خصوصی ذمہ داری کا مقصد یہ ہے کہ جاگیرداری نظام کی ان باقیات کا وجود سامراجی نظام کے سہارے اور تقویت کے لئے محفوظ رکھا جائے۔

اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی ذمہ داری گورنر جنرل کے ہاتھ میں ایک ایسا اچھا آلہ ہے کہ وہ ایک فرقہ کو دوسرے فرقہ سے لڑا سکتا ہے اور اس صورت سے فرقہ وارانہ جھگڑے اور رقابتوں کو ترقی دے سکتا ہے۔

سرکاری ملازموں کے حقوق اور مفاد کا تحفظ اس لئے گورنر جنرل کرے گا تاکہ موجودہ آہنی مزاج، ہندوستانی سول سروس کو برقرار رکھا جائے جو نہ صرف یہ کہ دنیا میں سب سے زیادہ گراں خرچ ملازمین میں سے ہیں بلکہ باشندگان ملک کے ساتھ ان کا برتاؤ حد سے زیادہ حاکمانہ اور غیر ہمدردانہ ہے فوج اور معاملات خارجہ کے متعلق خصوصی ذمہ داری کا راز یہ ہے کہ برطانوی سامراج اپنی اس طاقت اور قوت کو قائم رکھنا چاہتی ہے جس پر کہ ہندوستان میں اس کی حکومت کی بنیاد ہی اور اسی کے ساتھ مشرق میں برطانوی اثر و اقتدار کو بڑھانے اور ریشہ دوانیاں کرنے کے لئے وہ ہندوستان ہی کو مستقر بنانا چاہتی ہے۔ ہندوستانی فوج جس پر پچاس کروڑ روپیہ ہر سال خرچ ہوتا ہے مستقلاً جنگ کے لئے تیار رکھی جاتی ہے اس لئے نہیں کہ اندرون ہندوستان میں اس کی ضرورت ہے بلکہ اس لئے کہ بیرون ہند بھی برطانوی مفاد کے تحفظ کے لئے اس کی ضرورت رہتی ہے۔ موجودہ فوج پر جو معمولاً ہندوستان کی حفاظت کے لئے ضرورت سے زیادہ ہی اتنا زیادہ خرچ قومی تعمیر و ترقی کے کاموں کو روک کر قائم رکھا گیا ہے۔ لیکن برطانوی سامراج کو صرف اپنے اقتدار کو کسی نہ کسی صورت سے قائم رکھنے سے سروکار ہے اور بغیر ایک بہت بڑی اور تیار فوج کے وہ اپنے وجود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے اس لئے گورنر جنرل اس معاملہ میں اپنی خصوصی ذمہ داری کے فرائض بڑی احتیاط سے انجام دے گا تاکہ ہندوستان میں برطانوی سامراج کی فوجی قوت کو کمزور کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جائے۔

دیسی ریاستیں اور وفاق | سطور بالا میں ہم نے یہ حوالہ دیا ہے کہ وفاقی مجالس میں دیسی ریاستوں کو بہت زیادہ نمائندگی دی گئی ہے۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اور کن کن مختلف صورتوں سے سامراج نے ہندوستان میں جاگیرداری نظام کے باقیات کے ساتھ اپنا اتحاد مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ سامراج کی اس مخالف تحریک کو کچلا جائے جو روز بروز عام باشندگان ملک میں پھیل رہی ہے۔

وفاق میں دیسی ریاستوں کے داخلہ کا کوئی اثر نہ ان معاہدوں پر پڑے گا جو شاہ برطانیہ اور ان کے مابین ہوئے ہیں اور نہ ان کی داخلی فرماں روائی پر۔ یہ بات بھی صاف کر دی گئی ہے

کہ چونکہ شاہ برطانیہ کے ساتھ دیسی ریاستوں کے براہ راست معاہدے اور تعلقات ہیں۔ اس لئے
دیسی ریاستوں پر جو حقوق، اختیارات اور عملداری بادشاہ کو حاصل ہے ان کا عملدرآمد وائسرائے
بحیثیت بادشاہ کے نمائندہ کے کیا کرے گا اور وفاقی حکومت کو اس سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔
اب سوال یہ ہے کہ ریاستوں کی اندرونی خودمختاری میں کوئی دخل اندازی ہوگی کہ نہیں؟ اول تو یہ
کہ وفاقی مجالس کے کل قوانین کا اطلاق ریاستوں پر نہیں ہوگا۔ ریاست کے فرمانروا کو اجازت
دی جائے گی کہ داخلہ کے شرائط Instrument of accession میں ان امور کو خاص
طور پر بیان کردے جن کے متعلق وہ وفاقی مجالس کو اپنی ریاست کے لئے قانون سازی کی اجازت
دینے کے لئے آمادہ ہے۔ باقی دوسرے جملہ امور میں وہ وفاقی مجالس کے قوانین سے بالکل آزاد
ہوگا۔ علاوہ بریں ریاستوں کے اندر وفاقی مجالس کے قوانین کا نفاذ۔ ریاست ہی کے اہلکاروں کے
ذریعہ کیا جائے گا نہ کہ وفاقی حکومت کے ملازمین کے ذریعہ۔ چنانچہ یہ بات بھی قابل غور ہے، کہ گو
وفاقی مجالس کے ایوان ادنیٰ میں ۳۳ فی صدی اور ایوان اعلیٰ کی ۴۰ فی صدی نشستوں پر
ریاستوں کا قبضہ ہوگا اور برطانوی ہند کے لئے قانون سازی کے وہی اختیارات انھیں بھی حاصل
ہوں گے جو صوبجات کو دئے گئے ہیں۔ لیکن مجموعی حیثیت سے وفاقی مجالس کو کوئی اختیار ان
ریاستوں کے لئے قانون سازی کا نہ ہوگا سوائے ان چند مقررہ امور کے متعلق جو فرماں روایان
ریاست منظور کریں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ فرمانروا وفاقی مجالس کے جمہوری قوانین کو شکست
بھی دے سکتے ہیں اور ریاستوں میں اپنی مطلق العنان طرز حکومت کو بھی قائم رکھ سکتے ہیں
دستور میں کوئی ایک شرط بھی ایسی نہیں رکھی گئی ہے۔ جو ریاستوں کے لئے یہ لازم کرے کہ
وفاق میں شرکت کے بعد یا تو وہ اپنی رعایا کو بھی جمہوری نظام عطا کریں گی یا کم از کم ان کے
بنیادی حقوق ہی متعین کردیں گی ۔

ایک اور بات جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ برطانوی سامراج دیسی ریاستوں کو ملک کی
رائے عامہ کے خلاف خاص طور پر ایک آڑ بنانے کی فکرمند ہے وہ شرط ہے جو جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی

کی رپورٹ کے پیراگراف ۲۰۹ میں شامل کی گئی ہے کہ اگر شروع شروع ریاستوں کی تعداد جو وفاق میں شریک ہوں. دیسی ریاستوں کے حصہ کی کل نشستوں کو پُر کرنے کے لئے کافی نہ ہو تو باقی نشستوں کی خانہ پُری بھی داخل شدہ ریاستیں کریں گی تاکہ ریاستیں اپنے مفاد کا کما حقہ تحفظ کرسکیں۔

جدید دستور دیسی ریاستوں کے موجودہ اختیارات اور حقوق کا تحفظ اس طرح سے کرتا ہے کہ "دیسی ریاست کے حقوق اور اس کے فرمانروا کے حقوق اور مرتبہ کا تحفظ" گورنر جنرل کی خصوصی ذمہ داریوں میں داخل کر دیا گیا ہے۔ برطانوی حکومت نے ہمیشہ دیسی ریاستوں کو بیرونی حملوں اور اندرونی خلفشار سے محفوظ رکھنا اپنی خاص ذمہ داری سمجھا ہے اور ان کی مطلق العنانی کو قائم رکھنے میں دیسی فرماں رواؤں کی ہمیشہ ہمت افزائی اور امداد کی ہے۔ وائسرائے کی یہ خصوصی ذمہ داری اور اس کے بعد محکمۂ فوج کو خاص اس کے ماتحت کر دینے سے نہ صرف یہ کہ اس پالیسی کے تسلسل کی ضمانت ہو جائے گی، بلکہ جاگیرداری نظام کے ان آثار قدیمہ میں جنھیں زمانہ نے ختم کر دیا تھا ایک نئی قوت اور استحکام بھی پیدا ہو جائے گا۔

صوبجاتی حکومت: جدید دستور کے موئدین کا یہ دعویٰ ہے کہ ہندوستان کو صوبجاتی خودمختاری کی صورت میں حقیقی خودمختاری یا سلف گورنمنٹ عطا کر دی گئی ہے اس سے ان کا مطلب ہے کہ مرکزی حکومت کی نگرانی اور اثر صوبجات میں کم ہو گیا ہے اور خود صوبجات میں دوعملی حکومت کا اس جدید دستور نے خاتمہ کر دیا ہے۔ صوبجاتی خودمختاری کی یہ تاویل غلط اور گمراہ کن ہے اس لئے کہ اگر خودمختاری واقعی کوئی معنی رکھتی ہے تو یقیناً اس کا مفہوم یہ ہونا چاہیئے کہ مکمل طور پر قانون سازی اور مالیات کے اختیارات صوبجاتی مجلس کو منتقل کر دیئے جائیں اور صوبجات میں جمہوری نظام حکومت قائم کیا جائے۔ لیکن جدید دستور ان شرائط کو پورا کرنے سے اسی حد تک قاصر ہے جیسے کہ کوئی سابقہ دستور۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بعض اعتبار سے اس نئے دستور نے گورنران کے اختیارات میں اضافہ کرکے اور ان کو صاف وصریح الفاظ میں بیان کرکے صوبجاتی مجالس کی حیثیت کو پہلے سے بھی زیادہ ابتر بنا دیا ہے۔ آئندہ

گورنران ان صوبجات پر اور زیادہ مطلق العنانی سے حکومت کریں گے اور خود مختاری اگر کسی کو حاصل ہو گی تو گورنران کو ہو گی نہ کہ قوم کے نمائندوں کو۔

صوبجاتی مجالس قانون ساز | ہر صوبہ میں ایک لیجسلیٹو اسمبلی ہو گی اور خاص چھ اہم صوبوں یعنی بمبئی، بنگال، مدراس، ممالک متحدہ، بہار اور آسام میں لیجسلیٹو اسمبلی کے علاوہ ایک ایک لیجسلیٹو کونسل بھی ہو گی۔ یہاں مجلس قانون ساز کے دو ایوان ہوں گے ان میں لیجسلیٹو کونسل ایوان اعلیٰ ہو گی جس کے انتخاب کے لئے ملکیت اور جائداد والے ایک محدود طبقہ کو حق رائے حاصل ہو گا تاکہ وہ اس صوبہ کے مستقل حقوق کی نمائندگی کرے۔ لیجسلیٹو اسمبلی گویا ایوان ادنیٰ ہو گی اور اس کے انتخاب کے لئے ذرا زیادہ جمہوری اصول پر حق رائے دیا جائے گا

لیجسلیٹو کونسل کے اراکین کی تعداد مختلف ہو گی اور سب سے زیادہ تعداد بنگال میں ہو گی یعنی ۶۵۔ اور سب سے کم آسام میں یعنی ۲۱۔ ان میں سے کچھ گورنر نامزد کرے گا اور کچھ فرقہ وارانہ حلقہ انتخاب سے منتخب کئے جائیں گے۔ بنگال اور بہار میں علی الترتیب ۲۷ اور ۱۲ اراکین کا انتخاب دونوں صوبوں کی لیجسلیٹو اسمبلیاں کریں گی۔

لیجسلیٹو اسمبلی کے اراکین کی تعداد سب سے زیادہ بنگال میں ہو گی جہاں ۲۵۰ نشستیں ہونگی اور سب سے کم شمال مغربی سرحدی صوبہ میں جہاں کل ۵۰ نشستیں ہوں گی۔ اراکین کا انتخاب براہ راست ہو گا اور نشستوں کی تقسیم چونکہ فرقہ وارانہ ہے اس لئے حلقہائے انتخاب فرقہ وارانہ حصّوں میں تقسیم ہوں گے۔ چند نشستیں خاص خاص مفاد کے نمائندوں کے لئے مخصوص ہونگی مثلاً تجار، زمیندار، مزدور اور خواتین وغیرہ۔

اس سلسلہ میں خاص باتیں قابل غور یہ ہیں کہ اول تو حق رائے صرف صاحب جائداد اور تعلیم یافتہ لوگوں تک محدود رکھا گیا ہے اور اس طریقہ سے آبادی کا اکثر حصّہ جو مفلس اور ناخواندہ ہے حق رائے سے محروم کر دیا گیا ہے۔ جدید حلقہ انتخاب میں کل ۱۴ فی صدی آبادی شامل کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ ایوان اعلیٰ جو قدامت پسند اور جائداد رکھنے والے طبقہ کی نمائندگی

کرے گا خاص خاص صوبجات میں اس غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ جمہوری اور ترقی پسند قانون سازی کے خلاف مزید تحفظ کا انتظام کر دیا جائے۔ تیسرے یہ کہ فرقہ وارانہ تفریق اور فرقہ وارانہ اصول پر نشستوں کی تقسیم اس طرح کی گئی ہے کہ مختلف صوبجات میں مجالس قانون ساز کو ایک دوسرے کے مقابل اور مخالف گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ حکومت کے خلاف اتحاد عمل ناممکن ہو جائے۔

صوبجاتی مجالس کے اختیارات | لیجسلیٹو اسمبلی اور لیجسلیٹو کونسل میں جو مسودے پیش کئے جائینگے وہ اس وقت تک قانون نہیں بن سکتے جب تک کہ ہر دو ایوان اور گورنر اس کو منظور نہ کر دیں۔ اگر کسی مسودہ پر دونوں ایوانات میں اختلاف رائے ہو تو پھر اس مسودہ پر رائے لینے کے لئے گورنر ان کا ایک مشترک اجلاس طلب کرے گا اور اس مشترک اجلاس میں اگر مسودہ منظور ہو گیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ دونوں ایوانات نے اس کو منظور کر دیا ہے۔

گورنر کو بہرصورت یہ اختیار حاصل ہوگا کہ کسی مسودہ کی منظوری سے انکار کر کے اسکو قانون نہ بننے دے۔ نیز صوبجاتی مجالس کے منظور شدہ کسی قانون کو گورنر کی منظوری کے بعد تاریخ منظوری سے بارہ ماہ کے اندر اندر بادشاہ منسوخ کر سکتا ہے۔

صوبجاتی مجالس کو اس قسم کے قوانین بنانے کا اختیار نہ ہوگا جو براہ راست یا بالواسطہ اس ملک میں برطانیہ کے تجارتی اور صنعتی مفاد کے لئے نقصان رساں ہوں اور نقصان رساں ہونے نہ ہونے کا فیصلہ گورنر کرے گا۔

امور مالیات میں صوبجاتی مجالس کے اختیارات اور بھی زیادہ محدود ہونگے۔ صوبجاتی مصارف دو حصوں میں تقسیم کر دئے جائیں گے۔ یعنی (۱) وہ مصارف جو صوبہ کی آمدنی میں سے وضع کئے جائیں۔ (۲) وہ مصارف جو صوبجات کی آمدنی میں سے وضع کرنے کے لئے تجویز کئے جائیں۔ اول الذکر مجالس قانون ساز کی منظوری کے لئے نہیں پیش کئے جائیں گے اور اس میں حسب ذیل مدات شامل ہیں۔

(۱) گورنر کی تنخواہ، بھتّہ اور اس کے دفتر کے متعلق دوسرے مصارف۔

(۲) مطالبات قرض جو صوبہ کے ذمہ واجب الادا ہے۔

(۳) وزرا اور سرکاری وکیل کی تنخواہ اور بھتّہ۔

(۴) ہائی کورٹ کے ججوں کی تنخواہ اور بھتّہ۔

(۵) مستثنیٰ علاقوں کے مصارف۔

(۶) دیگر مصارف جن کی ادائیگی اس قانون کی رو سے لازم قرار دی جائے۔

باقی ماندہ مصارف کے لئے مجالس قانون ساز کی منظوری لازم ہے۔ لیکن گورنر کو اختیار دیا گیا ہے۔ مجالس قانون ساز کی نامنظوری کے باوجود وہ کسی صرف کو میزانیہ میں داخل کرنے کی منظوری دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ گورنر کی سفارش کے بغیر مالی امداد کا کوئی مطالبہ نہیں کیا جائیگا۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ صاف ظاہر ہے کہ صوبجاتی مجالس قانون ساز پر اتنی زیادہ آئینی قیود اور پابندیاں عائد ہوں گی کہ صوبجاتی معاملات میں کوئی اہم تبدیلی پیدا کرنا ان کی قدرت سے باہر ہوگا۔ امور متعلق مالیات اور قانون سازی کے جملہ معاملات میں آخری اختیار اور حکم گورنر کو حاصل ہوگا۔ اور وہ اس حیثیت سے موجودہ نظام حکومت کے تسلسل کو برقرار رکھے گا۔

گورنر کے اختیارات | گورنر اپنے حدود کے اندر اسی قسم کے خودسرانہ اختیارات کا مالک ہے جس طرح کہ گورنر جنرل وفاق ہند ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے جیسا کہ اوپر ظاہر کیا گیا ہے کہ مجالس قانون ساز کے ہر ایک فیصلہ کے خلاف اپنا فیصلہ صادر کرنے کا اس کو اختیار حاصل ہوگا۔ دوسرے یہ کہ گورنر جنرل کے مثل اس کی بھی "خصوصی ذمہ داریاں ہوں گی۔ یعنی (۱) صوبہ کے امن و امان میں خلل ڈالنے والے کسی خطرہ کا انسداد۔ (۲) اقلیتوں کے مفاد کا تحفظ (۳) سرکاری ملازمین کے حقوق کا تحفظ (۴) برطانیہ کی داخلی اور خارجی تجارت کا تحفظ (۵) دیسی ریاستوں کے حقوق کا تحفظ۔ (۶) گورنر جنرل کے صادر کردہ احکامات کا نافذ کرانا۔ جہانتک کہ خصوصی ذمہ داریوں کا تعلق ہے گورنر تنہا اپنی رائے پر عمل کرے گا اور اس کی کسی کارروائی پر کسی وجہ سے بھی کوئی

اعتراض نہ کیا جائے گا۔ تیسرے یہ کہ اس کو آرڈیننس نافذ کرنے کا اختیار ہو گا۔ اور صوبجاتی مجلس کے بغیر وہ خود بھی گورنری قانون کے نام سے قوانین بنا سکتا ہے۔

خصوصی ذمہ داریوں کی حقیقت تو بتائی جا چکی ہے لیکن اس جگہ ہم اس اہمیت کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں جو صوبجات آئین و انتظام (نظم و نسق) قائم رکھنے کے لئے جوائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی نے گورنر کی خصوصی ذمہ داری کے سلسلہ میں بتائی ہے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ میں ہے کہ "فی الحقیقت یہ تباہ کن ہو گا۔ اگر کسی صوبہ میں پولیس کو جو مشکل سے مشکل حالات پر ثابت قدم رہی ہے جس کی وفاداری کا ہندوستان اتنا زیادہ ممنون احسان ہے کہ اس کا شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا، کسی ایک جماعت کی وقتی ضرورت یا کسی وزیر کے سیاسی حامیان کی خوشنودی کے لئے قربان کر دیا جائے"۔ اسکو روکنے کے لئے گورنر کو اختیار دیا جائے گا کہ وزیر کی کسی تجویز کو وہ رد کر سکتا ہے اور بلا مشورہ مجالس قانون ساز وزیر جو کارروائی چاہے کر سکتا ہے۔ اگر ضرورت ہو گی تو وہ وزراکو برخاست کر دے گا اور مجالس قانون ساز کو توڑ دے گا۔ اور آخر میں یہ کہ "اگر وہ کوئی دوسری وزارت مرتب کرنے میں کامیاب نہ ہوا جو آئین و انتظام (نظم و نسق) کو انھیں اصول پر چلائے جو اس کی خصوصی ذمہ داریوں کے منشاء کے مطابق ہے تو پھر وہ مجبور ہو گا کہ دستور کی شکست کا اعلان کر دے اور ان تمام اختیارات کو اپنے ذمہ کرلے جو اس کے نزدیک صورت حال کی اصلاح کیلئے ضروری ہیں"۔ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ خفیہ پولیس ہر صوبے میں وزارت کے حدود اختیارات سے باہر ہو گی، اور اس کا تعلق ایک مرکزی محکمہ خفیہ پولیس سے ہو گا جو براہ راست گورنر جنرل کے ماتحت ہو گا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ گورنران کی مطلق العنانی صوبجات میں بالکل مکمل ہو گی مجالس قانون ساز اور وزرا انھیں کے رحم و کرم پر ہوں گے اور وہ لوگ اپنے محدود اختیارات اور وسائل سے ہر صوبہ میں سامراجی نظام کی جڑوں کو مضبوط بنائیں گے۔

احتجاج

متذکرہ تجزیہ سے یہ صاف ظاہر ہو گیا ہوگا کہ مجوزہ دستور مع اپنے جملہ تحفظات خصوصی ذمہ داریوں اور گورنران و گورنر جنرل کے مزید اختیارات کے سامراجی جبر و تشدد کا ایک نیا حربہ ہے اور ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کے لئے ایک نئی تدبیر ہے۔ تمام اختیارات خواہ وہ قانون سازی کے یا مالیات کے متعلق ہوں یا عدالت فوج اور پولیس کے متعلق، وہ سب سامراجی کل پرزوں کے ہاتھ میں مرکوز رہیں گے۔ علاوہ ازیں رجعت پسند جاگیردار طبقہ یعنی زمینداروں اور دیسی ریاستوں کی قوت کو منظم اور مستحکم کیا جائے گا، تاکہ ان کا رشتہ اتحاد سامراج کے ساتھ جوڑا جائے۔

جدید دستور کے آغاز سے ملک کی آزادی کے لئے قومی جدوجہد کا ایک نیا دور شروع ہو گا برطانوی سامراج چونکہ قومی تحریک کو دبانے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے اس لئے وہ اپنی گرفت کو اس ملک کے مستقل حقوق رکھنے والوں کی کھلم کھلا امداد سے اور زیادہ مضبوط کرے گی۔ اس لئے بہت سے مسائل اور زیادہ صاف اور واضح ہو جائیں گے۔ ایک طرف تو سامراج اور جاگیردار طبقہ ہو گا جو یہ طے کر چکا ہے کہ باشندگان ہند کی ہر اس خواہش اور کوشش کو ناکام بنایا جائے جو معاشی اور سیاسی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے کی جائے اور دوسری طرف وہ تمام عناصر ہیں، جو فاقہ مست ہیں اور جنھیں خوب لوٹا گیا ہے یعنی کسان، مزدور اور متوسط طبقے جو موجودہ سامراجی نظام سے نجات حاصل کرنے کی کوشش اور جدوجہد کر رہے ہیں۔

سامراجی اور جاگیرداری اتحاد کو موثر طریقہ پر شکست دی جا سکتی ہے اگر سامراج کی مخالف تمام قوتیں کانگریس کے اندر مجتمع اور متحد ہو جائیں۔ اس لئے ان تمام لوگوں کو جو سامراج کا شکار ہوئے ہیں اپنے اختلافات کو دور کر دینا چاہیئے تاکہ اس جدید مطلق العنانی کا مقابلہ کیا جائے، جس کی ابتدا نئے دستور سے ہونے والی ہے۔ قومی آزادی کی تحریک کی جڑیں قوم کی سیاسی اور معاشی علتوں میں ہونا چاہیئے اور اس کی قوت کا سرچشمہ اس جدوجہد میں ہونا چاہیئے جو ان علتوں کے خلاف کی جائے اس طرح سے اسکی قوت میں اضافہ ہوگا اور مقاصد میں صفائی پیدا ہو گی۔

انتخاب کے معرکہ میں ایک اچھا موقع ملتا ہے کہ عام باشندگان میں سامراج کے خلاف احساس پیدا کیا جائے اور قومی مطالبات کو عام طور پر پھیلایا جائے۔ مجالس قانون ساز کے اندر دستور کی سامراجی نوعیت کا بھانڈا اس طرح پھوڑا جاسکتا ہے کہ کسانوں کے مطالبات، مزدوروں کے مطالبات، اور غریب متوسط طبقہ کے مطالبات. غرض عام باشندگان کے مطالبات کو زور دیکر پیش کیا جائے۔ لیکن اس رجحان کو بہرحال روکنا ضروری ہے کہ انتخابات اور پارلیمنٹری پروگرام کو اصل مقصد سمجھ لیا جائے انھیں تو ایک بڑی لڑائی کا صرف ایک حصہ سمجھنا چاہیئے۔ اور جدید دستور کے خلاف زیادہ سے زیادہ شدید اضطراب اور بے چینی پیدا کرنے کا ایک ذریعہ بنانا چاہیئے اس کے علاوہ یہ صاف طور پر سمجھ لینا چاہیئے کہ حقیقی جدوجہد مجالس قانون ساز کے باہر ہو گی اور مجالس کے اندر مخالفت کا موثر ہونا بالکل اس مخالفت پر موقوف ہے جو باہر عام باشندگان کی طرف سے ہوگی چنانچہ باہر کی قوت اتنی زیادہ بڑھنا چاہیئے کہ لاکھوں نہیں کروروں انسانوں تک وہ پہنچ جائے اور ان میں سامراج اور اس کے اتحادیوں کی مخالفت کے لئے ایک حرکت پیدا ہو جائے۔

باشندگان ہند کی طرف سے سامراجی دستور کا جو بدل تجویز کیا گیا ہے؟ (مجالس آئین ساز اس مطالبہ پر سامراج کی مخالف جملہ قوتوں کو مجتمع ہو جانا چاہیئے اور اسی کو قومی تحریک کا سیاسی نعرہ بنانا چاہیئے۔ یہ بہرحال اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ مجلس آئین ساز صرف باشندگان ہند کی اپنی قوت سے پیدا ہوسکتی ہے اور سامراجی اثرات سے اس کو پاک اور آزاد ہو جانا چاہیئے۔ چونکہ اس کے انتخاب میں ہر عاقل و بالغ کو عام طور پر حق رائے حاصل ہوگا اس لئے یہی نہیں کہ مجموعی حیثیت سے باشندگان ہند کی خواہش آزادی کا اظہار ہو گا بلکہ ان کی فرمانروائی اور حاکمیت کے قیام کی طرف ایک قدم اٹھایا جائے گا۔

صحافت کے ذریعے سے

ہندوستانی ذہنیت میں زبردست انقلاب پیدا کرنے کی اُردو زبان میں پہلی کوشش

کلیم
دہلی

زیر ادارت شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

ہر صاحب عقل ہندوستانی کو جو اس دور کے رجحانات سے واقف ہے اس امر
کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے
اگر آپ کو اس مقصد عظیم سے ہمدردی ہے تو "کلیم" کی خریداری منظور فرما کر
ملک کے ارباب فکر کا ہاتھ بٹائیے - اور سنجیدہ علمی اور ادبی مضامین کے دوش بدوش
"کلیم" میں وہ سب کچھ بھی ہوگا جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
علاوہ ازیں شاعر انقلاب کا تازہ بتازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شائع ہوتا ہے
عمدہ تصاویر سے مزین، کتابت و طباعت دیدہ زیب، رنگین سرورق۔

سالانہ چندہ چھ روپے   ششماہی تین روپے آٹھ آنے

نمونے کے پرچے کے لئے ۹/ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

منیجر "کلیم" اکبر منزل، اجمل روڈ قرولباغ، دہلی

مکتبہ جامعہ کی نئی کتابیں

المدنیۃ والاسلام

یہ کتاب علامہ مصر محمد فرید وجدی کی مشہور تصنیف ہے۔ از مولوی رشید احمد صاحب انصاری مرحوم اب مکتبہ جامعہ نے اس کے تمام نسخے مجلد کرکے نہایت نفیس گردپوش DUST COVER کے باوجود قیمت صرف دو روپیہ (۲) کردی ہے۔ المدنیۃ والاسلام میں ثابت کیا گیا ہے اسلامی تمدن اور اصول وقوانین انسانی ترقی کے لئے ایک مفید چیز ہیں۔ قیمت دو روپے عہ

میری کہانی

پنڈت جواہر لال نہرو کی آپ بیتی کا اردو ترجمہ ہے۔ انگریزی میں یہ کتاب شائع ہوتے ہی تمام ہزار فروخت ہوگئی اردو میں ہندوستان کی اور سب زبانوں سے پہلے چھپی۔ ترجمہ نہایت سلیس اور شگفتہ ہے۔ کتاب ایک ہزار صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے۔ بلاک کی چودہ تصویریں ہیں اور دو خوشنما جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ قیمت مکمل مجلد چار روپے۔ للعہ

شعلہ و شبنم

اسلامی شان وعرب کے خون کھولا دینے والے واقعات، بادۂ مرجوش کی سرمستیوں اور گلہائے نورس کے معرج پر دو نظموں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دے گا۔ شاعر انقلاب کا یہ لافانی شاہکار غیر مطبوعہ کلام ہی رہا ہے۔ کتاب مجلد ہے اور نہایت خوشنما گردپوش سے آراستہ

تاریخ فلسفۂ اسلام

مشہور جرمن فلسفی، ٹ، جے دی بوئر کی مقتدر تصنیف کا اردو ترجمہ، از جناب ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے، پی ایچ ڈی، یہ کتاب کچھ ترمیم و اضافے اور نظر ثانی کے بعد چھوٹے سائز پر نہایت خوشنما جلد کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ اس میں اسلامی فلسفے کی نشوونما، یونانی، عربی علوم، فلسفۂ فطرت، یونانی و اسلامی حکماء، مشرق میں فلسفے کا انحطاط، وغیرہ پر کارآمد مباحث۔ قیمت دو روپے عہ

پستالوزی

از ڈاکٹر قاضی عبد الحمید صاحب لیکچرر جامعہ، ایم اے، پی ایچ، ڈی (برلن)، پستالوزی نے تعلیم کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ اس کتاب میں پستالوزی کی زندگی اس کے فلسفۂ تمدن۔ اس کے تعلیمی نظریے اور تعلیمی کارنامے اور ان کی تفصیل سلیس زبان، اور دلکش انداز بیان میں ملاحظہ فرمائیے۔

ورس ادب اگر بود زمزمہ محبتے ۔ جمعہ بہ مکتب آورد طفل گریز پائے را

قیمت مجلد عہ

تاریخ الامت

ابتدائے رسالت سے آخر زمانۂ خلافت عثمانیہ تک تمام قرونِ علوم اور مسلمانوں کے کارناموں کا ذکر نہایت سلیس اور دلچسپ عبارت میں کیا گیا ہے۔

اسلامی تاریخ کا یہ سلسلہ مولانا حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری نے بڑی جانفشانی اور تحقیق سے مرتب فرمایا ہے۔ ملک کی متعدد یونیورسٹیوں اور کالجوں میں داخل نصاب ہے۔ بالخصوص ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلباء کے لئے نہایت مفید ہے۔ طباعت و کتابت نہایت عمدہ

حصہ اول	سیرۃ الرسول	قیمت	[illegible]	مجلد	[illegible]
حصہ دوم	خلافت راشدہ	"	[illegible]	"	[illegible]
حصہ سوم	خلافت بنی امیہ	"	[illegible]	"	[illegible]
حصہ چہارم	خلافت عباسیہ	"	[illegible]	"	[illegible]
حصہ پنجم	عباسیہ بغداد	"	[illegible]	"	[illegible]
حصہ ششم	عباسیہ مصر	"	[illegible]	"	[illegible]
حصہ ہفتم	خلافت عثمانیہ	"	[illegible]	"	[illegible]

نوٹ: جو صاحب یہ مکمل سلسلہ یکمشت طلب فرمائیں گے ان کو براہ راست مجلد پیش کیا جائے گا اور قیمت غیر مجلد کی لی جائے گی۔ جلدیں نہایت اہتمام کے ساتھ اچھے مضبوط کپڑے کی تیار کرائی گئی ہیں جس پر کتاب اور مکتبہ جامعہ کا نام بلاک سے چھپوایا گیا ہے۔ جلد پر ایک خوبصورت خاکی کاغذ کا کور بھی ہے اس کی طباعت بھی بلاکوں سے کی گئی ہے۔

حصص اول و دوم طلباء کی ضروریات کے خیال سے چھوٹے سائز پر بھی شائع کئے ہیں اور ان کی قیمت ہر ایک کی ایک ایک روپیہ ہے۔

مکتبہ جامعہ دہلی

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے پی ایچ ڈی

جلد ۲۸	ستمبر سنہ ۱۹۳۷ء	نمبر ۳

فہرست مضامین

۱ شمالی ہند کے دیہاتی شعراء میں جدید انقلابی رجحانات (۲)	جناب سید مطلبی۔ فرید آبادی	۶۹۹
۲۔ ہندوستان کا کسان	پروفیسر محمد عاقل صاحب ایم اے (علیگ)	۷۰۷
۳۔ ہندوستان میں مزدور تحریک	جناب ریاض الدین صاحب ایم اے	۷۱۵
۴۔ عہد حاضر کا فلسفہ (۲)	مرزا محبوب بیگ صاحب	۷۳۱
۵۔ مسلمان اور کانگرس	ایک مسلمان	۷۴۷
۶۔ غزل	حضرت نشتر سندیلوی	۷۵۴
۷۔ تنقید و تبصرہ		۷۵۵
۸۔ رفتار عالم	شمالی افریقہ، الجزائر، مراکش عراق، ترکی، ایران فلسطین، مویشیوں کی نسلی اصلاح۔ کانگرسی وزارتیں، شمالی یورپ، چینی جاپانی تعلقات	۷۶۳
۹۔ تعلیمی دنیا	محمد عبدالغفور صاحب ایم اے۔ علیگ	۸۰۰

قیمت سالانہ پانچ روپے (صہ)   فی پرچہ آٹھ آنے (۸)

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس، دہلی

شمالی ہند کے دیہاتی شعراء میں جدید انقلابی رجحانات

(بہ سلسلہ گذشتہ)

سعداللہ میوات کا بہت پرانا اور اعلیٰ درجے کا شاعر ایک دوہے میں کہتا ہے جو آدمی اپنی ذات کو گروہ سے وابستہ نہیں رکھتا اور اس کے سو دوست اور پچاس دشمن نہ ہوں اس کی پیدائش ہی بے کار ہوئی۔

جاکے سَنّو ساہو نہیں بیری نہیں پچاس
ماتا ایسے پتر سے توکیوں بوجھوں مری نواس

کھکے بھی ایک پرانا میواتی شاعر ہے وہ کہتا ہے کہ غربت سے زیادہ ذلیل کرنے والی کوئی چیز نہیں ہے۔

دوہا

ٹوٹو[1] ایسی چیز ہے جیسے کتا کا ہبڈو[2] نو
کہیں سول جائے ٹوک کہیں سے ہو جاوے ترکو[3]

دوہا

ٹوٹے بیری تو برو ، تو پے چلے نہ گھات
سگھڑن کی اگھڑن لگے کوڑھن[4] کی سی بات

ایک دوہے میں کہتا ہے کہ اگر عقل ہو تو دولت بھی ہونی چاہئے۔ دولت، عقل دونوں کا نہ ہونا بڑا غضب ہے۔

دوہا

چترائی دے تو دھن دیجئے نا ترا نپی چترائی بھی لے
چترائی اور نا دھنا سائیں دونوں دکھ مت دے

ایک دوہے میں کہتا ہے کہ دوسروں کے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا تو مردوں

---

[1] مفلسی [2] دھکے کھاتا پھرنا [3] نکالا جانا [4] بے وقوف

اور ناخلفوں کا کام ہے اور خود اپنے بنائے ہوئے راستوں پر چلنا بہادروں، شیروں اور صحیح النسب لوگوں کا کام ہے۔

دوہا

لیک لیک گاڑی چلے، لیک ہی چلے کپوت
یہ تینوں اونٹ چلیں سوڑا[۲]، سنگھ سپوت

جدید دیہاتی شاعروں میں شب لال ساکن کوٹ علاقہ میوات ہی جو اپنی ایک چوپئی میں اہلکاروں کے حالات اس طرح بیان کرتا ہے۔ یہ اقتباس پوری چوپئی کے بجائے اس کا ایک حصہ ہے

دوہا

سن لے دھر کے دھیان میں کروں بیان حقیقت ساری
بے[۳] یا پولیس میں کر رہے تھانیداری
مقدم، چوکیدار ٹکے کے یار جلم پٹواری
رشوت کھا سلٹی کی الٹی کر ڈاری

چوپئی

نا یہ رحم کریں کائی پے ‌ ‌ بھونٹی[۴] کر دھریں بھائی پے
اپنی ناچ کیں آئی پے ‌ ‌ جھونٹی سوں[۵] کھا جائیں بائی پے

شعر

نیت بگڑی سبن کی جتنے اہلکار ہیں
بے بات کریں کید[۶] اور جرمانے کو تیار ہیں
دے کر رشوت چھٹالاؤ یہی ان کار ہے
شرم کاہی کو نہیں چاہے کہاس رشتہ دار ہے

---

[۱] بے راہ [۲] سورما، بہادر [۳] بے حیا [۴] کند [۵] قسم [۶] قید

ٹپکا

ہے پیسہ کی لاج چاہے محتاج ناگھر میں ناج

ہوئے پیسہ اُن کو تیار نہ سمجھیں ست است میں

چھند ہریانہ

ایک بات اور نئی سُناؤں سبھی سنو سرداری

اُڑگئی رے دیس اپنے سے ساہوکاری

دھریں بیاج پر بیاج ناکریں لحاج رکم ہوئے بھاری

وہ بیٹے ناپستوں پشت اسامی ہاری

ٹپکا

دیکھو آنکھ پسار، دھرم کی ہار، پاپ سرذا

سبن کے اوپر ہوا سوار نا کلا[۱] رہی ہے مت میں

کوٹ (علاقہ میوات) کے ایک بالکل نوخیز شاعر موج خاں کے دو بھجن ہیں یہاں نقل کرنے کے قابل معلوم ہوتے ہیں:۔

بھجن نمبر ۱

بج رہے پاپ کے ڈھول دُکھ پارہے بھارت باشی

جھوٹے جال پولیس پھیلادے | بن کا نون سفر ٹھیرا دے

رستہ گیر کو جال لگا دے | ایک سونو کے بولے بول جب ہتھکڑی بھرے کھاسی[۲]

کھ پارہے بھارت باشی

بیٹھے رہیں جو اپنے گھر میں | مکتی نہیں مال اور جبر میں

وہ بھی کر دے دس نمبر میں | اُن پر بنا کھتا[۳] دیا ڈھول مجھ سُن سن آوے ہانسی

---

[۱] تاثیر، قوت تاثیر [۲] خاصی [۳] خطا

دکھ پار ہے بھارت باشی

تین روپے جو لیں رپٹ کے — یہ مجھو دیکھے ہیں کھاس کپٹ کے

آنکھ لال کرتے ہیں ہٹ کے — مارن کو ہیں رول[۵] تھانے والے ستیاناسی

دکھ پار ہے بھارت باشی

سیدھی نہیں چلت باٹ ہیں — کسانن کا گلا کاٹ ہیں

دیواں سری کے بنے لاٹ ہیں — جن کا دو پیسے کا مول کتے بنے پھریں چپراسی

دکھ پار ہے بھارت باشی

بج رہے پاپ کے ڈھول دکھ پار ہے بھارت باشی

بھجن نمبر ۲

دکھ پار ہے بہت کسان پٹواری لگے ستاتے

جب پٹواری جمع اگھاتے — تین روپے کے آٹھ بتاتے

بنا کام کی رشوت کھاتے — نیک نہ کرتے کام گو وڑے باندھ لٹھ پر جانے

پٹواری لگے ستانے

تہر کے منشی کریں صفائی — تگنی ، چوگنی کریں بھرائی

گرداور نے رشوت کھائی — چھوٹے سے اک کھیت پر ، لگے مال مفت میں کھانے

پٹواری لگے ستانے

زمیندار پر ہے کنگالی — بری مصیبت کھدلانے ڈالی مات پتا بچے گھروالی

جن نے رات دن پڑے کمانے — نہیں ملے وقت پر کھانے

پٹواری لگے ستاتے

۵؎ رول (لائن کھینچنے کا)

ٹھگی ۔ جال حاکم کے چھایا   گلُوکال نے کھیل دکھایا
جس سے دکھ پاتی ہے رعایا   لیں مفت گھاس اور دانے
پٹواری لگے ستانے

دکھ پا رہے بہت کسان پٹواری لگے ستانے

اننت لال ساکن انکھیر (نواح ۔ فرید آباد) کا شاعر ہے اس کا تازہ بھجن قابل ذکر ہے

بھجن

مرے ہم کیوں نا دکھیا دیں کسان ؛
جو طرفہ سے دکھ کے بادل ہمارے اوپر امنڈ رہے
کوئی ہوا نہیں جو انھیں ہٹا دے امنڈ امنڈ کر گھمنڈ رہے
گرج گرج کر شور مچا دیں ۔ سن سن کر ہم ڈرن لگے
دکھ روپی اولوں کے بھئے سے بنا موت مرن لگے
کبھن کہاں سے آئے گا یہ پھکر رات دن کرن لگے
جب کوئی نہیں سہارا دیکھے دھیان ہری کا دھرن لگے
شاید رکھشا کرے ہماری دین بندھو بھگوان
مرے ہم کیوں نا دکھیا دیں کسان ؛

کھیتی باڑی کرنا بھائیو ہمیشہ
اور دوسرا اپسو پالن اُن سے ہی فقط گذارا ہے
اس سے ہی بھارت کا چلتا سارا ساہوکارا ہے
ان ساہوکاروں کے بس مٹھی میں جان ہماری ہے
ران ہی کے لئے کہتے ہیں جو کچھ کھیتی کیاری ہے

علی الحساب سبھی لے جاویں جو ہو پیداواری ہے
پھر بھی ان کا سود پٹے نا رقم بنی آہی ساری ہے
ہمارے نہیں ناج کا دانہ ان کے بھرے مکان
مرے کیوں نہ دکھیا دین کسان ہو

گھر پھر بچے بھوکے روویں ساہوکار پہ جاتے ہیں
آج نہیں ہے پھر لے لینا ہم کو سو بات بناتے ہیں
بھوکے مرکر گھاس پھونس کھاکتنے ہی روز بتاتے ہیں
جوڑے ہاتھ گڑگڑائے پھر مہر ساہ کو آئی ہے
پچھلا میرا سود پٹا دو بس لو میرے بھائی ہے۔
بیل، بھینس اور گائے ہیں دو پھر یہ بات اڑائی ہے
وہ بھی ہم نے لگا دئے بس گھر کی کری صفائی ہے
باجے جوت پڑا ہے دنیا باقی سارا لگان
مرے ہم کیوں نہ دکھیا دیں کسان

نمبردار چڑھے چھاتی پے گالی دے نت پٹواری
اور تیسرے دن دیتا ہے جیل وارنٹ دھکی نیاری
... لگان بھرو نہیں بہت ہو تھاری کھاری
چپراسی کو بلا بلا کر بس ہم کو پٹواتے ہیں
برتن بھانڈے بیچ انھیں دے اپنی جاں بچاتے ہیں
پھر بھی نہیں لگان پٹا پھر یہ وارنٹ کراتے ہیں
ہیں جیل میں ٹھونس پھیر گھر در نیلام کراتے ہیں
پھر بھی روزی داتا دنیا کے ہم مانے جاتے ہیں

ذ بلدار

تنے پر بھی نہیں نکلتے پا پی بے یا پران -
مرے ہم کیوں نہ دکھیا دیں کسان

ذری دآتا بھوکے مرتے ، کرتے موج بھکاری ہیں
ہمارے چھپر نہیں رہنے کو اُن کے محل اٹاری ہیں
ہمارے پیسے سے اُن کے موٹر کار سواری ہے
چالاکوں کے مجّے یہاں سیدھوں کا جینا بھاری ہے
قلاقند کھائیں وہ امرتی ، دیکھ دیکھ ہم للچائیں
بھاگ کا دوش بتاکر ، من مار مار کر رہ جائیں
سر پر جوتی پڑیں سینکڑوں ، کیا مجال کچھ کہہ جائیں
ہم کو بے ایمان گنوار کہیں سن کر سب کی سہ جائیں
انت لال کہے مکاروں کی ، چل رہی خوب دکان
مرے ہم کیوں نہ دکھیا دین کسان

وہ کلام جن کے کہنے والوں کا سراغ نہیں ملتا مندرجہ ذیل ہے۔ جس میں سب سے پہلے ایک ٹیسو کا گیت نقل کیا جاتا ہے جو بچپن سے آج تک سنتے ہوئے عمر گذری ہے۔ ذرا اس کا تمسخرانہ انداز بیان بھی ملاحظہ ہو:۔

ٹیسو

اک بنئے کی کہا حال کہوں ، جیسے ڈونڈ[۵] پہاڑی کا
اسّی گز کی انگیا پہنے کچھ نا بدن بچاری کا
دو سو گز کا لہنگا باندھے نا جک بدن بچاری کا

---

۵ ٹرے ۵ ناف

چار کھیت گا جبر کے کھا گئی، گجرا کھا گئی کیاری کا
کچھ نہ بدن بچاری کا۔ ناحک بدن بچاری کا
سود میں گاؤں بیٹھی کھا گئی، پیٹ پھٹا ناداری کا
کال سے دنیا بھوکی مر گئی، وصن ناگھٹا ہتیاری کا
اک بنئے کی کا حال کہوں جیسے ٹونڈ پہاڑی کا
چار چرس پانی کے پی گئی سانس نہ ٹوٹے داری کا
کوٹھے اوپر موتن بیٹھی، مل لوٹا بنجاری کا
تین گھر جاٹن کے بہہ گئے، چوتھا گھر بھٹیاری کا
کچھ نہ بدن بچاری کا، ناحک بدن بچاری کا

ایک شاعر نے بیان کیا ہے کہ کس طرح زمیندار زمین دیتے وقت کسان سے فریب کرتے ہیں اور وصولی کے وقت سختی، جس سے کسان برباد ہو جاتے ہیں۔

برسو سا ڈھو مینہہ مکدم میٹھا بولے

بٹہ تو سا کیا سمجھ کیا انعام   آیا موسم کاتک کا تو بکے مانگے دام
سب کچھ مانگے دام رام تینے کیسی کینی   پاگ پچھوڑی بیچ گا سٹھ کی بدیا دینی

ان جملہ اقتباسات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دیہاتی دنیا میں عرصے سے یہ تلاش ضرور جاری ہے۔ کہ ساہوکاروں کی لوٹ اور اپنی فاقہ کشی کا حل کیا ہے۔ مذہب اُن کے نزدیک ان مشکلات کا قابلِ عمل حل پیش کرنے سے قاصر ہو گیا۔ ساہوکار اور بڑے بڑے زمیندار کوئی حل ڈھونڈھنا نہیں چاہتے اور ان کے خیال میں سرکاری اہلکار بھی ان ہی کے زمرے میں شامل ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ سب اُن سے زیادہ سے زیادہ استفادہ حاصل کرنا اور روپیہ والا بن جانا چاہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ ہماری نظر سے اب تک کسی دیہاتی شاعر کا ایسا کلام نہیں گذرا ہے جس میں کوئی حل پیش کیا گیا ہو۔ لیکن وقت آگیا ہے کہ۔ دیہات سے ایسے شاعر نکلیں جو اس مشکل الجھن کا کوئی حل پیش کریں ۔

ہندوستان کا کسان

ذیل کا مضمون ایف ، ایم ، ڈی میلو کے ایک مضمون سے اخذ کیا گیا ہے

جو امریکہ کے رسالے کرنٹ ہسٹری بابت جون [illegible] میں شائع ہوا ہے

سرکار کی طرف سے جو کتابیں ہندوستان کے اسکولوں کے نصاب میں داخل کی جاتی ہیں ان میں برطانوی عہدِ حکومت کی برکات کا دل کھول کر تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اور ان میں خصوصیت کے ساتھ برطانوی عہد کے امن و امان کو خوب سراہا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ آج کل جنگوں و قتل و غارت گری سے ہندوستان کو نجات مل گئی ہے۔ لیکن بھوک سے سسک سسک کر جان توڑنے کی لعنت و مصیبت اب بھی باقی ہے

ہندوستان کسانوں کا ملک ہے۔ اس لئے ہندوستان کی مرفہ الحالی کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ یہاں کا کسان مرفہ الحال ہو۔ لیکن جب تحقیقات کی جاتی ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی معاشی حالت روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔ خصوصاً جب سے زرعی اشیائی قیمتیں گرنا شروع ہوئی ہیں۔ اس وقت سے تو کسان کی حالت بہت ابتر ہو گئی ہے۔ زمینداروں اور ساہوکاروں کے خلاف جذبہ بڑھتا جا رہا ہے جسے قوم پرست جماعتیں حکومت کی مخالفت میں استعمال کر رہی ہیں۔

معاشیات کے ایک ماہر نے بیان کیا ہے کہ گذشتہ سو سال سے دنیا کی غذا جس قیمت پر فراہم کی جا رہی ہے وہ لاگت سے (اگر لاگت میں اس کے تمام ضروری عناصر کو شامل کیا جائے) کم ہے مغربی ملکوں کی سرمایہ دارانہ زراعت پر ممکن ہے یہ قول صادق آئے یا نہ آئے لیکن ہندوستان کی زراعت کے بارے میں اس کی صداقت میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ ہندوستان کے کسان کو زراعت کے کاروبار میں خسارہ ہی خسارہ ہے۔ برسات مشتبہ اور غیر یقینی ہوتی ہے۔ مویشی کثرت کے ساتھ مرتے رہتے ہیں۔ قیمتوں میں تلون کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زراعت میں نفع کی صورتیں کم

اور نقصان کی بہت زیادہ ہیں۔ ہندوستان کے لوگ نقصان کے باوجود اس پیشے سے محض اس لئے لگے ہوئے ہیں کہ زندگی بسر کرنے کا اس کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے۔

پیداوار کی کمی | غذا کی فصلوں کو پیدا کرنے سے جو خالص بچت کسان کو معمولی سالوں میں ہوا کرتی تھی وہ عموماً بہت کم بنی ہوتی تھی۔ لیکن جب سے قیمتیں گر کر اپنی موجودہ حالت کو پہنچی ہیں اس وقت سے تو بچت کی جگہ کسان کو صاف اور کھلا ہوا نقصان ہو رہا ہے۔ کسان کی جوت میں جو آج رقبہ ہے اس پر صدیوں سے کاشت کا سلسلہ جاری ہے۔ اس لئے زمین کی قدرتی زرخیزی سے جتنا انتہائی کام لیا جا سکتا تھا وہ لیا جا چکا ہے۔ اب اس کی زرخیزی میں اضافہ کھاد کے ذریعے سے کیا جا سکتا ہے لیکن کسان زمین میں کھاد یا تو اس لئے نہیں ڈالتا کہ زمین اس کی اپنی نہیں ہے یا اس لئے کہ گوبر جو سب سے سستا کھاد ہے اس کا فائدہ ایندھن کی طرح استعمال کرنے میں زیادہ ہو۔ ہندوستان کی برسات کا تلون مشہور رہے۔ اگر ایک سال خشک سالی ہوتی ہے تو دوسرے سال سیلاب آجاتے ہیں۔ آبپاشی کے انتظام سے جزئی طور پر اس کی کچھ تلافی ہوتی ہے۔ حکومت نے تقریباً ایک ارب پچاس کروڑ روپیہ، تین کروڑ ایکڑ غیر مزروعہ رقبے کو کاشت میں لانے کے لئے صرف کیا ہے۔ لیکن آبپاشی شدہ رقبہ کا تناسب اب بھی بہت کم ہے پھر ایک طرف تو پانی کی رسد ناقابلِ اعتماد ہے۔ دوسری طرف اولے، پالے، جنگلی جانوروں، ٹڈیوں، چوہوں اور دوسرے موذی جانوروں سے پیداوار کو نقصان پہنچتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کاشت کے طریقے بھی دقیانوسی ہیں۔ جو اوزار استعمال کئے جاتے ہیں مثلاً لکڑی کا ہل اور ہنسیا وہ بہت ہی ابتدائی اور قدیم ہیں۔ غلے کی گہائی یا ہاتھ سے کی جاتی ہے یا لکڑی سے پیٹ کر یا بیلوں کے کھروں کے نیچے روندا کر۔ جدید آلات کے خریدنے کے لئے کسان کے پاس روپیہ نہیں ہوتا۔ مویشیوں کی نسل کشی بلا امتیاز کی جاتی ہے۔ بیمار مویشیوں کو الگ نہیں رکھا جاتا جس سے ان میں امراض اور وبائیں پھیلتی ہیں۔ پھر ایک فصل کاٹنے کے بعد کھیتوں کو عرصے تک پرتی یا خالی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ بے کار مویشیوں کو جیو ہتیا کے خوف سے مارا نہیں جاتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ میں تو مویشی کا وزن اوسطاً چودہ سو پونڈ ہوتا ہے لیکن ہندوستان میں چار سو سے سات سو پچاس پونڈ تک

ہوتا ہے۔

اوپر کے بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ کسان کی مشکلوں کا سبب (اگرچہ ان میں سے بعض اس نے اپنے لئے خود پیدا کی ہیں) پیداوار کی کمی ہے۔ ہندوستان میں فی ایکڑ صرف ۱۳ بشل گیہوں پیدا ہوتا ہے حالانکہ انگلستان میں گیہوں کی پیداوار ۳۱ بشل اور ڈنمارک میں ۴۹ بشل فی ایکڑ ہے۔ ہندوستان میں فی ایکڑ ۹۰۰ پونڈ چاول پیدا ہوتا ہے لیکن امریکہ میں ایک ہزار نوے اور جاپان میں دو ہزار ستر پونڈ۔ ہندوستان میں فی ایکڑ ۹۰ پونڈ روئی پیدا ہوتی ہے لیکن امریکہ میں ۱۲۱ پونڈ اور مصر میں ۲۵۳ پونڈ۔ ہندوستان کے ایک ماہر معاشیات نے تخمینہ کیا ہے کہ برطانوی ہندوستان میں پیداوار کا اوسط فی ایکڑ جس میں آبپاشی شدہ فصلیں بھی شامل ہیں جاپان کے مقابلے میں صرف ⅓ ہے۔

پیداوار کی اس کمی کے باوجود کھانے والوں کی تعداد ۳۵ کروڑ ہے اور ان میں سے ۷۰ فیصدی کو زراعت کے پیشے سے ہی اپنا گذارا تلاش کرنا پڑتا ہے۔ جس رقبے پر غذائی فصلوں کی کاشت کی جاتی ہے اس کا تناسب جب برطانوی ہندوستان کی آبادی پر پھیلایا جاتا ہے تو اس کا حصہ رسد فی کس ⅘ ایکڑ پڑتا ہے۔ پھر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء میں آبادی کی تعداد میں ۴۰ کروڑ تک اضافہ ہو جانے کی امید ہے! اس لئے صورت حال نازک ہوتی جا رہی ہے۔ چند سال گذرے ایک ماہر زراعت نے دکن کے ایک نمائندہ گاؤں کی حالت کا مطالعہ کر کے دریافت کیا تھا کہ زمین کے مالکوں میں صرف ۸ خاندان ایسے تھے جنھیں اپنی زمین سے کافی آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ ۴۲ ایسے تھے جو زراعت کے علاوہ دوسرے ذرائع سے اپنی آمدنی میں اضافہ کر کے محض گذارے کے لائق کما رہے تھے اور ۷۶ خاندان ایسے تھے جو سخت افلاس میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان مہاراجوں اور لکھ پتیوں کے باوجود جو دنیا کی اسٹیج پر موروں کی طرح دم چھیڑ کر ناچتے اور اپنے پروں کی چمک دمک دکھلاتے ہیں ہندوستان غریبوں کا ملک ہے۔ لوگوں کی غذا سے ان کی معاشی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ کرنل میک کیرسن کی ہندوستان میں غذائی تحقیقات کا کام کر رہے ہیں انھوں نے جب ملک کی آبادی کے خاص خاص گروہوں مثلاً سکھوں، مرہٹوں، پٹھانوں، گورکھوں، بنگالیوں

اور ہندوستانیوں کی غذا کے بارے میں تحقیقات کی تو اس سے بعض دلچسپ حقائق ظاہر ہوئے جب مختلف گروہوں کی غذاؤں پر تجربہ چوہوں کو کھلا کر کیا گیا تو اس آزمائش سے سکھوں اور بنگالیوں کی غذا کا فرق نمایاں طور پر ظاہر ہو گیا جن چوہوں نے سکھوں کی غذا کھائی تو تندرست، چاق و چوبند اور امن پسند بن گئے۔ لیکن جنھوں نے بنگالیوں کی غذا کھائی اُن کی تندرستی خراب اور اُن کا مزاج سخت اشتعال پذیر ہو گیا۔ اس لئے بنگال میں جس قدر سیاسی شورش ہے۔ وہ سب ناکافی غذا کی وجہ سے ہے۔ لارڈ لنلتھگو موجودہ وائسرائے نے حال میں تغذئے کے مسائل سے بہت دلچسپی کا اظہار کیا۔ انھیں تحقیقات سے معلوم ہوا کہ صرف ۴۰ فیصدی آبادی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے کافی غذا ملتی ہے۔

انسانی عنصر انسانی عنصر ظاہر ہے سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں، اسی کو سب سے زیادہ نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کسان جن حالات میں کام کرتا ہے وہ سخت ہمت شکن اور حوصلہ فرسا ہیں۔ اسے نہ صرف پیداوار کی کمی کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ زمیندار، ساہوکار اور سرکاری ملازم سب اس کی جان کے لاگو بنے رہتے ہیں۔ زمیندار ایسا لٹیرا ہے کہ فصل چاہے اچھی ہو یا خراب وہ اپنا لگان ضرور وصول کرتا ہے۔ ساہوکار اتنا لالچی ہے کہ جب وہ ضرورت سمجھتا ہے کہ کسان کو عمر بھر کے لئے اپنا مقروض بنائے رکھے تو اسے اپنے بہی کھاتوں میں جعل سازی کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا پھر سرکاری ملازموں کی بیرحمی ہے جو محاصل وصول کرنے کے سلسلے میں کسان کی سب چیزیں قرق کر لیتے ہیں اور خانماں برباد کرکے اسے دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لئے مجبور کرتے ہیں۔ یہ دیہاتی زندگی کے ایسے واقعات ہیں جن سے ہر شخص واقف ہے، کسان، جاہل، ناواقف اور ناعاقبت اندیش ہوتا ہے۔ اس کی زندگی پوری طرح اپنے ان دوست نما دشمنوں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ کسے سرکاری چپراسیوں، منشیوں اور محرروں کو جن کی تنخواہیں بہت کم ہوتی ہیں۔ رشوتیں دینا پڑتی ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے ملازموں پر بڑے افسر ہوتے ہیں جن کو اس لوٹ مار سے حصہ ملتا ہے اور اس طرح غریب کسان کو جس کا شکار کرنا بہت آسان ہے پوری طرح نوچ کھسوٹ لیا جاتا ہے۔ ساہوکار کی

معمولی شرح سود ۲۵ فیصدی سے ۷۵ فیصدی تک ہوتی ہے اس کے علاوہ کسان اپنی فصل کو ساہوکار کے ہاتھ سستے داموں فروخت کرنے کے لئے مجبور رہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اسے مزید نقصان پہنچتا ہے۔ کسان جب زمین کی حیثیت بڑھاتے ہیں یا زراعت کو ترقی دیتے ہیں یا جب اُن کی آبادی میں اضافہ ہوتا ہے تو ان سب باتوں کا نفع زمیندار کو ملتا ہے۔ کیوں کہ اسے لگان بڑھانے کا موقع مل جاتا ہے۔ ساہوکاروں کا ظلم اتنا بڑھا ہوا ہے کہ خود کاشت کرنے والے زمینداروں کے ہاتھوں سے زمینیں تیزی کے ساتھ نکلی جا رہی ہیں۔ دس سال کے اندر اندر صرف پنجاب میں محض لگان وصول کرنے والے زمینداروں کی تعداد (جو اپنی زمین کی کاشت خود نہیں کرتے بلکہ لگان پر اٹھاتے ہیں) ۶ لاکھ ۲۶ ہزار سے ۱۰ لاکھ ۶ ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ زمین کے معاملے کی اصلاح، دور حاضر کا ایک ضروری مسئلہ ہے۔ لیکن حکومت کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ کچھ سال گذرے سود کے خلاف ایک قانون بنایا گیا تھا، لیکن اس پر عمل درآمد کرانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ مالدار لوگوں کو اقتدار حاصل ہے اور حکومت ان سے بگاڑنا مناسب نہیں سمجھتی۔

نتیجہ یہ ہے کہ کسان تقدیر پرست بن گیا ہے۔ صرف حال کی باتیں سوچتا ہے اور مستقبل کو خدا کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ بات اس کی مسرفانہ عادتوں سے پوری طرح ثابت ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں دلچسپیوں کی اس قدر کمی ہے کہ جب کبھی کوئی شادی یا موت واقع ہوتی ہے تو ان تقریبوں کو غنیمت سمجھ کر وہ نہایت بے دردی سے روپیہ خرچ کرتا ہے۔ اپنی ذاتی پونجی کوئی نہیں ہوتی اس لئے قرض کے اژدہے سے معاملے کرتا ہے اور عموماً اکثر ایماندار اور محنتی کسانوں کی تباہی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ قرض کی وجہ سے ہزاروں مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ اور آخر میں ہر طرف سے ہار کر صنعتی شہروں میں کام کی تلاش میں کسان نکل کھڑا ہوتا ہے۔

ان تمام باتوں سے اس کی کارکردگی میں کمی پیدا ہو جاتی ہے صحت خراب ہو جاتی ہے اور امراض کے دفع کرنے کی قوت باقی نہیں رہتی۔ ہندوستان میں بہت سی وبائیں پھیلتی رہتی ہیں۔ مثلاً پلیگ، ہیضہ اور چیچک۔ لیکن ان وبائی امراض سے زیادہ تباہ کرنے والے وہ امراض ہیں جو مستقل طور پر موجود رہتے ہیں مثلاً ملیریا، کالا آزار، سنگرہنی، تپ دق

پیٹ کے کیچوے اور ہک ورم (HOOK WORM)۔ حکومت کی طرف سے علاج کا انتظام برائے نام ہے جو لوگ امراض میں مبتلا ہوں اور جن کے علاج کا کوئی بندوبست نہ ہو۔ ایسے لوگوں سے کھیتی اور دوسرے کاروبار میں اعلیٰ معیار کارکردگی کی توقع کرنا فضول ہے۔

جہالت کا مسئلہ دیہاتوں کی ترقی کی اگر کوئی امید کی جاسکتی ہے تو وہ تعلیم کے ساتھ وابستہ ہے لیکن یہ بیان کرتے وقت افسوس ہوتا ہے کہ صرف ۸ فی صدی آبادی پڑھنا اور لکھنا جانتی ہے۔ لارڈ مکالے کو تعلیم کے بارے میں اپنا مشہور مراسلہ لکھے ہوئے اور کپنی کو ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا وعدہ کئے ہوئے سو سال گذر گئے ہیں۔ اس کے برعکس امریکہ پر نظر ڈالئے تو وہاں کم و بیش ۵۰ سال کے عرصے میں ۹۴ فیصدی حبشیوں میں تعلیم پھیلادی گئی ہے اور جاپان نے ۴۰ سال کی مدت میں اپنی پوری آبادی کو تعلیم یافتہ بنا دیا ہے لیکن ہندوستان میں ہم دیکھتے ہیں کہ سو سال میں حکومت زیادہ سے زیادہ ۸ فیصدی لوگوں کو تعلیم یافتہ بنانے میں کامیاب ہوئی ہے۔

لیکن جب حکومت کی نصف سے زیادہ آمدنی فوج پر خرچ کر دی جائے اور جو باقی بچے اس میں سے بڑا حصہ مختلف سروسوں کے عہدہ داروں کو نذر کر دیا جائے تو اس سے زیادہ تعلیم کی توقع ہی کیا کی جاسکتی ہے۔ ہر صوبے میں جبری تعلیم کا قانون پاس ہو چکا ہے۔ لیکن یہ سب کاغذی کارروائی ہے۔ تعلیم روپیہ سے پھیلتی ہے اور سرکار کے خزانے میں اس کام کے لئے روپیہ ہی نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگ جہالت کی وجہ سے کشمکش حیات میں کم زور ثابت ہوتے ہیں۔ اور ترقی کی تمام راہیں ان کے لئے مسدود رہتی ہیں جب تک تعلیم کے ذریعے ہندوستان کے کسانوں کو نئے طریقوں کے فائدے سے آگاہ نہ کیا جائے گا اس وقت تک نہ تو کاشت کے سائنٹیفک طریقے پھیلائے جاسکتے ہیں نہ ساہوکار سے نجات دلانے کے لئے امداد باہمی کی انجمنیں قائم کی جاسکتی ہیں۔ نہ صفائی اور حفظان صحت کو ترقی دی جاسکتی ہے اور نہ امراض پر فتح حاصل کی جاسکتی ہے۔ غرضیکہ کوئی کام نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن حکومت ... سستے اور زود اثر نسخوں کی فکر میں ہے۔ چنانچہ پنجاب میں زراعتی کالج کے گریجوایٹ سرکار کے خرچ سے زمینوں پر بسائے جارہے ہیں تاکہ وہ اپنے پڑوسیوں کو پیداوار بڑھانے کا سبق دے سکیں۔

احاطہ بمبئی میں ایک تجویز ہے کہ ڈاکٹروں کو وظیفہ دے کر دیہات میں پریکٹس کرنے کے لئے مائل کیا جائے حکومت دیہات میں بہت سے ریڈیو اسٹیشن قائم کرنے کی تجویز پر غور کر رہی ہے تاکہ سوویٹ روس کی طرح ریڈیو کے ذریعے تعلیم بالغان کو ترقی دے سکے۔ مگر ریڈیو کا سٹ خریدنا کسان کے بل بوتے سے باہر ہے اس لئے حکومت کو سرکاری روپے سے کسانوں کے لئے رسیونگ سٹ فراہم کرنا ہوں گے۔

دیہات کی بے کاری دیہات کا ایک دوسرا بڑا مسئلہ بے کاری ہے کسان کم سے کم تین مہینے ضرور بے کار رہتا ہے۔ علاوہ ازیں محنت کو پس انداز کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی اور زمین کو ہزاروں ایسے بیکار لوگوں کی پرورش کرنا پڑتی ہے جن کی محنت بے فائدہ سال کے صرف چند مصروف دنوں میں ہی حاصل کیا جاسکتا ہے۔ پرانے زمانے میں اس زائد آبادی کو دیہاتی صنعتوں۔ مثلاً پارچہ بافی، دری بافی، کپڑے کے کام وغیرہ میں مصروف رکھا جاسکتا تھا۔ لیکن جب سے برطانیہ اور بعد میں جاپان نے اپنا ساماں ہندوستان کی منڈیوں کو بھجنا شروع کیا ہے۔ تمام مقامی صنعتیں تباہ ہو گئی ہیں۔ ہندوستان میں بڑے پیمانے کی چند صنعتیں ہیں۔ مثلاً سوتی پارچہ بافی کے کارخانے، لوہے اور فولاد کے کارخانے، شکر کے کارخانے لیکن ان کا وجود محض تائیدی محاصل کی وجہ سے قائم ہے اور اُن سے دیہات کے لاکھوں بے روزگاروں کے لئے کام نہیں نکل سکتا اور چونکہ سرکاری پالیسی یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان کو ایک زراعتی ملک رکھا جائے چاہے زراعت میں لوگوں کے لئے نفع ہو یا نہ ہو، اس لئے صنعت کی ترقی ابھی تک ابتدائی منزل میں ہے اگر ہندوستان میں بھوکے لوگوں کے جلوس" اور روٹی یا خون" کے مظاہرے نہیں ہوتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی غریب جاہل رعایا ابھی تک یہ نہیں جانتی کہ بے روزگاری سماج کے ظلم و ناانصافی سے پیدا ہوتی ہے۔

روپیہ کہاں جاتا ہے؟ بہرکیف صورت حال امید افزا معلوم نہیں ہوتی حکومت کی بیشتر آمدنی جو کاشت کاروں اور دوسرے غریب طبقوں سے وصول کی جاتی ہے وہ ان بڑے عہدہ داروں کی تنخواہوں پر صرف کر دی جاتی ہے جو ملک میں امن و امان اور اس سے تھوڑا کچھ زائد قائم رکھنے کے لئے مامور ہیں مثال کے طور پر صوبہ آسام میں جس کی آبادی کا ۹۰ فی صدی حصہ زراعت پیشہ ہے حکومت کے کل مصارف

میں سے صرف ایک فیصدی زراعت کے محکمے پر خرچ کیا جاتا۔

سے کروڑوں روپیہ مجالس قانون ساز کے اراکین اور ان عہدہ داروں کی تنخواہوں پر صرف ہوگا۔ جو نئے سیاسی کاموں کو نپٹانے کے لئے ملازم رکھے جائیں گے، لیکن لوگوں کی معاشی حالت میں وہ ترقی نظر نہیں آتی جس کے محاصل سے زائد خرچ کو پورا کیا جا سکے گا۔ ہندوستان کا توازن تجارت پہلے تقریباً ہمیشہ موافق رہا کرتا تھا۔ لیکن اب یہ ناموافق ہوگیا ہے۔ اگر گذشتہ پانچ سالوں میں ہندوستان سے سونا برآمد کیا جاتا تو ہندوستان میں سخت مالی دشواریاں پیدا ہو جاتیں۔ ۱۹۳۱ء میں برطانیہ نے معیار طلائی ترک کیا تھا۔ اس وقت سے اکتوبر ۱۹۳۶ء تک ہندوستان سے ۲ ارب ۸۶ کروڑ ۸۰ لاکھ ۷۰ ہزار ۹۱۰ روپے کا سونا برآمد کیا گیا اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ہندوستان کی عورتیں اپنا زیور بیچ بیچ کر اپنے شوہروں کا قرض ادا کر رہی ہیں۔

ہندوستان کا کسان سینکڑوں سالوں کی برائیوں اور ناانصافیوں کی وجہ سے اپنی موجودہ مشکلات میں مبتلا ہے اور برسر اقتدار طبقے جو بوجھ اس پر لادتے رہے ہیں۔ انہیں اب تک وہ کسی نہ کسی طرح برداشت کرتا چلا آیا ہے۔ لیکن بوجھ اٹھانے کی ایک حد ہوتی ہے اور غالباً اب وہ زمانہ دور نہیں ہے جب کسان اپنا یہ سارا بوجھ اتار کر پھینک دے گا۔

ایں مرد لث

"ابتدائی قانونی کوششیں"

(۱۸۶۳ء سے ۱۸۸۱ء تک)

دیسی صنعتوں کا زوال ۱۸۵۷ء کے مشہور غدر نے جہاں برطانوی حکومت کی متزلزل دیواروں کو پایہ استحکام تک پہنچایا وہاں ہندوستان کی قدیم دستکاریوں کے ساتھ بھی جو احسان کیا وہ تاابد فراموش نہ کیا جا سکے گا۔ غدر سے سو سال قبل کا زمانہ ہندوستان کی دستکاریوں اور صنعتوں کے لحاظ سے بہترین دور کہا جا سکتا ہے۔ اس زمانہ میں دیسی سامان تجارت نہ صرف مغربی یورپ بلکہ بلقان، عراق اور چین تک روانہ کیا جاتا تھا[۹۱] سوتی کپڑوں میں ڈھاکے کا ململ اب تک یادگار رہے اور دنیا کے مختلف حصوں میں اس کا ذکر فخر کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اونی کپڑوں کا کاروبار بھی زمانہ کے لحاظ سے حد عروج پر پہنچ چکا تھا۔ اور اس سے فائدہ اٹھانے والوں میں قرب وجوار کے دیگر ممالک کی ایک کثیر تعداد پائی جاتی تھی۔ اس صنعت کا وجود درحقیقت زمانۂ لامعلوم سے بتایا جاتا ہے لیکن مسلمان بادشاہوں کا دور خصوصاً اکبر کا عہد حکومت اس کی ترقی کے لئے حیرت انگیز ثابت ہوا[۹۲]۔ اس صنعت کی یادگار اونی شالیں، قالین اور کمبل اب بھی اپنی جگہ مایۂ ناز تصور کئے جاتے ہیں[۹۳]۔

---

[۹۱] بین الاقوامی تجارت کا دستور ہندوستان میں بہت قدیم ہے۔ اور اس کا وجود رگ وید کے زمانے سے بتایا جاتا ہے۔

[۹۲] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۱۷۸ "ہندوستان اکبر کی موت کے وقت" از مورلینڈ

[۹۳] قالینوں کے لئے آگرہ، جونپور اور مرزا پور۔ شالوں اور گرم کپڑوں کے لئے لاہور، لودھیانہ اور کشمیر (صفحات ۱۹۸ تا ۲۰۸ "ہندوستانی صنعت وحرفت کا فروغ" از کوس ودیولال کر۔

اسی طرح ریشمی کپڑوں کا کاروبار بھی ہندوستان کی مخصوص صنعتوں میں تھا اور سولہویں صدی عیسوی میں یورپ کے ساتھ تجارت نے اس کی اہمیت کو چار چاند لگا دیئے تھے، اول اول یہ صنعت گجرات اور بنگال تک محدود رہی مگر ٹیپو سلطان کے زمانے میں بڑھتے بڑھتے میسور تک جا پہنچی۔[۹] اس کے علاوہ صنعت لطیف میں معماری۔ مصوری اور نقاشی وغیرہ کو جو درجہ دورِ مغلیہ میں حاصل ہو چکا تھا۔ اس کی زندہ مثالیں اس قدر ہیں کہ محتاج بیان نہیں۔

ملوں اور فیکٹریوں کی ابتدا | لیکن غدر نے جو انقلاب عظیم برپا کیا وہ ان تمام صنعتوں کے لئے موت کا پیغام تھا۔ کاروبار مٹ گئے۔ کاروباری فرقے نیست و نابود ہو گئے۔ اور صنعتی خاندانوں کا عروج پستی کے عمیق غاروں میں دفن ہو گیا غرض کہ دیسی صنعتوں کا نام لیوا کوئی باقی نہ رہا۔ مانچسٹر اور لنکا شائر کا دور دورہ ہوا۔ سوتی اونی اور ریشمی ہر قسم کے کپڑے برطانیہ سے آکر فروخت ہونے لگے۔ اور بھولے بھالے ہندوستانی جلد ہی بھول گئے کہ ان کا ملک خود بھی کبھی انہی صنعتوں کا گہوارہ رہ چکا تھا۔ اس طرح ۱۸۵۷ء سے ۱۸۶۲ء تک ہندوستانی کپڑوں کا بازار پوری طرح برطانوی تجار کے ہاتھ میں رہا۔

اس کامیابی نے بدیشی پیشہ وروں کو ولائتی مشینیں اور پرزے ہندوستان میں لانے اور سوتی کپڑوں کے کارخانے قائم کرنے کی ہمت دلائی۔ چنانچہ ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک اصولوں پر کاربند ہونے والی پہلی فیکٹری بمبئی میں قائم ہوئی۔ اس طریقۂ پیداوار نے ہندوستان میں تجارت کی ایک نئی راہ کھولی۔ اور ملکی ملوں کے تیار کردہ کپڑوں کا خیر مقدم دیہات دیہات اور گھر گھر ہوا۔ انکی مقبولیت اس قدر عام ہوئی کہ دن بدن نت نئے کارخانوں کی بنیادیں پڑنے لگیں۔ اور ۱۸۷۴ء میں بمبئی کے شہری علاقہ میں ملوں کی تعداد ۲۸ اور پریسیڈنسی میں ۸ تھی۔ ان ملوں نے ایک طرف تو موٹے موٹے سوتی کپڑوں کی درآمد کو بالکل بند کر دیا اور دوسری طرف اپنا حلقہ تجارت روس، امریکہ اور

[۹] "ریشم کی صنعت و تجارت" از آر۔ سی۔ راؤلے

چین تک وسیع کر لیا۔

ہندوستانی فیکٹریوں کے خلاف برطانیہ میں یورش ۔ دیسی ملوں کی یہ ترقی برطانوی کاروبار کے لئے جس قدر خطرناک تھی اظہر من الشمس ہے کیونکہ دراصل ہندوستان میں مغربی سلطنت کی بنیاد شہنشاہی اور حکومت پر نہ تھی بلکہ تجارت پر تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی جس نے پہلے پہل عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی خود بھی بادشاہوں اور سپاہیوں کے کسی فرقے سے تعلق نہ رکھتی تھی بلکہ بعض برطانوی تجار کی ایک کمپنی تھی جس کو قضاء قدر نے مال تجارت کے عوض میں نہ صرف دولت بلکہ تخت و تاج بھی عطا کر دئے تھے۔ برطانوی حکومت کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا کہ ہندوستان کو یورپ اور خصوصاً برطانیہ کے تیار کردہ مال تجارت کے لئے ایک زبردست منڈی بنائیں۔ یہاں کے لوگوں کی ضروریات میں اضافہ کریں مگر اس طرح کہ ان کے پورا کرنے کے لئے برطانیہ کی مدد درکار ہو۔ یہاں کی خام پیداواروں کو ترقی دیں مگر اس لئے کہ وہ یہاں نہ استعمال ہو سکیں بلکہ انگلستان کی ملیں ان سے فائدہ اٹھائیں۔ ایسی صورت میں یہاں کی صنعتی اور تجارتی ترقی اطمینان کی نظر سے کیوں کر دیکھی جا سکتی تھی؟ ہندوستان کا وسیع بازار لیں ہاتھ سے نکلتے کون دیکھ سکتا تھا؟۔ خصوصاً اس وقت جو تجارتی خسارہ لنکا شائر کو اٹھانا پڑا اس نے برطانوی ممالک میں ایک خوفناک ہنگامے کی بنا ڈالی۔ پارلیمنٹ اور حکومت ہند کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونے لگی۔ ہندوستانی مزدوروں کے اوقات کار کو محدود کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ عورتوں اور بچوں کو قانونی تحفظ میں لانے کی درخواست کی گئی، ہفتہ وار تعطیلوں کے تعین کو ضروری قرار دیا گیا[۵۱]۔ مختصر یہ کہ ایسا فیکٹری قانون وضع کرانے کی کوشش ہونے لگی جو دیسی کپڑوں کی قیمتوں میں خاطر خواہ اضافے کا سبب ہو اور دور

۵۱ بمبئی کی ملوں کے حالات پر میجر مور کی رپورٹ میں تحریر ہے کہ "بمبئی کی ملیں عورتوں اور بچوں کی ایک کثیر تعداد سے کام لیتی ہیں جس کی وجہ سے مزدوری کا نرخ بہت گر گیا ہے۔ اس کے علاوہ کام کے اوقات بہت طویل ہیں اور مزدوروں کی صحت و آرام کا کوئی انتظام نہیں ہے نہ ہفتہ وار تعطیلوں کا کوئی دستور ہے۔

دراز لنکا شائر سے آنے والے مال کو تجارتی مقابلے سے محفوظ رکھے۔ ان مطالبات کی تائید میں اکتوبر ۱۸۷۶ء میں الگزنڈر گریو[1] نے اپنی ششماہی رپورٹ میں تحریر کیا کہ:-

"اس (سوتی) کاروبار کے ساتھ ترقی کی بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔ اس لئے جبکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ اس ملک (برطانیہ) کو فیکٹری قوانین نے گراں قدر فوائد پہنچائے ہیں تو کیا یہ امید کرنا بیجا ہوگا کہ ہندوستانی مزدوروں کو ان مصائب سے جو برطانوی مزدوروں کو زمانہ گذشتہ میں برداشت کرنا پڑے تھے محفوظ رکھا جائے۔ اور ان کو موقع دیا جائے کہ اوقات کار کی کمی۔ مہلت کی زیادتی، کھانے پینے کے بہتر انتظام اور چھوٹے بچوں کے تحفظ کے قوانین سے فائدہ اٹھائیں۔"

لنکا شائر کے مطالبات | ۱۸۷۶ء میں مسٹر ہومس نے "ہندوستانی ملوں کی ترقی" کے عنوان سے ایک مقالہ لندن سوسائٹی آف آرٹس روم میں پڑھا۔ اس میں دیسی ملوں کی روزافزوں ترقی کے ان تمام اثرات پر بحث کی گئی تھی جو لنکا شائر پر پڑنے والے تھے اور دکھلایا گیا تھا کہ "اگر ہندوستان کی ملیں اسی رفتار سے ترقی کرتی رہیں تو جلد وہ زمانہ آنے والا ہے جبکہ نہ صرف دیسی منڈیاں بلکہ برطانوی بازار بھی ہندوستان ہی کے تیار شدہ کپڑوں سے پٹے ہوئے نظر آئیں گے"۔ اس مقالے نے لنکا شائر کے مزدوروں میں شدید ہیجان پیدا کیا رشک کی خوابیدہ چنگاریاں بھڑکنے والے شعلوں کی طرح نمودار ہونے لگیں۔ اور لنکا شائر کے کونے کونے سے برطانوی مزدوروں والے قوانین کو ہندوستان میں نافذ کرانے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔

دوسری جانب محصولات کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی اور یہ دکھلایا گیا کہ ۵ فیصدی (قیمت پر) محصول درآمد کو جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے سے وصول کئے جاتے تھے بڑھا کر دس فیصدی کر دینا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ لنکا شائر کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

---

[1] یہ ایک برطانوی فیکٹری انسپکٹر تھے۔

اور دیسی کاروبار کو کھلم کھلا اعانت پہنچائی جارہی ہے۔ ایسی صورت میں محصولات درآمد کی آہنی دیواروں کو پاش پاش نہ کر دینا برطانوی حب الوطنی کے خلاف تھا۔ اس لئے مجلس قانون ساز و دیگر اراکین سلطنت برطانیہ سے اپیل کی گئی کہ دیسی منڈیوں کو محصولات سے آزاد کر کے برطانیہ اور ہندوستان کو یکساں طور پر مقابلہ کا موقع دیا جائے۔[۵۱]

اس ہنگامے نے ۱۸۷۵ء میں وزیر ہند لارڈ سالسبری اور وائسرائے ہند لارڈ نارتھ بروک کی توجہ لنکا شائر کے حقوق کی طرف مبذول کی اور انھیں ہندوستان میں مزدور قوانین نافذ کرانے کی تیاریاں شروع کرنے کے لئے مجبور کیا۔ اسی سال ہندوستان کی مجلس محاصل نے اختلاف عام کو ٹھکراتے ہوئے اور گذشتہ مجلس محاصل کی سفارشات کو رد کرتے ہوئے محصول درآمد کی مقدار میں تخفیف کی تجویز کی جو فوراً عمل میں لائی گئی۔[۵۲]

تحقیقاتی کمیٹی | ابھی محاصل کا مسئلہ پوری طرح طے بھی نہ ہو سکا تھا اور برطانوی کاروبار میں دلچسپیاں رکھنے والے دیسی منڈیوں کی مکمل آزادی کا مطالبہ کر ہی رہے تھے کہ وائسرائے ہند کے ایما سے حکومت بمبئی نے مزدوروں کے حالات کی جانچ کے لئے ایک کمیٹی کے تقرر کا اعلان کر دیا۔ اور حسب ذیل معاملات کے متعلق ان کی رائے طلب کی :-

(۱) مشینوں کے خطرات اور ان سے تحفظ کی تدابیر

(۲) فیکٹری میں کام کرنے والے بچوں کی عمر کا تعین

(۳) اوقات کار کے حدود

---

۵۱ اس موقع پر یہ بات قابل غور ہے کہ ہندوستانی کارخانے ابھی ابتدائی دور میں تھے۔ اور ان کی ترقی کے لئے بیرونی مقابلے کو روکنے کی سخت ضرورت تھی۔

۵۲ تجویز ۵ر اگست ۱۸۷۵ء کی ایک نئی محصولی کمیٹی کے ذریعہ کرائی گئی تھی جس نے گذشتہ کمیٹی کی تجویز کی جو محصول درآمد کی موافقت میں تھی تردید کی۔

(۴) تعطیلات

(۵) صفائی وحفظان صحت

(۶) پیشہ وروں کے بچوں کی تعلیم

(۷) فیکٹری توانین کی ضرورت

کاروباری حالات کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے جو تجاویز اس کمیٹی نے پیش کیں وہ لنکاشائر کی امیدوں کے خلاف تھیں - اگرچہ انھیں یہ تسلیم تھا کہ بمبئی کے کارخانوں میں اوقات کار طویل ہیں وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ سوتی کاروبار کے اس ابتدائی دَور میں جس سے ہندوستان گذر رہا تھا مزدور قوانین کا نفاذ غیر ضروری تھا۔ اور ملوں کی مجموعی حالت ایسی ابتر نہ تھی کہ انکی درستگی کے لئے قانونی حربے کی ضرورت ہو - عورتوں اور بچوں کے متعلق ان کی رائے یہ تھی کہ جس "قدرتی حالات" کے تحت وہ کام کرنے کے عادی ہیں وہ ان کے لئے مہیّا ہیں - اور ان پر کسی قسم کی سختی یا زیادتی نہیں کی جاتی - برخلاف اس کے اگر قانونی پابندیاں عائد کرکے ان کی اُجرتوں کو کم کر دیا گیا یا ان کی ایک بڑی تعداد کو برخاست کر دیا گیا تو یقیناً انھیں ایسا شدید نقصان پہنچے گا کہ جس کو سکون کے ساتھ برداشت کرنا ناممکن ہوگا۔[۵]

لنکاشائر اور ہندوستان | ہندوستانی مزدوروں میں بیداری کا فقدان اور ان کے حالات کو سدھارنے کا بیرونی اصرار - لنکاشائر کی چیخ پکار - مانچسٹر کا شور وغل کتنے ہی عجیب وغریب واقعات کیوں نہ ہوں ان کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا - لیکن ایسا کیوں تھا۔ اس کے متعلق ماہرین مزدور تحریک میں اختلاف ہے - عام پبلک اور کثیر التعداد اہل قلم کا متفقہ فیصلہ ہے کہ برطانوی یورش درحقیقت ہندوستانی مفاد کے لئے نہ تھی بلکہ یہاں کے تیار کردہ سوتی کپڑوں کے مقابلہ کو روکنے کی

---

۵ ہندوستانی مزدوروں کی بے سروسامانی اور زراعتی کاروبار کی بے بضاعتی کو جس کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی تھی مدنظر رکھتے ہوئے بمبئی تحقیقاتی کمیٹی کا نظریہ صداقت سے خالی نہ تھا۔

ایک تدبیر تھی۔ مندرجہ ذیل بحث میں ہم دیکھیں گے کہ برطانوی لیڈروں اور لنکا شائر کے خیر خواہوں نے خود بھی اس مقصد کو پوشیدہ رکھنے کی کوئی کوشش نہ کی تھی۔ اور اپنے اپنے حلقوں کے اراکین نے ایوان عامہ پر اپنے خیالات کا کھلے الفاظ میں اظہار کیا تھا۔ پھر بھی کچھ تعداد ایسے مصنفین کی موجود ہے جو برطانوی تحریک کو نیک نیتی، اخلاص اور سخاوت پر محمول کرتی ہے۔

ایک نظریہ | اس سلسلہ میں ڈاکٹر احمد مختار نے جس نظریے کو پیش کیا ہے وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ انھوں نے اپنی کتاب[۵۱] "ہندوستان میں فیکٹری لیبر" کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ "ہندوستان کی فیکٹریوں میں خرابیاں اور بے عنوانیاں غائت درجے تک پہنچ چکی تھیں اس لئے خدا ترس (برطانوی فرشتے) فوراً اپنے فرائض کو پورا کرنے کے لئے کمربستہ ہوگئے اور انھوں نے ہندوستانی مزدوروں کو قانونی تحفظ میں لانے کی کوششیں شروع کردیں" آگے چل کر انھوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ لنکا شائر کی ہندوستانی دلچسپی میں خود غرضی کا شائبہ ہونا اس وجہ سے بھی ناممکن تھا کہ "وہاں کا کاروبار دیسی کاروبار کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی پاچکا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ 'مزدوری حالات' کی اہمیت کو وہ پوری طرح محسوس کرنے لگے تھے"۔ ایسی حالت میں ان کا یہ خیال ہے کہ مسٹر ایڈ گریو۔ میجر مور۔ مسٹر بیزڈ اور اخبار لندن ٹائمس کے نامہ نگار ہندوستانی مزدوروں کے ساتھ محض جذبہ سخاوت کی بنا پر ہمدردی کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ لنکا شائر کی عرضداشتیں بھی بدنیتی پر محمول نہیں کی جاسکتیں کیوں کہ ہندوستانی مزدوروں کے بہی خواہ لیڈر سہراب جی شاپور جی بنگالی خود بھی انہی کا دست اعانت طلب کر رہے تھے۔

ہندوستان میں مزدور قوانین کے مسائل پر الگزنڈر گریو اور مسٹر ہوس کے نظریے ہم گذشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ اس موقع پر چند اور اقتباسات پیش کر دئے جائیں جو برطانوی اہل الرائے اور اہل قلم کی تقاریر اور بیانات سے لئے گئے ہیں۔ اس کے بعد ناظرین خود فیصلہ

[۵۱] ملاحظہ ہو صفحہ ۱۵ تا ۱۴

کر سکیں گے کہ برطانیہ کی تحریک میں صداقت اور سخاوت کا جذبہ کہاں تک موجود تھا۔

جولائی ۱۸۷۵ء میں مسٹر اینڈرسن نے پارلیمنٹ کے ایوان عام میں تقریر کرتے ہوئے ہندوستان میں مزدور قوانین کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان سے صاف ظاہر ہے کہ برطانوی پورش جذبہ حسد و رشک سے لبریز تھی۔ اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"ہم کو یہ امر فراموش نہ کر دینا چاہیئے کہ ہندوستان میں خام پیداوار کا کثیر ذخیرہ موجود ہے اور مزدوری کا نرخ کم ہے۔ ایسی صورت میں اگر ہم وہاں کے مزدوروں کو ۱۶ یا ۱۷ گھنٹے[۹۱] روزانہ کام کرنے سے باز نہ رکھیں گے تو ہم ان کو اپنے ہی ملک کے کاروباریوں کے مقابلہ میں بے جا فائدہ اُٹھانے کا موقع دیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی پیداوار کی قیمت ہماری پیداوار کی قیمت سے نسبتاً کم ہوگی اور ممکن ہے کہ ان کے کپڑے ہمارے ہی بازاروں میں آ کر مانچسٹر کے مقابلہ میں ارزاں فروخت ہونے لگیں۔"

اسی خیال کا اظہار آئندہ چل کر لارڈ شیفٹس بری (Shefts Bury) نے بھی دارالامرا میں کیا ہے جس کے نقل کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

لیکن سب سے زیادہ واضح اور صاف وہ تقریر ہے جو ۲۸ر فروری ۱۸۷۶ء کے ٹائمس آف انڈیا میں شائع ہوئی تھی۔ اس سے نقل کرتے ہوئے چند جملے واقعات حال پر پوری روشنی ڈالیں گے۔ وہ یہ ہیں:۔

"اگر یہ (ہندوستانی) پیشہ ور اسی طرح ترقی کرتے رہے تو اندیشہ ہے کہ

---

[۹۱] بلیمے (Blemey) کمیشن کی رپورٹ کے لحاظ سے جو ۲۳ر مارچ ۱۸۷۵ء کو مقرر ہوا تھا ملوں کے اوقات کار گرمیوں میں ۱۲½ گھنٹے روز اور جاڑوں میں ۱۰½ گھنٹے روز تھے اس کی رو سے مسٹر اینڈرسن کا مندرجہ بالا الزام غلط ثابت ہوتا ہے۔

ہندوستان کی تمام تجارت ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس لئے اس وقت ہمارا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہے کہ اس نوخیز پودے کو جڑ پکڑنے سے قبل ہی اُکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔"

اس کے علاوہ میجر مور، مسٹر جان کرافٹ اور دیگر برطانوی مشاہیر کے بیانات موجود ہیں جو کھلم کھلا برطانوی مفاد کی طرف مائل ہیں اور اس کا اعلان فخر کے ساتھ کرتے رہے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ کیوں کر تسلیم کر لیا جائے کہ مزدور قوانین کی برطانوی تحریک خلوص اور نیک نیتی پر مبنی تھی اور اس میں سراسر ہندوستانی مزدوروں ہی کا فائدہ مد نظر تھا۔

دوسرا ثبوت برطانیہ کی نیک نیتی کا یہ دیا جاتا ہے کہ کاروباری لحاظ سے جو ترقی لنکاشائر کو حاصل ہو چکی تھی وہ ہندوستان کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تھی اس لئے دیسی ملوں کی ترقی کا برطانیہ کو خائف کر دینا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ہندوستان میں ملوں کی ابتدا ہوتے ہی موٹے سوتی کپڑوں کی درآمد بالکل بند ہو گئی تھی۔ اور برطانوی کپڑوں کے فروخت میں بھی تقریباً ۲۰ لاکھ پونڈ سالانہ کی کمی ہو گئی تھی۔ نقشہ مندرجہ ذیل ملاحظہ ہو۔

نقشہ درآمد

سال	برطانوی سوتی کپڑوں کی درآمد (دس لاکھ پونڈ میں)
۱۸۷۰ — ۷۱	۱۹ ؍ ۰۵
۱۸۷۱ — ۷۲	۱۷ ؍ ۴۹
۱۸۷۲ — ۷۳	۱۷ ؍ ۲۳
۱۸۷۳ — ۷۴	۱۷ ؍ ۷۸

اور اگر اس تجارت کا مقابلہ موجودہ زمانہ کی سوتی تجارت سے کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ

لنکا شائر کے سوتی مال کی درآمد میں جو دیسی منڈیوں میں آکر فروخت ہوتے تھے تقریباً ۵۰ فیصدی کی کمی واقع ہوگئی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ برطانوی ملیں اب بھی ہندوستان کی ملوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں لیکن پھر بھی دیسی بازاروں میں وہاں کی تیار کردہ چیزوں کی مانگ کیوں کم ہوتی جارہی ہے؟ کیا یہ کمی برطانیہ کے مفاد کے لئے خطرناک نہیں ہے؟ کیا اس کمی کو پورا کرنے کے لئے لنکا شائر اور مانچسٹر کے تجار ہر ممکن کوشش کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے؟۔ پھر یہ کیونکر مان لیا جائے کہ ترقی یافتہ ہونا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ ان کا برتاؤ ہمارے ساتھ ہمیشہ خلوص اور سخاوت ہی کا ہوگا اگرچہ ہماری ذات سے انھیں کتنا ہی بڑا تجارتی خسارہ کیوں نہ اٹھانا پڑے۔

رہا مسٹر سہراب جی شاپور جی بنگالی کے اس خط کا معاملہ جس میں انھوں نے جان کرافٹ (مانچسٹر) کو لکھا تھا کہ[۵] .... کہ اب میرے پاس سوائے اس کے اور کوئی تدبیر نہیں ہے کہ برطانوی اثرات سے کام لے کر دیکھوں۔ کیونکہ یہ اثرات ہمارے حکام کے لئے ایسے ناگزیر ہیں کہ ان کی زد سے بچنا بہت مشکل ہے" اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ مسٹر بنگالی ان تمام برطانوی حکام سے جو ہندوستانی حکومت کے نظم و نسخ کے مالک تھے غیر مطمئن تھے۔ اور وہ اپنی مسلسل کوششوں کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ برطانوی مفاد کو ہاتھ میں لے کر اگر برطانیہ ہی سے مدد کی درخواست کی جائے گی تو شاید کام چل سکے۔

لیکن سہراب جی کا یہ خط اور وہ کوششیں جو انھوں نے مزدور سدھار کے لئے برطانیہ میں کیں یہ ثابت کرنے سے قاصر ہیں کہ برطانوی تحریک ہندوستان کے بہبود کے لئے تھی اور اسمیں ذاتی اغراض شامل نہ تھے۔ درحقیقت لنکا شائر اور مانچسٹر سے مدد طلب کرتے ہوئے ان کا یہ گمان ہرگز نہ تھا کہ وہ ایک مخلص دوست کی طرف دست اعانت دراز کر رہے تھے بلکہ وہ صرف اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے جو اس وقت انھیں حاصل تھا۔ علاوہ بریں اگر شاپور جی کو

[۵] منقولہ از ڈاکٹر احمد مختار "ہندوستان میں فیکٹری لیبر"

برطانوی بہی خواہوں پر اعتماد ہوتا تو اس امداد کے بدلے میں جو ان کو مانچسٹر سے ملنے کی اُمید تھی وہ خود بھی ہندوستان میں محاصل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے۔

اس زمانے کی مزدوری کیفیت اس سلسلہ میں یہ بھی فراموش نہ کردینا چاہئیے کہ ۱۸۷۴ء میں جب ہندوستان کی فیکٹریوں کے لئے قانون سازی کے مطالبات لنکاشائر اور مانچسٹر میں درپیش تھے تو دیسی ملوں کی تعداد علاقہ بمبئی میں ۴۶[۱] سے زیادہ نہ تھی اور ان کی عمر بھی صرف ۱۰ سال کی تھی یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دیہاتی اور خانگی کاروبار کا قلع قمع ہوچکا تھا۔ مزدوروں اور پیشہ وروں کی ایک بڑی تعداد فاقہ کشی کی مصیبت میں مبتلا تھی۔ زراعتی کاروبار کے خسارے کی تھوڑی بہت تلافی انہی ملوں کے ذریعے سے ہو جاتی تھی۔ یہی سبب تھا کہ ملوں میں ملازمتیں تلاش کرنے والے مزدوروں کی تعداد کثیر تھی اور اسامیاں نسبتاً قلیل۔ ایسی صورت میں خصوصاً جبکہ ملوں کی تعداد بڑھانے یا سوتی کپڑوں کے کاروبار کی توسیع کی تدابیر پیش نظر نہیں تھیں (برطانوی) فیکٹری قوانین کے نفاذ کا مطلب بیکاری کو بڑھانا یا اجرت کے نرخ میں کمی کر دینے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا۔

کیا برطانوی مزدوروں والے قوانین ان حالات پر نظر ڈالتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ برطانوی ہندوستان کے لئے موزوں تھے؟ مزدوروں والے قوانین اور محاصل درآمد سے آزادی ہندوستان کے لئے کہاں تک مفید تھی؟ ہمیں معلوم ہے کہ ہندوستان کے مزدور غیر مکلف اور آزاد دیہاتی زندگی کے عادی تھے ان کے اخراجات نسبتاً قلیل اور ضروریات کی تعداد مختصر تھی۔ انھوں نے فیکٹری کی ملازمتوں کو صرف اوقات گذاری اور زراعت کی کمی کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ سمجھ کر اختیار کیا تھا۔ دیہات اور دیہاتی کاروبار سے جو قدرتی لگاؤ انھیں تھا اس کی گرمی ان کے دلوں میں اب بھی باقی تھی اور وہ اپنی فرصت کے اوقات اب بھی دیہاتوں ہی میں بسر کرتے تھے۔ ایسی صورت میں اگر ان میں کاروباری بیداری اور حقوق کی پاسداری موجود نہ تھی تو حیرت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ وہ مہتم تھا

---

[۱] اس وقت سوتی کپڑوں کی ملوں کی تعداد ۲۶۵ ہے (صفحہ ۶۴۶ انڈین ایر بک ۲۷-۱۹۲۶ء۔

جبکہ حکومت ہند کو برطانوی مفاد سے الگ ہو کر ایسی ہمدردانہ تحقیقاتی کمیٹی قائم کرنے کی ضرورت تھی جو دیسی تجارت وکاروبار کو محفوظ رکھتے ہوئے غریب مزدوروں کی ملازمتیں قائم رکھنے، ان کی اجرت میں اضافہ کرنے اور صحت و دیگر آسائشیں فراہم کرنے کے ذرائع پر روشنی ڈالتی۔ نہ کہ برطانوی ساہوکاروں سے مرعوب ہو کر انہی قوانین کے نافذ کرانے کی تجویز کرتی جو ایک پختہ کار طریقۂ پیداوار کے لئے موزوں تھے۔

علاوہ بریں اس وقت ہندوستان ایک خاص معاشی دور سے گذر رہا تھا۔ فیکٹری پیداوار کی ابھی ابتدا تھی۔ دیہاتی اثرات ابھی زائل نہ ہوئے تھے۔ کاروباری نفع نقصان کا ابھی تجربہ نہ ہوا تھا اس لئے ضرورت تھی کہ بیرونی مقابلے کو جو سرعت کے ساتھ بڑھ رہا تھا روک دیا جاتا اور ہندوستان کی شیر خوار تجارت کو لنکا شائر اور مانچسٹر کی دست بُرد سے محفوظ رکھا جاتا۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہ ہو سکا کیونکہ برطانوی سخاوت اور خدا ترسی کا جذبہ صرف اس حد تک عمل پیرا تھا جہاں تک کہ برطانوی مفاد پر آنچ آنے کا خدشہ تھا۔ اس کی زد سے بچنے کے لئے فیکٹری قوانین کا نفاذ ضروری تھا۔ اس میں اس سے بحث نہیں کہ وہ ہندوستانی فضا کے لئے مناسب تھے یا غیر مناسب۔ اسی زمانہ میں جب محصول درآمد کو بالکل اُٹھا لینے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو ہندوستانی مزدوروں کے برطانوی خیر خواہوں میں سے کوئی ایک بھی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والا نہیں ملتا۔ اور سب کے سب ہم آہنگ ہو کر محاصل کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔

محاصل درآمد اور مزدور قوانین | بعض مصنفین[۵۱] کا خیال ہے کہ "سوتی کپڑوں کے محاصل اور مزدور سدھار کے مطالبات دو مختلف مسئلے ہیں جن کو ملا دینا ایسی غلطی تھی جس سے زمانہ ماضی کے ماہرین معاشیات بھی نہ بچ سکے۔ لیکن اس کا سبب صرف وہ بدگمانی تھی جو ان کے دلوں میں برطانیہ کے خلاف سرایت کر چکی تھی" درحقیقت محاصل کو مزدوری سے جدا کرنا ناممکن ہے خصوصاً جبکہ ہندوستانی کپڑوں کی تجارت اور پیداوار پر دونوں کا اثر یکساں پڑنے والا ہو۔ کیا یہ بات قابل غور نہیں کہ ہندوستانی فیکٹریاں

---

[۵۱] ڈاکٹر احمد مختار "ہندوستان میں فیکٹری لیبر"

اپنے ابتدائی دَور میں ایک گونہ تحفظ کی مستحق تھیں ؟ ۔ اور تحفظ کی سوائے اس کے کیا صورت ہوسکتی تھی کہ بیرونی مقابلے کی روک تھام کی جاتی ؟ مگر یہ بات کتنی حیرت انگیز ہے کہ سوتی کاروبار کے عہد طفلی سے لے کر اس زمانہ تک کبھی تامینی محصولات عائد نہیں کئے گئے[۵۱] پھر بھی مان چسٹر سے دلچسپی رکھنے والوں کو ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ ہندوستان کی منڈیوں میں تجارتی آزادی نصیب نہیں ۔ اور محاصل کی دیوار اصول تجارت کے بالکل منافی ہے ۔ اس لئے جہاں ایک طرف یہ کوشش کی جارہی تھی کہ مزدوری قوانین جاری کرائے جائیں وہاں دوسری طرف یہ شور ہو رہا تھا کہ محصولات بھی اٹھا دئے جائیں ۔ دونو تحریکوں کا مطلب ایک ہی تھا یعنی مقابلہ کی طاقت کو کچل دینا۔

کیا برطانیہ اور ہندوستان کا ... تھا؟

چنانچہ ۱۸۷۴ء میں مان چسٹر کی مجلس تجار نے جو عرضداشت وزیر ہند کے سامنے پیش کی تھی یہ دکھلایا تھا کہ :-

ا[۵۲] وضع محصولات کا جو طریقہ ہندوستان میں رائج ہے اس سے سوتی کپڑوں کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے ۔

ب یہ محاصل سوت، اور موٹے اور کم قیمت کپڑوں کی تجارت کے بالکل منافی ہیں ۔

ج ان کا مقصد امریکہ اور مصر سے روئی خرید کر ہندوستان ہی میں بہتر کپڑوں کا تیار کرنا ہے جس سے صریحاً برطانیہ کو نقصان پہنچنے کی امید ہے ۔

---

۵۱ اس مسئلہ کو آنریبل ڈبلو ۔ اسٹروکس نے اپنے اختلافی نوٹ مورخہ ۱۳ مارچ ۱۸۷۹ء میں (جس کا تعلق ابتدائی زمانہ سوتی کاروبار سے ہے) تصریح کے ساتھ پیش کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ " سوتی سامان کی موجودہ محاصل کے متعلق یہ شکایت سوائے مان چسٹر کے اور کسی کو نہیں ہے کہ یہ تامینی ہیں " اس کے علاوہ لارڈ نارتھ برک نے بھی تسلیم کیا ہے کہ یہ محاصل تامینی نہ تھے (صفحہ ۲۰۴ ۔ ان ۔ جے ۔ شاہ)

۵۲ تاریخ محاصل از ان ۔ جے ۔ شاہ صفحہ ۱۹۸

اور (۵) ان کا سب سے زیادہ مضر اثر بیرونی سامان تجارت کی قیمتوں میں اضافہ کرکے دیسی کاروبار کو فروغ دینا ہے۔

ان الزامات کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ ہندوستانی محصولات درآمد تجارت کے لحاظ سے غیر معاشی ہیں۔ لیکن اس خصوصی ماحول کے ماتحت جس میں دیسی کارخانے مصروف کار تھے مندرجہ بالا الزامات بعید از قیاس ہیں۔ ابھی یہ کاروبار ترقی کے اس زینے پر پہنچ ہی نہ پائے تھے جہاں برابری کے مقابلے کا سوال پیدا ہوتا۔ ابھی تو دراصل ہندوستانی تجارت میں مقابلے کی طاقت ہی نہیں تھی۔ اس کی مثال اس شیر خوار بچے کی تھی جو گھٹنیوں چلنے میں تیزی سے ہاتھ پیر مارنے کی کوشش کر رہا ہو مگر اس کو سہارا دیکر کھڑا کرنے والا کوئی نہ ہو۔ رہا ۵ فیصدی کا محصول جو حقیقی بنائے مخاصمت تھا، کسی حالت میں تاپنی نہیں ہوسکتا۔ (حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ سوتی کاروبار کا تحفظ عمل میں نہ لانا صریح ناانصافی تھی) کیونکہ تجارتی آزادی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ محاصل کو سرے سے اُڑا ہی دیا جائے۔ آخر کار ملکی نظم و نسق کے لئے بھی کثیر سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اسی طرح پر مختلف مال تجارت کو آزادی مل جائے تو حکومت کا خزانہ تباہی سے ہمکنار نظر آنے لگے۔ اس کے علاوہ ۵ فی صدی محصول کی حقیر رقم کسی ملک کی تجارت کو شدید نقصان پہنچانے سے قاصر تھی۔ ان نکات کا خیال کرتے ہوئے لارڈ سالسبری نے اپنے مراسلہ جولائی ۱۸۷۵ء میں وائسرائے ہند کو لکھا کہ:-

"اگر یہ صحیح ہو[۵] کہ محصولات درآمد کا مقصد برطانوی مقابلہ سے مفر حاصل کرنا اور ملک میں عام طور پر استعمال ہونے والی اشیائے ضروری کو گراں کرنا ہے تو اس معاملہ میں کچھ بھی کہنا غیر ضروری ہے کیونکہ ایسے محاصل معاشی نقطہ نظر سے قطعی طور پر قابل اعتراض ہیں۔ مگر میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ ان کے مقاصد

---

[۵] منقولہ در صفحہ ۲۰۷ "ہندوستانی محاصل کی تاریخ" از ان۔ جے شاہ۔

درحقیقت یہی ہیں ۔ پھر بھی ان کے خطرناک سیاسی اثرات سے میں غافل نہیں ہو سکتا۔"

لارڈ سالسبری کے ان جملوں کو نقل کرنے کے بعد ہندوستانی محصولات درآمد کے معاشی ہونے پر زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔لیکن جہاں تک سیاسی بین الاقوامی کشیدگی اور رنجش کا تعلق ہے ان محاصل کے اٹھادینے سے ان کے اور بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ دنیا کی ہر تجارتی قوم ہندوستان پر نگاہ التفات رکھتی ہے اور یہاں کی وسیع منڈیوں پر حاوی ہونا چاہتی ہے۔ ایسی حالت میں اگر تجارتی آزادی عام کر دی جاتی تو خود برطانیہ کے لئے شدید خطرہ تھا اور اگر برطانیہ کے لئے مخصوص کی جاتی تو دیگر ممالک اور برطانیہ میں پرخاش کا اندیشہ تھا۔

برطانوی پالیسی | لیکن ان تمام خطرات کو نظرانداز کرتے ہوئے بالآخر حکومت ہند کو یہی رائے دی گئی کہ محاصل کی دیوار کو منہدم کر دینا ضروری ہے ۔ اور اس معاملہ میں ہندوستان کی برطانوی حکومت کے اختلافات کو فرو کرنے اور ملکی مالیات اور اقتصادیات کی بے دریغ قربانی کرنے کا عزم بالجزم لیکر سرجان اسٹریچی ہندوستان تشریف لائے ۔انھوں نے اپنی ۱۸۷۷ء کی مالیاتی تقریر میں جس پالیسی کا اعلان کیا اس کے مطالعے کے بعد یہ صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ حکومت ہند کے لئے برطانوی مفاد بالاتر اور افضل تھا۔ اس تقریر کا اقتباس ذیل میں نقل ہے :۔

"اکثر (حکومت ہند) کا یہ فرض بتلایا جاتا ہے کہ ہندوستانی مفاد کو کسی حالت میں نظرانداز نہ ہونے دے ۔ اگرچہ اس میں مانچسٹر کو نقصان ہی کیوں نہ پہنچ رہا ہو ۔لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے۔میں اس نظریے کی سختی سے مخالفت کرتا ہوں کیونکہ اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ہندوستان میں صرف کرنے کے باوجود یہ ممکن نہیں ہے کہ میں برطانوی وطنیت کی فہرست سے خارج کر دیا جاؤں۔

مانچسٹر کا مفاد جسے احمق لوگ غیر ضروری اور مضحکہ خیز تصور کرتے ہیں نہ صرف ایک عظیم الشان اور ذہین قوم بلکہ لاکھوں انگریزوں کا مفاد ہے جن کا تعلق براہ راست سوتی کپڑوں کی تجارت اور ان کے کاروبار سے ہے مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی

ندامت نہیں ہے کہ اپنی ان ذمہ داریوں کو محسوس کرتے ہوئے بھی جو مجھ پر ہندوستان
کی ہیں ۔ میں اپنے ملک کی ذمہ داریوں کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ میرے
لئے وہ بہت زیادہ اہم اور گراں بہا ہیں ۔ مجھے یقین ہے کہ انگلستان میں میرے
ہم وطنوں کو جو شکایات ہیں وہ حقیقتاً مناسب اور صحیح ہیں ۔ اور انھیں صرف خیالی
اذیت تصور کرنا سخت غلطی ہے .... اس لئے جہاں تک میرا تعلق ہے
مجھے یقین ہے کہ اگر (تجارتی آزادی کی) اس زبردست ترمیم کو عمل میں نہ لانا ہوتا
تو میں اپنے موجودہ عہدے کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتا "

ان کوششوں کا نتیجہ بالآخر یہ ہوا کہ ۱۸۸۱ء میں پہلا فیکٹری قانون نافذ ہوا اور ۱۸۸۲ء میں
دیسی منڈیوں کو سوتی سامان کے لئے تجارتی آزادی عطا کی گئی ان قوانین کے متعلق اس وقت یہ کہے بغیر
نہیں رہا جا سکتا کہ یہ دونوں سوتی کارخانوں کی ترقی کے منافی تھے ۔ اور یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ
ہندوستان میں مزدور سدھار کی اشد ضرورت تھی اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کام کے لئے
جو قوانین وضع کئے گئے وہ یہاں کے حالات سے بالکل مناسبت نہ رکھتے تھے ۔ اس کے علاوہ
فیکٹری قانون کے ماتحت مزدوروں اور کارخانوں کا مطالعہ اور معائنہ کئے بغیر محصولات درآمد بھی اٹھالئے
گئے ۔ اس سے نہ صرف دیسی کاروبار بلکہ کل مزدور طبقہ کو جو شدید نقصان پہنچا اس کا تفصیلی بیان
انشاءاللہ کسی آئندہ موقع پر پیش کیا جائے گا ۔

عہدِ حاضر کا فلسفہ

لیکن برگساں نے تصوف کو ان لوگوں کی طبیعت کے موافق بنانے کی کوشش کی جو حرکت اور حیات پر ایمان رکھتے ہیں، ترقی کی واقعیت سے مطمئن ہیں اور اپنے تحت فلکی وجود کے متعلق کسی قسم کے فریب یا التباس میں مبتلا نہیں۔ تصوف کا قائل طبعاً عملی انسان ہوتا ہے مگر ایسا عملی انسان جو جمود پر مجبور ہے اور حیاتیت کا ماننے والا طبعاً جامد ہوتا ہے۔ مگر ایسا جو اپنے میں عمل کی بے پناہ خواہش رکھتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۴ء سے پہلے دنیا میں اسی قسم کے لوگ آباد تھے ان کے مزاجوں میں شکیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی جس کی وجہ سے وہ جوش اور ہیجان کے پیچھے اندھے اور غیر عقلی ایمان کے لئے دیوانے ہو رہے تھے۔ یہ غیر عقلی ایمان آخر میں انھیں ایک ایسے یقین کی صورت میں دستیاب ہوا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ دوسرے انسانوں کو آپس میں کٹ مرنے پر آمادہ کرنا ان کا فریضہ ہے لیکن سنہ ۱۹۰۷ء میں انھیں چونکہ اس جذبے کی تسکین کا کوئی موقع حاصل نہ تھا اس لئے برگساں نے ایک بدل پیش کیا اور الحق کہ نعم البدل پیش کیا۔

برگساں بعض اوقات اپنا نظریہ ایک ایسی زبان میں پیش کرتا ہے جس سے ناظر کو سخت دھوکہ ہوتا ہے کیوں کہ جن چیزوں کو وہ فریب اور التباس سمجھتا ہے ان کا تذکرہ کبھی کبھی ایسے لفظوں میں کر گزرتا ہے جن سے پایا جاتا ہے کہ وہ حقیقی ہیں۔ لیکن اگر ہم ان غلط فہمیوں میں مبتلا نہ ہوں تو زمان کے متعلق اس کے نظریے کا خلاصہ یہ ہوگا۔ زمان جدا جدا لمحات یا حادثات کا سلسلہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسی متواتر اُپج اور بالیدگی ہے جس میں مستقبل کی پیش گوئی کی گنجائش نہیں کیوں کہ وہ سر تا سر نئی اور بدیع جا ایک بعید از قیاس چیز ہے جو چیز حقیقت میں واقع ہوتی ہے وہ ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ مثلاً درخت بڑھتا ہے اور اس کے متوالی حلقے جوں کے توں سلامت رہتے ہیں (یہ مثال برگساں کی نہیں ہے) اس طرح دنیا روز بہ روز کامل سے کامل تر اور شاداب سے شاداب تر ہوتی جا رہی ہے۔

جو چیز واقع ہوتی ہے وہ وجدان کے حافظے میں (جو دماغ کے جبلی حافظے کا عکس ہے) علیٰ حالہٖ باقی رہتی ہے اس بقا کا دوسرا نام "مرورِ" ہے اور نئی تخلیق کا نتیجہ "جوشِ حیات"¹ کہلاتا ہے۔ وجدان کے خالص حافظے کی صحت و ثبات کا تعلق تہذیبِ نفس سے ہے اور اگرچہ برگساں یہ نہیں بتاتا کہ نفس کی اس تہذیب کے لئے کون سے اعمال ضروری ہیں لیکن تاڑنے والے تاڑ جاتے ہیں کہ وہ یوگیوں کی ریاضتوں سے زیادہ فرق نہیں رکھتے۔

اگر کوئی شخص برگساں کے فلسفے پر منطق جیسی بیہودہ اور بازاری چیز کے انطباق کی جرأت کرے تو اس "فلسفۂ تغیر" میں اسے بعض پیچیدگیاں اور الجھنیں نظر آئیں گی۔ برگساں ماہرِ ریاضیات کی مذمت اور تضحیک سے کبھی تھکتا یا چوکتا نہیں کیوں کہ اس غریب کا قصور یہ ہے کہ وہ وقت کو ایک ایسا سلسلہ سمجھتا ہے جس کے اجزا ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں۔ لیکن برگساں کے دعوے کے مطابق اگر دنیا میں واقعی کوئی خالص جدّت ہے اور اس میں جو کچھ واقع ہوتا ہے وہ حقیقت میں ہمیشہ باقی رہتا ہے تو کسی ابتدائی زمانہ کے موجودات کا موقت مجموعہ بعد میں آنے والے زمانہ کے مجموعہ کا لازماً ایک جزو ہوگا پس کل اور جزو کے اس علاقہ کی رو سے مختلف اوقات میں دنیا کی حالتوں کے مجموعوں سے ایک ایسا سلسلہ مرتب ہوگا جس میں وہ تمام خصوصیات پائی جائیں گی جن کی ایک ماہرِ ریاضیات کو ضرورت ہوتی ہے اور جنھیں برگساں دریا برد کر دینے کا دعویٰ کرتا ہے۔ ماسوا اس کے دنیا کی پچھلی حالتوں پر جن نئے عناصر کا وقتاً فوقتاً اضافہ ہوا ہے وہ اگر پرانے عناصر سے جدا نہیں ہیں تو خالص جدّت کہاں باقی رہی اور تخلیقی ارتقا نے کیا خاک خلّاقی کی۔ بہرحال برگساں فلوطینوس کے نظامِ فلسفہ سے انچ بھر تجاوز نہیں کرتا۔ اس دشواری کو وہ ہرچند یہ کہہ کر رفع کرتا ہے کہ ہر وقوعہ ایک بالیدگی یا اپج ہے جس میں ہر چیز بدل جاتی ہے اور پھر جوں کی توں باقی رہتی ہے لیکن یہ تصور ایک چیستان سے زیادہ نہیں جسے ایک شخص جو خوش اعتقاد نہ ہو کبھی پوچھنے کی

---

¹ Elan vital کا ترجمہ ہے اور کسی اور صاحب کا کیا ہوا۔ مترجم

توقع نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ برگساں کا خطاب یکسر صوفیانہ ایمان سے ہے عقل سے نہیں ہے اور جہاں ایمان منطق کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے وہاں ہم جیسے بے بال و پر برگساں کی پرواز کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

اسی اثنا میں فلسفیانہ دنیا کی سطح زمین پر ایک پودا اوسا یا ابھرا جسے مختلف اور متعدد سمتوں سے سینچا اور پروان چڑھایا گیا۔ اسے عموماً "موجودیت"[۵۱] کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں اس کی خصوصیات صرف دو ہیں (۱) ایک اس کا اسلوب جو تحلیلی ہے اور (۲) دوسری اس کی مابعد الطبیعیت جو کثرت وجود کی قائل ہے۔ لیکن یہ فلسفہ سرتاسر موجودیتی نہیں کیوں بعض اعتبارات سے اس میں اور برکلے کی تصوریت میں خاصی مماثلت ہے البتہ کانٹ اور ہیگل کی تصوریت سے اسے دور کی بھی نسبت نہیں۔ اس لئے کہ یہ نظامات جس منطق پر مبنی ہیں اس کو یہ فلسفہ سختی سے رد کرتا ہے اس فلسفہ میں جیمس کے اس نظریہ کو اختیار کرنے اور ترقی دینے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے جو یہ بیان کرتا ہے کہ دنیا کا بنیادی مسالہ یا مورد نہ ذہنی ہے اور نہ مادی بلکہ ان دونوں کے برخلاف ایک ایسی چیز ہے جو ذہن اور مادہ دونوں سے زیادہ بسیط اور زیادہ اساسی ہے اور جن سے مادے اور نفس دونوں کی ترکیب اور تشکیل عمل میں آئی

انیسویں صدی کے قرنِ آخر میں جو مشاہیر بہ قید حیات تھے ان میں جیمس ہی وہ پہلا اور آخری شخص تھا جس نے المانوی تصوریت کا طبقہ الٹ دینے کی پر زور کوشش کی بیٹلر اور ڈیوی کو ان دنوں میں نہ کوئی جانتا تھا اور نہ مانتا تھا خود جیمس کی حالت یہ تھی کہ دنیا اسے صرف ایک نفسیات داں سمجھتی تھی جس کی فلسفے میں کوئی خاص اہمیت یا وقعت نہیں ہوا کرتی۔ لیکن ۱۹۰۰ء کے آغاز سے بالکل کایا پلٹ ہوگئی المانوی تصوریت کی مخالفت کا طوفان چاروں طرف اس شدت سے اٹھ کھڑا ہوا جس کا کسی کو سان گمان تک نہ تھا۔ لیکن اس سے یہ خیال نہ کیجئے کہ یہ ساری مخالفت صرف

---

۵۱ Realism کا ترجمہ ہے۔ مترجم

نتائجیت ہی کی طرف سے تھی۔ بلکہ اس میں خالص نفسی نقطہ ہائے نظر کو بھی بہت زیادہ دخل تھا۔ سرزمین المانیہ میں فریگ کی تصانیف (جو ہر چند ۱۸۷۹ میں شائع ہوئیں مگر ابھی تھوڑے دن تک کسی نے سنجیدگی سے ان کا مطالعہ نہیں کیا تھا) کے علاوہ ہسترل کی کتاب "منطق پر چند خیالات" نے (جو ۱۹۰۰ء میں چھپی اور ایک یادگار تصنیف ثابت ہوئی) بہت جلد اپنے وسیع اثرات پیدا کرلئے اس کے سوا مینانگ کی دو تصنیفوں یعنی "مسلّمات" (مطبوعہ ۱۹۰۲) اور "نظریۂ اشیاء اور نفسیات" (مطبوعہ ۱۹۰۴ء) نے بھی اس معاملہ میں بہت اثر ڈالا۔ انگلستان میں جی۔ای مور اور میں نے انھی کے مماثل نظریات کی وکالت شروع کی۔ "تصدیق کی ماہیت" کے عنوان سے مور کا ایک نہایت معرکتہ الآرا مضمون ۱۸۹۹ء میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اس کی تصنیف "مبادی اخلاقیات" ۱۹۰۳ء میں چھپی۔ میری پہلی کتاب "فلسفہ لائب نز" ۱۹۰۰ء میں مطبع سے باہر آئی اور دوسری "مبادی ریاضیات" ۱۹۰۳ء میں تصنیف اور طبع ہوئی فرانس میں اسی قسم کے فلسفہ کو کوتراٹ نے بڑی آب و تاب سے پیش کیا۔ امریکہ میں ولیم جیمس کی "بنیادی تجربیت" کو (جس میں اس کی نتائجیت کا کوئی شائبہ نہ تھا۔) نئی منطق میں سمو دیا گیا۔ جس سے ایک بالکل نیا فلسفہ نمودار ہوا۔ یہ فلسفہ نوموجودیت کہلاتا ہے اور باوجودے کہ ماخ کی تصنیف "تحلیل احساسات" (مطبوعہ ۱۸۸۹ء) میں اس کے بعض اجزا موجود تھے اور وہ مذکورہ بالا یوروپی تصانیف کے مقابلہ میں زماناً مؤخر تھا لیکن وہ ان سب سے بہ درجہا زیادہ انقلاب انگیز ہے۔

اس نئے فلسفہ نے اب تک کوئی قطعی صورت اختیار نہیں کی بلکہ بعض اعتبارات سے ہنوز خام اور نامکمل ہے۔ مزید بریں اس کے مختلف وکیلوں اور داعیوں میں زبردست اختلافات بھی ہیں پھر اس کے اجزا رکسی قدر عسیرالفہم اور ادق بھی ہیں۔ غرض ان تمام وجوہ کی بنا پر ہم یہاں اس کے صرف چند نمایاں پہلو پیش کرسکتے ہیں اس سے زیادہ کی نہ ہم سے اُمید رکھنی چاہیئے اور نہ ایک مختصر مقالے میں تفصیل کی گنجائش ہوتی ہے۔

اس نئے فلسفہ کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا کوئی خاص فلسفیانہ اسلوب نہیں اور جب کوئی خاص اسلوب ہی نہیں تو پھر اس کے ذریعہ کسی خاص قسم کے علم کے حصول کا سوال ہی سرے سے بے معنی ہے۔ یہ فلسفہ سائنس اور فلسفہ دونوں کو ایک جانتا ہے۔اس کے نزدیک اُن میں آپس میں فرق صرف اتنا ہے کہ مخصوص علوم جزئی مسائل سے بحث کرتے ہیں اور فلسفہ ان سے زیادہ عام اور کلی مسئلوں پر نظر ڈالتا ہے پھر ایک اور فرق ان میں وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ فلسفہ ایسے فرضیات مرتب کرتا ہے جن کا تجربی استشہاد ہنوز انسانی دسترس سے بالکل باہر ہے اس فلسفہ کی نظر میں علم سراسر سائنس ہے یعنی وہ یہ کہتا ہے کہ علم کی جانچ اور تصدیق سائنس کے اصولوں اور طریقوں پر ہونی چاہئیے۔ اس فلسفہ کا مقصد یہ کبھی نہیں کہ کائنات پر مجموعی حیثیت سے بحث وتحیص کی جائے یا کسی جامع و مانع نظام کی تشکیل عمل میں لائی جائے بلکہ اسے اپنی منطق کے بل بوتے پر اس بات کا پکا یقین ہے کہ دنیا کی سخت سخت اور بے ترتیب فطرت سے انکار کرنے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے۔ اُسے دنیا کے "عضوی" ہونے سے انکار ہے مگر صرف وہیں تک جہاں تک کہ اس لفظ سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ اگر جزو کو پورے طور پر سمجھ لیا جائے تو کل کا استنباط بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ علاوہ ان تمام باتوں کے وہ المانوی تصوریت کی غلطی کا ارتکاب اور اعادہ خاص طور پر نہیں کرتا۔ یعنی یہ کوشش کبھی نہیں کرتا کہ علم کی ماہیت سے دنیا کی ماہیت کا استنباط عمل میں لایا جائے۔ وہ علم کو محض ایک طبعی واقعہ سمجھتا ہے جس کی نہ کوئی صوفیانہ وقعت ہے اور نہ کوئی کونیاتی اہمیت۔

اس نئے فلسفہ کے خاص سرچشمے تین ہیں (۱) علم کا نظریہ (۲) منطق اور (۳) ریاضیات کے اصول۔ کانٹ اور اس کے بعد کے لوگ عام طور پر یہ سمجھتے تھے کہ علم ایک باہمی تعامل ہے جس میں معلومہ شے ہمارے علم کی بدولت کچھ بدل جاتی ہے اور بنا بریں بعض ایسے خواص ہمیشہ اپنے میں رکھتی ہے جن کو ہمارے علم سے نسبت حاصل ہے۔ اس کے سوا وہ (بہ استثنار کانٹ) یہ بھی مانتے تھے کہ جو چیز علم میں نہیں آتی اس کا وجود محال منطقی ہے۔ لہٰذا علم کے

ذریعہ جن خواص کا ہم ادراک کرتے ہیں وہ واقع میں ایسے ہیں جن کا ہر چیز میں پایا جانا ضروری ہے اس طرح مدار بحث امر یہ تھا کہ اگر ہم صرف علم کی شرائط ہی کا غائر نظر سے مطالعہ کریں تو حقیقی دنیا کے متعلق بہت کچھ انکشافات عمل میں لا سکتے ہیں۔ اس کے برعکس نئے فلسفہ نے ایک دعویٰ تو یہ کیا کہ علم کو معلومہ اشیاء کی کوئی پرواہ نہیں اور دوسرا یہ کہ علم میں نہ آنے والی چیزوں کے معدوم ہونے کی کوئی معقول تو کیا نامعقول وجہ بھی موجود نہیں ہے۔ ان دعووں کا نتیجہ یہ نکلا کہ علم کا نظریہ جو اب تک کائنات کے طلسم اسرار کی لوح بنا ہوا تھا اپنی ساری اہمیت یک لخت کھو بیٹھا اور ہم کو سائنس کی محنت طلب تحقیقات کی طرف رجوع کرنا پڑا۔

علیٰ ہذا القیاس منطق میں سالمیت نے "عضوی" نظریہ کی جگہ حاصل کی۔ اب تک عام خیال یہ تھا کہ جب کوئی چیز کسی طرح متاثر ہوتی ہے تو دوسری چیزوں کی داخلی فطرت بھی اس کا اثر قبول کرتی ہے۔ کیونکہ جملہ چیزیں ایک رشتہ میں منسلک اور مربوط ہیں۔ اسی طرح اگر ہمیں کسی چیز کا مکمل علم حاصل ہو تو پوری کائنات کا مکمل علم بھی بخوبی حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن نئی منطق نے بلند آہنگی سے یہ دعویٰ کیا کہ کسی چیز کی ذاتی ماہیت سے منطقی طور پر یہ استنباط کبھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس چیز کو دوسری چیزوں کے ساتھ فلاں فلاں علاقے حاصل ہیں۔ اس اجمال کو ہم ایک مثال سے واضح کئے دیتے ہیں۔ لائب نز ایک جگہ کہتا ہے (اور اس باب میں وہ جدید تصوریئین سے لفظ بہ لفظ متفق ہے) کہ اگر کوئی شخص یوروپ میں ہو اور اس کی بیوی ہندوستان میں وفات پا جائے تو انتقال کے وقت اس میں ایک معنوی تغیّر پیدا ہوگا لیکن فہم عامّہ کا فتویٰ اس بارے میں یہ ہے کہ اس وقت تک کوئی معنوی تغیر پیدا نہ ہوگا جب تک کہ وہ اپنی خانہ بربادی کی خبر نہ سن لے گا۔ نئے فلسفہ کا نقطۂ نظر بھی یہی ہے اور اس کے نتائج اتنے دور رس ہیں کہ بادی النظر میں ہم ان کا احصار نہیں کر سکتے۔

ریاضیات کے اصولوں کو فلسفہ سے ہمیشہ گہرا تعلق رہا ہے وجہ یہ ہے کہ ریاضیات میں اعلیٰ درجہ کا یقینی بدیہی علم پایا جاتا ہے اور فلسفہ کا بڑا حصہ بدیہی علم کا دلدادہ ہے۔ ایلیائی زینو اور

اس کے بعد کے جملہ تصوری فلسفی اس بات کے دل و جان سے خواہش مند رہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ریاضیات کی ساکھ میں بٹہ لگائیں۔ چنانچہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے انھوں نے ایسے تناقضات بہت سے گھڑ لئے جن کا واحد مدعا یہ ثابت کرنا تھا کہ ماہرانِ ریاضیات کی رسائی مابعد الطبیعی حقیقت تک ہرگز نہیں ہو سکتی۔ صرف فلاسفہ ہی بہتر قسم کے مابعد الطبیعی حقایق بہم پہنچا سکتے ہیں۔ کانٹ کے فلسفے میں اس قسم کے دعوے بڑی تعداد میں موجود ہیں اور ہیگل تو اس بارے میں اس سے میلوں آگے ہے۔ لیکن انیسویں صدی کے دوران میں ماہران ریاضیات نے کانٹ کے فلسفہ کے اس حصہ کو بڑی بے دردی سے کچلا چنانچہ لوباچیوسکی[۵۱] نے غیر اقلیدسی ہندسہ ایجاد کر کے کانٹ کی قبل تجربی حسیات کی ریاضیاتی دلیل کے پرزے اڑا دئے۔ ویرسٹراس[۵۲] نے بہ دلائل یہ ثابت کر دیا کہ تسلسل میں اقل ناتمناہی (یا اجزائے لاتیجزّی) کو کوئی دخل نہیں۔ گیارگ کنتار[۵۳] نے تسلسل اور ناتمناہیت کے ایسے نظریے وضع کئے جنھوں نے فلاسفہ کے مقبول عام استعاروں کا خاتمہ کر دیا اور فرگیک[۵۴] نے یہ منوا کر چھوڑا کہ حساب منطق سے حاصل ہوا ہے حالانکہ کانٹ کو اس سے انکار تھا۔ غرض کہ یہ تمام نتیجے معمولی ریاضیاتی طریقوں سے حاصل ہوئے ہیں اور بنا بریں شک و شبہ سے ویسے ہی بالاتر ہیں جیسے کہ ریاضی کے پہاڑے۔ فلسفیوں نے اس صورتِ حال پر توجہ تو کی مگر ان مصنفوں کی تحریرات کا مطالعہ گوارا نہیں کیا جن کا ادہر ذکر آیا ہے البتہ نئے فلسفہ نے ضرور ان نتائج سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور اس میں کامیاب رہا۔

---

۵۱ پورا نام نکولائی آئوانو وچ لوباچیوسکی ۱۷۹۳ - ۱۸۵۶ روسی ماہر ریاضیات

۵۲ جرمن ماہر ریاضیات اس نے ۱۸۹۷ میں وفات پائی جامعہ برلن میں ریاضیات کا پروفیسر تھا۔

۵۳ ۱۸۴۵ - ۱۹۱۸ جرمن ماہر ریاضیات۔

۵۴ گاٹ لوب فرگیک سرزمین المانیہ کا مشہور ریاضی داں۔ مترجم

جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ آج طویل جہالت کے ان طرفداروں کے مقابلہ میں ہر طرح سے سرخرو اور کامراں ہے۔

نیا فلسفہ محض تنقیدی ہی نہیں بلکہ تعمیری بھی ہے لیکن اس کی تعمیر ہو بہو سائنس کی تعمیر ہے۔ کوئی فرق نہیں۔ سائنس ہی کی طرح وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے اور ہر طرح اطمینان اور جانچ کر لینے کے بعد بڑھتا ہے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہے اور پھونک پھونک کر اٹھاتا ہے۔ اس کی تعمیر کا ایک خاص فنی اسلوب ہے جسے ریاضیاتی منطق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ منطق ریاضیات کی ایک نئی شاخ ہے اور اس کی دوسری تمام اور نئی شاخوں کے مقابلہ میں فلسفہ سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہے۔ اس منطق کی ایجاد سے پہلے نہ یہ پتہ چلایا جا سکتا تھا کہ سائنس کے کسی نظریے کا فلسفے پر کیا اثر پڑتا ہے اور نہ یہ تعین کیا جا سکتا تھا کہ عوامل میں سے کن کو تسلیم کرنا چاہیئے اور کن کو نہیں۔ لیکن اس ریاضیاتی منطق نے ان سب کو ممکن کر دکھایا۔ ریاضیات اور طبیعیات کے فلسفہ نے اس اسلوب کی مدد سے بڑی زبردست ترقیاں حاصل کی ہیں۔ چنانچہ اس کی برکت سے طبیعیات کو جو پھل ملے ہیں ان کے ایک جزو کو ڈاکٹر وہائٹ ہیڈ[1] نے اپنی تین جدید تصنیفوں میں شرح وبسط سے قلم بند کیا ہے۔ قوی توقع ہے کہ اس اسلوب کی بدولت دوسرے میدانوں میں بھی خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوگی اور یہ توقع کچھ بے بنیاد نہیں۔ یہاں پر ہم اس اسلوب کو اس لئے ہدیۂ ناظرین نہیں کر سکتے کہ وہ بے حد فنی ہے اور یہی اس کا نقص ہے اگر یہ کوئی نقص ہے۔

جدید فلسفہ کثرت وجود کا بڑا حصہ قضایا کی منطقی تحلیل پر مشتمل ہے لیکن اس اسلوب کو جب پہلے پہل استعمال میں لایا گیا تو صرف ونحو کا بڑا اہتمام کیا گیا چنانچہ میناگ کہتا ہے کہ جب ہم واقعتہً یہ کہہ سکتے ہیں کہ "گول مربع موجود نہیں ہے" تو ایسے معروض کا ہونا ضروری ہے جو

---

[1] علم طبیعی کے مبادیات مطبوعہ ۱۹۱۹ - تصور فطرت مطبوعہ ۱۹۲۰ اور اصول اضافیت مطبوعہ ۱۹۲۲- یہ تینوں کتابیں جامعۂ کیمبرج کے مطبع میں چھپیں۔ مصنف

گول مربع ہو خواہ وہ غیر موجود ہی کیوں نہ ہو۔ راقم الحروف بھی پہلے پہل اس قسم کے استدلال سے محفوظ نہیں رہا۔ لیکن ۱۹۰۵ء میں اسے معلوم ہو گیا کہ اس سے گریز کیونکہ ممکن ہے۔ کیوں کہ اس سنہ میں اس نے "بیانات" کا نظریہ دریافت کر لیا جس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ جب ہم "گول مربع موجود نہیں ہے" کہتے ہیں تو گول مربع کا ذکر نہیں کرتے کیوں کہ گول مربع جیسے مہمل موضوع پر وقت صرف کرنا ایک خاصی بیہودگی ہے لیکن ایسے قضایا سے منطقی نظریوں کے بہترین معیار ہاتھ لگتے ہیں۔ بہت سے منطقی نظریئے صرف اس لئے رد کر دئے جاتے ہیں کہ وہ بیہودگیوں کی طرف مودّی ہوتے ہیں۔ لہذا منطقی کو ہمیشہ بیہودگیوں سے واقف اور ہوشیار رہنا چاہیئے جو شخص معملی (تجربہ خانہ کے) اختیارات کے افادہ سے بے خبر ہوتا ہے۔ وہ انھیں ہیچ اور ناچیز شمار کرتا ہے حالانکہ وہ عظیم الشان نتائج کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ یہی حال بیہودگیوں کا ہے جو منطقی کے اختیارات اور اس کی زرّین کامیابیوں کے مقدمے ہیں۔

نئے فلسفے میں چونکہ قضایا کی منطقی تحلیل کا کافی حصہ ہے۔ اس لئے شروع شروع میں فلاطون اور قرون وسطی کی موجودیت کا رنگ اس پر بے حد غالب رہا۔ اس زمانہ میں وہ مجردات اور مادّیات دونوں کو یکساں سمجھتا تھا یعنی اس کی نظر میں دونوں کی حیثیت وجود بالکل ایک تھی۔ مگر جیسے جیسے اس کی منطق پختہ ہوتی اور کمال کو پہنچتی گئی ویسے ویسے اس نظریہ سے وہ دست کش ہوتا گیا اب جو اثر اس پر پھر بھی باقی رہ گیا ہے وہ کچھ ایسا نہیں ہے جس سے فہم عامہ کو کوئی صدمہ پہنچ سکے۔

نئے فلسفہ پر شروع میں نظری ریاضیات کا اثر بے حد غالب تھا لیکن موجودہ زمانہ میں اس کی جگہ طبیعیات نے لے لی ہے۔ یہ انقلاب آئن سٹائن کا پیدا کردہ ہے۔ جس نے زمان، مکان، اور مادّہ کے پرانے تصوروں کی دنیا بالکل ہی بدل ڈالی۔ ہر چند یہاں نظریۂ اضافیت کی تشریح کا کوئی محل نہیں، تاہم اس کے فلسفیانہ نتائج کو مختصر لفظوں میں بیان کر دینا بالکل ناگزیر ہے۔

فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اضافیت کے نظریہ میں دو نہایت اہم نکات پوشیدہ ہیں:-

(۱) ایک یہ کہ ایسے واحد اور ہمہ گیر زمان کا کہیں وجود نہیں جس میں کائنات کے جملہ حوادث اپنی اپنی جگہ پر متمکن ہوں اور (۲) دوسرا یہ کہ طبیعی مظاہر کے مشاہدہ میں اگرچہ وضعی یا موضوعی جزو بہت بڑا ہے ——— اتنا بڑا کہ اب سے پہلے اس کا پورے طور پر کبھی احساس نہیں کیا گیا ——— لیکن اس کو ایک ریاضیاتی اسلوب کے ذریعہ بہ آسانی رد کیا جا سکتا ہے۔ یہ اسلوب پیمائشی رقموں کا[۵۱] احصار کہلاتا ہے اور میں اس پر ایک لفظ نہیں کہوں گا کیوں کہ اس کی فنی عبوست ناقابل برداشت ہے۔

زمان کے متعلق شروع ہی میں یہ امر ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ ہم یہاں کسی فلسفیانہ تخمین میں سر نہیں کھپا رہے بلکہ ایک ایسے نظریہ سے بحث کر رہے ہیں جو اختباری نتائج کی پیداوار ہے اور ریاضیاتی ضابطوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان دونوں زمانوں میں بالکل وہی فرق ہے جو مان ٹس کیو[۵۲] کے نظریوں اور امریکی دستور میں ہے۔ مختصر یہ کہ زمانی نظام ہر جگہ یکساں نہیں ہوتا۔ جو حوادث مادّے کے ایک قطعے پر رونما ہوتے ہیں وہ اس ناظر کے نقطۂ نظر سے ایک خاص زمانی نظام رکھتے ہیں جو مادّے کے مذکورہ قطعہ کے ساتھ ساتھ گردش کر رہا ہے۔ اور جو حوادث مادّے کے دوسرے قطعوں پر ——— ان قطعوں پر جن کے مقامات مختلف ہیں ——— رونما ہوتے ہیں۔ ان کا لازماً کوئی خاص یا معیّن زمانی نظام نہیں ہو سکتا۔ اپنے مافی الضمیر کو ہم ایک مثال کے ذریعہ واضح کئے دیتے ہیں۔ اگر کوئی روشنی زمین سے سورج کی طرف روانہ کی جائے اور وہاں سے پھر وہ زمین کی طرف لوٹے تو اس کی روانگی اور واپسی میں سولہ[۱۶] منٹ صرف ہوں گے یعنی وہ جس وقت زمین سے روانہ ہوئی تھی۔ اس کے ٹھیک سولہ منٹ بعد زمین پر واپس ہوگی اب ان سولہ منٹوں میں جو حوادث زمین پر رونما ہوں گے وہ سورج پر اس کے درود سے

---

۵۱ Tensor Calculas کا ترجمہ ہے۔ مترجم

۵۲ Montesquieu شارل زمان تس کیو ۱۶۸۹ - ۱۷۵۵ فرانسیسی فلسفی اور مصنف۔ مترجم

نہ ماقبل ہوں گے اور نہ مابعد۔ فرض کیجئے کہ ناظروں کی ایک بڑی تعداد زمین اور سورج کے لحاظ سے جملہ ممکن سمتوں میں گردش کر رہی ہے اور ان سولہ منٹوں میں زمین پر رونما ہونے والے حوادث کو اور سورج پر اس روشنی کے پہنچنے کو بہ نظرِ غور دیکھ رہی ہے پھر یہ بھی مان لیجئے کہ ان میں سے ہر ایک کی رفتار روشنی کی رفتار کے مساوی ہے اور ہر ایک کے پاس ایک صحیح وقت موجود ہے تو اب یہ ہوگا کہ ان میں سے بعض تو یہ خیال کریں گے کہ ان سولہ منٹوں میں جو حادثہ زمین پر رونما ہوا وہ سورج پر روشنی کے پہنچنے کے پہلے کا تھا بعض یہ سمجھیں گے کہ وہ اس کے ورود کے ہم وقت تھا اور بعض یہ جانیں گے کہ وہ اس کے بعد کا تھا۔ اگر صحت پر ہیں تو سب ہیں اور غلطی پر ہیں تو سب ہیں۔ لیکن طبیعیات کے غیر شخصی زاویہ نظر سے ان سولہ منٹوں میں جو حوادث زمین پر رونما ہوتے ہیں وہ سورج پر روشنی کے پہنچنے سے نہ پہلے کے ہیں نہ بعد کے اور نہ برابر کے۔ پس مادّے کے ایک قطعہ پر جو حادثہ ل رونما ہوا ہے اس کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ مادّے کے دوسرے قطعہ پر رونما ہونے والے حادثہ ب سے بالتحقیق مقدم ہے کیوں کہ بہ صورت اثبات یہ لازمی ہوگا کہ نور ل سے ایسے وقت نکلے جبکہ پہلا حادثہ رونما ہوا (ل کے وقت کے مطابق) اور ب پر ایسے وقت پہنچے جبکہ دوسرا حادثہ ابھی رونما نہیں ہوا (ب کے وقت کے مطابق) ورنہ دونوں حوادث کا زمانی نظام تو ناظر کے ساتھ ساتھ بدلتا جاتا ہے اور کسی طبیعی واقعہ کا استحضار نہیں کرتا۔

اگر نور کی رفتار کے مقابلے کی رفتاریں عام ہوتیں تو نہ ہم اطبّا کے پھندے سے آج چھٹکارا پاتے اور نہ طبیعی دنیا پر سائنس کے اسالیب کے ذریعے بحث کرنے کی نوبت آتی۔ لیکن اگر طبیعیات کا انکشاف ہو چکا ہے تو اس کا آئن شٹائنی طبیعیات ہونا ضروری ہے۔ اس واسطے کہ نیوٹنی طبیعیات صریحاً بیکار اور ناقابل انطباق ہے۔ تاب کار جواہر ایسے زرات خارج کرتے ہیں جو قریب قریب نور کی رفتار سے حرکت کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم اگر اضافیت کی نئی طبیعیات کو کام میں نہ لائیں تو ان کے طور طریق اور کردار کو سمجھنا ہمارے لئے قطعاً ناممکن ہو۔

قدیم طبیعیات کا ناقص ہونا کسی مزید ثبوت کا محتاج نہیں۔ اور اس نقص کا "بالکل معمولی" ہونا فلسفیانہ نقطۂ نظر سے کوئی معقول عذر نہیں۔ ہمیں غور اس واقعہ پر کرنا چاہیئے کہ جو حوادث مختلف مقامات پر رونما ہوتے ہیں ان میں آپس میں ایک حد تک کوئی معین زمانی نظام نہیں ہوتا۔ اور اسی واقعہ پر سے "مکان" اور "زمان" کی دو مختلف اصطلاحوں کی جگہ "مکانِ زمانہ"[1] کی واحد اصطلاح کو دی گئی۔ پس جس زمان یا وقت کو ہم اب تک کائناتی سمجھا کئے وہ حقیقت میں "مقامی وقت" ہے یعنی ایک ایسا وقت جو زمین کی گردش کا پابند اور کلیّت کے منصب سے اتنا ہی دور ہے جتنا کہ اس جہاز کا وقت جو بحر اوقیانوس کو عبور کرتے ہوئے اپنے گھنٹوں کو نہیں بدلتا۔

جب ہم اس بات پر غور کرتے ہیں کہ زمان کو ہمارے معمولی معمولی ادراکات میں کتنا زبردست دخل حاصل ہے اور اس کی اصلی حالت کیا ہے تو فوراً یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے نقطۂ نظر میں ایک نہایت گہری اور اہم تبدیلی کا پیدا ہونا ضروری بھی ہے اور یقینی بھی۔ مثال کے طور پر "ترقی" کے ادراک کو لیجئے۔ اگر زمانی نظام کسی اصول اور قاعدہ کا پابند نہیں ہے تو وقت کی پیمائش کے متعلق جو قرار داد طے پائیگی اس کے مطابق ترقی اور تنزل دونوں کا احتمال یکساں ہوگا۔ اسی طرح مکانی بُعد کا ادراک بھی بہت متاثر ہوتا ہے فرض کیجئے کہ دو ناظر دو مقاموں کے درمیانی فاصلہ کو انتہائی صحت کے ساتھ ناپنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں لیکن اگر ان کی اضافی حرکت تیز ہے تو ان کے تخمینے بالکل مختلف ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ فاصلہ کے تصور میں بے حد ابہام پیدا ہوگیا ہے کیونکہ فاصلہ ہوگا مادی چیزوں کے بیچ میں۔ خالی مکان کے نقطوں کے بیچ میں نہیں جو محض مفروضات ہیں۔ اس کے سوا یہ فاصلہ ایک خاص وقت کا پابند ہوگا کیوں کہ دو اجسام کا درمیانی بُعد ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور خاص وقت کی

---

[1] Space Time کا ترجمہ ہے مکان + زمان مترجم

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک موضوعی ادراک ہے اور اس راہ پر موقوف ہے جس سے ناظر گذر رہا ہے مزید بریں آج ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ فلاں جسم فلاں وقت موجود تھا البتہ صرف اتنا کہہ سکتے ہیں اور کہنا چاہئے کہ فلاں حادثہ فلاں وقت حاضر اور واقع تھا۔ دو حوادث کے بیچ میں ہمیشہ ایک خاص علاقہ ہوا کرتا ہے جو ان کا درمیانی " وقفہ " کہلاتا ہے۔ اور ہر قسم کے ناظر سے بے نیاز اور مستغنی ہوتا ہے اس " وقفہ " کی تحلیل مختلف ناظر مختلف مکانی اور زمانی مرکبوں میں کرتے ہیں لیکن یہ تحلیل خارجیت سے گراں بار نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ یہ وقفہ تو بے شک ایک خارجی طبیعی واقعہ ہے لیکن مکانی اور زمانی عناصر میں اس کی تقسیم خارجی طبیعی واقعہ نہیں ہے۔

مادہ کے متعلق ہمارا پرانا اور سہل تصور یہ تھا کہ وہ " ٹھوس " ہے لیکن یہ " ٹھوس پن " اب رخصت ہوتا جارہا ہے۔ مادہ کا کوئی ٹکڑا آج " حوادث کے ایک سلسلہ " سے زیادہ نہیں جو بعض قوانین اور نوامیس کا پابند ہے۔ اور ان کے مطابق وقوع پذیر ہوتا ہے۔ مادہ کے مذکورہ بالا تصور نے ایسے وقتوں میں جنم لیا جب کہ فلاسفہ کو " جوہر " کے تصور کے صحیح اور مستند ہونے میں کوئی شک اور شبہ نہیں تھا۔ مادے کو انھوں نے ایک ایسا " جوہر " سمجھ رکھا تھا جو ہمیشہ مکان اور زمان میں پایا جاتا ہے اور ذہن ایک ایسا " جوہر " تھا جو صرف زمان کا پابند ہے۔ اور مکان سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا۔ مابعد الطبیعیات میں " جوہر " کے ادراک کا " ٹھوس پن " رفتہ رفتہ " غائب " ہوتا گیا۔ لیکن طبیعیات میں وہ جوں کا توں باقی رہا۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے کوئی نقصان متصور نہ تھا۔ لیکن اضافیت کے نظریہ نے ایجاد ہو کر پرانی کائنات بالکل بدل دی۔ جوہر کا روایتی ادراک دو عناصر سے مرکب تھا جن میں سے (۱) پہلا عنصر تو یہ تھا کہ جوہر میں ایک منطقی خاصہ پایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ کسی قضیہ میں وہ جب کبھی واقع ہوگا ہمیشہ موضوع (مبتدا) کی حیثیت سے ہوگا محمول (خبر) کی حیثیت سے نہیں۔ اور (۲) دوسرا یہ کہ وہ ایک ایسی چیز تھا جو زماناً دائم اور قائم رہتی ہے۔ یا زمان سے بالاتر ہوتی ہے ان دو خاصتوں میں کوئی لازمی ربط نہیں تھا۔ لیکن اس بات کا ادراک نہیں کیا گیا۔ کیونکہ طبیعیات

کہتی تھی کہ مادّے کے ذرّے لافانی ہیں اور الہیات کہتی تھی کہ روح لافانی ہے۔ لہذا دونوں کے متعلق یہ سمجھا گیا کہ ان میں جواہر کے دونوں خواص پائے جاتے ہیں۔ لیکن اب طبیعیات ہمیں اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ ہم سریع الفنا حوادث کو حقیقی معنوں میں "جواہر" جانیں یعنی انہیں ایسے موضوع سمجھیں جو محمول نہیں ہو سکتے۔ مادّے کے جس ٹکڑے کو ہم ایک اور دوامی بائن سمجھتے ہیں۔ وہ حقیقت میں بہت سے کائنوں کی ایک لڑی ہے۔ گویا وہ سینما کا ایک منظر ہے جو بظاہر دکھلائی تو ایک دیتا ہے مگر حقیقت میں بہت سی چھوٹی چھوٹی تصویروں کا مجموعہ ہوتا ہے جب مادّہ کا یہ حال ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہی بات ذہن کے متعلق نہ کہیں واقعہ یہ ہے کہ دائم الحال نفس لافانی سالمہ کی طرح بالکل فرضی اور افسانوی ہے۔ دونوں کے دونوں حوادث کی لڑیاں ہیں اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ بعض دلچسپ علائق رکھتی ہیں۔

ماخ اور جیمس نے کہا تھا کہ ذہنی اور طبیعی دنیاؤں کا "مسالہ یا مواد" ایک ہے اور جدید طبیعیات اس بارے میں ان کی تائید کرتی ہے۔ "ٹھوس مادّہ" اب تک افکار اور دائم الحال نفس دونوں سے قطعاً مختلف تھا لیکن اب حالت اور ہو گئی ہے اب تو مادّہ اور نفس دونوں نے حوادث کے مجموعوں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ایسی صورت میں یہ خیال کرنا چنداں دشوار یا مشکل نہیں کہ ان دونوں کی تشکیل ایک ہی مواد سے عمل میں آئی ہے۔ اس کے سوا اب تک ذہن کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نقطۂ نظر کا مالک یا موضوع ہوا کرتا تھا۔ مگر یہ خصوصیت اب تو طبیعیات میں بھی پائی گئی ہے اور جہاں کہیں پائی گئی ہے ذہن سے بالکل بے لوث پائی گئی ہے۔ مثلاً فوٹو کے کیمروں کو پیش کیا جا سکتا ہے جن کو اگر مختلف مقامات پر نصب کر کے کسی ایک حادثہ کی تصویر لی جائے تو وہ اسی ایک "حادثہ" کو تو پیش ضرور کریں گے لیکن ان کے عکسوں میں اختلاف ہوگا۔ علیٰ ہذا جدید طبیعیات نے وقت پیماؤں اور پیمائشی جریبوں کو بھی موضوعی بنا دیا ہے۔ اب وہ براہ راست جو کچھ ظاہر کرتے ہیں وہ کوئی طبیعی واقعہ نہیں بلکہ طبیعی واقعہ کے ساتھ ان کی اضافت ہے اس طرح طبیعیات اور نفسیات کی درمیانی خلیج بڑی حد تک

پٹ گئی ہے اور ذہن اور مادّہ کی پرانی ثنویت کی دھجیاں فضائے بسیط میں کبھی کی اڑ چکی ہیں۔

اگر ہم یہاں پر اتنا بتلا دیں کہ جدید طبیعیات میں "قوت" جیسی کوئی چیز موجود نہیں ہے تو غالباً بے محل نہ ہوگا۔ بشرطیکہ اس لفظ سے اس کے پرانے یا مستعمل معنے مراد لئے جائیں پہلے عام طور پر ہم یہ خیال کرتے تھے کہ سورج زمین پر ایک قوت صرف کرتا ہے۔ مگر اب خیال یہ ہوگیا ہے کہ سورج کے قرب و جوار میں جو مکانی زمانی نظام ہے اس کا ڈول کچھ ایسا ہے کہ زمین کو دوسرے مداروں کے مقابلہ میں موجودہ مدار پر گردش کرنے میں بہت کم مزاحمت اُٹھانی پڑتی ہے۔ اس طرح جدید طبیعیات کا بڑا اصول "اقل عمل کا اصول" ہے یعنی کوئی جسم ایک مقام سے دوسرے مقام کو جاتے ہوئے ہمیشہ وہی راہ اختیار کرے گا جس میں عمل کی سب سے کم ضرورت ہو۔ (عمل اگرچہ ایک ٹھیٹھ فنی اصطلاح ہے لیکن یہاں پر اس کے مفہوم کی وضاحت چنداں ضروری نہیں ہے) اخبارات اور بعض اہل قلم حضرات اپنی تحریروں میں لفظ "حرکت" کا استعمال بڑے زور و شور سے کرتے ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے استعمال سے ان کی عبارتوں میں قوت اور تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ لیکن خود "حرکت کے علم[ف]" کا حال یہ ہے کہ اس میں حرکت کی قسم کی کوئی چیز پائی ہی نہیں جاتی اس کے برعکس وہ تو کاہلی کی بڑی دلدادہ ہے اور اسی بنا پر یہ چاہتی ہے کہ ہر چیز کا استنباط سستی کے ہمہ گیر قانون سے عمل میں لایا جائے۔ علاوہ اس کے کسی جسم کو دوسرے جسم کی حرکتوں پر کوئی "اقتدار" بھی حاصل نہیں ہے۔ جدید سائنس کی دنیا کو ان لوگوں کی دنیا سے کوئی نسبت نہیں جو "بڑے بڑے قانونوں" اور "طبیعی قوتوں" کی بڑ ہانکتے ہیں۔ البتہ لاؤزو کی دنیا سے اسے گہری مشابہت حاصل ہے۔

پرانے فلسفوں کے مقابلہ میں کثرتیت اور موجودیت کا جدید فلسفہ بعض اعتباروں سے بہت کم نتیجہ خیز ثابت ہوا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں فلسفہ الہیات کا خانہ زاد غلام تھا۔ اور کتب

ف۔ Dynamics کا ترجمہ اور حرکیات کا مترادف لفظ۔ مترجم

فروشوں کی فہرستوں میں آج تک وہ دونوں ایک ہی عنوان کے تحت جگہ پاتے ہیں فلسفہ کا فریضہ عام طور پر یہ سمجھا گیا تھا کہ وہ مذہب کے حقایق عظمیٰ کو بہ دلائل و براہین ثابت کرے لیکن نئی موجودیت کو نہ یہ دعویٰ ہے کہ وہ انھیں ثابت کر سکتی ہے اور نہ اس پر اصرار کہ انھیں جھٹلا سکتی ہے۔ اس کا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ علوم کے اساسی تصورات کو چھانٹ لے اور مختلف علوم کو باہم ملا کر کائنات کے اس جزو کے متعلق ایک ہمہ گیر اور واحد نظریہ ترتیب دے جس کا علم سائنس کو ہو چکا ہے اور جس کی تحقیق اور کھوج میں اس نے زبردست کامیابی حاصل کی ہے۔ اسے یہ علم نہیں کہ معلومہ جزو کائنات کے ماوراء کیا ہے اور نہ اس کے پاس کوئی ایسا طلسم ہے جس سے وہ لاعلمی کو علم میں بدل دے۔ وہ عقلی لذات کے قدردانوں کو عقلی لذات بخشتی ہے لیکن بیشتر فلسفوں کی طرح ان میں زعم باطل پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ اگر وہ خشک اور فنی ہے تو یہ قصور اس کا نہیں کائنات کا ہے جو شاعروں اور صوفیوں کے احساسات کا مطلق پاس نہیں کرتی اور ریاضیات کی بڑی دلدادہ واقع ہوئی ہے۔ یہ امر غالباً افسوس ناک ہے لیکن ایک ماہر ریاضیات اس پر کوئی افسوس محسوس نہیں کر سکتا ۔

مسلمان اور کانگرس

جامعہ کے پچھلے نمبر (اگست) کا مضمون "مسلمان کانگرس، اور مسلم لیگ" غور و توجہ سے پڑھا گیا۔ یہ مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ "ایک مسلمان" نے بھیجا ہے آئندہ پرچوں میں اس موضوع پر اور مضمون بھی شائع کئے جائیں گے، انشاء اللہ (اڈیٹر)

جامعہ کے پچھلے پرچہ میں ایک قوم پرست مسلمان" نے کانگرس کے مسلمان حامیوں کا نقطۂ نظر نہایت خوبی اور وضاحت سے پیش کیا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کے ماننے سے انکار نہیں کہ مسلمانوں کا سیاسی انتشار حد سے گذر چکا ہے۔ سرسید کی حکمت عملی کبھی کی پرانی ہوگئی۔ لیگ نوابوں اور سروں کی سرپرستی میں گھٹ کر دم توڑ رہی ہے۔ مسٹر جناح اور مولانا شوکت علی کے خلوص کے ہم لاکھ معترف ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ نوجوان نسلوں کی پریشانیوں اور متوسط اور عام طبقوں کے خیالات کو یہ بزرگ نہ سمجھ سکتے ہیں اور نہ اُن کے مطالبات کے ترجمان ہوسکتے ہیں۔ طرابلس و بلقان، جزیرۂ عرب اور خلافت کے ہنگاموں کی یاد بھی اب باقی نہیں رہی۔ نئے زمانے کی سیاسی اور معاشی ضرورتوں نے مسلمانوں کو من حیث القوم ایک ایسی بھنور میں ڈال دیا ہے جس سے باہر نکلنے کی تدبیر ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ بزرگوں کے بتائے ہوئے رستے بند ہوچکے تھے۔ ضرورت تھی کہ نئے حالات کے پیش نظر زندگی کی کوئی نئی شاہراہ سوچی جاتی لیکن جنگ عظیم سے پہلے کے اور بعد کے ہنگاموں نے قوم کو اتنا تھکا دیا ہے کہ وہ اس اضمحلال میں دماغ کی قوتوں سے کام لینے کے قابل نہیں رہی۔ جمہور نہ کبھی سرکار پرست تھے اور نہ اُنھوں نے نوابوں اور سروں کو کبھی اپنا رہنما بنایا، اُن کی اپنی دنیا کچھ دنوں سے نہیں بلکہ اس سے بہت پہلے تاریک ہوچکی تھی۔ سرسید نے صرف مسلمانوں کے اعلیٰ متوسط طبقوں کی ٹمٹماتی ہوئی شمع کو بجھنے سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ علی گڑھ تحریک کو عام جمہور اسلام کی خوشنودی کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ دراصل خلافت کے ہنگاموں نے زندگی میں پہلی بار مسلمان عوام کو اپنا ہم نوا بنایا۔ اس تحریک کے اثرات کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کو خود اس میں شریک ہونے کا موقعہ ملا۔ جامعہ کے مضمون نگار صاحب

کا طنزیہ انداز میں اس تحریک پر رائے زنی کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اگر سنہ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء میں جزیرۂ عرب اور خلافت کے نام پر مسلمان اُٹھے تو گیا، گاندھی جی کے رام راج' نے ہندوؤں کو اپنی طرف نہ کھینچا تھا۔ سچ یہ ہے کہ سیاسی اور معاشی مقاصد اس وقت نہ ہندوؤں کے سامنے تھے اور نہ مسلمانوں کے دونوں قوموں کو وقتی صدمے میدان میں لائے ۔ عقل کی عنان گیری جذبات کو روک نہ سکی ، اگر بقول "قوم پرست مسلمان" ہندو سوراج کا طالب تھا تو کیا مسلمان حالات میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے بے چین نہ تھا آزادی کی تڑپ اس کے دل میں موجود تھی۔ اپنے ہم وطنوں کے ساتھ آزادی کی جنگ میں وہ برابر کا شریک تھا۔ لیکن جنگ کی ہماہمی کے بعد جب جذبات کی جگہ عقل نے لی تو جامع مسجد دہلی میں آزادی ہند کی دعوت دینے والے ہندو رہنماؤں کو اس نے شدھی کی جنگ میں مصروف پایا جذباتی مسلمان سیاست کی یہ بھول بھلیاں نہ سمجھ سکا اور دل برداشتہ ہو کر جس نیند سے وہ برسوں کے بعد جاگا تھا پھر اس میں غرق ہو گیا۔ ہندو کی آزادی' رام راج" کے ہم معنی تھی اس لئے وہ سیاسیات کے اتار چڑھاؤ سے متاثر نہ ہوا۔ اور برابر آگے بڑھتا چلا گیا۔ لیکن مسلمان "اللہ اکبر" اور 'اسلام زندہ باد' کہہ کر ہندوستانی قومیت میں رچ نہ سکتا تھا اسی لئے وہ لوڈی اور رجعت پسند کہلایا۔

افسوس تو یہ ہے کہ جس طرح مسٹر جناح اور مولانا شوکت علی جمہور اسلام کے جذبات سمجھنے سے قاصر ہیں اسی طرح ہمارے کانگرسی مسلمان رہنما بھی عوام سے رابطہ بڑھانے کے اعلان کو کافی سمجھ لیتے ہیں ۔ نہ اول الذکر ہماری مشکلات کو جانتے ہیں اور نہ آخر الذکر کو ہمارے احساسات کا خیال ہے۔ ایک نے اگر جزیرۂ عرب اور بقول مضمون نگار "آسمان کی چیزوں کے لئے" ہمیں اکسایا تو یہ جماعت موہوم آزادی کے دل پذیر تخیل کی دیوی کے نام پر، ہماری قربانی مانگتی ہے ۔ "قوم پرست مسلمان" کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ

"اُن دکانگرسیوں کا کہنا ہے کہ سیاسی اور معاشی معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق بالکل غیر حقیقی اور مصنوعی ہے۔ اس بنیاد پر کسی قسم کی جداگانہ جماعت بندی نہیں کی جا سکتی اور اگر کی جاتی ہے تو وہ محض چند خود غرض اور جاہ پسند لوگوں کے فائدے کے لئے کی جاتی ہے جو مذہب کے نام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عوام کو دھوکا اور فریب دیتے ہیں۔ اس فریب کو جس قدر جلد ممکن ہو ختم کر دینا چاہئے اور عوام کے

سامنے معاملات کو صحیح روشنی میں پیش کرنا چاہیئے۔ عوام بھوکے اور ننگے ہیں۔ ان میں بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے۔ ان کے لئے یہی مسائل سب سے زیادہ اہم ہیں۔"

ہم خود چاہتے ہیں کہ سیاسی اور معاشی معاملات میں مسلم اور غیر مسلم کی تفریق نہ ہو اور بھوکے ننگے عوام کی مدد سب سے اہم مسئلہ بنایا جائے لیکن رونا تو یہ ہے کہ نظری حیثیت سے گذر کر جب ہم عملی دنیا میں آتے ہیں تو بھوکے اور ننگے عوام کی حالت زار پر آنسو بہانے والے عوام کی ہمدردی کو فرقہ وارانہ رنگ دیتے ہیں۔ ممکن ہے یو پی میں مسلمانوں کے ساتھ کانگرس کا وطیرہ منصفانہ ہو لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے سب سے بڑے مرکز بنگال، پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد ہیں، بنگال کا مسلمان آسمان کی چیزوں کو آج چھوڑنے کے لئے تیار ہے اگر آپ اسے دنیا کی چیزیں دینے کے لئے تیار ہوں۔ پنجاب کا لوڈی طبقہ غریب کسانوں کا وہاں کی کانگرس سے زیادہ ہمدرد ہے۔ صوبہ سرحد کا ہندو اس وقت تک کانگرس کے ساتھ ہے جب تک کانگرس ہندی گورمکھی سرکلر منسوخ کرنے کو تیار ہے اور اگر سر عبدالقیوم اس سرکلر کو منسوخ کرنے کا ذمہ لے لیں تو ہندو اسی کو آزادی کا پرستار سمجھ کر اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ بنگال کے مسلمان فرقہ پرستی سے بے زار ہیں لیکن اگر وہ اس امر کا مطالبہ کرتے ہیں کہ صوبے کی کثیر آبادی کو ننگے اور بھوکے رہنے دینا قومیت کے بلند آہنگ دعاوی کے منافی ہے تو اُن کو رجعت پسند اور فرقہ پرست کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ہے۔

ہمیں پنڈت جواہرلال کے تمام معاشی اور سیاسی اصولوں سے کلی اتفاق ہے۔ ہم ننگے بھوکے عوام کی مدد کو سیاست نہیں بلکہ مذہب کا سب سے اہم فرض سمجھتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ جواہرلال جی کی یہ تمام نظریہ سازی صرف زیب قرطاس یا رونق محفل سے آگے نہیں بڑھتی۔ کانگرس کی عنانِ اختیار حقیقت میں اُس جماعت کے ہاتھ میں ہے جو معاشی انقلاب سے اتنی ہی لرزاں ہے جتنے ہمارے لیگ کے ارباب اقتدار۔ ان حالات میں ہم کس منہ سے مسلمان عوام کو کہیں کہ آؤ کانگرس میں شریک ہو جاؤ کانگرس عوام ہندوستانیوں کی جماعت ہے۔ اور وہ تباہ حال لوگوں کی خدمت اپنا فرض سمجھتی ہے۔

اگر محترم مضمون نگار صاحب ننگے بھوکے مسلمان عوام کو کانگرس کی حسن نیت کا یقین دلانے کی

کوشش کریں تو ان کو معلوم ہو جائے کہ مسلمان عوام کیلئے کانگرسی رہنماؤں کی تقریر بازیاں مسٹر جناح کے دعووں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔ مسلمانوں کے پبلک جلسوں میں شریک ہو کر دیکھئے۔ ایک طرف خوش بیان مقرر کی تقریر ہو رہی ہے۔ لیکن سامعین کی ایک بڑی جماعت کو آپ یہ سرگوشیاں کرتے سنیں گے کہ میاں! ان لیڈروں کا کیا بھروسہ"، عوام کا اعتماد نہ مسٹر جناح اور مولانا شوکت علی کو حاصل ہے اور نہ ہمارے کانگرسی رہنماؤں کو، اُن کے نزدیک نہ لیگ کا نظام دل کش ہے اور نہ کانگرس کا عوام سے ربط پیدا کرنے کا اعلان اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں نظام ان کی زندگی کے حقائق سے بے گانہ ہیں ایک کو "سر دل" اور نوابوں کی سرپرستی کا فخر ہے تو دوسرے کو نئی قسم کے سرمایہ داروں کی اعانت کا شرف۔

بالفرض اس وقت اگر جنگ آزادی کا ہنگامہ کارزار گرم ہوتا اور کانگرس بدیسی دشمن کے خلاف معرکہ آرا ہوتی تو ہم کہہ سکتے تھے کہ اس وقت مسلمانوں کو عقل کی دور اندیشیوں سے بے نیاز ہو کر بے دھڑک جنگ کی آگ میں کود پڑنا چاہیئے۔ لیکن معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ کانگرس کا انقلابی عنصر دستوری جماعت کے مقابلے میں اپنی ہار مان چکا ہے۔ کانگرس کی تحریک کا تمام زور صرف اصلاحی کوششوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے اس وقت مسلمان سے محض جذبات کے نام سے اپیل کرنا دانش مندی سے بعید ہے۔ آزادی کی دیوی واقعی دل کش ہے۔ لیکن خدارا اُسے یہ تو بتائیے کہ اس پرستش کا اُسے کیا صلہ ملے گا۔ ہندو تو گمن ہے ملک اس کا۔ ملک کا جو تمدن ہے۔ جس تمدن کو وہ زندہ کرنا چاہتا ہے وہ اس کا۔ وہ مذہب کو خیرباد کہہ کر بھی ہندو رہے گا لیکن مسلمان کے لئے آزادی کے اس تخیل میں اپنے آپ کو کھپانا مشکل ہے۔

ہماری رائے میں کانگرس کی تحریک خالص قومی تحریک نہیں ہے۔ اس کی پچاس سالہ روایات بالکل ہندوانہ ہیں۔ جن کے اثرات آج بھی کانگرس کی ہر سرگرمی میں خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر "بندے ماترم" کے قومی گیت کو لیجئے اس گیت سے بنگالی مسلمانوں کو چڑ ہے۔ کیونکہ یہ گیت انہیں بنگال کی سیاسی زندگی کے اس دور کو یاد دلاتا ہے جس کا ذکر ہر مسلمان کے لئے سوہان روح ہے۔ دوسری مثال مہاتما جی کی ہے۔ ان کی عظیم المرتبت شخصیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن مہاتما جی کی سرگرمیاں بہت حد تک ہندو قوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کی متحدہ قومیت کی بنیاد صرف

سیاسی اور معاشی اصولوں پر رکھی جا سکتی ہے یعنی یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ متحدہ قومیت کی ترجمان جماعت کس حد تک مذہبی اثرات سے بالاتر ہو چکی ہے۔ کانگرس کا وجود معجون مرکب بن کر رہ گیا ہے، نام کو تو یہ سیاسی جماعت ہے لیکن اس کا رنگ روپ بالکل مذہبی ہے۔ اور جب تک اس کا یہ چلن رہے گا مسلمان من حیث القوم کبھی اس میں شریک نہیں ہوں گے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کے نزدیک کانگرس کی سال خوردگی خاص اہمیت رکھتی ہو لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ وہ ملک جہاں بدیسی حاکموں کے خلاف آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں اور وہاں کی اقلیتیں اپنے مخصوص تمدن کا قوی شعور رکھتی تھیں۔ ان ملکوں کے قومی رہنما کٹر وطن پرست تھے انھوں نے مختلف فرقوں کو یکجا کرنے کے لئے قومی جماعت کی بنا نئے اصولوں پر رکھی۔ مصر میں جنگ عظیم سے پہلے حزب الوطن کا زور تھا۔ گو کہ یہ آزادی خواہ جماعت تھی لیکن اس کا رنگ ڈھنگ بہت حد تک اسلامی روایات سے متاثر تھا سعد زغلول نے قومی تحریک شروع کی تو اپنی نئی جماعت بنائی جس کی روایات اول تو تھیں ہی نہیں اور اگر تھیں تو خالص قومی۔ ترکی میں مصطفےٰ کمال نے یہی کیا۔ عراق اور شام میں اسلامی اکثریتوں نے اقلیتوں کو اسی طریق سے اپنا ہم نوا بنایا لیکن ہندوستان کی دنیا ہی نرالی ہے۔ مہاتما جی کی تقریروں تحریروں اور اسکیموں کو لیجئے ان کا ہر لفظ دو ہزار سال پہلے کی زندگی کا آئینہ دار ہے، ان کی تحریک کو سمجھنے کے لئے بدھ مت جینی روایات اور بھگوت گیتا کا مطالعہ ضروری ہو گیا ہے اگر ہمارے قوم پرست مسلمان اپنے ہم مذہب بھائیوں کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ مسلمان سیاسی اور معاشی اغراض کے لئے جداگانہ جماعت بندی نہ کریں تو سب سے پہلے ان کا فرض ہے کہ وہ کانگرس کو صحیح معنی میں ایک سیاسی ادارہ بنائیں۔ درحقیقت کانگرس خالص ہندو قومی تحریک کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ اگر آپ حضرات کو امپیریلزم کے خلاف متحدہ محاذ قائم کرنے کی خواہش ہے تو کوئی نئی جماعت بنائیے جو ہندو تمدن کی حفاظت کی بجائے ہندوستانیوں کے حقوق کی محافظ ہو۔

نظری مذہب اور خیالی تمدن کی حمایت کے زعم میں ہم سیاسی اور معاشی آزادی کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے لیکن جماعتوں کے سامنے کوئی نصب العین رکھتے وقت یہ سوچ لینا چاہئے کہ یہ نصب العین

کہاں تک جمہور کی حسیات اور خیالات کا مظہر ہو سکتا ہے۔ بے شک معیشت زندگی کا ایک اہم مسئلہ ہے لیکن ہر سمجھ دار آدمی جانتا ہے کہ محض معیشت انسانی زندگی کا قبلہ مقصود نہیں ہو سکتا۔ اگر ہندو دھرم کی طرح اسلام کا دائرہ اثر محض فکری دنیا تک محدود ہوتا تو مسلمان کو ہندو تمدن میں گھل مل جانے میں وقت نہ ہوتی۔ لیکن اسلام محض ایک نظری عقیدہ نہیں، خوش قسمتی کہئے یا بد قسمتی تیرہ سو سال کی زندگی میں اسلام نے تمدن معاشرت اور سیاست کے متعلق زندگی کا ایک خاص زاویہ نگاہ بنا لیا ہے اور ہندوستانی مسلمان اس زاویہ نگاہ کا نہایت گہرا شعور بھی رکھتا ہے۔ نیز آپ سیاست اور مذہب کی تفریق کے ہزار اعلان کیجئے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر سیاست اجتماعی زندگی کا ایک شعبہ ہے تو مذہب اسلام کو آپ مذہب اور سیاست سے الگ نہیں کر سکتے۔ مذہب کے نام سے ووٹ لینا۔ عوام کو اپنا آلہ کار بنانا اور اس کو ذاتی اغراض کے لئے استعمال کرنا اور چیز ہے۔ اور زندگی کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر رکھنا دوسری چیز۔ مسلمان کو جب آپ یہ کہیں گے کہ سیاست سے مذہب اور تمدن کو جدا کر دو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ اسے مذہب اور تمدن کو چھوڑنے کو کہہ رہے ہیں، ایک مسلمان کے سامنے جب قرآن کریم، رسول اللہ صلعم، صحابہ کرام اور خلافت راشدہ کا نام لیا جاتا ہے تو اس کی چشم تصور کے روبرو فوراً تمدن اور سیاست کی ایک ملی جلی شکل آجاتی ہے۔ مذہبی اور تمدنی، اداروں کی آزادی اور سیاسی جماعت بندی کی مخالفت کی دعوت دینا اسلامی تعلیمات سے بے خبری کا اعلان کرنا ہے، اگر آپ اسلام کو بحیثیت مذہب اور مسلمانوں کو بلحاظ ایک جداگانہ تمدن رکھنے والی جماعت کے زندہ دیکھنے کے متمنی ہیں تو انھیں سیاسی جماعت بندیوں سے نہ روکئے بے شک جمہور اسلام کافی عرصہ غلط مذہب، خود غرض قیادت اور جاہ پسند امارت کا تختہ مشق بن چکا ہے زمانے کی نئی روئے اب اسے بے چین کر دیا ہے۔ بڑے بڑے خطاب یافتہ اشخاص سے عوام مسلمانوں کا اندازہ نہ کیجئے۔ بھوک، برہنگی۔ سامراج کی لوٹ کھسوٹ اور ہمسایہ قوم کی زرطلبی نے اُن کو نئے انقلاب کے لئے تیار کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ننگے بھوکے عوام کو غلط مذہب، خود غرض قیادت اور جاہ پسند امیروں سے نجات دلائی جائے۔ زندگی کی کلی کھلے بغیر نہیں رہ سکتی، بنگال، پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد کا فلاکت زدہ مسلمان نہ ہندو کی برتری سے خوش رہ سکتا ہے اور نہ سرکار پرست مسلمان رئیس

اس کی اٹھان کو روک سکتے ہیں شمالی ہند کے مسلمان کو آپ زوال آمادہ (DEMORALIZED) نہیں کہہ سکتے۔ اس کے قوائے زندگی اب تک تمدن کے سرطان سے محفوظ رہے ہیں۔ اب اس کو زندہ ہونے اور پھلنے پھولنے کا موقع ملے گا۔ نوابوں اور "سروں" کا زمانہ اب گیا۔ انقلاب کا دھارا عوام کو بلند و بالا کرکے رہے گا۔

ہم چاہتے ہیں کہ عوام کی بیداری کی عمارت کانگرسی معماروں کے ہاتھ سے نہ بنے۔ ہم مذہب اسلام اور اسلامی تمدن کو دنیا کا مفید ترین عنصر سمجھتے ہیں۔ اور انسانیت نو کی تخلیق میں اس عنصر کا وجود ضروری جانتے ہیں۔ اس وقت کانگرسی نصب العین کو قبول کرنے اور اپنی سیاسی وحدت کو ختم کرنے کے معنی اپنے مذہب، اور تمدن سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے ہیں۔ اس لئے ہم اپنی ملی زندگی کا نصب العین کانگرس نہیں رکھنا چاہتے۔ ہمارا خیال ہے کہ مسلمان عوام کی بیداری اُن کی خالص قومی زندگی کے معیاروں پر ہونی چاہیئے، اُن کو "مہاتما گاندھی جی کی جے" اور "بندے ماترم" کے نعروں کی بجائے۔ رسول اللہ صلعم صحابہ کرام اور سلف صالحین کا اُسوۂ حسنہ پیش نظر رکھنا چاہیئے، وہ ضرور بغاوت کریں۔ دولت کی غیر مساوی تقسیم پر لڑیں۔ زندگی کی سوتوں کو بہنے سے روکنے والی قوتوں کے خلاف تبرد آزما ہوں غلط مذہبیت اور خود غرض قیادت کے بتوں کو بے دریغ توڑیں لیکن اُن کی نشو و نما میں ہم انھیں ہندو اثرات سے مامون رکھنا چاہتے ہیں۔ جب وہ جمود، توہم پرستی اور عقلی غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر آزاد فضا میں رہنے کے قابل ہو جائیں تو پھر وقت آئے گا کہ مسلمان اپنی سیاسی جماعت بندی کو چھوڑ کر بھی اپنے تمدن اور مذہب کو محفوظ رکھ سکے گا۔

سادہ لوح اور انجان، چالاک اشخاص کی جماعت میں رہ کر ان کا دبیل ہی بنتا ہے، خدارا مسلمان کو روٹی کے نام سے گمراہ نہ کیجئے۔ ممکن ہے کانگرس میں شامل ہو کر وہ بھوک اور برہنگی کو کچھ کم کر سکے (اگرچہ ہمارے خیال میں یہ بھی ممکن نہیں)، لیکن بحیثیت ایک انسان کے نہ اس کا ذاتی وقار رہے گا، اور نہ اس میں عزت نفس کا جذبہ باقی رہ سکے گا۔

موسمِ بہار

"۱"

جلوۂ بہار اُن سے، موسمِ بہار اُن کا
جان منتظر اُن کی، دل امیدوار اُن کا

دم لبوں پہ پھرتی ہے جانِ بیقرار اُن کا
اور کچھ نہیں حسرت، صرف، انتظار اُن کا

تابعِ نظر نکلا رنگِ روزگار اُن کا
خار کو بھی گل کر دے حسنِ نو بہار اُن کا

لاکھ حسبِ سابق ہو، یوں ہی انتظار اُن کا
کیا کریں، نہیں جاتا، دل سے اعتبار اُن کا

گو مرے تڑپنے پر، ہنس وہ دیں تجاہل سے
حالِ دل کا رکھتا ہے، رنگ بیقرار اُن کا

وہ نگاہِ عشرت خیز، وہ تبسمِ گل ریز
اک اشارۂ رنگیں، موسمِ بہار اُن کا

اے فلک! جو اس در سے، خاک ہو کے لپٹے ہیں
قسمتِ رسا اُن کی، بخت سازگار اُن کا!

وہ رلائیں یا تڑپائیں، خیر، یہ خوشی اُن کی
ہم ہیں دل کے قابو میں، دل پہ اختیار اُن کا

ایسی سینکڑوں راتیں، کاٹ دی ہیں آنکھوں میں
اور ابھی دکھائے کیا، دیکھیں انتظار اُن کا

گو چھٹے ہوئے اُن سے، مدتیں ہوئیں نشترؔ!
ہے مگر خیال اب تک، دل سے ہمکنار اُن کا

تنقید و تبصرہ

A Monograph on Moslem Calligraphy، کچھ عرصہ ہوا اس نام سے محمد ضیاءالدین صاحب پروفیسر علوم اسلامیہ شانتی نکتن نے اپنی یونیورسٹی کے رسالے میں اسلامی فن خطاطی پر ایک سلسلہ مضامین لکھا تھا وہ مضامین اب کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ کتاب آرٹ پیپر کے ۷۲ صفحوں پر مشتمل ہے، جس میں ۱۶۲ کے قریب فن خطاطی کے شہکاروں کی تصویریں ہیں۔ طباعت نہایت پاکیزہ۔ قیمت چار روپیہ ہے ملنے کا پتہ یہ ہے:-

Visva-Bharati Book Shop,

210, Cornwallis Street, Calcutta.

اسلامی تمدن کے جمالیاتی عنصر کے روشن ترین مظاہر دو ہیں، فن تعمیر اور فن خطاطی۔ اسلامی روایات نے تصویر کشی اور مجسمہ سازی کی حوصلہ افزائی میں ہمیشہ تامل کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے جذبہ حسن پرستی نے عمارت اور خط کو مقصود فن بنایا۔ ان دو فنوں میں مسلمان کسی پیشرو کے خوشہ چیں نہیں تھے۔ انھوں نے ان میں تمام قوموں سے الگ اپنی راہ نکالی اور اس پر چل کر وہ فنی کمال کے معراج کو پہنچے۔

خطاطی کا جوہر صرف کتابوں اور مرقعوں تک محدود نہیں رہا بلکہ عمارات کے حسن کو دوبالا کرنے میں بھی خطاطی سے مدد لی گئی۔ تاج محل آگرہ، مسجد رفاعی قاہرہ اور الحمرا غرناطہ کو زندہ جاوید بنانے میں خطاطی کا بھی حصہ ہے۔ قرون وسطی میں اسلامی خطاطی نے یورپ کے اہل فن سے خراج تحسین حاصل کیا۔ اور خطاطی کے بعض طغرے مسیحی کلیساؤں اور عیسائی حکومتوں کے سکوں کی زینت بنے، اس مختصر سی کتاب میں مصنف نے اجمالی طور پر فن خطاطی کی نشو و نما اور اس کے ارتقا پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ خط کوفی کی ابتدا، اس کی تدریجی ترقی، خط نسخ اور نستعلیق کا معرض وجود میں آنا، اور خطاطی کی مختلف

قسموں کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے اور جا بجا مختلف خطوں کے نمونے بھی دئے ہیں ۔
خطاطی پر فنی نقطہ نظر سے بحث کرتے ہوئے آپ نے خطاطوں کو ممالک اسلامیہ میں جو ہر دلعزیزی حاصل تھی اُس کا ذکر کیا ہے اس ضمن میں بغداد ، مصر ، اسپین اور شام کی لائبریریوں اور نشر و اشاعت کے اداروں کے نظام پر بھی روشنی ڈالی ہے ۔ کتاب مذکور کا یہ باب نہایت دلچسپ اور پُر از معلومات ہے اور اس کا مطالعہ تاریخ اسلام کے ہر طالب علم کے لئے ضروری ہے ۔
خطاطی کے فنی تجزیہ اور اس کی تدریجی ترقیوں کی تاریخ بیان کرنے میں مصنف نے اپنی خوش ذوقی ، فنی بصیرت اور علمی تحقیق کا ثبوت دیا ہے ۔ اسلوب بیان نہایت سلجھا ہوا ہے ۔ الغرض موصوف کی یہ کوشش ہر لحاظ سے کامیاب اور قابل تعریف ہے ۔ اُمید ہے اسلامی تمدن سے دلچسپی رکھنے والوں میں یہ کتاب بہت مقبول ہوگی ۔
م ۔ س

مبادی سیاسیات | جلد اول (مملکت) مولفہ ہارون خاں صاحب شروانی ایم اے (آکسن) صدر شعبہ تاریخ و سیاسیات جامعہ عثمانیہ ، ضخامت ۱۹۶ ، کاغذ معمولی ، طباعت و کتابت مناسب ، قیمت عہ ملنے کا پتہ :۔ غلام دستگیر بک ڈپو ۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ۔

سیاسیات کی اہمیت سے آج کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا ۔ متمدن اور ترقی یافتہ ممالک تو ایک طرف رہے موجودہ زمانے کی کشمکشوں نے معمولی لکھے پڑھے آدمیوں میں بھی سیاسیات کا شوق پیدا کر دیا ہے ۔ آج کرہ زمین کا کون سا خطہ ہے جہاں سیاسی ہنگاموں کی گرم بازاری نے عوام کے کانوں اور دلوں کو اپنی طرف نہیں کھینچا ، اور خاص طور پر جنگ عظیم کے بعد سے تو ہمارے ملک کی تمام سرگرمیوں پر سیاسیات کا ہی رنگ چھایا ہوا ہے ۔ لیکن سیاسیات سے غیر معمولی شیفتگی کے باوجود ہماری زبان میں علم سیاست کے متعلق کوئی مختصر سی کتاب نہ تھی جس سے اردو جاننے والے مستفید ہو سکتے ۔
اس میں شک نہیں کہ کچھ عرصہ سے ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں علم سیاسیات بھی نصاب تعلیم میں داخل ہے لیکن درسی کتابیں ایک تو انگریزی میں ہیں جن کی علمی اصطلاحات اُس زبان میں کافی مہارت حاصل کئے بغیر بآسانی سمجھ میں نہیں آسکتیں دوسرے اس قسم کی کتابوں میں ہندوستانیوں کے معیار لیاقت کا

خیال نہیں رکھا گیا۔ مبادی سیاسیات نے اُردو جاننے والوں کے لئے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔

کتاب کے گیارہ باب ہیں۔ ہر باب میں مملکت کے مختلف اداروں اور اُس کی خصوصیات کو فرداً فرداً لیا ہے۔ سیاسی نظریات پر بحث کرتے ہوئے مسلمان متفکرین ابن خلدون اور امام غزالی اور ہندو روایات کو بھی سامنے رکھا ہے اور مطالب کی توضیح میں مثالوں سے بھی کام لینے کی کوشش کی ہے بہر حال علم سیاست کے مبادی کو پیش کرنے میں مصنف کی یہ سعی ہر لحاظ سے کامیاب ہے اور اس علم کا مبتدی بھی اس کتاب سے پورا فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

مصنف نے عہد حاضر کی جملہ سیاسی تحریکوں پر بھی روشنی ڈالی ہے، اس سلسلہ میں جرمنی اور اٹلی کی فسطائیت اور روس کی اشتراکیت پر خاص طور پر تنقید کی ہے دوران بحث میں دوسرے ملکوں کے حکومتی اداروں کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ الغرض ہر اخبار بیں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے کیونکہ بین الاقوامی واقعات اور قوموں کی باہمی چپقلشوں کا صحیح اندازہ کرنا سیاسیات کے مبادی کو جانے بغیر مشکل ہے۔

کتاب کی زبان زیادہ مشکل نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس موضوع کو علمی اصطلاحات کے بغیر بیان نہیں کیا جا سکتا تھا لیکن موصوف نے حتی الوسع کوشش کی ہے کہ اصطلاحات کے اشکال کو تشریح کی مدد سے عام فہم بنایا جائے۔ بعض اصطلاحات کے ترجمہ کے متعلق ہماری چند گذارشات ہیں۔ مصنف نے Discipline کا ترجمہ تادیب کیا ہے، ہمارے خیال میں "نظم" اور "ضبط" سے یہ معنی بہتر ادا ہوتے ہیں اسی طرح Politician کا ترجمہ "سیاس" بھی غیر مانوس ہے، کتابت کی بھی چند غلطیاں ہیں، مثلاً صفحہ ۱۰ پر دہی کو ہی، مملکتوں کو ملکوں لکھا گیا ہے صفحہ ۵ پر زمانہ کو زبان صفحہ ۵۹ پر رواداری کو رازداری۔ صفحہ ۱۱۴ پر جامہ کو جامعہ لکھا ہے۔ امید ہے دوسری اشاعت میں ان غلطیوں کی تصحیح کر دی جائے گی۔

کتاب کے آخر میں ۱۴ صفحوں پر اصطلاحات کی فہرست ہے۔

م ۔ س

دوم | یہ کم وبیش ایک سو صفحے کا رسالہ ہے جس میں پروفیسر براؤن مرحوم کے ایک لیکچر کا اُردو ترجمہ ہے۔ موصوف نے ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں عربی طب کی تاریخ پر چار لیکچر دئے تھے جو بعد میں "طب العرب" کے نام سے کتابی صورت میں چھپے۔ زیر نظر رسالہ پروفیسر براؤن کے دوسرے لیکچر کا ترجمہ ہے۔ پہلا لیکچر گذشتہ جنوری میں اُردو میں منتقل ہو کر شائع ہو چکا ہے۔ مترجم صاحب ان چاروں لیکچروں کے ترجمہ کا ارادہ رکھتے ہیں۔

پروفیسر براؤن کے نام سے مشرقی علوم کا کون طالب علم ہے جو واقف نہیں موصوف کو مشرقی علوم سے محققت نہ شغف نہیں بلکہ والہانہ عشق تھا۔ اُن کی تاریخ ادبیات ایران فارسی ادب کی بے مثل تصنیف ہے۔ خوش قسمتی ہے کہ فن طب کے عالم اور لاہور کے مشہور حاذق طبیب حکیم سید نیر واسطی صاحب کو موصوف کی کتاب "طب العرب" کے ترجمہ کا خیال ہوا۔ واسطی صاحب نے صرف ترجمہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جہاں کہیں مصنف کی غلطی پائی ہے طب کی کتابوں کے حوالوں سے اس کی تصحیح کی ہے۔ ترجمہ کی زبان صاف ہے، اور مترجم کے حاشیے اُن کی محققانہ کاوش اور عالمانہ ژرف نگاہی کا پتہ دیتے ہیں۔

ناشر نے رسالہ کے کاغذ میں بخل سے کام لیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ چاروں لیکچروں کا ترجمہ مکمل کر کے اُن کو ذرا اچھے کاغذ پر کتابی صورت میں چھاپ دیا جائے۔ یہ مضمون اس قابل ہے کہ اس کو مستقل کتاب کی صورت دی جائے۔

رسالہ کی قیمت ۸/ ہے اور ملنے کا پتہ :- منیجر رسالہ شمس الاطبا، بھاٹی گیٹ لاہور

م۔س

اسلامی طب | (شاہانہ سرپرستیوں میں) از قاضی معین الدین صاحب رہبر فاروقی، ضخامت ۱۰۱ صفحے کاغذ معمولی۔ کتابت وطباعت عمدہ ملنے کا پتہ :- سن برج ہاؤس، عابد بلڈنگ مصطفےٰ بازار حیدرآباد دکن قیمت عـہ

"اسلامی طب" میں مسلمان بادشاہوں کے زیر سایہ طب کے نشو ونما پانے اور پروان چڑھنے کو بیان کیا گیا ہے، اسلامی حکومتوں میں طب کو شروع ہی سے غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے چنانچہ اسلامی روایتوں میں "علم الادیان" کے بعد "علم الابدان" کا ہی درجہ ہے۔ مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت

میں اس فن کو خوب ترقی دی۔ یونان، مصر اور ہندوستان کی طب کو نئی زندگی بخشی۔ شفاخانے بنائے۔ دوا سازی کے فن کو کمال تک پہنچایا۔ معرکۃ الآرا کتابیں تصنیف کیں جو عرصہ دراز تک یورپ کی درسگاہوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔ "اسلامی طب" میں طب کی اس طویل داستان کو نہایت عمدہ اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کی ضخامت، اور مصنف کی محنت کا خیال کرتے ہوئے قیمت کل عہ بہت کم ہے۔

م۔س

ہندوستان کے مسلمان کا نصب العین کیا ہے یہ ۳۰ صفحے کا چھوٹی تقطیع کا ایک رسالہ ہے جس میں عزیز ہندی صاحب نے مسلمانوں کے نصب العین کی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ موصوف زمانہ کے بہت نشیب و فراز دیکھ چکے ہیں۔ افغانستان کے امانی انقلاب، سرزمین پنجاب کی سیاسی شورشوں اور آئے دن کے ہنگاموں، مسلمانانِ ہند کے عام انتشار اور بے مقصدی کے الم ناک واقعات سے متاثر ہو کر عزیز ہندی صاحب نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ آپ کا طرزِ فکر مجتہدانہ ہے مگر افسوس زبان مصنف کے افکار کی صحیح ترجمانی سے قاصر ہے۔ موصوف کی یہ کوشش بہرحال قابلِ تحسین ہے، یہ رسالہ اُن کی زیرِ تصنیف کتاب کا باب اوّل ہے۔ قیمت کل ۲۰ر اور ملنے کا پتہ پنجاب اکاڈمی امرتسر ہے۔

م۔س

ندائے حق | شائع کردہ ینگ مینز مینشنل لیگ، ملتان شہر۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶ ضخامت ۲۴ صفحات۔ کتابت و طباعت معمولی۔ قیمت ۰ر۔ ملنے کا پتہ:۔ ینگ مینز مینشنل لیگ، قدیرآباد ملتان شہر۔

یہ ایک اصلاحی ٹریکٹ ہے۔ پہلے یہ "پکار" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، زیرِ نظر نسخہ ٹریکٹ کا دوسرا ایڈیشن ہے جس میں عنوان بدل کر ندائے حق رکھا گیا ہے۔

شروع میں ایک مقدمہ ہے، جس میں مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ لیا گیا ہے، اس کے بعد مسلمانوں کی مذہبی اور اجتماعی زندگی پر تبصرہ ہے، اور آخر میں "ہمیں کیا کرنا چاہیئے" کے زیرِ عنوان چند مشورے دیئے گئے ہیں۔

مقدمے میں مقدمہ نگار صاحب نے " مولویوں کے طبقے " سے خاص طور پر بحث کی ہے اور اپنی تنقیدات کا انھیں کو مرکز بنایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ رشد و ہدایت کو کچھ لوگوں نے ذاتی اغراض کی تکمیل کا ذریعہ بنایا اور اس سے مسلمانوں کی مذہبی اور اجتماعی زندگی پر اثر پڑا۔ لیکن صاحب مقدمہ نے جس انداز میں اس چیز کو پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ موصوف نے حالات کا صحیح اندازہ کرنے میں غلطی کی ہے۔ اور حد اعتدال سے بہت بڑھ گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی یہ حالت ان کی سیاسی غلامی کا نتیجہ ہے۔ مولویوں کا طبقہ اس الزام سے بڑی حد تک مبرا ہے۔

اس کے علاوہ مرض کا جو درماں صاحب مقدمہ نے تجویز کیا ہے، ممکن ہے۔ اس سے مرض کم ہونے کے بجائے اور مہلک ہو جائے۔ موصوف نے مذہب کی موجودہ مسخ صورت پر حملہ تو کیا ہے، لیکن یہ نہ فرمایا کہ اس کی اصلی صورت کے احیا کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں گی۔ اصل چیز مذہب کی اصلاح ہے، اور اس کی طرف سے کنارہ کشی اختیار کر کے جماعتی اصلاح کا مشورہ دیا ریت پر عمارت کی بنیاد رکھنے کے مترادف ہوگا۔

ب - ع

آکسفورڈ | از فضل احمد کریم صاحب فضلی بی۔ لٹ۔ (آکسن) آئی۔ سی۔ ایس۔ تقطیع ۲۰×۳۰ ضخامت ۱۲ صفحات۔ ملنے کا پتہ :- دفتر انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد (دکن)

فضل احمد کریم صاحب نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے تفریحی مشاغل کو نظم کیا ہے۔ نظم میں ۲۲۶ اشعار ہیں ایک کافی بڑا حصہ اردو شاعری کی تنقید کے لئے وقف کیا گیا ہے۔ حالانکہ تمہیداً چند اشعار کافی تھے۔ تمہیدی اشعار میں فاضل مصنف نے کسی قدر زیادتی اور غلو سے کام لیا ہے۔

اصل موضوع پر مصنف نے ایک ہلکے طنز کے ساتھ اچھے اور رواں اشعار لکھے ہیں اور مغربی تہذیب کو اس کے اصلی روپ میں پیش کیا ہے۔ جھوٹی محبت جو نفس کی ہوس رانیوں کی تحریک کا نتیجہ ہوتی ہے، مغربی جمالیات کا خاص پہلو ہے، جسے مصنف نے نہایت دلکش پیرائے میں باندھا ہے۔

خاتمے پر دو شعر ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے جذبۂ " حب الوطن من الایمان " کی

کسک سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی ہے :-

یہ دریا کہاں یہ کنارے کہاں ✤ یہاں کے سے واں ''چاند تارے'' کہاں
نہیں یہ کہ ''واں چاند تارے'' نہیں ✤ بہت ہیں' پہ ''ندیا کنارے'' نہیں

اور یہی اس نظم کی جان ہے۔

طنزیات مانپوری | از حضرت مانپوری' متوسط تقطیع' ضخامت ۱۲۰ صفحے' مجلد' کاغذ کتابت وطباعت معمولی۔ ملنے کا پتہ :- ندیم گیا۔ قیمت عہ۔

طنزیات مانپوری کا موضوع ہمارا سماج ہے' قدیم وضع کو مغرب زدہ سوسائٹی میں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُن کا بیان دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد مفید بھی ہے۔ مرحوم اکبر اس صنف ادب کے امام تھے۔ موصوف نے مشرق اور مغرب کے اس تمدنی تصادم کو ایک حکیم اور شاعر کی نظر سے دیکھا' اُن کی شاعری نوحہ تھی سال خوردہ مشرق کی پسپائی کا جو آسے نوجوان مغرب کے مقابلہ میں ہوئی۔ بیشک اکبر کے زمانہ میں صرف ایک مختصر سی جماعت تھی جو مغرب کی جادوگری کی تاثیر سے اپنے آپ کو بچا سکی تھی لیکن آج ہمارا یہ حال نہیں' مغرب کا دیوالہ نکل چکا ہے' اور اس کی ''مرعوبیت'' بھی قصہ ماضی بن چکی ہے۔ ضرورت تھی کہ شکست خوردہ مشرق نے اس دس سال کے عرصہ میں جو کروٹ لی ہے اس کو ہمارے ادیب اور اہل قلم موضوع سخن بناتے۔ اس میں شک نہیں کہ عہد ماضی کی مرثیہ گوئی اب ''بال جبریل'' اور ''ضرب کلیم'' کی شکل اختیار کر چکی ہے لیکن ''اکبری رنگ'' کے ''اقبال'' کا ہنوز انتظار ہے۔

''طنزیات'' میں تمدن کی موجودہ کشمکش کو ایک ظاہر بین ادیب کی نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ زبان بہت صاف اور طرز بیان دلچسپ ہے۔ ظرافت میں کہیں کہیں ہلکا پن ہے' شروع میں ۸۰ صفحے کا جو طویل مقدمہ ہے اس کی ماہیت باوجود غور و فکر کرنے کے معلوم نہ ہو سکی۔ بحیثیت مجموعی کتاب اچھی ہے۔

م۔س

دکن کی پری | مصنفہ حکیم ناصر نذیر صاحب فراق مرحوم' تقطیع ۲۲×۲۹/۱۶ ضخامت ۷۰ صفحات قیمت ۶/ ملنے کا پتہ

کتب خانہ علم و ادب جامع مسجد دہلی۔

حکیم ناصر نذیر فسراق اُردو کے مشہور انشار پرداز تھے، دہلی کی ٹکسالی زبان میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ روزمرہ اور محاورے کو اس خوبی سے نبھاتے تھے کہ پڑھئے اور مزے لیجئے۔

دکن کی پری ایک تاریخی افسانہ ہے۔ اس کے کردار کا انتخاب مصنف نے دکن کی بہمنی سلطنتوں کے زمانہ عروج سے کیا ہے۔ افسانے کی ہیروئن ایک غریب سُنار کی لڑکی ہے جو حُسن و جمال میں یکتائے روزگار تھی۔ بیجاپور کا راجکمار اُسے اپنی ہوس پرستیوں کا مرکز بنانا چاہتا تھا، مگر ایک بزرگ کی عنایات سے وہ بچ جاتی ہے، اور آخر میں شاہی حرم میں آتی ہے جہاں اس کے والدین اور خود اس کی رضا سے اس کا عقد ولیعہد سلطنت سے ہو جاتا ہے۔ افسانہ پلاٹ کے لحاظ سے کچھ زیادہ اہم نہیں ہے اور نہ اس سے پڑھنے والے پر کوئی خاص اثر ہوتا ہے۔ مگر زبان کے اعتبار سے اسے اور دوسرے افسانوں پر فوقیت ہے۔ م۔ س

کتابت و طباعت بھی اچھی ہے، سرورق سہ رنگی بلاک کا ہے۔ اور کتاب کی معنوی حیثیت کے مناسب ہے۔

قلعہ معلی کی جھلکیاں | از عرش صاحب تیموری۔ ناشر مکتبہ جہاں نما جامع مسجد دہلی، قیمت ۸ر ضخامت ۷۶ صفحے۔

مرزا احمد سلیم شاہ صاحب عرش خاندان مغلیہ کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی اولاد میں سے ہیں۔ موصوف نے اپنے بزرگوں سے قلعہ معلی کے دور اقبال کی جو باتیں سنی تھیں ان کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے۔ مصنف نے شاہی خاندان کے آداب اور شہزادوں کے طریق بود و باش کو نہایت اختصار سے لکھا ہے، یہ موضوع جتنا تفصیل طلب اور دلچسپ تھا، عرش صاحب نے اس کے بیان میں اُسی قدر اختصار اور بخل سے کام لیا ہے، اُمید ہے موصوف قلعہ معلی کی عبرت خیز داستان کو بھی زیادہ تفصیل سے لکھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔

ذخیرہ ثواب اُخروی | از مولٰنا محمد مشتاق صاحب ناشر کتب خانہ علم و ادب جامع مسجد دہلی۔

اس رسالہ میں "اِنَّ اللہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ" کی عربی تفسیر اور اس کا ترجمہ درج ہے۔

کلید قرأت | از مولٰنا خلیل احمد صاحب

علم قرأت کی یہ ابتدائی کتاب ہے جس میں مصنف نے نہایت آسان اور عام فہم الفاظ میں عربی حروف کے مخرج بتائے ہیں، قرآن کریم کی تلاوت کے لئے اس کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری ہے، بچوں کو تو یہ کتاب ضرور پڑھانا چاہیئے قیمت درج نہیں۔ اور ملنے کا پتہ :۔ ناخدا بک ایجنسی لکھنؤ ہے۔ م۔ س

بقیہ کتب و رسائل پر آئندہ پرچے میں تبصرہ کیا جائے گا۔

رفتارِ عالم

شمالی افریقہ | اسپین کی خانہ جنگی اور مسولینی کی سامراجی چالوں نے شمالی افریقہ کے حاکموں اور محکوموں دونوں میں بڑی بے چینی پیدا کر دی ہے یوں تو افریقی عرب برسوں سے فرانس کی غلامی کے جوئے کو اٹھائے رہا اور جنگ عظیم میں اس نے فرانس کی خاطر اپنے بھائیوں کو قتل کرنے سے گریز نہ کیا لیکن ۱۹۱۸ء کے بعد ترکی، شام، عراق اور مصر سے بیداری کی جو لہر اٹھی وہ بحرِ ظلمات تک بڑھتی چلی گئی، چنانچہ الجزائر میں بے اطمینانی پھیلی، ٹیونس کے عرب رہنما جلا وطن کئے گئے۔ مراکش میں خون کی ندیاں بہیں اور ریف میں غازی عبدالکریم نے آزادی کا جھنڈا بلند کیا۔ سامراجی حکومتیں محکوموں کی اٹھتی ہوئی قوتوں کو دبانے میں مصروف تھیں کہ اسپین میں جنگ شروع ہو گئی اور جنرل فرانکو نے عربوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کیا، ادھر مسولینی نے برطانوی اور فرانسیسی سلطنتوں کا زور توڑنے کے لئے عربوں کو اپنے ہاتھ میں لینے کی حکمت عملی اختیار کی، چنانچہ طرابلس کے عربوں کو یقین دلایا گیا کہ اطالیہ عربوں میں مسیحی تبلیغ کی اجازت نہیں دے گا نیز حبش کی مسلمان آبادی کو مراعات دی گئیں، اور اہل فلسطین کی جنگ آزادی سے ہمدردی کا اظہار کیا گیا، مسولینی کی اس سیاست سے برطانیہ اور فرانس بدکے، برطانیہ نے مصر کو معاہدہ پر راضی کر لیا، اور فلسطینی عربوں سے صلح و صفائی کی طرح ڈالی، فرانس نے ایک طرف تو شام اور لبنان کو خوش کیا اور دوسری طرف افریقہ کے عربوں کی شکایات کو دور کرنے کی تگ و دو شروع کی، الجزائر اور مراکش کے عربوں اور فرانس کی موجودہ کشمکش کا ذکر ذرا تفصیل سے سنئے۔

الجزائر | فرانس کو اس ملک پہ قبضہ کئے ایک سو سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے، اس طویل مدت میں فرانس کی یہ حکمت عملی رہی ہے کہ اہل جزائر کو اپنی زبان، مذہب، تمدن اور قومیت سے بیگانہ کر کے انہیں حقیقی معنوں میں ہمیشہ کے لئے فرانس کا غلام بنا دیا جائے، اس ناپاک

تجویز کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے عربی زبان کی ترویج و تدریس پر پابندیاں عائد کی گئیں، اصلاح پسند علماء کو دبایا گیا اور توہم پرست صوفیوں اور پیروں کی حوصلہ افزائی کی گئی تاکہ "روشن خیال" نوجوان اپنے مسخ شدہ مذہب سے نفرت کرنے لگ جائیں اور نئی نسلیں مذہب سے عاری اور فرانسیسی تمدن کی شائق بن کر نکلیں۔ جزائری عربوں کی قومیت کو ختم کرنے کے لئے یہ چال چلی کہ جو جزائری اپنی قومیت چھوڑ کر فرانسیسی قومیت اختیار کرے اس کے ساتھ خاص رعائتیں کی جائیں، اور اس کو اپنے حکمراں فرانسیسی کا درجہ دیا جائے، فرانسیسی قومیت اختیار کرنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ نکاح، طلاق، وراثت اور شخصی قوانین میں شریعت کی بجائے فرانسیسی قانون کا پابند ہو جاتا ہے، حکومت چاہتی ہے کہ اس طرح سے جزائریوں کو فرانسیسی بنا کر اس ملک سے عربی زبان، اسلامی تمدن، اور عربی قومیت کو بالکل نیست و نابود کر دیا جائے۔

اہل جزائر کو فرانسیسی بنانے کی مہم کو سر کرنے کے لئے حکومت عیسائی مشنریوں کو استعمال کر رہی ہے، سرکاری خزانے سے ان کو مدرسے کھولنے اور شفا خانے قائم کرنے کے لئے رقمیں ملتی ہیں۔ حالت یہ ہے کہ ایک طرف تو عربی زبان کی تعلیم اور اسلام کی تبلیغ کو روکا جاتا ہے اور دوسری طرف مسیحی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کرنے کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

جزائریوں کو اپنی زبان، مذہب، تمدن اور قومیت کھو کر اگر تن ڈھانکنے کو کپڑا اور پیٹ بھرنے کو روٹی مل جاتی تو شاید آج الجزائر میں بے اطمینانی اتنی نازک صورت اختیار نہ کرتی فرانس نے عربوں کو صرف اپنی زبان، تمدن اور مذہب سے محروم نہیں کیا، بلکہ اس نے ساحل کی زرخیز زمینیں اصلی باشندوں سے چھین کر فرانسیسی آبادکاروں کو دے دیں تجارت، صنعت و حرفت اور دولت پیدا کرنے کے تمام ذرائع پر بدیسی قابض کر دئے، جزائری مزدور بن کر رہ گیا لیکن مزدوری میں خون پسینہ ایک کر کے بھی اس کے لئے آرام کی زندگی حرام ہو گئی۔ حکومت نے " جاہل، کندہ ناتراشں اور مفلس عوام" پر قانون کی خاص لاٹھی مسلط کی اور متمدن آبادکاروں کے لئے دوسرے قوانین بنائے، فرانس کی یہ حکمت عملی آخر رنگ لا کر رہی، اہل جزائر کی بے چینی کا نقشہ

فرانسیسی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے جو الجزائر کے تحقیقاتی کمیشن کا رکن تھا ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

"الجزائر کا سب سے بڑا مسئلہ بھوک کا ہے، موسم گرما میں تو جزائری موت کا مقابلہ کر لیتے ہیں لیکن سردی میں ہزاروں کو بھوک اور ٹھنڈ کی شدت ہمیشہ کی نیند سلا دیتی ہے، پچھلے سال بدقسمت رعایا کو فاقہ کی موت سے بچانے کے لئے حکومت نے بڑے جتن کئے، پچاس کروڑ فرانک سے زیادہ تو نقد رقم تقسیم کی گئی۔ اس کے علاوہ منوں گندم باجرہ اور چاول کی رسد بانٹی گئی، اس میں شک نہیں کہ بہت سے لوگ کام پر فاقہ کو ترجیح دیتے ہیں لیکن اکثر تعداد تو ان کی ہے جو کام مانگتے ہیں لیکن ان کو کام نہیں ملتا۔"

آگے چل کر رکن مذکور عرب محلوں کی بےکسی اور بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"ہم نے بہت سے ایسے شہر دیکھے جہاں سینکڑوں ہزاروں اشخاص اس طرح رہتے ہیں کہ بدن پر چیتھڑے، چہرے پژ مردہ، ہڈیوں پر گوشت کا نام نہیں، مکانات خستہ، ان کی بدحالی کا یہ عالم ہے کہ جب تک انسان ان کو آنکھوں سے دیکھ نہ لے کبھی باور نہ کرے، دیکھنے کو تو بڑے بڑے شہر ہیں لیکن مکانات سب کے سب ٹین اور تختوں کے جو غلاظت اور تعفن کے مرکز ہیں، اس گندگی میں ننگے بھوکے بچوں کے غول کے غول پلتے ہیں، جب صفائی کی یہ حالت ہو تو الجزائر جیسی اچھی آب و ہوا میں ہزاروں بچوں کا اندھا اور دق میں مبتلا ہونا کوئی تعجب کی بات ہے؟"

فرانس کی صدسالہ حکومت کی یہ برکات ہیں جو اہل جزائر کو دنیا کی سب سے بلند دعویٰ کرنے والی جمہوریت سے ملی ہیں، حیرت تو یہ ہے کہ جزائریوں کی بدحالی کا اعتراف کرنے کے بعد رکن مذکور ان کی شورش اور بےچینی کا ذمہ دار چند شوریدہ سر اور فتنہ پسند لیڈروں کو ہی گردانتا ہے،

فرانسیسی آبادکاروں کی محنت نے الجزائر کی ساحلی زمینوں کو واقعی بہشت بنا دیا لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ بہشت بنانے والے جزائری کاشتکار کے لئے اس میں جگہ ہے یا نہیں، مگر اہل جزائر نے اب تک صبر سے کام لیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تباہ حالی نے انھیں احتیاجات کی بجائے اب گویا

سے کام لینے پر آمادہ کر دیا ہے، رکن مذکور لکھتا ہے کہ "اوران" کے ضلع میں شورشوں اور بلوؤں کا زور ہے، جلسوں میں پستولوں اور طمنچوں کا علی الاعلان مظاہرہ ہوتا ہے، ایک اور مقام پر تحقیقاتی وفد کے جانے سے کچھ دیر پہلے موٹروں کے جلوس میں اسلحہ کی نمائش کر کے اہل جلوس نے اپنے مطالبات کے حق بجانب ہونے کا نمایاں طور پر اعلان کیا؛

اہل جزائر فرانس کے ساتھ ساتھ یہودیوں کے بھی مخالف ہیں، اگر فرانسیسی آباد کار ہر وقت عربوں کے حملوں سے پریشان رہتے ہیں تو یہودی تاجر بھی جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنی دکانوں پر بیٹھتے ہیں، اہل جزائر کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ ان کی تمام مصیبتوں کا سبب فرانس ہے اور ان کے ہم وطن یہودی اس کے حلیف ہیں۔

فرانس نے اہل ملک کی بے چینی کو دور کرنے کے لئے عربوں کو جزائر کی اسمبلی میں ابھی ابھی اپنے نمائندے بھیجنے کا حق دیا ہے لیکن مرض اتنا بڑھ گیا ہے کہ بقول رکن موصوف ان تدبیروں سے اس کا علاج ممکن نہیں، عوام روٹی چاہتے ہیں، اور زمانہ ہوتا تو حکومت روٹی کی بجائے گولہ اور بارود برساتی لیکن اب وقت بدل گیا، فرانس اہل جزائر کو کچل کر خود اپنی جان سلامت نہیں رکھ سکتا، آزادی اور غلامی کی اس کشمکش میں بظاہر تو آزادی کی جیت یقینی نظر آتی ہے۔

سلسلہ بیان میں ایک بات رہ گئی، فرانس نے پچھلے سالوں میں عرب قومیت کو ختم کرنے کی یہ تدبیر کی کہ اہل جزائر کو یہ طمع دیدی کہ اگر وہ عرب قومیت کی بجائے فرانسیسی قومیت اختیار کر لیں تو انھیں حکمرانوں کے حقوق دئے جائیں گے، ایک طبقہ نے اس پیشکش کو قبول کر لیا، نتیجہ یہ نکلا کہ قوم نے ان کا بائیکاٹ کر دیا، ان کے مُردوں کو اپنے قبرستانوں میں دفن ہونے سے روکا اس پر حکومت نے اپنے وفاداروں کا ساتھ دیا۔ نوبت کشت و خون تک پہنچی، الغرض اہل جزائر کی سخت مخالفت کی وجہ سے یہ تحریک تقریباً مردہ ہو چکی ہے اور اب تک بیس پچیس ہزار جزائری جو فرانسیسی قومیت میں داخل ہو چکے ہیں ان کی جان بھی عذاب میں ہے۔

مراکش | ۱۹۰۴ء میں فرانس اور برطانیہ کے درمیان مراکش کے متعلق ایک معاہدہ ہوا تھا جس کی

رُو سے اول الذکر کو مراکش میں اپنی سیادت قائم کرنے کا حق دیا گیا ، فرانس نے سلطنت کے نظم ونسق کو تو اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن " امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین " یعنی سلطان مراکش کی ذات گرامی کو باقی رکھا ، دوسرے لفظوں میں حکم اور اختیار تو فرانسیسی ہائی کمشنر کو دیا گیا اور نام سلطان کا رہا ، الجزائر کی طرح مراکش میں بھی اہل ملک جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی حکومت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے ، شروع میں جلوسوں اور اجتماعات تک معاملہ رہا لیکن فرانسیسیوں کی سختی سے تحریک آزادی روز بروز زیادہ قوت پکڑتی گئی اور باتوں اور تقریروں سے نوبت بلوؤں اور خونریز معرکوں تک پہنچ گئی ۔ فرانس نے اس تحریک کو کچلنے کے لئے اہل مراکش کو آپس میں لڑا کر حکومت کرنے کی حکمت عملی اختیار کی ۔

مراکش میں دو نسلوں کے مسلمان آباد ہیں - ایک تو عرب ہیں جو زیادہ تر ساحلی علاقوں میں اقامت گزیں ہیں اور دوسرے بربر ہیں جو اندرون ملک اور پہاڑوں میں رہتے ہیں - عرب بیشتر تعلیم یافتہ ہیں ، عربی ان کی مادری زبان ہے - لیکن بربر عربی زبان سے ایک حد تک بیگانہ اور اسلامی تمدن سے بہت کم متاثر ہیں ، فرانس نے بربروں کو عربوں کے خلاف اکسایا اور انھیں عربی زبان ، عربی تمدن اور اسلامی قومیت سے قطعی طور پر الگ کرنے کے لئے بربری قومیت کا خیال پیدا کیا - بربروں کی آبادی میں عربی زبان کی درسگاہیں بند کر دی گئیں مسلمان واعظوں اور مدرسوں کو بربروں تک پہنچنے سے روک دیا گیا - اب تک بربر اسلامی قانون کے تابع تھے - فرانس نے شرعی عدالتیں منسوخ کر کے ان کی جگہ فرانسیسی قانون نافذ کیا ' ان سبھی کوششوں کے ساتھ ساتھ فرانسیسی مشنریوں کو بربروں پر ریل دیا گیا - یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں بربری آبادیوں میں پھیل گئے ہیں اور مدرسے اور شفاخانے بنا کر بربروں کو اپنے حلقہ اثر میں کر رہے ہیں ۔

فرانس کے اس اقدام سے مراکش میں بڑی بے اطمینانی پھیل چکی ہے ، نہ صرف یہ کہ عرب اس قانون کے خلاف ہیں بلکہ بربر بھی فرانس کے ان الطاف کو استحسان کی نظروں سے نہیں دیکھتے ، کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ کسی نہ کسی شہر میں ہنگامہ نہ ہوتا ہو ، فرانس بُری طرح رعیت کو دبا رہا ہے

لیکن بے چینی کم ہونے کی بجائے برابر بڑھ رہی ہے، مراکش کی اس صورت حال نے اسپین کی خانہ جنگی کی وجہ سے اور بھی نازک حالت اختیار کر لی ہے مراکشی عرب دیکھتے ہیں کہ ان کے پڑوسی فرانکو کی فوج میں بھرتی ہو رہے ہیں، اسپین کے ماتحت علاقہ میں جرمنوں نے باقاعدہ فوجی مدرسے کھول رکھے ہیں جہاں عربوں کو فوجی تعلیم دی جا رہی ہے، پچھلے دنوں یہ خبر لی تھی کہ بہت سے مراکشی سرحد عبور کر کے اسپینی علاقہ میں جا رہے ہیں۔ ان حالات نے فرانس کو بہت پریشان کر دیا ہے، اب کوشش ہو رہی ہے کہ مراکشیوں کو دم دلاسا دے کر خوش کیا جائے اور فرانکو اور ہٹلر کے اثر سے ان کو مامون کر دیا جائے۔ عربی جرائد "الجزائر" اور "شہاب" سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی افریقہ میں ہٹلر کو خاص طور پر ہر دلعزیزی حاصل ہے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ عرب یہودیوں سے تنگ ہیں اور ہٹلر کی یہود دشمنی ان کے دل کو لگتی ہے، دوسرے فرانس کے بیر نے ان کو اس کے دشمنوں کا دوست بنا دیا ہے۔

عراق | ایک سال ہونے کو آیا کہ عراق کے فوجی افسروں نے کابینہ کے ارکان کو توپ و تفنگ کی زود اثر منطق سے قائل کر کے استعفے دے دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس واقعہ سے عراق کی سیاسی زندگی کا نیا دور شروع ہوا، عہد فیصلی کے پرانے گھاگ سیاسئین یا تو گولی کا نشانہ بنے یا انھوں نے عراق سے بھاگ کر اپنی جان بچائی۔ ہاشمی پاشا جو عراق کا بے تاج بادشاہ سمجھا جاتا تھا اور شاہ فیصل کے عہد حکومت میں اس کا شمار انگریز دشمن اور انتہا پسند سیاست دانوں میں ہوتا تھا، غدار وطن قرار دیا گیا اور بیچارے کی بے کسی کی شرم خدا نے دیار غیر میں وطن سے دور موت دے کر رکھ لی، موت کے بعد نئی حکومت نے مرحوم کے لاشے کو وطن میں جگہ دینے سے انکار کر دیا، عسکری پاشا جیسا جہاں دیدہ سیاستداں ایک فوجی کے ہاتھوں قتل ہوا، نوری پاشا جو شاہ فیصل کا دست راست اور برطانی عراقی معاہدہ کا بطل تھا روپوش ہو کر موت سے بچ سکا۔ پرانے زمانے کے با اثر سیاسئین نوجوان عنصر کی جرأت سے دم بخود ہو کر بیٹھ گئے اور کسی کو مخالفت کی ہمت نہ ہوئی۔

اس فوجی انقلاب کا ہیرو کرنل باقر صدقی تھا، وزارت کا قلمدان سلیمان حکمت کو دیا گیا۔

اس نوآموز نوجوان نے تدبیر مملکت میں غیر معمولی لیاقت کا ثبوت دیا چنانچہ انقلابی وزارت کے حسن انتظام کی داد برطانی اخبار "ٹائمز" تک نے دی، بظاہر عراق کی فضا سکون بخش معلوم ہوتی تھی اور خیال کیا جاتا تھا کہ یہ نوجوان حکومت کی کشتی کو کھینے میں مشاق ناخدا ثابت ہوں گے لیکن اچانک "رائٹر" کی اطلاع ملی کہ کرنل باقر صدقی کو موصل کے ہوائی اسٹیشن پر کسی سپاہی نے قتل کر دیا۔ دوسرے تیسرے دن خبر آئی کہ سلیمان حکمت نے وزارت سے استعفےٰ دے دیا، اور نئی وزارت مرتب ہو گئی۔

تفصیلات کا ہنوز انتظار ہے۔ امید ہے آئندہ پرچہ میں اس پر مفصل بحث ہو سکے گی،

مصر مصر کے نوجوان تاجدار ملک فاروق کی رسم تاج پوشی ۲۹ر جولائی کو مصری پارلیمنٹ میں ادا کی گئی، اس تقریب میں مصری حکومت سے زیادہ مصری رعایا نے خلوص اور جوشِ عقیدت کا مظاہرہ کیا، شیخ الازہر مصطفےٰ مراغی چاہتے تھے کہ تاج پوشی کی تقریب کو مذہبی مراسم کے ساتھ منایا جائے لیکن وفد پارٹی کے صدر موجودہ وزیر اعظم نے یہ کہکر ٹال دیا کہ شاہ فاروق صرف مصری مسلمانوں کے بادشاہ نہیں بلکہ عیسائی بھی ان کی رعایا میں سے ہیں، بہر حال شیخ الازہر نے یہ کیا کہ تاج پوشی کے دن عشار کی نماز شاہ فاروق کو جامع ازہر میں پڑھائی اور ایک سادہ سی تقریب کے بعد قرآن کریم اور بخاری شریف کا ایک ایک نسخہ شاہ موصوف کی خدمت میں پیش کیا۔

مصری اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ وفد بادشاہ کی ہر دلعزیزی سے زیادہ خوش نہیں فواد مرحوم کے زمانہ میں قصر شاہی اور "بیت الامہ" یعنی صدر دفتر وفد پارٹی میں برابر تصادم رہا۔ اب وفد کو خطرہ ہے کہ ان کے مخالفین شاہ فاروق کی ہر دلعزیزی کی آڑ میں وفد کو گرانے کی کوشش نہ کریں۔ وفد سے اب مذہبی طبقے عام طور پر خوش نہیں ہیں۔ نحاس پاشا اور آن کے ساتھیوں کی قبطیت پرستی سے بعض جماعتیں پہلے بھی نالاں تھیں لیکن اب مسلمان عوام کے کان بھی وفدیوں کی بعض حرکات سے کھڑے ہو رہے ہیں شاہ فاروق نوجوان ہیں، آن کے والد تو زمانہ کے بہت سے رنگ دیکھ چکے تھے، اس لئے دھڑا بندیوں اور ایک جماعت کو دوسری جماعت سے

لڑاکر اپنا کام نکالنا خوب جانتے تھے اور خاص بات یہ تھی کہ ہر موقعہ پر برطانی ریذیڈنٹ کا مشورہ اُن کے شامل حال رہتا تھا، لیکن اب حالت بالکل بدل گئی ہے، انگریزی دخل ختم ہو گیا، وفد والے برسرِاقتدار آگئے، اور بادشاہ ناتجربہ کار ہے، اگر قصرِ شاہی اور وفد میں صلح وصفائی سے کام چلتا گیا تو خیر ہے ورنہ بادشاہت اور جمہور میں ٹکر ناگزیر ہو جائے گی۔

مصری اخبار "المصور" لکھتا ہے کہ حکومت کو اپنی حلیف سلطنت سے ہدایت ملی ہے کہ جنگی تیاریوں کی رفتار کو تیز کر دیا جائے، مصر کی طرابس کی سرحد کو خاص طور پر محفوظ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہوائی جہازوں اور مشین گنوں کی دھڑا دھڑ فرمائشیں انگلستان پہنچ رہی ہیں' بازاری گپوں کا لذیذ ترین موضوع آئندہ جنگ بن گیا ہے۔" م۔ ح

ترکی | ترکی حکومت نے حال میں اوقاف کے متعلق ایک قانون پاس کیا ہے، جس کی رُو سے اب تمام اوقاف متولیوں کے زیرِ انتظام رہیں گے، البتہ یہ متولی وزارت اوقاف کو جواب دہ ہوں گے، اور متولیوں کو ملکی ضروریات کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ اس ضمن میں مناسب ہے کہ ہم اوقاف کے پچھلے انتظامات پر ایک سرسری نظر ڈال لیں۔

سلاطینِ ترکی کے زمانہ میں تین طرح کے اوقاف تھے، ایک وہ جو کلیتہً متولیوں کے ہاتھ میں تھے اور سلطنت کی ان پر کوئی نگرانی نہیں تھی، دوسرے وہ جن کا انتظام تو متولی ہی کرتے تھے لیکن وزارت اوقاف ان کی نگراں تھی، اور تیسرے وہ جن کا اہتمام براہ راست وزارت کے سپرد تھا، جمہوریہ ترکیہ نے پہلی قسم کے اوقاف تو بالکل ختم کر دئے تھے، یعنی تمام اوقاف وزارت کے ہاتھ میں دے دئے تھے۔ اس وقت تک کوئی ، ہزار اوقاف وزارت کے اہتمام میں تھے، جن کی ۵ فی صدی آمدنی وزارت کے دفتری اخراجات پر صرف ہوتی رہی ہے۔

وزارت کی طرف سے ایک جنرل ڈائرکٹر تمام اوقاف کا ذمہ دار تھا اور اس کا تعلق براہ راست وزیرِاعظم سے تھا، جنرل ڈائرکٹر کے ماتحت متعدد ڈائرکٹر تھے، جو ملک کے تمام اوقاف کی دیکھ بھال کرتے تھے، باوجود اس کے کہ اوقاف کی جائدادوں کا ایک بڑا حصہ ملک کے داخلی محکموں، تعلیم اور

میونسپلٹیوں کو دیدیا گیا ہے مگر پھر بھی ان کی آمدنی نہایت اہم حیثیت رکھتی ہے، ملک کی تمام مسجدوں کے علاوہ کئی ہزار عمارتیں تین لاکھ ایکڑ جنگلات، تین لاکھ ساٹھ ہزار زیتون کے درخت، دس میدان، شاہ بلوط کے درختوں کے ۱۲ باغات، دو سو سے زیادہ سبزیوں کے باغ، چار ہزار کے قریب میدان، کانیں اور تقریباً دس ہزار جائدادیں اس وقت وزارت کے پاس ہیں۔

شروع میں تمام اوقاف اپنے متولیوں کے زیر انتظام تھے، اس کے بعد کچھ کو وزارت اوقاف نے اپنی نگرانی میں لے لیا اور بعض، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں بالواسطہ وزارت کی نگرانی میں ہے یعنی انتظام متولیوں کا تھا اور نگرانی وزارت کی۔ غیر مسلم اقلیتوں کی جائدادیں بھی اوقاف میں شمار ہوتی تھیں لیکن ان کا اہتمام منتخب کمیٹیوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا، جن کا انتخاب اقلیتیں الگ الگ کرتی تھیں۔

اقتصادی اعتبار سے ۱۹۳۶ء ترکی کے لئے بہت مبارک سال رہا۔ فصلیں بہت اچھی ہوئیں، مقدار بھی زیادہ رہی اور پھر قیمت بھی زیادہ اٹھی، بہت سے پیداواروں کا نفع بالخصوص گیہوں اور تمباکو کا، ۱۹۳۵ء کی نسبت بہت زیادہ رہا۔ اور یہی نہیں کہ زراعت غیر معمولی طور پر اچھی ہوئی بلکہ معدنیات نے بھی بہت ترقی کی، یہی وجہ ہے کہ ترکی حکومت نے اب "معدنیات" کو "قومی" بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے، یعنی اب غیر ملکی کمپنیوں کو اس کا اجارہ نہیں دیا جائے گا اور ملک میں انفرادی تاجر بھی ان سے نفع طلبی نہیں کر سکیں گے۔

اس سال ۲۵۰ کیلومیٹر ریل کی لائن تیار کی گئی، اس وقت ترکی کے قبضہ میں ۶ ہزار ۲ سو بیاسی کیلومیٹر ریلوے لائن ہے، حکومت نے طے کیا ہے ۱۹۳۷ء کے لئے عثمان بینک سے ۵ فیصدی سود پر روپیہ قرض لے لیا جائے۔

ترکی تجارت کی خوشحالی کا اندازہ کرنے میں ذیل کے نقشہ سے مدد ملے گی۔

غیر ملکی تجارت	برآمد	۱۱۷،۷۳۳،۰۰۰	ترکی پونڈ	۱۹۳۶ء
	"	۹۵،۸۶۱،۰۰۰	"	۱۹۳۵ء
	درآمد	۹۲،۵۴۱،۰۰۰	"	۱۹۳۶ء
	"	۸۸،۸۲۳،۰۰۰	"	۱۹۳۵ء

فاصل برآمد	۲۵۰ ۲۰۲، ۰۰۰	ترکی پونڈ	۱۹۳۶ء
	۶،۰۳۸،۰۰۰	"	۱۹۳۵ء

اس نقشہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ترکی کی برآمد بڑھ رہی ہے اور درآمد کو حکومت کم سے کم کر رہی ہے، صرف دو سال کے اندر اندر درآمد کے مقابلہ میں برآمد کا یہ اضافہ حیرت انگیز ہے۔

مالیات عامہ کی حالت اس سال بھی نہایت اطمینان بخش رہی حکومت نے اس سال کوئی نیا محصول عاید نہیں کیا، اور نہ کسی ضروری مد کا روپیہ کم کیا اس کے باوجود ۳۶-۱۹۳۵ء کے میزانیہ میں ایک بہت بڑی ...

ترکی حکومت اپنی آبادی میں اضافہ کے لحاظ سے بھی بہت خوش قسمت معلوم ہوتی ہے، اس وقت یورپ میں عام طور پر شرح پیدائش کم ہو رہی ہے لیکن ترکی میں شرح پیدائش (روس کے بعد) سب سے زیادہ ہے، ۱۹۲۷ء میں شرح ۲ر۱۴ فی ہزار تھی اور ۱۹۳۵ میں ۲ر۱۶ فی ہزار۔

<u>ایران</u> اس سال کا میزانیہ کئی مہینے ہوئے پارلیمنٹ پاس کر چکی ہے، اس میں گذشتہ سال کی نسبت دو سو پچاس ملین ریال اضافہ ہوا ہے جو پونڈ کے حساب سے تین ملین سے کچھ زیادہ (اکتیس لاکھ ۲۵ ہزار پونڈ) ہوتے ہیں۔ کل میزانیہ ۱۲۵۰ ملین ریال یعنی ایک کروڑ چھپن لاکھ بیس ہزار پونڈ کے قریب ہے، (انگریزی ایرانی تیل کمپنی کی سالانہ رقم جو دو ملین پونڈ سے کچھ زیادہ ہوتی ہے اس میں شامل نہیں ہے) ریلوے اور فوج کے شعبوں کے لئے اس دفعہ بھی بھاری بھاری رقمیں رکھی گئی ہیں۔ ایران کی کل فوج اس وقت ۹۲ ہزار ہے، جس میں ۱۲ ہزار محفوظ فوج ہے۔

انگریزی ایرانی تیل کمپنی، حکومت ایران کو جو سالانہ رقم ادا کرتی ہے، اس کو حکومت کے سالانہ میزانیہ میں شامل نہیں کیا جاتا بلکہ محفوظ میں جمع کر دیا جاتا ہے، اور دوران سال میں جس مد میں کمی پڑتی ہے یا کسی نئے خرچ کے لئے اس رقم میں سے روپیہ لیا جاتا ہے اس سال اس محفوظ رقم میں سے ۲ ملین پونڈ جنگ کی مد میں مزید دیا گیا (بجٹ میں ۲۵ ملین پونڈ منظور ہوئے تھے یہ بھی ملحوظ رہے کہ یہ کل آمدنی کا ½ ہے) اور ۶ لاکھ ریل میں صرف کئے گئے اور ۸ لاکھ شکر فیکٹری میں لگا یا گیا۔

آمدنی کی سب سے بڑی مد تو اجارہ ہے جس سے ہر سال کم از کم ۸۰ ملین تومان مل جاتے ہیں، اس کے علاوہ ۱۰ ملین کسٹم سے وصول ہوتا ہے اور ۱۸ لاکھ ٹیکس سے (۹ لاکھ بالواسطہ ٹیکس اور ۹ لاکھ بلا واسطہ) اس کے علاوہ جرمانہ بھی آمدنی کی ایک معقول مد ہے یعنی ۱۰ لاکھ تومان (تقریباً ۲ لاکھ پونڈ) کا سرکاری خزانہ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

۲۵ فروری ۱۹۳۱ء ایک قانون کے ذریعہ تمام غیر ملکی تجارت حکومت ایران کا اجارہ قرار دی گئی ہے۔ مذکورہ بالا ۸۰ ملین تومان (تقریباً ۶۵ لاکھ روپئے) ان ہی اجاروں سے ملتے ہیں۔

پچھلے دنوں شاہ ایران نے ترکستان سے خلیج ہند تک دورہ کیا۔ اس دورہ میں ملک کی زرعی، صنعتی اور حرفتی حالات کا بغور مطالعہ فرمایا۔ ایران کی صنعت جس نے پچھلے دس سال میں ترقی کی بہت سی منزلیں یکایک طے کر ڈالیں روز بروز بڑھ رہی ہے۔ ریشم، چمڑا، شیشہ اور قالین کا کام زور شور سے ہو رہا ہے، اور زراعت اس وقت صنعت و حرفت سے بھی آگے آگے ہے۔ زراعت میں نئے نئے آلات اور جدید طریقوں سے کام لیا جا رہا ہے اس لئے روئی اور غلہ کی کاشت خوب ہو رہی ہے، روئی اور تمباکو کی کاشت براہ راست حکومت کی نگرانی ہے اس لئے یہ اور ترقی کر رہے ہیں، روئی کاتنے اور کپڑا بننے کی مشینیں بھی کھل گئی ہیں، اور روئی کی زراعت میں حکومت بڑی دلچسپی کا اظہار کر رہی ہے، ملک کے ذمہ دار لوگوں کا خیال ہے کہ زراعت میں لگایا ہوا روپیہ زیادہ بارآور ہو رہا ہے۔ صنعت و حرفت اس کی نسبت کم مفید ثابت ہو رہی ہے، اس لئے اس سال صنعتی جوش و خروش میں کمی ہو گئی ہے، صنعت و حرفت کے بہت سے سرکاری اور نجی پروگرام منسوخ کر دئے گئے ہیں، اور ساری توجہ زراعت پر مرکوز ہو گئی ہے۔ روئی، گیہوں، چاول اور گنے کی زراعت میں بیش از بیش مدد دی جا رہی ہے۔

گیہوں کی زیادہ مقدار اب بھی جرمنی کو جاتی ہے، روئی کی بڑی مقدار تو روس لے لیتا ہے باقی کو جرمنی ہاتھوں ہاتھ لے جاتا ہے۔ ملک کی ضروریات کے بعد جتنا چاول بچتا ہے اُسے بھی روس خرید لیتا ہے۔ شکر کے کارخانوں میں گنے کی موجودہ مقدار ناکافی ہوتی ہے۔ ایران میں بے کاری اور بے روزگاری کا نام و نشان نہیں ہے۔

ایران، بیرونی مصنوعات کی درآمد کو کم کرنے میں لگا ہوا ہے، ۱۹۳۱ء میں ۵۶ لاکھ سے زیادہ روسی تیل ایران میں آیا تھا۔ لیکن ۱۹۳۶ء میں وہ ۴۲ لاکھ ہی رہ گیا ہے۔ عام درآمد جس میں لوہے کی مصنوعات اور زراعتی مشینیں وغیرہ ہیں ابھی روس سے آرہی ہیں۔ روس کی کل برآمد ایران میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ پونڈ سالانہ کے قریب ہے۔

آج کل ایران میں جرمن بڑھ رہے ہیں، تبریز جو ایران کے بڑے شہروں میں دوم نمبر کا شہر ہے اور روسی سرحد سے ۸۰ میل ہے یہاں کے مغربی باشندوں میں نوے فیصدی جرمن ہیں، اور خود پایۂ تخت (طہران) میں بہت سی جرمن کمپنیاں، کارخانے اور دوکانیں ہیں۔ کل ایران میں کوئی بارہ سو جرمن ہیں۔

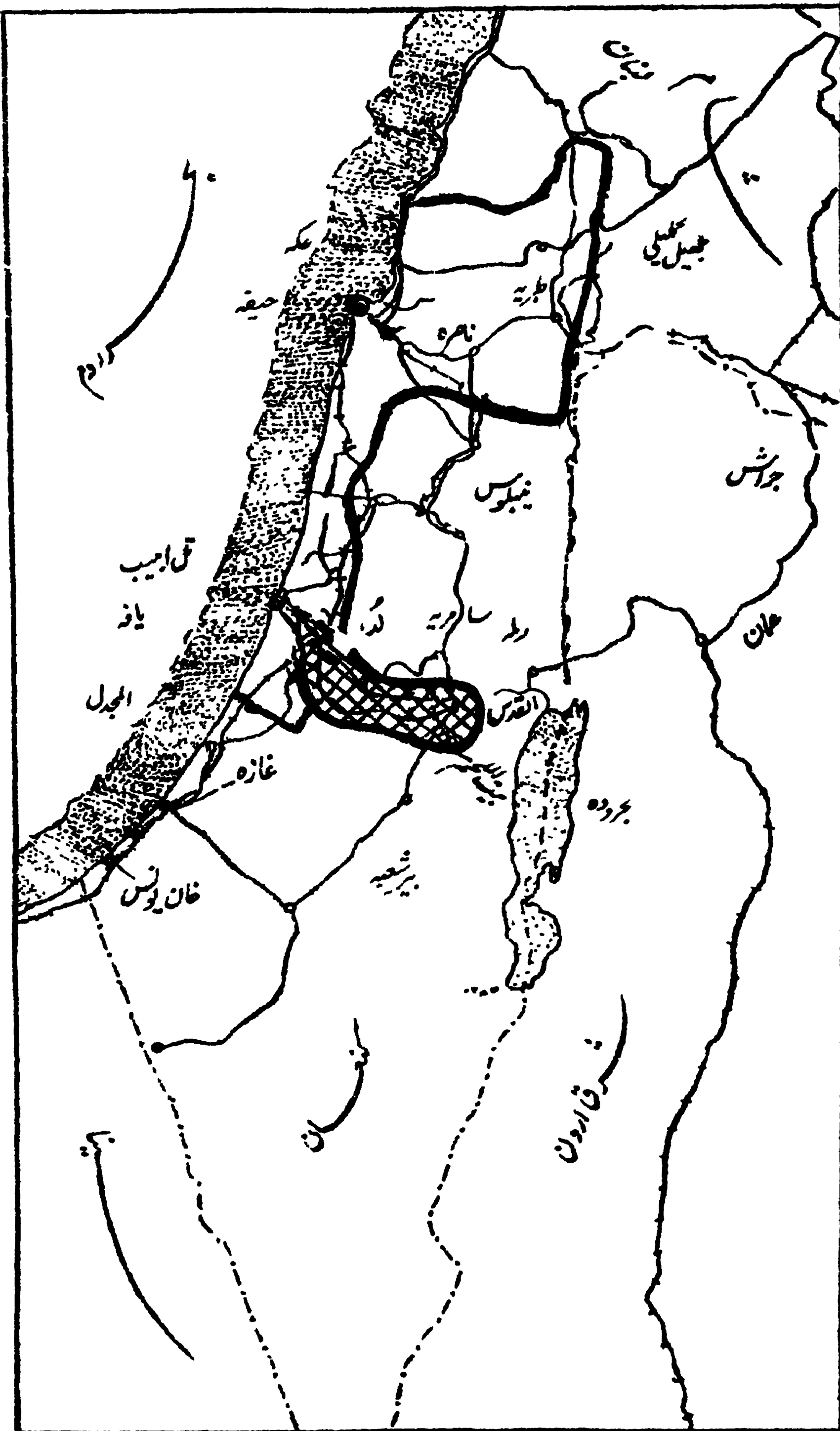
انگریزی ایرانی تیل کمپنی نے اس سال اسی لاکھ ٹن سے زیادہ تیل نکالا، جس سے پچانوے لاکھ پونڈ کے قریب نفع ہوا۔ یہ نفع گذشتہ سال کی نسبت ۵۴ لاکھ پونڈ کے قریب زیادہ ہے، عراق کے تیل کا ٹھیکہ بھی اسی کمپنی کے پاس ہے اس سال تک ان دونوں جگہ سے نوے کروڑ ٹن تیل نکالا جاچکا ہے۔

فلسطین | شاہی کمیشن کی رپورٹ مدت ہوئی شائع ہوچکی ہے اور حکومت برطانیہ نے ان سفارشات کو منوانے کا بھی فیصلہ کرلیا ہے اس لئے کہ برطانیہ، کے نزدیک مسئلہ فلسطین کا اس سے بہتر کوئی حل ہو نہیں سکتا۔ ان سفارشات کی رُو سے فلسطین کے زرخیز اور اہم ترین ساحلی علاقہ کے مالک یہودی ہوں گے، معمولی اور بنجر سا علاقہ عربوں کو دیا جائے گا۔ اور 'بیت المقدس' شہر برطانیہ کی تحویل میں رہے گا۔ عربوں پر یہ کیا کم ظلم ہے کہ ان کے ملک کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے جائیں، غضب بالائے غضب یہ ہے کہ ساحل کا تمام عمدہ علاقہ، ساری زرخیز زمینیں، اور پھر خود قبلہ اول، بیت المقدس کا شہر ان سے چھین لیا گیا، یہ ہے صلہ ان تمام وفاداریوں کا جو عربوں نے اپنوں کو چھوڑ کر غیروں سے کی تھیں۔ خود شاہی کمیشن کو اعتراف ہے کہ "جنگ عظیم میں اتحادیوں کی کامیابی کو عرب اپنی مکمل آزادی، سمجھے ہوئے تھے اور یہی ولولہ ان کو جنگ میں ہمت دلا رہا تھا"۔ جہاں تک برطانوی وعدوں کا تعلق ہے ہم عربوں کے

اس خیال کو بے جا نہیں کہہ سکتے تھے۔ اس لئے کہ شریف حسین نے بالتفصیل حدود ـــــ کا حوالہ دیکر سرہنری میکموہن کو یہ لکھا تھا کہ وہ کل جزیرۂ عرب کی آزادی چاہتے ہیں، اور اسی شرط پر اتحادیوں کا ساتھ دیں گے۔ میکموہن نے اپنے دوستانہ خطوط میں حدود کے مسئلہ کو قبل از وقت کہہ کر ٹال دیا لیکن یہ بہرحال طے تھا کہ عربی ممالک جس میں نجد و حجاز، عراق و شام شامل ہیں آزاد کر دیے جائیں گے۔ فلسطین ترکی حکومت میں شام میں شامل تھا اس لئے لازماً اس کے معنی یہ تھے کہ فلسطین بھی آزاد ہوگا سرہنری میکموہن کا خط تو آج تک شرمندۂ اشاعت نہ ہوسکا، شاید رموز حکومت، نے اس کی اجازت نہیں دی، لیکن یہ سب کو اقرار ہے کہ جزیرۂ عرب میں سے صرف وہ علاقے مستثنیٰ تھے جن کی آبادی (واکثریت) غیر عرب ہے یعنی اڈانا اور حلب وغیرہ۔ شریف حسین کو اگرچہ یہ کاٹ چھانٹ بھی منظور نہ تھی لیکن بہرحال دلیل معقول تھی کہ ان علاقوں کی آبادی عرب نہیں ہے مگر فلسطین میں تو اس وقت بھی ۹۰ فیصدی عرب آباد تھے، اسے کس طرح علیحدہ قرار دیا جا سکتا تھا؟ شریف حسین کو جزیرۂ عرب کی کمل آزادی کا یقین دلانے کے بعد برطانیہ اور فرانس کے درمیان کچھ راز کی باتیں شروع ہوئیں اور انھوں نے آپس میں ایک خفیہ معاہدہ کر کے شمالی عرب (شام و عراق) کو اپنے درمیان تقسیم کر لیا اور "اتحادیوں کے مذہبی جذبات کا لحاظ کرتے ہوئے" بیت المقدس کے لئے طے ہوا کہ وہ "ترکی حکومت سے علیحدہ کر کے آپس (فرانس، برطانیہ، روس) میں سے کسی ایک کو دیدیا جائے۔ اور "بقیہ عرب" "عرب حکومت" کے لئے چھوڑ دیا جائے"

ایک ہی علاقہ کے لئے یہ دو معاہدے تھے، اسی لئے دوسرا معاہدہ خاص طور پر پردہ راز میں رکھا گیا، اور ۱۹۱۷ء تک کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، مگر گھر کے بھیدی روس نے راز فاش کر دیا۔

انہی دنوں یعنی نومبر ۱۹۱۵ء میں برطانیہ نے یہودیوں سے بات چیت شروع کی، اور اس کا نتیجہ "اعلان بالفور" کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس میں "فلسطین میں یہودیوں کا قومی وطن بنانے اور اس سلسلہ میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کا وعدہ کیا گیا" اور ساتھ ہی ساتھ فلسطین کی غیر یہود آبادی کو یہ اطمینان بھی دلا دیا گیا کہ "ان کی مذہبی، اور معاشرتی حقوق بالکل محفوظ ہوں گے" مسٹر لائڈ جارج نے



لبنان
جلیل گلیلی
عکہ
حیفہ
طبریہ
ناصرہ
نیبلوس
جراش
تل ابیب
یافہ
لدہ
رملہ
سامریہ
عمان
المجدل
القدس
غازہ
بحر مردہ
خان یونس
بیر شعبہ
شرق اردن

جو اس وقت برطانیہ کے وزیراعظم تھے اس سلسلہ میں کمیشن کو بیان دیا ہے کہ "یہودی رہنماؤں نے ہم سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر اتحادی فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن بنانے میں خاطر خواہ مدد کریں تو وہ اپنی تمام کوشش اتحادیوں کی حمایت میں صرف کریں گے" مسٹر لائڈ جارج پوری ایمانداری کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں ان معاہدوں میں تضاد ہے اور وہ غریب اس طوفان حوادث کا ذکر بھی کرتے ہیں جس کی وجہ سے یہ وعدے کئے گئے تھے

"اہل رومانیا پس چکے تھے روسی فوج میں اختلال و بد دلی پیدا ہو چکی تھی، فرانسیسی فوج اس وقت وسیع پیمانہ پر جارحانہ کارروائی کی اہل نہ تھی۔ اطالوی کیپو ریٹو کے مقام پر شکست کھا چکے تھے۔ جرمنی کی آبدوز کشتیاں برطانیہ کے بے شمار جہازوں کو غرقاب کر چکی تھیں، امریکہ سے کوئی فوج اس وقت تک فرانس نہیں پہنچی تھی"۔

لیکن یہ "قومی وطن" کیا چیز ہے، اس سے کیا مراد ہے، آیا یہودیوں کی مستقل حکومت یا محض "آزادی سکونت" اس کی تشریح میں بھی شاہی کمیشن نے مسٹر لائڈ جارج سے چاہی تھی، موصوف نے فرمایا کہ "نہیں، ہم فلسطین میں فوراً ہی تو کوئی یہودی ریاست قائم کرنا نہیں چاہتے تھے، اور یہ بغیر کثرت آبادی کی رائے کے ہو بھی کیسے سکتا تھا، لیکن ہاں یہ تھا کہ اگر یہودی .... وہاں اکثریت حاصل کرلیں تو فلسطین ایک یہودی ریاست بن جائے گا۔ لائڈ جارج جس چیز کو آج بھی صاف صاف نہیں کہنا چاہتے وہ اُن کے سیاسی رفقا نے اسی زمانہ میں علی الاعلان کہہ دی تھی، مسٹر ولسن صدر جمہوریہ امریکہ جیسے ذمہ دار شخص کی زبان سے اتحادیوں کے ارادہ اور وعدہ کا اظہار اس طرح ہوا۔

"اتحادیوں نے ہماری حکومت اور ہماری قوم کی پوری موافقت کے ساتھ یہ منظور کر لیا ہے کہ فلسطین میں یہودی حکومت کا سنگ بنیاد رکھ دیا جائے گا" جنرل اسمٹس (برطانوی سامراج کی وزارت جنگ کے رکن) نے جوہانسبرگ میں ایک تقریر میں فلسطین کے متعلق پیشین گوئی کرتے ہوئے فرمایا "آنے والی نسلوں کے لئے ایک عظیم الشان یہودی حکومت تختۂ ارض پر وجود میں آرہی ہے"۔

اگران صاف باتوں میں بھی کوئی ابہام پایا جاتا ہو تو اُن الفاظ کو کیا معنی پہنائے جا سکتے ہیں جس میں خود لارڈ بالفور نے یہ احسان جتاتے ہوئے کہ اتحادیوں نے "ظالم و جابر ترکوں" کی صدیوں کی غلامی سے عربوں کو آزاد کیا ہے، اور عراق کی حکومت خود اختیاری کا راستہ صاف کر رہے ہیں۔ فرمایا تھا کہ ہم ان کی زمین کا ایک "ناخن بھر" ٹکڑہ لے لیں تو کیا غضب ہو جائے گا۔

اور پھر شاید یہ ذکر نہیں آیا ہے کہ برطانیہ نے اُس رقبہ کو بھی مستثنیٰ قرار دیا تھا جسے وہ "فرانس کو نقصان پہنچائے بغیر کسی کو نہیں دے سکتے" اس فقرہ کے متعلق ڈاکٹر ٹوئنبی شامل ہیں۔ سٹوڈرڈ نے لکھا ہے کہ "یہ فقرہ بلا شبہ انگریزی تاش کا 'جوکر' تھا مگر اس سے مقصد حاصل ہو گیا۔ عرب چونکہ خفیہ معاہدہ سے ناواقف تھے انھوں نے یہ تصور کیا کہ یہ استثنا لبنان کے محدود ضلع سے تعلق رکھتا ہے وہ خوش خوش بغاوت کی تیاری کے لئے گھر واپس آئے اور دوسرے سال بغاوت ہو گئی۔"

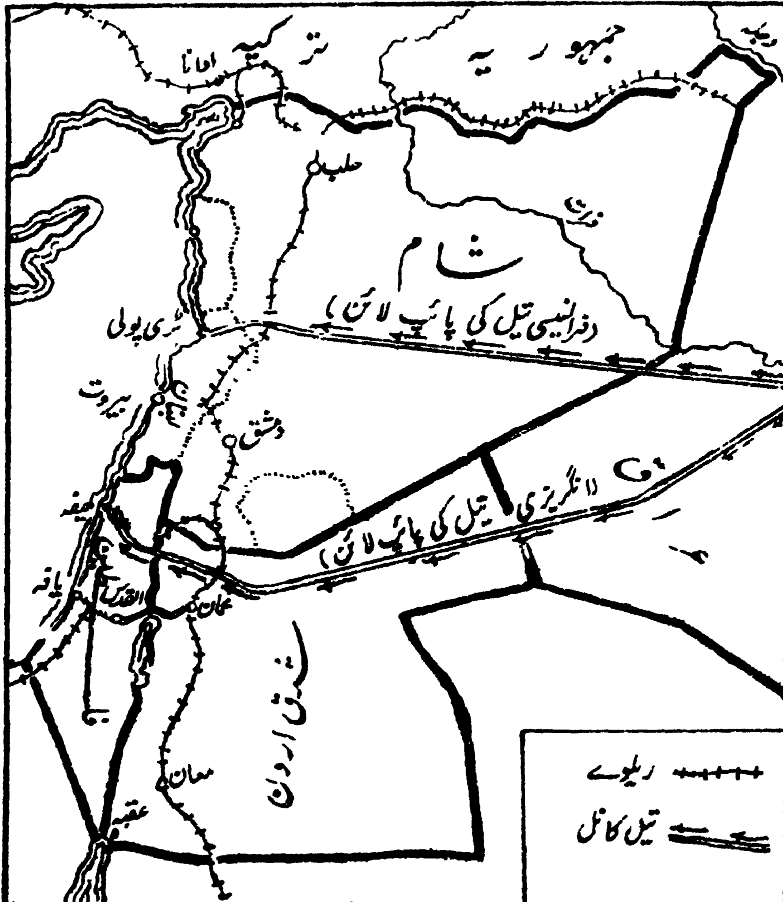
حقیقت یہ ہے کہ فلسطین کا فیصلہ آج سے بیس بائیس سال پیشتر ہی کیا جا چکا تھا، محض عربوں کو دھوکہ دینے کے لئے یہ حقیقت زیر نقاب رکھی گئی۔ اور اسی لئے ہنری میکموہن کے خط کو دنیا سے چھپایا گیا اور اسی لیے عربوں کو 'شام' کی آزادی کا نام لے کر فلسطین کے جزئی خیال سے باز رکھا — حتیٰ کہ ۱۹۱۸ء میں فرانس اور برطانیہ نے صلح کے بعد عربوں کی تسکین کے لئے جو بیان شائع کیا اس میں بھی عراق اور شام وغیرہ کی تدریجی دستوری ترقی کا تصریحی وعدہ کیا اور فلسطین کو گول کر دیا۔ اور صرف 'قومی وطن' کی مبہم اصطلاح سے ۱۹۲۲ء تک یہ فائدہ اٹھایا گیا کہ "ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہودیوں کو عربوں پر مسلط کر دیا جائے" اور چونکہ بالفور اعلان میں یہودیوں کی مراعات اہل فلسطین کے تحفظات کے ساتھ مشروط تھیں، اس لئے عربوں کے لئے بے چینی کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ۱۹۲۳ء میں شریفی معاہدہ کے صریحاً خلاف، جب عراق، شام اور فلسطین پر انتداب کا دیو مسلط کر دیا گیا تو عرب اس عجیب و غریب 'آزادی' کو دیکھ کر حیران رہ گئے اور اغیار کی بدنیتی نے انھیں خوفزدہ کر دیا۔ دفتر نوآبادیات نے ان کی حیرانی کو کم کرنے کے لئے پھر ایک 'اطمینان بخش' بیان شائع کیا جس میں عربوں کو یقین دلایا کہ "ہم نہ فلسطین کو بالکل یہودی بنانا چاہتے ہیں اور نہ خدانخواستہ وہاں عربوں کے تمدنی اور معاشرتی اثر کو کوئی صدمہ پہنچانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

عربوں کے اطمینان کے لئے یہ بیان کافی نہیں تھا، انگریزوں کے خلاف عام برہمی پیدا ہوگئی ہنگامے اور فسادات شروع ہوئے جن کی تحقیقات کیلئے ۱۹۲۹ء میں مسٹر شا کی صدارت میں ایک کمیشن فلسطین پہنچا، اس کمیشن نے اگرچہ فسادات کی علت غائی یہ نہیں بتلائی کہ عرب برطانیہ پر اعتماد نہیں رکھتے لیکن یہ دیکھ کر کہ غیر معین بیانات سے اب کام چلنا مشکل ہے حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ "وہ صاف لفظوں میں اپنی پالیسی کا اعلان کرے۔ اور ۱۹۲۲ء کے اعلان کو از سر نو مستحکم کردے۔ یعنی یہ کہ انتداب میں یہودیوں کو جو مراعات حاصل ہیں وہ کسی درجہ میں بھی ان کو حکومت کے کام میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتیں" اس کے جواب میں وزیر اعظیم مسٹر میکڈانلڈ نے 'صاف لفظوں' میں پالیسی کا اظہار فرمایا کہ ہم ہر جماعت کے ساتھ پورے عدل سے کام لیں گے اور ۱۹۲۲ء کے عہد کو پورا کریں گے۔ ان اب کمیشن لیگ کے اجلاس میں شا رپورٹ اور اس بیان پر بڑی لے دے ہوئی اور انتداب کمیشن نے غیر معمولی جرأت کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ "فلسطین کی بے چینی کی اصل وجہ یہ ہے کہ برطانیہ نے اہل فلسطین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا' اور شا کمیشن کا یہ بیان سراسر غلط ہے کہ اس تصادم کو برطانیہ کی مخالفت سے کوئی تعلق نہیں ہے" فلسطین کے آخری فسادات سے متاثر ہوکر شاہی کمیشن کا تقرر عمل میں آیا۔ اس نے "بیس سال کے پرانے جزئی واقعات" کی تحقیق کو گڑے مردے اکھاڑنے کی برابر سمجھ کر چھوڑ دیا لیکن پھر بھی اس " افسوسناک حقیقت " کا اقرار ہے کہ،

"لڑائی کی ضرورتوں کی وجہ سے حکومت برطانیہ شریف حسین کو صاف صاف اپنے ارادوں سے مطلع نہ کرسکی۔ آپ دیکھیں گے کہ سر ہنری میکموہن کے خط مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۵ء میں فلسطین کا واضح ذکر نہیں کیا گیا ہے اور نہ اس سے پہلے کوئی خاص اشارہ کیا گیا تھا۔ بعد کی خط و کتابت میں شریف حسین اور سر ہنری میکموہن کے درمیان صرف بیروت اور حلب کے متعلق اختلاف تھا۔ شریف حسین نے اس بات پر زور دیا کہ یہ علاقے خالص عرب میں اور جب ہنری میکموہن نے فرانسیسی مصالح کی طرف توجہ دلائی، تو شریف حسین نے جواب دیا کہ اگرچہ وہ شمال میں اپنی حقیقت سے

دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں، تاہم وہ سر دست برطانیہ اور فرانس کی باہمی مخالفت کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ اور فرانس کے مطلوبہ علاقوں (بیروت اور لبنان کے ساحلی علاقے) کے متعلق مزید گفت و شنید جنگ کے خاتمہ پر ملتوی کرنا مناسب خیال کرتا ہے۔"

یہی "افسوسناک حقیقت" اس بات کا بھی اعتراف ہے کہ برطانیہ اور شریف حسین میں فلسطین کے معاملہ میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ لیکن ان تمام وعدوں کے باوجود فلسطین کا یہ حشر کیوں ہوا اس پر پچھلے سال ۱۹ جون کو پارلیمنٹ کے ایک معزز ممبر نے روشنی ڈالی تھی "مدافعت کے لحاظ سے فلسطین کی مقامی حیثیت نہایت اہم ہے، یہ گویا کیپنم جنکشن (لندن کا سب سے بڑا ریلوے جنکشن) ہے



یہ ایک ایسے مقام پر واقع ہے، جو انگلستان، افریقہ اور ایشیا کے ہوائی راستوں کا مرکز ہے، بحر روم کے جدید حالات نے اس کی بحری حیثیت کو صد درجہ اہم بنا دیا ہے قبرص، فلسطین اور مصر پر اگر مضبوطی کے ساتھ قبضہ رکھا جائے تو اس سے نہ صرف نہر سویز کو کھلا رکھنا ممکن ہو گا بلکہ تمام مشرقی بحر روم پر بھی قبضہ رہ سکے گا۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ حکمبرداری کی رُو سے ہم فلسطین میں بحری مرکز قائم کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ تاہم اگر حیفہ کو ترقی دے کر بحر روم کا ایک زبردست بندرگاہ اور تجارتی مرکز بنا دیا جائے نیز اس کو تیل کی فراہمی کا ایک بڑا منبع قرار دیا جائے تو جنگ کے زمانہ میں جب ہمیں کہیں اور سے تیل نہیں مل سکے گا، اس علاقہ کے نتائج نہایت اہم ہوں گے۔"

اس تقریر سے یہ بات بھی روشن ہو جاتی ہے کہ فلسطین کے موجودہ حل میں یہودیوں کے وعدہ کو اتنا دخل نہیں ہے جتنا برطانیہ کے ذاتی مفاد کو مسئلہ بیت اللحم اور دیوار گریہ کا نہیں بلکہ ان سے زیادہ مقدس شے "لارجسٹ پائپ لائن" کا ہے، ورنہ یہود کے متعلق دنیا جانتی ہے کہ ان کو اگر کہیں پناہ ملی تو مسلمانوں ہی کے سایہ میں ملی ہے، یہی یہود تھے جو اسلامی اسپین میں حکومت کے مشیر و وزیر تھے، ترقی کی ہر راہ ان پر کھلی ہوئی تھی، اسی طرح مصر میں ان کو ترقی کا پورا موقع دیا گیا اور خلافت راشدہ میں تو یہ حال تھا کہ خلیفہ وقت کے ذاتی مقدمات یہودیوں کے حق میں فیصل ہو جاتے تھے، آج بھی یہود ٹیونس، الجیریا اور عراق میں مسلمانوں کے ساتھ امن و اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ فلسطین کو اگر دینی حیثیت سے دیکھا جائے تو کون نہیں جانتا کہ انجیل اور توریت کے نام لیوا ازل سے ایک دوسرے کے پیغمبروں کے دشمن ہیں، اور صرف مسلمان ہی ہے جس کے دل میں ان دونوں مقدس پیغمبروں کا یکساں احترام موجود ہے، اور جس طرح آج بھی "قمامہ" کا کلید بردار مسلمان ہے فلسطین کا واقعی محافظ بھی مسلمان ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن مسلمان کا اثر وہاں گوارا کیسے ہو جب کہ "وہ (فلسطین) سلطنت برطانیہ میں رسل و رسائل اور آمد و رفت کا اہم نقطہ ہے" اور ان کے نقطۂ نظر سے یہ دیکھتے رہنا ضروری ہے کہ وہاں کسی ایسی قوم کو آباد ہونے اور اپنی قومیت کو عظیم الشان ترقی دینے کی اجازت نہ دی جائے جو بالآخر ہمارے لیے خطرناک ثابت ہو" (کرنل کلفٹن براؤن ممبر پارلیمنٹ)

اسی لئے یہود جیسی غیر سیاسی قوم کو دنیا سے لالا کر اس ساحل پر بسا یا گیا ہے، اور اس خیال سے کہ کہیں یہ کچھوا بھی کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے عربوں اور یہودیوں کے درمیان میں خود بدولت اپنا ٹھکانا بنائے ہوئے ہیں۔ یہودیوں اور عربوں میں برابر چلتی رہے اور بیت المقدس کے مذہبی محافظ پنچ کی حیثیت سے دونوں کے سرپرست ہوں، فلسطین کا ساحل دنیا کی اس مذہبی خدمت کے عوض ان کے اثر میں رہے، اور دنیا کے مذہبی احساسات کی خاطر تکلیفیں جھیلنے والی سلطنت کے جہازوں کو آسانی سے تیل ملتا رہے۔ غریب یہودی بھی بس ایک بہانہ ہیں، اور ان کے سردار ڈاکٹر وائیس مان نے ایک دوسرے سلسلہ میں سچ کہا تھا کہ " یہودی ہمیشہ ہی بہت اچھا بہانہ ثابت ہوئے ہیں "!

مویشیوں کی نسلی اصلاح لارڈ لنلتھگو نے جب سے ہندوستان کی وائسرائی کا چارج لیا ہے، ملک کی زراعت کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس ذیل میں موصوف نے ہندوستانی زراعت کے اس پہلو پر خاص زور دیا ہے جو قوت محرکہ اور حیواناتی مصنوعات سے متعلق ہے یعنی مویشیوں کی اچھی نسل کا رواج۔

ہندوستان اپنے طبعی ماحول کی بنا پر از منۂ قدیم سے ایک زراعتی ملک رہا ہے۔ صنعت و حرفت میں بھی کچھ پیچھے نہ تھا، اور ایک زمانے میں اس کی مصنوعات کا دنیا کی منڈیوں پر قبضہ تھا، مگر اس کا خاص پیشہ زراعت ہی رہا ہے،

زراعت کے لئے جہاں طبعی ماحول اور زمین کی زرخیزی لازم ہے، وہاں قوتِ محرکہ بھی ایک ضروری جزو ہے۔ یہاں قدیم زمانے سے آج تک قوتِ محرکہ مویشیوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں عام طور پر بیل اور بھینسے اس کام کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ مگر بیلوں کا حصہ نسبتاً زیادہ اور اہم ہے۔ ہل چلانا، کنوئیں سے پانی کھینچنا اور پیداوار کا ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا سب کام بیلوں سے لئے جاتے ہیں۔

ہندوستانی معیشت میں مویشیوں کی اہمیت کا کچھ اندازہ ذیل کے اعداد و شمار سے ہو جائیگا۔ یہ اعداد ۱۹۴۴-۴۵ء کے ہیں۔

برطانوی ہند میں:۔

زراعت میں کام آنے والے مویشیوں کی کل تعداد		۱۵۹۹۳۵۰۰۰
بھیڑوں اور بکریوں	" "	۶۱۱۵۷۰۰۰
دیگر مویشی مثلاً گھوڑے، گدھے، خچر اور اونٹ	"	۴۸۰۱۰۰۰

ذیل کے نقشے سے معلوم ہوگا کہ مختلف صوبوں میں ہر ۱۰۰ ایکڑ مزروعہ زمین پر مویشیوں کی تعداد کا اوسط کیا ہے اور ہر ۱۰۰ نفوس پر اوسط تعداد کیا ہے۔

	مویشیوں کا اوسط تعداد	
	ہر سو ایکڑ مزروعہ زمین پر	ہر سو نفوس پر
اجمیر میواڑ	۱۳۴	۸۶
آسام	۱۰۰	۶۹
بنگال	۱۰۸	۵۲
بہار و اڑیسہ	۸۸	۵۷
بمبئی	۳۸	۶۰
برما	۳۴	۴۲
سی پی و برار	۵۶	۸۹
کورگ	۱۰۰	۸۴
دہلی	۷۵	۲۴
مدراس	۷۵	۵۳
سرحدی صوبہ	۵۰	۴۴
پنجاب	۶۰	۶۷

آبادی کی اکثریت کی نظر میں گائے کو جو مذہبی حیثیت حاصل ہے وہ دراصل اسی اہمیت کا نتیجہ ہے۔ برطانوی حکومت تاجروں کی حکومت ہے، اس نے ہمیشہ یہ چاہا ہے کہ ملک کی حالت میں کم سے کم دخل دے کر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ لیکن کسان کی حالت درست کئے بغیر تجارت کو فروغ دینا بھی دشوار تھا۔ اس لئے ہوتے ہوتے ادھر کچھ توجہ شروع کی گئی۔ ۱۹۰۳ء سے پیشتر یہاں کی اقتصادی زندگی کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔ ۱۹۰۳ء میں لارڈ کرزن کے عہد میں زراعت کو فروغ دینے کے لئے کچھ کوشش کی گئی تھی۔ مگر یہ کوشش ابھی ابتدائی منزل میں تھی۔ صرف ایک مرکزی ادارہ بہار کے صوبے میں پوسا کے مقام پر جدید سائنٹفک زراعتی تجربات کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ جس میں نئے نئے بیجوں اور زمین کی مختلف صلاحیتوں کا تجربہ کیا گیا تھا۔ تجربہ کامیاب دیکھ کر ۱۹۰۵ء میں زراعتی تحقیق کی از سر نو تنظیم کی گئی۔ اس میں ایک مرکزی تجربہ گاہ کے بجائے صوبہ جاتی اداروں کے قیام کی ضرورت تسلیم کی گئی اور بڑے بڑے صوبوں میں زراعتی ادارے کھولے گئے۔ ۱۹۰۵ء کے بعد کبھی کبھی جزوی تبدیلیاں اور اضافے ہوتے رہے۔ کوئی بنیادی اور اہم اضافہ نہ ہوا۔

اس کے بعد ۱۹۲۶ء میں زراعت کی تحقیقات کے لئے ایک رائل کمیشن مقرر کیا گیا، اس کمیشن کے صدر لارڈ لنلتھگو صاحب تھے اس کمیشن کی رپورٹ میں مویشیوں کے متعلق نہایت سیر حاصل بحث کی گئی تھی۔ اور اس کی طرف خاص توجہ دینے کی سفارش کی گئی تھی۔

لارڈ لنلتھگو نے اپنے دورِ حکومت کا آغاز زراعت کے اسی پہلو کی اصلاح سے کیا ہے، اس تحریک کی بنیاد مندرجۂ ذیل مقاصد پر رکھی گئی ہے۔

۱۔ مویشیوں کی اہلیتِ کارکردگی بڑھانا۔

۲۔ حیواناتی پیداوار اور مصنوعات کی تنظیم۔

ظاہر ہے گایوں اور بیلوں کی موجودہ نسل نہایت خراب ہے۔ بیل چھوٹے ہوتے ہیں، تھوڑے کام میں تھک جاتے ہیں اور کسان کو کام ادھورا چھوڑ دینا پڑتا ہے۔ اس لئے مجبوراً اس کو کئی جوڑیاں

رکھنی پڑتی ہیں ۔ پھر ان جوڑیوں کے علاوہ اس کے یہاں گائیں اور بھینسیں بھی ہوتی ہیں ۔ اس لئے اُسے چارے کے لئے مستقل انتظام کرنا پڑتا ہے ۔ اور چونکہ چارے کے لئے زمین کی کمی کے سبب وہ مستقل کھیت وقف نہیں کرسکتا ، اس لئے غلے کے کھیتوں سے جو کچھ چارہ ملتا ہے وہ سب کا سب بیل کھالیتے ہیں گایوں اور بھینسوں کو چرنے پر قناعت کرنی پڑتی ہے ، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ دودھ اور گھی کافی تعداد میں پیدا ہو سکتا ہے ، اور نہ نسل ہی معقول پیدا ہوتی ہے ۔

اس کے علاوہ چھوٹی نسل کے مویشی کھاتے بہت ہیں ۔ رائل کمیشن کی رپورٹ میں اس سلسلے میں مندرجہ ذیل سائنٹفک نتیجے نکالے گئے ہیں :-

> یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ جس قدر چارہ ایک سو چھوٹے بیلوں کے لئے درکار ہوگا ، اتنا ہی پچاس دوگنے قد و قامت کے بیلوں کے لئے بھی ہوگا ۔ مویشی جس نسبت سے نسل میں خراب اور چھوٹے قد کے ہوتے ہیں ، اُسی نسبت سے اُن کی خوراک بڑھ جاتی ہے ۔

اس تحریک میں جہاں بیلوں کی نسل پر زور دیا جارہا ہے ، وہاں اچھے قسم کے چارے کے انتظام کی طرف بھی خاص توجہ دی جارہی ہے ۔ اور ذاتی چراگاہ یا چارے کے لئے کھیت بنانے کے بجائے اس امر پر زور دیا جارہا ہے کہ ہر گاؤں یا کئی گاؤں مل کر ایک مشترک چراگاہ کا انتظام کریں اور اسے ہرا بھرا رکھنے کے لئے معقول محنت اور سرمایہ لگایا جائے ۔ اس سلسلے میں چارے کے لئے کھتیاں بنانے ، چارے میں غذائیت کا جزو بڑھانے کے لئے تجربات ہو رہے ہیں اور اس بات پر زور دیا جارہا ہے کہ یہاں بھی مویشی اور چارے کا انتظام انھیں اصولوں پر چلایا جائے جن پر کاربند ہو کر آسٹریلیا اور کنیڈا اپنی زمینوں سے زیادہ سے زیادہ غلہ حاصل کرتے ہیں حالانکہ وہاں کام کرنے والے مویشیوں کی اتنی کثرت نہیں ہے ، جتنی ہندوستان میں ہے ۔

تحریک کا دوسرا رخ مویشیوں کے ذریعے ملک میں دودھ مکھن کے کاروبار کو فروغ دینا ہے دودھ گھی کی جتنی تعداد اچھی ذات کی گایوں اور بھینسوں سے حاصل ہوتی ہے ، چھوٹی ذات کی گایوں اور

بھینسوں سے نہیں ہوتی۔ پنجاب میں اچھی ذات کی گایوں اور بھینسوں کے پالنے کا رواج ہندوستان کے دوسرے صوبوں سے پہلے ہوا ہے۔ یہاں نہروں اور دریاؤں کی کثرت کے سبب چارے کا انتظام بھی قدرے اچھا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ دودھ اور گھی کی جتنی کثرت اس صوبے میں ہے، دوسرے صوبوں میں نہیں ہے۔ چھوٹی ذات کی گائیں بچہ دینے کے بعد زیادہ سے زیادہ ایک سال تک دودھ دیتی ہیں وہ بھی دودھ کی مقدار کچھ تو انکی ذات کی خصوصیت کی وجہ سے اور کچھ چارے کا انتظام اچھا نہ ہونے کے باعث دوسرے تیسرے مہینے سے کم ہونی شروع ہو جاتی ہے، اور آخر میں چل کر ان میں ایک پاؤ کر لے کر آدھ سیر تک دودھ رہ جاتا ہے۔ دودھ کی کمی کا اثر بچھڑے پر بھی بہت بُرا پڑتا ہے۔ وہ دن بدن دُبلا ہوتا چلا جاتا ہے، اور عین شباب کے زمانے میں بھی محنت سے جی چراتا ہے۔

اچھی نسل کی گائیں پالنے کے رواج سے ایک طرف محنتی اور بڑے بڑے بیل حاصل ہوں گے، دوسری طرف دودھ مکھن کثرت سے ہوگا، اس لئے ملک کی ضروریات سے جو بچ رہے گا، ان کی برآمد سے قومی دولت میں اضافہ ہوگا۔ کنیڈا، ڈنمارک، اسٹریلیا اور امریکہ سے دودھ کی مصنوعات کی درآمد اس بات کی شاہد ہے کہ اس ایک شعبہ سے کتنا روپیہ ہندوستان سے باہر چلا جاتا ہے، حالانکہ دودھ دینے والے جانور یہاں اِن ملکوں سے زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ملکی ذرائع پیداوار کا بغور تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے، کہ بصورت خام ہندوستان میں ہر چیز موجود ہے، صرف تنظیم اور چاہئے زراعتی تنظیم کا موقع وائسرائے کی تحریک سے ہاتھ آیا ہے۔ جسے نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

تحریک کی رفتار | اس تحریک کو ایک سال کا زمانہ ہوا ہے۔ اور لوگ بھی (وہ خواہ سرکاری افسران ہی کیوں نہوں) اس کی طرف توجہ کرنے لگے ہیں۔ گذشتہ مئی میں اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے ایک آل انڈیا اجلاس شملہ میں ہوا تھا۔ اس اجلاس میں ہر صوبے کے نمائندے شریک ہوئے تھے، اس کا خاص مقصد یہ تھا کہ تحریک حیوانات کو زیادہ سے زیادہ ہمہ گیر بنانے اور اس کا اثر گاؤں تک پہنچانے کے لئے مزید تدابیر پر بحث کی جائے۔

وائسرائے نے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ قابل غور ہیں۔

آپ نے فرمایا تھا:۔

"یہ امر محتاجِ تشریح نہیں کہ ہندوستان کی زراعت کا تمام انحصار مویشیوں پر ہے ۔اس لئے کہ قوتِ محرکہ کے حصول کی مویشیوں کے علاوہ ہندوستان میں اور کوئی سبیل نہیں ہے ۔ میرے خیال میں ہندوستان کی زراعت کو فروغ دینے کے لئے مویشیوں کی نسلی اصلاح سے بڑھ کر اور کوئی ترکیب نہیں ہے"

زراعت کے تحت میں مویشیوں کی اہمیت جتانے کے بعد وائسرائے نے اس تحریک کی اقتصادی اور تجارتی پہلو کو بھی واضح کیا:۔

"ہندوستان کی سالانہ آمدنی میں مویشیوں کے ذریعے کم وبیش تیرہ ارب روپیہ آتا ہے ۔ اس میں مویشیوں کی محنت ، ڈیری کی مصنوعات ، کھاد وغیرہ سب اجزا شامل ہیں ۔ یہ محض ایک اندازہ ہے ، مگر اس سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بحالت موجودہ مویشیوں کا وجود کس قدر اہم اور پیداآور ہے ۔ آج آپ لوگ جہاں مویشیوں کی نسلی اصلاح کی تحریک کی کامیابی کے ذرائع تجویز کرنے کے لئے آئے ہیں وہاں آپ کے سامنے بہت سے ضمنی مسائل بھی آئیں گے جو بظاہر اقتصادیات سے متعلق ہوں گے ، مگر ان کی اصل مویشیوں سے ملتی ہوگی ۔ مثلاً بھیڑ بکری کی پیداوار اون کی پیداوار چمڑے اور ہڈی کی صنعت اور گھوڑوں کی اچھی نسل پیدا کرنا ۔ وغیرہ جن کا تعلق ملک کی قومی دولت سے بہت گہرا ہے"۔

تحریک کی رفتار کا جائزہ لیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اس کا اثر مرکز سے نکل کر صوبوں تک پہنچنا چاہئے ۔ اور اصل میدان تو صوبے ہی ہیں ، اس لئے کہ عوام اور کسانوں کا تعلق جتنا قریبی صوبوں اور ضلعوں سے ہے ، مرکز سے نہیں ہے ۔ مرکز کا کام تو متعدد صوبوں میں باہم تبادلہ اطلاعات کا انتظام کر دینا اور گاہے بگاہے صوبائی تحریکوں کو ایک جگہ پر جمع کر دینا ہے ۔ آخر میں آپ نے آئندہ کے لئے امید کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:۔

"آخر میں مجھے اجازت دیجئے کہ میں اپنے پہلے الفاظ پھر دہراؤں کہ ہم کسان کی بھلائی اس سے بڑھ کر اور نہیں کر سکتے کہ مویشیوں کی اصلاح کے لئے قدم اُٹھائیں - میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر ہم نے صحیح راہِ عمل اختیار کی اور ہماری پالیسی صحتِ نیت پر ہوئی تو ہم بہت جلد کامیاب ہوں گے - اور آگے چل کر کسانوں کا طبقہ ہمارے ساتھ ہوگا"

وائسرائے کی تقریر کے بعد جناب سر جگدیش پرشاد صاحب کی صدارت میں کانفرنس میں صوبوں کے نمائندوں نے اپنے صوبے کے تجربات پیش کئے اور اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے مختلف اسکیمیں پیش کیں - ان تمام اسکیموں میں قدرِ مشترک چیز یہ تھی کہ صوبوں میں مویشیوں کی تحریک کے لئے فنڈ کھولا جائے اور صوبے کے وزیرِ زراعت کی صدارت میں محکمۂ اصلاحِ مویشیان قائم کیا جائے - اس محکمے کا کام یہ ہو کہ مشترکہ فنڈ سے اچھے نسل کے بیل خریدے - اور ان کے ذریعہ اپنی نگرانی میں ہر ضلع میں اچھی نسل کے گائے بیل کی پیدائش کا انتظام کرے -

یہ محکمہ اسی ضمن میں حتی المقدور مشترک چراگاہوں کے قیام کی کوشش بھی کرے گا - اور اچھے چارے کی کاشت کا رواج بھی بڑھائے گا ؛ جو اچھے نسل کے مویشیوں کے وجود کے لئے ایک لازمی ربط ہے -

وائسرائے کی یہ تحریک جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ہندوستانی زراعت کے لئے نہایت مبارک ہے - مگر اس کی کامیابی بڑی حد تک مشروط ہے ، اور اگر اس کی طرف خلوصِ نیت سے توجہ نہ کی گئی اور کارآمد ذرائع اختیار نہ کئے گئے تو بقول مسٹر کھاپرڈے چند ایکڑ زمینوں میں تو اچھے موٹے موٹے اور جاندار بیل نظر آجائیں گے - مگر کاشتکاروں کی آبادی بالکل محروم رہ جائے گی - ہندوستان کا کسان اَن پڑھ ہوتا ہے - وہ کسی چیز کی اہمیت سمجھ بوجھ کر تسلیم نہیں کرتا - یہ درست ہے کہ جب وہ اچھے موٹے تازے گائے بیل دیکھے گا تو اُسے تحریص ضرور ہوگی ، مگر یہ جذبہ ممکن ہے اس کے اندر مستقل نہ رہے - اس باب میں کسانوں کی تعلیم کا معقول انتظام کیا گیا تو اثر بھی اس تحریک کا پائدار ہوگا ، اور اس کی کامیابی میں وقت بھی کم صرف ہوگا -

کسان غریب بھی ہے، اچھی نسل کے جانور خریدنے کے لئے اس کے پاس پیسے نہیں۔ اس لئے ان کی خریداری میں اسے سہولتیں بھی بہم پہنچانی چاہئیں۔ امداد باہمی کے بنک اس باب میں کسانوں کی خاصی مدد کرسکتے ہیں۔

تحریک بہ حیثیت مجموعی مفید ہے، مگر ہندوستان کے لئے کوشش فلاح کا محض ایک رخ ہے۔ دنیا میں آج کل زراعت وصنعت جب تک دوش بدوش نہ چلیں کوئی ملک کما حقہ ترقی نہیں کرسکتا۔ حکومت برطانیہ کی پچھلی پالیسی دیکھئے تو یہ رہی ہے کہ ہندوستان کو انگلستان کی مشینوں کے لئے اشیا رخام کی فراہمی کے لئے استعمال کیا جائے۔ زراعت کو فروغ دینے میں بھی یہ حکمت مضمر ہے کہ کسان کی قوت خرید بڑھے تو برطانوی مال کی کھپت اس منڈی میں زیادہ ہو۔ اس لئے اس یک رخی تحریک فلاح کو دیکھ کر جہاں خوشی ہوتی ہے، اور امید بندھتی ہے وہاں ایک گونہ تشویش بھی ہوتی ہے کہ ؎

ہم تک کب اُن کی بزم میں آیا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں — ب۔ ع

کانگریسی وزارتیں | ہندوستان کے چھ بڑے صوبوں میں کانگریس نے کئی مہینہ سوچ بچار اور بحث مباحثہ کے بعد وزارتیں قبول ہی کرلیں۔ قانون ساز مجالس کے جلسے بھی ہو چکے۔ جمہور کی طرف سے مجالس کے افتتاح کے وقت ہر جگہ جو مظاہرے ہوئے وہ ہندوستان کی تاریخ میں بالکل نئی بات تھے۔ پہلی مرتبہ ان مجالس کو جمہور نے اپنے فلاح اور بہبود کے ادارے جانا اور جو مناظر پہلے قومی جلسوں میں دیکھنے میں آتے تھے وہ قانون ساز مجالس کی عمارتوں کے باہر اور اندر دکھائی دیئے۔ جلوس، ہجوم، بیکار رے، بندے ماترم، غرض وہی قومی جلسوں کا سا جوش، وہی خلوص، وہی عقیدت ـــــ اور کہیں کہیں وہی بے ترتیبی! یہ ہونا چاہئے بھی تھا اور ہو بھی چکا، لیکن حکومت کا کام محض جوش اور عقیدت اور بے ترتیبی سے انجام نہیں پاتا۔ اس کے لئے ضرورت ہے غور و فکر اور تدبیر کی۔ جس جوش کا مظاہرہ جمہور کی طرف سے ہوا ہے اس سے وزارتوں کی ذمہ داری بڑھتی ہے۔ ان توقعات کا پتہ چلتا ہے جو جمہور کو ان سے ہیں، ان کے کاموں میں جمہور کی طرف سے تعاون کا وعدہ بھی اس

مضمر ہے، مگر فکر اور تدبیر کا فرض بہرحال وزارتوں کے ذمہ رہتا ہے۔ ان کی کامیابی اب اس سے نہیں جانچی جا سکتی کہ کسی وزیر کا اسٹیشن پر کس شان سے استقبال ہوا، کیا جلوس نکلا، یا انھوں نے کیسی دل ہلانے والی تقریر کی۔ اب کامیابی کا معیار یہ ہوگا کہ ان کی تدبیر سے صوبہ کی خوشحالی میں کیا اضافہ ہوا، کتنے بھوکوں کے پیٹ بھرنے کی سبیل نکلی، کتنے بے کاروں بے روزگاروں کو کام ہاتھ آیا، کتنے بیماروں کے علاج کی اور کتنے تندرستوں کو بیماری سے بچانے کے لئے حفظ ماتقدم کی تدابیر کی گئیں، کتنے ان پڑھ جاہلوں کے لئے لکھنے پڑھنے کا اور اپنے آس پاس کے معاملات کو سوچنے سمجھنے کے قابل بنانے کا سامان کیا گیا، غریب کے لئے انصاف حاصل کرنے میں کیا سہولتیں پیدا کی گئیں، رشوت کا بازار کس حد تک سرد پڑا، گاؤں اور شہر کے درمیان حمل ونقل کے ذرائع میں کیا ترقی ہوئی، صوبہ کی آبادی کے مختلف حصوں میں جو بے اعتمادیاں ہیں وہ کہاں تک مٹیں، قوم کی معاشی اور سیاسی ترقی کی طرف سے جو مایوسیاں یا شبہے ہیں وہ کہاں تک کم ہوئے۔ ان کی کامیابی اور ناکامی اس طرح جانچی جائے گی کہ جب یہ عنان حکومت ہاتھ سے دیں گے اس وقت ان کا صوبہ پہلے سے زیادہ خوشحال ہوگا یا بدحال، اور آزادی کی طرف اعتماد کے ساتھ قدم بڑھانے پر آمادہ ہوگا یا اس تجربہ کی وجہ سے اس میں کچھ جھجک پیدا ہو جائے گی۔

اس معیار پر پورا اترنے کے لئے ان وزارتوں کو بڑے مالی وسائل درکار ہوں گے اور قابل آدمی افلاس، بیکاری، بیماری، جہل باتوں سے نہیں مٹائے جا سکیں گے۔ آدمیوں کا حال یہ ہے کہ جتنے اعلیٰ عہدہ دار ہیں، جنھیں ان وزارتوں کے دست و بازو سمجھنا چاہئے ان پر زیادہ تر انگریز پہلے سے متمکن ہیں، ان کے جملہ حقوق قانوناً محفوظ ہیں، انھیں کوئی مشکل ہی سے چھو سکے گا۔ عہدہ داروں کا فرض تو یہ ہے کہ وزارت وقت کے احکام کی تعمیل کریں اور یہ عہدہ دار بھی تعمیل ضرور کریں گے۔ مگر تعمیل تعمیل میں بھی فرق ہوتا ہے۔ جب حکومت کے مقاصد کے باب میں وزارت اور اس کے عملہ میں ایسا بنیادی اختلاف ہو جیسا کہ اندیشہ ہے کہ موجودہ وزارت اور اس کے عملہ میں ہو سکتا ہے، اور پھر وزارت کو اس عملہ کی برطرفی، یا ان کی تنخواہ میں اضافہ و تخفیف کا حق بھی نہ ہو تو وزارت کے بہت سے منصوبے

مشکل ہی سے تکمیل کو پہنچ سکتے ہیں یہ مشکل بھی حل ہو جائے تو وسائل کا معاملہ ہے۔ کانگریس جن چیزوں کا قوم سے وعدہ کرتی رہی ہے ان کو پورا کرے تو وسائل اور کم ہوتے ہیں۔ کسان پر لگان کم کرے تو زمیندار سے مالگذاری کم وصول ہوگی، شراب کی فروخت بند کرے تو آبکاری کی آمدنی ہاتھ سے جائے گی۔ مصارف میں تخفیف کرکے اس کمی کی تلافی ہو سکتی تھی، تو بڑے تنخواہ دار ملازموں کی تنخواہیں گھٹانے کا حق ہی نہیں ہے۔ چھوٹوں پر مشق تخفیف سے کیا حاصل ہوگا۔ فوج، ریلیں، ڈاک اور تار، محاصل، یہ سب مرکزی حکومت کے تحت ہیں ان میں نہ خرچ کم کرنے کا اختیار ان وزارتوں کو ہے نہ ان سے آمدنی بڑھانے کا۔ بعض ملکوں میں وسائل بڑھانے کے لئے حکومت زر رائج کی مقدار بڑھاتی ہے، سو اس کا اختیار بھی صوبجاتی حکومتوں کو نہیں، سیاست، زرگری بھی مرکزی حکومت کا حق ہے! قومی تعمیر کے کام اگر اٹھائے گئے تو غالباً صوبائی حکومتوں کو قرض لینا ہوگا، اور ان اغراض کے لئے قرض لینا مالیاتی اصول سے غلط بھی نہ ہوگا، لیکن یہاں بھی گورنر بہادر اور گورنر جنرل کی خوشنودی شرط ہے!

اس سے یہ تو واضح ہوگیا کہ جو بنیادی مسائل کسی قومی حکومت کو حل کرنے چاہئیں ان کے حل کی توقع موجودہ قومی وزارتوں سے کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ وہ قانون دستور کے شکنجہ میں جکڑی ہوئی ہیں اور وہ انھیں قدم قدم پر روکے گا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اگر دوسرے ایسے کام وزارتیں انجام دیں جس سے جمہور کا اعتماد ان پر قائم رہے تو ان معاملات میں وزارت کی ناکامی سے دستور کو بدلوانے کا مطالبہ قوی ہوگا اور حرکت آزادی میں قوم ایک قدم اور آگے بڑھنے کو تیار ہوگی۔

مگر اس بےبسی کے باوجود جس کا ہم نے ذکر کیا یہ وزارتیں کس طرح جمہور کا اعتماد قائم رکھ سکتی ہیں؟۔ ایک تو یوں کہ آزادی کے لئے کام کرنے والوں کو محض آزادی خواہ ہونے کے جرم میں جو تکلیفیں، اور سزائیں اٹھانی پڑتی تھیں ان کو ختم کرادیں۔ آزاد خیال اشخاص پر، طالب علموں پر، اخباروں پر، جو زیادتیاں پچھلے زمانہ میں ہوتی رہی ہیں، خفیہ پولیس کی تاک جھانک سے انھیں جس طرح

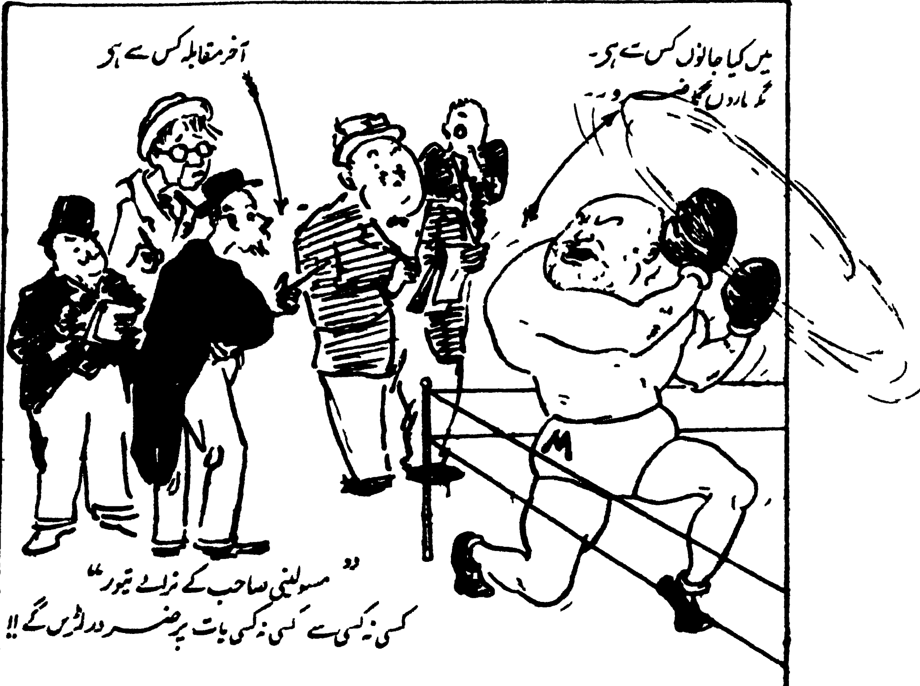
تنگ کیا جاتا رہا ہے، اس کا سد باب ہو جائے۔ اس سے آزادی اور سچی خدمت قومی کی قوتیں اور ولولے ترقی کریں گے۔ اور جب دستور کی بنیادی خامیوں کی وجہ سے اس کا چلانا ممکن نہ رہیگا تو یہ قوتیں کام دیں گی۔ پھر یہ وزراء اپنی شخصی مثال سے اور اپنے حکم سے اس کا اہتمام کر سکتے ہیں کہ سرکاری عہدہ دار اپنے کو قوم کا خادم سمجھیں۔ یہ ممکن ہونا چاہیئے کہ اب لوگ پولیس کے پاس شکایت لے جانے سے اس لئے نہ ڈریں کہ خود مصیبت میں پھنس جائیں گے اور عدالت میں اس وجہ سے نہ جانا چاہیں کہ قدم قدم پر رشوت دیتے دیتے اپنے مطالبہ سے زیادہ زیر بار ہو جائیں گے۔ خفیہ پولیس کا رخ آسانی کے ساتھ سیاسی جلسوں کی طرف سے موڑ کر عدالتوں کی جانب کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ وہاں یہ بھی اس رشوت کے "قومی ادارہ" سے تمتع نہ کرنے لگیں!

یہ سُودیشی کی تحریک کو، قومی تعلیم کے کام کو، دیہات سدھار کی کوششوں کو، جنھیں ابتک غیر سرکاری قوتیں انجام دیتی رہی ہیں اپنی تھوڑی سی توجہ سے بہت پھیلا سکتے اور بہت مضبوط کر سکتے ہیں۔ اگر وسائل کی کمی خود حکومت کو اس کا موقع نہ دے کہ وہ ان کاموں کو پوری طرح خود انجام دے تو شاید اچھا ہی ہے، بہتر یہی ہے کہ یہ کام غیر سرکاری طور پر انجام پائیں اور دفتریت کی مرجھانے والی ہوا سے دور ہی رہیں، مگر حکومت کی ہمدردی اور توجہ سے ذرا زیادہ آسانی کے ساتھ فروغ پا سکیں۔

یہ وزارتیں باوجود وسائل کی کمی کے یہ کر سکتی ہیں کہ اپنے زمانہ اقتدار میں اپنے صوبہ میں ان آزادی دشمن افراد اور جماعتوں کے زور کو توڑ دیں جو گانوں گانوں اور شہر شہر قوم کی گردن پر تسمہ پا کی طرح مسلط ہیں۔ یہ وزارتیں ہمدرد ماہروں کی مدد سے اپنے صوبوں کی زراعتی، صنعتی، تعلیمی، ضرورتوں کی کلی تحقیق کرا سکتی ہیں جن کے بغیر وسائل ہاتھ آجانے کے بعد بھی کوئی پائدار تبدیلی کرنا ممکن نہ ہوگا۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ یہ وزارتیں اپنے عمل سے اس بے اعتمادی کو بہت کچھ کم بلکہ ختم کرانے میں مدد دے سکتی ہیں جو ملک کے ہندو مسلمانوں میں باہم اس وقت پھیلی ہوئی ہے۔ افسوس کہ صوبجات متحدہ میں کانگریس اور مسلم لیگ میں وزارت کے معاملہ میں سمجھوتہ کی کوششیں ناکام رہیں، ورنہ حکومت کے

کاروبار میں ان دونوں جماعتوں کا تعاون اس بے اعتمادی کے رفع کرنے میں بہت کچھ مدد دیتا۔ مگر یہ نہیں کہ اس کے مواقع ختم ہو گئے۔ ہر روز ایسے مواقع پیدا ہوں گے کہ وزارت اپنے عمل سے اس بے اعتمادی کو کمزور اور بالآخر مٹانے کی کوشش کر سکے گی۔ لیکن یہی مواقع اگر صحیح طور پر استعمال نہ کئے گئے تو بے اعتمادی کو بڑھا بھی سکتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا، تو وزارتوں کے سارے مہتم بالشان سے مہتم بالشان کارنامے ایک طرف ہوں گے اور قومی مستقبل کے ساتھ یہ ایک خیانت ایک طرف۔ اور اس خیانت کا بوجھ زیادہ ہی ہوگا۔ اس لئے کہ جب موجودہ کانگریسی وزارتیں دستور کے نقص کی وجہ سے بنیادی تبدیلیوں سے قاصر ہیں تو پھر تو ان کی کامیابی کا معیار بس یہ ہے کہ وہ قوم کو اس دستور کے بدلوانے اور پوری قوت اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کے لئے تیار کر رہے ہیں یا نہیں۔ اور جب تک وہ ہندو مسلمان کی یہ باہمی بے اعتمادی ـــ چاہے وہ کتنی ہی غیر منطقی اور غیر عقلی ہی ثابت کی جاسکے ـــ رفع نہ کریں یہ تیاری پوری نہیں کی جاسکتی۔ ان وزارتوں پر ہماری قومی زندگی کے مستقبل کی ذمہ داری ہے خدا کرے یہ اس سے اچھی طرح عہدہ برآ ہوں۔

ذ۔ ح



"مسولینی صاحب کے نرالے تیور"
کسی نہ کسی سے کسی نہ کسی بات پر ضرور لڑیں گے!!

شمالی یورپ | رسالہ جامعہ کی پچھلی اشاعت میں ایک مضمون شمال کے برفیلے رقبہ میں روس کی صنعتی، بحری اور جنگی تیاریوں کے متعلق شایع ہوا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ روسی اس علاقہ میں کس انہاک سے کام کر رہے ہیں۔ روسی ہوا باز متعدد بار قطب شمالی کے اوپر سے اڑ کر امریکہ پہنچ چکے ہیں۔ قرینہ یہ ہے کہ زیادہ عرصہ نہ گذرنے پائیگا کہ قطب شمالی پر کا ہوائی راستہ دنیا کے طیاروں کی شاہراہ بن جائے گا۔ اس لئے کہ ہماری دنیا کے سب اہم مرکز دنیا کے شمالی نصف میں واقع ہیں۔ اگر دنیا کی چھت پر سے اڑ کر سفر کیا جائے تو ان مرکزوں کے درمیان کا فاصلہ اس سے کم ہو جاتا ہے کہ زمین کی کمر کے چاروں طرف اڑ کر اسے طے کیا جائے۔ لندن سے ٹوکیو جانے کے لئے اگر خط استوی کے پاس پاس جائیے تو زیادہ دور کا سفر ہے قطب شمالی پر سے اڑ کر پہنچ جائیے تو کم۔ یہی حال ماسکو سے سین فرانسسکو یا نیو یارک سے شنگھائی کے سفر کا ہے، پھر اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ روسی اپنے ہوائی جہازوں کو مشرق بعید میں ایسے راستہ سے بھیج سکتے ہیں جہاں کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا۔ دشمن کے ہوابازوں کو نہ تو اس سرد علاقہ میں اڑنے کی مشق ہوگی نہ لاسلکی کے وہ قطبی مرکز ان کے ہاتھ میں ہوں گے جو روسی ہوا بازوں کو منٹ منٹ کی خبر دیتے ہیں، روس جاپان کی جنگ ہوئی تو روسی ہوائی جہاز جاپانی محاذ پر عقب سے حملہ کر سکیں گے۔ اور اگر امریکہ روس کے ساتھ ہوا تو برابر روس کی مشرقی فوج کو قطب کے اوپر سے ہو کر سامان پہنچ سکے گا، اور جاپانی اس راستہ میں کچھ نہ کر سکیں گے۔

لیکن اس جاپانی۔ روسی جنگ سے زیادہ آج کل روس اور جرمنی میں جنگ کے امکانات پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ لندن کے اخبار پچھلے دنوں شمال میں فوجی تیاریوں کی عجیب عجیب داستانیں شایع کرتے رہے ہیں۔ کسی نے رات کو ناروے اور سویڈن کے شمال میں فوجی طیاروں کو اڑتے دیکھا ہے، کسی نے ایک جرمن آبدوز کو چھپ کر ساحل کے پاس آتے دیکھا ہے۔ کہتے ہیں کہ جنرل بلوم برگ بھی خفیہ طور پر ناروے کے ساحل کا تفصیلی معائنہ کر گئے ہیں، مرمانسک بندرگاہ میں روس بھی پوشیدہ تیاریاں کر رہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

شمال کے یہ ممالک عرصہ سے جنگ سے مامون ہیں۔ سویڈن اور ناروے تو نپولین کے

عہد کے بعد سے محفوظ رہے ہیں، ڈنمارک ۱۸۶۴ء میں پروشیا سے لڑا تھا اس کے بعد سے کسی سے نہیں۔ یہ ملک جمعیۃ اقوام اور امن عالم کے بھی بڑے حامی ہیں۔ انھوں نے اب تک بلا کسی شرط کے اور دوسروں سے بھی اس کا مطالبہ کئے بغیر اپنی فوجی قوت کو گھٹایا ہے۔ لیکن آج ان کے اس پُرامن حصہ میں بھی ہر دم جنگ کا ذکر ہے۔ بات یہ ہے کہ جنگ عظیم سے پہلے اس شمالی علاقہ میں کل چار با اختیار ریاستیں تھیں، آج دس ہیں۔ نئی ریاستیں کچھ پرانے روسی علاقہ میں سے بنائی گئی ہیں، کچھ جرمن علاقہ میں سے۔ روس اور جرمن کی موجودہ رقابت سے ان ریاستوں کے لئے طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔

سب سے زیادہ خطرہ میں ڈنمارک ہے۔ جسے جنگ کے بعد جرمنی کا کچھ علاقہ بھی دیا گیا تھا۔ اس چھوٹے سے ملک کا ساحل ساڑھے تین ہزار میل سے زیادہ کا ہے۔ اور کہیں کوئی ساحلی چٹان نہیں، سب صاف سپاٹ میدان۔ جرمنی کو کچھ تو اپنا علاقہ واپس لینے کا حوصلہ ہے، کچھ یہ کہ سرحد کے پاس ہی اس کے ہوائی جہازوں اور بعض جنگی صنعتوں کے خاص مرکز ہیں۔ ڈنمارک کسی طرح اپنی حفاظت نہیں کر سکتا۔ ان کے مشہور سیاسی ہوُرُپ کا قول تھا کہ یہ "اسلحہ کس کام کے؟" چنانچہ اس نے اپنی فوجوں کو برابر گھٹایا۔ آج کل ۸ ہزار فوج ہے، ۵۰ ہوائی جہاز ہیں، اور بیڑہ کا مجموعی وزن ۱۱ ہزار ٹن! لیکن باوجود اس بے بسی کے یہ بھی اب جنگ کے لئے کچھ نہ کچھ تیاری کر رہے ہیں۔

سویڈن کا معاملہ یہ ہے کہ وہاں اچھا لوہا نکلتا ہے۔ اور اس لوہے کا بہت بڑا حصہ جرمنی کو جاتا ہے۔ پچھلے سال میں جتنا کچھ لوہا جرمنی میں آیا اس کا تقریباً آدھا سویڈن سے خریدا گیا ہے۔ اور جرمنی جنگ میں مبتلا ہو جائے تو شاید لوہا حاصل کرنے کا ایک موقع یہیں سویڈن سے ہی ہو۔ روسی چاہیں گے کہ یہ رر

ناروے اس جھگڑے میں یوں آلودہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوہا جاتا ہے اس کے بندرگاہ نارِوک سے جو سویڈی کانوں کے قریب ہے۔ چنانچہ سویڈن اور ناروے بھی اپنا فوجی خرچ بڑھا رہے ہیں۔ فنستان جس نے روس سے الگ ہو کر آزادی حاصل کی ہے، اب اپنے دوسرے شمالی ساتھیوں کی

ملا ہوا ہے۔ جنگ کے بعد بحیرہ بالٹک کے جزائر آلینڈ اسے دے گئے تھے، حالانکہ سویڈن انھیں اپنا حق سمجھتا تھا۔ سویڈن کو خوش کرنے کے لئے ۱۹۲۱ء میں یہ طے ہوا تھا کہ ان جزائر کے فوجی قلعے مسمار کر دیئے جائیں۔ لیکن اب میں کا یہ حال ہے کہ مشترکہ اغراض کے تحفظ کے لئے سویڈن والے اس پر راضی ہیں کہ ان جزائر کو فوجی مرکز بنا دیا جائے۔ اور روس والے اس پر خاصے برہم ہیں۔

غرض اس علاقہ میں بھی جنگ کا خوب چرچا ہے۔ لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ ان امن پسند ملکوں کی فوجی تیاریاں نہ روس سے حفاظت کے لئے کافی ہوں گی نہ جرمنی سے۔ اس لئے یہ اس فکر میں ہیں کہ برطانیہ سے روابط بڑھائیں کہ وہ جنگ کی حالت میں ان کی مدد کرے۔ ہاں اس کے ساتھ ساتھ اپنے باہمی اتحاد عمل کو بڑھا کر معاشی تعاون کی تدبیریں کر رہے ہیں کہ جنگ کی صورت میں یہ دوسروں کے بالکل دست نگر نہ ہوں۔ (ذ۔ ح)

چینی جاپانی تعلقات | یہ اقتباس ایک مشہور جاپانی رسالہ "نگی شنجو" سے لیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ جاپانی، چین سے اپنے تعلقات کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ دوسرے نانکنگ کی حکومت پر چینی اشتراکیوں کے اس اثر کی جو متحدہ چین، کی تحریک کے سلسلے میں پڑا ہے، (جس کا ذکر تفصیل سے ہم اپنی پچھلی اشاعت میں کر چکے ہیں) کچھ دلچسپ تفصیلات بھی معلوم ہوتی ہیں۔

کچھ دن ہوئے میں سیر و سیاحت کی غرض سے چین کے شمالی علاقے میں گیا تھا۔ یہاں میں نے جو کچھ دیکھا اور جو کچھ لوگوں کو کہتے سنا اس سے مجھے یقین ہو گیا کہ چینی جاپانی تعلقات اس وقت تک خوش گوار نہیں ہو سکتے جب تک کوئی بنیادی فیصلہ نہ ہو جائے۔ ۲۵ جنوری ۱۹۳۷ء کو میں تین تسین (TIENTSIN) پہنچا۔ ایک دن یہاں کے ایک بڑے بازار سے گزر رہا تھا کہ یکایک میری نظر چین کے ایک نقشے پر پڑی جو ایک بہت بڑے کتب فروش کی دوکان میں شیشے کی بیرونی کھڑکی میں لٹک رہا تھا۔ اگرچہ یہ نقشہ مئی ۱۹۳۶ء کا چھپا ہوا تھا لیکن اس میں منچوریا کو چین کا ایک حصہ دکھلایا تھا اور اس کے تمام صوبوں اور شہروں کے نام وہی تھے جو "مان چوکو" کی تعمیر سے پہلے تھے۔ اسی

طرح دیواروں اور تار کے کھمبوں پر بڑے بڑے پوسٹر لگے دیکھے جن میں قومی نعرے درج تھے۔ سرحد کے انتشار نے چینیوں کے قومی جذبے کو جس شدت کے ساتھ اُبھارا تھا جاپانی اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ گھڑی ہوئی بے بنیاد باتیں متحرک تصویروں کے ذریعہ دکھائی جاتی تھیں اور جاپان کے خلاف چینیوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کی ہر ممکن تدبیر اختیار کی جاتی تھی۔ برخلاف اس کے جاپانی سپاہیوں کا یہ حال تھا کہ اُن میں سے کوئی بھی خوشی سے سوئین کی جنگ میں شامل ہونے کے لئے تیار نہ تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاپانی موثر پروپگنڈا کرنا نہیں جانتے۔

اس سفر میں "سیان" کے حادثے کے متعلق جو باتیں مجھے معلوم ہوئیں وہ ان روایات سے بالکل مختلف ہیں جو جاپان میں بیان کی جاتی ہیں۔ مثلاً جاپان میں کوئی شخص یہ نہیں جانتا کہ اس جنگ میں (MAE TSE TUNG ' CHUTE.) ماؤ سے تنگ، چو طے، اور چو یولائی کمیونسٹ رہنما بھی شریک تھے۔ چین میں یہ بات عام طور سے مشہور ہے کہ مارشل چیانگ کائی شک کی رہائی کے سلسلہ میں نانکنگ کے مدبرین نے اس عام جذبے کی حمایت کا یقین دلایا تھا جو جاپان کے خلاف تمام چین میں پھیلا ہوا تھا۔ نیز انھوں نے ۶۰ (ساٹھ) لاکھ "یان" چاندی کی اور تیس لاکھ بنک کے نوٹوں کی شکل میں کمیونسٹوں کی سپاہ اور (CHANG HSUEH LIANG) اور (YANG HU CHANG) چانگ سوسے لیانگ اور یانگ ہوچنگ کی فوجوں کو دینے کا وعدہ کیا تھا سرخ فوج کے لئے بہت سے ہتھیار اور جنگی ساز و سامان مہیا کرنے کا معاہدہ کیا تھا۔ اس میں موٹر گاڑیاں اور بیس ہوائی جہاز بھی شامل تھے جو سیان میں حکومت نانکنگ کے قبضے میں تھے۔ ان کے علاوہ حکومت کا یہ بھی وعدہ تھا کہ وہ ہر مہینہ نصف لاکھ یان ( ) یانگ ہوچنگ کی معرفت سرخ فوج کو دیتی رہیگی۔ یہ ہیں وہ واقعات اور تفصیلات جن پر جاپان کو خاص طور سے غور کرنا چاہیئے۔ اُسے چاہیئے کہ وہ سیان کے حادثے کی تحقیقات کرے۔ اسی کے ساتھ ساتھ چین میں پیش آنے والے آئندہ واقعات کو بھی سامنے رکھنا چاہیئے اور پیش رفت کرنا چاہیئے کہ چین کے معاملات میں اس کا کیا رویہ رہیگا۔

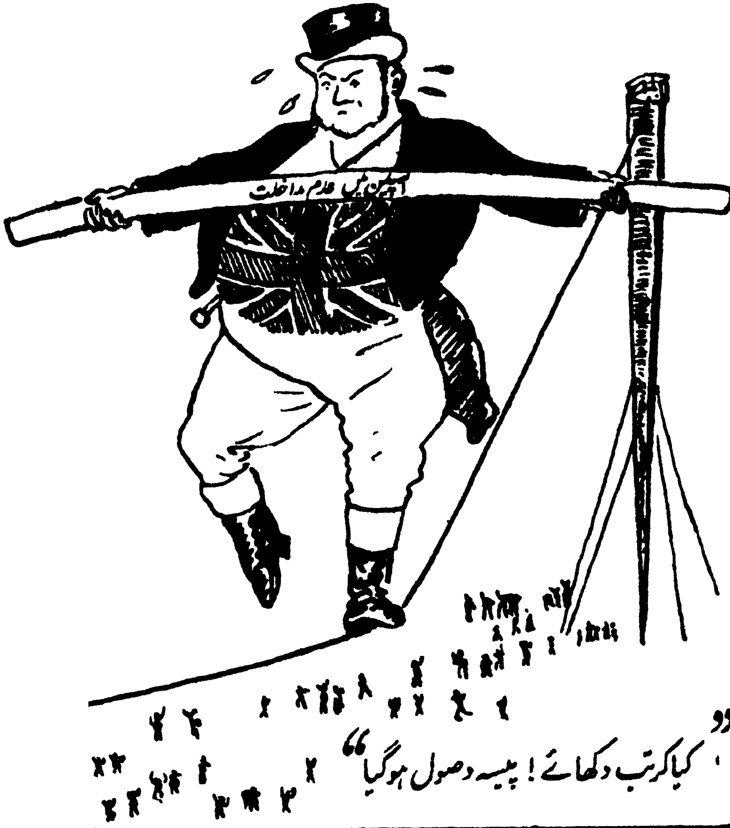
اسی کے برابر اہم وہ اعلان بھی ہے جو کومن تانگ نے شائع کیا ہے اور جو ایک اعتبار سے سیان کے حادثے کے جاری رہنے کا سبب بھی خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس اعلان میں بار بار اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ کومن تانگ مملکت چین میں کسی قسم کی شورش پسند نہیں کرتی اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس وقت تک چینی اور جاپانی تعلقات کی تجدید ناممکن ہے جب تک مشرقی ہوپی کی حکومت اور خود ہوپائی اور چہار کا ملکی نظم ونسق بیرونی انتداب سے پاک نہ ہو جائیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ چین اور جاپان کے رجحانات میں کس قدر اختلاف پیدا ہوگیا ہے۔ ایک طرف جاپان یہ سمجھتا ہے کہ مان چوکو ایک خودمختار ریاست کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ چین سے ہر طرح علیحدہ ہے۔ دوسری طرف چین تعلقات کی تجدید اس وقت تک کرنے کے لئے تیار نہیں جب تک مانچوکو پہلے کی طرح اس کے قبضہ میں نہ آجائے۔ اور چین کو کاروباری تعلقات میں برابر کا مرتبہ نہ حاصل ہو جائے۔

دوسری طرف روسی حکومت شمالی چین میں اپنا اقتدار بڑھاتی چلی جا رہی ہے۔ چینیوں کی سرخ فوج کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ اور سیان کے حادثے کے بعد سے جنگی سازوسامان میں اور بھی اضافہ کر دیا گیا ہے تاکہ ضرورت پڑنے پہ کام آسکے۔ اگرچہ خود چین میں ابھی اتنی قوت نہیں پیدا ہوئی کہ وہ جاپان کا مقابلہ کر سکے، لیکن چینیوں کی سرخ فوج سے نانکنگ کا پلہ بھاری ہوتا چلا جا رہا ہے اگر لڑائی چھڑ جائے تو یقیناً چینیوں کی سنٹرل فوج سرخ فوج کے جرنیلوں کے بڑھنے کے لئے راستہ صاف کر دے گی۔ چین سے کوئی معاملہ کرتے وقت جاپان کو یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ چین میں جاپانیوں کی مخالفت کی اصل وجہ یہی سرخ فوج رہی ہے۔

غرض شمالی چین میں اپنی سیاحت سے میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ موجودہ جمود پر غالب آنے کے لئے جاپان کو مناسب ذرائع اختیار کرنے چاہئیں۔ اسے چاہیئے کہ وہ فروعی باتوں کو چھوڑ کر چینی جاپانی تعلقات استوار کرنے کے لئے نانکنگ کی حکومت سے بنیادی مسائل طے کرے!

پہلا بنیادی مسئلہ مانچوکو کی ریاست کا ہے۔ جاپان کو چینیوں کے سامنے مانچوکو کے وجود کی غرض وغایت کی اچھی طرح تشریح کر دینی چاہیئے اور نانکنگ کی حکومت سے یہ مطالبہ کرنا چاہیئے کہ وہ

مانچوکو کی نئی حکومت کو ایک خودمختار ریاست تسلیم کرلے - دوسرا ضروری مسئلہ یہ ہے کہ چین اور جاپان کے درمیان ایک ایسا معاہدہ ہوجانا چاہئے جو چین سے کمیونسٹ تحریک کا خاتمہ کردے - دوسرے مسائل کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ مشرق سے کمیونزم کا بالکل خاتمہ ہوجائے - اس کے بعد اگر نانکنگ کی حکومت کے رویہ سے یہ ظاہر ہو کہ وہ مشرق بعید میں سرخ فوجوں کی قوت دور کرنے کے لئے کچھ نہیں کرنا چاہتی تو پھر جاپان کو مجبوراً چین میں ایک قابل اعتماد (!) حکومت قایم کرنی پڑے گی۔ اور اگر جاپان ایشیا میں کوئی نئی روح نہیں پیدا کرنا چاہتا اور نہ اس میں اس کی اہلیت ہے تو اُسے براعظم سے دست کش ہوجانا چاہئے۔ (ب - ل)



"کیا کرتب دکھائے! پیسہ وصول ہوگیا"

سیاسی بازیگری

تعلیمی دنیا

گورنمنٹ آف انڈیا کے ماہرین تعلیم مسٹر وُڈ اور ایبٹ کی رپورٹ شائع ہوگئی ہے۔ رپورٹ کا بنیادی اصول کتابی تعلیم کی مخالفت اور فنی اور صنعتی تعلیم کی حمایت ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے رپورٹ میں نظام تعلیم کی نئی تشکیل کے لئے سفارشات کی گئی ہیں۔

حکومت تجربی طور پر دہلی اور لاہور میں دو صنعتی ادارے کھولنے کا ارادہ کر رہی ہے۔ دہلی میں تو اس اسکول کے نصاب کا تعلق صنعت پارچہ بافی سے ہوگا جو دہلی کی سب سے بڑی صنعت ہے۔ لاہور میں کوئی بڑی صنعت نہیں اس لئے وہاں کا مدرسہ ریلوے کے محکمہ کے لئے طلبا کی تربیت کا انتظام کرے گا۔ بالخصوص ڈاک و تار اور محکمہ رفاہ عامہ کی تعلیم پر توجہ دی جائے گی۔ اس سلسلے میں محکمہ تعلیم کی طرف سے ان تمام محکمہ جات کا پورا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جائیگی تاکہ طلبا کو تعلیم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملازمت حاصل کرنے میں مناسب سہولتیں بہم پہونچائی جاسکیں۔

مہاتما گاندھی نے اخبار ہریجن میں مسئلہ تعلیم پر اپنے ذاتی خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

"ہر بچے کی تعلیم کسی مفید دستکاری سے شروع ہونا چاہئے تاکہ وہ اپنی تربیت کے آغاز سے ہی اپنے ہاتھ سے چیزیں بنانا شروع کردے۔ اور اگر حکومت مدرسوں کی تیار کردہ اشیاء کو خریدنے کا انتظام کردے تو ہر اسکول مالی لحاظ سے اپنی مدد آپ کر سکیگا۔ طریقۂ تعلیم کے متعلق گاندھی جی کا خیال ہے کہ پہلے تعلیم زبانی ہو اور بعد میں الف بے پڑھائی جائے۔ یہ تجویز بادی النظر میں تو حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے مگر اس سے محنت میں بہت بچت ہوگی۔ اور طالب علم سال بھر میں ہی بہت کچھ سیکھ سکے گا۔ مہاتما جی نے ابتدائی تعلیم پر بہت زور دیا ہے۔ اور نیز اس امر پر توجہ دلائی ہے کہ انگریزی زبان کی تدریس کی اہمیت کم کرنا چاہئے۔ کالج کی تعلیم کا حیات ملی سے گہرا تعلق ہونا چاہئے۔ اور صنعتی و حرفتی اداروں اور ٹکنیکل شعبوں کا کارخانوں سے الحاق ہونا چاہئے۔ مثلاً ٹاٹا کا کارخانہ اک انجینیرنگ کالج اپنی طرف سے جاری کرے۔

کچھ عرصہ ہوا، ڈاکٹر ٹیگور نے ایک ایسی انجمن کے قیام پر زور دیا تھا جو ان اشخاص کے لئے تعلیمی سہولتیں بہم پہونچا سکے جنہیں کبھی دیسی تعلیم کا موقعہ نہیں ملا۔ اس انجمن کے مقاصد میں سے مختلف مضامین پر مفید مطلب کتابوں کی فہرستیں مرتب کرنا، ایسی موضوعات پر کتابیں تیار کرنا جو بازار میں دستیاب ہی نہیں ہوسکتیں، اور مختلف مرکزوں میں ایسے طلبار کے امتحان لینا جنہوں نے اس سلسلے میں تعلیم پائی اور نتائج کے طور پر اسناد عطا کرنا۔ وشوا بھارتی نے اس کام کو اپنے ذمے لے لیا اور بنگال کے لئے ان تجاویز کا خاکہ بھی منظر عام پر آچکا ہے۔

تحریک تعلیم بالغان انگلستان میں ۱۸۹۹ء میں شروع ہوئی اور آج نیشنل ایڈلٹ اسکول یونین کے زیر اہتمام ۱۲۰۰ سے زائد مدرسے اس اہم فرض کو انجام دے رہے ہیں۔ اس ادارے کا تعلق ایک دوسری تحریک سے بھی ہے جس کا مقصد تعلیم بالغان کے اصولوں کا تمام دنیا میں پرچار کرنا ہے۔ اس کی بین الاقوامی کمیٹی کچھ عرصے سے ہندوستان میں مسئلہ تعلیم بالغان پر خاص طور پر توجہ دے رہی ہے۔ اسی سلسلے میں مسٹر ولیم ارسان کی بیوی نے پچھلے موسم سرما میں ہندوستان کا ایک تعلیمی دورہ کیا جس کے دوران میں ان کو ملک کے مختلف حصوں میں تعلیمی اداروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بالخصوص ناگپور میں انھوں نے نیشنل کرسچین کونسل کے مباحثوں میں شرکت کی، مسئلہ تعلیم بالغان کونسل کے اس اجلاس کا خاص موضوع تھا۔ نیشنل یونین کی طرف سے ہندوستان میں تعلیم بالغان کے موضوع پر ایک "ہینڈ بک" تیار کی جارہی ہے جس میں ہندوستانی اور انگریزی ماہرین تعلیم کے مقالات ہونگے۔ ان میں سر رادھا کرشنن اور پروفیسر سیدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نیز انجمن تعلیم بالغان دہلی، شہر میں تعلیم بالغان کا ایک مرکز قائم کرنے کی تجویز پر غور کررہی

ڈاکٹر نیل کنٹھ داس رائے نے اندھوں کی تعلیم کے لئے ہندوستان کی ضروریات کے مطابق بریل سسٹم ایجاد کیا ہے جو تمام ہندوستانی زبانوں کے لئے کام آسکے گا۔ مرکزی مشاورتی بورڈ اس ایجاد میں خاص دلچسپی لے رہا ہے اور صوبائی حکومتوں کی رائے بھی اس کے جاری کرنے کے سلسلے میں دریافت کی جارہی ہے۔

ریاست بڑودہ کی پچھلے سال کی تعلیمی رپورٹ کے مطالعہ سے ریاست میں تعلیمی ترقی کے متعلق بعض دلچسپ باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ جو برطانوی ہند کے ماہرین تعلیم کے لئے بھی قابل توجہ ہیں۔

ریاست میں لازمی ابتدائی تعلیم کی برکت سے پچھلے دس سال کے اندر پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد میں ۵۹ فی صدی کا اضافہ ہوا۔ اس سال ۵۳ دیہاتی کتب خانے اور ۸ عورتوں اور بچوں کے کتب خانے قائم کئے گئے۔ ٹرینڈ اساتذہ کی تعداد بڑھانے کی پالیسی پر شدت سے عمل کیا گیا۔ نیز تمام ممکن وسائل مثلاً ریفریشر کورس تعلیمی رسائل اور پرچوں۔ تنخواہ کے اضافے۔ بونس وغیرہ سے اساتذہ کی لیاقت اور قابلیت کو ترقی دینے کی کوشش کی گئی۔

حکومت مدراس نے تعلیمی اصلاحات کے سلسلے میں ایک اعلان شائع کیا ہے۔ لازمی تعلیم کے متعلق حکومت کا خیال ہے کہ فی الحال جبریہ تعلیم سے زیادہ اہم مسئلہ موجودہ مدارس کی تعلیمی اصلاح ہے۔ انگریزی زبان کی تعلیم کا معیار گھٹا کر ہندوستانی زبانوں کی تعلیم کو زیادہ ترقی دی جائے۔ مڈل اور ہائی اسکولوں کے نصاب میں ضروری تبدیلیاں کی جائیں۔ یونیورسٹی میں داخلے پر پابندیاں عاید کی جائیں۔ اس آخری مقصد کی تکمیل کے لئے حکومت قوانین ملازمت میں ضروری ترمیم کے لئے آمادہ ہے۔

برٹش گی آنا کے ہندوستانی باشندگان نے دوسری ہندوستانی کانفرنس کے موقع پر حکومت سے استدعا کی ہے کہ ان کو پبلک بورڈوں میں مناسب نمائندگی دی جائے۔ جبریہ تعلیم کا قانون زیادہ سختی سے نافذ کیا جائے تاکہ ہندوستانی طبقے میں خواندگان کی تعداد میں معقول اضافہ ہو سکے۔ نیز ٹریننگ کالج میں ہندوستانی طلبا کیلئے زیادہ تعداد میں نشستیں مخصوص کردی جائیں۔

ہوائی کی یونیورسٹی کے ارباب اختیار نے ہندوستانی تہذیب وتمدن کا اک شعبہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کا نام "اورینٹل انسٹیٹیوٹ" ہوگا۔ مسٹر سنکلیر ڈائرکٹر انسٹیٹیوٹ کے قول کے مطابق۔ ہندوستان کی تہذیب اور اس کے ادبی خزائن اہل یونان اور روما کے تمدنی شاہکاروں سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔ اس مقصد کیلئے یونیورسٹی

کی طرف سے ڈاکٹر کالیداس ناگ کلکتہ یونیورسٹی کو ہندوستانی تمدن کے موضوع پر چھ تقاریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ جن میں ہندوستانی ادب۔ آرٹ۔ فن سنگ تراشی مصوری وغیرہ پر بحث کی گئی۔ ڈاکٹر ناگ انسٹیٹیوٹ کی بنیادی تشکیل اور انتظام میں بھی بطور ماہر ادب و فنون ہند مشورہ دے رہے ہیں۔

پروفیسر سر پی سی۔ رے استاذ کیمیا کلکتہ یونیورسٹی پچھلے دنوں بوجہ ضعیف العمری اپنے عہد سبکدوش ہوگئے ہیں۔ پروفیسر موصوف ہندوستان میں علم کیمیا کی تدریس اور تحقیقات کے پہلے علمبردار ہیں۔ نہ صرف انھوں نے سینکڑوں طلبا کو علم کیمیا کی اہمیت سے روشناس کرایا۔ بلکہ ہندوستانی صنعت دوا سازی بھی ان کی کچھ کم مرہون منت نہیں۔ بنگال فارمیسوٹیکل کمپنی کو جاری کرکے انھوں نے ولایتی اور ہندوستانی ادویہ کی صحیح کیمیائی تربیت اور خالص پیداوار کا سنگ بنیاد رکھ دیا۔ نجی زندگی میں پروفیسر موصوف قرن اولے کے اساتذہ کا نمونہ ہیں طبیعت میں انتہائی سادگی ہے۔ انھوں نے اپنی مبیش قرار تنخواہ ہمیشہ طلبا کے وظائف اور امدادی رقوم کے لیے وقف رکھی۔ اور پچھلے دنوں ہی انھوں نے اپنے کمپنی کے سالہا سال کے جمع شدہ منافع کو یونیورسٹی میں کیمیادی تحقیقات کے لئے وقف کردیا۔ آپ نے اعلان کیا ہے کہ وہ درسی کام سے فارغ ہوکر دیہات سدھار پر اپنی توجہ مبذول فرمائیں گے۔ قارئین جامعہ کے لئے یہ امر باعث دلچسپی ہوگا کہ پروفیسر موصوف نے جامعہ ملیہ کے پہلے تقسیم اسناد کے جلسہ میں ایک معرکتہ الآرا صدارتی خطبہ پڑھا تھا۔ اور اس کے بعد بھی ہمیشہ جامعہ کے کام میں گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر شاہ سلیمان چیف جسٹس الہ آباد نے دنیائے سائنس کے سامنے نظریۂ اضافیت کے مقابل ایک نیا نظریہ پیش کیا ہے جو نیوٹن کے اصولوں پر مبنی ہے۔ ان دو متضاد نظریوں کا حتمی فیصلہ ان علمی تجربات اور مشاہدات پر ٹھیرا جو پچھلے اپریل میں سورج کے کمل گرہن پر جاپان میں کئے گئے تھے۔ حکومت ہند نے اس غرض کیلئے ڈاکٹر رایڈ کو ایک علمی وفد کا قائد بنا کر بھیجا تھا ڈاکٹر موصوف نے اپنے مشاہدات کی بنا پر حال ہی میں رائل سوسائٹی لندن میں ایک مقالہ پڑھا ہے۔ جس میں ڈاکٹر سلیمان کی پیشین گوئی کو صحیح اور نظریۂ اضافیت سے حساب کردہ پیش گوئی کو تجربی طور پر غلط ثابت کیا ہے۔ ڈاکٹر سلیمان نے ستاروں کی شعاع کے متعلق جو پیشین گوئی کی ہے۔ اس پر ڈاکٹر میخائیلوف کام کر رہے ہیں اور ان سے نتائج

بھی چند ماہ میں شائع ہو جائیں گے۔

جامعہ ازہر کے مفتی اعظم شیخ المصطفےٰ مراغی نے اعلان کیا ہے کہ وہ عنقریب دنیا بھر کے مسلم علماء کو ایک نمائندہ اجتماع میں شریک ہونے کی دعوت دینگے جو امور ذیل کو بحث ونظر کے بعد قابل تعمیل بنا سکیگا۔ (۱) اسلامی دنیا میں دینی مدارس کے قیام کا مسئلہ۔ (۲) نصاب دینیہ کا تعین اور طریقۂ تعلیم کی اصلاح۔ (۳) تبلیغ اسلام کے اسباب و وسائل وغیرہ۔ شیخ المصطفےٰ المراغی ان چند روشن خیال اور بلند حوصلہ علماء میں سے ہیں جو ہمارے دینی نصاب وطریق تعلیم کی اصلاح کی اہمیت کو پوری طرح سمجھتے ہیں۔ شیخ موصوف نے پچھلے دنوں ہی جامعہ ازہر میں بنیادی اصلاحات جاری فرما کر دنیائے اسلام پر احسان کیا ہے۔ نیز چین۔ جاپان۔ ہندوستان۔ سوڈان وغیرہ میں علماء کے وفود بھیج کر اشاعت اسلام کے سلسلے میں بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ شیخ موصوف کی قیادت میں اجتماع مذکور اپنے نیک مقصد میں کامیاب ہوگا۔

چند مخلص قومی کام کرنے والی خواتین کی کوششوں سے روس کے بعض شہروں میں والدین کے لئے یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ یہ ادارے والدین کے لئے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت اور نگرانی کی راہ پر مشعل ہدایت کا کام کرینگے۔ نصاب کے چند اہم مضامین شادی اور کنبہ۔ بچوں کی تربیت۔ بچے اور تھیٹر۔ بچوں کے فالتو اوقات کا صحیح استعمال وغیرہ ہونگے۔ ان جماعتوں میں مرد اور عورتیں بڑی تعداد میں داخل ہو رہی ہیں۔ بالعموم یہ ادارے کلب گھروں کے قریب کھولے گئے ہیں اور زمانۂ تعلیم سات ماہ سے دس ماہ تک ہے۔

بین الاقوامی پی۔ ای۔ این کانگریس کا پندرھواں اجلاس پیرس میں منعقد ہوا جس میں آزادیٔ تحریر کے موضوع پر بہت سی ضروری تجاویز متفقہ طور پر منظور کی گئیں۔ ایچ جی ولز کانگریس کے پرانے صدر نے ایک پیغام بھیجا جس میں آزادیٔ تحریر و تقریر پر بندشوں اور سختیوں کی شدید مذمت تھی۔

ایک تجویز میں حکومت جرمنی کی ان پابندیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی گئی جو مقررین اور مصنفین پر عائد کر دی گئیں ہیں بالخصوص حکومت کے اس اقدام پر سخت نکتہ چینی کی گئی کہ حکومت نے کارل فان اوزٹیسکی کو جنہیں

نوبل پرائز ملا تھا اوسلو جانے سے روکا۔ نوبل پرائز کی شرائط میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انعام پانے والے اصحاب کو اوسلو میں ایک کمیٹی کے سامنے حاضر ہونا پڑتا ہے۔ اور اپنے خاص مضمون پر اک تقریر بھی کرنا ہوتی ہے۔

ایک تجویز میں اسپین کی موجودہ حالت پر اظہار افسوس کیا گیا، اور غرناطہ میں مشہور اسپینی شاعر گارسیا لورکا کے قتل کی سخت مذمت کی گئی۔ کیونکہ متوفی نے اسپین کی سیاسی جنگ میں کسی گروہ کی بھی طرفداری نہ کی تھی۔ ایک بہت اہم تجویز میں ان پابندیوں کی شدید مذمت کی گئی جو بعض یورپی ممالک میں اقلیتوں کے تمدن اور تہذیب پر عاید کی گئی ہیں۔

اس کانگریس میں کال کاپک (چکوسلوویکیا)۔ جیمز جائس (آئرلینڈ)۔ ڈاکٹر امیہ چیٹرجی (ہندوستان)۔ جے۔ بی پریسٹلے (انگلستان) وغیرہم نے شرکت کی۔

ورلڈ فیڈریشن آف ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کا ساتواں اجلاس ٹوکیو امپیریل یونیورسٹی میں منعقد کیا جا رہا ہے۔ مضامین زیر بحث میں سے چند عنوان تعلیمی آزادی، ریڈیو کے ذریعہ السنۂ جدید کی تدریس، ریڈیو کی نفسیات تعلیمی صنعت و حرفت، ریڈیو کے ذریعہ ورزش، گھر اور مدرسہ کا اتحاد عمل، تعلیم کے ذریعہ بین الاقوامی یکجہتی اور مفاہمت تعلیم اخلاق، دیہاتی تعلیم وغیرہ ہیں۔ مقررین میں سے خاص سربرآوردہ اصحاب سر حسن سہروردی نائب صدر میڈیکل کونسل ہند، پروفسیر پال منرو، ٹیچرز کالج کولمبیا، ڈاکٹر سٹیفن ڈگن ڈائرکٹر انسٹیٹیوٹ آف انٹرنیشنل ایجوکیشن ہیں۔

اس سلسلے میں جاپان کے فوجی آرٹ کی نمائش کا انتظام کیا گیا ہے۔ جس کا انصرام واسیدا (Waseda University) اور ٹوکیو امپیریل میوزیم کے ہاتھ میں ہے۔ پھولوں کی نمائش ان اساتذہ کے ہاتھ میں ہے جو پرانے سجاوٹ اور ترتیب کے اصولوں کے ماہر ہیں۔ نمائش میں اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ نہ صرف پھولوں کی زیبائش کے پرانے اصولوں کا مظاہرہ ہو بلکہ مہمانوں کو ان مختلف طریقوں سے بھی آگاہ کیا جائے جن سے یہی اصول نئے گھروں کی زیب و زینت کے لئے کارآمد اور مفید ثابت ہو سکتے ہوں۔

ہر صبح کانفرنس میں بچوں اور نوجوانوں کی تعلیم کے متعلق فلمیں دکھائی گئیں۔ کانفرنس کی طرف سے مہمانوں کی واقفیت اور تفریح کے لئے تاریخی اور علمی سیروں کا انتظام کیا گیا۔

پچھلے دنوں انگلستان کے چند علمی حلقوں کی طرف سے تجویز پیش کی گئی تھی کہ لندن میں ہندوستانی آرٹ کی نمایش کی جائے۔ امید ہے کہ یہ تجویز اگلے موسم سرما تک عمل میں آ جائے گی۔ اس سے پہلے لندن میں چینی اور ایرانی آرٹ کی نمائشیں ہو چکی ہیں جو ہر طرح کامیاب رہیں۔ ہندوستان میں بھی فن سنگ تراشی، مصوری اور دیگر فنون لطیفہ کے نادر شاہکار موجود ہیں۔ خاص لندن میں بھی برٹش میوزیم، البرٹ میوزیم اور انڈیا آفس میں ہندوستانی آرٹ اور صنعت کے بہترین نمونے موجود ہیں۔

اوکسفورڈ یونیورسٹی نے سر عبدالرحیم صدر اسمبلی، سر تیج بہادر سپرو اور سر اکبر حیدری کو ڈاکٹر آف سول لا کی اعزازی ڈگری دی ہے۔

بقائے صحت کیلئے ایک اچھی دوا

OKASA اوکاسا

دماغی کام کرنے والوں کیلئے ایک بہترین چیز ہے

اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے

اوکاسا کے استعمال سے جھریاں اور سفید بال نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں

اوکاسا کے استعمال سے اضمحلال، چڑچڑاپن، نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں۔

اس سے پہلے کہ

بحالی قوت رفتہ کا وقت گذر جائے اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجئے

۱۰۰ ٹکیوں کا بکس دس روپے عہ — آزمائش کے لئے ۲۰ ٹکیاں چار روپے للعہ

اوکاسا کے استعمال سے مکمل فائدہ حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نئی اور تازہ اوکاسا کی ٹکیاں استعمال کی جائیں۔ اس کی شناخت یہی ہے کہ تازہ اوکاسا کے ڈبے پر ایک سرخ فیتہ ہوتا ہے

اوکاسا ہر دوا فروش سے مل سکتی ہے یا ذیل کے پتے سے بھی منگا سکتے ہیں:۔

اوکاسا کمپنی برلن انڈیا لمیٹڈ، نمبر ۱۲ ریمپرٹ رو پوسٹ بکس نمبر ۴۹۶ بمبئی

پیامِ تعلیم

فارغ ہوکر ظاہر ہے کہ تھوڑا وقت تم ورزش اور کھیل کود میں صرف کرتے ہوگے۔ مگر اس کے بعد کیا کرتے ہو؟ ہم تمھیں بہترین مشغلہ بتائیں! پیامِ تعلیم پڑھا کرو۔ یہ رسالہ محض تمھاری خاطر تو جاری کیا گیا ہے۔ اس میں تمھاری دلچسپی کی ہر چیز ہوتی ہے۔ اچھے اچھے اور مزے دار قصّے، کہانیاں، مفید اور دلچسپ معلومات، لطیفے، مفید مشغلے، لیتھو اور بلاک کی اچھی اچھی تصویریں وغیرہ وغیرہ۔ غرض اس کے پڑھنے کے بعد تمھیں کوئی دوسرا مشغلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی، پچھلے سال سے ضمیموں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ ان ضمیموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ایک انجمن بھی پیام برادری کے نام سے کھولی گئی ہے۔ اس انجمن کے ذریعے تمھارے لئے نئے نئے دوست فراہم کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے۔ کہ مفید مشغلوں میں تم ایک دوسرے کی مدد کرو۔ تمھاری خاطر ہم نے اس کی قیمت بھی بہت کم رکھی ہے۔

صرف **دو روپے آٹھ آنے (عہ/)** سالانہ

پیامِ تعلیم کا سال نامہ بھی اسی چندے میں ملتا ہے۔ اس کی قیمت خریداروں سے علیحدہ نہیں لی جاتی۔ یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ہمارے سال نامہ سے بڑھ کر بچوں کے کسی پرچے نے سال نامہ شائع نہیں کیا۔ اس سال بھی یہ سال نامہ بہت اہتمام سے شائع ہو رہا ہے۔ صرف سال نامے کی قیمت بارہ آنے (۱۲/)

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

شعلۂ طور

از

جگر مرادآبادی

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری

جو فارسی میں

امیر خسروؔ کے کلام کی مخصوص صفت ہے

اردو میں

جگر مرادآبادی کے حصہ میں آئی ہے

شعلۂ طور

جگر کے کلام کا مکمل مجموعہ ہے

قیمت ـــــے ؍

مکتبہ جامعہ دہلی

Printed at Mahbub-ul-Mataba, Delhi.

آئینے کے سامنے

مکتبہ جامعہ دہلی

مضامین رشید

از

پروفیسر رشید احمد صدیقی

پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اردو کے منتخب لکھنے والوں میں ہیں۔ خصوصاً ان کی مزاحیہ نگاری ملک کے ہر طبقے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ان کے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شائع کیا ہے۔ یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشتِ زعفران، تروتازہ شاداب اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت دو روپے (عہ)

مکتبہ جامعہ، دہلی

بالله

جامعہ

زیر ادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے، پی ایچ ڈی

جلد ۲۸	اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

۱	صوبہ بہار میں اردو کانفرنس	پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن)	۸۰۹
۲	مسلمان، مسلم لیگ اور کانفرنس	جناب حسن ریاض صاحب	۸۲۱
۳	انگلستان تک	محمد احمد صاحب سبزواری، بی اے عثمانیہ	۸۳۷
۴	ساحل گنگا کے تاثرات	محمد یحییٰ صاحب اعظم گڈھ	۸۵۲
۵	دنیا کی تجارت میں مشرق کا مقابلہ۔	برکت علی صاحب بی اے (جامعہ)	۸۵۳
۶	حدیث عشق	حضرت نشتر سندیلوی	۸۶۶
۷	رفتار عالم۔	چین و جاپان۔ روس اور چین کا معاہدہ۔ بحر روم اور نیون کانفرنس، عراق، مصر، افغانستان صوبجاتی اسمبلیوں کی زبان۔	۸۶۷
۸	تعلیمی دنیا	محمد عبدالغفور صاحب ایم اے (علیگ)	۸۸۳

قیمت سالانہ پانچ روپے (صہ) فی پرچہ آٹھ آنے (۸)

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی

پیام تعلیم

اپنے مدرسے سے فارغ ہوکر ظاہر ہے کہ تھوڑا وقت تم ورزش اور کھیل کود میں صرف کرتے ہوگے ۔ مگر اس کے بعد کیا کرتے ہو ؟ ہم تمھیں بہترین مشغلہ بتائیں! پیام تعلیم پڑھا کرو۔ یہ رسالہ محض تمھاری خاطر جاری کیا گیا ہے ۔ اس میں تمھاری دلچسپی کی ہر چیز ہوتی ہے ۔ اچھے اچھے اور مزے دار قصّے ، کہانیاں مفید اور دلچسپ معلومات لطیفے ، مفید مشغلے ، لیتھو اور بلاک کی اچھی اچھی تصویریں ۔ وغیرہ وغیرہ ۔ غرض اسے پڑھنے کے بعد تمھیں کوئی دوسرا مشغلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہ ہوگی ۔ پچھلے سال سے ضمیموں کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے ۔ ان ضمیموں کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے ۔ ایک انجمن بھی پیام برادری کے نام سے کھولی گئی ہے ۔ اس انجمن کے ذریعے تمھارے لئے نئے نئے دوست فراہم کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے کہ مفید مشغلوں میں تم ایک دوسرے کی مدد کرو ۔ تمھاری خاطر ہم نے اس کی قیمت بھی بہت کم رکھی ہے ۔ صرف

دو روپے آٹھ آنے (عـہ) سالانہ

پیام تعلیم کا سال نامہ بھی اسی چندے میں ملتا ہے ۔ اس کی قیمت خریداروں سے علیحدہ نہیں لی جاتی یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ہمارے سال نامے سے بڑھ کر بچوں کے کسی پرچے نے سال نامہ شائع نہیں کیا ۔

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

بہار میں اردو کانفرنس

۲۸ اور ۲۹ اگست کو پٹنہ میں ایک کانفرنس ہوئی تھی، اس کی روداد پچھلی اشاعت میں شائع نہیں کی جا سکی اس لئے کہ رسالہ چھاپے خانے بھیجا جا چکا تھا۔ لیکن کانفرنس کی نوعیت ایسی تھی کہ اس کی کارگذاری اور بحثوں کو اب بھی شائع کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کانفرنس کے اکثر ڈیلیگیٹ ادبی دنیا میں بڑی حیثیت رکھتے ہیں، اور مختلف موقعوں پر جو خیالات ظاہر کئے گئے اور جو فیصلے ہوئے وہ مثال کا کام دے سکتے ہیں۔ کانفرنس انجمن ترقی اردو صوبہ بہار کے سکرٹری قاضی عبدالودود صاحب، بی اے (کینٹیب) کے اصرار پر منعقد کی گئی تھی۔ ان کو یہاں اختصار کے لئے سکرٹری صاحب انجمن کہا جائے گا۔ مولوی عبدالحق صاحب، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی، پنڈت برج موہن دتاتریا صاحب کیفی، مولانا ظفرالملک صاحب، پروفیسر غلام السیدین صاحب، پروفیسر رشید احمد صاحب، آل احمد سرور صاحب نے اپنی موجودگی سے کانفرنس کو زینت بخشی۔ میں جناب شیخ الجامعہ صاحب کے ارشاد پر جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا کہ میرے نام بھی دعوت نامہ آ گیا۔ غرض کہ میں بھی موجود تھا۔ یہ نہیں معلوم کہ کل کتنے لوگ بلائے گئے تھے۔ بہرحال معذرت کے تار نہیں سنائے گئے اور سکرٹری صاحب انجمن کے چہرے سے اطمینان ظاہر ہوتا تھا۔

۲۸ کی صبح کو ہم سب سکرٹری صاحب کے دولت خانے پر جمع ہوئے۔ بعض لوگوں کو ٹھیک ٹھیک معلوم نہ تھا کہ کہاں جانا چاہئے، اس لئے کہ انھیں کوئی اطلاع نہیں دی گئی تھی، لیکن بھٹکتے بھٹکتے وہ بھی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ جب یہ طے ہو گیا کہ کوئی مہمان باقی نہیں ہے، تو مولانا سید سلیمان صاحب سے صدارت کی درخواست کی گئی، اور انھوں نے سکرٹری صاحب سے کہا کہ انجمن کو بتائیں کہ کیا کرنا ہے اور کس ترتیب سے۔ کانفرنس کا کوئی ایجنڈا تیار نہ تھا، سکرٹری صاحب نے وہ رسالہ

پڑھنا شروع کیا جو تمام ڈیلیگیٹوں کے پاس بھیجا جا چکا تھا اور ان مختلف مسائل کی توضیح کرنے لگے جن کا اس میں ذکر تھا اور توضیح بھی کی جا چکی تھی۔ معلوم ہوا کہ دو اہم مسئلے ہیں جن پر کانفرنس کو رائے دینا ہے، ایک تو عدالت کی زبان، اور دوسرے تعلیم کی زبان۔ کچھ دیر اس قسم کی باتیں سننے کے بعد سب اس پر متفق ہو گئے کہ عدالت کی زبان صوبجاتی مسئلہ ہے؛ اس پر کانفرنس کا رائے دینا مصلحت کے خلاف ہوگا۔ پھر تعلیمی زبان کا مسئلہ چھڑا، سکرٹری صاحب نے وہ تجویز سنائی جو پٹنہ یونیورسٹی کے سینیٹ میں بابو بلدیو سہائے صاحب نے پیش کی تھی، کہ ہندستانی کو، جو صوبے میں عام طور پر بولی جاتی ہے، ذریعۂ تعلیم بنانا چاہیئے۔ اس تجویز کے پیش ہونے کے تھوڑے دن بعد بہار کی انجمن ترقی اُردو کا ایک جلسہ ہوا تھا جس میں سکرٹری صاحب کی رائے جو ہندستانی کے متعلق تجویز سینیٹ میں نہایت عجلت کے ساتھ پیش کر دی گئی تھی منظور ہوئی اور ایک ریزولیوشن پاس کیا گیا جس کا آخری حصہ یہ ہے:۔

"سینیٹ کی تجویز میں علمی مضامین کے لئے میٹرکولیشن تک انگریزی کی جگہ ہندستانی ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی ہے لیکن ہندستانی کی جو تعریف کی گئی ہے وہ بالکل ناکافی اور مبہم ہے۔ حامیان اُردو اسے تسلیم نہیں کرتے، اور انھیں بے حد اندیشہ ہے کہ ہندستانی کے نام سے ہندی ذریعۂ تعلیم نہ بنادی جائے۔ اس جلسے کی خواہش ہے کہ حامیان اُردو کے ایک وفد کو اس کا موقع دیا جائے کہ اس مسئلے کے متعلق اپنے خیالات حکومت کے سامنے پیش کرے اور اس کے بعد ذریعۂ تعلیم کے مسئلے کا فیصلہ کیا جائے۔"

اسی سلسلے کا ایک اور ریزولیوشن یہ بھی تھا:۔

"چونکہ اُردو کا مسئلہ سارے ہندستان کا مسئلہ ہے اور زبان میں انقلاب انگیز تغیر اہل ادب و انشا کے غور و خوض کے بغیر نہایت خطرناک ہے، یہ جلسہ تجویز کرتا ہے کہ حکومت بہار ہندستانی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کے متعلق دمرکزی، انجمن ترقی اُردو سے دریافت کرے کہ وہ موجودہ زبان میں کس حد تک تغیر کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہے۔ کوئی فیصلہ جو اس انجمن کو، جو اُردو بولنے والوں کی واحد

مسلہ انجمن ہے، منظور نہیں، بہار کے حامیان اُردو کو منظور نہ ہوگا۔۔۔"

بہار کی انجمن کو خاص فکر اس کی تھی کہ (۱) سائنس کی اصطلاحات کس زبان سے لی جائیں گی (۲) ان اصطلاحات سائنس کا کیا حشر ہوگا جو روزمرہ کی زبان میں داخل ہو چکی ہیں' (۳) الفاظ کے داخل کرنے یا خارج کرنے کا کیا معیار ہوگا ' (۴) ان الفاظ اور محاورات کے متعلق کیا عمل کیا جائے گا جو اُردو میں رائج اور مستند ہیں، ہندی میں نہیں' یا ہندی میں رائج اور مستند ہیں اور اُردو میں نہیں' (۵) اُردو ہندی کے صرف و نحو میں جہاں اختلاف پایا جاتا ہے وہاں کسے ترجیح دی جائے گی' اور (۶) ہندستانی کے بنیادی قواعد کون سی جماعت وضع کرے گی۔ چنانچہ اسی جلسے میں جہاں مندرجہ بالا ریزولیوشن پاس کئے گئے اس کا بھی اعلان کیا گیا کہ " یہ جلسہ گورنمنٹ کو آگاہ کرتا ہے کہ اگر متذکرہ بالا انجمنوں کے مشورے کے بغیر اُردو زبان میں کچھ تغیرات کئے گئے تو وہ بہار کے اُردو داں طبقے کے لئے ناقابل قبول ہوں گے۔"

سکرٹری صاحب نے یہی ریزولیوشن سنائے اور اپنے اندیشے بیان کئے۔ اگرچہ انھوں نے خیالات کی ترتیب اور طرح دی تھی۔ کانفرنس کے بعض ڈیلیگیٹ بے صبر ہو گئے اور ایک نے سلسلۂ گفتگو کو توڑ کر مولوی عبدالحق صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ ایسی بحث تو کبھی ختم نہیں ہوتی، دو بجے راجندر بابو سے ملاقات کرنا ہے۔ اور اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ ادھر اُدھر کی باتیں کر کے رخصت ہو جائیں تو اپنے خیالات کو اور اگر کوئی مطالبے ہوں تو انھیں ترتیب دے دینا چاہئے۔ یہ تجویز سب کو پسند آئی، لیکن چونکہ سکرٹری صاحب ابھی کھڑے تھے، اس لئے ان سے درخواست کی گئی کہ اصولی بحث کو چھوڑ کر وہ بتائیں کہ انھیں شکایت کس بات کی ہے اور وہ کیسی اصلاح چاہتے ہیں۔ سکرٹری صاحب نے فرمایا کہ ٹکسٹ بک کمیٹی نے جتنی کتابیں مشترک زبان یعنی ہندستانی میں منظور کی ہیں وہ بلا استثنا بہت ہی خراب زبان میں لکھی گئی ہیں۔ بکثرت الفاظ اور محاورے ایسے ہیں جو اُردو کی کسی لغت میں نہیں ملتے۔ عام زبان کی جگہ عموماً گنواری زبان استعمال کی گئی ہے۔ نظم کے نام سے جو چیزیں ہیں ان میں قواعد عروض کا مطلق خیال نہیں کیا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی

فرمایا کہ ٹکسٹ بک کمیٹی میں ایسے لوگ کم ہیں جو غلط اور صحیح اُردو میں تمیز کر سکیں یا کتابوں کے مطالعے میں اپنا وقت صرف کر سکیں، اور اگر لوگوں کا رونا اور کتابوں کی زبان یہی رہی تو اردو کا خاتمہ سمجھنا چاہئے ٹکسٹ بک کمیٹی کی شکایتیں کرتے کرتے سکرٹری صاحب نے کہا کہ میں بھی اس کمیٹی میں تھا، لیکن میں نے دیکھا کہ لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے ہیں اور جب میں کوئی اعتراض کرتا ہوں تو وہ اسے تسلیم کر کے کہتے ہیں کہ ہاں بھائی تم ٹھیک کہتے ہو، ہم تو کچھ کر نہیں سکتے، لیکن تم جس طرح کی ترمیم پیش کرو ہم منظور کر لیں گے اور جس کتاب کو تم ناقص پاؤ اُسے ہم خارج کر دیں گے۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں تمام کتابوں کو دیکھتا، اور چونکہ اور کسی کو اس کام سے ذرا بھی دلچسپی نہ تھی اس لئے میں نے استعفار دیدیا۔ یہ کیفیت سن کر کانفرنس کے کان کھڑے ہوئے اور مولانا ظفر الملک صاحب نے کہہ بھی دیا کہ قاضی صاحب آپ نے بڑی سخت غلطی کی، مگر استعفار تو کب کا منظور کیا جا چکا تھا اور کانفرنس کو بیٹھ کر سنتے رہنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ پھر کسی نے ان کتابوں کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی جن کی زبان کا رونا رویا گیا تھا۔ سکرٹری صاحب کو شاید توقع نہ تھی کہ کانفرنس والے ایسی کھوج کریں گے اور ان کے یہاں کتابیں تھیں بھی نہیں۔ ایک صاحب بھیجے گئے تو وہ ساٹھ کتابوں میں سے کل چار عدد ڈھونڈھ کر لا سکے، اور باقی کے متعلق وعدہ کیا کہ تلاش کر کے لا دیں گے۔ ان چار کتابوں کو سب نے الٹ پلٹ کر اور ادھر ادھر سے پڑھ کر دیکھا۔ سیدھی سادی سلجھی ہوئی زبان تھی، "لڑکو" کے ساتھ قوسین میں "بالکو" تھا تو "محبت"، "نفرت"، "عداوت" جیسے لفظ بھی بغیر ہندی کے ہم معنی الفاظ کے لکھے ہوئے تھے۔ نظمیں میر اور غالب کے کلام کی ہم پلہ نہ تھیں تو دیہاتی بچوں کے لئے خاصی اچھی اور موزوں تھیں اور ان میں عروض کے خون کے بھی ایک ہی دو ننھے ننھے بوند دکھائی پڑے۔ تب کسی نے کہا کہ قاضی صاحب، ہمیں تو ان کتابوں کی زبان میں کوئی خاص عیب نظر نہیں آتا، اب آپ کوئی مثال دیجئے تو ہم شاید اپنی رائے بدلیں۔ سکرٹری صاحب نے ایک کتاب اٹھائی اور اُسے پڑھنا شروع کیا۔ صفحہ ڈیڑھ صفحہ پڑھ گئے اور کوئی غلطی ایسی نہ ملی جو کانفرنس کے سامنے جتائی جاتی۔ پھر انھوں نے ایک نظم شروع کی، اور پہلے مصرع کو کہا کہ دیکھئے بالکل ناموزوں ہے۔ مگر اسے بھی پروفیسر غلام السیدین صاحب

نے ایک لفظ کا تلفظ صحیح کرکے پڑھا تو وہ موزوں نکلا۔ سکرٹری صاحب نے کتاب رکھ دی اور کہا کہ اصل میں ہم کو دیکھنا یہ ہے کہ معیارِ فصاحت کیا ہے۔ اس پر ایک صاحب بڑبڑانے لگے اور سید ین صاحب نے فرمایا کہ میری رائے میں یہ کتابیں ان کتابوں سے ہرگز بدتر نہیں ہیں جو یوپی میں مشترک زبان کی ریڈریں کہلاتی ہیں۔ اور ہاں یوپی میں بڑی کوشش کرنے کے بعد یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ نظم کا حصہ مشترک نہیں ہوسکتا، کیونکہ ہندی اُردو کے قواعد عروض میں بڑا اختلاف ہے۔ اس لئے ہمیں بہار کی ریڈروں کے اس حصے پر سخت تنقیدی نظر نہ ڈالنا چاہئے۔ معیارِ فصاحت کی بحث اپنی جگہ پر ٹھیک ہے، لیکن ایسی کتابوں میں جو زیادہ تر دیہاتی بچوں کے لئے لکھی گئی ہوں اس معیار کا لحاظ نہیں کیا جاسکتا۔ انھیں تو بول چال کی زبان کے قریب تر لانے کی فکر کرنا کہیں زیادہ ضروری ہے۔

اس موقع پر وہی حضرت جنھوں نے پہلے کہا تھا کہ راجندر بابو سے گفتگو کرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے پھر بول اُٹھے کہ اس کے متعلق کچھ نہیں طے ہوا۔ اب کانفرنس متفقہ طور پر راضی تھی کہ خیالات کو ترتیب دیا جائے، اور جناب صدر نے یہ تجویز کیا کہ کانفرنس ہندستانی زبان کی ایسی تعریف کرے جو سب کو منظور ہو، اور پھر اس تعریف کے لحاظ سے دیکھا جائے کہ کیا تجویز کیا جاسکتا ہے۔ پنڈت کیفی صاحب نے ہندستانی کی تعریف کی، اور کسی قدر بحث کے بعد کانفرنس نے قریب قریب کامل اتفاق رائے سے طے کیا کہ "ہندستانی سے مراد اس ملک کی وہ زبان ہے جو اس ملک کی ہندو مسلمان قوموں کے میل ملاپ سے بنی ہے اور جس کو شمالی ہندوستان کے باشندے عام طور سے بولتے ہیں اور ہندستان کے دوسرے رہنے والے عام طور سے سمجھتے ہیں اور جو عربی، فارسی اور سنسکرت کے نامانوس الفاظ سے خالی ہو اور اُردو اور دیوناگری رسم خط میں لکھی جائے۔" زبان کی اس طرح تعریف کرنے کے بعد پھر باقی باتوں کا جلد جلد فیصلہ ہوگیا۔ ہم انھیں ترتیب وار دیتے ہیں:-

(۱) ابتدائی چار جماعتوں کی کتابیں ایسی عام اور آسان ہندستانی زبان میں لکھی جائیں جو اُردو اور ہندی رسم خط کے اختلاف کے علاوہ یکساں طور سے اُردو اور ہندی بولنے والوں کی سمجھ میں آسکیں۔

(۲) ایسی کتابوں کے انتخاب اور منظوری میں جو طریق عمل اس وقت جاری ہے وہ قابل اطمینان نہیں ہے۔ حصہ نثر میں کم اور نظم میں زیادہ اس قسم کی بے عنوانیاں ہیں جن کی اصلاح ہونا ضروری ہے۔ تفصیلات سے قطع نظر اس اصول کو سامنے رکھنا لازم ہے کہ ہندی اور اُردو کے طلبار کی ذہنیت اور مذاق پر ایسا اثر نہ پڑے جو آگے چل کر ان کے ادبی مذاق کی ترقی میں حائل ہو۔ یہاں یہ ذکر بھی ضروری ہے کہ ایسی کتابوں کا حصۂ نظم لازمی طور پر مشترک نہ ہو۔

(۳) ثانوی جماعتوں میں اُردو پڑھنے والوں کو ہندی اور ہندی پڑھنے والوں کو اُردو سیکھنا لازمی ہوگا، جیسا کہ صوبۂ متحدہ میں ہوتا ہے۔

(۴) ابتدائی جماعتوں میں علوم کا ذریعۂ تعلیم ہندستانی ہوگی۔ علمی اصطلاحیں کوشش ہو کہ ہندستانی سے بنائی جائیں، اور جو رائج ہیں وہ برتی جائیں، اور جو موجود نہ ہوں ان کے لئے ہندی اُردو کی عام فہم اصطلاحوں کو ایک ساتھ استعمال کیا جائے۔

(۵) ثانوی جماعتوں میں ادبی ریڈریں علیحدہ ہوں۔ ذریعۂ تعلیم ہندستانی ہو، بشرائط بالا۔

(۶) قواعد زبان، اصطلاحات اور لغات کے لئے انجمن ترقی اُردو اور ہندی کی کسی نمائندہ جماعت سے مساوی تعداد میں لوگ لئے جائیں جو ان باتوں کا فیصلہ کریں۔ اختلاف کی صورت میں اُردو سب کمیٹی کی رائے اُردو رسم خط کی کتابوں کے لئے اور ہندی سب کمیٹی کی رائے ہندی رسم خط کی کتابوں کے لئے فیصلہ کن سمجھی جائے۔

یہ سب طے کرنے کے بعد کانفرنس نے شرف الدین حسن صاحب رئیس باڑھ کے یہاں دعوت کھائی اور پھر سب لوگ سکرٹری صاحب کے مکان پر راجندر بابو اور بلدیو سہائے صاحب سے ملاقات کے لئے پہنچے۔ راجندر بابو یا کانفرنس والوں کو وقت بتانے میں کوئی غلطی ہوگئی تھی، ہم لوگ جب پہنچے تو راجندر بابو انتظار کر رہے تھے۔ کانفرنس کے بعض لوگوں کو ڈر تھا کہ کہیں یہ ملاقات ہندی اتھوا ہندستانی کے چھیڑے ہوئے جذبات کو برانگیختہ نہ کرے، لیکن یہ اندیشہ بالکل بے بنیاد ثابت ہوا۔ سب راجندر بابو سے بڑے تپاک کے ساتھ ملے، اِدھر اُدھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ

بلدیو سہائے صاحب، جو اس وقت کانگریسی حکومت کے سرکاری وکیل ہیں اور جنھوں نے یونیورسٹی سینٹ میں ہندستانی کے متعلق ریزولیوشن پیش کیا تھا تشریف لائے۔ انھیں جلدی تھی اور ان کی درخواست پر راجندر بابو اور کانفرنس والے اس پر راضی ہو گئے کہ پہلے ان سے گفتگو کر لی جائے۔ ان کا انداز اس شریف آدمی کا سا تھا جس پر بیجا الزام لگائے گئے ہوں۔ انھوں نے یہ انداز کیوں اختیار کیا تھا یہ کانفرنس کو معلوم نہ ہو سکا، ہم نے تو بس یہ دیکھا کہ سکرٹری صاحب اپنی کرسی گھسیٹ کر بلدیو سہائے صاحب کے سامنے لے آئے، اور ہمیں ان کے لہجے میں کچھ تیزی محسوس ہوئی، مگر شاید یہ وہ گرمی تھی جو کسی کل کے دیر تک چلتے رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ کانفرنس والے تو بس ہوں ہاں کرتے رہے، اس لئے کہ دوران گفتگو میں جو انکشافات ہوئے انھوں نے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی۔

(۱) کانفرنس نے 'ہندستانی' کی ایسی تعریف کر لی تھی جو معیار کا کام دے سکتی تھی، اور چونکہ سکرٹری صاحب نے فرمایا تھا کہ 'ہندستانی' کی جو تعریف سینٹ میں کی گئی تھی وہ "بالکل ناکافی اور مبہم ہے" اور اس کی وجہ سے "بیجا اندیشہ ہے کہ ہندستانی کے نام سے ہندی ذریعۂ تعلیم نہ بنادی جائے" اس لئے کانفرنس بلدیو سہائے صاحب کی تعریف کو اپنی کسوٹی پر جانچنے کے لئے تیار تھی۔ لیکن بلدیو سہائے صاحب نے بسم اللہ اس سے کی کہ میں زباں داں ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا، میں اور میرے خیال کے لوگ بس یہ چاہتے ہیں کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم نہ رہے۔ ہندی کیا ہے اور ہندستانی کیا یہ آپ لوگ جانئے، ہم نے سینٹ کے ریزولیوشن میں تو عام بول کی زبان کو تعلیمی زبان بنانے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔ ان کے پاس اس کارروائی کی روئداد موجود تھی، انھوں نے ہم کو ریزولیوشن پڑھ کر سنایا۔ اس پر واقعی اعتراض نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سکرٹری صاحب نے بھی وہ ریزولیوشن پڑھا تھا اور اس کا ترجمہ بھی ٹھیک کیا تھا، لیکن ترجمہ کرنے کے بعد انھوں نے سمجھ لیا کہ اصل انگریزی عبارت کا مطلب عام بول چال کی زبان نہیں عوام کے بول چال کی زبان ہے، اور اسی بنا پر انھوں نے ہم سے شکایت کی تھی کہ یہاں کے لوگ عوام کی بول چال کو ہندستانی کا نام دے

رہے ہیں، حالانکہ یہاں عوام کی کوئی ایک بولی نہیں، بلکہ اکثر ضلعوں میں ہر گانو کی الگ بولی ہے جسے پڑوس کے دوسرے دیہاتی بھی نہیں سمجھتے۔ بلدیو سہائے صاحب نے سینٹ کا ریزولیشن دو بارہ پڑھ کر سنایا۔ ہم سر ہلا کر چپ ہو گئے۔ کوئی کہتا تو کیا کہتا؟

(۲) اس کے بعد بلدیو سہائے صاحب نے فرمایا کہ ہمارے یہاں اُردو ہندی کا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ میں نے حفیظ صاحب کے ساتھ دورہ کر کے دیکھا کہ اکثر اسکولوں میں ایک ہی استاد اُردو ہندی بولنے والوں کو ساتھ ساتھ پڑھاتا ہے، اُردو والے اُردو کی کتاب، ہندی والے ہندی کی سامنے رکھ کر پڑھتے ہیں، اور سبق اور استاد کی باتیں سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ یہ واقعہ بیان کر کے سمجھئے بلدیو سہائے صاحب نے کانفرنس کے سر پہ دو پتھر مارا۔ ہمارے پاس طریق تعلیم کے بارے میں کوئی معلومات نہ تھی اور ہمیں کچھ بتایا بھی نہیں گیا، سکرٹری صاحب خود اس حقیقت سے واقف نہیں تھے یا انھوں نے ایسی ذرا سی بات کا ذکر کرنا بالکل فضول سمجھا ....

حفیظ صاحب، جو ایک سر برآوردہ وکیل اور موجودہ اسمبلی کے رکن ہیں آ نہیں سکے تھے یا بلائے نہیں گئے تھے، اس لئے بلدیو سہائے صاحب کے بیان کی تائید یا تردید نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہم پھر چپ ہو گئے۔

(۳) اس کے علاوہ ہمیں معلوم ہوا کہ ٹریننگ کالج میں داخلے کے جو امیدوار ہوتے ہیں ان میں ایسوں کو ترجیح دی جاتی ہے جو ہندی اُردو دونوں جانتے ہوں، اور ٹریننگ اسکولوں میں دونوں زبانیں پڑھائی جاتی ہیں۔ استادوں کے تقرر میں یہ لحاظ ان لوگوں کا مانا جاتا ہے جو ان دونوں زبانوں کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ یہ سب باتیں بھی سکرٹری صاحب کو معلوم نہ تھیں یا انھوں نے ہم کو بتائیں نہیں۔ بلدیو سہائے صاحب جب رخصت ہوئے تو کانفرنس والوں کو بھی بستر باندھ کر اپنے اپنے گھر چل دینا چاہئے تھا، یا اتنے دنوں ٹھہرنے کا ارادہ کر لینا چاہئے تھا کہ سکرٹری صاحب غور و فکر کے لئے ضروری مواد فراہم کر دیں۔ بلدیو سہائے صاحب جاتے جاتے یہ بھی فرما گئے کہ سینٹ کے فیصلے کے بعد اب آپ لوگوں کا کام ہے کہ ہماری ہدایت کریں۔ میں تو قاضی صاحب سے پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور اب بھی کرتا ہوں کہ ہماری مدد اور ہماری کوششوں کی اصلاح کریں۔ اُردو ہندی کے معاملے میں فیصلہ کرنا درکنار ہمیں تو

اپنے آپ کو کوئی رائے رکھنے کا اہل نہیں سمجھتا۔ آپ لوگ جو کچھ فیصلہ کریں اسے میں منظور کروں گا۔ ہمارے سکریٹری صاحب اسی بات کی شکایت کر چکے تھے کہ سارا کام انھیں کے اوپر چھوڑ دیا جاتا ہے اور اسی وجہ سے وہ ایک دفعہ ٹکسٹ بک کمیٹی سے استعفا دے چکے تھے۔ مگر اس وقت کچھ فخر تھا کہ وہ اس ذمہ داری کے مستحق سمجھے جا رہے ہیں۔

بلدیو سہائے صاحب تشریف لے گئے تو راجندر بابو سے گفتگو شروع ہوئی۔ وہ نہایت ہی شائستہ، منکسر مزاج اور صلح پسند آدمی ہیں، اُردو۔ یا ہندستانی۔ بہت صاف اور صحیح اور روانی کے ساتھ بولتے ہیں، لیکن شاید اسی وجہ سے کہ وہ اہل ادب دانشا میں زبردستی شامل کرلئے گئے ہیں ان کے سامنے کوئی معیار فصاحت نہیں، اور وہ اُردو بولنے والوں کو مخاطب کرتے ہیں تو ایسی اُردو اور ہندی سمیلن میں ایسی ہندی بولتے ہیں کہ اہل ادب دانشا ان کے پیچھے نہ پڑیں، اور سننے والوں کی خواہش کا لحاظ کرنے کی بدولت بعض لوگوں کو خیال ہوگیا ہے وہ زبان کے معاملے میں تعصب برتتے ہیں۔ اس ملاقات میں انھوں نے جو باتیں کیں ان پر متعصب اُردو داں کسی قسم کا اعتراض نہ کرسکتا تھا۔ آخر میں ان سے یہ طے ہوگیا کہ اُردو ہندی جاننے والوں کی مجلس ہندستانی کی لغت تیار کرنے کے لئے قائم کی جائے گی۔ غلام السیدین صاحب نے گفتگو کا انداز دیکھتے ہی راجندر بابو اور مولوی عبدالحق صاحب کی طرف سے مشترک اعلان شایع کرنے کی تجویز پیش کی، دوران گفتگو میں اعلان کا مسودہ تیار ہوا، اور اس پر دستخط بھی ہوگئے۔

کام ختم ہوتے ہی لوگ دعوتوں میں شریک ہونے کو چلدئیے۔ دوسرے دن صبح تک جو کچھ ہوا وہ کانفرنس والوں کا ذاتی معاملہ تھا۔ دعوتوں سے بہر حال کوئی ہرج نہیں ہوا۔ دوسرے دن بھی حاضری پوری تھی۔

لیکن کام کچھ نہیں تھا۔ ایک صاحب کی تحریک سے بابو بلدیو سہائے صاحب نے جو کچھ فرمایا تھا وہ نوٹ کرلیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد خواجہ محمد نور صاحب، جج ہائی کورٹ، تشریف لائے، اور ان سے بھی بہت کچھ جو کانفرنس والوں کو پہلے سے بتایا جانا چاہئے تھا، معلوم ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ بلدیو سہائے

صاحب نے جو کچھ استادوں کے بارے میں بیان کیا تھا وہ صحیح ہے، لیکن عموماً جس زبان میں تعلیم دی جاتی ہے وہ بہت خراب ہوتی ہے۔ انگریزی، ہندی اور اُردو کے پرچے جانچنے کے لئے الگ الگ ممتحن ہوتے ہیں، اور امتحانوں میں کوئی ایسی بے انصافی نہیں ہوتی جس کی شکایت کی جا سکے۔ عدالتوں میں اس وقت ہندی رسم خط رائج ہے اور رائج رہے گا۔ اس سلسلے میں اُردو کے ساتھ جو زیادتی کی گئی وہ ایک "تاریخی واقعہ" ہے، اس کا ہندی اُردو کی موجودہ کشمکش سے کوئی واسطہ نہیں، اب اس کی شکایت کرنا فضول ہے۔ اس وقت کاغذات اگر ہندی رسم خط میں ہوتے ہیں تو دوسری طرف زبان اور اصطلاحیں وہی ہیں جو پہلے تھیں، جب عدالتی زبان اُردو تھی۔

گفتگو کے سلسلے میں ایک بہت دلچسپ بات معلوم ہوئی۔ سکریٹری صاحب انجمن نے پہلے روز درسی کتابوں کی زبان پر جو اعتراض کئے تھے ان میں سے کانفرنس نے ایک بھی تسلیم نہیں کیا۔ مگر جب انھوں نے فرمایا کہ ان کتابوں میں بھیڑئے کی جگہ "ہنڈار" لکھا ہے اور بھیڑئے کو قوسین میں رکھا گیا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ معیار فصاحت پلٹ دیا گیا ہے تو کانفرنس لاجواب ہو گئی، اس لئے کہ مولانا سلیمان ندوی کے سوا کسی نے بھی ہنڈار کا لفظ نہیں سُنا تھا۔ چنانچہ اس وقت خواجہ صاحب سے اس کا فیصلہ کرنے کی درخواست کی گئی کہ ہنڈار اور بھیڑئے میں کس کو فضیلت حاصل ہے۔ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ بہار میں شہری اور دیہاتی سب ہنڈار ہی بولتے ہیں، میں آپ لوگوں کی ہنسی سے ڈر کر چاہے بھیڑیا کہوں، لیکن گھر پر میں بھی بھیڑئے کی جگہ ہنڈار بولتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ قاضی صاحب (یعنی سکریٹری صاحب) بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے۔ چونکہ اُردو اور ہندستانی دونوں کو بول چال کی زبان ہونے کا دعویٰ ہے اور لکھنؤ جیسے مرکز فصاحت میں بھی گیدڑ کو سیار کہنے کی اجازت ہے۔ اس لئے سکریٹری صاحب کا یہ آخری اعتراض بھی رد کر دیا گیا اور بھیڑئے کو ہنڈار کہنا بہار والوں کے لئے صحیح مانا گیا۔

اس جلسے کے بعد   صاحب کے یہاں کھانے اور سچد آنند سنہا صاحب، وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی کے یہاں چائے کی دعوت تھی۔ ساڑھے چھ بجے کیفی صاحب، سیدین صاحب، مولوی

عبدالحق صاحب، مولانا سلیمان ندوی صاحب اور رشید صدیقی صاحب نے سینٹ ہال میں ہندو مسلمانوں کے ایک بہت بڑے جلسے میں تقریریں کیں۔ یہ کانفرنس کی آخری کارروائی تھی۔

مسلمانوں کی تہذیب کا سہارا اب لے دے کر بس ان کی زبان رہ گئی ہے، اور اگر یہ سمجھ کر کہ وہ خطرے میں ہے ان کے چند نمائندے پہنچ جائیں، بڑے لوگوں سے مل لیں اور بڑے جلسوں میں تقریریں کرلیں تو ہمیں کوئی تعجب نہ ہونا چاہئے۔ ہمارے دل و دماغ پر اب تک نیند کی سستی چھائی ہے، اور ہم ایک دوسرے پر اتنا کم بھروسا کرتے ہیں کہ کسی کے ڈر کر چلا اٹھنے پر بھی لوگ ہمدردی میں اس کی طرف متوجہ ہو جائیں تو خیال ہوتا ہے کہ قوم کا پرانا معمول بدل رہا ہے۔ پٹنہ کی کانفرنس میں جو بھی گیا اس لئے گیا کہ اس کے دل میں مسلمانوں کی اور ان کی زبان کی قدر تھی، اور اس نے دعوت قبول کرنا اپنا فرض سمجھا۔ کانفرنس کرنے کی جو غرض تھی وہ بھی ایک حد تک پوری ہوئی۔ لیکن ہمیں یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ پٹنہ کے بہت سے مسلمان جو اُردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو پہلے سے یہ نہیں بتایا گیا کہ کانفرنس کرنے کا ارادہ ہے، اور بہت سے ہندو دوستوں کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ یہ کانفرنس ہندی کی مخالفت یا اس سے مقابلہ کرنے کے لئے بلائی گئی ہے۔ کانفرنس کی خوش قسمتی سے کانگرسی حلقوں میں ایک بات بنانے والا موجود تھا، ورنہ ایک جھگڑا کھڑا ہو جاتا۔ لیکن یہ نقصان ضرور ہوا کہ کانفرنس بہت سے مقامی لوگوں کے تجربے اور معلومات سے مدد حاصل نہ کر سکی، اور ان لوگوں کی اس ذ صورت بھی نہیں دیکھی جن سے اس جمہوری دور میں زبان کی سچی خدمت کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ تعمیری کام کا شوق بڑے مجموعوں میں برجستہ تقریریں کرنے سے پیدا نہیں کیا جا سکتا، اس کے لئے آنکھ کو آنکھ سے، دل کو دل سے ملنا ہوتا ہے۔

کانفرنس کے دوسرے جلسے میں کام ختم کرنے کے بعد پروفیسر غلام السیدین صاحب نے سکریٹری صاحب انجمن کو تنبیہ کی تھی کہ اب لغت اور محاورے اور معیار فصاحت پر بحث کرنے کا زمانہ نہیں ہے، اب اصولاً ہمیں کوشش کرنا چاہئے کہ اپنی زبان کو عوام کی زبان کے قریب تر لائیں، اسے زیادہ

سے زیادہ آسان کرکے زیادہ سے زیادہ پھیلائیں۔ لیکن اہلِ ادب دانش تو ان ملکوں میں جہاں جمہوری نقطۂ نظر عادت بن گیا ہے اپنی صحبت الگ چاہتے ہیں، ہندستان میں اس گروہ کی خود پسندی کب گوارا کرے گی کہ وہ زبان کو پھیلانے میں مدد دے۔ چنانچہ یہ کانفرنس چند شبہات جو ایک صاحب کے دل میں پیدا ہوگئے تھے رفع کرکے منتشر ہوگئی۔ اس سے نہ پوچھا گیا اور نہ اس نے بتایا کہ زبان کو پھیلانے کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں اور کون سے لوگ ہیں جو اس فرض کو انجام دینے کا حوصلہ یا استعداد رکھتے ہیں۔ کانگریسی وزارت کے تعلیمی منصوبوں کا بھی کوئی ذکر نہیں آیا۔ اس لئے یہ سوال بھی پیدا نہ ہوا کہ مسلمانوں کو خدمت کا حق وصول کرنے کی کیا تدبیریں اختیار کرنا چاہئیں۔ غضب تو یہ ہے کہ ہماری انجمن ترقی اُردو کی کارگذاری بھی اس کے سامنے پیش نہیں کی گئی، اور سوائے اس کے کہ اس کے ڈیلیگیٹوں نے ایک اخبار کے لئے سفارشی خط پر دستخط کئے، اس سے کسی قسم کی عملی امداد کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ کارکنوں اور ہمدردوں کے اس رویے کو دیکھ کر آئندہ کے متعلق اندیشے پیدا ہوں تو کیا بیجا ہے؟

کانگریس اور مسلم لیگ

از جناب ریاض صاحب سابق ایڈیٹر ملت دلوید

مسلمان مسلم لیگ کے ذریعہ اپنی تنظیم کریں یا کانگریس میں داخل ہو جائیں اس مسئلہ پر رسالہ جامعہ کی اشاعت ماہ اگست میں کسی صاحب نے بحث فرمائی ہے۔ نام کی جگہ انھوں نے اپنے کو" ایک قوم پرست مسلم" لکھا ہے۔ مسلم اور قوم پرست! ایک عجیب سی بات ہے۔ مسلمان کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ صرف خدا پرست ہو اور کوئی پرست نہ ہو۔ لیکن اب وہ وطن پرست بھی ہو سکتا ہے اور قوم پرست بھی اور پھر بھی مسلم رہ سکتا ہے۔ عجب نہیں کہ کوئی قوم پرست اس اعتراض کو دیکھ کر یہ کہے کہ" وہی کٹ ملاپن، وہی قل اعوذیوں کی سی گفتگو، اسی وجہ سے تو مسلمان تباہ ہیں اتنی باریکیوں پر غور کر کے لفظ پرست تھوڑی لکھا گیا ہے" اور اگر ذرا ذہین ہوئے اور بحث کی طرف مائل ہو گئے تو ممکن ہے کہ یہ فرمائیں" ہم سیاسی حیثیت سے قوم پرست ہیں اور مذہبی حیثیت سے خدا پرست۔ بحث چھڑنے پر معترض بھی طرح طرح کے سوالات کر سکتا ہے۔ وہ پوچھے گا کہ معاشی حیثیت سے؟ تمدنی حیثیت سے؟ زراعتی حیثیت سے؟ صنعتی اور حرفتی حیثیت سے؟ تجارتی حیثیت سے؟ جنگی حیثیت سے؟ ادبی حیثیت سے؟ علمی حیثیت سے جناب کیا ہیں؟ اندیشہ ہے کہ پھر یونانیوں کی پوری فہرست اصنام بغیر ان تمام سوالات کا جواب دینا جو اس سلسلہ میں پیدا ہو سکتے ہیں مشکل ہوگا۔ پھر معترض بھی اگر طبیعت کا سقراط ہوا تو وہ پاک اور ناپاک، انصاف اور ناانصافی کی بحث چھیڑ دیگا۔ مختلف حیثیتوں کے اصولوں میں تصادم ہوگا، مختلف حیثیتوں کے دیوتا دست و گریبان ہوں گے، زندگی ایک ہنگامہ اور خلفشار بن جائے گی کیسی مشکل ہوگی۔

یہ صحیح ہے کہ اخبار نویس الفاظ کا ترجمہ کرنے میں بڑے بے احتیاط ہیں۔ پیٹری اٹ (PATRIOT) کا ترجمہ وطن پرست اور نیشنلسٹ (NATIONALIST) کا ترجمہ قوم پرست کرتے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی بلا غور کئے یہی الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں، پرستش کا حقیقی مفہوم کسی کے

ذہن میں نہیں ہوتا مگر یہ اعتراض میں نے ضرورتاً قائم کیا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے مضمون کے خاتمے پر یہ فیصلہ دیا ہے کہ مسلمانوں کو سیاسی اور اقتصادی اغراض کے لئے جداگانہ تنظیم نہیں کرنی چاہئے کانگریس میں شریک ہوجانا چاہئے اور مذہبی اور تمدنی اغراض کے لئے جداگانہ تنظیم کرنی چاہئے۔

اب یہاں کیسی اہم بحث پیدا ہوجاتی ہے۔ مذہب، سیاست، اقتصادیات اور تمدن بالکل الگ الگ ہیں، ان کے درمیان حدود فاصل قائم ہیں یا یہ سب باہم مربوط ہیں؟

ترکی گورنمنٹ نے ٹرکی میں یورپین قسم کی چھجے دار ٹوپی رائج کردی ہے۔ چونکہ یہ گورنمنٹ کا حکم ہے اس لئے سیاسی ہے مگر لباس کے متعلق ہے لہٰذا عمل میں آتے ہی تمدن کا معاملہ بن جاتا ہے۔ اس ٹوپی میں چھجہ ہے اس لئے سجدہ نہیں ہوسکتا عبادت میں حارج ہے۔ اب یہ وسیع معنی میں نہیں بالکل محدود معنی میں مذہبی مسئلہ ہوگیا۔ مجبوراً نماز پڑھنے کے لئے ٹرکی کے مسلمان کپڑے کی ایک دوسری ٹوپی جیب میں رکھتے ہیں ہر وقت دو ٹوپیاں۔ کپڑے کی ٹوپی بار بار دھلتی ہے اس وجہ سے ان کو ایسی کئی ٹوپیاں رکھنی پڑتی ہیں ایک ہی حکم کا یہ چوتھا اقتصادی پہلو ہے ایک بہت ہی چھوٹی اور خفیف سی بات ہے مگر ایک ساتھ سیاسی بھی ہے، اقتصادی بھی ہے، تمدنی بھی ہے اور مذہبی بھی ہے۔ پھر اسی ایک مثال سے یہ بات بھی ثابت ہے کہ سیاست مذہب کے اثرات سے بالکل آزاد ہونے کے بعد بھی کس قدر مداخلت پسند واقع ہوئی ہے کہ اتنی اتنی سی بات کا انتظام کرتی ہے کہ ٹوپی کیسی پہنیں اور انھیں اس پر مجبور کرتی ہے کہ ایسی پہنیں جس سے وہ نماز نہ پڑھ سکیں۔

"سیاست اور مذہب الگ الگ ہیں" لوگوں کے ذہن میں اس خیال کی تاریخ محفوظ نہیں ہے ورنہ وہ یہ بات ایسی آسانی سے نہ کہیں۔ جس زمانے میں یورپ کی حکومتیں کلیسا سے دبی ہوئی تھیں اور کلیسا اپنے اقتدار کا غلط استعمال کر رہا تھا تو اس دور کے حکمرانوں نے کلیسا کے استبداد سے نجات حاصل کرلے کے لئے یہ ایک اصول وضع کیا تھا۔ لیکن جب اس کوشش میں کامیابی ہوگئی تو حکومت اور سیاست غالب ہوگئی اور کلیسا مغلوب ہوگیا۔ کلیسا میں سیاست کی مداخلت شروع ہوگئی، یہ نہ ہوسکا کہ مذہب کا دائرہ عمل الگ ہوجاتا اور حکومت کا الگ۔ صاحب قوت جو کوئی بھی ہو مداخلت پسند ہوتا ہے اور بالخصوص

زیادہ ۔

روس میں اس وقت اقتصادی سیاست کا دور ہے لیکن مذہب میں جتنی مداخلت وہاں ہے اور کہیں نہیں ہے ۔ خدا کے خلاف حکومت کی طرف سے ایک مستقل تحریک جاری ہے کسی کی مجال نہیں کہ خدا پر اعتقاد رکھے ۔ یہ انھیں سوشیلسٹوں اور کمیونسٹوں کا عمل ہے جن کا یہ دعویٰ ہے کہ سیاست اور مذہب الگ الگ ہیں مذہب ہر شخص کا نجی معاملہ ہے ۔

ہر سیاست اور تمدن کا ایک پس منظر ہوتا ہے روس کے موجودہ تمدن اور سیاست کا پس منظر زار روس کا استبداد اور زار کی شہنشاہی کے موید کلیسا کا جبر ہے اس لئے روس کی بالشویکی حکومت بادشاہت اور مذہب کی عداوت سے کبھی پاک نہیں ہوسکتی ۔

یورپ نے مظلوم اور بے یار و مددگار عیسائیت کو اپنے دامن قوت و سیاست میں پناہ دی تھی اور اپنی شرائط پر اس مذہب کو قبول کیا تھا، یعنی دور جاہلیت کے تمام رسم و رواج قایم رہیں گے ۔ لہذا وہی پس منظر یورپ کے تمدن میں منعکس ہے ۔ مذہب سیاست کا خدمت گار ہو کر رہ سکتا ہے، افراد کا نجی معاملہ ہے وہ سیاست میں مخل نہیں ہوسکتا ۔ یورپ کا تمام فلسفہ سیاست اسی خیال پر مبنی ہے اور جس روز سے یورپ کی سیاست کو مشرق پر غلبہ حاصل ہوا ہے اس خیال کی خوب تبلیغ کی جارہی ہے اور ہم اس سے متاثر ہیں ورنہ یہ بات کہ مذہب اور سیاست الگ الگ ہیں ایسی لچر بات ہے کہ اس پر ذرا استدلال کیجئے یہ ایک خیال پریشان ثابت ہوگی ۔

اس خیال کے مویدوں کے پاس اس کے سوا، اور کوئی دلیل نہیں ہے کہ یورپ کامیاب ہے اور ہم ناکام ہیں ۔ مگر یہ کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے ۔ مسلمانوں نے بھی ایک زمانہ میں بڑی بڑی حکومتیں قایم کی ہیں ۔ ان کی سیاست اس وقت ساری دنیا پر غالب تھی اور اس وقت بھی وہ اس کے قائل نہ تھے کہ سیاست اور مذہب الگ الگ ہیں ۔ بلکہ اس کے قائل تھے کہ مذہب زندگی کی تمام سرگرمیوں پر حاوی ہے ۔ پھر ٹھیک اسی دن سے زوال شروع ہوا جس دن سے سیاست مذہب کے قابو سے باہر ہوئی ۔

کفر ہو یا اسلام مذہب ہو یا انکار مکمل اور مربوط ہونا چاہئے ضرور کامیاب ہوگا ۔ فرق صرف یہ رہیگا کہ

اسلام کی کامیابی دنیا کے لئے برکت اور راحت کا سبب ہوگی اور انکار کی کامیابی باعث زحمت اور پریشانی۔

یورپ کامیاب ضرور ہے مگر اس کامیابی کے نتائج کو اُسے اب سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے ساری دنیا میں اختلال کی سی صورت پیدا ہے۔ کہیں دولت کے ڈھیر ہیں اور کہیں کھانے کے لئے اتنا بھی میسر نہیں جتنا جینے کے لئے ضروری ہے۔

روس کی خلاف فطرت مساوات کا تماشا بھی دیکھتے جائیے۔ ابھی پورے بیس برس بھی تو نہیں ہوئے اسٹیلن کے زمانہ میں لینن کا کمیونزم باقی نہیں رہا افراد کے حق میں ترقی کے ساتھ مراعات جاری ہیں مگر پھر بھی تمدن میں توازن قائم نہیں ہوتا۔

جب تک متضاد عناصر کمزور ہیں بس اسی وقت تک خیر ہے جب طاقت ور ہو جائیں گے تصادم لازمی ہے۔ یورپ کا سرمایہ دارانہ اقتدار ایک مہیب دھماکے کے ساتھ عنقریب پاش پاش ہونے والا ہے روس کے بے ربط اور خلاف فطرت تمدن کی یہ ساعت شاید ابھی کچھ دور ہو۔ لامرکزی (CENTRIEF UGAL) میلانات دوسرے معاملوں میں ممکن اور مفید ہیں مگر مذہب اور تمدن میں ان کے لئے بالکل

اسلام دنیا کا آخری مذہب ہے اور قرآن آخری پیغام۔ یہ بالکل تازہ ہے اس میں سہو، نسیان اور تصرف و الحاق کو کوئی دخل نہیں ہے۔ مذہب کا صحیح تخیل وہی ہے جو قرآن پر مبنی ہو۔ قرآن میں ہر قسم کے اصول تعلیم کئے گئے ہیں، سیاسی، معاشرتی، معاشی، تمدنی، تجارتی، اور وہ بھی جو عبادت اور عقائد کے متعلق ہیں۔ غرضکہ اسلام جس طرح قرآن میں تعلیم کیا گیا ہے ایک مکمل تمدن اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا کامل اور مربوط ضابطہ ہے جس کے ٹکڑے نہیں کئے جا سکتے۔ اگر مذہب محض عبادات تک محدود ہوتا تو قرآن زیادہ سے زیادہ ایک جزو کی کتاب ہوتی جس میں نماز روزہ اور بڑی مشکل سے حج کے متعلق کچھ احکام ہوتے، لیکن ایسا نہیں ہے۔ قرآن کے تصور میں ایک عالمگیر تمدن ہے سیاست، اقتصادیات، معاشرت، معاشیات اور عبادت وغیرہ اس کے شعبے ہیں۔ قرآنی اخلاقیات (ETHICS) یہ سب مبنی ہیں اور یہی ان کے درمیان ربط قائم رکھتے ہیں۔

مذہب کے متعلق یورپ کا اور غالباً ساری غیر مسلم دنیا کا تخیل ناقص ہے ۔ وہ صرف عبادت کو اور اللہ کے متعلق عقیدے کو مذہب کہتے ہیں ۔ باقی تمام زندگی کے شعبوں کو اس دائرے سے خارج سمجھتے ہیں ۔ اگر یہ خیال صحیح ہے تو کسی مذہب میں یہ احکام نہیں ہونے چاہئیں کہ جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، غیبت نہ کرو، زنا نہ کرو، رشوت نہ لو، غصب نہ کرو، بخل نہ کرو، ظلم نہ کرو، قتل نہ کرو، انصاف کرو، جو مصیبت میں ہوں ان کی مدد کرو، سچی شہادت دینے سے گریز نہ کرو وغیرہ وغیرہ ۔

یہ احکام ہر اس مذہب میں موجود ہیں جو کسی کتاب پر مبنی ہے اور ان میں سے کسی چیز کا تعلق عبادت اور طریقہ عبادت سے نہیں ہے بلکہ سب سیاست، معاشرت، اقتصادیات اسی دنیوی زندگی کے مختلف شعبوں کے متعلق ہیں ۔ حکمائے اخلاقیات نے بھی جو کچھ لکھا ہے وہ بھی سب یہی ہے ۔ اسی کا نام اتھکس ہے اور اسی پر سیاست اقتصادیات اور معاشرت کی بنیاد رکھی گئی ہے ۔ اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ آیا یہ اخلاقی اصول ان آسمانی کتابوں نے ان حکیموں سے اڑائے یا حکیموں نے فکر، بحث اور تشریح کر کے لئے ان کتابوں سے یہ اخذ کر لئے ۔ مجھے یقین ہے کہ بات آخر ہی کی ٹھیک ہے ۔ قرآن چونکہ تازہ ترین پیغام ہے اور مسلمانوں کی زبان پر ہے اس لئے مسلمان سیاست کے متعلق کہے، معاشرت کے متعلق کہے یا اقتصادیات کے متعلق کہے وہ سب قرآنی تعلیمات اور اسی کے اصولوں کے حوالے سے کہتا ہے ۔ یورپ والے جو کچھ کہتے ہیں وہ فلسفیوں کے حوالے سے کہتے ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ اصل ماخذ ان کے ہاں بھول میں پڑ گیا ہے ۔ یورپ کو اگر مذہب کے سلسلے میں کوئی چیز یاد ہے تو وہ صرف دور وسطےٰ کے ان پادریوں اور لطریقوں کا جاہلانہ تعصب، تنگ نظری اور تشدد ہے جنھوں نے تعلیم اور غسل تک کو حرام قرار دیدیا تھا ۔

یورپ کا اہل سیاست جب سیاست میں مذہب کی مداخلت پر تحقیر اور نفرت کا اظہار کرتا ہے تو اس کے ذہن میں وہی غلط اور مکروہ مذہبیت ہوتی ہے اور ہمارے ہاں کے لوگ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان یہاں تک کہ پنڈت جواہر لال نہرو بھی انہی کی کورانہ تقلید کرتے ہیں اور ان کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ تقلید کر رہے ہیں ۔

کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ کارل مارکس کی کتاب اور لینن اور اسٹیلن کے اقوال پر بلا سوچے سمجھے

ایمان لانا اوران کے عمل کی تبلیغ کے لئے دیوانہ وار جدوجہد میں مصروف ہو جانا تو بہت قابل ستائش اور قابل ناز ہے! لیکن قرآن اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارک یا اقوال کا ذکر بھی اس قدر مکروہ ہوگیا ہے کہ اس پر ہرطرف سے لعن طعن کی بوچھار اس طرح شروع ہو جاتی ہے گویا مذہب کے خلاف اشتراکی جہاد شروع ہوگیا۔ انسان کو اپنے عقائد کی تائید میں دیوانگی کرنا ضرور، مذہبی دیوانگی کا دور گیا دہری اوراشتراکی دیوانگی کا دور آگیا۔

جھانسی کے الیکشن میں مسٹر جناح کے نام سے کسی صاحب نے ایک اشتہار شایع کیا جس میں یہ عبارت تھی " انسانوں اور قوموں کی قوت اور ترقی کا راز یہ ہے کہ وہ باہم متحد اور منظم ہوں اور تمام کام باہمی مشورے سے انجام دیں اور اللہ پاک نے یہی حکم مسلمانوں کو دیا ہے جس پر عمل کرنے سے غیر مسلم آج قوی اور ترقی پذیر ہیں .... ان جملہ تحریکات سے میرا مقصد محض اس قدر ہے کہ اپنے خدا و رسول م کے حکم کے موافق مسلمان آپس میں متحد اور منظم ہوں اور اپنے تمام معاملات اور کاموں کو باہمی مشورے سے انجام دیں اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے رہیں اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالیں "

جن لوگوں نے مسٹر جناح کی تقریریں سنی ہیں اور تحریریں دیکھی ہیں وہ اس عبارت کو بیک نظر دیکھ کر یہ کہدیں گے کہ یہ مسٹر جناح کا طرز بیان نہیں ہے۔ پھر جس شخص نے یہ عبارت لکھی ہے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ اس کو انشا میں کوئی سلیقہ ہے اور نہ اس کے خیالات مرتب اور مربوط ہیں لہذا اس میں کسی شبہ کی گنجایش نہیں ہو سکتی کہ یہ اشتہار مسٹر جناح کا لکھا ہوا نہیں تھا۔ لیکن اگر ہو تا بھی تو اس میں وہ کونسی ایسی بات ہے جس پر پنڈت جواہر لال نہرو اس قدر بگھڑے اور مسٹر جناح سے انھوں نے اس طرح محاسبہ کیا جس طرح چوری یا قتل کے جرم سے کیا جائے کیا اس میں کانگریس کو ووٹ دینا کفر بتایا گیا تھا یا مسلم لیگ کو ووٹ دینے پر جنت کی بشارت تھی ؟ متحد اور منظم ہونے کے لئے کہا گیا اور تاکید میں خدا اور رسول کے احکامات یاد دلائے گئے۔

.... میں اس مسلمان سے پوچھتا ہوں جو سیاست اور اقتصادیات میں لینن، اسٹیلن اور پنڈت جواہر لال کا پیرو بننا چاہتا ہے اور اس بات کا دعویدار ہے کہ سیاست اور اقتصادیات میں مذہب

کا کوئی دخل نہیں ہونا چاہیئے بلکہ سیاسی اور اقتصادی تنظیم غیر مذہبی طور پر ہونی چاہیئے کہ قرآن میں مسلمانوں
سے یہ کہا گیا ہے یا نہیں کہ وہ خدا کی رسی کو مضبوط پکڑیں ؟ اور کیوں کہا گیا ہے ؟ کیا صرف اس وقت
اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑلیں جب نماز پڑھیں یا جب جنت میں جانے کے لئے زمین سے آسمان تک زینہ
لگے اور اس کے دائیں بائیں اللہ کی رسّی باندھی جائے تو اس کو اس خوف سے پکڑ پکڑ کر چڑھیں کہ نیچے نہ
گر جائیں ۔

یورپ کی حیرت انگیز مادی ترقی سے مسلمانوں کی آنکھیں خیرہ ہوگئی ہیں اور عقل و حواس معطل ہیں
خاکم بدہن وہ وقت دور نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اپنے تنزل کا باعث اسلام ہی کو قرار دیدیں ۔ اب ان کی
نظر میں اپنی ہر چیز ذلیل ہے اور ذی اقتدار غیر مسلم دنیا کی طرف سے جو بات آئے وہ معزز اور محترم ہے ۔
کیسی دردناک حالت ہے !

انہوں نے شاید اس بات پر کبھی غور نہیں کیا کہ یا وہ اسلام اور قرآن کو مکمل قبول کر سکتے ہیں یا وہ مجموعی
طور پر اس کی ہر چیز سے انکار کر سکتے ہیں ۔ ان کے لئے یہ تیسرا راستہ بالکل بند ہے کہ وہ قرآن میں سے
کچھ قبول کریں اور کچھ سے انکار کردیں ۔ اقتصادیات کارل مارکس کی ، سیاست روسو کی ، معاشرت
روسیوں کی ، تمدن گاندھی جی کا ، عبادات قرآن کی اس خلط ملط کی قرآن ہرگز اجازت نہیں دے سکتا ۔

سیاسیات میں ، اقتصادیات میں ، معاشرت میں اور جملہ امور دنیا میں اسلام کا ایک خاص نقطہ نظر
اور مسلک ہے وہ مجموعی طور پر ایک جامع تمدن ہے دنیا کی ہر مجلس میں ذی ہوش مسلمان ایک پارٹی کی حیثیت
رکھتا ہے وہ پارٹی اس وقت برسراقتدار نہیں ہے یہ اور بات ہے ۔ ایک زمانے میں تھی اور پھر ہو سکتی
ہے ۔

شاید اس موقع پر ترکوں ، مصریوں ، عراقیوں اور ایرانیوں کی مثال پیش کی جائے یہ سب
اس وقت نیشنلسٹ اور یورپ کے پیرو بنے ہوئے ہیں ۔ یہ مثالیں بالکل ہمارے کام نہیں آسکتیں ۔
اسلام عربوں یا ترکوں کی پیروی نہیں ہے ۔ ہماری ہی طرح یہ بھی حیران ہیں ، ہارے ہوئے ہیں ، اور
یورپ کے اقتدار سے مرعوب ہیں ، اپنے تنزل کے اسباب پر غور کئے بغیر یورپ کے طریقہ سیاست کا

تجربہ کر رہے ہیں انجام کار یہی ہوگا کہ یا وہ ہر حیثیت سے مسلمان رہیں گے یا کچھ اور ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس تھوڑے ہی عرصے میں بعض بعض جگہ بازگشت کے آثار نمودار ہو چلے ہیں اس سے زیادہ اور کوئی بات لغو ہو نہیں سکتی کہ مسلمان اس لئے ناکام ہیں کہ ان کی سیاست مذہب کے تحت میں ہے کسی اصول اور نظرئے کے صحیح اور غلط ہونے کی یہ کوئی کسوٹی نہیں ہے کہ وہ ہنگامی طور پر کامیاب یا ناکام ہے روس میں کمیونزم کامیاب ہے، جرمنی میں نازی ازم کامیاب ہے، اٹلی میں فیسزم کامیاب ہے، فرانس اور امریکہ میں جمہوریت کامیاب ہے، انگلستان اور جاپان میں شاہی کامیاب ہے اور ان میں سے ہر ایک اصولی حیثیت سے دوسرے کی ضد ہے۔

مسلمان اگر دنیا میں اپنا وجود قایم رکھنا چاہتے ہیں تو انھیں بھی اپنے تمدن و مذہب کی تمام خصوصیات کے ساتھ عمل کے میدان میں آنا چاہئے۔ اگر اپنے علم اور نشان کے ساتھ انھوں نے فتح حاصل کی تو وہ مسلمانوں کی اور اسلام کی فتح ہوگی۔ لیکن اگر انہی افراد نے جو اس وقت مسلمان ہیں سوشلزم نازی ازم یا کمیونزم اختیار کر لیا تو مسلمانوں کی حیثیت سے انھوں نے تو ہتھیار ڈال دئیے شکست قبول کر لی۔ وہ کمیونزم، سوشلزم یا نازی ازم کی فتح ہوگی جس پر مسلمانوں کو خوش ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

بعض لوگوں کا یہ خیال رہا ہے کہ اگر مسلمان سود لینا شروع کر دیں تو ان کی اقتصادی بدحالی دور ہو جائے اور واقعی اس کی انھوں نے تبلیغ بھی کی۔ یہ وہی لوگ ہیں جو جی ہار چکے ہیں اور جنھیں اپنے ہتھیاروں پر بھروسہ نہیں رہا ہے۔ اگر مسلمان سود لے کر امیر ہو جائے تو وہ یقیناً مسلمان کی حیثیت سے امیر نہیں ہوا بلکہ یہودی یا بنئے کی حیثیت سے امیر ہوا قرآن کے اقتصادی نظرئے کے ایک پہلو سے وہ منکر ہوا اور یہودیوں اور بنیوں سے اس نے شکست کھائی۔ اس معاملہ میں اس نے انکا ایمان قبول کر لیا۔

تعجب ہے مسلمانوں میں اب اتنا دم بھی باقی نہیں رہا جتنا انگلستان کی سیاسی پارٹیوں میں ہے۔ گلیڈ اسٹون کے بعد سے انگلستان کی لبرل پارٹی تنزل پذیر ہے کبھی کنزرویٹو اور کبھی لیبر پارٹی اقتدار حاصل کر رہی ہے مگر لبرل اپنے اصولوں سے کسی طرح انحراف نہیں کرتے۔ کتنی ہی اقلیت میں ہوں،

مگر اپنے اصولوں اور نظریوں کی تبلیغ کئے جاتے ہیں۔ اپنی شکستوں کا باعث اپنے عمل کی کوتاہیوں کو سمجھتے ہیں حریفوں کی فتح سے مرعوب ہوکر اپنے اصولوں کو بُرا نہیں کہتے۔ اور جس شخص کا لبرل اصولوں پر عقیدہ نہیں رہتا وہ لبرل پارٹی سے استعفیٰ دے کر دوسری پارٹی میں چلا جاتا ہے مسلمانوں کی یہ حالت ہے کہ مذہب سے انکار کرتے ہیں، سوشلسٹ اور کمیونسٹ بنتے ہیں، اسلام کے ہر اصول پر معترض ہیں مگر پھر بھی اپنے کو مسلمان ہی کہے جاتے ہیں اس کا یہ سبب ہے" کہ دوسرے گروہوں میں ان کی قدر ہی اس وجہ سے ہے کہ یہ مسلمان ہوکر اسلام اور مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں اگر یہ اسلام کو ترک کرکے کسی دوسرے گروہ میں مل جائیں تو پھر ان میں کوئی ایسی بات نہیں رہتی جس کی وجہ سے ان کو وہاں امتیاز حاصل ہو۔

"مسلمان سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے کانگریس کے ماتحت تنظیم کریں، مذہبی اور تمدنی حیثیت سے علیحدہ تنظیم کریں" یہ خیال غیر اسلامی بھی ہے اور غیر معقول بھی۔ پورے تمدن میں شعبہ سیاست کی وہ حیثیت ہے جو نظام سیاسی میں پولیس اور فوج کی۔ جس تمدن میں سیاسی تنظیم موجود نہو وہ پراگندہ اور مضمحل ہو جاتا ہے۔ سیاسی اور اقتصادی اغراض کے لئے مسلمان جداگانہ تنظیم نہ کریں اس کے معنی یہ ہوئے کہ مسلمان انفرادی حیثیت بلا شرط اس کانگریس میں داخل ہو جائیں جو اس وقت تک ۹۹ فی صدی ہندو ہے، جس کی قیادت ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے، جس پر ہندو مذہبیت کا غلبہ ہے، جس کا سیاسی رخ ابھی معین نہیں ہے کہ وہ یورپ کے سرمایہ دارانہ قوم پرستی کے نظریئے پر آگے بڑھے گی یا سوشلسٹ ہو جائے گی، جو مسلمانوں کے جداگانہ سیاسی وجود کو بالکل تسلیم نہیں کرتی، جو اس کی سخت مخالف ہے کہ مسلمان مسلمان کی حیثیت سے اپنی ضروریات اور شکایات پیش کریں، جو مسلمانوں کو اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ کانگریس کے عہد نامے اور مینی فسٹو پر دستخط کرنے بعد مذہبی معاملات میں بھی اپنی رائے آزاد رکھیں یہ یوپی میں ابھی اس وقت ہوا جب کانگریس پارٹی اور لیگ کی پارلیمنٹری پارٹی میں اشتراک عمل کی گفتگو ہو رہی تھی۔ اس وقت مسلمان سیاسی اور اقتصادی حیثیت سے بالکل کانگریس کی پالیسی اور پروگرام کے پابند ہوں گے، مجلس واضعان قانون میں یہ ان پر واجب ہوگا

کہ ہر معاملہ میں کانگریس پارٹی کے ساتھ رائے دیں، وزراء کی حیثیت سے صرف کانگریس کی پالیسی کا نفاذ عمل ان کا فرض ہوگا۔

دوسری طرف مسلمان اپنی تمدنی اور مذہبی تنظیم علیحدہ کریں گے اس تنظیم کا مقصد صرف یہ ہونا چاہیئے کہ قرآن کے مطابق مسلمانوں کا جو مذہب اور تمدن ہے اس کی حفاظت کی جائے اور اس کی تبلیغ کی جائے

کانگریس میں سوشیلسٹ پارٹی کی اکثریت ہو جاتی ہے اور کثرت رائے سے یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ سوشیلسٹ حکومت قایم کی جائے اور مذہبیت کا استیصال کیا جائے، خدا کے خلاف اعلان جنگ ہو۔ ہندوستان کا سیاسی نظام جس میں مسلمان بھی شامل ہوں گے فوراً اس فیصلے کی تعمیل میں مصروف ہوجائیگا اور دوسری طرف اپنے معینہ فرایض کے مطابق مسلمانوں کا مذہبی اور تمدنی نظام مسلمانوں کے مذہب اور تمدن کی حفاظت میں مصروف ہو جائے گا۔ اس حالت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے سیاسی نظام کا ساتھ دیکر مذہب کا استیصال کریں یا اس سوشیلسٹ حکومت کا ساتھ دیکر جو مذہب میں مداخلت کر رہی ہو مذہب کا استیصال کریں مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ تجویز پیش نہ کی جائے کہ جو مسلمان سیاسی نظام میں داخل ہوں وہ سیاسی نظام کا ساتھ دیں اور جو مذہبی نظام میں داخل ہوں وہ مذہبی نظام کا ساتھ دیں۔ مگر یہاں یہ دشواری پیش آئے گی کہ ہر مسلمان شہری کی حیثیت سے سیاسی نظام میں داخل ہوگا اور ہر مسلمان مسلمان کی حیثیت سے مذہبی اور تمدنی نظام کے تحفظ کا ذمہ دار ہوگا۔ اس معاملے میں ذمہ داریاں مشترکہ ہیں منقسم اور جدا گانہ نہیں ہیں۔

ان شعبوں کے الگ الگ ہونے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ کانگریس مذہبی، تمدنی، سیاسی اور اقتصادی امور کی اس طرح تشریح کردے کہ ہندوستان کے تمام مروجہ مذاہب کے پیرو اس پر متفق ہو جائیں۔ مذہبی اور تمدنی امور میں اسی مذہب کا قانون نافذالعمل ہو، ان قوانین کے نفاذ وعمل کے لئے ہر فرقے کی عدالتیں قایم کردی جائیں، حکومت ان عدالتوں کے فیصلوں کے نفاذ کی ذمہ دار ہو اور مذہبی قوانین میں کوئی مداخلت نہ کرے۔ اقلیتیں اس کو خوشی سے منظور کرلیں گی مگر کیا اکثریت

اور کانگریس بھی منظور کرے گی ؟

اگر کانگریس کو یہ صورت منظور نہیں ہے تو مسلمان ہرگز کانگریس میں بلا شرط اور انفرادی حیثیت سے شریک نہیں ہوں گے۔ وہ کانگریس کی اس معاملے میں شدت سے مخالفت کریں گے۔

قوم پرست مسلمانوں کو چھوڑ کر باقی سب مسلمان کانگریس کو ہندوؤں کی فرقہ وارانہ انجمن سمجھتے ہیں۔ وہ اس کے قائل نہیں ہیں کہ کانگریس کامل آزادی کی طالب ہے۔ اگر کانگریس کامل آزادی کی طالب ہوتی تو احمد آباد میں مولانا حسرت موہانی کا کامل آزادی کا رزولیوشن کامیاب ہو جاتا۔ اس وقت گاندھی جی نے اس رزولیوشن کی سخت مخالفت کی۔ اس وقت گاندھی جی کو یہ عذر تھا کہ ہندوستان ابھی کامل آزادی کی جنگ کے لئے تیار نہیں ہے۔ حالانکہ اصل وجہ مخالفت یہ تھی کہ اس وقت خلافت کمیٹی کے ماتحت مسلمانوں کی تنظیم ہندوؤں سے بہتر تھی۔ گاندھی جی کو یہ خوف ہوا کہ اگر اس وقت یہ تحریک شروع ہوئی تو ہندوستان کے مستقبل کی تعمیر کا کام مسلمانوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا اور ہندو راج کی تمنا خواب پریشان ہو کر رہ جائے گی۔

پھر ٹھیک دس برس بعد لاہور میں کانگریس نے کامل آزادی کا رزولیوشن منظور کیا اور وہ بھی اس بات پر چڑ کر، محض دھمکی دینے کے لئے کہ حکومت نے نہرو رپورٹ منظور کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یقیناً ۱۹۳۰ء میں ہندوستان آزادی کی جنگ کے لئے ۱۹۲۱ء سے زیادہ تیار نہ تھا۔ ہاں مسلمان منتشر اور پراگندہ ہو چکے تھے۔ اب نہ فردائے سیاست پر مسلمانوں کے استیلار کا اندیشہ تھا اور نہ اس کا خوف تھا کہ تحریک کسی وقت اتنی طاقتور ہو جائے گی جو گاندھی جی کے قابو سے باہر ہو جائے۔ اس وقت سے اب تک گاندھی جی نے اِنڈی پنڈنس (INDEPENDENCE) کی کتنی تشریحیں کی ہیں ان کو دیکھئے ان کی نیت اور ہمت کا اندازہ ہو جائے گا۔

مسلمانوں کو اس کا یقین ہے کہ کانگریس کی تحریک اور کانگریس کے ۹۹ فی صدی لیڈروں کا یہ مقصد ہے کہ ہندوستان کا داخلی اختیار اکثریت کی حیثیت سے ہندوؤں کو مل جائے، ہندوستان پر انگریزوں کی سیادت قایم رہے اور انگریزی سنگینوں کے زور سے وہ مسلمانوں کے ساتھ وہی عمل کریں جو انھوں نے

ایک زمانے میں بودھ مذہب کے پیروؤں کے ساتھ کیا تھا۔ اگر کانگریس واقعی آزادی کی طالب ہوتی تو وہ اس وقت تک کے لئے کہ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت قایم ہے مسلمانوں کے مطالبات ضرور منظور کرلیتی۔ مسلمان صرف دور محکومیت ہی کے لئے تحفظات چاہتے ہیں کامل آزادی ملنے کے بعد کیا ہوگا اس کی انھیں کوئی فکر نہیں ہے۔ مگر وہ زمانہ کانگریس کے تصور میں نہیں ہے جب انگریز نہوں گے اور ہندوستان کو استقلال حاصل ہوگا۔ ان کی یہ تمنا بھی نہیں ہے۔ وہ تو صرف برطانوی سیادت اور حمایت میں عہدے اور اختیار چاہتے ہیں۔

کانگریس کی یہ فرقہ وارانہ تحریک نئی نہیں ہے۔ جس روز سے ہندوستان پر انگریزوں کا تسلط ہوا ہے انھوں نے زیادہ سے زیادہ فرقہ وارانہ فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے مسلمان نہیں چاہتے تھے کہ انگریزوں کی زبان میں تعلیم رائج ہو۔ یہ وہی پالیسی تھی جو مصر، شام، عراق اور دوسرے مقامات میں مسلمانوں نے اختیار کی مگر ہندوؤں نے آگے بڑھ کر لبیک کہا اور بڑے جوش سے تعلیم حاصل کرنے لگے۔ ہندوستان کو انگریزی مال کی منڈی بنانے میں ہندوؤں ہی نے تعاون کیا۔ انگریزوں سے پہلے چونکہ مسلمان بادشاہوں کی حکومت تھی اس لئے اس وقت برطانوی حکومت کی پالیسی یہ قرار پائی کہ مسلمانوں کو اقتصادی اور سیاسی حیثیت سے پامال کیا جائے لہذا ہندوؤں کے لئے لوٹ معاف کردی گئی۔ ہندوؤں نے بڑھ بڑھ کر ملازمتیں حاصل کیں۔ مسلمان عہدوں اور دفاتر سے بیدخل کئے گئے۔ قرضے اور سود کے قوانین اس قسم کے بنائے گئے جو ساہوکاروں کے لئے بہت مفید تھے مسلمانوں کی تمام جائدادیں ہندو ساہوکاروں کے قبضہ میں گئیں، ہندو ایجنٹوں کے ذریعہ ملک میں انگلستان کی مصنوعات بکنے لگیں دستکار جو کثرت سے مسلمان تھے برباد ہوگئے۔

ہندوؤں کو یہ درس اسی وقت سے دیا گیا تھا جب سے انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے آئے تھے کہ مسلمان باہر کی قوم ہیں ہندو ہندوستان کے قدیم باشندے ہیں، انگریز ہندوستان کو آزاد کرانے آئے ہیں، سیاست کی تعلیم دینے اور تہذیب سکھانے آئے ہیں۔ جس وقت ہندوستانی حکومت کے قابل ہوجائیں گے تو ان کو حکومت خود اختیاری دی جائے گی، ہندو اکثریت میں ہیں لہذا

حکومت انہی کی ہوگی ہندوؤں نے اس سبق کو خوب رٹا اور پھر انگریزوں ہی کی نگرانی میں کانگریس کے ماتحت تنظیم اور حکومت خود اختیاری حاصل کرنے کی کوشش شروع کر دی۔

اب مسلمان اچھی طرح پامال ہو چکے تھے۔ ان میں سرسید پیدا ہوئے تعلیم اور نوکری کا وعظ شروع ہوا۔ ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی تنظیم سے گھبرا کر اور نیز فرقہ وارانہ رقابت کو اور زیادہ قوت دینے کے لئے انگریزوں نے مسلمانوں کی بھی مدارات شروع کر دی۔ نوکریاں ان کو بھی ملنے لگیں۔ ہندوؤں نے اس کو مسلمانوں کی طرف سے اپنے حق پر جارحانہ اقدام سمجھا اور حکومت سے بھی وہ اس پر خفا ہوئے کہ ہمیشہ سے موردِ الطاف ہم تھے اب یہ مسلمانوں پر کرم کیا۔ انھوں نے اس حکومت خود اختیاری کے حصول کے لئے اور زیادہ شدت سے کوشش شروع کر دی جس میں سارا اختیار اکثریت کو حاصل ہوگا اور انگریز کو یہ اختیار نہ رہیگا کہ اندرونی انتظام میں دخل دے۔ اگر مسلمان بغاوت کریں گے تو انگریزوں کی فوجیں ان کی سرکوبی کے لئے موجود ہوں گی۔

اب رہا ہندوؤں کا یہ وعظ "آزادی اور متحدہ قومیت" تو مسلمان اس سب کو ریا سمجھتے ہیں ہندو جب لفظ قوم بولتا ہے تو اس کے ذہن میں سوائے ہندو قومیت کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ ہر مطالبہ متحدہ قومیت کے طرف سے صرف اس لئے کرتے ہیں اور اسی وجہ سے بحیثیت بھیرہ بنگا مسلمانوں کو بھی کانگریس کے ایجیٹیشن میں شریک رکھنا چاہتے ہیں کہ انگریز ان کا مطالبہ پورا کرنے میں فرقہ وارانہ اختلاف کا عذر پیش نہ کر سکیں۔

ہندوؤں کی سیاسی پالیسی مسلسل اور مربوط ہے۔ بار بار ٹھکرا نے کے بعد بالآخر کانگریس نے نئے دستور میں عہدے قبول کئے چھ صوبوں میں اس وقت کانگریس کی گورنمنٹ ہے۔ کہیں ایک جگہ بھی مسلمان چیف منسٹر ہوا ؟

جب تک الیکشن کے نتائج کا اعلان نہ ہوا اس وقت تک کانگریس والوں کو مسلم لیگ کے ساتھ بڑا عشق تھا۔ یہ منصوبے تھے کہ کانگریس اور لیگ مل کر وزارت قایم کریں گی مگر جس وقت یہ دیکھا کہ کانگریس کو اتنی اکثریت حاصل ہوگئی ہے کہ اس کو کسی دوسری پارٹی سے اتحاد کرنے کی ضرورت

نہیں ہے تو یہ اعلان کر دیا گیا کہ کانگریس وزارت بنانے میں کسی پارٹی سے اتحاد نہ کرے گی۔ مسلم لیگ مذہبی انجمن قرار دی گئی اور بلا تکلف یہ کہہ دیا گیا کہ مسلم لیگ اور اس کے لیڈر اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے کوئی گفتگو کی جائے مسلمانوں کو راست انفرادی حیثیت سے کانگریس کا ممبر بنایا جائے پنڈت جواہر لال اس فتح کے جوش میں یہاں تک بڑھے کہ انھوں نے اپنے ایک اخباری بیان میں یہ بھی فرما دیا کہ کانگریس میں مسلمان ممبروں کی تعداد ہمیشہ لیگ سے زیادہ رہی ہے ہزاروں اور لاکھوں مسلمان کانگریس کے ممبر ہیں۔ اگر پنڈت جواہر لال نہرو صدر کانگریس کا یہ بیان صحیح ہے تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں مسلمانوں کی نیابت اس تعداد کے اعتبار سے کیوں نہیں ہے ؟ پنڈت جواہر لال سچے ہیں تو مسلمانوں کے اس خیال کی تصدیق ہو رہی ہے کہ ہندو کانگریس میں مسلمانوں کو اختیار کی جگہ دیکھنا پسند نہیں کرتے اور چونکہ کانگریس میں انتخاب مشترکہ اور مخلوط ہے وہ آسانی سے ان مسلمانوں کو ناکام کر دیتے ہیں جو کانگریس میں انتخاب کے لئے اٹھتے ہیں۔ ورنہ کانگریس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی میں مسلمانوں کی تعداد اس کا ثبوت ہے کہ مسلمان کانگریس میں بالکل نہیں ہیں یہ دو چار آدمی بھی جو ہیں محض نمائش کے لئے رکھے گئے ہیں یہ انتخاب سے نہیں آئے۔

اس وقت پنڈت جواہر لال نہرو کی یہ کوشش ہے کہ عام مسلمانوں کو کثیر تعداد میں کانگریس کا ممبر بنایا جائے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کے فرقہ دارانہ مطالبات سے نجات حاصل کرنے کے لئے کانسٹی ٹوینٹ اسمبلی (CONSTITUENTASSEMBLY) ایک نیا نسخہ ایجاد کیا ہے جس کے نمائندے ہر بالغ کے ووٹ سے منتخب ہوں گے۔ مسلمانوں میں کانگریس اثر پیدا کرنے کی کوشش کرے یہ کچھ عیب نہیں ہے مگر جس مقصد کے لئے وہ یہ کر رہی ہے وہ اچھا نہیں ہے۔

مسلمان جب تحفظات کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہندوؤں کی طرف سے طعن کیا جاتا ہے کہ مسلمان اکثریت پر اعتماد نہیں کرتے۔ مسلمان ڈرپوک ہیں، اس قسم کے تحفظات اور فرقہ دارانہ تفریق اصول جمہوری کے خلاف ہے، یہ تحفظات جمہوری نظام میں کھپ نہیں سکتے۔ عجیب! ان بزرگوں کو یہ خبر نہیں کہ

جمہوریت کی بنیاد ہی بے اعتمادی پر ہے۔ جب تک لوگوں میں اعتماد رہتا ہے شاہی سب سے بہتر حکومت ہے اور وہ قایم رہتی ہے۔ لیکن جب بے اعتمادی اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے کہ ہر فرد اپنے مفاد کی خود نگرانی ضروری سمجھتا ہے اور نیابت پر بھی کسی کو اعتماد نہیں رہتا تو جمہوریت کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ لوگ جس قدر زیادہ بدگمان اور بے اعتماد ہوں گے اتنا ہی جمہوری نظام بہتر بنے گا جمہوریت کی تاریخ اس خیال کی تصدیق کر رہی ہے۔

جمہوری نظام میں کیا چیز کھپ سکتی ہے اور کیا نہیں کھپ سکتی یہ عجیب منطق ہے۔ یہ متفقہ رائے ہے کہ انگلستان کو دنیا میں سب سے زیادہ جمہوری آزادی حاصل ہے مگر وہاں بادشاہ موجود ہے۔ انگلستان کی جمہوریت میں بادشاہ کھپ سکتا ہے ہندوستان کی جمہوریت میں فرقہ وارانہ تحفظات نہیں کھپ سکتے۔ پھر اسی سلسلہ میں ایک اور بات ہے جو بہت ہی مضحکہ خیز ہے ایک طرف جمہوریت کا تخیل اتنا بلند کہ اقلیتوں کے فرقہ وارانہ مطالبہ سے سخت گریز اور دوسری طرف مستقل مذہبی اکثریت کا دعویٰ قایم۔ جس طرح آئین میں جداگانہ حلقہائے انتخاب ہونے کے باوجود کانگریس نے مسلمانوں کے الیکشن میں دخل دیا اسی طرح مختلف فرقوں کے وزراء کا تناسب معین ہونے کے باوجود یہ بھی کیا ہوتا کہ کسی جگہ مسلمان وزراء کی تعداد ان کے تناسب سے زیادہ بڑھادی ہوتی۔ اس سے مسلمان یہ سمجھتے کہ اب ہندوؤں میں فراخدلی پیدا ہوگئی ہے۔ نہیں گن گن کر ہندوؤں کی تعداد پوری کی گئی۔ پھر اڑیسہ میں تو کمال ہی کر دیا ایک بھی مسلمان وزیر نہیں رکھا گیا۔ یہ صرف ایسے موقعوں کے لئے ہے کہ پنڈت جواہرلال نہرو یہ فرمایا کرتے ہیں کہ "میں ان معاملات کو فرقہ وارانہ نظر سے دیکھنا پسند نہیں کرتا" بیشک یہ غیر فرقہ وارانہ نظر ہندوؤں کے لئے بہت مفید ہے۔

ان حالات میں مسلمانوں کے لئے اس کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے کہ وہ جملہ اغراض کے لئے مسلم لیگ کے ماتحت اپنی تنظیم کریں، ریاستہائے متحدہ جمہوریہ مستقلہ ہند اپنا مطمح نظر قرار دیں۔ دستور میں اقلیتوں کے لئے ایسے تحفظات قایم کریں کہ اس کا امکان باقی نہ رہے کہ کسی حصہ ملک میں کوئی مستقل مذہبی اکثریت استبداد قایم کرسکے۔ ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں ہیں یہ مسلمانوں ہی کے اندیشوں، خطرات اور احتیاط سے ہوگا

کہ ہندوستان میں مذہبی فرقوں کی ایسی جمہوریت قائم ہو جائے جس میں جمہوریت کی صرف صورت نہیں بلکہ حقیقت ہو۔ ہندو اکثریت میں ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اپنا فرقہ وارانہ استبداد قائم کرنے کی کوشش کریں گے یہ مقتضائے فطرت ہے لہٰذا ان پر اعتماد کرنا بدترین حماقت ہے۔ کیا ہندو اور مسلمان ہمیشہ لڑتے رہیں؟ اور اگر لڑتے رہیں گے تو آزادی کی جنگ کیسے لڑی جائے گی؟ یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ ہرگز یہ منظور نہیں ہے کہ ہندو اور مسلمان لڑتے رہیں بلکہ مدنظر دائمی اور مضبوط اتحاد ہے۔ اور وہ اس طرح حاصل ہوگا کہ مسلمان مسلم لیگ کے ماتحت نہایت طاقتور تنظیم کریں۔ ایسی طاقتور کہ کسی ایسے فرد کو جو اپنے کو مسلمان کہتا ہو اس کے خلاف بغاوت کرنے کی جرأت نہو، سوائے مسلم لیگ کے اور کسی ٹکٹ پر کوئی مسلمان مجلس واضع قانون میں منتخب نہ ہوسکے ہندو اور انگریز یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں کہ سوائے مسلم لیگ کے مسلمانوں کی طرف سے بولنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ یہ حالت پیدا کرنے کے لئے جو کچھ بھی کرنا پڑے وہ کیا جائے پھر جب کانگریس آزادی کی جنگ کے لئے اور مجالس واضعان قانون اور وزارتوں کی ترکیب میں مسلمانوں سے اتحاد اور اشتراک عمل کی خواہش کرے تو اس کو اس صورت میں منظور کیا جائے کہ ملک کے لئے جب کوئی پروگرام بنے اور پالیسی معین کی جائے تو مسلم لیگ اور کانگریس کی مجالس شوریٰ کا مشترکہ اجلاس اس کام کو انجام دے اور اس کا عمل دونوں انجمنوں کی مجالس عاملہ کے سپرد ہو۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان، کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اس طرح معاہدہ ہوگا جس طرح دو قوموں کے درمیان ہوتا ہے ہندو ہندو لیڈروں کی قیادت میں اور مسلمان مسلمان لیڈروں کی قیادت میں آزادی کے لئے بحیثیت حلیف کے جنگ کریں گے مسلمان ہندو کانگریس میں مدغم ہو کر فوج کے خدمتی کی حیثیت سے پیچھے پیچھے نہیں چلیں گے۔

انگلستان بینک

از جناب محمد احمد صاحب سبزواری بی اے عثمانیہ

موجودہ زمانہ میں دنیا کے مختلف حصوں میں مال و اسباب کے انتقال اور لین دین کا کاروبار جاری ہے اور ہر ملک کے تجارتی تعلقات دوسرے ملکوں سے وابستہ ہیں اسی بنا پر ہر ملک کا نظام زر بین الاقوامی نظام زر کا ایک جز بن گیا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد لوگوں کو اس امر کا اچھی طرح احساس ہونے لگا کہ جب کسی ملک کے نظام زر میں خرابی واقع ہو جاتی ہے تو ساری دنیا کا اس سے متاثر ہونا کم و بیش ضروری ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایک ملک صرف اپنے نظام زر کو درست کر کے کامیابی حاصل کر سکے۔

اس زمانہ میں بین الاقوامی نظام زر کا سب سے بڑا مرکز شہر لندن ہے۔ لندن کے ایک مربع میل کے اندر اندر وہ جگہ واقع ہے جو "عالمی بازار زر" کہلاتی ہے اور یہیں کی ایک سڑک "تھریڈ نیڈل" پر وہ مشہور مالی ادارہ واقع ہے جس کا بین الاقوامی نظام زر پر بڑا اثر ہے۔ اس سے میری مراد انگلستان بینک ہے۔ اس رقبے میں تمام مالی اداروں کی شاخیں، چھوٹے بڑے دفتر، ایجنسیاں یا کارندے موجود ہیں۔ چنانچہ ۱۹۳۶ء یہاں ۲۰۸ مختلف بینکوں کی شاخیں موجود تھیں۔ اس وجہ سے یہ کہنا کہ دنیا کا نظام زر بڑی حد تک انگلستان کے نظام زر پر منحصر ہے کچھ زیادہ غلط نہیں ہے۔ جنگ سے پہلے انگلستان اپنی مرکزیت کا تنہا اجارہ دار تھا مگر اب پیرس (فرانس) اور نیو یارک (امریکہ) بھی اس کے رقیب بن گئے ہیں۔ تاہم اقتصادی حالات اور مالی بحرانات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جو تقویت انگلستان بینک کو حاصل ہے وہ دوسرے بازاروں کو میسر نہیں۔

انگلستان کا نظام زر تین بڑے اجزا پر مشتمل ہے۔ (۱) انگلستان بینک جو ایک خانگی ادارہ ہے مگر حکومت کا بینک بھی اسی کو سمجھنا چاہیئے۔ (۲) "دوسرے بینک" جن میں

انگلستان کے ۵ بڑے بنیک بہت اہمیت رکھتے ہیں اور تیسرے لمبارڈ اسٹریٹ، جو اصل میں غیر ملکی بنیکوں کے مترادف ہے مگر یہ اپنے قدیم نام سے مشہور ہے۔ تیرہویں صدی میں پوپ نے لمبارڈ قوم کے چند افراد کو ٹیکس وصول کرنے کے لئے یہاں روانہ کیا یہ لوگ اس حصہ میں آباد ہو گئے اور بعد میں روپیہ کا لین دین شروع کر دیا۔ بعد میں لندن کے سناروں نے بھی اس حصہ میں آباد ہو کر اپنا کاروبار شروع کیا اور اس طرح لمبارڈ اسٹریٹ جو دراصل ایک سڑک کا نام ہے بازار زر کے مترادف سمجھا جانے لگا مگر ہمارا موضوع بحث اس وقت انگلستان بنیک ہے۔ اس کے فرائض اور کاروبار پر روشنی ڈالنے سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں بنیکاری کی ابتدا کیوں اور کب ہوئی۔

موجودہ زمانہ میں جو لفظ بنیکنگ یا بنیکاری استعمال ہوتا ہے اس کا آغاز انگلستان میں سنہ ۱۶۴۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس زمانہ تک لوگ اپنے زاید ذخیرے اور اندوختے "ٹاور آف لندن" میں محفوظ رکھا کرتے تھے۔ اور یہاں پس انداز کو محفوظ کرنے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ حکومت ان کی حفاظت کی ضامن ہے۔ چارلس اول کے زمانہ میں ملک میں مختلف بدامنیاں ہوئیں اور حکومت کو روپیہ کی سخت ضرورت لاحق ہوئی۔ ابتدا میں نئے محصول عائد کئے گئے چنانچہ ان ہی نئے محاصل میں ایک "محصول جہاز" تھا جس کے خلاف عوام نے صدائے احتجاج بلند کی اور جان ہمپڈن کا نام اس سلسلہ میں کافی مشہور ہے۔ جب حکومت کو اس طرح ناکامی ہوئی تو بادشاہ نے شاہ اسپین، پوپ، اور لندن کے شہریوں سے قرضہ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کامیابی یہاں بھی قسمت میں نہ تھی مجبوراً چارلس نے سب طرف سے مایوس ہو کر ٹاور آف لندن کے ذخیرہ پر جس کی تعداد ۱۳ لاکھ پونڈ تھی قبضہ کر لیا۔ اس واقعہ نے حکومت کا اعتبار لوگوں کی نظروں میں گرا دیا اور ان کا رجحان بنیکاری کی طرف ہونے لگا۔

اس واقعہ کے بعد سے سوداگروں اور تاجروں نے اپنی رقمیں خود اپنے پاس رکھنا شروع کیں مگر اب ان کے خزانچیوں اور منشیوں نے جعل، فریب اور دھوکہ سے کام لینا شروع کیا۔

کبھی یہ رقم لے کر فرار ہو جاتے تھے۔ اکثر اوقات کثیر رقمیں اپنے آقاؤں کی بغیر اطلاع سناروں کو قرض دیتے تھے جو ان کو ۴ پنس روزانہ کے حساب سے سود ادا کرتے تھے۔ چنانچہ اب لوگوں نے اپنی رقمیں سناروں کے حوالہ کرنا شروع کیں۔ اس طرح سناروں نے ان فرائض کی انجام دہی اپنے ذمہ لی جو موجودہ زمانہ میں بنک کرتے ہیں۔ یہ تاجروں اور خانگی افراد کا روپیہ محفوظ رکھتے تھے، لوگوں کو روپیہ قرض دیتے تھے، ہنڈیاں خریدتے اور ان پر بٹہ کاٹتے تھے۔ جو لوگ ان کے پاس اپنا سرمایہ محفوظ رکھتے تھے ان کو یہ ایک رسید دیا کرتے تھے۔ اور معتبر سناروں کی یہ رسیدیں موجودہ نوٹوں کی طرح دست بدست گھومتی تھیں۔ اسی زمانہ میں یہودیوں نے بھی روپیوں کا لین دین شروع کیا۔ مگر ان کے خلاف شکایات تھیں کہ یہ شرح سود بہت زیادہ وصول کرتے ہیں چنانچہ چارلس دوم کے زمانہ میں حکومت کو ۱۵ سے ۲۰ فیصد شرح سود پر قرضہ ملا کرتا تھا۔ یہ خصومت اس وقت اور زیادہ ہوگئی جب یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنی حاصل کردہ شرح کا نصف بھی ان لوگوں کو نہیں دیتے جن کے سرمایہ سے یہ کاروبار کرتے ہیں۔ بہرحال اب یہ کوشش شروع ہوئی کہ کسی طرح اس کاروبار کو حکومت اپنے ہاتھ میں لے لے۔

سنہ ۱۶۹۴ء میں ولیم سوم کی حکومت کو مزید رقم کی سخت ضرورت پیش آئی مگر قدیم تلخ تجربات کی بنا پر کسی نے اس کو رقم دینے کی حامی نہ بھری۔ اس موقع پر اسکاٹ لینڈ کے ایک باشندے ولیم پیٹرسن نے ایک بنک کے قیام کی تجویز پیش کی۔ اس نے حکومت کو ۱۲ لاکھ پونڈ اس شرط پر قرض دینے کی رضامندی ظاہر کی کہ اول تو اس کو شاہی فرمان کے ذریعہ ایک بنک قائم کرنے کی اجازت دی جائے، دوسرے قرضہ کی رقم کی حد تک بنک کو نوٹ جاری کرنے کا اختیار رہو۔ چونکہ حکومت کو روپے کی شدید ضرورت تھی اس لئے اس نے ان شرائط کو تسلیم کیا اور سنہ ۱۶۹۴ء کے شاہی فرمان کے ذریعہ انگلستان بنک کا قیام عمل میں آیا۔ بنک کا انتظام ایک کمیٹی کے سپرد ہوا جو گورنر، ڈپٹی گورنر کے علاوہ ۲۴ نظما پر مشتمل تھی۔ اور ان لوگوں پر یہ بھی پابندی لگ گئی تھی کہ گورنر ۴ ہزار، ڈپٹی گورنر ۳ ہزار، اور ہر ناظم ۲ ہزار پونڈ کے حصے خریدے۔

یہیں سے انگلستان کے "قومی قرضہ" کا آغاز ہوتا ہے۔

۱۶۹۴ء سے ۱۸۴۴ء تک بینک کی تاریخ مختلف مباحث سے پُر ہے ۱۶۹۷ء میں اس کو ایک شاہی فرمان کے ذریعہ مشترک کاروبار کرنے کی اجازت دی گئی۔ ۱۷۰۸ء میں سب سے پہلا مالی بحران نمودار ہوا۔ اسی سال فرانس کے حملہ کی خبر نے ملک میں سراسیمگی پیدا کر دی اور بینک کے مخالفوں نے اس کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیاں پھیلانا شروع کر دیں چنانچہ بعض سرآوردہ کاروباری لوگوں نے بینک کے نوٹوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور وہ تمام لوگ جن کا سرمایہ بینک میں محفوظ تھا اپنی رقمیں واپس لینے کے لئے بینک پر یورش کرنے لگے۔ اور وہ وقت قریب تھا کہ بینک دیوالیہ ہو جائے۔ مگر اس نازک موقع پر بعض خاندانی امیروں، اور رئیسوں نے بینک کو قرضے دیکر اس کی ساکھ کو برقرار رکھا۔ نپولیانی جنگوں کے دوران میں بینک نے اپنے نوٹوں کے عوض سونا دینے سے انکار کر دیا مگر یہ پابندی محض عارضی تھی اور اس زمانہ میں نوٹ ہوتے بھی بہت قیمتی۔ چنانچہ سب سے چھوٹا نوٹ ۲۰ پونڈ کا ہوا کرتا تھا۔

بینک کے قیام کی تاریخ سے ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان ہو جاتا ہے کہ شاید یہ یورپ کا سب سے پہلا بینک ہو۔ لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ یورپ میں بینکاری کی ابتدا بہت پہلے سے ہو چکی تھی چنانچہ بارہویں صدی میں اطالوی ریاستوں میں متعدد بینک قائم ہو چکے تھے۔ ۱۴۰۷ء میں جینوا کا مشہور بینک "بینک آف سینٹ جارج" اور ۱۵۸۷ء میں وینس کا "بانکو دی ریلیتو" قانونی طور پر قائم ہو چکے تھے پھر پندرہویں صدی میں مغربی یورپ کے متعدد مقامات مثلاً ایمسٹرڈم، ہمبرگ، اور راٹرڈم میں بینک کھلے، سب سے پہلے ۱۶۵۸ء میں بینک آف سوئڈن نے اپنے نوٹ جاری کئے۔

بینک اصل میں ایک دوکان ہے جہاں سرمایہ کا کاروبار ہوتا ہے جس طرح دوکان دار ایک شخص سے چیزیں خریدتا ہے اور دوسروں کے ہاتھ فروخت کرتا ہے اسی طرح بینک کچھ لوگوں سے سرمایہ حاصل کرتا ہے اور دوسروں کو قرض دیتا ہے۔ تو اب دیکھنا یہ ہے کہ انگلستان بینک

کن ذرائع سے سرمایہ حاصل کرتا ہے اور کن مدوں پر اس کو صرف کرکے نفع کماتا ہے۔

انگلستان بینک کے حصول سرمایہ کے ذرائع کو اولاً دو بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اولاً ملکی ذرائع اور ثانیاً غیر ملکی ذرائع۔ ملکی ذرائع میں حسب ذیل مدات شامل ہیں۔

۱۔ سرکاری امانتیں۔ اگرچہ انگلستان بینک اپنے دستور کے لحاظ سے ایک خانگی ادارہ ہے لیکن عملاً اور حقیقتاً وہ ایک سرکاری ادارہ ہے۔ اور تمام سرکاری فرائض کو اچھی طرح انجام دے رہا ہے۔ حکومت کے تمام مالی معاملات اسی کے سپرد ہیں، وہی حکومت کے مختلف محکموں کے حسابات رکھتا ہے، وہی قومی قرضے کا انتظام کرتا ہے، وہی دارالضرب کا نمایندہ ہے، اور وہی سرکاری رقموں کا تحویل دار ہے۔ انگلستان بینک کی یہ ایک عجیب خصوصیت ہے کہ اس پر کوئی قانونی گرفت نہیں نہ وہاں حکومت کا کوئی نمایندہ ہے۔ مگر وہ سرکاری کام بڑی عمدگی سے انجام دے رہا ہے۔ اگرچہ یہ بینک خانگی حصہ داروں کی ملکیت ہے مگر سالہا سال سے اس کو "بینکوں کے صدر" کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور کبھی بینک کے نظما اپنے ذاتی منافع کو قومی اور سرکاری مفاد پر ترجیح نہیں دیتے چنانچہ اب یہ بات تسلیم کی جاچکی ہے کہ اس بینک کا اصل کام قومی فلاح و بہبود ہے اور حصہ داروں کا نفع کمانا محض ایک ضمنی چیز ہے۔ از روئے قانون حکومت کو بینک کے معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مگر ہمیشہ ہوتا وہی ہے جو حکومت چاہتی ہے۔ بلکہ بینک کے نظما مصیبتوں کے وقت حکومت کے بہترین مشیر ثابت ہوئے ہیں۔ خصوصاً جنگ عظیم میں ان کی امداد قابل تحسین ہے۔ چنانچہ حکومت اپنی تمام رقمیں یہیں رکھتی ہے جنگ کے زمانہ میں بعض اوقات ان رقموں کی تعداد ۵ کرور پونڈ تک پہنچ گئی ہے۔ اور بینک کے سرمایہ حاصل کرنے کا یہی ایک بڑا ذریعہ ہے۔

۲۔ خانگی امانتیں۔ بڑے بڑے کارخانے، مشترک سرمایہ دار کمپنیاں، خانگی اشخاص اپنے حسابات یہاں رکھتے ہیں اور ہفتہ واری تختہ میں " دیگر امانتوں " کے نام سے

جو رقم درج ہوتی ہے وہ یہی ہوتی ہے۔ چونکہ انگلستان بینک اپنی امانتوں پر کسی قسم کا سود نہیں دیتا اس وجہ سے ان خانگی امانتوں کی تعداد اتنی زیادہ نہیں ہوتی جو اس بینک کے خاص مرتبہ اور قوت کا لحاظ کرتے ہوئے ہونا چاہیئے تھی

۳۔ بینکوں کے محفوظ ذخیرے:۔ انگلستان میں جو مختلف بینک مالی کاروبار کرتے ہیں وہ اپنے محفوظ ذخیرے اپنے پاس رکھنے کے بجائے انگلستان بینک میں رکھوانا زیادہ مفید سمجھتے ہیں۔ اگرچہ ان بینکوں پر کوئی قانونی پابندی نہیں ہے کہ وہ اپنے ذخیرے انگلستان بینک میں رکھیں مگر باوجود سود نہ ملنے کے وہ اپنی رقمیں یہاں محفوظ رکھواتے ہیں۔ تمام مالی ادارے ایسے مضبوط ادارہ کی اہمیت کو اچھی طرح جانتے ہیں اور آڑے وقت انگلستان بینک کے ذرا سے اشارہ سے وہ دیوالیہ ہونے سے بچ جاتے ہیں۔

۴۔ غیر ملکی اداروں کی امانتیں۔ جب کوئی مالی مرحلہ پیش آتا ہے تو بیرونی بازار زر میں کام کرنے والوں، ہنڈی دلالوں اور بینکاروں کو انگلستان بینک کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے وہ بنظر احتیاط اس بینک سے تعلقات رکھتے ہیں اور یہاں اپنا کچھ سرمایہ محفوظ رکھتے ہیں اور چونکہ ان امانتوں کا زیادہ تر حصہ لمبارڈ اسٹریٹ کے توسط سے آتا ہے اس وجہ سے ان کو ملکی ذرائع میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ ورنہ درحقیقت اس کا ذکر غیر ملکی ذرائع میں ہونا چاہیئے۔ غیر ملکی ذرائع میں حسب ذیل مدات شامل ہیں۔

ا۔ غیر حکومتوں کی امانتیں:۔ مختلف حکومتوں کو اپنے معاملات کیلئے بسا اوقات کثیر مقدار میں قرضوں کی ضرورت ہوتی ہے اور ایسے قرضے حاصل کرنے کیلئے لندن بڑا اچھا بازار ہے جہاں بڑی بڑی رقمیں آسان شرائط پر مل جاتی ہیں کیونکہ انگلستان کے اکثر لوگوں کے پاس اصل زائد بھی ہوتا ہے اور وہ اس کو دوسرے ملکوں میں لگانے کے خواہش مند بھی نظر آتے ہیں۔ چنانچہ اکثر دوسرے ملک لندن ہی کے بازار زر سے قرضہ حاصل کرتے ہیں۔ پھر انگلستان ایک بڑا صنعتی ملک بھی ہے۔ اور اس زمانہ میں قرضہ عموماً

ملک میں ریلیں بنوانے، جہاز خریدنے، یا آلات حرب خریدنے کے لئے لیا جاتا ہے اور یہ سب چیزیں یہاں ارزاں اور بہتر مل جاتی ہیں۔ اس لئے غیر حکومتوں کو سہولت اسی میں نظر آتی ہے کہ وہ وہیں قرضہ حاصل کریں اور وہیں سے سامان خریدلیں۔ کیونکہ قرضہ یہاں لیکر دوسرے ملک میں سامان خریدنے میں روپیہ کو دوسرے ملک میں منتقل کرنا پڑے گا۔ پھر بعض اوقات قرضہ کی صورت میں یہ شرط بھی لگادی جاتی ہے کہ سامان ہمارے ہی ملک سے خریدا جائے۔ چنانچہ ان سب باتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ ہوتا ہے کہ غیر حکومتیں انگلستان بینک کی معرفت وہاں قرض لیتی ہیں۔ اور یہ سب رقم بینک اپنے پاس محفوظ رکھتا ہے۔ اور اب حکومتیں جن لوگوں سے مال خریدتی ہیں انگلستان ان کو ان کے مال کی قیمت ادا کردیتا ہے۔ اور اس طرح تھوڑی تھوڑی مدت کے لئے بینک کو کثیر رقم مل جاتی ہے۔

جنگ کے بعد سے تجارت اور لین دین میں کچھ بے اعتباری سی پیدا ہوگئی ہے۔ اور شرح مبادلہ میں اوتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً انگلستان اور فرانس کے درمیان تجارت ہوتی ہے اور معمولی حالات میں ایک پونڈ ۱۲۰ مارک کے برابر ہے لیکن اگر کسی وجہ سے ایک پونڈ ۱۵۰ مارک کے برابر ہو جائے تو تباہی آجائے چنانچہ اس کی بیشی کو پورا کرنے کے لئے فرانس اپنی کچھ رقم انگلستان بینک میں رکھتا ہے اور یہی صورت دوسرے ملک اختیار کرتے ہیں اور اس طرح انگلستان بینک کو مستقل طور پر غیر ممالک کی امانتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔

۲۔ غیر ملکی افراد کی امانتیں:۔ ممالک غیر کے اکثر لوگ اپنی امانتیں یہاں رکھواتے ہیں۔ خصوصاً چھوٹے چھوٹے ممالک کے بادشاہ اور امرا تو اپنی کثیر رقمیں یہاں محفوظ رکھتے ہیں۔ کیونکہ بینک کی ساکھ اور اعتبار بہت بڑھا ہوا ہے اور سنہ ۱۹۱۴ء سے قبل یہاں سے ہر وقت بڑی سے بڑی تعداد میں سونا حاصل کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ لوگوں کو اس پر بڑا اعتماد ہے۔

اور وہ اپنی رقموں کو یہاں رکھنا مناسب خیال کرتے ہیں۔ اور اس طرح بینک کو باہر سے اچھی خاصی رقمیں حاصل ہو جاتی ہیں۔

۳۔ غیر ملکی تاجروں اور بینکوں کی رقمیں:۔ انگلستان بڑا صنعتی ملک ہے اور اس کے یہاں دوسرے ملکوں سے لین دین ہوتا ہے۔ اور اس لئے غیر ممالک کے کاروباری افراد یہ چاہتے ہیں کہ اپنی کچھ رقمیں یہاں محفوظ رکھیں۔ پھر موجودہ زمانہ میں پونڈ صرف انگلستان کا ہی زر نہیں رہا بلکہ دوسرے چھوٹے چھوٹے ممالک مثلاً ہالینڈ، سویڈن، ناروے وغیرہ یا ہندوستان اور دیگر انگریزی مقبوضات کا بھی بیرونی سکہ پونڈ ہی ہے۔ اس طرح پونڈ کو بین الاقوامی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اور دو ممالک جب اپنے تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں رقومات روانہ کرتے ہیں تو انگلستان ہی کا توسط تلاش کرتے ہیں ان سب وجوہ کی بنا پر انگلستان بینک کے پاس غیر ملکی تاجروں اور بینکوں کی کثیر رقمیں رہتی ہیں اور اس کے سرمایہ حاصل کرنے کا ایک ذریعہ بن جاتی ہیں۔

بہر حال ان مختلف ذرائع سے بینک کے پاس کافی ذخیرہ جمع ہو جاتا ہے۔ اب بینک اپنا سرمایہ صرف دو قسم کے کاروبار میں لگاتا ہے اول حکومت کو قرضے دینا اور دوسرے خانگی افراد کو قرض دینا۔

حکومت کو آمدنی تو ایک مقررہ وقت پہ ہوتی ہے مگر خرچ فی الفور ہوتا رہتا ہے۔ اب چونکہ یہاں حکومت کے مختلف محکموں کی رقمیں رہتی ہیں۔ اس لئے ایک محکمہ کی فاضلات سے دوسرے کا کاروبار کر دیا مگر بعض اوقات حکومت کو اپنی متوقعہ آمدنی سے زیادہ رقم کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ اس وقت بینک ہی حکومت کو قرض دیتا ہے۔

بینک ایک خانگی ادارہ ہے اور اُسے اپنے مالکوں کے لئے کچھ نفع بھی کمانا ہے اس لئے وہ معمولی کاروبار مثلاً ہنڈیوں پہ بٹہ کاٹنا، تمسکات پر قرضے دینا، حصص پر قرضے دینا اور اسی طرح کے دوسرے کام کرتا ہے۔ عموماً یہ لمبارڈ اسٹریٹ کو عندالطلب قرضے دیا کرتا ہے۔

اس بازار کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ یہاں رقم پر کم سے کم مدت تک کا سود مل جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں دنوں تک کا سود ملتا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ سود کی شرح بہت کم ہوتی ہے مگر چونکہ کثیر رقم دی جاتی ہے اس لئے کچھ منافع مل جاتا ہے۔ مگر بینک کے اس معمولی کاروبار کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے ذرائع کا لحاظ کرتے ہوئے بہت کم رقمیں ان مدّوں پر صرف کرتا ہے — وہ ایک مرکزی بینک ہے اور اس کی ذمہ داریاں نہ صرف اندرون ملک بلکہ بیرون ملک بھی پھیلی ہوئی ہیں اور مصیبت کے وقت سب کی نظریں اسی پر پڑتی ہیں اس لئے عموماً وہ ۵۰ فیصد امانتیں بشکل زر نقد محفوظ رکھتا ہے۔ اور ۵۰ فیصد کاروبار میں لگاتا ہے۔

آج کل یہ بینک ۱۸۴۴ء کے قانون کے تحت کام کر رہا ہے۔ اس قانون کے دو بنیادی اصول ہیں اوّل یہ کہ نوٹ جاری کرنے کا اجارہ صرف اسی بینک کو حاصل رہے گا۔ دوسرے نوٹوں کی ایک معینہ تعداد تو تمسکات کی ضمانت پر جاری کی جائے گی اور اس کے بعد تمام تعداد کے ہم قدر فلز بطور ضمانت رکھنا لازمی ہوگا۔ ان دونوں باتوں پر عمل کرنے کے لئے حسب ذیل باتوں کا حکم دیا گیا۔

(۱) لندن کے اطراف میں ۶۵ میل کے اندر اندر کوئی اور بینک اپنے نوٹ جاری نہ کرے۔

(۲) صوبوں میں کسی نئے بینک کو نوٹ جاری کرنے کی اجازت نہ ہو۔

(۳) جن بینکوں کو یہ حق پہلے سے حاصل ہو وہ صرف اس تعداد تک محدود کر دیا جائے جو تاریخ منظوری تک جاری ہوں۔

(۴) دوسرے بینکوں میں اگر کوئی دیوالیہ ہو جائے یا کاروبار بند کردے یا کسی دوسرے بینک میں ضم ہو جائے تو اس کے جاری شدہ نوٹوں کے دو ثلث کی مقدار کی حد تک انگلستان بینک کو نوٹ جاری کرنے کا حق حاصل ہو جائے گا۔

(۵) ایک کرور ۴۰ لاکھ پونڈ کی حد تک انگلستان بینک کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ تمسکات کی ضمانت پر نوٹ جاری کرے لیکن اس سے زائد نوٹوں پر ان کے ہم قدر سونا رکھنا لازمی ہے۔

(۶) انگلستان بنیک کے نوٹ تمام ملک میں بجز اسکاٹ لینڈ اور آئرلینڈ کے زر قانونی قرار دیئے گئے۔

(۷) انگلستان بنیک کے کاروبار کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔ شعبہ نوٹ اور شعبہ بنیکاری۔ نوٹوں کا اجارہ ۱۹۲۱ء میں مکمل ہوا اور تمام دوسرے بنیکوں کے نوٹ آہستہ آہستہ غائب ہو گئے۔ بنیک کے نوٹ جاری کرنے پر مختلف اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ اس طریقہ کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں لچک بالکل نہیں ہے نہ اس میں بازاری ضروریات کے مطابق کم و بیش ہونے کی صلاحیت ہے۔ کیونکہ جب ہر نوٹ کے معاوضہ میں سونا رکھنے کی شرط لازمی قرار دی گئی تو بازار کو حسب ضرورت رقم نہیں مل سکتی۔ اور اسی وجہ سے انگلستان میں چک کا رواج ہوا۔ بات یہ ہوئی کہ کاروبار بڑھا اور اس کے لئے زائد زر کی ضرورت ہوئی مگر زر کی تعداد محدود تھی اس لئے لوگوں نے ایسا طریقہ نکال لیا کہ بغیر زر کے کاروبار ہو جایا کرے۔

بنیکاری کا شعبہ ہر جمعرات کو اپنے حسابات کا تخمینہ شایع کرتا ہے۔ جس میں بنیک کے دونوں شعبوں کا بدھ کی شام تک کا حساب ہوتا ہے اس کو ہفتہ واری تخمینہ کہا جاتا ہے جو حسب ذیل ہے:-

انگلستان بنیک کا ہفتہ واری تخمینہ

(اس ہفتہ کا حساب جو یوم چہارشنبہ بتاریخ ۲۱ نومبر ۱۹۲۸ء کو ختم ہوا)

حساب صیغہ اجرائی نوٹ

ذمہ واریاں	اثاثے
جاری شدہ نوٹ ۰۸۵ و ۶۴ و ۰۹ و ۱۸ پونڈ	حکومت کی امانتیں ۱۰۰ و ۱۵ و ۱۰ و ۱ پونڈ
	دیگر امانتیں ۹۰۰ و ۳۴ و ۸۷ "
	سونے کے سکے و طلائی خشت ۰۸۵ و ۱۴ و ۱۲ و ۱۶ "
جملہ ۰۸۵ و ۶۴ و ۰۹ و ۱۸ پونڈ	جملہ ۰۸۵ و ۶۴ و ۰۹ و ۱۸ پونڈ

حساب صیغہ بینکاری

ذمہ واریاں			اثاثے		
بینک کے حصہ داروں کا سرمایہ	۱۴،۵۵۳،۰۰۰	پونڈ	حکومت کی تمسکات	۱۴،۳۸،۴۰،۳۲۷	پونڈ
دیگر حصص	۳،۲۰۴،۱۴۷	"	دیگر تمسکات	۳،۴۷،۵۷،۴۹۱	"
عوام کی امانتیں	۱۳،۴۹۸،۱۸۹	"	نوٹ	۴،۱۸،۶۱،۷۱۰	"
دیگر امانتیں	۹،۹۴۷،۲،۱۰۵	"	چاندی اور سونے کے سکے	۸،۷۰،۵۰۴	"
ہفتہ واری اور دیگر ہنڈیاں	۲،۵۹۱				
جملہ	۱۳،۲۱،۳۰،۰۳۲	پونڈ		۱۳،۲۱،۳۰،۰۳۲	پونڈ

ان تخمینوں پر نظر ڈالنے سے ایک بات عجیب نظر آتی ہے وہ یہ کہ صیغہ اجرائی نوٹ میں نوٹ ذمہ واریوں کی جانب ہیں اور شعبہ صیغہ بینکاری میں ان کو اثاثوں کے تحت رکھا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اول الذکر صیغہ نوٹوں کے بدلے سونا دینے پر مجبور ہے۔ دوسرا صیغہ بجائے سونے چاندی کے رکھنے کے نوٹ رکھتا ہے۔ اور اس کو جب ضرورت ہو وہ ان کو صیغہ اجرائی نوٹ میں بھجوا کر سونے میں تبدیل کرا سکتا ہے۔ اس لئے اس کو اسی میں سہولت ہے کہ وہ اپنے یہاں نوٹ رکھے۔

ہفتہ واری حسابات مرتب ہونے کے بعد مجلس نظما میں پیش ہوتے ہیں اور اس کی منظوری کے بعد ان کو شایع کر دیا جاتا ہے یہ فیصلہ مجلس نظما ہی کرتی ہے کہ اس ہفتہ میں بینک کی شرح کیا ہے مختلف سالوں میں بینک کی شرح کا جو اوسط رہا اس کا اندازہ ذیل کے اعداد سے ہو سکتا ہے :-

	پونڈ - شلنگ - پنس
۱۸۴۵ تا ۱۸۵۴	۳ - ۸ - ۵

مدت	پونڈ	شلنگ	پنس
۱۸۵۵ تا ۱۸۶۴	۴	۱۲	۹
۱۸۶۵ تا ۱۸۷۴	۳	۱۶	۱
۱۸۷۵ تا ۱۸۸۴	۳	۳	۱۱
۱۸۸۵ تا ۱۸۹۴	۳	۳	۲
۱۸۹۵ تا ۱۹۰۰	۳	۰	۴

گویا ۱۸۴۵ء سے ۱۹۰۰ء تک اوسط ۳ پونڈ ۱۲ شلنگ رہا ہے۔ موسم گرما میں موسم سرما کے مقابل شرح زیادہ رہتی ہے، موسم گرما میں فصل کے درو کے وقت، تعطیلات کے سفروں کی وجہ سے روئی اور دوسری اشیا کی درآمد کی وجہ سے شرح بڑھ جاتی ہے۔ جنگ کے زمانہ میں شرح میں کچھ زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔

شرح سود کا انحصار بنک کے ذخیرہ محفوظ پر ہے۔ اگر ذخیرہ کے سونے میں کمی ہونے لگتی ہے تو شرح سود بڑھا دی جاتی ہے۔ اس طرح نہ صرف سونا بنک سے نکلنا بند ہو جاتا ہے بلکہ دوسرے ملکوں کا سونا بھی بنک میں آنے لگتا ہے۔ اگر سونے کی مقدار حد سے آگے بڑھ جائے تو شرح سود کم کر دی جاتی ہے انگلستان بنک کی شرح کا بین الاقوامی بازاروں میں بڑی بے چینی سے انتظار کیا جاتا ہے اور اس کا اثر زر کی قدر اور اس کی نقل و حرکت پر پڑتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ بنک کے ذخیرہ میں کمی بیشی کیوں ہوتی رہتی ہے۔ بات یہ ہے کہ بنک کے ذخیرہ پر دو قسم کے مطالبات ہوتے ہیں۔ ایک اندرونی مطالبات کہلاتے ہیں اور دوسرے بیرونی۔ اندرونی مطالبات کا تعلق زیادہ تر کاروباری ضروریات سے ہوتا ہے اور یہ ضروریات وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی ہیں اور ان کا اس طرح بدلنا ناگزیر ہے مثلاً ہر سہ ماہی پر زر کی بڑی مقدار مطلوب ہوتی ہے تاکہ متعدد قسم کی ادائیاں مثلاً لگان، کرایہ، وغیرہ کی جائیں

کیونکہ یہاں سہولت کی خاطر ان کی ادائی ہر سہ ماہی پر ہی ہوتی ہے۔ یا ہر ششماہی پر بڑی رقموں
کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ مشترک سرمایہ دار کمپنیاں اس زمانہ میں اپنا منافع تقسیم کرتی ہیں
یا اگست کے مہینہ میں لوگ تعطیلات کی وجہ سے لندن سے باہر جاتے ہیں اور ضروریات کے
لئے اپنے ساتھ بہت سا روپیہ لے جاتے ہیں یا کرسمس کے موقع پر تحفے تحائف خریدنے، انعامات
دینے اور دیگر اخراجات کے لئے رقموں کی ضرورت ہوتی ہے گویا ان خاص خاص موقعوں پر
زر زیادہ مطلوب ہوتا ہے مگر بنک ان مطالبات سے خوف زدہ نہیں ہوتا کیونکہ ان مطالبات
کی چند خصوصیات ہیں اول تو یہ مقررہ اوقات پر ہوتے ہیں۔ پھر تجربے سے ان کی مقدار کا
بھی صحیح اندازہ ہو جاتا ہے، تیسرے بنک کو یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ رقمیں کس کام کے لئے لی
گئیں یا کہاں گئیں اور کب تک واپس آئیں گی۔ ان وجوہ کی بنا پر ان کا انتظام آسانی کے ساتھ
ہو جاتا ہے۔

مگر بنک جن مطالبات سے ڈرتا ہے وہ بیرونی مطالبات ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بھی
اکثر کا زمانہ مقرر ہوتا ہے اور بنک ان کے صحیح اندازہ سے واقف ہوتا ہے مثلاً روئی یا دوسری
پیداواروں کے زمانہ میں مصر اور ہندوستان بہت سا سونا آجاتا ہے۔ مگر بعض بیرونی مطالبات
ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق نہ تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کب ہوں گے، کتنی مقدار کے ہوں گے،
اور نہ یہ کہ کہاں سے ہوں گے۔ اور اصل میں ان ہی مطالبات کو پورا کرنے کے لئے انگلستان
بنک کو ہر وقت تیار رہنا پڑتا ہے۔

بیرونی مطالبات جن کی وجہ سے انگلستان بنک کے ذخیرہ طلا پر اثر پڑتا ہے اس میں
درآمد کی زیادتی، برآمد کی کمی (سوتی اور غیر سوتی درآمد و برآمد دونوں ان میں شامل ہیں) شرح مبادلہ
کے تغیرات وغیرہ مختلف اسباب شامل ہیں۔ اب اس وقت سونے کو باہر جانے سے روکنا کس
طرح ممکن ہے اس کی سب سے آسان ترکیب تو یہ ہے کہ بنک قرضے دینا موقوف کر دے مگر
ایسا کرنے سے بازار زر میں کھلبلی پڑ جانے کا اندیشہ ہے اور لوگ اپنی امانتیں واپس لینے دوڑیں گے

اور وہی مصیبت پیدا ہو جائے گی جس سے بنک بچنا چاہتا تھا۔ تو ایسی صورت میں گو بنک قرضے دینا بند نہیں کرتا مگر شرح سود بڑھا کر قرض لینے والوں کی ہمتیں پست کر سکتا ہے۔ پھر اس کی شرح کی زیادتی کو دیکھ کر دوسرے تمام بنک بھی اپنی اپنی شرح سود بڑھا دیتے ہیں گویا اب قرضے زیادہ سود پر ملتا ہے اور امانتوں پر زیادہ سود دیا جانے لگتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرضہ کی طلب میں کمی ہو جاتی ہے اور امانتوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔

مگر ہر موقع پر شرح سود میں زیادتی ٹھیک نہیں کیونکہ بعض اوقات اس کی وجہ سے مالی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب انگلستان بنک اپنے ذخیرہ محفوظ کو گھٹتا دیکھ کر شرح بڑھا دیتا ہے تو دوسرے تمام بنک بھی اس کی اتباع میں شرح سود زیادہ کر دیتے ہیں شرح سود کی زیادتی کی وجہ سے کاروباری اشخاص کو بڑی دقتیں پیش آتی ہیں انھیں نہ صرف اونچی شرح پر قرضہ ملتا ہے بلکہ بعض اوقات قرض ملنا ہی دشوار ہو جاتا ہے۔ جو لوگ پہلے سے قرضدار ہوتے ہیں ان سے قرضوں کی واپسی کا مطالبہ شدت سے کیا جاتا ہے اور چونکہ جدید قرضہ ملنا دشوار ہوتا ہے اس لئے اچھے اچھے ساکھ والوں کا دیوالا نکل جاتا ہے۔ اور ان کے ساتھ لین دین کرنے والے بھی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں۔ اس طرح دائرہ پھیلتا ہی رہتا ہے۔ اور عوام خاص ساکھ والوں کا دیوالا نکلتے دیکھ کر اپنی رقمیں واپس لینے بنکوں کے پاس آتے ہیں اور ہر شخص رقم بشکل طلا یا انگلستان بنک کے نوٹوں کی شکل میں حاصل کرنا چاہتا ہے اب انگلستان بنک کے ذخیرے پر اس کا نمایاں اثر پڑتا ہے اور یہ ذخیرہ جلد جلد گھٹنے لگتا ہے۔ جس قدر یہ گھٹتا ہے اسی قدر لوگوں کی بدحواسی بڑھتی جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ عوام انگلستان بنک کے ذخیرے کو کاروباری ساکھ اور اعتبار کا آلہ تصور کرتے ہیں ایسی حالت میں انگلستان بنک کے پاس اپنے ذخیرہ کو بچانے کی صرف ایک ہی صورت رہ جاتی ہے یعنی وہ اپنے نوٹ چھاپ چھاپ کر لوگوں کو دے کیونکہ سخت سے سخت مرحلے میں بھی عوام نوٹوں کی طرف سے بدگمان نہیں ہوتے۔ مگر از روئے قانون بنک ایک خاص مقدار سے زائد نوٹ بغیر ہم قدر سونا رکھے جاری نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ایسی

حالت میں حکومت کی اجازت سے بینک کا قانون عارضی طور پر منسوخ کر دیا جاتا ہے اور بعد میں پارلیمنٹ سے اس کی منظوری لے لی جاتی ہے۔ جوں ہی بینک کا قانون معطل کیا جاتا ہے مالی بحران کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو مزید نوٹ جاری کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی صرف یہ اعلان کہ بینک کا قانون معطل کر دیا گیا اعتبار پیدا کرنے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ انگلستان بینک کی نہ صرف انگلستان بلکہ ساری دنیا میں کیا حیثیت اور اہمیت ہے۔ اور غالباً اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے جان، اے ٹاڈ نے اپنی کتاب "میکانیزم آف ایکسچنج" (THE MECHANISM OF EXCHANGE) میں حسب ذیل جملہ لکھ دیا ہے۔

"اگر کسی طرح انگلستان بینک کا دیوالا نکل جائے تو کیا ہو۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے مگر یہ کہنا کچھ زیادہ مبالغہ آمیز نہیں معلوم ہوتا کہ اس بینک کے دیوالے کے معنی ہیں حکومت برطانیہ، اور برطانوی افراد کا دیوالا اور ہر ملکی بینک کا دیوالا بلکہ دیگر تمام مملکتوں کا دیوالا" ؎

ساحلِ گنگا کے تاثرات

روانی پر تری اے رودِ گنگا! جان و دل قرباں
تری موجوں میں ہے عہدِ کہن کی داستاں پنہاں

نمایاں ہے ترے آئینے میں تصویر ماضی کی
ترے چینِ جبیں میں نقش ہے تقدیر ماضی کی

ترا ہر قطرہ ہندوستاں[1] کے حق میں آبِ حیواں ہے
حیات افروز ایماں بادۂ سر جوشِ عرفاں ہے

نہ تنہا ضو فگن تیری تجلی چشمِ زائر میں
تڑپتی ہیں تری موجیں دلِ بے تاب شاعر میں

ترے ہی دم سے باقی ہے نشاں دیرینہ عظمت کا
وطن مرجع بنا ہے آج تک اہلِ عقیدت کا

تمنا ہے ترے جلووں کی پہنائی میں کھو جاؤں
تری ان مضطرب موجوں سے ہم آغوش ہو جاؤں

کسی صورت سے اب قابو نہیں ہے شورشِ دل پر
کہوں کیوں کر جو کچھ دیکھا ہے میں نے تیرے ساحل پر

کمی اب تک نہیں ہے اشکِ رنگیں کی روانی میں
جھلک کس کی نظر آئی ہے مجھ کو تیرے پانی میں

ابھی تک نقش ہے دل پر تری موجوں کی بیتابی
وہ اندازِ تلاطم وہ ادائے رقصِ سیمابی

دمِ صبح اللہ اللہ وہ شعاعِ مہر کا عالم
وہ کوسوں تک مسلسل ارتعاش و لرزشِ پیہم

تری یہ مضطرب موجیں ہیں یا کرنوں کا گہوارہ
ترے یہ مرتعش جلوے ہیں یا فردوسِ نظارہ

جدھر دیکھو ہے اک طوفان رنگینی و رعنائی
ہے کیف اندوز تا حدِ نظر چشمِ تماشائی

محمد یحییٰ ۔ اعظم گڑھ

[1] مراد ہندو دنیا۔

نیاکی نہ

جناب برکت علی صاحب بی، اے (جامعہ)

جاپان کی برآمد کی تجارت میں جو روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اُسے ایک اتفاقی صورت کہکر ٹالا نہیں جاسکتا یہ تو محض ایک جزو ہے، مشرق میں صنعت کی غیر معمولی رفتارِ ترقی کا جو دنیا کے بڑے بڑے صنعتی ممالک کے تجارتی توازن کو درہم برہم کر دینے والی ہے ۔ جاپان کی اس روز افزوں صنعتی ترقی کا راز اس کی محنت کی ارزانی میں مضمر ہے ۔ اور یہ وہ ذریعہ ہے جس سے دنیا کی تجارت کا رُخ نہایت آسانی سے پھیرا جاسکتا ہے ۔

اس حقیقت کو سمجھنے کے لئے جاپانی مقابلے کی تاریخ کا مطالعہ بھی ضروری ہے، مشرق اور مغرب کے تجارتی تعلقات میں یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ ارزانی محنت کے بل پر مشرق کی مصنوعات بین الاقوامی بازار میں داخل ہو کر خطرناک نتائج کا باعث ہوئیں ۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی کی معاشی تاریخ اسی نوع کا ایک اور واقعہ ہمارے سامنے پیش کرتی ہے، مغرب کا صنعتی انقلاب مشرق کے اسی معاشی امتیاز کی بنا پر ہوا۔ محنت کی بچت کے لئے بے شمار تدابیر کا بروے کار لانا متعدد ایجادات کا باعث ہوا اور یہ محنت کی بچت کا احساس پیدا ہوا مشرق کی سستی محنت کی وجہ سے۔

پہلے پہلے تو یورپ اور ایشیا کی تجارت میں معیارِ زندگی اور اخراجاتِ پیدائش کو بہت کم دخل تھا، اس لئے کہ مغرب میں مشرق سے جو اشیا، برآمد کی جاتی تھیں ان میں محنت کا سوال ہی نہ تھا۔ مثلاً مسالے، ریشم اور چاء ۔ مگر اٹھارہویں صدی میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی اور دوسری مغربی تجارتی کمپنیوں نے مشرق سے یہاں کی مصنوعات اپنے ممالک میں بھیجنی شروع کیں ان مصنوعات میں ہندوستان سے روئی کا سوت، سوتی کپڑے، ململ، چھینٹ اور پردے وغیرہ بھیجے جاتے تھے۔ اور چین سے ریشم بسترے، اور برتن وغیرہ ۔ سترہویں صدی کے آخری سالوں میں ان مصنوعات کی برآمد اس قدر بڑھی

کہ اسے یورپ کی بڑھتی ہوئی مفلوک الحالی کا باعث ٹھہرایا جانے لگا۔ اور جیسے آج یورپ کے کپڑے ہندوستانی صنعت کو برباد کر رہے ہیں، ہندوستانی اور چینی مصنوعات نے برطانیہ کی اونی صنعت کو آغاز کار ہی میں صدمہ پہنچایا۔ یہاں کے سوتی کپڑے نہ محض سستے ہوتے تھے۔ بلکہ ڈیزائن اور رنگ کے لحاظ سے جاذب نظر بھی ہوتے تھے۔ اس زمانے کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقابلے نے برطانیہ کی یہ حالت کر دی تھی کہ انگلینڈ کے بڑے بڑے صنعتی شہر ویران نظر آتے تھے۔ کارخانے بند پڑے تھے، اور مزدور ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے اور بھیک مانگ کر پیٹ پالتے تھے۔ چنانچہ ہندوستانی کپڑے کی غیر معمولی درآمد سے تنگ آ کر حکومت نے اس کی مخالفت شروع کی اور سارے ملک میں اس کے خلاف اتنی نفرت پھیلی کہ اگر کوئی عورت ہندوستانی چھینٹ پہن کر سڑک پر نکلنے کی جرات کرتی تو اُسے تنگ کیا جاتا اور کپڑے پھاڑ ڈالے جاتے۔

فرانس میں بھی مشرقی مصنوعات کی مخالفت ہوئی۔ اور وہاں ۱۶۸۶ء میں ایک قانون کے ذریعے ہندوستانی مال کی درآمد اور فرانسیسی کارخانوں میں ان کی نقل ممنوع قرار دی گئی۔ انگلستان میں بھی ۱۷۰۰ء اور ۱۷۲۰ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستانی مال کی درآمد کو روکنے کے لئے قوانین بنائے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستانی مصنوعات کی فروخت یک لخت نہ رُک سکی۔ اور نہ برطانیہ کی ریشمی مصنوعات کے لئے مشرقی بازار میں کوئی کشش پیدا ہو سکی۔ برطانیہ میں قانونی ممانعت کے باوجود چوری چوری ہندوستان کا مال پہنچ جاتا تھا، جو وہاں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے کافی ہوتا تھا۔

ہندوستانی اور چینی مصنوعات کے خلاف جو قوانین پاس ہوئے، اُن پر بحث مباحثے میں مشرق کے معیار زندگی اور اخراجات پیدائش کو خاص طور پر موضوع بحث بنایا گیا تھا۔ متعدد مصنفین نے اس امر پر زور دیا کہ برطانوی مال کی نکاسی مشرق کے بازار میں اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب ان کے اخراجات پیدائش میں تخفیف کی جائے۔ ایک غیر معروف مصنف نے ۱۷۰۱ء میں یہ رائے پیش کی کہ بہتر تنظیم، اصول تقسیم عمل اور مشینوں اور انجنوں کے ذریعے کم لاگت پر اشیاء پیدا کی جا سکتی ہیں۔ اور ہندوستانی مال کی درآمد [illegible] کے لئے مہلک ثابت ہوگی۔ صنعتی انقلاب سے ایک صدی پہلے محنت کی

بحث کے لئے جو تدبیریں عمل میں لائی جاتی تھیں، ان میں سے اس نے بہت سی مثالیں بھی پیش کیں۔

اٹھارہویں صدی کے آخر میں کپڑے کی صنعت میں متعدد ایجادات کی وجہ سے کلوں کا رواج مکمل ہو چکا تھا۔ مشرق کی صنعت پارچہ پر سے پابندیاں اٹھالی گئیں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں نے نہایت اطمینان سے دعویٰ کرنا شروع کیا کہ "اب ہندوستانی محنت کی تجارتی مقابلے میں کوئی حیثیت باقی نہیں رہی۔ انھوں نے اس دعویٰ کی تصدیق یہ بتاکر کی کہ ہندوستان سے اب مصنوعات کم آتی ہیں۔ اور کچا مال زیادہ آتا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ "ہر دکان میں بالکل ہندوستانی طرز اور رنگ کا برطانوی ململ ایک چوتھائی بلکہ اکثر ایک تہائی سے بھی کم قیمت پر برائے فروخت موجود رہتا ہے"۔ اس کا سبب انھوں نے یہ بتایا کہ "جو کام برطانوی کارخانہ متعدد مشینوں کی مدد سے ایک کاریگر کے ذریعے پورا کرتا ہے، اسی کام کے لئے ہندوستانی کارخانے میں پندرہ کاریگروں کی ضرورت ہوگی"۔

ہرچند انگلینڈ میں ہندوستانی مصنوعات کے سیلاب کو مشینوں اور کارخانوں کے رواج نے روک دیا تھا لیکن اس کے باوجود مشرق کے بازاروں میں برطانوی مال اب بھی مقابلے کے قابل نہ ہوسکا تھا۔ اول تو ہندوستان کے ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے برطانوی کپڑے سے بہتر ہوتے تھے، اور پھر برطانوی کپڑے کی قیمتیں بھی زیادہ ہوتی تھیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے آغاز میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے برطانوی کارخانے داروں کو ہندوستان میں کاروبار کرنے کے لئے آمادہ کیا تھا مگر اسے ناکامی ہوئی۔ بسنہ ۱۸۳۴-۴۲ء میں چین میں برطانوی کپڑے کی درآمد کل درآمد کا ۸ فی صدی تھی۔ مگر سنہ ۱۸۷۲-۸۱ء میں برطانوی کپڑے کی صنعت نے اس قدر ترقی کرلی تھی کہ اس کی درآمد کا اوسط کل درآمد کا ۲۸ فی صدی ہوگیا۔ اس کے علاوہ دوسری مصنوعات کی درآمد بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ سنہ ۱۸۷۱ء میں ہندوستان کی درآمد میں برطانیہ کی سوتی مصنوعات کا ۵۰ فی صدی حصہ تھا۔

غرض مشین نے مشرق کی سستی محنت کو شکست دیدی تھی۔ یہیں سے مشرق کی دستی مصنوعات کی تباہی کا آغاز ہوتا ہے۔

مشین کے رواج سے مصنوعات کی مقدار بڑھی اور ملک کی ضروریات سے کہیں زیادہ اشیا بچ رہتی تھیں۔ اس بقیہ حصّے کے لئے منڈی کی ضرورت تھی۔ گذشتہ سو سالوں سے مشرق بعید کے ممالک پر مغربی کارخانوں کی مصنوعات کی کھپت کے لئے برابر اہل مغرب کا دانت جما رہا ہے۔ چنانچہ برطانوی سفیر نے جس نے ۱۸۴۲ء میں نانکن کے معاہدے پر دستخط کئے، اپنے ملک کے صناعوں کو مطلع کیا کہ "میں نے تمھاری مصنوعات کے لئے ایک ایسی منڈی تلاش کی ہے کہ لنکا شائر کی تمام مشینیں اس کے ایک صوبے کے لئے بھی مصنوعات کی فراہمی سے قاصر رہیں گی۔" اس وقت سے اب تک یہ ممالک اپنی امیدوں کی تکمیل کے لئے کوشش کرتے رہے، لیکن یہ اُمیدیں بس تھوڑے ہی دن کے لئے تھیں اس لئے کہ اُس وقت کے آنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ مشرق اپنی ضروریات کے لئے خود مصنوعات تیار کرنے لگا۔

ایشیا کی ان تین بڑی قوموں میں بہ نسبت مغربی ممالک کے بیرونی خریداری کا اوسط نہایت کم رہا ہے۔ اگر ۳۰-۱۹۲۶ء کے دور کے اعداد و شمار پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان میں سالانہ خریداری کا اوسط ۷۷ر۱ ڈالر فی کس تھا، اور چین میں ۴۸ر۲ ڈالر فی کس، ممالک متحدہ امریکہ میں جو بہت حد تک اپنی ضروریات خود اپنی اندرونی تجارت سے پوری کرسکتا ہے، سالانہ درآمد کا اوسط ۹۷ر۳۲ ڈالر فی کس تھا۔ جاپان میں جو ایک ذرا سا جزیرہ ہے، بیرونی خریداری کا سالانہ اوسط ۱۵ ڈالر فی کس اور سلطنت متحدہ برطانیہ میں ۱۱۳ ڈالر فی کس تھا۔

غرض مشرقی درآمد کا تناسب مغربی درآمد سے بھی کم ہے۔ اگر مشرق کے تمام ممالک کی درآمد کے اوسطوں کو ایک دوسرے سے ضرب دیدیا جائے اور اس طرح جو مجموعی اوسط حاصل ہوگا، وہ بھی مغرب کی درآمد کے اوسط سے کم رہے گا۔ چین کا رقبہ کوئی ۴ ملین مربع میل ہے۔ اور آبادی ۴۰۰ ملین، مگر ۳۰-۱۹۲۶ء کے درمیان یہاں کی سالانہ درآمد کا اوسط ۷۶۳ ملین ڈالر تھا۔ اور ہندوستان میں جس کی آبادی ۳۵۰ ملین ہے، اس مدت میں سالانہ درآمد کا اوسط ۸۵۱ ملین ڈالر کی قیمت کا تھا۔ جاپان میں جس کی تجارت کو سب سے زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے، درآمد کا اوسط ۹۶۳ ملین ڈالر

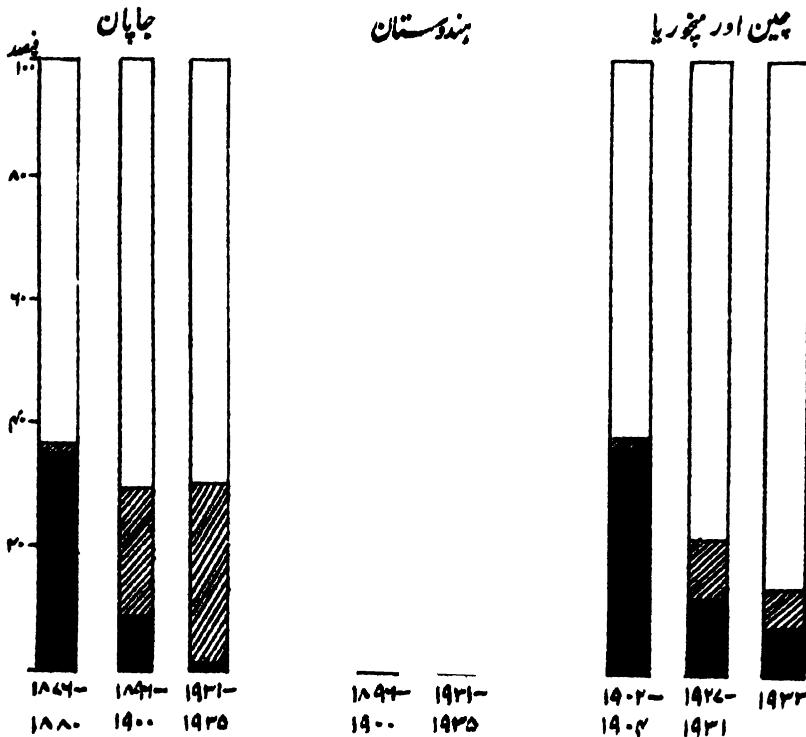
کی قیمت کا تھا۔ ان کے مقابلے میں یورپ کے ایک چھوٹے سے ملک بلجیم کو لیجئے۔ اس کی سالانہ درآمد کا اوسط ایک ارب، تین کرور ۲ لاکھ ٹین ڈالر تھا۔ ایشیا کے ان تینوں ممالک کی آبادی کا تناسب دنیا کی تمام آبادی کا ۴۰ فیصدی ہے، مگر ان کی مجموعی تجارت کا تناسب کل ۸ فیصدی۔

مشرق کی اس تجارتی پستی کے دو اسباب ہوسکتے ہیں، ایک یہ کہ یہاں کے لوگوں کا معیارِ زندگی اتنا پست ہے کہ مشکل سے زندگی گذارنے بھر کے لئے آمدنی ہوتی ہے، اس لئے قوتِ خرید

جاپان، ہندوستان اور چین کی درآمد کا نقشہ

(خاکہ ۱)

(مختلف زمانوں میں)



روئی کی مصنوعات   خام روئی

بہت کم ہے۔ دوسری سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ اپنے محدود وسائل کے ساتھ دستکاری کا بوسیدہ اور زوال آمادہ نظام سرمایہ داری کے منظم کارخانوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور سرمایہ داری کا بے پناہ سیلاب اس قدیم نظام کو بہائے لئے جاتا ہے۔ مغرب کے اس مقابلے نے مشرقی ممالک میں جو بے چینی اور انتشار پھیلا یا ہے، وہ سترہویں صدی کی یورپی بے چینی سے جو مشرقی مقابلے نے پھیلا رکھی تھی، کہیں زیادہ ہے۔ اور اس انتشار کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مشرق میں بھی ایک صنعتی نظام بالکل جدید مغربی نظام کے طرز پر پرورش پا رہا ہے۔

مشرقی تجارت کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ مشرق بعید کی معیشت میں کتنی زبردست تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ انیسویں صدی میں ان ممالک میں روئی کے سوت اور سوتی مصنوعات کی درآمد میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے میں چین اور منچوریا کی درآمد میں سوتی مصنوعات کا اوسط ۹۳ فیصدی تھا اور ہندوستان کی درآمد میں ۸۳ فیصدی۔ بیسویں صدی شروع ہوتے ہی جاپان میں سوتی صنعت کو اتنا فروغ ہو چکا تھا کہ اس کی کپڑے کی درآمد ۸۔۹ فی صدی سے زیادہ نہ رہی۔ حالانکہ ۱۸۶۰ء میں یہ اوسط ۴۶ فیصدی تھا۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ان ایشیائی ممالک میں روئی کی مصنوعات کی درآمد میں نسبتاً تخفیف شروع ہوئی۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء کے اختتام پر ہندوستان کی درآمد میں روئی کی مصنوعات کا حصہ ۱۷ فیصدی تھا۔ اور چین اور منچوریا میں ۱۹۲۷-۳۱ء میں ۱۳ فیصدی۔ جاپان کی درآمد میں تو روئی کی مصنوعات کا اوسط بالکل صفر کے برابر تھا۔ اس لئے کہ ۱۹۳۱-۳۵ء میں کل درآمد کا ۱۔ فیصدی سے بھی کم اوسط تھا۔ مغربی ممالک کو اس سے اور بھی صدمہ ہوا ہے کہ ہندوستان اور چین میں روئی کی مصنوعات جاپان فراہم کرنے لگا ہے۔ سلطنت متحدہ برطانیہ کا حصہ ہندوستان کی روئی کی مصنوعات کی درآمد میں ۱۹۰۰ء میں ۹۵ فیصدی تھا جو ۱۹۳۳-۳۵ء میں گھٹ کر ۵۷ فیصدی رہ گیا۔ اور جاپان کا حصہ ۱۔ فیصدی سے بھی کم سے بڑھ کر ۴۵ فیصدی ہو گیا۔ اسی مدت میں چین کی درآمد میں سلطنت

متحدہ برطانیہ کا حصہ ۴۰ سے گھٹ کر ۱۴ فیصدی سے بھی کم رہ گیا اور جاپان کا حصہ ۱۴ فیصدی سے بڑھ کر ۶۹ فیصدی ہوگیا۔

اس طرح مغرب کی روئی کی مصنوعات کو جو نقصان ہوا ہے، اس کی تلافی ان کی دوسری مصنوعات کی برآمد سے ہوسکتی تھی۔ مگر ایسں بھی ناکامی رہی۔ جاپان میں مصنوعات کی درآمد کا اوسط ۱۲ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ بلکہ اشیاء خام بالخصوص روئی، اون کچا لوہا اور فولاد کی درآمد کا اوسط البتہ ۶۰ فیصدی تک ہے۔ اسی طرح چین کی درآمد میں خاص اشیاء روئی، مٹی کا تیل، تمباکو، گیہوں اور آٹا ہیں۔ البتہ ہندوستان میں ابھی روئی کی مصنوعات کا اوسط خاصا ہے دوسری اشیاء میں مشین، لوہا۔ کچی روئی معدنی اشیاء اور تیل اور شکر شامل ہیں۔

ان تینوں ایشیائی ممالک میں درآمد میں اضافہ ہوا ہے۔ ان میں سے اشیاء خوردنی اور اشیاء خام کی درآمد میں اضافے کا اندازہ خاکہ ۱۷ سے بخوبی ہوجائے گا۔

تجارت کی ان تبدیلیوں سے صاف طور پر عیاں ہے کہ مشرق میں مغربی تجارت کے اقتدار کو دعوتِ مقابلہ دیدی گئی ہے۔ چین، ہندوستان اور سب سے زیادہ جاپان صنعتی نظام کے فروغ سے اب اس قابل ہوگئے ہیں کہ ملک کی مصنوعہ اشیاء کی ضروریات خود پوری کرلیں۔ ایک مدت تک انھیں مغرب سے کلیں اور پرزے خریدنے پڑیں گے، لیکن جوں جوں صنعت ترقی کرتی جائے گی۔ وہ مشین بھی خود ہی تیار کرنے لگیں گے۔ اس کے بعد یہ ممالک (بہ استثنائے ہندوستان) اشیاء خوردنی خریدیں گے۔ اور ان کے بدلے میں اپنے یہاں سے مال برآمد کریں گے اور لامحالہ یہ اشیاء برآمد مصنوعہ اشیاء ہوں گی۔

اس رجحان کی تصدیق جاپان کی برآمد کی تجارت سے پہلے ہی سے ہورہی ہے بسنہ ۱۹۲۲ء میں مصنوعات کی برآمد کا اوسط ۴۵ فیصدی تھا جو اب بڑھ کر ۶۰ فیصدی ہوگیا ہے۔ اس میں روئی کی مصنوعات کا بڑا حصہ ہے، بیرونی ممالک میں جاپان کی مصنوعات کی فروخت کا اثر برطانوی مصنوعات پر بہت برا پڑا ہے۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں جاپان کی برآمد کا اوسط پہلی بار برطانیہ سے بڑھا۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں

جاپان برطانیہ سے ۷۴ فیصدی تک بڑھ گیا۔[۹۵] جاپان کی برآمد کا اضافہ اور سلطنت متحدہ برطانیہ کی تخفیف چند ممالک مثلاً برطانوی ہند، نذرلینڈز، اور ایسٹ انڈیز میں خاص طور پر نمایاں ہے۔

برطانوی ہند کی روئی کی مصنوعات کی درآمد میں برطانیہ اور جاپان کا حصہ

	سلطنت متحدہ برطانیہ	جاپان
۱۹۲۴	۸۹٫۴	۷٫۲
۱۹۲۵	۸۶٫۸	۸٫۳
۱۹۲۶	۷۵٫۱	۱۶٫۵
۱۹۳۱	۶۲٫۶	۲۹٫۶
۱۹۳۲	۵۴٫۳	۳۷٫۲
۱۹۳۴	۵۶٫۸	۳۶٫۹
۱۹۳۵	۶۵٫۹	۳۰٫۷

روئی کی مصنوعات کی برآمد کا نقشہ

	برطانیہ	جاپان
۱۹۲۵	۴۴۳۶ ملین مربع گز	۹۰۵ مربع گز
۱۹۲۹	۳۶۷۲ "	۱۷۹۱ "
۱۹۳۲	۲۱۹۷ "	۲۰۳۲ "
۱۹۳۳	۲۰۳۱ "	۲۰۹۰ "
۱۹۳۴	۱۹۹۴ "	۲۵۷۷ "
۱۹۳۵	۱۹۴۹ "	۲۷۲۵ "
۱۹۳۶	۱۹۱۷	۲۷۰۸ "

ایسٹ انڈیز کی (روئی کی مصنوعات) کی درآمد میں برطانیہ، جاپان اور نیدرلینڈز کا حصہ۔

کل قیمت درآمد کا اوسط فی صد

	برطانیہ	جاپان	نیدرلینڈز
۱۹۲۳	۲۹/۶	۱۴/۲	۳۲/۴
۱۹۲۵	۳۲/۶	۲۰/۸	۲۵/۵
۱۹۲۹	۲۳/۹	۲۷/۵	۲۶/۹
۱۹۳۱	۱۱/۳	۴۳/۲	۲۶/۲
۱۹۳۳	۶/۵	۷۴/۴	۷/۰
۱۹۳۵	۴/۰	۷۶/۸	۱۵/۰

یورپ کو اب یہ دعویٰ کرنے کا حق نہیں رہا کہ مشرق صرف ایک منڈی ہے۔ مشرق بعید کی قومیں خود منڈی کی تلاش میں اپنے حدود ملک سے گذر رہی ہیں۔ اب وہ مغرب سے براہ راست تجارتی مقابلہ کر سکتی ہیں۔ جس کا نتیجہ وہی ہونے والا ہے جو سترہویں اور اٹھارہویں صدی کے مقابلے سے ہوگیا تھا۔

مشرق میں اس تجارتی احیار کے کئی اسباب ہیں۔ ان میں منڈی کی وسعت، اشیار خام کی کمی، اور محنت کی فراوانی خاص وجوہ ہیں۔ منڈی کے لئے ایشیار کا کشادہ اور وسیع خطہ خالی پڑا ہوا ہے، اشیار خام کی یہاں کمی ہے، جنھیں یہ ممالک مصنوعات کی برآمد سے حاصل کریں گے، اور اس طرح صنعت کی ترقی کے لئے تحریک ہوگی۔

مشرق کی صنعتی ترقی میں منڈی کی وسعت، اور اشیار خام کی کمی کے علاوہ سب سے زیادہ دخل محنت کی فراوانی کو ہے۔ مشرق میں آبادی کا بیشتر حصہ زمین کی پیداوار پر زندگی بسر کرتا تھا۔ مگر تقسیم کچھ اس طرح پر واقع ہوئی ہے کہ عوام کی بیشتر تعداد کی آمدنی گذر اوقات کی حد سے زیادہ نہیں بڑھ پاتی۔ یہاں صنعتی نظام کا آغاز ایسے ماحول میں ہو رہا ہے کہ محنت کی بہت بڑی مقدار زراعتی آبادی میں موجود ہے، زراعت پر پہلے ہی سے بہت زیادہ بار ہے، اور بڑھتی ہوئی آبادی کا

بیشتر حصہ زراعت کو چھوڑ کر کارخانوں کی طرف کھنچا جا رہا ہے، لوگ صدیوں سے زراعت میں لگے ہوئے ہیں۔ اور چونکہ اس سے بڑھکر دولت آفریں پیشے کا امکان نہ تھا اس لئے ان کا معیار زندگی دن بدن گرتا جاتا تھا۔ اب چونکہ صنعت میں آمدنی کا امکان پیدا ہوگیا ہے اس لئے لوگ اس کی طرف کھنچ رہے ہیں، اب بھی صنعتی کارخانوں میں گو اجرت بجائے خود بہت کم ہے، لیکن زراعتی پیشے کی آمدنی سے نسبتاً زیادہ ہے۔

مشرق اور مغرب میں اجرت کی سطح کا فرق نہایت نمایاں ہے، اس فرق کی بنا پر مزدوروں کی تحریص کے لئے ان کے معیارِ زندگی کے لحاظ سے اجرت میں اضافے کی بہت گنجائش ہے۔ بہر حال بین الاقوامی مقابلے کے نقطۂ نظر سے جاپان کی اجرت کی سطح قابلِ توجہ ہے، جاپان میں ایک سوت کاتنے والے کی اجرت امریکہ کے ایک مزدور کی اجرت کے دسویں حصہ سے کچھ ہی زیادہ ہے، چین کا مزدور امریکہ کے مزدور کی اجرت کا بارہواں اور سترہواں حصہ پاتا ہے۔ اور ہندستانی مزدور ساتواں حصہ۔

اس قدر کم اجرت کے باوجود یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مزدوروں کو لوٹا جاتا ہے۔ بلکہ یہ اجرت ان کے معیارِ زندگی کو جو انہیں زراعتی پیشے سے حاصل تھا کسی قدر بڑھا ہی دیتی ہے۔ ان مزدوروں کی ضروریات نہایت درجہ محدود ہوتی ہیں ان کا مطالبہ صحت بخش اور سادہ غذا، ایک مختصر سا سادہ مکان اور چند سوتی کپڑوں تک محدود ہوتا ہے، جو رقم اِن ضروریات پر صرف ہوتی ہے اس کی نسبت سے کہیں زیادہ آرام مل جاتا ہے۔ اور اس حال میں ان کا معیارِ زندگی تکمیل ضروریات کے لحاظ سے مغربی مزدور کے شاندار معیارِ زندگی سے کم نہیں ہوتا۔ ان مشرقی مزدوروں کا یہ معیار ان کی غذا کی نوعیت سے جو بیشتر سبزی اور ساگ ہوتی ہے، مقرر ہوگیا ہے، یہ سبزیات برسات کے موسم میں جہاں پانی کافی مقدار میں برستا ہے، بہت بڑی مقدار میں پیدا ہوتی ہیں۔ اور اس لئے سستی۔ مشرق کا رقیبانہ حصہ جو بین الاقوامی تجارت میں ہوگیا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔

مگر ان تمام آسانیوں کے باوجود مشرق کی صنعت کو ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ مزدوروں کی اہلیت

کارکردگی بہت پست ہوتی ہے۔ زمانہ دراز سے یہاں کے لوگ زمین پر کام کرتے رہے ہیں جسے مستقل طور پر چھوڑ دینا انھیں شاق ہوتا ہے۔ دیہات چھوڑ کر شہر میں جائیں گے ضرور، مگر ایک ہی زمانہ میں پھر گھر لوٹ آئیں گے۔ اس وجہ سے کارخانوں کو تنے سرے سے بھرتیاں کرنی پڑتی ہیں اور تجربہ کار مزدور تیار نہیں ہو پاتے۔ ایسے مزدور مشینوں کی باریکیوں سے چونکہ ناواقف ہوتے ہیں اس لئے مشین پر کام کرنے کے لئے انھیں نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ مزدور محنتی ہوتا ہے۔ زیادہ عرصے تک کام بھی کر سکتا ہے، لیکن چونکہ زراعت میں کام کرنے کا عادی ہوتا ہے، اس لئے کارخانہ میں بھی اسی بے پروا خرامی اور آزادہ روی سے کام کرتا ہے یا کرنا چاہتا ہے، اور یہ طریقۂ کار مشین کے لئے قطعاً ناموزوں اور ناقص ہے۔ غرض کارکردگی کے لحاظ سے وہ امریکہ یا مغرب کے کارخانوں کے مزدور کی برابری نہیں کر سکتا۔ اس لئے یہاں مغرب کی بہ نسبت ایک متعینہ کام کرنے کے لئے زیادہ مقدار میں محنت درکار ہوتی ہے۔

لیکن یہ یقین کر لینا بہت بڑی غلطی ہوگی کہ مشرق کی محنت کی یہ خامیاں دائمی ہیں۔ یہ خامیاں موروثی نہیں ہیں۔ محض صنعت کی غیر پختگی کے نتائج کے طور پر ہیں جو زراعتی ماحول اور خام تنظیم کے اثر سے وجود پذیر ہوئی ہیں۔ انھیں دور کیا جا سکتا ہے، محنت کو تربیت یافتہ بنایا جا سکتا ہے، اور آہستہ آہستہ کارکردگی میں اضافہ ہو بھی رہا ہے۔ صنعتی آبادی میں استقلال آ چلا ہے۔ اور تنظیم کی پیداآوری میں اضافہ بھی ہو چلا ہے۔

مشرق کی محنت کے آئندہ امکانات کی تصدیق جاپان کی روئی کی صنعت سے ظاہر ہے۔ چونکہ لوگ یہاں بھی مشین سے آشنا ہو گئے ہیں اس لئے یہاں کی محنت میں سلیقہ اور ترتیب، تنظیم میں ترقی اور سب سے زیادہ کارکردگی میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہو گیا ہے۔ گذشتہ دس سالوں میں (۱۹۲۵-۱۹۳۵) فی مزدور چرخوں کی تعداد دگنی ہو گئی ہے۔ اور سوت کی مقدار وزن فی مزدور ۷۰ فیصدی بڑھ گئی ہے، گو اب بھی جاپان کی کارکردگی امریکہ کی محنت سے گری ہوئی ہے لیکن اضافہ کی رفتار برابر جاری ہے۔ انگلستان کی ملوں کی برابری تو جاپان کی ملوں نے کی ہے،

بلکہ بعض اوقات اس سے آگے نکل جاتی ہیں۔ روئی کی صنعت کے علاوہ جاپان نے دوسری مصنوعات میں بھی ترقی کی ہے، اور اسی قسم کی ترقی چین اور ہندوستان میں بھی ممکن ہے۔

ماہرین اقتصادیات کا خیال ہے کہ جب کسی نئے صنعتی ملک میں کارکردگی میں اضافہ ہوتا ہے، تو وہ ملک اجرت کی شرح میں اضافہ ہو جانے کے سبب اپنی سستی محنت کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے، مگر جاپان کے حیرت انگیز اضافۂ کارکردگی کا اجرت کی شرح پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ جاپان کی زراعتی آبادی میں محنت کثیر مقدار میں موجود ہے جس کی وجہ سے مزدوروں کی رسد کی کثرت سے اجرت کی شرح میں اضافہ ہونے کے بجائے الٹی تخفیف ہوئی ہے، ۱۹۲۶ء میں شرح اجرت اگر سو فرض کی جائے تو ۱۹۳۲ء میں یہ شرح ۶ ر ۸۰ ہو گئی۔ یہ تخفیف اور زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے جب ہم اس واقعے کی طرف غور کرتے ہیں کہ اس زمانے میں جاپانی سکے "ین" کی قیمت گر گئی تھی، جس کے سبب شرح اجرت کو چڑھ جانا چاہئے تھا۔ مگر ہوا یہ کہ سکے کی اس تخفیفِ قیمت کی وجہ سے قیمتیں تو چڑھ گئیں مگر شرح اجرت میں کوئی اضافہ نہوا۔

شرح اجرت کی تخفیف اور مزدور کی اہلیت کارکردگی میں اضافے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اجرتوں کی مد میں ۱۹۳۲ء کے آخر میں ۱۹۲۵ء کی رقم کا کل ۴۰ فیصدی ادا کرنا پڑا۔ اگر مزدور کی اجرت میں اس کے اضافی مطالبات مثلاً رہنے سہنے کے اخراجات، مکانات اور دوسرے اخراجات کو شامل کر کے مقابلہ کیا جائے تب بھی جاپان کی شرحِ اجرت ممالک متحدہ امریکہ، برطانیہ اور غالباً ہر بڑے صنعتی ملک کی شرح اجرت سے کم ہوتی ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ مستقبل قریب میں مشرقی ممالک کی شرح اجرت میں کوئی اضافہ نہوگا۔ محنت کی تنظیم یہاں مفقود ہے۔ اور ایک زراعتی ماحول کے اثر کی وجہ سے ان کی تنظیم ایک حد تک ناممکن بھی، اس کے علاوہ زراعت سے ہٹ کر لوگ صنعت کی طرف چونکہ برابر جوق در جوق چلے آ رہے ہیں اس لئے اجرت کو ایک متعینہ کم شرح پر مستقل کر دینے کے بجائے اس میں بھی آسانی اور اطمینان کے ساتھ مزید تخفیف کی جا سکتی ہے، اب اشیاء غذا کی تیاری میں نسبتاً کم محنت صرف ہو گی، اس لئے کہ نئے طریقے کار کا رواج ہو چلا ہے جس سے

بے شمار طریقوں سے آسانیاں فراہم کی گئی ہیں بیج کے انتخاب کی آسانی ، نئی نئی فصلوں کی کاشت ، کھاد کی نئی نئی اور پیداآور قسمیں ، اور سب سے زیادہ زمین کی تیاری میں مشین کا استعمال ۔ وہ ذرائع ہیں جن سے بہت کم محنت صرف کرکے غذائی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ محنت زایدہ کی بہت بڑی مقدار دیہاتی حلقوں سے فراہم ہو جائے گی اور چونکہ دوسرے ممالک میں مشرقی ہجرت پر نہایت سخت پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں ، یہ محنت دوسری طرف منتقل نہ ہو سکے گی اور نہایت کم اجرت پر دیسی کارخانوں میں کام کرنے کے لئے مجبور ہوگی ۔ اِن حالات میں شرح اجرت میں اضافے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا ۔

مزدوروں کی زیادتی اور شرح اجرت کی کمی مشرقی ممالک کی صنعتی ترقی اور مصنوعات کی برآمد کو بڑھانے میں خاص طور پر ممد ثابت ہوگی ۔ پہلے بھی محنت کی فراوانی اور ارزانی کی بدولت مشرق کے مقابلے نے مغربی منڈیوں میں ہلچل ڈال دی تھی ۔ جسے صنعتی انقلاب کی مشینوں نے کچل ڈالا ۔ اب پہلی بار مشرق میں مشین اور سستی محنت کی باہمی کوشش سے پھر ایسے مواقع پیدا ہو رہے ہیں کہ مقابلے کی آسانیاں مشرق ہی کو حاصل رہیں گی ۔ اِن دو عناصر کی آمیزش سے جو فضا پیدا ہو چلی ہے ، اُسے بہت بڑی بین الاقوامی اہمیت حاصل ہو گئی ہے ، اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا معیارِ زندگی کا یہ شدید تضاد دنیا کی معیشت میں یوں ساتھ ساتھ نبھ بھی سکے گا یا نہیں ؟

شبِ عشق

فریبِ حسن! فریبِ بہار، کیا کہنا!
طلسم بندیٔ نقش و نگار، کیا کہنا!

تجاہلِ کرمِ مصلحت نگر، معلوم!
تغافلِ نگہِ ہوشیار، کیا کہنا!

فسوں طرازیٔ حُسنِ نظر! ترے صدقے
جنوں نوازیٔ رنگِ بہار، کیا کہنا!

تراوشِ گلۂ زخمِ دل، بحالِ تباہ
تقاطرِ مژۂ اشکبار، کیا کہنا!!

جنونِ عشق کی بے ہوشیاں خوشا قسمت
ہوا و سایۂ دامانِ یار، کیا کہنا!

ہمہ نیاز و ہمہ اضطرابِ شوقِ تمام
فسانۂ دلِ اُمیدوار، کیا کہنا!

میں دل کا حال کہے جاؤں، چپ سُنے جاؤ یونہیں
ہلیں نہ ہونٹ مرے، بُردبار، کیا کہنا!

کوئی بھی سامنے آئے، مگر ہو جیسے تمہیں
کمالِ شوق و حدِ انتظار، کیا کہنا!

بنا ہے دامنِ نشتر، "بہار نامۂ شوق"
"برشکِ خون تمنا نگار"! کیا کہنا!!

حضرت ز

رفتارِ عالم

چین اور جاپان : منگولیا کی خود مختاری

چین اور جاپان میں آج تک اعلان جنگ نہیں ہوا ہے مگر جنگ کی آگ دہک رہی ہے شکست و فتح کی تفصیلی خبریں آپ روز اخباروں میں پڑھتے ہی ہوں گے، مگر اس سلسلہ میں دو خبریں ایسی آئی ہیں جنھیں ذرا سمجھ لینا چاہیئے، اس لئے کہ شاید آگے آگے جو ہونے والا ہے اس کا پس منظر یہی خبریں ہوں گی۔ ایک خبر منگولیا کے متعلق ہے کہ منگول سردار جاپان کی مدد سے اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے کی فکر میں ہیں، دوسری خبر یہ ہے کہ روس اور چین میں ایک معاہدہ ہوگیا ہے کہ ایک دوسرے سے جنگ نہ کریں گے، اس لئے کہ قومی معاملات کے تصفیہ کے لئے جنگ "مہذب" انسانیت کا شعار نہیں! اس معاہدہ کے بعض دفعات پوشیدہ بھی ہیں۔

آیئے پہلے منگولیا کے معاملہ کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ منگولیا کا موجودہ علاقہ چنگیز خاں کی وسیع سلطنت کا بچا کھچا حصہ ہے اور جب سے چین پر منگولوں کا مختصر سا تسلط چودھویں صدی عیسوی میں ختم ہوا اس پر بس سناٹا سا چھایا رہا ہے۔ خانہ بدوشوں کی سی زندگی ہے، مگر مہذب دنیا میں خصوصاً منظم اور طاقتور حکومتوں کے پڑوس میں دشت نوردوں کے لئے صحرا بھی حاسدوں کی آنکھ کی طرح تنگ ہو جاتا ہے۔ ان کے ایک طرف روسی سلطنت تھی دوسری طرف چین کی منچو شہنشاہی۔ روسی تہذیب سے تعلق اس لئے نہ بڑھا کہ ان سے متصل سائبیریا کا ویران علاقہ تھا، اُدھر جنوب میں صحرائے گوبی تھا اندرونی منگولیا کی سرحد اگرچہ چین سے ملتی تھی مگر سرحدی علاقہ کی آب و ہوا چینی نوآبادی کے لئے کچھ بہت سازگار نہ تھی۔ مدتوں یونہی سکون کی سی حالت رہی۔ مگر کہتے ہیں کہ سکون محال ہے قدرت کے کارخانہ میں۔ موت کے سکون تک کو بھی تو زندہ چھیڑے بغیر نہیں چھوڑتے۔ کفن چور کفن چراتے ہیں،

قبر فروش قبریں دباتے ہیں، اور ہر برہنہ نعش پر کئی کئی گدھ منڈلاتے ہیں۔ پھر منگولوں کا سکون تو کچھ موت کا سکون نہ تھا، ایک سکتہ سا تھا۔ روس نے جب مشرق کی طرف قدم بڑھایا تو ان میں بھی، کہ کبھی انھوں نے روس کو فتح کیا تھا، ہلچل پیدا ہوئی۔ مال کا لین دین شروع ہوا، تعلقات بڑھے، ادھر چین نے منچوریا میں بڑے پیمانہ پر نو آبادیاں بسائیں تو منگولیا میں بھی اپنے نو آباد کار بھیجے۔ روس اور چین میں اس علاقہ کے متعلق کچھ اختلاف ہوا تو ۱۸۱۵ء میں ایک معاہدہ کے ذریعہ ل بانٹ کر کھانے کا عہد و پیمان ہوگیا۔ لیکن روس کے جو حوصلے ادھر مشرق میں تھے ان میں جاپان مزاحم ہوا اور ۱۹۰۴ء میں روس کو شکست کھانی پڑی۔ اس شکست کے بعد چین نے اپنے آدمی بڑی کثرت سے اس علاقہ میں بسائے اور خاصکر اندرونی منگولیا میں انھوں نے منگول قبائل کو چینی صوبوں میں اس ڈھب سے شامل کیا کہ ہر جگہ یہ غریب سیاسی اقلیت بن جائیں۔ چینی تاجروں نے یہاں سود پر روپیہ پھیلایا اور قرض کے جال میں غریب منگولوں کو پھانسا۔

چینی زیادتیوں سے گھبرا کر منگولوں نے روس سے تعلقات بڑھائے۔ اس نے الگ الگ سود خواروں کی جگہ منظم بنک بنا دیا، ریل چلا دی، کانیں کھدوا دیں۔ تہذیب میں ترقی شروع ہوئی اور آزادی آہستہ آہستہ ہاتھ سے جانے لگی۔

چین اور روس میں یہ کھینچ تان تھی ہی کہ ۱۹۰۵ء کی فتح کے بعد جاپان بھی پنچوں میں شامل ہوا تو اس نے بھی منگولیا پر اپنا حق جتایا۔ روس نے جھٹ اس سے معاملہ چکا لیا اور دو معاہدے ہوگئے۔ ایک کھلا ایک چھپا۔ جاپان نے بیرونی منگولیا اور مغربی منچوریا میں روس کا "حق" تسلیم کرلیا۔ پہلے ۱۸۹۹ء ہی میں انگلستان بھی روس کا یہ "حق" تسلیم کرچکا تھا۔ حلوائی کی دوکان پر باوا جی کی فاتحہ اسی کو کہتے ہیں۔

۱۹۱۱ء میں جب چین میں انقلاب ہوا اور جمہوریت قایم ہوئی تو روس اور جاپان نے پھر ایک معاہدہ کیا۔ پیکنگ سے جو خط طول البلد کا گذرتا ہے اسے حد مقرر کیا گیا۔ اس کے مغرب میں روس کا اور مشرق میں جاپان کا حلقہ اثر قرار پایا۔ جاپانیوں کے یہ منصوبے دیکھکر چینیوں نے بھی ہاتھ پیر ہلائے ۱۹۱۲ء میں منگولوں کی آزادی میں معتدبہ کمی کی۔ قبائلی علاقوں کو اپنے باضابطہ صوبوں میں ہضم کیا،

اندرونی منگولیا میں اپنے آدمی بڑی کثرت سے بھیجے ۔ لیکن بیرونی منگولیا مقابلۃً محفوظ رہا ۔ وہ تو جب روس میں انقلاب کی گڑبڑ ہوئی اور بیرونی منگولیا کو روسی کمک پہنچنے کا امکان بہت کم ہوگیا تو چین نے وہاں بھی اپنا ایک خاص جنرل بھیجا کہ اس علاقہ کو بھی باضابطہ چینی صوبہ بنالے ۔ چونکہ اس کی زد روس پر پڑتی تھی اس لئے جاپان نے بھی چین کو شہ دی ۔ مگر اس چینی جنرل نے وہاں وہ غضب ڈھایا کہ لوگ تنگ آگئے اور بعد کو ایک پاگل روسی نواب ان گرن اسٹرنبرگ نے جو روس سے بھاگ کر آیا تھا وہاں تسلط جما لیا ۔ تسلط ہونے کے بعد انھوں نے بھی ظلم میں کمی نہ کی ۔ بالآخر روس کی انقلابی فوج نے آکر ان کا خاتمہ کیا تو لوگ ذرا مطمئن ہوئے ۔ ایسی بلا سے نجات ملی تھی کہ لوگوں نے انقلابی فوج کو اپنا بڑا محسن مانا ۔ ادھر پرانا سیاسی نظام سب اس افراتفری میں بیٹھ ہی چکا تھا اس لئے ایک گلابی انقلابی حکومت یہاں قایم ہوگئی ۔ اس کے قایم ہوتے ہی روس نے اپنی ساری فوج ہٹالی ۔ اس سے عوام میں روس کے ساتھ بڑی عقیدت پیدا ہوئی ۔ کہ یہ ہے بے غرض ساتھی ۔ پھر ۱۹۲۴ء میں یہاں کی حکومت میں اور زیادہ جمہوری عنصر بڑھا اور اس وقت سے یہ علاقہ اپنے کو خود مختار سمجھتا ہے ۔ روس کا دوست ہے ۔ اور دوستی اتنی گہری ہے کہ اغیار اسے روس کا ایک صوبہ جانتے ہیں !

ادھر اندرونی منگولیا میں بھی چین سے آزاد ہونے کی تحریک جاپانی مدد سے برابر چل رہی تھی ۔ لطف یہ کہ جب موقع ہوتا جاپان چینی قوت کو بھی اکسا دیتا کہ کہیں آزادی خواہ عناصر اپنی حیثیت نہ بھول جائیں ۔ ان منگولوں پہ ایک تو اپنی جنگ آزادی کی قربانیوں کا بوجھ ہے ، دوسری طرف چینی سرمایہ دار ان کا خون چوسے لیتے ہیں ۔ پھر خود ان کے سردار اور لاما ہیں ۔ اس گروہ تسمہ پا سے بھی جان ضیق میں ہے ۔ جاپان اپنی غرض سے انھیں مدد دیتا ہے ۔ جب منچوکو کی نئی ریاست قایم کرائی تو ایک نیم خود مختار صوبہ منگولوں کا ــــ سن گان ــــ بھی بنوادیا کہ منگولوں کی ہمدردی حاصل ہو ۔ اور یوں اندرونی منگولیا میں ہوکر بیرونی منگولیا میں قدم جمانے اور روس کے منصوبے توڑنے کا موقع ملے ۔ منچوریا کی فتح کے ساتھ ساتھ جاپان نے چہول اور چہار کا منگول صوبہ تو دبا ہی لیا ہے ۔ مغربی حصہ میں منگول قبیلوں کے امیروں اور مذہبی پیشواؤں کو رشوتیں دے کر ، وعدے کرکے ، ہتھیار اور سامان جنگ پہنچاکر ،

چین سے آزاد ہونے پر آمادہ کر رہا ہے۔ آزادی کی تحریک کچھ تو منگول سرداروں کی خود غرضیوں کی وجہ سے، کچھ قدرتی طور پر چین سے آزاد ہونے کی آرزو سے قوت پکڑ رہی ہے۔ ان کے ایک بڑے سردار شہزادہ تے نے پہلے چین سے معاملہ کرکے اپنی ایک خود مختار سیاسی جمعیۃ تسلیم کرالی تھی۔ اور چین میں سن یات سین کے خیالات پر دیانت سے عمل ہوتا اور چیانگ کائی شک ملک کے اقتدار پسند اور جابر عناصر سے ساز باز کے باعث اس منگولی جمعیۃ سے عہد شکنی نہ کرتا تو شاید جاپان کو اتنی آسانی یہاں نہ ہوتی۔ چین کی بدعہدی اور کمزوری نے شہزادہ تے کو جاپان سے جا ملایا۔

لیکن بیرونی منگولیا کا قرب ہے، روسی اثر ہے، جمہوری اور اشتراکی خیالات کی خاصی اشاعت ہو چکی ہے۔ اس لئے معاملہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا شاید لوگ سمجھتے ہوں۔ جاپان کے اثر میں منگولوں کے خودغرض افراد ہیں اور نفس پرست مذہبی پیشوا۔ اور کیوں نہ ہو، یہ بس بھرے پودے کسی دوسرے بڑے زہریلے درخت کے سایہ ہی میں خوب پنپتے ہیں۔ ان میں سے کچھ جاپان کے ساتھ ہیں تو کچھ چین کے ساتھ ہوں گے کہ خودغرضی کو اخلاقی اصولوں سے سروکار نہیں ہوتا۔ لیکن منگول قبائل کی عام آبادی دیکھتی ہے کہ اس کے لئے نہ ادھر کچھ ہے نہ اُدھر۔ وہ چین سے بیشک بیزار ہے مگر سوچتی ہے کہ جاپان ہی سے ساتھ کیا مل جائے گا۔ منچوریا کے غریبوں کو کیا مل گیا۔ وہ اپنے پڑوس میں چینی بدامنی اور چینی امراء اور تاجروں کی خودغرضی دیکھتی ہے، دیکھتی ہے کہ یہ پیٹ کے کتے اپنی غرض کے سامنے اپنے وطن اور اپنی حکومت ہی کا ساتھ نہیں دیتے تو ہم غیروں مفتوحوں کو کیا دیں گے۔ دوسری طرف پڑوس ہی میں جاپانی فوجوں کا غرور و تمکنت دیکھتی ہے، قوت کی فرعونیت کا نظارہ کرتی ہے، چینی تاجروں اور ساہوکاروں سے بھی زیادہ بڑے پیٹ والے جاپانی سرمایہ داروں کا تسلط جمتے دیکھتی ہے۔ اسے بھلا اس سے کیا تسکین ہوسکتی ہے کہ چینی پنجہ سے نکل کر جاپانی جال میں پھنس جائے۔ کڑھائی میں تلا جانا بیشک بُرا ہے۔ پر اس سے نکل کر آگ میں گر پڑنا بھی تو کچھ اچھا نہیں۔ پھر یہی عام آبادی اپنے قریب بیرونی منگولیا میں جمہور کی حکومت کا ناقص ہی سہی پھر بھی اچھا خاصا نمونہ دیکھتی ہے۔ جانتی ہے کہ روسی سپاہی وہاں نام کو نہیں۔ پھر کل منگولیا علاقہ

کے یکجا ہونے کا امکان دکھتی ہے۔ کیا عجب ہے کہ منگولی آزادی کی یہ تحریک جو اس وقت جاپانی سامراج کی ایک چال ہے کل جاپان ہی گردن میں عذاب کا طوق بن کر پڑ جائے۔ اور یہ منگولیا قبیلے اپنے ہم قوموں کے ساتھ ہوکر اور روس سے مدد پاکر جاپان کے سارے منصوبوں کو تہ و بالا کردیں۔

اس قیاس کو اور بھی تقویت ہوتی ہے اس سے کہ خود چین میں اسی منگول علاقہ سے متصل چینی جمہوری اور اشتراکی فوجوں کا بہت اثر ہے۔ یعنی چینی قوم کے اس عنصر کا اثر جس نے اس وقت چیانگ کائی شک کو جاپان سے لڑنے پر مجبور کیا ہے۔ یہی وہ عنصر ہے جس نے سن یات سین کی قیادت میں چینی شہنشاہیت کا خاتمہ کیا۔ پھر جب یوان شی کائی کے ہاتھوں جمہوریت خطرہ میں پڑی تو اسے دوبارہ کومن تانگ کے قیام سے زندہ کیا اور تقریباً سارے ملک کو قومیت، جمہوریت، اشتراکیت کے اصول سہ گانہ پر متحد کیا! پھر جب اپنے ایک ساتھی کی بے وفائی کی وجہ سے منتشر ہوا تب بھی ملک کے ایک بڑے حصہ کو اپنے اثر میں رکھ سکا، سارے ملک میں اتحاد قومی تحریک اور پردیسی اقتدار کے ختم کرنے کے جذبہ کو ابھارتا رہا، اندرونی منگولیا کے قریب ہی شمال۔ مغربی چین میں لاکھوں کا لشکر یکجا کرسکا! خود چیانگ کائی شک کی فوجوں کو جاپان کے خلاف ابھار سکا، چین کے سارے طالب علموں میں دفاع قومی کا ولولہ پیدا کرسکا، اور بالآخر اپنے اس مخالف کو جس نے کئی سال سے اس عنصر کی بیخ کنی میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا جاپان کے خلاف کھڑا کردینے میں کامیاب ہوا اور یوں گویا ساری چینی قوم کو پھر اپنا ہمنوا بنا لیا۔

اس عنصر کے قوت پکڑنے سے جاپان کے سارے آگے کے منصوبوں کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ اسی لئے چین سے اس کے جو مطالبات ہیں ان میں سب سے پہلا یہی ہے کہ اس عنصر کو یکقلم مٹادو۔

روس اور چین کا معاہدہ | اب روس اور چین میں جو معاہدہ ہوا ہے وہ اس عنصر کو اور بھی تقویت پہنچاتا ہے۔ جاپانی سامراج کے مقابلہ میں اشتراکی روس نیم اشتراکی چین کا ساتھی بنا ہے۔ منگولیا کا ایک بڑا علاقہ روس کے اثر میں ہے ہی، اندرونی منگولیا کی تحریک آزادی بھی امیروں کے ہاتھ سے نکل کر

جمہور کی تحریک بن سکتی ہے۔ ایسی تحریکیں تمام تر پروگرام کے مطابق تو ہوا نہیں کرتیں۔ کرنے والوں کی نیت کیا ہوتی ہے اور ہوتا کیا ہے۔ عجب نہیں کہ چین و جاپان کی جنگ اپنے اندر ایک اس سے زیادہ اہم معرکہ کو چھپائے ہوئے ہو۔ کیا عجب ہے کہ یہ جنگ روس اور جاپان، سرمایہ داری اور اشتراک کا ایک فیصلہ کن معرکہ بن جائے۔ اس معرکہ کا نتیجہ کون جان سکتا ہے؟ غالباً بازی اس کے ہاتھ رہے گی جس کا ساتھ دوسری طاقتیں دیدیں۔ مگر یہ کس کا ساتھ دیں؟ اگر جاپان کو قوت پہنچا کر جتاتی ہیں تو اپنے ہاتھوں اپنی چینی تجارت کا خاتمہ کرتی ہیں، اپنے فاضل سرمایہ کے وہاں لگنے کے امکانات مٹاتی ہیں اور دنیا کی سیاست خصوصاً مشرق کی سیاست میں اپنی اعتباری حیثیت کو کہاں سے کہاں نیچے پہنچا دیتی ہیں اور جاپان کو زک دلانے کے لئے روس کا ساتھ دیتی ہیں تب بھی سرمایہ دار یورپ کے ہاتھ سے چین کا ممکنات سے بھرا ہوا میدان نکل جاتا ہے۔ اور سیاست عالم میں، سرمایہ داری اور اشتراک کے تصادم میں، اشتراک کا پلہ بہت بھاری ہوجاتا ہے۔ اسی دگدا میں دوسری قومیں دم بخود ہیں۔ اور ان کی سیاست میں اس یکسوئی اور قوت کے آثار نہیں ملتے جو ایسے نازک موقعوں پر کام آتے ہیں۔ اخلاقی ہمدردی اکثر کی چین کے ساتھ ہے۔ مگر ریاستوں کی اخلاقی ہمدردی کا حشر دنیا حال ہی میں حبش کے اندر دیکھ چکی ہے۔

(د۔ ح)

بحر روم اور نیون کانفرنس

کوئی دن نہیں جاتا کہ اسپین کی خانہ جنگی یورپ میں کوئی نہ کوئی نیا فتنہ کھڑا نہ کرتی ہو۔ ابھی اسپین میں عدم مداخلت کا جھگڑا چل ہی رہا تھا کہ بحر روم میں آنے جانے والے جہازوں پر حملے ہونے لگے، صرف برطانیہ کے کوئی تیس جہاز ان حملوں کا نشانہ بنائے گئے، فرانس اس بحری قزاقی سے گھبرا اٹھا، اور روس کا تو ایک جہاز ترکی ساحل کے قریب ایک آب دوز کشتی کے حملہ کا شکار ہوگیا۔ ترکی حکومت نے بیان کیا کہ کچھ دنوں سے ساحل کے آس پاس ایک آب دوز کشتی دکھی جارہی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ جہازوں پر طیارے بم برساتے، آب دوز کشتیاں نقب لگاتیں اور کبھی

کبھار کوئی جنگی جہاز گولہ باری کے شق کرنے سے بھی نہ چوکتا لیکن پتہ نہ چلتا کہ حملہ آور کون ہیں۔ عدم مداخلت کانفرنس کی قراردادوں کی رو سے کسی مشکوک جہاز سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی اجازت نہ تھی بلکہ اس کی اطلاع کانفرنس کو دینا پڑتی تھی۔ فرانس اور برطانیہ اپنے جہازوں کو خطرہ میں دیکھ کر کس طرح خاموش رہ سکتے تھے، بحر روم ان دونوں سلطنتوں کے لئے شہ رگ کا حکم رکھتا ہے، بھلا یہ ممکن تھا کہ بحری قزاقی کی روک کا معاملہ فوراً ہاتھ میں نہ لیا جاتا۔ چنانچہ ایک کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا۔ بارہ سلطنتوں کے نام دعوت نامے جاری کئے گئے، اور سوئٹزرلینڈ کے شہر نیون میں کانفرنس کا اجلاس ہوا۔

کانفرنس کا انتظام ہو رہا تھا کہ روس کے جہاز کے ساتھ اوپر والا واقعہ پیش آیا۔ روس نے اٹلی کو اس جرم کا ذمہ دار ٹھہرایا، اٹلی نے تردید کی روس نے اس تردید سے مطمئن ہونے کی بجائے اور زیادہ زور شور سے الزام لگایا بس پھر کیا تھا، اٹلی روٹھ گیا۔ جرمنی نے بھی اپنے حلیف کا ساتھ دیا۔ کانفرنس ہوئی لیکن نہ اٹلی شریک ہوا اور نہ جرمنی نے حصہ لیا۔ کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ اسپین کے ساحل کی نگرانی چھوڑ کر عین سمندر کے راستوں کی دیکھ بھال کی جائے۔ جنگی جہازوں کو اس امر کی اجازت دی گئی کہ وہ حملہ کا جواب حملہ سے دیں اور بحری قزاقوں سے کوئی بھی رعایت ملحوظ نہ رکھیں۔ اٹلی شریک نہ تھا، فرانس اور برطانیہ نے نگرانی کا تمام بار خود اپنے اوپر لے لیا۔ اور یہ طے کیا کہ اگر اٹلی شریک ہونا چاہے تو اس کے لئے دروازہ کھلا ہے۔

اب اٹلی سے نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہے، اور معاملہ یہاں تک آ کر رُک گیا ہے کہ اٹلی نگرانی کے کام میں مساوات کا طالب ہے۔ مسولینی کا کہنا یہ ہے کہ بحرِ روم اٹلی کا سمندر ہے، اور اگر اس میں ہمیں برابر کا شریک نہ مانا گیا تو ہم کسی نگرانی کے لئے تیار نہیں ہوں گے۔ دونوں طرف سے "الصلح خیر" کے دانشمندانہ اصول پر عمل ہو رہا ہے، امید ہے ایک دو دن تک آپس میں سمجھوتہ ہو ہی جائے گا۔ لیکن یہ واضح ہے کہ بحر روم سے برطانوی تسلط کا خاتمہ ہو گیا۔ اب یا تو اٹلی کو دبا کر پھر اسے قایم کیا جائے، یا اس سے مل کر صلح و آشتی سے کام نکالا جائے۔

ان دنوں مسولینی سیاست کی بساط پر نئی نئی چالیں چل رہا ہے، کچھ عرصہ ہوا برطانیہ کے وزیراعظم سے دوستانہ خط وکتابت شروع ہوئی، فریقین نے قدیم دوستی کا ذکر خیر کیا، موجودہ بدگمانیوں پر افسوس کا اظہار ہوا اور آئندہ کے لئے دوست بن کر رہنے کے وعدے ہوئے، اس پر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ یہ نیوں کانفرنس کا جھگڑا ہو گیا۔ تعلقات پھر کشیدہ ہونے لگے لیکن اب فرانس بیچ میں پڑ گیا ہے۔ آج (۲۴ ستمبر) کی اطلاع ہے کہ فرانس اور اٹلی کے نمائندوں میں جنیوا کے مقام پر گفتگو ہوئی جس میں تصفیہ طلب باتوں پر دل کھول کر اظہار خیال کیا گیا، امید ہے نیوں کانفرنس کے جھگڑے کو چکانے کے لئے عنقریب پیرس میں جو اجتماع ہوگا اس میں سب باتیں بحسن و خوبی طے ہو جائیں گی،

اٹلی ادھر تو برطانیہ اور فرانس سے صلح صفائی کی باتیں کر رہا ہے اور ادھر مسولینی اور ہٹلر، ملاقات کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں، مسولینی سیاسی شطرنج کی بازی میں ایک مہرہ پر سب کچھ نہیں لگانا چاہتا، جرمنی سے تعلقات بڑھاتا ہی تو صرف اپنی قیمت پر فرانس اور برطانیہ سے زیادہ سے زیادہ بولی بلوانے کے لئے اور اب اگر ہٹلر سے ملنے جا رہا ہے تو فرانس اور برطانیہ سے عہد محبت استوار کرنے کے بعد تاکہ ہٹلر دوستی کا مول زیادہ پیش کر سکے، الغرض یورپ کی موجودہ سیاسیات میں نہ دوستی کے معنی دوستی ہیں اور نہ دشمنی سے یہ خیال ہوتا ہی کہ اب دوستی کبھی نہ ہوگی، برسات کی ہوائیں اتنی جلد اپنا رخ نہ بدلتی ہوں گی جس طرح یورپ کی موجودہ سیاسیات بدل رہی ہیں۔ (م۔ س)

عراق

قارئین نے ستمبر کے پرچہ میں کرنل بکر صدقی کے افسوسناک قتل کی خبر پڑھلی ہوگی، مرحوم عراقی افواج کے سپہ سالار تھے اور گذشتہ برس کے فوجی انقلاب کے بانی مبانی۔ عراق کے نوجوان طبقے مرحوم کے بہت گرویدہ تھے اگست ۱۹۳۳ء میں جب آشوریوں نے جو عراق کے قدیم ترین باشندوں کا ایک بچا کھچا عیسائی فرقہ تھا اور برطانیہ نے خاص طور پر اس کی پشت پناہی کی تھی

موصل کے نواح میں بغاوت کی، تو یہی شخص تھا جس نے نہایت سختی سے اس بغاوت کو دبایا، اور تلوار سے اشوری جیسے نازک مسئلہ کا ایک دو ہفتہ میں فیصلہ کر دیا، بعد میں جمعیت الاقوام اور برطانی حلقوں میں کرنل موصوف کے ظلم پر بہت کچھ کہا سنا گیا لیکن اس میں شک نہیں کہ صدقی بکر نے ہمیشہ کے لئے اشوریوں کے فتنہ سے عراق کو نجات دلا دی، کہتے ہیں کہ برطانی سامراج نے عراق کی اس اقلیت کو نہایت لاڈ پیار سے پروان چڑھایا تھا اور برطانی سیاست والوں کا خیال تھا کہ فلسطین کے یہودیوں کی طرح اشوری بھی برطانی استعمار کا آلہ کار بن سکیں گے۔

اشوری فتنہ کو دبانے کے بعد کرنل موصوف بغداد لوٹے تو ان کا شاہانہ استقبال ہوا، مرحوم فیصل گو زندہ تھے لیکن صحت کی بحالی کے لئے یورپ گئے ہوئے تھے، ان کے قائم مقام شاہ غازی نے نوجوان قائد کی بڑی آؤ بھگت کی، یہ طلوع تھا بکر صدقی کے آفتاب اقبال کا،

عراق کا مسئلہ بڑی الجھنوں میں پڑا ہوا ہے۔ یہاں کے عرب قبائل اسلام کے دور اول ہی سے انقلاب آفرینی میں شہرت حاصل کر چکے ہیں کہا جاتا ہے کہ ترکوں کو عراق پر تسلط قائم رکھنے کے لئے ہر سال دس ہزار ترک عربوں کی خون آشامی کی نذر کرنے پڑتے تھے، انگریز آئے تو انھوں نے بھی اپنے آپ کو عراقیوں کے مقابلہ میں عاجز پایا، ناچار مرحوم فیصل کو عراق کے تخت پر بٹھایا گیا، اور برطانی توپیں اور طیارے اُن کے محافظ بنے لیکن فیصل سمجھ دار اور عرب فطرت کے صحیح نباض تھے، اُنھوں نے برطانی سامراج کی بجائے اہل عراق کے دلوں میں پناہ ڈھونڈی اور برسوں کی ان تھک کوششوں کے بعد پردیسی توپوں اور طیاروں سے بے نیاز ہو گئے۔

الغرض عراق میں بادشاہت کو ثبات حاصل ہو گیا چنانچہ فیصل کا انتقال ہوا تو عراقیوں نے شاہ غازی کو ہاتھوں ہاتھ لیا، بلکہ باپ سے زیادہ بیٹے سے محبت کرنے لگے، اِدھر سے فراغت ہوئی تو اب آپس میں جماعتی کشمکش کا سلسلہ شروع ہوا۔

ترکوں کے عہد حکومت میں بھی ایرانی سلطنت نے عراق کو زیر اثر کرنے میں سالہا سال تک کوششیں کی تھیں، کربلائے معلیٰ، نجف اشرف اور دوسری مقدس زیارت گاہوں کی وجہ سے

یہاں ایرانی اثر یوں بھی زیادہ ہے۔ عراق کی تقریباً آدھی آبادی شیعہ ہے اور ان کی ہمدردی ایران کے ساتھ ہے۔ شمالی عراق میں شیعیت کا اثر کم ہے اور یہ لوگ ترکوں کو اچھی نظر سے دیکھتے ہیں بلکہ ان میں سے ایک جماعت ایسی بھی تھی اور اب تک ہے جو ترکوں کے ساتھ مدغم ہونے کو تیار ہے، ان کے بعد فیصل کے ساتھیوں یعنی پرانے سیاست دانوں کی ایک جماعت ہے جو اتحاد عرب کے حامی تھے، اور اسی اتحاد عرب کے نام سے انھوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا، اس ٹولی کے سردار خود فیصل تھے اور نوری، ہاشمی، عسکری اس تحریک کے روح رواں تھے، یہ سب لوگ فیصل کی زیر قیادت ترکوں سے لڑ چکے ہیں، گویا عراق میں تین سیاسی گروہ ہیں، ایک ایران دوست، ایک ترک دوست، ایک اتحاد عرب کا حامی۔

سنہ ۱۹۲۰ء کے ہنگاموں نے ایک اور نسل کو پیدا کیا یہ متوسط طبقوں کے نوجوان تھے، عراق کی سخت گرم اور سخت سرد آب و ہوا کا اثر باشندوں کی طبیعتوں پر پہلے ہی کیا کم تھا کہ بیسویں صدی کی انقلابی تحریکوں نے ان کے جذبات کو بالکل بے عنان کر دیا، عراق میں مزدوروں کی بہت بڑی قوت ہے، فقر و فاقہ بھی کچھ کم نہیں، روسی افکار کا انقلابی سیلاب عراق کو متاثر کئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا چنانچہ یہاں بھی نوجوانوں کی بے چینی طبیعیں بغاوت پر آمادہ ہونے لگیں، یہ بے چینی کبھی اشتراکیت کا نام پاتی، کبھی اسے اتحاد عرب کے مخالفین کا نام دیا جاتا، کبھی اسے ترکی کی حمایت کا اثر کہا جاتا! بہرحال یہ بغاوت تھی نوجوانوں کی بوڑھے مدبروں کے خلاف، نوجوان یہ کہتے ہیں کہ اتحاد عرب محض ایک ڈھونگ ہے جس کو رچا کر یہ مدبر اپنی بے تدبیری اور بے عملی کے عیبوں کو چھپاتے ہیں، عراق کی داخلی مشکلات اتنی اہم ہیں کہ اس وقت ہمیں تمام قوتیں ان پر صرف کرنی چاہئیں، مزدور تباہ حال ہیں، کسان بھوکا مرتا ہے، تعلیم یافتہ نوجوان بے کار ہیں، ضرورت ہے کہ اس وقت عراق کا ہر باشندہ صرف عراقی ہو، اتحاد عرب کے خواب میں اپنا وقت نہ گنوائے، اور ملک کی اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی حالت کو سدھارنے میں منہمک ہو۔

پرانے سیاست دانوں اور نئے رہنماؤں میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر جلدی کو شیطان

کا کام بتلاتے ہیں لیکن نوجوان ہر کام کو آناً فاناً کرنے کے قائل ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ دونوں جماعتوں میں تصادم ہوا پچھلے سال بکر صدقی (جوان نوجوان عنصر کے قائد تھے) کو موقعہ ملا تو اس نے فوج کے ذریعہ ہاشمی (جو اتحاد عرب کے حامی تھے) کی وزارت ختم کر دی، مخالف گو بظاہر سہم گئے لیکن اندر ہی اندر ان کی سازشیں کام کر رہی تھیں، آخر کار فوج کے ایک سپاہی کے ہاتھ سے بکر صدقی موت کے گھاٹ اترے۔ جب وزارت کا ستون گر گیا تو پھر سید سلیمان حکمت کی وزارت کیسے باقی رہتی، چنانچہ وزارت نے استعفٰی دے دیا، اور اعتدال پسند فریق برسر حکومت آگیا، جو نہ بالکل نوجوانوں کا ہمنوا تھا نہ اتحادِ عرب والی جماعت کا ساتھی

مصر

شاہ فاروق کی تخت نشینی کے ہنگاموں سے ابھی فرصت نہ ملی تھی کہ وفدی جماعت کے آپس کے اختلافات نے مصریوں کی ہنگامہ پسند طبیعت کو نیا مشغلہ فراہم کر دیا۔ خدا کے فضل سے مصر میں سیاسی جماعتوں کی پہلے بھی کمی نہ تھی، وفد کو چھوڑ کر اس وقت چار پارٹیاں اور ہیں، تعجب یہ ہے کہ سب جماعتوں کا مقصد اور لائحہ عمل تقریباً ایک ہی ہے، اگر یہ ممکن ہوتا کہ کسی سیاسی جماعت کے بیک وقت ایک کی بجائے تین تین چار چار صدر ہوتے تو آج مصر میں صرف ایک ہی پارٹی نظر آتی،

جنگ عظیم سے پہلے مصر میں حزب الوطن کا زور تھا، ۱۹۲۰ء کی تحریک میں سعد زغلول کی وفد جماعت بنی، آرام پسند اور جاہ پرست پاشاؤں کو سعد کے استبداد سے شکایت ہوئی تو احرار وجود میں آئے، احرار زمانہ کی بڑھتی ہوئی رو کا ساتھ دینے پر مجبور ہوئے تو مرحوم بادشاہ نے بڑے بڑے خاندانوں کو اتحاد پارٹی کے نام سے اپنے تخت کے گرد جمع کیا۔ صدقی پاشا کو انگریزوں نے شہ دی اور وزارت عظمٰی کی مسند پر بٹھایا تو اس نے شعب کے نام سے اپنی جماعت بنالی، حزب الوطن پرانے مجاہدوں کی جماعت ہے جو اپنی جوانی جان توڑ کوششوں میں گذار کر زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے، وفد کے علاوہ باقی جماعتیں نام ہیں ایک صاحب القاب پاشا اور اس کے چند حامیوں کا،

بے شک وفد ایک فعال جماعت ہے مصریوں کی غالب اکثریت اس جماعت کے ساتھ ہے اور آج کل حکومت بھی اسی پارٹی کی ہے، وفد کی ایکجہتی اور جماعت بندی کی بنیاد "سعد پرستی" ہے، اہل مصر کو سعد سے محبت نہیں بلکہ عشق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وفد محض سعدی ہونے کی وجہ سے ملک میں استنے ہر دلعزیز ہیں، پارٹی کے لیڈر نحاس پاشا میں لاکھ عیب سہی لیکن آخر وہ "خلیفہ سعد" ہے، وفدی لیڈر بھی سعد کی اس "خلافت" سے خوب فائدے اٹھاتے ہیں اور اپنے مخالفوں کا منہ بند کرنے کے لئے مرحوم لیڈر کا ذکر خیر کافی سمجھتے ہیں، وفد میں خود اختلافات موجود تھے لیکن انگریزوں کی مخالفت نے ان اختلافات کو دبائے رکھا، اب برطانی مصری معاہدہ ہو گیا اور دبے ہوئے اختلافات کو ابھرنے کا موقعہ ملا،

مصر کی تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وفد کے آپس کے اختلافات نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے، نقراشی پاشا جو بیگم سعد زغلول کے بھانجے ہیں اور پارٹی کے زبردست ارکان میں ان کا شمار ہوتا ہے نحاس سے بگڑ گئے، باتوں سے معاملہ ہنگاموں تک پہنچا اور دونوں فریقوں میں آپس میں خوب چلی ظاہر ہے نقراشی آسانی سے ہار نہیں مانیں گے، اور ان کی مخالفت سے وفدی جماعت بھی اپنے آپ کو سنبھال نہ سکے گی،

ستمبر کے "جامعہ" میں ازھر اور وفد کی رقابت کا ذکر آ چکا ہے، تخت نشینی کے مراسم کے سلسلہ میں یہ لکھا گیا تھا کہ بادشاہ نے عشاء کی نماز ازھر کی جامع مسجد میں ادا کی، یہ اطلاع ٹھیک نہ تھی، وفد کا شروع سے یہ اصرار تھا کہ تخت نشینی کے سلسلہ میں کوئی رسم ازھر میں نہ ہونے پائے، بیان کیا جاتا ہے کہ وفد کی ازھر سے برافروختگی بڑھتی جا رہی ہے، کچھ بعید نہیں کہ وفد کے رہنما مصطفےٰ کمال کو اپنا مشعل راہ بنانے کی کوشش کریں اور ملک کے دینی طبقوں کی قوت کو توڑ دیں لیکن بادشاہ کا وجود ان جھگڑوں کو نمٹانے میں بہت حد تک مفید رہے گا، بادشاہ کی ہر دلعزیزی ہمدردی اور مساوات پسندی نحاس پاشا کو غالباً مصر کا مصطفےٰ کمال بننے کا موقعہ نہ دیگی۔

ہم نے غالباً مئی کے پرچے میں ذکر کیا تھا کہ دولت مصر افغانستان میں سفارت خانہ قائم کرنے پر غور کر رہی ہے، اس عرصہ میں یہ مسئلہ نہ صرف طے ہو گیا بلکہ مصر کا پہلا سفیر افغانستان پہنچ بھی گیا، اس سلسلہ میں یہ تذکرہ نامناسب نہ ہوگا کہ افغان حکومت مدتوں سے ان تعلقات کے قیام کی کوشش کر رہی تھی۔ دورِ امانی میں محمود طرزی وزیر خارجہ تھے لیکن مرحوم کی توجہ زیادہ تر مغربی ممالک پر تھی، انقلاب کے بعد افغانستان میں دفتر خارجہ کی سیاسی حکمت عملی کا مسئلہ زیادہ اہم ہو گیا اور حسن اتفاق سے یہ منصب علامہ فیض محمد خاں کو تفویض ہوا، جو دنیائے اسلام اور ممالک شرقیہ کی سیاست میں فہم خصوصی کے مالک ہیں، موصوف نے وزارت کا قلمدان ہاتھ میں لیتے ہی مشرقی دول کی طرف توجہ کی تھی ترکی تعلقات کو مزید تقویت دی، ایران کے روابط کو مستحکم کیا، اور حجاز میں زمانہ حج میں شاہی نمائندوں کو بھیجا اور مصر میں ایک مستقل سفارت خانہ قائم کیا، اور بجا طور پر توقع قائم کی کہ اب مصر بھی اس کے جواب میں عملی قدم اٹھائے گا، لیکن مصری وزارتیں انگلستان کی سیاست کے ساتھ داخلی پیچیدگیوں میں اس بری طرح الجھی رہیں کہ افغان دوستی کی اہمیت محسوس نہ کر سکیں اور سالہا سال کی کوششوں کے باوجود بھی افغانستان کو اثبات میں جواب نہیں ملا۔ مایوس ہو کر مصر کا سفارت خانہ توڑ دیا گیا اور ملا صاحب شور بازار کو جو مصر میں سفیر کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ واپس بلا لیا گیا۔ حتیٰ کہ مصر میں وفد پارٹی برسر اقتدار آئی اور نحاس پاشا وزیر اعظم ہوئے تو افغانستان و مصر کی سیاست کا مسئلہ دوبارہ زیر بحث آیا ادھر افغان وزارت خارجہ نے آقائی مجددی (صاحب شور بازار) کو از سر نو گفتگو کرنے کے لئے مصر بھیجا صدر اعظم نے ایک کمیٹی مقرر کی اور سفارتی تعلقات پر اس کی رائے مانگی۔ کمیٹی نے لکھا "مصر ایک ایسی یقینی منزل تک پہنچ گیا ہے جہاں یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ دنیا کی ترقی، صلح، امن عام اور بنی نوع انسان کی فلاح و صلاح کے لئے دنیا کی حکومتوں سے اپنے تعلقات جدید اساس سے قائم کرے۔" یہ

حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ مغربی دول سے رابطہ رکھنے کے ساتھ ساتھ اس امر کی اہمیت محسوس کرے کہ مشرقی اقوام اور دول مشرق سے مصر کے سفراء کے تعلق کا قیام، سفراء کا تبادلہ

قونصلوں کا تقرر بھی ضروری ہے۔ یہ تمام امور ایک ایسے وسیع مطمح نظر کے ماتحت ہونے چاہئیں جس کے ساتھ سیاسی مصلحتیں بھی وابستہ ہوں اور تمدنی، علمی اور اقتصادی مصالح بھی۔"

ہز اکسلنسی عبدالرحمٰن عزام سفیر مصر متعینہ افغانستان جو اواخر اگست ہندوستان ہوتے ہوئے کابل گئے ہیں، مصر و ترکی کی جدید تاریخ کے ممتاز آدمیوں میں ہیں، اور زمانہ طالب علمی سے ہی قومی تحریکوں میں حصہ لیتے رہے ہیں، اسٹوڈنٹ کانفرنس جنیوا (۱۹۱۴ء) میں موصوف لندن کے مصری طلبا کے نمایندے منتخب ہوئے تھے۔ اسی سال اگست میں جب جنگ چھڑی تو کانفرنس کے غیر معمولی اجلاس نے طے کیا کہ عبدالرحمٰن عزام کو جلد سے جلد مصر پہنچ کر حریت وطن کی کوششوں میں شریک ہو جانا چاہئے۔

عبدالرحمٰن عزام مصر آکر جہاد آزادی میں شریک ہو گئے، برطانیہ کے صاحبان اختیار نے ان کے خلاف وارنٹ جاری کر دیا۔ موصوف کو اس کا علم ہوا تو وہ طرابلس جا کر مشہور مجاہد شیخ سید احمد سنوسی کی فوج میں شامل ہو گئے، اور اس کے بعد قسطنطنیہ، برلن اور طرابلس میں رہ کر ترکی کی خاموش مگر نہایت قیمتی خدمات انجام دیتے رہے، جنگ عظیم ختم ہو گئی، طرابلس پر اطالیہ نے قبضہ کر لیا لیکن عبدالرحمٰن عزام کی خدمات جاری رہیں اور وہ سید عمر مختار کے ساتھ سات سال تک اطالیہ سے برسر پیکار رہے۔

۱۹۲۳ء میں جب سنا کہ مصر میں نئے دستور کا اجرا ہو رہا ہے وہ اپنے وطن واپس آکر سعد زاغلول پاشا کی جماعت میں شامل ہوئے، اور آپ نے پارلیمنٹ کے اندر اور باہر ملک کی بہت سی خدمات انجام دیں۔

عبدالرحمٰن عزام کو ہندوستان کی تحریک آزادی سے بڑی دلچسپی ہے اور بہت سے قومی رہنماؤں سے آپ کے دوستانہ اور عقیدت مندانہ مراسم رہے ہیں، بالخصوص مولانا محمد علی مرحوم سے۔ مشرقی قوموں کے اتحاد اور دنیا کے عام امن و دوستی کی حمایت آپ کا خاص مشغلہ ہے خدا کرے مصر و افغانستان کے یہ تعلقات ہز اکسلنسی عزام کی دردمندی و فراست سے ہمیشہ استوار رہیں اور دونوں کے لئے مبارک ثابت ہوں۔

صوبجاتی اسمبلیوں کی زبان

موجودہ دستور میں جہاں برطانوی حقوق اور اثرات کے تحفظ کی اور تدبیریں کی گئی ہیں وہاں انگریزی زبان کی بقا کے لئے یہ قاعدہ بنایا گیا ہے کہ صوبجاتی اسمبلیوں میں صرف انھیں لوگوں کو اپنی مادری زبان بولنے کی اجازت ہوگی جو انگریزی نہ جانتے ہوں۔ چنانچہ اسی دفعہ کی تحت میں بنگال اسمبلی کے صدر نے وہاں کے وزیراعظم فضل الحق صاحب کو بنگالی میں تقریر کرنے کی اجازت نہیں دی۔ دیکھنے میں تو یہ بات کچھ بڑی نہیں معلوم ہوتی، لیکن اصل میں قومی زبان کی عزت قومی جھنڈے کے احترام سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ قومی جھنڈے کو جس اتحاد کی علامت ہم بنانا چاہتے ہیں وہ بڑی حد تک اس زبان کے مسئلے کی بدولت ایک حسرت بن کر رہ جاتا ہے، اور جب تک ہماری سرکاری زبان انگریزی ہے، اس وقت تک سمجھئے ایک اردو ہندی ہندوستانی کا تصفیہ ہی نہیں بلکہ ہندو مسلم کا ملاپ اور مختلف طبقوں کا ربط ضبط ملتوی ہوتا اور مشکل بنتا رہے گا۔

یو۔پی۔ میں صدر اسمبلی پرشوتم داس ٹنڈن صاحب نے حکم دیدیا ہے کہ مجلس کی ساری کارروائی اور تقریروں کی رپورٹ اردو ہندی دونوں میں چھاپی جائے۔ یہ تجویز بے شک بہت اچھی ہے، لیکن اس سے کام نہیں بنتا، بات جیسے بنی رہے۔ انگریزی کی شرط بہت سے لوگوں کی جو شاید بہت مفید مشورے دے سکتے زبان بند رکھے گی، جو لوگ تقریریں کریں گے بھی انھیں اپنی بات پوری پوری کہنے میں دشواری ہوگی، اور ان لوگوں کی تقریریں جو اچھی انگریزی جانتے ہیں جتنا کہ چاہئے اثر نہیں کریں گی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جب تک موجودہ دستور کی حرف بہ حرف پیروی ہوتی رہے گی ہماری اپنی زبان کی اصطلاحوں کو رواج پانے کا پورا موقع نہ ملے گا۔

صوبجاتی حکومتوں کے قدم ذرا اور جم جائیں اور کام کا بوجھ ذرا ہلکا ہو جائے تو انھیں چاہئے کہ اس مسئلے کو اٹھائیں اور سب مل کر یا تو دستور کی اس دفعہ کو منسوخ کرائیں یا اس کی خلاف ورزی کی کوئی

تدبیر نکالیں۔ سول سروس کی تنخواہوں سے جو خسارہ ہوتا ہے اسے پورا کرنا آسان ہے، صوبجاتی زبانوں اور ہندستانی کے اس طرح پس پشت ڈال دئے جانے اور قومی نمائندوں کے منہ میں انگریزی کی لگام چڑھا دینے سے جو نقصان ہو رہا ہے اس سے بچنے کی بس ایک ہی تدبیر ہے ـــــ خلاف ورزی۔

(م-م)

=

تعلیمی دُنیا

(محمد عبدالغفور صاحب۔ ایم۔اے۔ علیگ)

۲۰ ستمبر کو قصر مطابا غیچہ میں ترکی تہذیب و تاریخ کی ایک کانفرنس منعقد ہونے والی ہے جس کے متعلق وزیر تعلیم ترکیہ نے وسیع پیمانہ پر تیاریاں شروع کر دی ہیں۔ اس کانفرنس کی غرض یہ ہے کہ ترکی تہذیب و تمدن نے جو اثر تاریخ عالم پر ڈالا ہے اس کا بطور ایک زندہ حقیقت کے اظہار کیا جائے۔ دو ہفتے تک ثانوی مدارس کے اساتذہ مختلف علمی مضامین پر تقریریں کریں گے۔ اس موتمر میں یورپ بھر کے علماء آثار، مورخین اور مشرقی علوم کے اساتذہ شرکت کریں گے۔ چار مستشرقین نے اطلاع دی ہے کہ وہ تاریخی واقعات سے ثابت کریں گے کہ گوٹن برگ (یورپ) کے سب سے پہلے چھاپہ خانہ سے پہلے ترکوں نے چھاپہ کا استعمال شروع کر دیا تھا۔

ٹامس مسارک سابق صدر جمہوریہ چیکوسلوویکیا کی وفات سے نہ صرف یورپ کے جمہوریت پسند اور بین الاقوامی اخوت کے علمبرداروں کو ہی سخت صدمہ پہنچا بلکہ تعلیمی دنیا سے بھی ایک قابل محقق اور ادیب اٹھ گیا۔ مسارک ان معدودے چند ہستیوں میں سے تھے جو پریذیڈنٹ ولسن کی طرح معلمی کی کرسی چھوڑ کر بساطِ سیاست کے صدر نشین بن گئے۔ اوائل عمر میں وہ نجی طور پر معلمی کرتے رہے۔ پھر یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد دی آنا یونیورسٹی میں لکچرر مقرر ہوگئے۔ بعدہ اپنے وطن پراگ میں فلسفہ کے پروفیسر ہوگئے۔ جنگ عظیم کے دوران میں ملک سے جلاوطن ہو کر انھوں نے یورپ میں چک (Zchec) قوم کی آزادی کے پرچار کا بیڑا اٹھالیا اسی اثناء میں وہ کنگز کالج لندن میں لکچرر ہوگئے اور وہاں انھوں نے لندن اسکول سلاوُ (Slav) اسٹڈیز کی بنیاد رکھی جس کے ذریعہ سے انگلستان کے علمی حلقوں کو پہلی پہل

مشرقی یورپ کی چھوٹی اقوام کے تہذیب و تمدن۔ معاشرت اور زبان سے روشناس کرایا گیا۔
یہ اسکول آج بھی سرگرمی سے اپنا ادبی اور علمی فرض ادا کر رہا ہے اور علمی دنیا کے لئے یہ ان کی سب سے شاندار خدمت تھی۔

جامعہ ازہر نے جامعہ نجف اشرف کے طلبار کی ایک جماعت کو دعوت دی ہے کہ وہ جامعہ ازہر میں داخل ہو کر اسلامی دنیا کی سب سے پرانی تعلیم گاہ سے استفادہ حاصل کریں۔ جامعہ ازہر نے ایسی دعوت حال میں ہی چینی طلبار کو دی تھی۔ اسلامی برادری کی بنیادوں کو استوار کرنے کے واسطے اس قسم کے تبادلہ سے بہتر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ جامعہ نجف نے اس دعوت کو شکریہ سے قبول کر لیا ہے اور عنقریب طلبار کا ایک گروہ مصر روانہ ہو جائے گا۔ اس ضمن میں یہ امر باعث دلچسپی ہے کہ شیعہ اصحاب کا شاید یہ سب سے پہلا گروہ ہے جو حصول تعلیم کی غرض سے جامعہ ازہر میں داخلہ لے گا۔

پروفیسر کے۔ ٹی شاہ نے بمبئی یونیورسٹی کی سینٹ میں تجویز پیش کی ہے کہ مختلف تمدنی علاقوں کی تعلیمی اور کلچرل ضروریات کو پورا کرنے کے لئے پونا۔ کرناٹک، سندھ میں علیحدہ یونیورسٹیاں قائم کی جائیں۔ مگر اس تجویز کی بعض اصحاب کی طرف سے شدید مخالفت کی گئی۔ چند تو مالی وجوہات کی بنا پر مخالف تھے۔ بعض کا خیال تھا کہ اس قسم کی تمدنی تعلیم ہندوستانی اتحاد کے منافی ثابت ہوگی مہاراشٹر یونیورسٹی کی اسکیم کے سلسلے میں ایک وفد وزیر اعظم سے ملاقات کر چکا ہے۔ مسٹر کھیر نے ہمدردانہ غور فرمانے کا وعدہ کیا۔

سر مرزا اسمٰعیل دیوان میسور نے اس ہندوستانی وفد کی قیادت کی جو مشرق بعید کی دورل ہائیجین کانفرنس میں شرکت کی غرض سے باندیونگ (جاوا) گیا تھا۔ اک دعوت کے موقعہ پر تقریر

کرتے ہوئے مرزا اسمٰعیل نے جاوا اور ہندوستان کے قدیم تاریخی تعلقات کا تذکرہ کیا جن کے اثرات اب تک وہاں کی سماجی اور مذہبی زندگی میں نظر آتے ہیں بالخصوص حق اداکاری موسیقی اور رقص جیسے فنون لطیفہ میں یہ اثرات زیادہ نمایاں ہیں بالخصوص فن موسیقی کی قدیم روایات تو محض مسلمان مغنیین کی وجہ سے زندہ رہ گئیں۔

وزیر تعلیم پنجاب نے ایک مضمون کے ضمن میں تعلیمی لائحہ عمل پر مفصلہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے حکومت کا مقصد نئے مدارس یا زیادہ طلبا ر کے داخلے کی بجائے ابتدائی تعلیم کی اصلاح اور ترقی ہے اس مقصد کے لئے پنجاب کے جبریہ ابتدائی تعلیم کے قانون میں مفصلہ ذیل تبدیلیاں کی جائینگی۔ (۱) ابتدائی تعلیم کی مدت چار سال سے پانچ بلکہ چھ کردی جائے گی۔ (۲) لازمی تعلیم کے لئے میعاد جو چھ سے گیارہ سال تھی اب چھ سے بارہ سال تک ہوگی (۳) حسب ضرورت لڑکیوں کے لئے بھی تعلیم لازمی قرار دی جائے گی (۴) اگر ممکن ہوا تو ابتدائی تعلیم سے اوپر کے درجوں میں تعلیم لازمی قرار دی جائے گی (۵) لازمی تعلیم کا نفاذ بجائے مقامی کمیٹیوں کے صوبائی حکومت کی طرف سے ہوا کرے گا۔ (۶) حسب ضرورت تعلیمی ٹیکس بھی عاید کیا جا سکے گا (۷) جبری تعلیم کی نگرانی اور نفاذ کے لئے خاص انتظام کیا جائے گا۔

پرائمری اساتذہ کی لیاقت ریفرشر کورس اور بہتر تربیت سے بڑھائی جائے گی۔ مدت تربیت ایک سال سے دو سال اور شرائط داخلہ میں تعلیمی اسناد کی شرط کڑی کردی جائے گی۔ معائنہ سخت ہوا کرے گا۔ ابتدائی مدارس میں لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ تعلیم پائیں گے۔

(لاوٹیکا) جزائر فجی میں منعقدہ ٹیچرز کانفرنس کے ساتویں سالانہ اجلاس نے جزائر کے ہندوستانی باشندوں کی تعلیم کے متعلق مفصلہ ذیل قراردادیں منظور کیں۔

نئے مرکزوں میں ہندوستانی طلبا ر کے لئے نئے اسکول کھولے جائیں اور ان کے لئے

مناسب تعلیمی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں ۔ نیوزی لینڈ یونیورسٹی کے امتحان داخلہ میں زبان ہندی کو اختیاری مضمون قرار دیا جائے ۔ جزائر فجی کے مدارس کا الحاق نیوزیلینڈ یونیورسٹی سے ہے ۔ موجودہ اسکولوں سے دو میل کے اندر رہنے والے چھ سال سے چودہ سال کی عمر کے بچوں کے لئے تعلیم لازمی قرار دی جائے ۔ چند تجاویز اساتذہ کی بہتری کے لئے بھی منظور کی گئیں

تعلیمی بورڈ انگلستان کی طرف سے حال میں ہی ایک رپورٹ ہوم ورک یعنی بچوں کو گھر کے لئے مدرسہ کا کام دینے کے مسئلہ پر شائع کی گئی ہے ۔ جس میں بارہ سال سے کم عمر کے بچوں کے لئے گھر کا کام نہ دینے کی سفارش کی گئی ہے ۔ شہری علاقوں کے مدارس کے لئے رپورٹ میں مفصلہ ذیل ہدایات دی گئی ہیں ۔

بچے ہفتے میں پانچ رات سے زیادہ آموختہ کی تیاری میں صرف نہ کریں بلکہ صرف چار رات ہو تو اور بھی بہتر ہے ہر شب چودہ سال تک کے بچوں کے لئے ایک گھنٹہ اور چودہ سے سولہ سال تک کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ سے زیادہ تیاری کے لئے صرف نہیں ہونا چاہیئے ۔
تحقیقات کے دوران میں پتہ چلا ہے کہ بعض بچوں کو دوہرا گھر کا کام کرنا پڑ جاتا ہے ۔ ایک تو اساتذہ کی طرف سے دیا جاتا ہے دوسرا والدین کی جانب سے ۔ سب سے افسوسناک امر یہ ہے کہ بعض کم عمر کے بچوں کے مدارس میں بھی گھر کے لئے کام دیا جاتا ہے جو سخت قابل اعتراض ہے ۔ رپورٹ میں گھر کے کام کی وجہ امتحانی تیاری اور اس کا خوف قرار دی گئی ہے ۔ بچوں میں دماغی اور ذہنی کمزوری اور بیماری کی وجہ ایک تو امتحان ہے اور دوسرا وہ بھاری کام جو ان کو اس سلسلے میں گھر کے لئے دیا جاتا ہے ۔ جہاں کہیں ایسے امتحان رکھے گئے ہیں جن کے لئے رٹنے والی تیاری کی ضرورت نہیں اور جو خاص طور پر بچے کی ذہانت کا جائزہ لگاتے ہیں نہ کہ اس کی قابلیت اور معلومات کا ۔ وہاں گھر کا کام بالکل دیا نہیں جاتا ۔
گھر پر زیادہ کام دینے سے ایک خطرہ یہ ہے کہ جو بچے دن تو اسکول میں اور رات گھر پر

تیاری میں گزار دیتے ہیں وہ ایسی فضا میں نشو و نما پاتے ہیں جو گرد و نواح کی سماجی زندگی سے بالکل بے تعلق
ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت دیلیز میں ملا ہے جہاں مدرسے کا کام طلبا کے وقت کا اتنا حصہ لے لیتا ہے
کہ انھیں مقامی ادب و تمدن۔ کلچر اور موسیقی میں دلچسپی لینے کا کوئی موقعہ ہی نہیں ملتا۔ نیز شہریت کے
لئے تعلیم و تربیت محض مدرسے کی چار دیواری کے اندر نہیں دی جاسکتی بلکہ اس کی عملی مشق مدرسے
سے باہر ہی ہوسکتی ہے۔

اگر گھر کے لئے کام دینا کم کر دیا گیا تو اس کے ساتھ ساتھ طریقۂ امتحان میں بھی ضروری تبدیلیاں
کر دینی ہوں گی۔

جاپان کے مدارس میں کچھ عرصے سے ریڈیو سٹ مہیا کرنے پر خاص توجہ مبذول کی جارہی
ہے۔ نصف سے زیادہ اسکولوں میں سٹ لگائے جاچکے ہیں اور ان کی تعداد دن بدن بڑھتی جارہی
ہے۔ ریڈیو کے روزانہ پروگرام کو مفید اور دلچسپ بنانے میں خاص طور پر سرگرمی کا اظہار کیا جارہا ہے۔
ابتدائی مدارس، مدارس بالغان اور کنڈر گارٹن اسکولوں کے لئے علحدہ پروگرام مرتب کئے جاتے
ہیں۔ ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ ریڈیو استاد کا معاون و مددگار ہونا چاہئے۔ اور پروگرام کی معلومات
اسکولی تعلیم سے متعلق ہو اور اسے مکمل کرنے والی ہو۔

ہر صبح جاپانی اسکولوں میں مدارس سے متعلق مضامین نشر کئے جاتے ہیں۔ ان کے عنوان
علم اخلاق۔ قومی زبان۔ تاریخ۔ جغرافیہ۔ سائنس۔ موسیقی وغیرہ بہت سے انواع پر مشتمل ہوتے
ہیں۔ نیز تمام طلبار کے لئے جسمانی ورزشیں باقاعدہ نشر کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سی عملی
ضرورت کی اور روزانہ کی کارآمد چیزوں پر تقریریں کی جاتی ہیں۔ سرکردہ اصحاب اور قائدین بچوں
کے لئے تقریریں کرتے ہیں تاکہ طلبا ان کی ذات، اوصاف اور ان کے اعلیٰ تخیل سے واقفیت حاصل
کرسکیں۔ ہر سال ان تقریروں کے موضوع پر لاکھوں رسالے چھپتے ہیں اور مدرسوں میں مفت
تقسیم ہوتے ہیں۔ ٹوکیو امپیریل یونیورسٹی کے زیر انتظام اسکول براڈ کاسٹنگ پر نفسیاتی تحقیقات

کا کام بھی ہو رہا ہے۔

انگلستان کے مدارس میں ریڈیو کے ذریعہ پیام رسانی کا کام بی۔ بی۔ سی کے زیر اہتمام بہت کامیابی سے چل رہا ہے۔ اور ہر ہفتہ کے بچوں کے پروگرام تعلیمی جرائد اور رسالوں میں باقاعدہ شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہندوستان میں تو ریڈیو سماجی اور سیاسی زندگی میں بھی نئی چیز ہے اور اسکول تو ابھی اس کے فیض سے محروم ہی ہیں۔

دلی اسٹیشن نے کچھ عرصہ سے بچوں کا ہفتہ وار پروگرام شروع کیا ہے مگر ابھی تک کوئی ایسا مستقل انتظام نہیں کیا جا سکا جس کے تحت میں مشاہیر تعلیم۔ قائدین ملت۔ مقبول و معروف مصنفین افسانہ نویس وغیرہ ملک کی نئی نسل کو حیات ملی کا پیام جدید پہنچا سکیں۔

تعلیمی دنیا میں اپنی مدد آپ:۔

امریکن طلبار اپنی مالی مشکلات کو دور کرنے کے لئے نئے طریقے ایجاد کرنے میں شہرۂ آفاق ہیں پرانے پیشے مثلاً بھٹوں میں کوئلہ ڈالنا۔ ہوٹلوں میں بطور خادم کام کرنا اب فرسودہ اور بے کار ہو چکے ہیں۔ اب تو کمانے کے لئے دلچسپ جدتیں کی جاتی ہیں۔ مثلاً بالٹی مور میں ایک ایف۔ اے کے طالب علم نے میری لینڈ یونیورسٹی کے طلبا کو صبح بیدار کرنے کی خدمت اپنے ذمے لے لی ہے۔ یہ طالب علم شام کے سات بجے سو کر صبح دو بجے اٹھتا ہے۔ اور دو گھنٹے مطالعہ کرتا ہے اس کے بعد طلبا کے کمروں کا گشت کرتا ہے۔ کھلی ہوئی کھڑکیاں بند کر دیتا ہے اور کمرے کا درجۂ حرارت اعتدال پر رکھنے کے لئے بھاپ کی نالیاں کھول دیتا ہے۔ اصل مشکل تو سات بجے صبح کو ہوتی ہے جب اسے بعض گہری نیند سونے والے حضرات کو بیدار کرنے کے لئے اچھی خاصی کشتی لڑنا پڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ طلبا کے بستر درست کرتا ہے جس کے لئے اسے فی بستر دس سنٹ (ایک ڈالر= سو سنٹ) ملتے ہیں۔ ٹیچرز کالج فلاڈلفیا کا ایک طالب علم اخبارات اور رسالوں کے لئے معمے ایجاد کرتا ہے۔ نیو جرسی کے زراعتی کالج کے پانچ طلبا انڈے بیچ کر کتابوں کا اور کھانے اور کپڑے کا

خرچ چلاتے ہیں۔ ہر ایک طالب علم کالج فارم کے مرغی خانے میں سو سے ڈیڑھ سو سفید لگ ہورن رکھتا ہے۔ اور گرد و نواح میں ہر ہفتے تقریباً چار سو سے پانچ سو انڈے بیچ لیتا ہے۔ اس طرح سے سال بھر میں ایک سو پچیس ڈالر یا اس سے کچھ زیادہ کما لیتا ہے۔ کالج کے انڈا مرغی کے محکمے کے افسر اعلیٰ نے ان طلبار کے کام کے متعلق بہت اعلیٰ رائے ظاہر کی ہے۔ اس کے خیال میں مطالعہ اور کمانے کی تجویز کو ملانے کی وجہ سے یہ طلبار انڈے بہت کفایت سے حاصل کر سکتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ ان کو تجارتی کاروبار کا بھی عملی تجربہ ہو جاتا ہے۔

اتھاکا میں دو عرب طلبار نے اپنے گزارے کے لئے ایک دلچسپ ادبی شغل اختیار کر لیا ہے۔ وہ کالج کے ایک پروفیسر کے لئے عربی کتابوں کا انگریزی میں ترجمہ کر دیتے ہیں اور معاوضہ میں رہنے کا کمرہ اور کھانا مفت ملتا ہے۔

چار روسی نوجوانوں نے ایک موسیقی پارٹی بنالی ہے اور دعوتوں اور دوسری تقریبوں پہ گا بجا کر اپنا گزارا چلا لیتے ہیں۔ غرض کہ قصابی اور آہن گری سے لے کر خندقیں کھودنے تک ہر قسم کا کام طلبا کرنے کو تیار ہیں۔

بیری کالج میں عورت اور مرد طلبار پارچہ بافی سے۔ لکڑی کا سامان تیاری کرکے اور زراعت سے گزارا چلاتے ہیں، گایوں کا دودھ دوہتے ہیں، گھوڑوں کے نعل لگاتے ہیں۔ جھاڑو اں بناتے ہیں۔ اس طریق سے تقریباً ۲۴۰ ڈالر سالانہ کما لیتے ہیں جو ان کے خرچ خوراک، رہنے سہنے، اور کتابوں کی خرید کے لئے کافی ہوتا ہے۔ اس مدرسے میں سولہ سال کی عمر سے لے کر پچاس سال کی عمر تک کے طالب علم موجود ہیں۔

امریکن طالب علم کو ہاتھ سے کام کرنے میں کوئی عار نہیں ہے۔ ایک ہندوستانی طالب علم لکھتا ہے کہ انھوں نے کولمبیا یونیورسٹی میں بہت سے ایسے طالب علم دیکھے جو اس سال تو کھانے کی میز پر خادم کا کام کرتے تھے اور دوسرے سال ہی کسی اور یونیورسٹی میں پروفیسر، ڈین یا چانسلر بن کر چلے گئے۔

ہندوستان میں کتابی تعلیم، سماجی پابندیوں اور عام اقتصادی گراوٹ کی وجہ سے اس قسم کے تجربات تعلیمی حلقوں میں نہیں کئے گئے ۔ البتہ بنارس یونیورسٹی نے اس سلسلے میں غریب طلبار کے لئے صنعتی اور دستی کام مہیا کر کے دوسرے اداروں کے لئے ایک مبارک مثال قائم کر دی ہے۔ بنارس میں نادار اور کم مایہ طلبار فرنیچر کی مرمت کرتے ہیں ۔ کمروں اور لکڑی کے سامان پر رنگ کرتے ہیں ۔ زمین کے ہموار کرنے میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ زراعتی اور انجنیرنگ کالج میں بطور مستری یا کسان کام کرتے ہیں اور کام کے تناسب سے اجرت پاتے ہیں ۔ ضرورت ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں جو نفرت ہاتھ کے کام سے پھیلی ہوئی ہے اس کا سد باب جلد سے جلد کر دیا جائے اس کی اہمیت سپرد کمیٹی نیز ان کارخانے داروں نے بھی تسلیم کی ہے جن پر ہندوستانی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلبار کو ملازم نہ رکھنے کا الزام لگایا جاتا ہے۔

بمبئی کونسل میں بجٹ پر مباحثہ کے دوران میں مسٹر کھیر (KHER) نے حکومت کی تعلیمی پالیسی کا اعلان ان الفاظ میں کیا " ہمارا مقصد ابتدائی تعلیم کی اصلاح اور معیار تعلیم کو بڑھانا ہے اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے حکومت اپنے اوپر زیادہ سے زیادہ ذمہ داری لینے سے بھی دریغ نہ کرے گی ۔ مفت اور لازمی تعلیم کی توسیع کے لئے حکومت رضا کارانہ خدمات حاصل کرنے کی کوشش کرے گی ۔ ریاضت جسمانی اس تعلیمی لائحہ عمل کا ضروری عنصر ہوگی۔ دستکاری اور صنعت و حرفت ہر اسکول کے نصاب میں شامل ہوں گے اور کوشش یہ کی جائیگی کہ طلبار اپنے آبائی پیشوں سے غیر متعلق نہ ہو جائیں "

رضا کارانہ خدمات کے سلسلے میں یہ امر باعث دلچسپی ہے کہ ایک کانگریسی وزیر تعلیم نے تجویز کی ہے کہ تمام میٹرک کے امیدواروں پر لازمی قرار دیا جائے کہ سند حاصل کرنے کے بعد ایک سال تک مفت تعلیم دیں یوپی میں حکومت کے پنشن خواروں کو بھی دیہات سدھار اور تعلیمی ترقی کے سلسلہ میں رضا کارانہ خدمات پیش کرنے کی ترغیب دی گئی ہے ۔

بہار میں ڈاکٹر محمود، وزیر تعلیم نے علمی تحقیقات اور تجسس کو ترقی دینے کے لئے عوام اور طبقہ زمینداران سے خاص طور پر اپیل کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے نادار اور قابل طلبار کے لئے نہ صرف حکومت کی طرف سے وظائف مہیا کرنے کا انتظام کیا ہے بلکہ صوبے کے امیر طبقے۔ تعلقہ دار۔ کارخانہ دار وکلار اور تجارت پیشہ اصحاب سے درخواست کی ہے کہ وہ اس مبارک کام میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں اور ایسے طلبا کی نقد رقم سے یا کھانے اور رہنے کی سہولتیں مہیا کر کے امداد کریں۔

پچھلے چند مہینوں میں مدراس کی حکومت کی تعلیمی پالیسی کے متعلق بہت غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مدراس گورنمنٹ نے ہندی زبان کو مدرسوں میں لازمی قرار دیا ہے، جس کا مقصد یہ ہے کہ اُردو زبان کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ مگر واقعہ اس کے خلاف ہے، حکومت مدراس ایک خالص ہندوستانی زبان کی ترویج کرنا چاہتی ہے۔ جو ہر دو رسم الخط میں لکھی جائیگی۔ طالب علموں کو اختیار ہو گا کہ وہ اپنے حسبِ خواہش جو رسم الخط چاہیں اختیار کریں۔
زبان کے سلسلے میں حکومتِ مدراس نے پنڈت جواہر لال جی اور جامعہ ملیہ سے مشورہ کیا ہے۔ اور ان کے مشورہ کے مطابق وہاں عنقریب کارروائی شروع ہو جائے گی۔

مہاتما گاندھی نے ہریجنوں میں ایسے مدارس کی تجویز پیش کر کے جو آپ اپنا خرچ اٹھا سکیں تعلیمی حلقوں میں خاصی ہلچل ڈال دی ہے۔ مہاتما جی کا خیال ہے کہ ہر اسکول کا طالب علم ایک سال کی صنعتی تربیت کے بعد ایک آنہ فی گھنٹہ کمانے کے قابل ہو جائے گا۔ ان کے خیال میں اگر صبح کا وقت کتابی تعلیم کے لئے وقف کر دیا جائے اور شام کا دستکاری کے لئے تو بچہ مہینہ بھر میں روزانہ چار گھنٹے کام کر کے ساڑھے چھ روپیہ کما سکے گا۔
اس تجویز سے بچہ نہ صرف محنت اور کام کی عزت کرنا سیکھے گا بلکہ دستکاری اس کے لئے ذہنی

اور دماغی ترقی کا باعث ہوگی۔ نصف یوم کے مدارس کا ایک یہ بھی فائدہ ہے کہ دوپہر کے بعد اساتذہ، مدرسے کی عمارت، اور سامان بالغوں کی تعلیم کے لئے بالکل مفت اور بغیر مزید اخراجات کے استعمال ہو سکتے ہیں۔

اس تجویز پر بعض تعلیمی حلقوں کی طرف سے شدید نکتہ چینی کی گئی ہے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ متمدن ممالک میں ایسی ہمہ گیر تعلیمی پالیسی کہیں بھی نہیں پائی جاتی بچوں پر اس نازک عمر میں کام کا اتنا بوجھ ان کو ہمیشہ کے لئے معطل اور ان کے تو ار کو مستقل نقصان پہنچا دے گا۔ لیکن بعض ماہرین سمجھتے ہیں کہ ہاتھ کے کام ہی سے بچہ کی صحیح ذہنی تربیت ممکن ہے۔

ہندوستان میں لازمی اور مفت تعلیم کا مسئلہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ تقریباً ہر صوبہ نے لازمی تعلیم ایکٹ رائج کر کے ابتدائی لازمی تعلیم کی ترویج کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ بالعموم یہ تعلیم مفت نہیں دی گئی۔ بہرحال عام طور پر ہر جگہ اور خاص طور پر دیہاتی حلقوں میں اس اسکیم کو بہت ناکامی ہوئی ہے اس کی وجہ صرف تعلیم سے غیر دلچسپی۔ والدین کی جہالت یا جبریہ قوانین کی عدم موجودگی نہیں بلکہ اس کا بڑا سبب اقتصادی مشکلات ہیں جو غریب کسان اور چھوٹے پیشہ ور کو سانس نہیں لینے دیتیں۔ اگر کسان کا لڑکا اس کو زراعتی کاموں میں۔ جانوروں کی نگہ بانی میں مدد دے دیتا ہے اور غریب پیشہ ور کا لڑکا روزمرہ کی زندگی میں باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ اپنے بچوں کو خواہ مخواہ مدرسے میں بھیج کر کتابی تعلیم دلائیں جس کا نتیجہ لازمی طور پر آبائی پیشے سے نفرت اور بیکاری ہو۔

جرمنی کے ایک مشہور ماہر تعلیم اور ریاست پرشیا کے وزیر تعلیم نے جنھوں نے ایشیائی ممالک کی اقتصادی اور تعلیمی حالت کا بنظر غائر مطالعہ کیا تھا لکھا ہے کہ ایشیائی اقوام کی اقتصادی حالت اس قدر گری ہوئی ہے کہ اس میں تعلیم کی کوئی جگہ ہی نہیں! بعینہ یہی حالت ہندوستانی کسان کی ہے جب تک کسان کی اقتصادی حالت درست نہ ہوگی وہ کسی حالت میں بھی اپنے آپ کو اپنے بچوں کی

محنت اور امداد سے محروم نہ کرے گا، وہ محنت جو اس کو زندگی کی کم سے کم ضروریات مہیا کرنے کی ضامن ہے۔ اور ایسی حالت میں کبھی بھی اپنے آپ بچوں کو مدرسہ بھیجنے پر رضامند نہ ہوگا۔

مہاتما جی کی تجویز اس اہم مسئلہ کا ایک حل پیش کرتی ہے۔ متمدن ممالک میں کالج کی تعلیم کے سلسلے میں تو بالعموم طلبا تعلیم کا خرچ خود برداشت کر لیتے ہیں۔ امریکہ میں تو یہ تعلیمی زندگی کا عام تجربہ ہے۔ جرمنی میں جنگ عظیم کے بعد طلبا کی انجمنوں نے ہزاروں طلبا کی انھیں مناسب کام مہیا کرکے تکمیل تعلیم کے سلسلے میں امداد کی۔ امریکہ کے بعض نیگرو زراعتی مدارس۔ ڈنمارک کے فوک اسکول ایک حد تک اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔ کیا ہندوستان جو اس وقت اک تجربی دور سے گزر رہا ہے اس پر ٹھنڈے دل سے غور نہ کرے گا۔

صحیفۂ چین

از

اسد علی انوری فرید آبادی

"صحیفۂ چین" میں چین کی قدیم و جدید تاریخ پر نہایت محققانہ نظر ڈالی گئی ہے، اور ثابت کیا گیا ہے کہ پرانے زمانے میں مذہبی، اخلاقی اور اجتماعی علوم کا معیار کس قدر بلند تھا۔ زبان میں سلاست اور روانی کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔

کتابت و طباعت نہایت عمدہ اور کاغذ چکنا لگایا گیا ہے۔ کتاب کی جلد بندی میں خاص اہتمام ملحوظ رکھا گیا ہے، ڈسٹ کور کی رنگینی نے اس کی زینت کو اور بھی بڑھا دیا ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (عہ؍)

مکتبہ جامعہ، دہلی

شعلۂ طور

از

جگر مراد آبادی

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری

جو فارسی میں

امیر خسرو کے کلام کی مخصوص صفت ہے

اردو میں

جگر مراد آبادی کے حصے میں آئی ہے

شعلۂ طور

جگر کے کلام کا مکمل مجموعہ ہے

قیمت ۔ے،

مکتبہ جامعہ دہلی

Printed at Muhbub-ul-Mataba Delhi.

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

مضامین رشید

از

پروفیسر رشید احمد صدیقی

پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اردو کے منتخب لکھنے والوں میں ہیں۔ خصوصاً ان کی مزاحیہ نگاری ملک کے ہر طبقے میں غیرمعمولی مقبولیت حاصل کرچکی ہے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ان کے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شائع کیا ہے یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران " تروتازہ شاداب" اور فرحت بخش کتاب کی ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت دو روپے (عا ر)

مکتبہ جامعہ، دہلی

بسم اللہ

جامعہ

زیر ادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ ڈی

نمبر ۵	نومبر ۱۹۳۷ء	جلد ۲۸

فہرست مضامین

۱۔ گونگوں کی دنیا — جناب فضل احمد کریم صاحب فضلی سی ایس — ۸۹۳

۲۔ ترکی میں تعلیم — ایشیاٹک ریویو — ۹۳۳

۳۔ تقسیم و انتشار اراضی — جناب پروفیسر حبیب الرحمن صاحب ایم اے — ۹۴۱

۴۔ غزل — جناب فضل احمد کریم صاحب فضلی بی اے — ۹۵۲

۵۔ ہندوستان کے مزدور — جناب منیر صدیقی صاحب بی اے (علیگ) — ۹۵۲

۶۔ تہذیب جدید کا انجام — جناب مولوی محمود علی خاں صاحب بی اے — ۹۶۲

۷۔ رفتار عالم — پیمان سعد آباد

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس

مدراس اسمبلی۔ ممالک متوسط کی اسمبلی — ۹۶۴

~~تعلیمی کانفرنس (وردھا)~~ — ۹۶۴

قیمت سالانہ صہ ر — فی پرچہ ۸ ر

پرنٹر پبلشر پروفیسر محمد مجیب بی اے (آکسن)، محبوب المطابع برقی پریس۔ دہلی

ہماری متعدد فہرستیں

مکتبہ جامعہ نے اپنے زبردست ذخیرے کی فہرستیں ایک خاص نوعیت سے علیحدہ علیحدہ شائع کی ہیں۔ جو حضرات جس خاص مضمون یا شعبے سے دلچسپی رکھتے ہوں۔ ازراہ کرم مطلع فرمائیں مطبوعہ فہرست فوراً ارسال کی جائے گی۔ چند فہرستوں کے نام درج ذیل ہیں :۔

(۱) مطبوعاتِ جامعہ ۔ جامعہ کی شائع کردہ اور سول ایجنسی کی کتابوں کی مکمل فہرست

(۲) ناشرینِ اُردو ۔ جامعہ کے علاوہ اردو کتابوں کے تمام ناشرین کی فہرستوں کا مجموعہ

(۳) مصنّفین اُردو ۔ مشہور مصنّفین، مترجمین و مولفین اردو کتابوں کی فہرست

(۴) بچوں کی کتابیں ۔ بچوں کے لئے اردو کی کتابوں کی فہرست

(۵) عورتوں کی کتابیں ۔ عورتوں اور بچیوں کے لئے پسندیدہ کتابیں ۔

(۶) مختصر فہرست کتب ۔ کتب اردو کی تقریباً ایک ہزار مشہور کتابوں کی فہرست

(۷) ادبی کتابیں ۔ تاریخ و تنقید ادب، مقالات و انشا، ناول، افسانہ، نظم، ڈراما، مکاتیب، ظرافت وغیرہ پر اردو کتابوں کی مکمل فہرست ۔

(۸) مذہبی کتابیں ۔ ڈھائی سو منتخب مذہبی کتابوں کی فہرست ۔

(۹) تاریخی کتابیں ۔ پانچسو منتخب تاریخی کتابوں کی فہرست ۔

(۱۰) اجتماعیات، سیاسیات، معاشیات، تعلیم، فلسفہ، منطق، نفسیات، اخلاقیات، طبیعیات، کیمیا، طب، حفظانِ صحت، زراعت اور صنعت و حرفت پر اردو کی تمام کتابوں کی مکمل فہرست زیرِ طبع ہے ۔ عنقریب شائع ہوگی۔

مکتبہ جامعہ دہلی

گونگوں کی دنیا

اور

مولانا ہمزاد

(خود مولانائے موصوف کے قلم حقیقت رقم سے)

گونگوں کی دنیا

مورخہ پہلی ماہ نجات

سنہ ستر ہزار عشقی

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان موج افزا

دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسٰہا

میرے ہمزاد

تم حیرت سے کہوگے مولانا ہمزاد جیسے سلامتی ساحل پر جان دینے والے اور اس شعر کو سرنامہ بنائیں۔ صبر سے کام لو۔ پہلے میرے حالات سن لو پھر جو جی چاہے کہنا۔

تم میرا حال اسی وقت اچھی طرح سمجھ سکو گے جب میں تمھیں اپنے واقعات کچھ پہلے سے بتاؤں گا۔ (حال میں جذبات اور خیالات کا حال بھی شامل ہے۔ اس جگہ یہ کہہ دینا اچھا ہے کہ آئندہ بھی اسی طرح جملہ معترضہ ہوں گے جنھیں سہواً چھوڑ نہ جانا) وہ دن تمھیں یاد ہیں جب تم مجھے مولانا ہمزاد کہہ کے چھیڑا کرتے تھے اور میں بھی جواباً تمھیں ہمزاد کہا کرتا تھا یہاں تک کہ ہم لوگوں کا یہی نام پڑ گیا۔ بہت دن کی بات ہے۔ جب ہم تم دونوں اتنے بڑے نہ تھے۔ جب تمھاری لاپروائی باعث غم میں شک کا عالم حد سے بڑھا ہوا تھا۔ جب تمھاری یہ حالت تھی کہ ـــــ

نہ کھانے کی سدھ بدھ نہ پینے کا ہوش ٭ نہ جانے بھرا دل میں کا ہے کا جوش

جب تم اس ہیئت کذائی سے بقول شفیق بزرگوں کے گستاخی کیا کرتے تھے۔ جب تم
(یہ اور پہلے کی بات ہے مگر گذشتہ باتوں کی رو میں یہ بھی یاد آگئی اس لئے لکھے دیتا ہوں) جب
تم بجائے پڑھنے جانے کے بستہ بغل میں دبائے میرے ساتھ کھیلنے بھاگ آتے تھے اور اکثر
بغیر بستہ کے گھر واپس جاتے تھے جب تم بستہ نہ ہونے کی وجہ اپنے خشمگیں اتالیق سے "بہ
ہدیہ افریدن بہ بہانہ ساز کردن" سے کام لے کر بتایا کرتے تھے اور جب تم ...... جب تم ....
مختصر یہ کہ جب تم ایسے نہ تھے جیسے اب ہو۔ اب تو ولایت سے واپسی کے بعد بہت سنبھل گئے ہو
معلوم نہیں کیوں۔ شاید وہ باتیں یاد نہ ہوں اور ان کا یاد دلانا بھی اب تمھیں ناگوار ہو۔ اچھا اسی سلسلے
میں ایک بات پوچھ لوں جو زبانی نہ پوچھ سکا تھا۔ بتاؤ تم اتنا بدل کیوں گئے۔ تم نے اپنی وہ والہانہ
روش کیوں چھوڑ دی شاید اپنی نئی پوزیشن کے خیال سے۔ مگر کم سے کم مجھے تم سے ایسی ظاہرداری
کی امید نہ تھی۔ میں سچ کہتا ہوں تمھاری وقعت اگرچہ دنیا کی نظروں میں تمھاری اس پوزیشن کی وجہ
سے بہت بڑھ گئی مگر میری نظروں سے تم اپنی نئی روش کی وجہ سے بہت گر گئے تھے۔ تھے اس
لئے کہ اب وہ بات نہیں رہی۔ اب ذاتی تجربے نے مجھے اس بات کا قائل کر دیا ہے کہ ہر شخص کو
بعض وقت "زمانہ باتو نہ سازد تو با زمانہ بساز" پر عمل کرنا ہی پڑتا ہے۔ خیر تو میرا یہ تجربہ جس کے
بیان کرنے کے لئے میں دراصل یہ خط لکھ رہا ہوں اتنا دلچسپ ہے کہ عوام تو اسے پڑھ کے بغیر
"واہ واہ ؟ - نہیں ؟ سچ ؟" کہے اور افیون خانے کے مخصوص انداز میں تنقید و تبصرہ کئے
رہ ہی نہیں سکتے اور تم اسے پڑھ کے اس قدر متاثر ہو گے کہ اس کا اندازہ سوائے میرے کوئی اور
نہیں کر سکتا۔ اس وقت صفی کا وہ شعر یاد آگیا ؎

یہ دل افسانہ ہے ٭ متح

نوٹ:۔ اس مضمون کا خیال مجھے ایچ۔ جی۔ ولس کا فسانہ "اندھوں کی وادی" پڑھ کے پیدا ہوا

زمانے کی رگ چاہے متحرک ہو یا نہ ہو مگر تمھارے دل کی ایک اک رگ ضرور پھڑکنے لگے گی۔ معلوم نہیں تمھیں یاد ہو کہ نہیں عرصہ ہوا تم نے اپنی بکری کے بچے کو جب وہ گردن ٹیڑھی کئے چھکے چکنے مخمل جیسے کان ہلاتا کلیلیں کرتا دودھ پینے جا رہا تھا اس کی ماں کے آگے سے اٹھا لیا تھا۔ تم اسے جتنا لپٹاتا اور پیار کرنا چاہو وہ اتنا ہی ٹانگیں مارے اور "میں - میں" چلائے۔ ماں بھی سب رد بندی "میں - میں" کرتی رہی مگر تم نے ایک نہ سنی۔ اسے گود میں دبوچے خوش خوش باہر چلے گئے کچھ دور تو ماں کی آواز کان میں آتی رہی۔ پھر بند ہو گئی۔ بچہ بھی بیچارہ چپ ہو گیا۔ مگر اب اس کے دل کی کیفیت جو آواز اور حرکات سے ظاہر نہ ہوتی تھی اس کی ابھری ابھری گول گول آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ اسے دیکھ کے بقول غالب رگ سنگ سے لہو ٹپکنے لگتا، مگر تم پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اب بڑے دل والے بنتے ہو۔ خیر تو جب تمھارا باہر کی سب سے جی بھرا تو گھر کی طرف چلے گھر کے قریب ابھی نہ پہنچے تھے کہ بکری کی دردناک "میں - میں" کی صدا پھر آنے لگی۔ اس کو سن کے بچہ بس نہ چل سکا بیتاب ہو کے "میں میں" کرنے لگا کہ زور زور سے ٹلا لگا اور تمھاری گود سے تڑپ کے نکل جانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ تمھارے دل کی اس حالت کا جو اس خط کے پڑھنے کے بعد اس کی سوئی ہی تصویر ہے بس فرق جو ایک بکری کے بچے اور انسان کے دل میں ہونا چاہیے وہی سمجھو اور وہ بھی تمھارا دل۔ دیکھو کہاں کی بات کہاں نکل آئی جو ابھی سب کہنے کی بات تھی اس کا ذکر ابھی چھیڑ دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ اصل بات وہی ہے اس کے نوع بنواد زبان پر ہی آئی ہے۔ جی چاہتا ہے ابھی کہہ دوں مگر نہیں اگر ابھی کہہ دیا تو بقول یاروں کے سارا مزا کرکرا ہو جائے گا" ورنہ یہ بھی ہے کہ وہ بات کیا ہے یعنی اندازہ نہ کر سکو گے اس سے کہ تم سے بتاتا ہوں۔ تم میں یہ کہہ رہا تھا کہ جس وقت یاد ہو یہ سب پیش کا۔ تم یاد ہے کہ زیادہ ایسا ہو گا تو اس زمانہ میں جو دلچسپ جھگڑے تم لوگوں میں ہوا کرتے تھے وہ سب بھی یاد ہوں گے۔

بظاہر ہم میں تم میں کوئی بات مشترک نہ معلوم ہوتی تھی۔ تم لوہے کی پتیلی سے پورے پہلوان بننے میں کوشاں۔ تمھارے جسم میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سا ننہ لی ...

اور میرے جسم میں محتسب کی۔ مگر معلوم نہیں کیا بات تھی کہ ہم لوگوں میں اتنی گہری دوستی تھی معلوم نہیں یوں ہی رو میں لکھ گیا ورنہ اس کی وجہ اب مجھے صاف معلوم ہوتی ہے۔ خط پڑھنے کے بعد تمھیں بھی معلوم ہو جائے گی۔

ہماری لڑکیوں میں وہ دن یاد رہیگا۔ مجھے تو کبھی نہ بھولے گا شاید تمھیں بھی یاد ہو۔ شروع برسات کا زمانہ تھا۔ موسم کی پہلی گھٹا تھی اور خوب گھر کے آئی تھی، بالکل گھنگور۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ " کالا مینگھا" لڑکے لڑکیوں کی " لگڑی چھونچی بیل پیا ساکالے مینگھا پانی دے" کی متواتر چیخ پکار سے غصے میں آکے بپھر گیا تھا۔ آسمان پر وہ گرج چمک تھی کہ سوتے دل بھی جاگ اٹھیں۔ پھر صبح کا سہانا وقت ہر شے میں زندگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ دل میں ایک عجب طرح کی خنکی اور سرور محسوس ہو رہا تھا۔ ایسی حالت میں تم سے کب گھر میں کل سے بیٹھا جاتا۔ تم آئے اور مجھے دریا کی سیر کے لئے پکڑ لے گئے۔ ہم لوگ یوں ہی گھومتے گھامتے بظاہر بغیر قصد ایک جگہ پہنچ گئے۔ میں تو سمجھتا ہوں تم مجھے وہاں قصداً لے گئے تھے مگر خیر۔ غالباً تم سے پہلے ہی میری نکتہ رس نگاہوں نے دیکھ لیا کہ حینہ سے

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن ؎ جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

والی راد ھائیں کنہیا جی کی نگاہوں سے بے خبر عجب ترنگ میں نہا رہی ہیں۔ کوئی کسی پر پانی پھینک رہی ہے کوئی کسی کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ رہی ہے۔ کوئی شرم کے مارے بیٹھی جا رہی ہے۔ کوئی کسی کے پیچھے جھپٹ رہی ہے کوئی قہقہہ لگا رہی ہے۔ کوئی کنارے پر کھڑی جلدی جلدی کپڑا اتار رہی ہے اور زور سے کہہ رہی "اے سُنا۔ ہم آجائیں تو"۔ میں نے فوراً اپنا منہ ادھر سے پھیر لیا۔ تم نے جو دیکھا تو بار بار" مولانا دیکھئے اس طرف ایک چیز" کہہ کہہ کے میری جان عذاب میں ڈالدی۔ میں باتوں میں ٹالتا رہا کہ تمھیں یہ پتہ نہ چلے کہ میں نے ادھر دیکھ لیا ہے۔ جب تمھارا اصرار حد سے بڑھا اور مجھے محسوس ہونے لگا کہ اب زیادہ انکار رازافشا کر دیگا تو میں نے لاپروائی سے مڑ کے " کہاں ؟ کیا" کہتے ہوئے اس جانب آسمان کی طرف دیکھا۔ بہت میں نے کوشش کی کہ دامن نگاہ کا کوئی گوشہ اس معصیت انگیز

منظر پہ بار دیگر پڑ کے ملوث نہ ہو مگر پھر بھی ایسا معلوم ہوا ایک لٹکتا ہوا کونا اس پر سے رگڑ کھاتا ہوا نکل ہی گیا۔ تم نے کہا" مولانا۔ میں آپ کو اس وقت آسمان پر فرشتے تھوڑی دکھانا چاہتا ہوں بلکہ زمین پر حوریں"۔ میری نگاہ نیچے کی طرف بے اختیار گر پڑی۔ میں نے خوف و غصے کی حالت میں کہا "کیا بکتے ہو" اور پھر فوراً لاحول کہہ کے ادھر سے منہ پھیر لیا ساتھ ہی ساتھ میں نے تمھارا ہاتھ زور سے پکڑا اور تمھیں وہاں سے کھینچ کے لے جانے لگا۔

تم "مولانا خیریت تو ہے۔ آخر یہ سب کیوں؟"

میں "پہلے یہاں سے چلو تب بتاؤں"۔ اس وقت میرے منہ سے ہر وقت توبہ۔ توبہ نکل رہی تھی اور میری گرفت میں اتنی قوت پیدا ہو گئی تھی کہ تم اس سے نکل نہ سکے۔ جب کچھ دور جا چکا تو میں نے کہا" تم بڑے وہ ہو۔ زبردستی گنہگار بناتے ہو؟"

تم "گنہگار؟ کیسے؟"

میں "گناہ آنکھوں سے بھی تو ہوتا ہے؟"

تم "مگر میں تو آپ کو ایسا نہیں سمجھتا تھا کہ آپ اتنی جلدی گناہ کر بیٹھیں گے"

میں نے کھسیا کے کہا" استغفراللہ۔ میرے کہنے کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ خدانخواستہ مجھ سے گناہ سرزد ہی ہو گیا۔ اللہ اس سے ہمیشہ بچائے۔ ارے وہی "چو کل بسیار شد پیلان بلغزند" والی بات سمجھو"

تم۔ "مولانا سعدی کا یہ قول تو آپ کو یاد رہا اور وہ نہ رہا کہ ؎

کہ گفت بر رخ زیبا نظر خطا باشد ٭ خطا بود کہ نہ بینند روے زیبا را "

میں۔ "مجھے سب یاد ہے۔ فضول باتیں نہ کرو۔ چلو"

تم "اور حافظ کا یہ شعر بھی کہ ؎

چہ کار اندر بہشت ان مدعی را ٭ کہ میل امروز با حورے ندارد "

یہ سن کے مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے جوش میں آ کے کہا" نئی تعلیم نے تم لوگوں کو بالکل

جہل [illegible] نہ کچھ سمجھو نہ بوجھو مگر سمجھتے ہو کہ سب کچھ جانتے ہو۔ خواجہ کے اس شعر کا کچھ مطلب سمجھے بھی کہ جھٹ سے پڑھ دیا۔

تم۔ "مطلب صاف ......"

میں۔ "اسی سے تو میں کہتا ہوں کہ خاک نہیں سمجھے۔ صوفیوں اور وہ بھی خواجہ حافظ علیہ الرحمتہ جیسے بزرگ کا کلام سمجھنے کے لئے مدتوں حضرات صوفیہ کی خدمت میں زانوے ادب تہ کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ نہیں کہ کچھ کالج اسکول میں ان لوگوں سے پڑھا جو خود کچھ نہیں جانتے اور سمجھے کہ ہم بڑے عالم فاضل ہو گئے۔ اندھا اندھے کو کیا راستہ دکھائے گا۔"

تم۔ "بجا ارشاد آپ ہی اس کا مطلب فرمائیے"

میں۔ "ابھی میں خود اپنے میں اتنی صلاحیت نہیں پاتا کہ خواجہ کے مطلب کو کما حقہ سمجھ سکوں۔ مگر خیر جتنا سمجھ سکتا ہوں بتاتا ہوں۔ اس شعر کا مطلب صرف ایک لفظ "حور" کے معنی سمجھنے پر منحصر ہے۔ حور کا مطلب؟"

تم۔ "فرمائیے"

میں۔ "حور ظاہر ہے کہ دنیا میں نہیں ہوتی اس لئے اس کا استعمال خواجہ کے مخصوص انداز میں مجازی ہے۔"

تم۔ "بجا"

میں۔ "تو پھر یہاں حور سے مطلب خواجہ کا کیا ہو سکتا ہے۔ حور کا مطلب ...

قبل اس کے کہ میں جملہ ختم کروں تم بول "اٹھے" اوہو۔ اب میں سمجھا۔ حور کے معنی پیر کیوں مولانا۔"

میں۔ (خوش ہو کے) "بیشک۔ آخر جمال ہمنشیں ....."

ابھی ٹھیک سے جمال ہمنشیں نہ کہہ سکا تھا کہ اتنے زور سے بجلی کا کڑکا ہوا کہ بے اختیار منہ سے "یسبح" نکل کے رہ گیا۔ کھٹ سے جسم سکڑ گیا۔ جھٹ سے سر جھک گیا اور آناً فاناً میں

تمھارے پیچھے دبک سا گیا۔ جب یہ مصیبت ختم ہوئی تو میں نے کہا " بھائی چلو گھر۔ اب یہاں زیادہ رہنا ٹھیک نہیں "

تم۔ " اگر آپ ہی پر بجلی گرنی ہے تو وہاں نہیں گر سکتی۔ کاہے کو گھر والوں کو اپنے ساتھ گھسیٹتے ہیں یہ بجلی محض آپ ہی کے لئے چکی تھی۔ آپ نے مولانا کشف الدجا بجمالہ کا یہ شعر سنا ہے"

میں۔ (حواس مجتمع کرتے ہوئے) " مولانا کون"

تم۔ " ارے اپنے مولانا کشف الدجا بجمالہ قدسرہ کا نام نامی نہیں سنا"۔ پہلے تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں نے واقعی نہیں سنا مگر بہت جلد کچھ دھندھلا دھندھلا سا خیال آنے لگا اور میں نے کہا " سنا کیوں نہیں شعر پڑھو تو پتہ چلے۔ سینکڑوں شعر سنا کرتا ہوں "

تم۔ " اچھا تو سنئے۔ فرماتے ہیں[۵۱]

فلک پر بھی ہے قبضہ شیخ جی ان حسن والوں کا
وہ دیکھو لے رہا ہے برق میں انگڑائیاں کوئی

میں۔ (فوراً جوش میں آکے) " کیا شعر فرمایا ہے۔ رعنائی خیال کے قربان جائیے۔ جی خوش ہوگیا۔ کیا تم اسے بھی بیہودہ مجازی معنوں میں لے جاتے ہو۔ یہ شعر خالص حقانیت کا ہے اور حضرت سیدنا قدسرہ کے فیضان روحانی کا ثمرہ ہے "

تم نے ذرا مسکرا کے کہا " مولانا تو آپ میری ولایت کے قائل ہوگئے "

میں (غصے میں) " تم نے کیوں حضرت مولانا کے نام سے اپنا شعر پڑھا"

تم " اگر ایسا نہ کرتا تو آپ اتنی تعریف کرتے "

میں " بڑے گستاخ ہو۔ معافی مانگو"

تم " کس سے اپنے آپ سے "

---

[۵۱] اُردو کے وہ اشعار جن

میری جھینپ اور کھسیاہٹ کا تم اندازہ کرسکتے ہو۔ اسی عالت میں میں نے کہا "تم نے کیوں دھوکا دیا۔ کیوں کفر بکا۔ کیوں اپنے کو مولانا کشف الدجا بجالہ کہا۔ تم لوگ نہ معنی سمجھو نہ مطلب جو کچھ منہ میں آتا ہے بکنے لگتے ہو" یہ کہتے ہوئے میں تمھارے پیچھے دوڑا۔ تم بھی زیادہ نہ بھاگے۔ خیر جب پکڑا تو تم نے کہا کہ " مولانا صرف آپ کو چھیڑنا چاہتا تھا۔ بس"۔ دل تو احساس شکست سے چور تھا اس وقت لڑتا کیسے۔ سوائے اس کے کچھ اور نہ کہہ سکا کہ مجھے ایسی چھیڑ نہیں پسند۔ اس کے بعد ہم لوگ پھر دوست ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باتیں کرتے گھر کی طرف چلے۔ باتوں باتوں میں تم نے کہا (آخر پرانی عادت کہاں جاتی)" مولانا آپ کیوں زبردستی اپنی جان کو عذاب میں ڈالتے ہیں۔ ثواب کے لئے عذاب میں پڑنا کون عقلمندی ہے۔ کیا آپ کو وہاں سے چلے آنے میں تکلیف نہیں ہوئی"۔ یہ سن کے میں پھر کھسیا یا اور بولا " تکلیف کیا عین راحت ہوئی، جانتے ہیں یہ عذاب عارضی ہے اس لئے اسے خوشی سے برداشت کرتے ہیں۔ اس کے بدلے جب وہ رحیم کریم جنت النعیم عطا فرمائے گا تو ساری کسر پوری ہو جائے گی۔ میں نے کسر کہا۔ توبہ۔ کسر کیا۔ جتنی اب تکلیف ہوئی ہے اس سے ہزار گنا زیادہ آرام نصیب ہوگا اور وہ عیش عیش جاودانی ہوگا۔ یہاں کی طرح فانی نہیں" یہ کہتے کہتے میں جوش میں آگیا اور جنت کے عیش و آرام کی ایسی زبردست تصویر کھینچی کہ مجھے خود لطف آگیا۔ سچ کہتا ہوں میرا دل بول رہا تھا کہ میں نے اتنی پرجوش اور" لذیذ" تقریر کبھی نہ کی تھی۔ ایک اک لفظ جو زبان پر آتا تھا معلوم ہوتا تھا کہ دل کی انتہائی گہرائیوں سے نکل رہا ہے۔ خیر تو جب میں دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ میٹھی شراب طہور کی نہر کا ذکر کر چکا جو میرے پرلنے انداز گفتگو میں بجز دخیال آنے کے منہ سے ملحق ہو جائے گی تو تم نے حسب عادت بیہودہ سوالات شروع کر دئے کہ" مولانا کیسے۔ نہر کی نہر مع اینٹا چونا گارا کے منہ میں لگ جائیگی یا اس میں سے ایک موج اٹھ کے منہ میں گھس جائے گی یا کوئی حور جام بلوریں میں بھر کے اور ہتھیلی پر رکھ کے خواصوں کی طرح مودبانہ پیش کرے گی یا محبوب شوخ و شنگ کی طرح گلے میں ہاتھ ڈال کے اور قسمیں دے دے کے پلائے گی"۔ تمھارے شروع کے دو سوال سن کے تو میرا غصہ ناک تک آگیا تھا مگر

تمھارے آخری سوال نے میرے جسم میں سرور کی ایک برقی لہر دوڑادی اور میں نے اسی پُرکیف جوش میں کہا" ہاں اور کیا، بیشک، مومنوں کے لئے وہاں حوریں تو ہوں گی اور وہ بھی کیسی یہاں کی چڑیلوں سے ہزار لاکھ کرور مہاسنکھ گنا بڑھکے تم نے میرے لطف وجوش کے دھکتے ہوئے انگاروں پر یہ کہہ کے پانی چھڑکا کہ" ارے مولانا سوچئے تو کیا فرمارہے ہیں آپ ۔ دوزخ کا ذکر کررہے ہیں کہ جنت کا ۔ اگر حوراتنی کریہہ المنظر ہستی کا نام ہے جس کے آگے ہماری چڑیلیں بھی حور معلوم ہوں تو کم سے کم خاکسار تو ایسی جنت سے باز آیا اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ ہی اس کے لئے اتنے حیران پریشان کیوں ہیں کہ اس دنیا کو جو جنت بن سکتی ہے زبردستی دوزخ بنائے ڈالتے ہیں ۔ میں نے کہا لاحول ولا قوۃ میرا مطلب یہ تھوڑی تھا ۔ میرا مطلب یہاں کی چڑیلوں سے وہ چڑیلیں تھا جنھیں تم لوگ حور سے بڑھکے سمجھتے ہو لیکن جن کی ہستی ان حوروں کے مقابلے میں جو انشاء اللہ جنت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہمارے تصرف میں آئیں گی چڑیلوں سے بڑھکے نہیں ۔"

تم ۔" اچھا تو کہہ چلئے " ۔ میں نے پھر سلسلۂ گفتگو شروع کیا اور" لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم " کے مصداق خوب خوب رطب اللسانی کی ۔ دنیا کا زبردست سے زبردست مصور بھی اپنی محبوبہ کی برہنہ تصویر کیا اس کیف وسرور جوش ومستی کے ساتھ کھینچے گا جس سے میں نے حوروں کے ایک اک عضو کی مصوری کی ۔ پہلے تو تم بیچ بیچ میں بولتے جاتے تھے کہ" مولانا سڑک کا تو خیال کیجئے ۔ لوگ کس طرح دیکھ رہے ہیں ۔ کیا کہتے ہوں گے " مگر میری تقریر کے سیلابی دھارے کے آگے یہ تنکے کیا ٹھہرتے ۔ آخر کار تم بھی دم بخود ہوکے سننے لگے ۔ جب میں اپنی جادو بیانی ختم کرچکا (اس وقت کی تقریر مجھے سچ مچ جادو معلوم ہوتی اور میں خود مسحور ہوا جاتا تھا بمصداق ؎

ہم مست ہوئے جاتے ہیں خود اسکے اثر سے ؎ یہ شعر نہیں نعرۂ مستانہ ہے گویا)

اور سمجھا کہ تم اگر پورے نہیں تو کم سے کم آدھے مسلمان تو ہو ہی گئے ہوگے ۔ اس وقت میں نے

تمھاری طرف بڑے فاتحانہ انداز میں ہمہ تن سوال خاموش بن کے دیکھا۔ تم نے ایسی مسکراہٹ کے ساتھ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ منبج کو ۔ ضبط کرتے ہو کہا ۔

شیخ صاحب کی ذہانت دیکھو ہو حور کو سمجھے ہیں عورت ہوگی

بس نہ پوچھو تن بدن میں آگ لگ گئی ۔ ہم نے قریب قریب جامے سے باہر ہوکے کہا "عورت نہ ہوگی تو کیا تمھارا سر ہوگا ۔ خدائے عزاسمہ نے بہ نفس نفیس اپنے کلام پاک میں اس کا کھلے لفظوں میں وعدہ فرمایا ہے ۔ بیہودہ، بدتمیز کہتا ہے" شیخ صاحب کی ذہانت دیکھو ۔ انگور کھٹے ہیں ۔ ارے ظالم خدا کے غضب سے ڈر ۔ تجھے کیا ہوگیا ہے ۔ کیا سمجھتا ہے کہ تو ہمیشہ اسی طرح بنا رہے گا ۔ تیرے ہاتھ پیر میں اسی طرح زور رہیگا ۔ تیرے دل و دماغ ہمیشہ یوں ہی تروتازہ بنے رہیں گے ۔ اگر اندھا نہیں ہوگیا ہے تو اپنے اردگرد ایک نظر ڈال ۔ یوں فرعون بے سامان نہ بنا رہ ۔ دور کیوں جاتا ہے رمضان ہی کو دیکھ ۔ بڈھی چمڑا ہے اور چمڑا بھی کیسا جیسے برسوں کا سکھایا ہوا ۔ کانوں میں جب تک چیخ کے نہ بولو سن نہیں سکتا ۔ آنکھیں دیکھنے میں اچھی مگر اپنے پوتے کو بھی نہیں پہچانتا ۔ اپنے بل بوتے بچھونے سے اٹھ نہیں سکتا اگر قضائے حاجت کی ضرورت ہوئی اور کوئی ترس کھانے والا موجود ہوا تو اس نے بڑی مشکل سے اٹھایا ورنہ پڑے ہی پڑے سب کچھ اور اسی میں لت پت پڑے رہنا ۔ اس دن نہیں دیکھا کہ جب وہ اپنی ادھموئی آواز میں دھیرے دھیرے "پانی ۔ پانی" کہہ رہا تھا اور اس کی بہو جھلا کے یہ کہتی ہوئی آئی "بڈھا مرو نہیں جات ۔ جان اجاب ماں ہے ۔ کہاں تلک کوئی کرے" اور بیدردی کے ساتھ اسے اٹھا کے پانی پلانے لگی ۔ پلاتے کیا لگی اس کے ہاتھ میں یہ کہہ کے کٹورا پکڑا دیا کہ "لیو ڈھکو ۔ پانی، پانی، پانی، پانی ۔ مرے جات ہیں پانی بنا" تو اس کی گردن کس طرح بے اختیار ہل رہی تھی ۔ ہاتھ کس طرح کانپ رہا تھا ۔ آدھا پانی اس کے اوپر چھلک چھلک کے گرا تب کہیں ایک دو قطرے اس کے، پیرسے بڑھے ہوئے منتظر ہونٹوں میں پہنچے اور اتنے ہی میں اس قدر تھک گیا کہ آہستہ سے بس کہہ کے پڑ گیا ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ اسی طرح پیدا ہوا تھا ۔

کیا کبھی اس کی عمر تمھاری طرح نہ تھی ۔ کیا اس کے یہی کانپتے ہوئے ہاتھ جن سے اب پانی کا کٹورا نہیں سنبھلتا کبھی شراب طہور سے بھرے ہوئے قدرت کے زرنگار پیالوں سے نہ کھیلتے رہے ہوں گے ۔ کیا کبھی وہ بھی بانکا چھیلا بنا نہ پھرتا رہا ہوگا ۔ تم نے تو خود اس کے منہ سے اس کی جوانی کے قصے سنے ہیں ۔ کس طرح قوس قزح کے رنگ کا صافہ پیچ در پیچ ایک طرف ذرا سا جھکا کے باندھے ۔ خوب تیل پلی پتیل جڑی چمکتی سر سے اونچی لاٹھی لئے چھنا ہوا تن زیب کا کرتا زیب تن کئے اور اس کے اوپر کسی پھولدار ریشمی کپڑے کی صدری پہنے تہمد باندھے سلیم شاہی جوتا ڈاٹے ایک طرف گال میں دو خوشبودار دیسا دری پان کی گلوریاں دبائے (مجھے اس کا یہ کہنا کبھی نہ بھولے گا کہ "بھیا اللہ قسم کبھی دو چھوڑ ایک گلوری منہ میں نہ رکھتے تھے") سینہ تانے کس آن بان سے چوک کی سیر کو نکلتا تھا کہ عورت تو عورت مرد بھی دیکھتے رہ جاتے تھے ۔ ہر طرف اس کی خاطر تواضع ہوتی تھی ۔ اگر کہیں کچھ دن ناغہ کر کے جاتا تھا تو وہاں سب تکا ٹکا یہی کہتے "ارے آج کدھر سے چاند نکلا ۔ رمضان بھیا تو بالکل عید کا چاند ہو گئے"۔ یا ایک اس کا وہ زمانہ تھا یا ایک یہ ہے کہ اس کے اپنے اس کے مرنے کی دعا کرتے ہیں ۔ کیا رمضان نے کوئی قصور کیا ہے کہ اس کا یہ حال ہو گیا اور کیا تم کہیں سے لکھا کے آئے ہو کہ یوں ہی سدا بہار بنے رہو گے ۔ اگر تم نے اس کی اتنی عمر پائی تو تمھارا بھی یہی حال ہوگا اور اگر کم عمری ہی میں مرے تو دیکھنا کہ موت کس طرح تمھارے سارے قصر خیالی کو دفعتاً مسمار کر دے گی ۔ اتنا بھی وقت نہ ملے گا کہ اپنے ارمانوں کے پورا نہ ہو سکنے کا افسوس ہی کر لو ۔ بڑے بڑے فرعونوں کا یہی حال ہوا ہے ۔ تم تو تم ۔ آنکھیں کھول لو تو دیکھو کہ جمادات، نباتات، حیوانات ساری کائنات درس عبرت ہے ۔ عبرت پکڑو عبرت ۔ ورنہ پھر سوائے پچھتانے کے اور کچھ ہاتھ نہ آئے گا"۔ تقریر تو میں نے بہت لمبی چوڑی کی تھی مگر اس کا خلاصہ یہی ہے ۔ جوش میں آ گیا تھا ۔ اردو فارسی شاعری سے جو نادر نفی صدی اسی مضمون کی ہے میں نے جگہ جگہ کام لے کے اپنی تقریر کے اثر کو بہت بڑھا دیا تھا ۔ تم بھی متاثر نظر آ رہے تھے ۔ جس قدر تم پر زیادہ اثر ہوتا نظر آتا تھا اسی قدر میں اور زور و شور سے تقریر کرتا تھا ۔

آخر جب حلق سوکھنے لگا تو میں نے اسی درس عبرت پر تقریر ختم کی اور تمھاری طرف منتظر جواب بنکے دیکھا۔
تم نے کہا سے

کیا خاک لے سے جینا پر لطف دکھائی دے ؎ ہر نقش جسے عبرت انگیز نظر آیا

میں بھڑک اٹھا تیری اور تیرے پُر لطف جینے کی ایسی تیسی۔ میں کیا جانتا تھا کہ اللہ جل شانہ عم نوالہ نے ابوجہل کی طرح تیرے قلب پر مہر ثبت کر دی ہے۔ "صمٌ بکمٌ عمیاً فہم لا یرجعون۔" یہ آیت قرآنی پڑھتا اور لاحول ولا قوۃ کہتا میں تمھیں راستے ہی میں چھوڑ کے اپنے گھر واپس آیا۔

مدت تک نہ میں تم سے بولا اور نہ تمھیں بولنے کا موقع دیا۔ شاید تم بھی "سبک سر بنکے کیوں پوچھیں" پر عمل کرتے رہے۔ یاد نہیں آتا کہ پھر کیسے سلسلہ شروع ہوا۔ شاید ہم لوگوں نے سے

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے ؎ تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

پر عمل کیا ہو اور اپنے اپنے دل میں یہ سوچ کے کہ "پانڈے جی پچھتائیں گے پھر چنے کی کھائیں گے" آپ ہی آپ مل گئے ہوں یا ہاں خوب یاد آیا۔ واہ میں یہ دلچسپ واقعہ بھولا ہی جا رہا تھا۔ سنو میں ہی نے پیش قدمی کی تھی۔ صرف چنے کی دال مجبوراً کھانے ہی کے لئے نہیں۔ جی تو تم سے ملنے کے لئے پھر بہت چاہنے لگا تھا لاکھ ہو بقول نظیر "اک عمر کی جو ہے پڑی عادت نہیں چھٹتی" مگر اس کے علاوہ ایک اور بات بھی تھی۔ میں تم سے اتنے عرصے تک زیادہ تر اس وجہ سے نہیں بولا تھا (غصے کی وجہ بھی تھی) کہ میں تم سے بات کرنا گناہ سمجھتا تھا۔ مومن نے یہ شعر تو طنزاً کہا تھا کہ سے

میرے آنسو نہ پونچھنا دیکھو ؎ کہیں دامان تر نہ ہو جائے

لیکن میرے نزدیک تم سے بات چیت کرنا واقعی بمنزلہ گناہ کے تھا۔ کچھ عرصے کے بعد آپ ہی آپ مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ نہیں۔ میں غلطی پر ہوں۔ تم گمراہ ہو تو میرا فرض یہ ہے کہ تم کو راہ راست پر لاؤں نہ کہ تم کو اور گمراہ ہونے دوں۔ یہ خیال آنا تھا کہ اپنے آپ کو اس سہل انکاری پر کہ ایک بہانہ ڈھونڈ کے اس بڑے فرض کی ادائیگی سے قاصر رہا (اس وقت مجھے اپنا گذشتہ طرز عمل صاف بہانہ نظر آتا تھا) خوب لعنت ملامت کی اور اسی وقت تمھارے ہاں گیا۔ تم تھے نہیں۔ نوکروں سے کہہ آیا کہ جب آؤ تو

کہدیں کہ میں آیا تھا۔ تم تھوڑی دیر کے بعد" چہرہ خوشی کے مارے گلستان بنا ہوا" میرے ہاں پہنچے اور خوشی سے لبریز آواز میں بولے "کہئے مولانا کیسے یاد فرمایا"۔ مجھے تمھارے چہرے اور آواز کے لہجے سے یہ معلوم کر کے تو بڑی خوشی ہوئی کہ تم مجھ سے تجدید دوستی کے خیال سے بہت خوش ہو مگر تمھارا اتنا رجحان دیکھ کے میں نے منہ بنا کے خشک لہجے میں کہا "کچھ نہیں ایک کام تھا"۔ اس پہ تم بیساختہ بول اُٹھے "کام کی بات بعد میں ہوگی۔ پہلے آپ مجھ سے خوش ہو جائیے تب۔ بہت غصہ کر چکے۔ لائیے کانی اُنگلی"۔ یہ کہہ کے تم نے اپنی کانی انگلی کو ٹیڑھا کر کے بڑھایا مگر میں اپنی انگلی سیدھی ہی کئے رہا۔ کانی انگلی ملا کے لڑکیوں یا چھوٹے بچوں کی طرح عہد وفا باندھنا مجھے اپنے سن علم و فضل اور تقدس کے شایان شان نہ معلوم ہوا۔ خصوصاً اس بات کا خیال آیا کہ میں ایک اہم اور بہت مقدس کام کو اس تجدید دوستی کے ساتھ شروع کرنے والا ہوں۔ لہٰذا اس کی ابتدا ایسے مسخرے پن سے نہ ہونی چاہئے۔ میں نے بہت متین لہجے میں کہا کہ " خیر تمھاری یہی خوشی ہے تو دوستی ہو جائے گی۔ مگر یہ انگلی ونگلی کیا لڑکیوں کا کھیل۔ لیکن تم نے ایک نہ مانی اور بغیر میری کانی انگلی کو زبردستی ٹیڑھا کئے اور اس کو اپنی انگلی سے کس کے کھینچے نہ رہے اور سچ پوچھو تو با وجود میری ظاہری مخالفت کے مجھے دل ہی دل میں اس کا لطف بھی آیا۔ اس طرح ہماری دوبارہ دوستی کا سلسلہ شروع ہوا۔

میں نے یہ دوبارہ دوستی تمھیں راہ راست پر لانے کے لئے شروع ہی کی تھی اس لئے میں نے اب کی دفعہ پہلے سے بھی زیادہ زور شور سے بحث و مباحثے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ یہ بحثیں بڑی دلچسپ تھیں اس لئے مجھے اب تک قریب قریب لفظ بلفظ یاد ہیں۔ مگر میں اس وقت انھیں یہاں لکھ کے تمھارے صبر کی ضرورت سے زیادہ آزمائش کرنا اور اس طرح ان کے اثر کو کھونا نہیں چاہتا۔ فرصت ملی تو انھیں کبھی علیحدہ لکھوں گا۔ اس وقت تم میرے ان دلچسپ تجربات کو سننے کے لئے بیچین ہو رہے ہو گے جن کا ذکر میں نے اس خط کے شروع میں کیا ہے اور شائد تم بے صبری کی وجہ سے میرے اس لکھنے کو بھی فضول سمجھتے ہو مگر مجھے یقین ہے کہ جب تم پورا خط پڑھ چکو گے اس وقت تمھاری رائے بدل جائے گی۔ خیر جس طرح بھی ہو صبر کے ساتھ یا بے صبری سے صرف ایک واقعہ کا ذکر اور سن لو۔

امید ہے کہ باوجود بے صبری کے بھی وہ چنداں غیر دلچسپ نہ معلوم ہو۔

ہم لوگ ایک دن جمیل کے ہاں دعوت کھانے جا رہے تھے اور میری طبیعت بمصداق ؎

زندہ دل شیخ جی کب تھے اتنے ؛ آج شائد کہیں دعوت ہو گی

خوب جولانی پر تھی۔ مذہبی بحث تو میں ہیر پھیر کر چھیڑ ہی دیا کرتا تھا۔ اس دن بھی چھیڑ دی اور بڑے جوش کے ساتھ تم نے بہت بچنے کی کوشش کی مگر میری گرفت سے کہاں نکل سکتے تھے۔ تم نے "فالتو عقل"[۱] نہ ہونے کا عذر پیش کیا مگر یہاں کون سنتا ہے۔ آخر تم نے کھسیا کے کہا "مولانا کوئی دلچسپی کی بات کیجئے۔ یہ کیا۔ ہر وقت مذہب' خدا' سنتے سنتے ناک میں دم آگیا"۔ یہ سُن کے مجھ سے کہاں رہا جاتا۔ فوراً برس پڑا۔ میں نے کہا "غضب خدا کا تو کیا بک رہا ہے۔ آسمان سے بجلی نہیں گر پڑتی کہ تجھے بھسم کر دے۔ زمین پھٹ نہیں جاتی کہ تجھے نگل جائے۔ خدا کے ذکر سے تجھے دلچسپی نہیں اس سے نعوذ باللہ تیرا ناک میں دم آتا ہے۔ تونے کیا خدا کو سمجھ رکھا ہے ملعون"۔

تم۔ "مولانا اکبر کا یہ شعر یاد ہے ؎

میں کب کہتا ہوں واعظ تجھ سے میں نے رازِ دیں سمجھا
فقط اتنا ہی سمجھا ہوں کہ تو بھی کچھ نہیں سمجھا"

میں۔ "تو اپنی کٹ حجتی سے باز نہ آئیگا"

تم۔ "واہ مولانا الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" میں یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا کہ مجھے کوئی چور کہے۔ خوب بگڑا قریب تھا کہ مار بیٹھتا تھا کہ تم نے کہا زبردستی آپ اتنا بگڑ رہے ہیں آپ کو کچھ غلط فہمی ہو گئی ورنہ مجھ میں اور آپ میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہیں یہ آپ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں میرا ایک بہت پہلے کا کہا ہوا شعر ہے سُن لیجئے" میں نے بڑی خوشی اور اُمید بھرے لہجہ میں کہا تمھیں چھیڑنے میں مزا ملتا ہے عجیب آدمی ہو ابھی تو میں مار بیٹھا ہوتا۔"

[۱] مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں۔ فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں (اکبر)

تم۔ "شیخ جی میں اور مجھ میں صرف اتنا فرق ہے

وہ خدا کے واسطے ہیں اور خدا میرے لئے"

یہ سُن کے جو کچھ طبیعت کی حالت ہوئی بتا نہیں سکتا "خدا کے واسطے" پر خاص کر غصے سے کانپ اُٹھا، وہ جوش جو ذرا دب گیا تھا پھر زور شور سے اُبھر آیا اور میں نے آگ بگولا ہو کے کہا" اس وقت جو جی چاہے کہہ لے قیامت میں قدر عافیت معلوم ہوگی دیکھنا بچا کیا حشر ہوگا۔ دوزخ کے کندے بنو گے یہ زبان جو اس وقت بہت چل رہی ہے اسی میں ملائکہ لوہے کی لال انگارہ سلاخیں بھوکیں گے نہایت ڈراؤنے ڈراؤنے اژدھے بالکل زندہ آتش فشاں پہاڑ، جن کے منہ کے غاروں سے شعلے لپک رہے ہوں گے کبھی کھڑا نگل جائیں گے کبھی پھاڑ پھاڑ کے بوٹی کر دیں گے، ہاتھی سے بڑے بڑے بچھو ڈنک ماریں گے ہر ڈنک ایسا ہوگا کہ ستر برس تک اس کا درد کرب نہ جائیگا۔ خون پیپ کھانے کو ملیگا اس وقت سوائے توبہ استغفار کے کچھ بن نہ پڑے گی اب بھی سویرا ہے۔ راہ راست پر آجاؤ اور یہ مسخرا پن چھوڑ دو۔ ایسی باتیں مذاق میں بھی کرنا بہت بڑا گناہ ہے"۔ میں تو سمجھا تھا کہ دنیا کے سکھوں انسانوں کی طرح تم بھی عذاب دوزخ کی اس تصویر سے کانپ اُٹھو گے مگر تم ایسے روئیں دل اور روئیں تن نکلے کہ دبی ہوئی مسکراہٹ سے بولے ع

بے بسی، اس پہ جہنم، کیا خوب ⁂ کسی ظالم کی ظرافت ہوگی

"ظالم" اور "ظرافت" سن کے تو میں تمہارے اوپر حملہ آور ہوا چاہتا تھا کہ اس شعر کے معنی کی طرف خیال گیا اور میں نے دیکھا کہ وہی ہمارے پرانے جبر و قدر کے مسئلے کو اس پیرائے میں ادا کیا گیا ہے۔ میں کچھ خوش ہوا کچھ کھسیایا اور مسئلہ جبر و قدر پر ایک زبردست تقریر کی جو آئندہ کبھی بشرط فرصت الگ سے لکھوں گا۔ بہر حال اس کا خلاصہ یہ ہے کہ صاحب ایمان کو اس سے دور دور رہنا چاہیئے اس کے حل کی کوشش نہ کرنی چاہیئے بلکہ جب اس کا خیال آئے تو تین دفعہ لاحول پڑھ دینی چاہیئے کیونکہ درحقیقت یہ وسواس شیطانی ہے۔ میرے اس کہنے پر تم نے نہایت سنجیدگی سے کہا" مولانا آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ مجھے شیطان اس طرح بہت ستایا کرتا ہے۔ میں آپ کے ارشاد کے

مطابق اسے دور رکھنے کی انشاءاللہ ضرور کوشش کروں گا مگر یہ فرمائیے کہ اس کے لئے با قرأت لاحول پڑھنی زیادہ مجرب ہوگی یا بے قرأت"۔ یہ سن کے جو میری کیفیت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ شاید تم کرسکو بس یہی جی چاہتا تھا کہ اگر بس چلتا تو میں تمھیں فوراً سنگسار کرا دیتا (سچ کہتا ہوں اس وقت مجھے اس بات کا مطلق خیال نہ آتا تھا کہ تم میرے سب سے بڑے دوست ہو یا میں نے تمھیں سنگسار کرا دیا تو ایک ایسے انسان سے جو میر صاحب کے اس شعر کا مصداق ہے کہ ؎

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

دنیا ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائے گی یا کسی کو بھی سنگسار کرانا بڑا سنگدلی ہے کیونکہ مذہب کی دھکتی ہوئی آگ کے شعلے ان خیالات کے خس و خاشاک کو بھسم کر دیتے ہیں)۔ خیر میرا غصہ مجبوراً میری کانپتی ہوئی آواز، لال انگارہ آنکھوں اور تمتمائے ہوئے چہرے سے ظاہر ہوا۔ میں نے کہا سنگسار نہ سہی تو کم سے کم اپنے دونوں ہاتھوں سے تمھارا گلا گھونٹ کے تمھاری آنکھوں کے ڈھیلے تو چٹکا ہی سکتا ہوں۔ میں تمھاری طرف جھپٹا ہی تھا کہ جمیل سامنے آگیا۔ چونک کے دیکھا تو اس کا گھر سامنے ہے۔ فوراً جس طرح بنا غصہ ضبط کیا۔ بڑی دیر تک میں چپ رہا۔ بات چیت کا بھی ٹھیک سے جواب نہ دے سکتا تھا جمیل جب وجہ پوچھے تو مجبوراً کہہ دوں یوں ہی طبیعت ذرا ٹھیک نہیں ہے۔ دسترخوان پر میں تم سے دور بیٹھا۔ کھانا پر اد عوتی تھا، اور کوئی دن ہوتا تو اس کی دل کھول کے داد دیتا مگر آج نوالے حلق میں پھنستے تھے اور قریب قریب ہر ایک کو پانی کے ساتھ اتارنا پڑتا تھا۔ اس بات نے میرے غصہ کو اور بڑھا دیا۔ کھانے کے بعد میں نے جلد رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ تم تاڑ گئے کہ خیریت نہیں اور میرے ساتھ نہ آئے۔

اس کے بعد تمھارے ولایت جانے تک میں نے تم سے سیدھے منہ بات نہ کی۔ جب تمھارے وہاں جانے کا زمانہ قریب آیا تو البتہ پرانی دوستی اور میرے خیالات نے مجھے مجبور کیا کہ میں پھر تمھارے پاس جاؤں اور تمھیں ولایت میں قدم سنبھال کے رکھنے کی ہدایت کروں۔ اب مجھے اس بات پر ہنسی آتی ہے

مگر اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں ایک تکلیف دہ فرض کو پورا کر رہا ہوں مجھے یہ دیکھ کے بڑی خوشی ہوئی کہ تم نے میری نصیحت کو بجائے حسب معمول ہنسی میں اڑا دینے کے شکریہ کے ساتھ قبول کیا۔

تمھارے ولایت جانے کے بعد میں نے اپنے آپ کو زیادہ تر فلسفہ اور مذہب کی کتابیں پڑھنے اور نام کے مسلمانوں کو پورا مسلمان بنانے اور نامسلموں کو مشرف بہ اسلام کرنے میں مصروف رکھا اس میں مجھے بڑی کامیابی ہوئی۔ میری ہمت بڑھی اور میں نے مذہب کے استحکام اور فلسفہ کی دھجیاں اڑانے کے لئے کئی زبردست کتابیں تصنیف کیں یہاں تک کہ میرے تابعین نے جن کی تعداد روز افزوں تھی میرے نام کے پہلے 'حضرت' اور آگے 'غزالی ثانی' لکھنا شروع کر دیا اور میں نے بھی اس لقب کو بخوشی اختیار کر لیا۔

میرے خیالات کی یہ حالت تھی کہ تم ولایت سے واپس آئے۔ میں نے تم سے بہ... کھود کھود کے وہاں کی سب باتیں پوچھیں (یہ حال کی بات ہے اس لئے تمھیں سب یاد ہوگی) جب تم نے سب واقعات بتائے اور اپنی آکسفورڈ والی نظم سنائی تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے دل میں غیظ و غضب کا طوفان تھپیڑے مارنے لگا۔ میرے کانوں میں ایک آواز غیب سے آنے لگی (جو پہلے تو بہت صاف نہ تھی مگر روز بروز صاف ہوتی گئی) کہ میں یورپ والوں کی ناپاک سرزمین کو فسق و فجور کی غلاظت سے پاک کروں۔ میں نے اس کا اظہار سوائے حلقۂ مکتوبان خاص کے اور کسی پر نہ کیا۔ سفر کے تفصیلی حالات بیان کرنے کے لئے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے یہاں صرف انھیں باتوں کا ذکر کرتا ہوں جن کا تعلق آئندہ کے واقعات سے ہے۔

جہاز میں کیا سوار ہوا کہ ایک نئی دنیا میں پہنچ گیا۔ ہر طرف عورت مرد اس طرح خوش خوش گھومتے پھرتے نظر آئے جیسے انھیں روز قیامت کا خیال ہی نہیں اور نہ نجات کا غم۔ جدھر دیکھئے ایک ایک جوڑا بیٹھا ہے الگ کونے میں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ لوگ میاں بیوی ہوں گے مگر جب میں نے دیکھا کہ ابھی ایک عورت ایک مرد کے ساتھ بیٹھی ہوئی ہے اور ابھی دوسرے کے ساتھ اور دونوں کے ساتھ اس طرح کہ ہمارے ملک میں بیویاں بھی اپنے شوہروں کے ساتھ اس طرح

نہیں بیٹھتیں تو میرا رُواں رُواں کھڑا ہوگیا کچھ تو جہاز کے ہر وقت گن گن گن گن کرنے کی وجہ سے اور کچھ ان روح لرزا دینے والے مناظر کے ہر وقت آنکھوں کے سامنے رہنے سے مجھے زندگی دوبھر معلوم ہونے لگی اور میں زیادہ تر اپنے کمرے ہی میں بند پڑا رہتا، اپنے بچھونے پر پڑا پڑا غور کیا کرتا کہ کس طرح ان گمراہوں کی ہدایت کروں، پہلے تو یہ مسئلہ طے کرنا تھا کہ اس گمراہی کا سبب کون ہے، میں جلد اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ اصل بس کی گانٹھ عورت ہے، اسی نے آدم کو جنت سے نکالا اور یہی اولاد آدم کو جنت سے محروم رکھنا چاہتی ہے اگر یہ مردوں کی حوصلہ افزائی نہ کرے تو ان کی کبھی ہمت نہ پڑے، میں نے اپنی حالت پر غور کیا اور تھوڑی دیر کے لئے طوعاً وکرہاً یہ خیال کیا کہ اگر بالفرض میرے دل میں وسواس شیطانی پیدا ہو اور میں اس جہاز پر کسی لڑکی سے عشق کرنا چاہوں (ایک بڑی شوخ وشنگ لڑکی تھی اسی کا خیال آیا) اور وہ میری ہمت نہ بڑھائے تو میں کیا کروں گا بقول غالب پیش دستی یا خدا پرستی، میں کچھ فیصلہ نہ کر سکا، آخر یہ خیال پیدا ہوا کہ آزما کے دیکھ لوں آزمائش میں کیا حرج ہے۔اس ارادے سے باہر نکلا اور اسے ڈھونڈنے لگا وہ نظر تو آئی مگر بدستور ایک لمبے کے ساتھ دونوں بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے، مجھے یہ منظر پہلے سے بھی زیادہ برا لگا اور میں بے چینی سے اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ کیسے یہ مردود کھسکے اور میں پہونچوں، خدا خدا کرکے مراد برآئی اور وہ جہنم واصل ہوا میں اپنے دل میں اس طرف بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ایک دوسرا بدمعاش پہنچ گیا اور نہایت بے تکلفی سے اس کے پاس کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا، کوئی برف میں ٹھنڈی کی ہوئی لالہ رنگ چیز جو ضرور شراب ہی ہوگی منگائی اور دونوں نے اپنے گلاس ایک دوسرے سے بجا کے پینا شروع کیا، وہ پگھلی ہوئی آگ ابھی ان کے حلق سے نہ اُتری ہوگی کہ اِدھر جان جل کے کباب ہوگئی، اتنا غصہ شاید مجھے کبھی نہ آیا ہوگا میں چپ بیٹھا دیکھا کیا، کبھی کبھی وہ بدمعاش میری طرف ایسی نگاہوں سے دیکھتا کہ جی چاہتا کہ آنکھ نکال لوں کبھی کبھی وہ بھی ایک نگاہ غلط انداز ڈال ہی دیتی اور پھر فوراً اس طرح ہٹا لیتی کہ کچھ نہ پوچھو۔اس سے کچھ اُمید بندھتی اور دل میں ایک ہلکی سی خوشی کی لہر دوڑ جاتی میں۔اسی طرح بڑی دیر تک بیٹھا رہا وہ ملعون اُٹھنے کا

نام ہی نہ لیتا تھا خیر کسی طرح اُٹھا، اس کے اُٹھنے سے کرسی پر سے اتنا بوجھ نہ اٹھا ہوگا جتنا کہ میرے سینے سے اٹھا۔ میں" اب جگہ تھام کے بیٹھو میری باری آئی ش کہہ کے اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ میرا دل سچ مچ، مثل نقش مدعائے غیر، بیٹھ گیا یعنی کیا دیکھتا ہوں کہ وہ بھی اٹھی اور دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوئے میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ میں تھوڑی دیر تک غصہ اور کھسیاہٹ کی دنیا میں کھویا ہوا رہا۔ پھر چپکے سے اُٹھ کے اپنے کمرے میں چلا گیا پلنگ پہ لیٹ کے جو واقعات ابھی ہوئے تھے ان پر ایک اک کرکے غور کرتا رہا اور اسی حالت میں سوگیا خواب میں بھی وہی سب باتیں نظر آئیں اب زیادہ تو یاد نہیں صرف اتنا یاد ہے کہ کسی طرح ہم لوگ اکیلے ہوگئے۔ میں نے اس سے کچھ "عشق کرنا" چاہا جس پر وہ بگڑی۔ میں نے اسے شوخی و شرارت پر محمول کیا۔ پھر حسن طلب کا خیال پیدا ہوا اور میں نے بصد شوق اپنا منہ اس کی طرف بڑھانا شروع کیا اور اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف ہٹانا، یہاں تک کہ ہمارے ہونٹوں کے درمیان دو ناکوں کا فاصلہ رہ گیا۔ اتنے میں اس نے دفور ناز میں اس زور سے ایک طمانچہ میرے داہنے رخسار پر مارا کہ میں چونک پڑا اور آنکھ کھل گئی کیا دیکھتا ہوں کہ میرا تمام چہرا گرم ہے ناک سے سانس بھی گرم گرم نکل رہی ہے، وہ مقام جہاں طمانچہ لگا تھا خاص طور سے گرم تھا یہ سب واقعات اس قدر آنکھ کے دیکھے معلوم ہو رہے تھے کہ مجھے دھوکا ہونے لگا کہ شاید سچ مچ ایسا ہی ہوا ہو اور وہ مار کے باہر چلی گئی ہو، اس کا کمرے میں آنا خیال میں نہ آیا، خیر اسی شک و شبہے کی حالت میں اُٹھ کے میں نے منہ دھویا، چہرے کی گرمی کم ہوئی اور میں ٹھنڈی ہوا کھانے کے لئے ڈک پر گیا۔ وہاں یہ دیکھ کے میرے پاؤں میں کچھ کمزوری سی محسوس ہونے لگی کہ وہ ڈک کے ایک کونے میں جنگلے پر ٹیک لگائے سمندر میں ڈوبتے ہوئے آفتاب کا منظر دیکھ رہی ہے اور اکیلی ہے میں بھی اس سے کچھ دور اسی طرح کھڑا ہوگیا اگرچہ میں بظاہر لطف منظر اٹھا رہا تھا مگر دل میں کوئی "تقریب بہر ملاقات" سوچ رہا تھا کہ پہلے کیا کہوں اور کس طرح وہ اس کا کیا جواب دے اور میں کیا جواب دوں۔ آدھے گھنٹے تک کی گفتگو سوچ جاتا پھر شروع کا حصہ بھول جاتا اور کوئی دوسرا سلسلہ گفتگو سوچتا۔ خیر یا تو کچھ سوچ کے یا اضطراری

حالت میں (اس وقت میں ٹھیک بتا نہیں سکتا کہ کیا بات تھی) میں نے بڑی لَے کے ساتھ سیٹی بجانی شروع کی، میں عمر بھر گانے بجانے کو گناہ سمجھتا تھا اس لئے اسے خود کیسے جان سکتا تھا مگر اس وقت کی سیٹی سے مجھے ایک لذت محسوس ہوتی تھی اور میں سمجھ رہا تھا کہ بہت پر اثر طریقہ سے بجا رہا ہوں، میں نے تھوڑی ہی دیر بجایا تھا کہ اس نے میری طرف ایک ایسی نگاہ ڈالی جس کے میں معنی نہ سمجھ سکا اور فوراً وہاں سے چلی گئی۔ پھر دو منٹ بعد ایک بغل جاپ ساتھ لئے نمودار ہوئی، اس وقت مجھے بغل جاپ کی موجودگی اتنی بُری نہ معلوم ہوئی بلکہ دل کو کچھ اس خیال سے خوشی ہوئی کہ وہ قصداً مجھے جلانے کے لئے اسے اپنے ساتھ لے آئی ہے، اگر اسے میرا خیال نہیں تو یہ چھیڑ چھاڑ کیوں۔

یہ خیال آنا تھا کہ میری سیٹی نے الفاظ کی صورت اختیار کی اور یہ شعر زبان پر تھا ؎

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو ٭ کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ ادا سے ہم (حالی)

میں اس وقت تک اس لطف کی دنیا میں رہا جب تک وہ چکر لگاتی رہی، ادھر وہ اپنے کمرے میں گئی ادھر میں اپنے کمرے میں۔

اسی طرح دو تین دن کٹے مگر مجھے اس سے بات کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ ایک رات کو پھر میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ میری داڑھی نہایت زوروں سے کھینچ رہی ہے اور یہ کہے جا رہی ہے کہ

اور کیا پھبتی کہوں بن آئے ہو لنگور سے

داڑھی منڈواؤ میں باز آئی خدا کے نور سے (جان صاحب)

آنکھ کھلی تو دیکھا داڑھی ہاتھ میں تھی، فوراً اٹھ کے اپنا چہرا آئینہ میں دیکھا اور بڑی دیر تک دیکھتا رہا غور کیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے،

یہ شعر کہ

ہے ابھی چہرے پہ خود نورِ شباب ٭ بعد میں داڑھی بڑھا لی جائے گی

اس وقت یاد آیا اور کچھ دیر کھٹکتا رہا کیونکہ اس میں کسی قدر منطقی استدلال تھا اور منطق مجھے ہمیشہ سے مرغوب۔ میں نے خیال کیا کہ آخر بات ہے تو لگتی ہوئی۔ نورِ شباب بھی تو خدا ہی کا نور ہے اور

ایک طرح نورِ شباب زیادہ بجا طور پر خدا کا نور ہے یہ آدمی نہیں پیدا کرسکتا داڑھی تو اپنے بس کی چیز ہے رکھی نہ رکھی۔ لہٰذا جب یہ اصلی نور نہ رہ جائے اور چہرے کو اللہ کے نور کی ضرورت ہو اس وقت داڑھی بڑھالی جائے۔ فی الحال بضرورت کام کرنے سے فائدہ۔ یہ سب خیالات آئے، مگر شرع شریف کے حکم کا خیال سب پر بالا تھا، آخر کوئی تو مصلحت ہوگی جس کی بنا پر داڑھی رکھنے کا حکم ہوا ہے، الغرض قریب تھا کہ میں داڑھی رکھنے کے موافق فیصلہ کردوں کہ اتنے میں ایک اور سلسلۂ خیال پیدا ہوا، مجھے یاد آیا۔ کہ میں یہ سب کیوں کررہا ہوں، ظاہر تھا کہ اپنے نفس کے لئے نہیں بلکہ گمراہوں کو صحیح راستہ دکھانے کے لئے، اس لئے مجھے ہر وہ چیز کرنی چاہیئے جو اس پاک مقصد کے حصول میں مدد کرے، داڑھی کا ایک ایک بال اگر گمراہوں کی آنکھوں میں شہتیر کی طرح نہیں تو کم سے کم بہت بڑے بڑے اور موٹے موٹے خس کے تنکوں کی طرح تو ضرور تھا، خواب کی بھی تعبیر یہ تھی کہ جب تک میں داڑھی دور نہ کردوں گا اس محبوب شوخ و شنگ سے قربت حاصل نہ ہوگی خواب کا خیال آتا تھا کہ مجھے یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ آخر میں نے یہ خواب کیوں دیکھا مجھے اس نتیجہ پر پہنچنے میں مطلق دیر نہ لگی کہ یہ خدا کی طرف سے ہدایت تھی، جب میں خدا کے نام کا ڈنکا بجانے اور یورپ کے کلیساؤں میں نعرۂ اذان بلند کرنے کے لئے بحرِ ظلمات عبور کررہا ہوں تو وہ قندیلِ نور مجھے راستہ نہ دکھائیگی تو اور کون دکھائے گا بوجہ سلسلہ وحی کے بند ہو جانے کے خدا اپنے مجاہدوں کو رویائے صادقہ کے ذریعہ سے پیغام پہنچاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا خواب رویائے صادقہ میں سے تھا، یہ خیال آنا تھا کہ میں نے بغیر کچھ اور غور کئے اپنے ناپاک استرے سے ان پاک بالوں کو جو اب تک مجھے جان سے زیادہ عزیز تھے صاف کر ڈالا مونچھ مونڈنے میں کچھ پس و پیش کیا کیونکہ اس پر تاؤ دینے کی میری عادت تھی، اکثر جب کچھ نہ کرتا یا کسی امر پر غور و فکر کرتا تو برابر تاؤ دیا کرتا، اس وقت مجھے یہ خیال آیا کہ اس ناپاک کے جو اکثر اس کے ساتھ رہتا ہے مونچھ ہے یا نہیں، جیسے ہی میری آنکھوں کے سامنے اس کی مادہ رو صورت آئی میں نے استرا اٹھا بقیۃ السیف کو بھی صاف کردیا، آئینہ میں پھر ہر طرح گھما پھرا کے اپنی صورت دیکھی، جیسا محسوس ہوا نہ بتاؤں گا، اس خیال نے

جملہ احساسات کو دور کر دیا کہ یہ صورت اسے پسند آجائے تو سب سوارت ہے، اب تبدیلِ لباس کی بھی فکر ہوئی کیونکہ یہ بھی لازمی نظر آیا، اول تو میرے پاس کوئی انگریزی کپڑا نہیں (ہمیشہ سے نفرت تھی ہوتا کیسے) اور اگر کہیں سے مل بھی جائے تو پہننا معلوم۔ خیر اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ میرے کمرے کا بیرا کسی کام سے آیا، میرے دماغ میں فوراً ایک خیال کی لہر سی دوڑ گئی اور مجھے یہ آناً فاناً محسوس ہوا کہ وہ خدا کا بھیجا ہے۔ میں نے اس سے اپنی مشکل ظاہر کی اور انعام دینے کا وعدہ کیا۔ اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا کہ کوئی نیا سوٹ تو وہاں ملنے سے رہا۔ وہ اپنا ایک پرانا سوٹ البتہ دے سکیگا بشرطیکہ اسے معقول قیمت دی جائے۔ میں فوراً راضی ہو گیا اور اس نے اپنا ایک واقعی پرانا سوٹ (واقعی میں نے اس لئے کہا کہ مجھے ہلکی ہلکی یہ امید تھی کہ شاید پرانا اس نے انکساراً کہا ہو) مجھے لاکے پہنایا، ٹائی وغیرہ سب باندھی۔ مجھے پتلون کچھ اُٹنگا اور ران میں کستا سا معلوم ہوا مگر اس نے مجھے سمجھا دیا کہ یہ میری ڈھیلی مہری کے پاجامہ پہننے کی عادت کی وجہ سے ہے، ابھرے پیٹ پر واسکٹ بھی بہت کسی معلوم ہوئی اور کوٹ کے بٹن تو لگے ہی نہیں، اس نے کہا کہ بٹن نہ لگانا نیا فیشن ہے، خیر میں اسی طرح سج کے اوپر گیا اور اس شوخ کو ادھر ادھر ڈھونڈھنے لگا، ایک جگہ اپنے عاشق یا معشوق کے ساتھ (جو بھی وہ مردود رہا ہو) بیٹھی نظر آئی میں بھی کچھ دور ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور بڑی امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا کہ اب دیکھیں اس کی نگاہیں کیا کہتی ہیں اس نے گوشۂ چشم سے مجھے دیکھا، تھی تو وہ نگاہ غلط انداز ہی مگر میرے اوپر پڑتے ہی جم سی گئی، پھر تو اس نے میری طرف بار بار دیکھنا شروع کیا اور اس بلا کی تبسم آمیز شوخی کے ساتھ کہ کچھ نہ پوچھو، میرے دل سے چہرے تک اور چہرے سے دل تک پہلے گدگدی اور پھر گرم گرم خون کی لہر دوڑنے لگی، کچھ عجب کیفیت تھی ایسی کہ اس کا تجربہ کبھی پہلے نہ ہوا تھا، بے اختیار منہ سے نکل گیا ؎

اک سرسری نظر ہو تو سمجھالوں دل کو بھی ؛ لیکن میں کیا کروں نگہ بار بار کو

کچھ دیر تک میں اور اس پر لطف دنیائے شعر میں رہتا مگر یکایک مجھے جیسے کوئی اینچتے میں ڈھکیل دے۔ اس سب کے اصل مقصد کا خیال آیا اور میں اپنے اوپر غصہ اور لعنت ملامت کرتا اٹھ کے اپنے کمرے میں

چلا گیا، وہاں میں نے اپنے آپ کو خوب بُرا بھلا کہا اس وقت میں اپنی نظروں میں صاف Paphnutius معلوم ہو رہا تھا ایسا جی چاہا کہ داڑھی نوچ لوں، فوراً ہاتھ گال کی طرف اٹھے اور غصہ ان پر اتارا، لیٹے لیٹے از سر نو پھر Paphnutius سے اپنا مقابلہ کرنا شروع کیا اور جلد نتیجے پر پہنچ گیا کہ مجھ میں اور اس میں وہی فرق ہے جو عزازیل اور جبریل میں یعنی بظاہر دونوں فرشتے مگر ایک کا باطن کفر و ضلالت کی سیاہی سے شب دیجور اور دوسرے کا بارش انوار رحمت سے نور اعلیٰ نور، اس سے کچھ دل کی وحشت کم ہوئی، پھر بڑی دیر تک سوچ سوچ کے یہ طے کیا کہ اپنے ارادے کو استقامت دینے کے لئے خدا کو حاضر ناظر گردان کے یہ عہد کروں کہ اس آزمائش کے عشق کو آزمائش کی حد سے بڑھنے نہ دوں گا۔ چاہے وہ مجھ سے سچ مچ عشق ہی کیوں نہ کرنے لگے۔ اس آخری بات نے میرے خیال کو اس جانب منتقل کیا کہ میں نے جس وقت امتحان کی ٹھانی تھی اس وقت صرف نتیجہ کا ایک ہی پہلو سامنے آیا تھا یعنی اگر اس نے میری محبت مسترد کر دی۔ لیکن اس نے اگر میری محبت قبول کی، اس سوال کا خیال ہی نہ کیا تھا، میں نے اپنی اس بیوقوفی پر اپنے آپ کو اور بُرا بھلا کہا اور نئے سرے سے صورت معاملات پر غور کیا بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر اُس نے میری محبت رد کر دی تو میرا امتحان کا مقصد پورا ہوگا اور اگر اس نے قبول کی (جس کا اب مجھے امکان زیادہ معلوم ہوتا تھا) تو اس صورت میں کہ وہ مشرف بہ اسلام ہو اور شرع شریف کے مطابق میری منکوحہ بیوی بننے کی خواہش ظاہر کرے۔ مجھے اسے زوجگی میں قبول کرنے میں کوئی عذر نہ ہونا چاہیئے یہ سب باتیں سوچ کے دل میں اطمینانی صورت پیدا ہوگئی، اب میں زیادہ مستعدی سے اس سے ملنے کا موقع ڈھونڈھنے لگا، جیسے جیسے وہ مجھے دیکھ کے مسکراتی میرے شوق کی آگ اور بھڑکتی، آخر کار میں نے ایک دفعہ اسے اکیلا بیٹھا پا ہی لیا، میں نے اپنے پاؤں مضبوط کئے جو پھر کمزور ہونے شروع ہو گئے تھے اور یہ طے کر کے کہ جس طرح وہ مرد وداس کے پاس کرسی کھینچ کے بے تکلف بیٹھ گیا تھا میں بھی بیٹھوں گا اس کی طرف بڑھا (اپنے درمیان یخ بستہ کو توڑنے کا مجھے اب بہترین طریقہ یہی نظر آتا تھا) کرسی کے پاس پہنچا اور اسے اتنے زور سے کھینچا کہ گھٹنے میں چوٹ بھی لگ گئی، مگر اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس پر اسی زور سے بیٹھ گیا، بیٹھا ہی تھا کہ وہ اونچی آواز میں Coming

غائب ہوگئی۔ میں حافظ کے اس مصرع کی کہ

"بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی ست"

زندہ تصویر بنا در کی در پڑا رہا۔ سوچتا رہا کہ معاملہ کیا ہے، دنیا میں ہم لوگوں کو کچھ غلط پڑھایا گیا تھا کیا کہ حوریں جنت میں مومنوں کی کنیزوں کی طرح ہوں گی۔ یہاں تو قصہ ہی کچھ اور ہے۔ بجائے میرے پاس محبت سے آ کے بیٹھنے کے وہ اس جہاز والی چڑیل کی طرح رفو چکر ہوگئی، اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ بہت سے لوگ مرد عورت میری طرف آتے نظر آئے کچھ دیر تک میں ان لوگوں کو حیرت سے دیکھتا رہا، نہ ایک حرف انھوں نے کہا نہ میں نے۔ آخر میں نے سوچا کہ کب تک زبان خاموشی سے گفتگو کروں۔ کوئی بات بھی ہے، چنانچہ میں نے ان سے پوچھا کہ وہ لوگ کون ہیں اور کیوں مجھے اس طرح دیکھتے ہیں، ادھر میری زبان کا پتہ کھڑکا ادھر ان لوگوں کے ہوش حواس کا گھوڑا بھڑکا، تم میرے اس جملہ کو پڑھ کے ہنسو گے تو مگر جو ہوا اور جس طرح ہوا اسے میں اس سے بہتر طریقہ سے بیان نہیں کر سکتا مجھے اب کی دفعہ تعجب کے ساتھ ہنسی بھی معلوم ہوئی، میں نے کہا یہ لوگ آدمی ہیں کہ گھن چکر۔ پھر خود بخود دل نے جواب دے کے شرمندہ کیا کہ نہ آدمی نہ گھن چکر حوران سیم بر اور غلمان زریں کمر، میں نے کھڑے ہو کے تحکم کے ساتھ کہا "چلو ادھر آؤ" یہ کہنا تھا کہ وہ اور پیچھے ہٹے اور آپس میں کچھ اشاروں اشاروں میں کہہ کے غائب ہوگئے، میں نے کہا یہ سب گونگے ہیں کیا۔ جنت کا تذکرہ کرنیوالے واعظوں کو ایک عدد صلواۃ سنائی کہ ایسی موٹی بات نہ لکھی دل نے کہا دنیا میں یار لوگ ایسے ہی عقلی گدے لڑایا کرتے ہیں اور اَللّٹپ اُڑاتے ہیں۔ اس وقت مجھے ایک دفعہ پھر دنیا میں واپس جانے کی خواہش پیدا ہوئی تاکہ میں لوگوں کو جنت کے صحیح حالات بتا سکوں اور سارے کٹھ ملاؤں کی زبان لال کر سکوں (اس وقت مجھے وہ سب لوگ جنھیں میں علمائے کرام میں سمجھتا تھا کٹھ ملا نظر آتے تھے) میں اپنا غصہ اچھی طرح نہ اتار چکا تھا کہ پھر بہت سے لوگ آتے نظر آئے مختلف چیزیں ہاتھوں میں لئے ہوئے، ان میں ایک چیز از قسم جال کے بھی تھی میں معاملات کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ وہ لوگ میرے چاروں طرف کچھ دور کھڑے ہوگئے اور پھر یکایک اس تیزی سے جھپٹے

جیسے بی چوہے پر اور میں فوراً جال کے اندر۔ میں بہت چھٹپٹایا مگر اکبر کے اس شعر کا مصداق بن کے رہ گیا کہ ؎

"تڑپوگے جتنا جال کے اندر .. جال گھسے گا کھال کے اندر"

میں نے بڑی ڈانٹ ڈپٹ مچائی مگر بے سود۔ یکایک یہ خیال آیا کہ شاید یہ لوگ مجھے کافر سمجھتے ہیں کیا۔ فوراً میں نے بسم اللہ۔ اعوذ باللہ۔ لا الہ اللہ الا اللہ۔ محمد رسول اللہ۔ اللہم صل۔ اللہم بارک۔ وغیرہ باواز بلند ورد کرنا شروع کیا مگر سب اکارت گیا۔ آخر راضی بہ رضا ہوکے چپ ہو گیا۔ خیر جب انھوں نے اچھی طرح دیکھ لیا کہ میں جال سے نہیں نکل سکتا تو ایک اڑتے ہوئے موٹر پر مجھے لاد کے ایک نہایت عظیم الشان باغ میں لے گئے جہاں طرح طرح کے جانور دیکھ کے جی خوش ہو گیا میرے دل میں حور کی طرح کبھی کبھی یہ خیال بھی آجاتا تھا کہ کہیں یہ اعراف تو نہیں ہے ان کے اشارے کی بات چیت سے مجھے کچھ کچھ ان کے گونگے ہونے کا یقین آچلا۔ اور چونکہ اشارے کی زبان ایسی زبان ہے جسے ہر شخص چاہے کسی ملک اور قوم کا کیوں نہ ہو کچھ نہ کچھ اپنی سمجھ کے مطابق سمجھ سکتا ہے اس لئے میں بھی کچھ کچھ ان کے معنی مطلب سمجھنے لگا' مجھے یہ محسوس ہوا کہ وہ لوگ یہ طے کرنا چاہتے ہیں کہ مجھے کہاں رکھیں اور اس مسئلہ نے کافی اختلاف رائے پیدا کر دیا ہے' آخر میں نے یہ دیکھا کہ کچھ جانور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جائے جا رہے ہیں اور نہایت تیزی سے کچھ مشینیں کام کر رہی ہیں تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھے ایسی جگہ لے گئے جس کے ایک طرف چمپنزی بندر اور دوسری طرف کاکاتوا کی بود باش تھی' جو مقام مجھے رہنے کے لئے ملا تھا وہ کافی کشادہ تھا مگر بالکل جزیرہ اس کے چاروں طرف ایک ایک سو ہاتھ چوڑی اور گہری خندقیں تھیں جزیرے میں چند درخت تھے پھول پھل کے اور ایک مصنوعی پہاڑی میں کھوہ'

میں نے اب از سر نو اپنی حالت پر غور کرنا شروع کیا مجھے خیال ہوا شاید کسی گناہ کی سزا میں خداوند تعالیٰ نے میرے لئے یہ سزا تجویز فرمائی ہو اور اپنے رحم و کرم سے مجھے دوزخ کا کندہ نہ بنایا ہو' سزا کی میعاد ختم ہونے کے بعد پھر انشاء اللہ جنت کا پورا آرام نصیب ہوگا' اس خیال کی خوشی کو

مکدر کرنے کے لئے۔ کچھ یہ بھی خیال آیا کہ اگر یہ مقام بالفرض جنت ہے تو پھر یہ لوگ آپس میں اس قدر مشورہ کیوں کر رہے تھے جہاں خدا کا حکم ہوتا وہاں انھیں مجھے بے چون و چرا پہنچا دینا چاہئے تھا مگر لسان الغیب کے اس مصرع نے کہ " رموز مصلحت خویش" یا خدا کے اس انجمن سے نجات بخشی۔

کھانے کے لئے صبح شام مجھے ایک ایسی قسم کی جھولی کے ذریعہ سے جس سے حضرت ابراہیمؑ آگ میں پھینکے گئے تھے۔ ہر قسم کی چیز اینٹ پتھر سے لے کے کچا گوشت تک ملتا۔ اس وقت خاص طور سے تماشائیوں کا مجمع ہوتا اور وہ لوگ بڑے شوق سے یہ دیکھتے نظر آتے کہ میں کیا کھاتا ہوں اور کس طرح۔ میں پھل وغیرہ کھا لیتا۔ ایک دن میں نے سوچا جیسا دیس ویسا بھیس۔ یہ سب اشاروں میں بات کرتے ہیں میں بھی کیوں نہ کروں۔ چنانچہ جب تماشائی اکٹھا ہوئے تو میں نے اشاروں کی زبان میں اس شان سے تقریر کرنی شروع کی کہ اگر تم دیکھتے تو ہنستے ہنستے لوٹ جاتے۔ اس سے وہ لوگ بے انتہا خوش نظر آئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری ذہانت کی داد دے رہے ہیں اب روز بروز تماشائیوں کا مجمع بڑھنے لگا اور میں نے اپنی خاموش گفتگو کا سلسلہ جاری رکھا جس کی وجہ سے ان کی مہربانیاں روز افزوں ہوتی جاتی تھیں۔

ایک دن مغرب کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک زبردست گوریلا میرے جزیرے میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں گھبرا گیا کہ یا اللہ یہ کیا۔ عمر بھر میں پہلے پہل گوریلے سے سابقہ پڑا۔ میں چپکے سے جا کے کھوہ میں گھس گیا اور اس کے منہ پر جس قدر پتھر مل سکے رکھ کے راستہ بند کیا۔ پھر بھی ڈر کے مارے دیر تک نیند نہ آئی۔ جہاں کھٹ سے ہوا اور میں جھٹ سے اٹھ بیٹھا۔ کسی طرح خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ میں نے اپنی کھوہ کے دروازے سے جھانک کے دیکھا تو گوریلا صحن میں بیٹھا ہوا ہے مگر خیریت یہ ہے کہ پیٹھ میری طرف ہے۔ میں چپکے سے کھوہ کے اندر لوٹ گیا اور بڑی دیر تک وہیں اٹھی بیٹھی مچائے رہا۔ جب کھانے کا وقت آیا تو پھر جا کے جھانکا۔ گوریلا بدستور بیٹھا تھا مگر اس دفعہ اس کا منہ میری طرف تھا۔ میں نے تیزی سے اپنا سر کھینچ لیا۔ اتنے میں دھم سے آواز ہوئی' یہ کھانے کے پہنچنے کی اطلاع تھی۔ انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں اس لئے پھر جھانکا۔ کھانے کی ٹوکری کھوہ کے منہ کے پاس ہی پڑی تھی لہ

گوریلا بہت تیزی سے میرے کھانے کی سب چیزیں کھائے جارہا تھا - اس وقت بھی وہ منہ میری ہی طرف کئے بیٹھا تھا مگر کھانے میں منہمک - قریب ہونے کی وجہ سے میں اسے اچھی طرح سے دیکھ سکا. میں نے کہا دیکھوں نر ہے کہ مادہ - دیکھا تو مادہ - میں اسے دیکھ ہی رہا تھا کہ اس کی نگاہ اُٹھی - اس نے جیسے ہی مجھے دیکھا ایسے خوفناک طریقے سے دانت نکالے بھبکی دکھائی کہ میں فوراً پیچھے کی طرف گر سا پڑا - دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا کہ کہیں آ نہ جائے مگر وہ نہ آئی غالباً کھانے میں مصروف رہنے کی وجہ سے - شام کے کھانے کے وقت بھی میں چپ پڑا رہا - دھم سے آواز ہوئی - خالی پیٹ نے بہت ستایا مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا - رات بھر مارے بھوک کے نیند نہ آئی - ڈر الگ - میں نے سوچا کہ تسبیح و تہلیل ہی میں اپنے کو لگائے رکھوں مگر اس دہشت کے مارے روح تحلیل ہوئی جاتی تھی کہ کہیں وہ سجدے کی حالت میں آ گئی تو کیا کروں گا - لہٰذا دل ہی دل میں نہایت خلوص کے ساتھ میں نے خدا سے گڑ گڑا کے دعا مانگی کہ وہ اپنے حبیب پاک کے طفیل میں مجھے اس عذاب الیم سے نجات بخشے - اس وقت مجھے اپنی یہ دعا اپنی جملہ نمازوں سے زیادہ پر اثر و پر کیف معلوم ہوتی تھی - خیر جوں توں صبح ہوئی - میں نے ڈرتے ڈرتے صرف آنکھ نکال کے جھانکا تو وہ دیونی نظر نہ آئی - اب میں نے اپنے سر کا ذرا سا اور حصہ نکال کے دیکھا مگر وہ اب بھی دکھائی نہ دی - جی چاہا کہ نکل کے دیکھوں مگر فوراً ہی خیال آیا کہ کہیں وہ اسی ٹیلے پر بیٹھی نہ ہو - یہ خیال آنا تھا کہ میرا سر خود بخود بقول شخصے داخل دفتر ہو گیا - میں دل میں سوچنے لگا کہ کہیں خدا نے میری دعا قبول نہ کر لی ہو اور اس پلید کو جہنم واصل فرما دیا ہو - اپنی دعا کے اثر پر تو مجھے یقین تھا مگر یہ بات اتنی دل خوش کن تھی کہ اس کا یقین نہ آتا تھا - خیر میں نے یہ طے کیا کہ اصلیت کے جاننے کا موقع کھانے کے وقت آئے گا - اگر وہ اس وقت بھی غائب رہی تو دعا کے قبول ہونے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہ رہیگی - نہایت بے چینی کے ساتھ کان اس دھم کی آواز سننے پر لگے رہے - آخر کار آواز آئی - بے صبری اور خوف کی وجہ سے سر عجب کشمکش میں تھا - ایک آگے کو ڈھکیلے تو دوسرا پیچھے کو گھسیٹے - اگر چاہتے ہو کہ میری اس حالت کی تصویر تمہاری آنکھوں میں پھر جائے تو غالب مرحوم کے مشہور شعر میں ذرا تحریف کر کے یوں پڑھو کہ ؎

رو کے ہے مجھے خوف جو کھینچے ہے مجھے بھوک ؎ کھانا میرے آگے ہے گوریلا مرے پیچھے

خیر کسی طرح میں نے جھانکا ہی ۔ دیکھا تو ٹوکری کھانے کی بھری پڑی ہے اور وہ دیونی ندارد ۔ بے اختیار اس دیوار کو جسے میں نے اپنی حفاظت کے لئے تیار کیا تھا پھاند گیا اور اس ٹوکری پر ٹوٹ پڑا جب شکم سیر ہو کے کھا چکا تو اللہ کا شکر ادا کیا ۔ اس وقت مجھے اپنی رات کی صلوٰۃ بے وضو یاد آئی [۱] اور اپنی ہزاروں " نماز با وضو " پر اس کی فضیلت کا پورا پورا احساس ہوا ۔

اس دن مغرب کے بعد پھر کوئی چیز اسی گوریلا قسم کی مگر مقابلتہً چھوٹے قد کی میری حدود ارضی میں نظر آئی ۔ پھر وہی مصیبت ۔ دل لرز گیا ۔ میں بدستور اپنی ماند میں چپکے سے چلا گیا اور رات بھر اس عذاب سے بچنے کی بھی دعا مانگتا رہا ۔ صبح کو میں نے جھانک کے دیکھا تو وہ بھتنی موجود ہے ۔ چمپینزی کی مادہ معلوم ہوئی ۔ خیر کچھ ہمت کر کے میں نکلا ۔ میرا نکلنا تھا کہ وہ میری طرف اس طرح جھپٹی کہ میرے پائے ثبات بے اختیار اکھڑ گئے اور پھر میں اپنی ماند میں لڑھکتا پڑھکتا جا کے گر پڑا ۔ میں نے کہا آج کا بھی کھانا پینا حرام ہوا ۔ کیا مصیبت ہے ۔ مجھ سے کون سی ایسی خطا سرزد ہوئی جس کی یہ سزا مل رہی ہے ۔ خیر میں نے بدستور سارا دن اور ساری رات الحاح وزاری میں گذاری ۔ ایسا معلوم ہوا کہ خدا نے میری دعا پھر سن لی کیونکہ وہ دوسرے دن کھانے کے وقت نظر نہ آئی میں پھر شکر ایزدی بجا لایا اور اطمینان سے سانس لینے لگا لیکن پھر بھی دل دھڑکتا ہی رہا کہ شام کا وقت خیریت سے گذر جائے تو جانیں ۔ خیر شام ہوئی ۔ ابھی اچھی طرح اندھیرا نہ ہوا تھا کہ پندرہ بیس بندروں کا غول جس میں گوریلا ، لنگور ، اوڈنگ ، چمپینزی اور طرح طرح کے بندر تھے عجب عجب خوفناک آوازوں کے ساتھ لمبے لمبے تیز چمکتے ہوئے دانت نکالتا ایک دوسرے کو کاٹتا کودتا پھاندتا داخل ہوا ۔ اس منظر کو دیکھ کے جان حزیں کی جو حالت ہوئی ہو گی اس کا تم خوب اندازہ کر سکتے ہو ۔ میں نے کیا کیا اور کس طرح کیا مجھے مطلق یاد نہیں ۔ بس میں نے اپنے آپ کو ماند کے ایک کونے میں سر دھنسائے ہوئے پڑا پایا ۔ اس حالت میں کب سے پڑا تھا اور کب تک

[۱] جو نیت ہو تری خالص تو پھر زاہد برابر ہیں ؎ نماز با وضو تیری صلوٰۃ بے وضو میری (مصنف)

پڑا رہا بتا نہیں سکتا۔ ایک ایسی مدت کے بعد جو برسوں معلوم ہوتی تھی ماند کے منہ پر کچھ کھٹ پٹ کی آواز معلوم ہوئی۔ جان نکل گئی، میں نے اور سختی سے اپنا سر کونے میں دھنسایا۔ کچھ دیر بعد چند پیروں کے اندر داخل ہونے کی آواز معلوم ہوئی، اب میں بالکل تن بہ تقدیر ہو گیا۔ بس یہی آرزو رہ گئی کہ جو کچھ ہونا ہے جلد ہو جائے۔ مجھے ہر وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ اب جسم میں خونخوار دانت گھسے اب میرے بدن کے تکے اڑے۔ اتنے میں میری پیٹھ میں کوئی چیز لگی۔ دل بیٹھ گیا۔ مگر پھر نہ دانت گھسے نہ کچھ ہوا۔ ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کوئی کنکری جسم پر پڑ کے اچھل گئی۔ کچھ دیر بعد یکایک ساری ماند روشن ہو گئی۔ جان میں جان آئی۔ پلٹ کے دیکھا تو چند خوبصورت انسان کھڑے ہیں۔ ایک ہاتھ میں ٹارچ کے قسم کی کوئی چیز ہے اور وہ لوگ اپنے سامنے ایک جال پھیلائے ہوئے ہیں میں نے کہا اب پھر مجھے پکڑ کے کہیں لے جائیں گے کیا۔ خیر جال میں بند ھنا اس زندگی سے جو میری تھی ہزار درجہ بہتر تھا۔ اس لئے میں زیادہ ڈرا نہیں اور ان سے اشارے سے پوچھا کہ وہ لوگ کیا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بلا اب سر سے ٹل گئی اور میں باہر نکل سکتا ہوں۔ یہ سنا تھا کہ میں ہمہ تن شکر بن گیا اور وہ لوگ فوراً چلے گئے۔ میں باہر نکلا۔ بہت سے پھل تھے۔ خوب جی بھر کے کھایا۔ آج تماشائیوں کا بڑا مجمع تھا مگر کھانے کے بعد ایسی سستی معلوم ہوئی کہ ویسی کبھی افطار کے بعد بھی نہ معلوم ہوئی تھی۔ بس پڑ رہنے کو جی چاہا اور پڑتے ہی ایسا سویا کہ سارے دن کی خبر لے ڈالی۔ شام کو آنکھ کھلی۔ منہ ہاتھ دھو کے ناشتے کے طور پر کچھ کھایا۔ ابھی میں کھانے سے فارغ نہ ہوا تھا کہ سینکڑوں تماشائی میرے جزیرے کے سامنے آ گئے۔ میں نے کہا خدا نے میرا دل خوش کیا اب میں انکا بھی کروں۔ ان کے قریب گیا اور اشارے کی زبان میں بات چیت شروع کر دی۔ انھوں نے پہلے تو میرے اتنے دن غائب رہنے پر تعجب ظاہر کیا۔ میں نے وجہ بتائی تو ان کا سارا چہرہ خاموش قہقہہ بن گیا۔ انھوں نے ایک پری چہرہ کو جو پاس کھڑی تھی پلٹ کے بتایا کہ مجھے بھی ویسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ میں بغیر جواب دئے فوراً اپنی ماند میں جاکے پڑ رہا اور اقبال کے انداز میں خالق بد حسن خوب خوب شکوے کئے۔ شکوہ ہی کی حالت میں یہ شبہ پھر مجھے ستانے لگا کہ کہیں میرا یہ خیال کہ یہ مقام جنت ہے غلط تو نہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے اس شبہ نے یقین کی صورت اختیار کی اور میں بہت کھسیایا۔ میں نے کہا مفت ہی

اللہ میاں کا اس قدر شکر ادا کیا۔ مگر پھر حضرت شیخ کا یہ فرمانا یاد آیا کہ" در ہر نفسے دو شکرے واجب۔" ظاہر تھا کہ اس کے مقابلہ میں میری شکر گذاری کچھ نہ تھی۔ طبیعت کھسیائی ہوئی تھی اس لئے میں نے شیخ کی شان میں بھی دو تین کلمات خیر کہہ دئے از قسم کبھی خود بھی اس پر عمل کیا تھا کہ دھڑ سے نصیحت ہی کر دی اور اور اگر عمل کیا تھا تو دنیا میں کوئی اور کام کیسے کر سکے مگر پھر فوراً قہر خداوندی کا خیال آیا اس نے میرے غصہ کو عجز و نیاز سے بدل دیا اور میں بڑی دیر تک نماز پڑھتا رہا۔

دوسرے دن ایک حور وحشی میری طرف آتی نظر آئی۔ پہلے تو میں اسے کچھ شبہ کی نظر سے دیکھتا رہا مگر میں نے اس کے ہاتھ میں کوئی خوفناک چیز نہ دیکھی جس کی وجہ سے اطمینان ہوا۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلہ پر رک گئی۔ اب میری کچھ ہمت کھلی اور میں نے اشارے سے اس کو اپنے پاس بلایا۔ ایسا معلوم ہوا کہ میرے اس اشارے سے وہ بہت خوش ہوئی اور فوراً چلی آئی۔ جی چاہتا تھا کہ فوراً اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالدوں مگر ہاتھ اٹھ اٹھ کے رہ جاتا تھا۔ وہ مجھ سے ذرا دور ہٹ کے بے تکلف بیٹھ گئی اور اشاروں میں بات چیت شروع کی۔ مجھے علاوہ اور باتوں کی خوشی کے یہ خوشی بھی تھی کہ اب سب باتیں معلوم ہوجائینگی۔ پہلی بات جو میرا پوچھنے کو جی چاہا وہ قدرتی طور سے وہی تھی جو مجھے سب سے زیادہ ستا رہی تھی یعنی یہ کہ وہ مقام واقعی جنت ہے یا کوئی اور جگہ ہے۔ پوچھنے کا خیال آنے کو تو آگیا مگر جب میں نے پوچھنا چاہا تو بات سمجھ میں نہ آئی کہ کس طرح پوچھوں۔ سوچ ساچ کے میں نے اس مشکل کا حل آخر نکال ہی لیا۔ بڑا جی خوش ہوا اور میں نے اپنی ذہانت کی داد اپنے آپ کو دل ہی دل میں خوب دی میں نے کہا پہلے خدا سے شروع کروں گا وہ ایسی چیز ہے کہ ہر شخص کو اس کا جاننا لازمی ہے۔ فوراً سمجھا سکوں گا۔ پھر اچھے برے کام بتاؤں گا۔ پھر موت کا نقشہ کھینچ دوں گا۔ اس کے بعد یہ خیال آسانی سے ادا ہو جائے گا کہ وہ چیز جو خدا اچھے کاموں کے صلے میں مرنے کے بعد دیتا ہے۔

میں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔ اس نے دیکھ کے اس طرح سر ہلایا کہ معلوم ہوا اچھی طرح سمجھتی ہے اس کے بعد میں نے زمین پر ایک تخت کا نقشہ کھینچا اور اشارے سے تخت کو آسمان پر بتایا اور پھر خود پلتھی مار کے بیٹھ کے یہ ظاہر کیا کہ وہ اس پر بیٹھتا ہے۔ وہ بہت مسکرائی اور مجھ سے یہ اشارہ

کرکے کہ میں ابھی آتی ہوں چلی گئی - جلد ہی کاغذ پنسل لے کے پہنچ گئی اور کاغذ پر نقشہ کھینچ کھینچ کے اور اشاروں کی مدد سے یہ بتایا کہ میرا خیال غلط ہے آسمان پر کوئی چوکور چیز نہیں صرف ستارے گردش کررہے ہیں۔ بس۔ میں نے بہت گردن اردن ہلا کے اور کاغذ پنسل کی مدد سے اپنے خیال کو ظاہر کرنے کی کوشش کی مگر اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا۔ میں نے کہا اچھا یوں نہ سہی یوں سہی - خیال آیا کہ خدا دل میں بھی تو رہتا ہے۔ میں نے فوراً دل کی طرف اشارہ کیا - اس نے پھر گردن ہلا کے بتایا کہ وہ اچھی طرح جانتی ہے اور فوراً دل کا کام بتایا - میں نے زور سے گردن ہلا کے کہا نہیں وہ تو میں جانتا ہوں میرا مطلب اور ہے - اس نے پوچھا کیا - میں بڑی مشکل میں پڑا کہ اب کیسے بتاؤں -ایک ترکیب نکالی۔ دل کی تصویر کھینچ کے اندر تخت کی تصویر بنائی -اب فکر ہوئی کہ اللہ میاں کو کس طرح بتائیں کہ اس تخت پر بیٹھے ہیں - خود بیٹھ کے بتانے والی ترکیب بیکار ثابت ہو چکی تھی - بڑی سخت دقت ۔ نور کے خیال کو کس طرح ظاہر کریں ۔خیر سورج کی طرف اشارہ کیا ، اس نے کہا ہاں ہاں سمجھتے ہیں - پھر کرنوں کو بتایا اور اس کے بعد ان کرنوں کو تخت پر بٹھایا - خیال تو آیا کہ میں سورج کو خدا قرار دئے دے رہا ہوں مگر مجبوری تھی - وہ ظالم اسے بھی نہ سمجھی - اشارے کرکے اس نے بتایا کہ سورج کی کرنوں کا اثر ہر چیز میں ہے دل ہی کی کیا خصوصیت ہے - ایسی طبیعت کھسیا رہی تھی کہ کچھ نہ پوچھو - خدا خالق کائنات ناممکن ہے کہ ہر مخلوق اسے نہ جانے سارے پنکھ پکھیرو اس کی پرستش کرتے ہیں - بقول نظیر ؎

سانجھ سویرے چڑیاں مل مل چوں چوں کرتی ہیں ؎ چوں چوں چونچوں چونچوں کیا بیچوں بیچوں کرتی ہیں

یہ سب بھی کرتے ہوں گے مگر کیا قیامت ہے کہ ایسی بدیہی چیز کو سمجھا نہیں سکتا ۔ اکبر کا یہ مصرع جس نے اکثر بہت تسلی دی تھی کہ " جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا " اس گاڑھے وقت میں بھی یاد آیا مگر بیکار - پہلے اپنے آپ کو سمجھانے کا سوال رہتا تھا اب دوسرے کو سمجھانا ہے ایسے کو جو ہماری زبان نہیں سمجھتا اور اسے سمجھانا ضروری - میں نے کہا خیر مجبوری میں سب جائز ہے - بت پرستی ہی کے خیال سے کچھ مدد لوں - چنانچہ ایک بڑے پتھر پر میں نے پانی ڈالنا شروع کیا - درختوں سے

کچھ پھول توڑ کے اس پر چڑھائے ۔ اس کو دیکھا تو اس کا چہرہ حیرت بنا ہوا ہے ۔ میں نے کہا ابھی نہیں سمجھی ۔ تب میں نے دل میں خدا سے کہا کہ یا اللہ تو علیم و خبیر ہے تو اسے گناہ نہ سمجھنا ۔ میں صرف تیرا خیال ظاہر کرنے کے لئے ایسا کر رہا ہوں ۔ یہ کہہ کے پہلے میں اس پتھر کے آگے ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا ۔ پھر اسے سجدہ کیا ۔ سر اُٹھا کے جو دیکھا تو اس کے چہرہ پر نہ محض حیرت ہے بلکہ ہنسی بھی ۔ میں نے کہا یہ بھی ترکیب نہ چلی ۔ تھوڑی دیر سر کھجاتا رہا اس بات کا احساس کہ میں خدا کے خیال کو نہیں ظاہر کر سکتا اتنا تکلیف دہ تھا کہ میں ہار ماننے کے لئے تیار نہ تھا ۔ خیال آیا کہ کچھ تصرف سے کام لینا چاہیئے مگر پھر وہی دقت ۔ کس چیز کو بتاؤں کہ جو ہر چیز میں ہے ۔ اتنے میں خیال آیا کہ سورج کی روشنی کے متعلق وہ خود کہہ چکی ہے کہ اس کا اثر ہر چیز میں ہے چنانچہ میں نے بتایا کہ وہ چیز جو سورج کی روشنی کی طرح ہر چیز میں ہے ۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا ۔ میں نے کہا بڑی بات ہے ۔ اپنی بالآخر کامیابی پر خوشی ہوئی ۔ دل میں یہ بات کبھی کبھی کھٹکتی تھی کہ کہیں مسخری نے یہ نہ سمجھ لیا ہو کہ میری مراد سورج کی روشنی ہی سے ہے مگر میں اسے فوراً بھول جانے کی کوشش کرتا ۔

اب میں نے اچھے بُرے کاموں کے اظہار کی کوشش شروع کی ۔ سب سے اچھا کام ظاہر تھا کہ نماز ہے ۔ میں جھٹ سے نیت باندھ کھڑا ہو گیا ۔ رکوع سجود کے بعد سلام پھیر کے لگے ہاتھوں دعا بھی مانگ لی کہ یا اللہ میری مشکل آسان کر ۔ اس سے فارغ ہو کے میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہی حیرت اور مسکراہٹ ۔ اب مجھے اس بات کے سمجھانے کی دقت بھی محسوس ہوئی ۔ میں نے کہا اور کون ایسا اچھا کام ہے جسے میں اشاروں سے ظاہر کر دوں ۔ بہت کام خیال میں آئے مگر ایسے کہ جن کی اصلی صفت یعنی اچھائی کو میں ظاہر نہ کر سکتا تھا ۔ پھر میں نے کہا اچھے کام نہیں تو کم سے کم بُرے کام تو ضرور سمجھا سکوں گا پھر اس کے بعد اچھے کام بتانا آسان ہو گا یعنی جو اس کے برعکس ہیں ۔ اب بُرے کاموں کی فہرست سامنے آئی ۔ زنا کو اس فہرست میں اولیت حاصل تھی ۔ مگر اس فعل قبیح کی تشریح کروں تو کیسے ۔ ایک ترکیب سوجھی یعنی پہلے شادی سمجھاؤں جو آسان بات ہے ۔ پھر یہ بتاؤں کہ اُن مردوں اور عورتوں کے درمیان میاں بیوی کے تعلقات جو میاں بیوی نہیں ہیں ۔ چنانچہ

میں نے اسے عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا۔ میں نے اس سے اپنے سامنے بیٹھنے کو کہا۔ وہ مسکراتی ہوئی آ کے بیٹھ گئی۔ پھر میں نے آنکھ بند کر کے اسے بتایا کہ وہ بھی بند کرے۔ اس نے ہنس کے یہ بھی کیا۔ میں نے کہا اب اپنے اور اس کے سر پہ چادر کس طرح ڈالوں۔ وہاں چادر ہی نہیں۔ میں تھوڑی دیر اسی کشش و پنج میں تھا کہ اس نے آنکھ کھول دی اور مسکرا کے گویا یہ پوچھنے لگی " آ گئے "۔ میں نے کہا یوں کام نہ چلے گا۔ جا کے بہت سے پھول توڑ لایا مگر سہرا کیسے گوندھوں وہاں تاگا کہاں۔ اس سے اشارہ کر کے بتایا۔ وہ فوراً سر ہلا کے مسکراتی ہوئی چلی گئی اور جلد بہت سا تاگا لے آئی۔ میں نے جھٹ جھٹ دو سہرے تیار کئے۔ ایک اس کے باندھنے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر اس نے میرے ہاتھ سے لے لیا۔ پھر میں نے خود اپنے سہرا باندھا اور اس سے بتایا کہ وہ بھی اسی طرح باندھے۔ اس نے خوش ہو کے جھٹ سے باندھ لیا ہم دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ کچھ نہ پوچھو روح تک لذت یاب ہو گئی۔ مگر جب میں نے نگاہ استفسار اس کے چہرے پر ڈالی تو صاف معلوم ہوا کہ کچھ نہیں سمجھی۔ میں نے ایک اور ترکیب سوچی۔ کاغذ پر ایک مرد کی تصویر بنائی ایک عورت کی اور دونوں کی گردن میں طوق ڈال کے ایک زنجیر سے ملا دیا۔ وہ یہ دیکھ کے کچھ ہنسی کچھ چیں بجبیں ہوئی اور فوراً پنسل سے زنجیر کاٹ دی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ شادی کے خیال کو اب میں کس طرح ظاہر کروں۔ پھر وہی بے بسی کا احساس۔ اتنے میں خیال آیا کہ اگر اس بات کو ظاہر نہیں کر سکتا تو کم سے کم چوری کے خیال کو تو ضرور کر سکتا ہوں جو دوسرا بہت بڑا کام ہے۔ اس کے لئے ملکیت کے خیال کو ظاہر کرنا ضروری تھا جو آسان بات معلوم ہوئی۔ میں نے پھل وغیرہ کو دکھا کے جواب بھی کچھ باقی تھے کہا کہ اگر وہ انھیں لے لے تو کیا ہوگا۔ اس نے اشارے سے کہا کہ اگر اسے ضرورت ہے اور مجھے نہیں تو کیا حرج ہے۔ میں نے بتایا کہ اچھا اگر میں اس کی کتاب واپس نہ کروں تو۔ اس نے پھر وہی جواب دیا۔ میں نے کہا عجب اُلٹی کھوپری کے لوگ ہیں۔

میں بڑے مخمصے میں پڑا تھا اور کوئی بات سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ بس بار بار سر کھجلا رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ کے مسکرائی اور کتاب کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ پہلے میں اس کی زبان سیکھ لوں پھر ہم لوگ آسانی

سے ایک دوسرے کی بات سمجھ سکیں گے۔ اس وقت جو کچھ میراجی چاہے پوچھ لوں گا۔ میں خوشی سے راضی ہوگیا بات معقول تھی۔ مگر اس نے کہا پہلے ایک اور ضروری کام کرنا ہے۔ میں اس کام کی نوعیت نہ سمجھا اور فوراً گردن اس جوشیلے انداز سے ہلائی جس سے ظاہر ہوتا تھا " ہاں ہاں بسر وچشم "۔ وہ گئی اور تھوڑی دیر کے بعد چند لوگوں کو اپنے ساتھ لے آئی۔ انھوں نے مجھ سے منہ کھولنے کو کہا۔ کیا کرتا مجبوراً کھولا۔ ایک مردِ دونے فوراً کمانی کی قسم کی کوئی چیز لگادی جس سے منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کے بعد انگلی ڈال کے اس نے اچھی طرح میرے منہ کے ہر حصہ کو ٹٹولا۔ آخر کار زبان کو پکڑا اور اس کی خوب دیکھ بھال کی حلق کا بھی یہی حال ہوا۔ اس نے اشارے سے بتایا کہ میری زبان ضرورت سے زیادہ بڑی ہے اور حلق میں بھی کچھ خرابی ہے جو اپریشن اور دوا کے استعمال سے دور ہو جائے گی۔ میں بہت گھبرایا۔ ڈرا کہ منہ میں کمانی لگی ہوئی ہے کہیں ظالم اپریشن شروع نہ کردیں۔ اس وقت کی بلا سر سے ٹالنے کے لئے میں نے بڑی لجاجت اور خوشامد کے انداز میں ظاہر کیا کہ میں بعد میں اپریشن کرالوں گا فی الحال منہ سے کمانی نکال دیجائے۔ انھوں نے فوراً نکال دی اور بعد میں آنے کا اشارہ کرکے چلے گئے۔ جان بچی لاکھوں پائے کا مضمون تھا مگر دل بڑی دیر تک دھڑکتا رہا۔ میں تھوڑی دیر تک چپ بیٹھا رہا اور پھر چپ چاپ اٹھ کے اپنی ماند میں چلا گیا۔

دوسرے دن اگرچہ دل پر خوف کا اثر غالب تھا مگر پھر بھی اس پری چہرہ کو دیکھنے اور اس سے خاموش سلسلہ گفتگو جاری رکھنے کو بے اختیار جی چاہ رہا تھا۔ زبان دل بس یہ کہہ رہی تھی کہ ؎

ساتھ میں اس کے ڈاکٹر ہاتھ میں جن کے نیشتر ٭ آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

تھوڑی دیر بعد وہ آئی اور اکیلی آئی۔ جی خوش ہوگیا۔ اس نے پوچھا کب اپریشن کراؤگے۔ کیا جواب دیتا۔ ٹالنے کی کوشش کی مگر جیسے وہ ہاتھ دھو کے پیچھے ہی پڑگئی۔ میں نے کہا اشاروں سے سب کچھ نہیں کہہ سکتا، تھوڑی بہت اپنی زبان سکھادو تب بتاؤں۔ خیر وہ راضی ہوگئی۔ چونکہ زبان بہت سیدھے سادھے اصول پر تھی اس لئے میں تیزی سے سیکھنے لگا۔ ایک جی تو اپنی ذہانت دکھانے کو چاہتا تھا دوسرا اس سے روکتا تھا یہ خیال دلا کے کہ جتنی جلدی زبان سیکھو گے اتنے ہی جلد اپنی زبان

کٹوانے کا ٹیڑھا سوال پیدا ہوگا ۔ بڑی مشکل تھی ۔ اس کے سامنے گودن بننے پر بھی دل آمادہ نہ ہوتا تھا اور نہ آبان ہی کٹوانی منظور تھی ۔ خیرالامور اوسطہا کا کلیہ یہاں بھی کام آیا اور میں نے کبھی گودن اور کبھی ذہین بن بنکے مہینے ڈیڑھ مہینے پار کر دئے ۔ اس عرصہ میں اس کا حسن اور دلربایانہ انداز (جس کی دلکشی میں اشاروں کی گفتگو نے چار چاند لگا دئے تھے) اکثر مجھے بیخود کر دیتا اور ہوس پیش دستی غالب آتی مگر اس کا ایک اشارہ میرے ہاتھ پاؤں جکڑ دینے کے لئے کافی ہوتا ۔ وہ عموماً ایسے موقعوں پر میری زبان کی طرف اشارہ کرتی کہ اسے جلد کٹوا دو ۔ کچھ دنوں کے بعد تو ظالم برابر زبان کٹوانے کا سوال پیش کرنے لگی ۔ آخر کار میں نے ایک دن اس کو اسی کی زبان میں سمجھایا کہ زبان ایک نعمت ہے ۔ بجائے اس کے کہ مجھ سے کٹوانے کو کہا جائے ان لوگوں کو اپنی زبان ہلانے کی کوشش شروع کر دینی چاہیئے ۔ کچھ دنوں کے بعد وہ بھی بولنے لگیں گے اور اس کی اہمیت سمجھیں گے ۔ اس نے جواب دیا کہ منہ سے آوازیں نکالنا جانوروں کا کام ہے انسان کا نہیں ۔ مجھ میں جو کچھ عیب ہے وہ یہی ۔ اگر میں ان لوگوں کی دنیا میں انسانوں کے حقوق حاصل کرنا چاہتا ہوں تو مجھے گونگا ہو کے رہنا پڑے گا ورنہ جیسے اب تک جانوروں کی طرح رہتا چلا آیا ہوں رہوں گا ۔ میں نے پھر اسے سمجھانے کی جان توڑ کر کوشش کی مگر بے سود ۔ مجبوراً چپ ہو رہا ۔ سوتے جاگتے ہر وقت سوچا کرتا ۔ ان لوگوں کی جہالت اور نادانی پر رہ رہ کے غصہ آتا کہ اپنے عیب کو خوبی سمجھتے ہیں اور مجھ میں جو لے دے کے ایک خوبی ہے اس کو عیب ۔ خیر اگر اس کو خوبی نہیں سمجھتے نہ سمجھیں مگر ظالم رواداری سے تو کام لیں ۔ یہاں تو یہ ہے کہ اگر چاہتے ہو ہم تمھیں انسان سمجھیں تو بالکل ہماری طرح ہو جاؤ ۔ ہمارے عیب کو خوبی سمجھو اپنی خوبی کو عیب ورنہ تم جانور ہم انسان اور چونکہ کثرت انہی لوگوں کی ہے اس لئے جس کی لاٹھی اس کی بھینس ۔ عمر بھر میں جتنا فلسفہ پڑھا تھا اور بہت پڑھا تھا سب یاد آ گیا ۔ ان سے بہت کچھ تسلی دینے کی کوشش کی مگر اس تلخ حقیقت کے آگے کہ زبان کٹوانی پڑے گی سب تسلیوں کے چھینٹے زخم پر نمک کا کام کرتے تھے ۔ آخر کار جو کام فلسفہ سے نہ ہوا وہ محبت نے کیا ۔ رہ رہ کے اس شوخ کا اشارہ دل میں چٹکیاں لیتا کہ پہلے زبان کٹواؤ تب ۔ دنیا کے تمام مشہور

عاشقوں کے واقعات آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ ان کی قربانیوں کے آگے میرا ایک ذرا سا پارۂ گوشت کو کٹوا کے پھینک دینا کوئی بڑی بات نہ معلوم ہوئی۔ چنانچہ دوسرے دن جب وہ حسب معمول آئی تو اس پر عشق کا احسان جتا کے میں نے زبان کٹوانے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ یہ دیکھ کے وہ جس طرح خوش ہوئی میں کبھی نہ بھولوں گا۔ ایک بجلی سی کوندی۔ اس نے میرے دونوں رخساروں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور چشم زدن میں غائب ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کچھ لوگوں کے ساتھ نمودار ہوئی۔ اس کے بعد کیا ہوا اور کیسے ہوا میں نہیں بیان کر سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اینجانب اس وقت زبان بریدہ ہیں۔

اس حادثہ کے پیش آنے کے بعد میں بہت جلد یہاں کی سوسائٹی کا رکن ہو گیا۔ اب میں یہاں کی زبان اور طرز معاشرت سے پوری طرح واقف ہوں۔ میں تفصیل سے اس کا نقشہ کھینچتا اور سچ یہ ہے کہ میں نے اسی لئے لکھنا شروع ہی کیا تھا مگر یہ خط شیطان کی آنت ہو چکا ہے۔ پڑھتے پڑھتے گھبرا گئے ہوگے۔ اس وقت زیادہ لکھنا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ ایک بات اور بھی ہے، مجھے ڈر ہے کہ تم کہیں اس خط کو شائع نہ کر بیٹھو۔ میں تمھیں ایسا کرنے سے منع نہیں کرتا کیونکہ جانتا ہوں بیکار ہے مگر ذرا پہلے سوچ سمجھ لینا۔ اول تو شائد ہی ہماری موجودہ صحافت میں کوئی ایسا "ظلوم وجہول" رسالہ ہو جو اس بار امانت کو قبول کرنے کی جسارت کرے تو تم کہوگے کس کا سر پھرا ہے کہ ایک تو بار بھی اٹھائے دوسرے گالی بھی کھائے، مگر میں کیا کروں

درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند ٭ آنچہ استاد ازل گفت ہماں میگویم)

جامعہ کو آزما کے دیکھو۔ اسی سے کچھ 'قابو ملا' کہنے کی امید کی جا سکتی ہے (اگر غور سے دیکھو تو میری اس سچی کہانی میں کوئی ایسی بات نہیں جو اسے اچھوت بنا دے۔ جیسا تم نے دیکھا ہوگا اس میں معنی کی کم سے کم تین تہیں ہیں۔ پہلی تہ تو ضرور یاران جنگجو کو برافروختہ کر دینے کے لئے کافی کیا کافی سے زیادہ ہے۔ دوسری جو ذرا سے غور کے بعد ظاہر ہو جاتی ہے اس پر کوئی سمجھ دار آدمی ناخوش نہیں ہو سکتا بلکہ شاید خوش ہی ہو۔ رہی تیسری وہاں تک صرف انھیں لوگوں کی نگاہیں پہنچیں گی جو محرم راز ہیں

اور بمصیغۂ انھیں سے دادِ سخن پانے کی اُمید ہے۔ برہمی کیسی)۔ خیر تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی رسالہ واقعی سرپھرا ثابت ہوا تو کیا تمھارے خیال میں جتنا میں لکھ چکا ہوں وہ کافی بارنہیں۔ میری رائے میں تو اسی وقت کافی سے زیادہ ہے۔ اتنا پہلے اچھی طرح سنبھل جائے پھر اور دیکھا جائیگا۔

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست ؎ اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

رہی تمھاری دلچسپی۔ اس کے لئے یہاں اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ یہ دنیا تمھاری اس خیالی دنیا سے بہت ملتی جلتی ہے جس کا ذکر تم کبھی کبھی مجھے چھیڑنے یا اپنے دل کا بخار نکالنے کے لئے یا جس لئے بھی ہو کیا کرتے تھے (یہ زبردستی کا اتہام ہے۔ میری خیالی دنیا تو شاعر کی دنیا ہے جہاں "ہیں جائے من و جائے تو باشد" کا مضمون مضمون ہو۔ شاید مولانا کا مطلب اُس آنے والی دنیا سے ہے جس کا ذکر میں ان سے کبھی کبھی کیا کرتا تھا)۔ تم مجھے لکھنا کہ یہ خط شائع ہوا کہ نہیں۔ اگر ہوا تو اس کا کیا اثر ہوا۔ اسی کے مطابق میں پھر تمھیں لکھوں گا۔ ہاں اگر تم یہ یقین دلاؤ کہ تم میرے خطوں کو شائع نہ کرو گے تو البتہ تمھاری معلومات اور دلچسپی کے لئے یہاں کی ایک ایک بات کی تفصیل فوراً لکھ بھیجوں۔ مگر انھیں پڑھ کے تم اپنے بکری کے بچے کی طرح یہاں آنے کے لئے بیقرار ہو جاؤ گے۔ اس بیقراری کا علاج میرے پاس نہیں۔ اس لئے ذرا سوچ سمجھ کے لکھنا۔

جو کچھ مجھے کہنا تھا میں نے رو میں جس طرح بنا کہہ دیا۔ اب اگر تم اس کے متعلق بھی اکبر کے الفاظ یہ کہو کہ ؎

ڈالدے جان معانی میں وہ اُردو یہ ہے ؎ کروٹیں لینے لگے طبع وہ پہلو یہ ہے

تو سوائے اس کے کہ تمھاری سخن فہمی اور ذوقِ سلیم کی داد دوں اور کیا کر سکتا ہوں۔ اچھا مری جان اب خدا حافظ'

تمھارا .....

ہمزاد

ہاں ایک بات اور کر سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ جب تم خود اس طرح کہو تو پھر میں بھی کیوں نہ تمھاری

ہاں میں ہاں ملا کے ایک تو تمھیں خوش کروں دوسرے خود بھی خوش ہوں۔ یہ تمھارا ہی مقولہ ہے نا ؎

دل میں محمود ہیں زباں سے ایاز ٭ اس قدر انکسار کون کرے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا ٭ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کیلئے

فضل احمد کریم فضلی

ترکی میں تعلیم

ترکی میں مسئلہ تعلیم کی تاریخ تین عہدوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔

(۱) تعلیم دینی کا دور۔ آغاز سے تنظیمات تک یعنی ۱۸۳۹ء تک

(۲) درمیانی دور۔ تنظیمات سے جمہوریت کے اعلان تک ۱۸۳۹ء سے ۱۹۲۳ء

(۳) اصلاحات کا دور۔ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۷ء

پہلے دور کی مدت پانچ صدی۔ دوسرے کی تقریباً ایک صدی یا کچھ کم اور تیسرے کی جس میں حیرت انگیز تبدیلی اور ترقی ہوئی ہے پندرہ سال۔

جب پہلے پہل ترکوں نے خانہ بدوشی کو ترک کیا اور مفتوحہ علاقوں میں آ بسے تو انہیں یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اپنے فوجی نظام اور دیوانی محکمہ جات کے افسروں کے لئے تعلیم و تربیت کی سہولتیں مہیا کریں۔ اس غرض کے لئے ترکوں نے نیسیا اور بروصہ میں قاضی اور مفتی تیار کرنے کے لئے مدارس جاری کئے۔ سلیمان اعظم کے عہد حکومت کے اختتام تک یہ مدرسے تعداد میں برابر بڑھتے اور ترقی کرتے گئے۔ اور ان ہی اداروں سے سلطنت عثمانیہ کے بڑے بڑے نامور حکام تربیت پا کر نکلے۔

تنظیمات اس تحریک کا نام ہے جس کے زیر اثر ترکی سلطنت نے ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہونے کی کوشش کی۔ اس تحریک نے جدید "اسکول" کی بنیاد ڈالی مگر پرانے مدرسے جوں کے توں رہے۔ اس عہد میں پرانی دینی قسم کی تعلیم اور زمانۂ جدید کی تعلیم دونوں برابر جاری رہیں۔ پرانے مدارس کی تنظیم اور انصرام تو شیخ الاسلام کے ہاتھ میں رہا اور نئے اسکولوں اور اداروں کے لئے ایک نیا محکمہ معارف قائم کیا گیا وزارت معارف کے اسکولوں میں نصاب تعلیم محض عربی زبان پر ہی موقوف نہ تھا۔ بلکہ حکومت کی طرف سے انجینیرنگ اسکول اور گلاطہ سرائے کا لیسے کھولے گئے۔ لیسے میں ذریعہ تعلیم فرانسیسی اور اساتذہ بھی فرانسیسی تھے اس ادارے سے پرانی اور نئی طرز حکومت کے سیاسیئن فارغ التحصیل ہو کر نکلے۔

صوبجات کے والی اور حکام کی تربیت سول سروس اسکول، ملکیہ، (۱۸۷۶) میں کی جاتی تھی۔ قانون کے لئے ایک علیحدہ ادارہ حقوق مکتبی (۱۸۷۹) تھا مگر تعلیمی ترقی کے لحاظ سے سب سے شاندار۔ راہم دور اصلاحات کا ہے۔ جس میں نظام تعلیم کے بنیادی اصول چار قرار پائے گئے۔ (۱) تعلیم کو مذہبی اثرات سے آزاد کرنا (۲) اتحاد ملی (۳) لڑکوں اور زنانہ تعلیم کے طریقوں کی مغائرت دور کرنا (۴) طلبا کی ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ جسمانی تربیت کا انتظام۔

پچھلے دس سال میں ترکوں کی تمدنی اور سیاسی زندگی میں حیرت انگیز تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں اور مغربی تمدن کے اختیار کرنے کی تحریک کے جدید تعلیمی تحریک سے گہرے تعلقات ہیں۔ اس تحریک کا سب سے اہم اقدام لاطینی رسم الخط کا اختیار کرنا تھا۔ دوسرے ترکی تاریخ کی تدریس کی اصلاح اور ترکی زبان کی اصلاح۔

ترکی سیکڑوں سال سے عربی اور فارسی الفاظ اور تراکیب ترکی لغت میں شامل ہوتی رہی ہیں درحقیقت زیادہ مشکل تو تراکیب اضافی۔ وصفی اور اسماء الجمع وغیرہ کی تھی ان اجنبی تراکیب کی وجہ سے زبان بہت مشکل اور بے ڈھنگی ہو گئی۔ اور طرز بیان غیر واضح اور پیچ دار ہو کر رہ گیا۔ درحقیقت یہ زبان محض ادبی اور کتابی بن گئی جس کا حلقۂ اثر تعلیم یافتہ طبقہ تھا۔ اس کی وجہ سے تحریری زبان اور عام فہم زبان میں ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی۔

شمسی۔ نمیق کمال اور اکرم اور دوسرے جدید مصنفین کے اثر سے ترکی زبان بہت سے اجنبی اثرات سے پاک ہو گئی۔ لیکن جدت پسند طبیعتوں کے لئے اس تحریک کی رفتار بہت سست تھی اس لئے بعض مصلحین نے یہ کوشش کی کہ جن عربی اور فارسی الفاظ کے بجائے ترکی الفاظ مل سکتے ہیں وہ ترکی لغت سے خارج کر دئے جائیں۔ پس ترکی ماہرین السنہ نے صوبوں، دیہاتوں اور ان غیر ممالک میں جہاں ترکی زبان بولی جاتی ہے نئے ترکی الفاظ کی جستجو میں علمی تحقیقات شروع کر دی تاکہ یہ الفاظ اجنبی خارج شدہ الفاظ کی جگہ لے سکیں۔ آغاز جمہوریت اور آزادی کے جوش و خروش میں تو یہ تحریک خوب زور پکڑ گئی مگر اب کچھ ٹھنڈی پڑ گئی ہے۔ تاہم لغت کا اصلاحی کام چل رہا ہے۔ اور ابھی تک اس کے نتائج پر کوئی حتمی

فیصلہ نہیں دیا جا سکتا۔

ابتدائی مدارس سلاطین ترکیہ کے زمانہ میں اب سے بیس سال پہلے تک ابتدائی تعلیم کا انتظام وزارت معارف کے ہاتھ میں تھا۔ بعض مدارس غیر ملکیوں کے تھے۔ دوسرے غیر مسلم اقوام کے مذہبی ابتدائی مدارس شیخ الاسلام اور محکمہ اوقاف کے ماتحت تھے۔ ۳ مارچ ۱۹۲۴ء کے قانون کے تحت یہ مختلف النوع ادارے یک قلم موقوف کر دئے گئے اور ابتدائی تعلیم کا کل نظام وزارت معارف کو تفویض کیا گیا۔ ابتدائی تعلیم کی مدت گاؤں میں تین سال اور قصبوں میں پانچ سال ہے۔ پہلی تین جماعتوں میں ایک جامع مضمون پڑھایا جاتا ہے جس کا نام علم حیات (حیات بلگیسی) ہے۔ اس میں معلومات انسانی کے ابتدائی امور شامل ہیں۔ بچوں کو ان کے ماحول کی اشیاء کا مطالعہ کرایا جاتا ہے اور ایسے مشاہدات پر غور و فکر کرنا سکھایا جاتا ہے جو ان کی قوت متخیلہ کو بیدار کر دیں۔ نیز انہیں تقریر۔ تحریر۔ نقاشی اور ورزش کی مشق کرائی جاتی ہے تاکہ ان میں قوت بیان اور طاقت اظہار پیدا ہو۔ ان اداروں کی تعلیم مشہور و معروف حقیقی واقعات پر مبنی ہوتی ہے۔ اور بالعموم سبقوں کے عنوان روزانہ اخباروں کی سرخیوں سے لئے جاتے ہیں۔ مثلاً پچھلے دنوں ترکوں کی توجہ مسئلہ سنجک پر مرکوز تھی۔ اس موقعہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بچوں کو بتایا گیا کہ ملک شام کب تک زمانے میں ترکوں کے قبضہ میں تھا۔ یا اس سے متعلق دوسرے مسائل مثلاً بحیرۂ روم کی سیاسی اہمیت کیا ہے؟ زبان اساس ملی کو زندہ رکھنے کا ذریعہ کیوں ہے؟ انتداب Mandate۔ مجلس اقوام اور سیاسی عہد نامے کیا ہیں۔ وغیرہ وغیرہ ہر سال ۱۴ جنوری سے ۱۸ جنوری تک مسو دیشی یا کفایتی، ہفتہ منایا جاتا ہے۔ اگر موسم خوشگوار ہوا تو اس ہفتے کے دوران میں ملکی صنعت و حرفت کی ترقی کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ بچے کارخانوں۔ بنکوں اور ریلوے اسٹیشنوں کی سیر کرتے ہیں۔ اسی ضمن میں ان کو علم اقتصادیات کی بھی کچھ واقفیت ہو جاتی ہے مثلاً ملکی پیداوار۔ درآمد۔ برآمد۔ بنک کا سود۔ قرضہ ملی۔ تجارت سے ضروری مسائل سے روشناسی ہو جاتی ہے۔

گرامر اسکول گرامر اسکول ابتدائی مدارس اور لیسے کی درمیانی کڑی ہے۔ گرامر اسکول کی مدت تعلیم چھ سال ہے جس کو دو برابر حصوں میں منقسم کر دیا گیا ہے آخری تین سال درجۂ لیسے کے لئے مخصوص ہیں۔

لیسے نے دور اصلاحات میں ولایات کے عدادیہ مدارس کی جگہ لے لی ہے۔ اس کا

نصاب وسیع اور جدید کر دیا ہے۔ معیار تعلیم بھی پہلے سے بلند ہے۔ یونیورسٹی میں بہتر طلبا بھیجنے کی غرض سے میٹرک امتحان کو سکول لیونگ سرٹیفکٹ سے علیحدہ قرار دیا گیا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں طلبا کی تعداد ۱۱،۷۴۶ تھی جو ۱۹۲۶ء کی تعداد سے دس گنی ہے۔ بعض ولایات (صوبوں) میں بہت سے نئے مدارس قائم کئے گئے ہیں اور ان میں دار الاقامہ۔ ورزش خانے۔ معمل اور کتب خانے تعمیر کئے گئے ہیں۔

اگرچہ اب نصاب میں سائنس کے مختلف مضامین کا اضافہ ہو گیا ہے تاہم عربی اور فارسی کی لازمی تعلیم خارج کرنے کی وجہ سے کام کافی ہلکا ہو گیا ہے۔ عربی اور فارسی نکال دینے سے کچھ ایسا تعلیمی نقصان واقع نہیں ہوا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان زبانوں کے پڑھانے کے طریق پرانے اور فرسودہ تھے۔ اور زیادہ زور طالب علم کی قوت حافظہ پر دیا جاتا تھا۔ اس کی قوت ادراک اور ذہنی ارتقا کے لئے اس طریقۂ تعلیم میں کوئی جگہ نہ تھی۔ ان غلط طریقوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ان اصحاب کے ہاتھ میں جو پرانے عدایہ مدارس کے تعلیم یافتہ ہیں فارسی یا عربی زبان کی کوئی کتاب دے دی جائے تو اس کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکتے۔

یونیورسٹیاں آج کل ترکی میں صرف استنبول کی یونیورسٹی ہے جس میں پانچ شعبے ہیں۔ قانون۔ ادب۔ اقتصادیات۔ سائنس۔ طب۔

یونیورسٹی کے اساتذہ میں ایسے اصحاب ہیں جو اپنے علم و فضل کی وجہ سے یورپ بھر میں مشہور ہیں۔ ان میں سے بیشتر اہل جرمن ہیں جن کو نازی حکومت نے ملک بدر کر دیا ہے۔ لکچر بالعموم جرمن یا فرانسیسی زبان میں ہوتے ہیں اور نوجوان ترک پروفیسر جو غیر ملکی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہیں ان کا ترجمہ ترکی زبان میں کر دیتے ہیں۔ ان اساتذہ کے ساتھ یہ معاہدہ ہے کہ وہ چار سال کے بعد ترکی زبان میں لکچر دیا کریں گے۔ ان میں سے بعض نے تو اس مدت معینہ سے پہلے ہی اس شرط کو پورا کر دیا ہے۔ چند سالوں میں انگورا میں بھی ایک یونیورسٹی قائم کی جائے گی۔ فی الحال وہاں قانون۔ السنۂ جدیدہ۔ جغرافیہ۔ تاریخ۔ اور طب حیوانات کے شعبے موجود ہیں۔ علوم سیاسی کا مدرسہ جو دیوانی محکموں کے لئے امیدوار تیار کرتا ہے حال میں ہی انگورا منتقل کر دیا گیا ہے۔ اور عنقریب ہی شعبہ طب کا افتتاح بھی ہو جائے گا۔ انگورا اور استنبول میں مدارس میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے ایک چوتھائی ہے صرف استنبول کے شعبہ ادب میں لڑکیاں تعداد میں کچھ زیادہ ہیں یعنی لڑکے

۲۰۷ اور لڑکیاں ۷۸۲ طالبات لڑکیوں کا مقصد یونیورسٹی کی تعلیم سے محض ذہنی تربیت ہی نہیں بلکہ وہ اس تعلیم کے ذریعہ اقتصادی آزادی حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ ترکی میں لڑکیوں کے لئے کوئی ملازمت یا پیشہ ممنوع نہیں۔ منشی گری میں تو عورتوں کی بھرمار ہے ہی مگر آج کل تو عورتیں منصف۔ وکیل۔ طبیب۔ سلوتری اور سرکاری ملازم بھی ہونے لگی ہیں۔

آج ہم انگورا اور ترکی کے ہر بڑے شہر میں علی الصبح جب سیکڑوں عورتوں کو بنکوں اور دفاتر وزارت میں روزانہ کام پر جاتے دیکھتے ہیں تو خواہ مخواہ دل میں خیال آتا ہے کہ بیس برس پیشتر انہیں کی بہنیں حرم سرائے کی چاردیواری میں مقید رہا کرتی تھیں۔ ترکیہ جدید کی ترقی پر حیرت ہی نہیں ہوتی معجزہ کا گمان ہوتا ہے

مدارس کی تعداد زیادہ ہو جانے سے طلبا کے رہنے سہنے کا مسئلہ بھی زیادہ اہم ہوتا جا رہا ہے۔ انگورا کو ہی لے لیجئے اس کی آبادی چالیس ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ تیس ہزار ہو گئی ہے۔ اور انگورا یونیورسٹی کی تجویز کے ساتھ ساتھ رہنے سہنے کے انتظامات کا مسئلہ بھی اتنا ہی اہم ہے۔

وزارت تعلیم جب کبھی کوئی نیا مدرسہ کھولتی ہے تو ساتھ ہی دارالاقامے کا بھی انتظام کرنا پڑتا ہے۔ ترکیہ جدیدہ میں یونیورسٹیوں نے ایک بہت ہی اہم کام اپنے ذمہ لے لیا ہے اور وہ علمی تحقیقات ہے۔ اب ترک اپنی تاریخ کو غیر ملکی مصنفین کی عینک لگا کر نہ پڑھیں گے۔ ترکی نوجوان کو تاریخی اور آثار قدیمہ کی تحقیقات کے جدید طریقوں پر تربیت دی جا رہی ہے تاکہ محکمۂ آثار قدیمہ اجنبی محققین کا مرہونِ منت نہ رہے۔

فنی تعلیم ترکی حکومت جو تجاویز صنعت و حرفت کو ترقی دینے کے لئے عمل میں لا رہی ہے ان سے ہر صناع اور پیشہ ور کے سامنے ترقی کی نئی راہیں کھل گئی ہیں۔ اسلئے وہ فنی اور صنعتی ادارے جو علمی اور جدید تعلیم دیتے ہیں مقبول عام ہو گئے ہیں۔ تین ماہ ہوئے جب انگورا میں گھریلو صنعت و دستکاری کی نمائش کی گئی تھی جس کے مطالعہ سے پتہ چلا کہ ترکی صناع کی مہارت اور نفاست کس طرح دوبارہ نئی زندگی حاصل کر رہی ہے۔ فوجی اور جہاز رانی کے مدارس کے علاوہ اور بہت سے فنی ادارے کھولے گئے ہیں۔ جو اپنی قبیل کے یورپی مدارس سے لگا کھا سکتے ہیں مثلاً نارمل ہائی اسکول۔ انجینیروں کا ہائی اسکول۔ فنون لطیفہ کا مدرسہ۔ زراعتی مدرسہ۔ اور ٹریننگ کالج۔ فنی تعلیم و تربیت کے کام میں عورتوں نے بڑا حصہ لیا ہے۔ انگورا میں عصمت الونو کا مدرسہ

ترکیہ جدید کی آزاد عورت کے لئے کھولا گیا ہے۔

اجنبی اثرات | ترکی کے نظام تعلیم کی تشکیل میں ترکی سیاسیئن نے کسی یورپی ملک کی نقالی نہیں کی۔ بادی النظر میں تو یہ نظام تعلیم گنگا جمنی سا معلوم ہوتا ہے۔ کہیں کہیں امریکی، فرانسیسی اور جرمنی اثرات نظر آتے ہیں۔ ابتدائی مدارس کے نصاب میں کنڈرگارٹن کے خد و خال نمایاں ہیں۔ فنی تربیت میں امریکی فنی اداروں کے اصول صاف دکھائی دیتے ہیں اور لیسے مدارس کی ساخت فرانسیسی لیسے سے ملتی جلتی ہے درحقیقت ترکی سیاسیئن کو جہاں کہیں بھی کوئی اچھی بات نظر آئی تو انھوں نے دوسرے کی پیروی کرنے میں تامل نہ کیا۔ تاہم غیر ملکی اصولوں کو اختیار کرتے ہوئے انھوں نے یہ حقیقت پیش نظر رکھی کہ ترک بچے کا ذہنی ارتقا، اس کی جبلت اور پیدائشی خصلت مختلف ہیں اور اسی لئے انھوں نے غیر ملکی نصاب اور طریق میں مناسب ترمیم اور تبدیلی کر دی۔ آج کل اگر کوئی حکومت کسی شعبے کی اصلاح کا کام اپنے ہاتھ میں لیتی ہے تو وہ سب سے پہلے ان تحقیقاتی اور اصلاحی اقدامات کی مکمل معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرتی ہے جو اس سلسلے میں غیر ممالک میں عمل میں لائے گئے۔ ترکیہ جدید نے بھی یہی کیا۔ نیز حکومت کے دفاتر ان نوجوان ترکوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جنھوں نے غیر ممالک میں تعلیم پائی۔ انہیں میں سے بعض ترقی کر کے محکموں کے افسر اعلےٰ بھی ہو گئے ہیں۔ قصرِ تعلیم کو بلند کرنے میں ان سب لوگوں کا حصہ ہے اور اسی لئے ترکی نظام تعلیم میں گنگا جمنی رنگ نمایاں ہے۔

تعلیمی مسائل اور مشکلات | اگرچہ لیسے مدارس کا معیار تعلیم پرانے اعدادیہ مدارس سے بہت اونچا ہے تاہم ترکیہ جدید اس سے مطمئن نہیں بلکہ وہ ان کو بہترین یورپی اداروں کا مدِ مقابل بنانا چاہتی ہے۔ اور اس مقصد کے حصول کے واسطے ہر ممکن کوشش عمل میں لائی جا رہی ہے۔ لیسے کے فارغ التحصیل طلباً کے معیار لیاقت کو بلند کرنے سے ہی یونیورسٹی تعلیم کا معیار بلند ہو سکتا ہے اور وزارت کے محکموں میں آجکل یونیورسٹی کے اسناد یافتگاں ہی بھرتی کئے جاتے ہیں۔ السنۂ جدیدہ کی تعلیم کا مسئلہ ملک کے لئے بے حد اہم اور ضروری ہے۔ ادبِ ملی کی تکمیل کا مسئلہ بھی فوری توجہ کا محتاج ہے۔ بہت سے مغربی شاہکار اب تک ترکی زبان میں ترجمہ نہیں ہو سکے۔ اس بارِ عظیم کی ذمہ داری آئندہ نسلوں پر ہے۔

ترکی سیاسئین کی دور اندیش پالیسی کی وجہ سے استنبول یونیورسٹی کا معیار تعلیم بہت بلند ہوگیا ہے۔ نصاب تعلیم وسعت اور معیار میں یونیورسٹیوں سے کسی حالت میں کم نہیں ہے۔ اگر کوتاہی ہے تو اساتذہ کی طرف سے نہیں بلکہ طلبار کی طرف سے ہے۔ اسی غرض سے حکومت لیسے کا معیار بڑھانے کی انتہائی کوشش کر رہی ہے۔ انگورا یونیورسٹی کی تجویز کے بعد حکومت تیسری یونیورسٹی کے قیام پر غور کرے گی۔

ادب کی تدریس ترکی زبان کی اصلاح نے ایک اور مشکل پیدا کردی ہے۔ موجودہ اسکولوں میں فارسی اور عربی کی صرف ونحو نہیں پڑھائی جاتی، اسلیئے پچھلے دس سال کے عرصے میں بہت سے فارسی الفاظ بیکار اور غیر مستعمل ہو گئے ہیں۔ نہ تو سرکاری تحریریں استعمال ہوتے ہیں اور نہ اخباروں میں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ترکی طلباب ترکی متقدمین کا کلام پڑھ نہیں سکتے اور نیفی۔ نبی۔ فضلی اور ندیم جیسے شعراان کے لئے معمہ ہوکر رہ گئے ہیں۔ ادب قدیم کو مدارس کے نصاب سے خارج کرنے کا تو خیال بھی کسی کے ذہن میں نہیں آسکتا۔ ادب تو قوموں کی حیاتِ ماضی کا آئینہ اور حیات ملّی کا اہم جزو ہوتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس پرانے کلام میں سے غیر مستعمل اور غیر مانوس الفاظ نکال دیئے جائیں۔ اس میں یہ دقت ہے کہ اصل اور جدید ایڈیشن میں کوئی مطابقت نہ رہے گی۔ ترکی کے تعلیمی حلقوں میں اس مسئلہ پر بہت غور کیا جارہا ہے۔

دیہاتی مدارس ترکی میں گاؤں دور دور واقع ہوئے ہیں اور آبادی کم ہے۔ فاصلے کی وجہ سے گاؤں کو تعلیمی ضروریات کے لئے ملحق نہیں کیا جاسکتا۔

بعض حالات میں جغرافی مشکلات تو دور ہو سکتی ہیں مگر اس سے عام مسئلہ تعلیم حل نہیں ہو پاتا۔ درحقیقت چالیس ہزار مدارس کی تعمیر اور اساتذہ کی فراہمی کے لئے بہت رقم کی ضرورت ہے۔ اعلان جمہوریت سے سال بسال تعلیم عاملہ کی مد پر خرچ کا اضافہ ہی ہوتا رہا ہے لیکن ضروریات اس قدر وسیع ہیں کہ ایک معمولی میزانیہ کی مدات سے اس کو پورا نہیں کیا جاسکتا۔ اُمید ہے کہ مستقبل قریب میں جب حکومت کی صنعتی اسکیم تکمیل پا چکے گی تو اک پنج سالہ تعلیمی لائحہ عمل کی بنیاد ڈالی جائے گی۔ ترکی میں تعلیمی پالیسی کی تعمیر جمہوریت اور شہریت کے اصولوں پر استوار کی گئی ہے۔ ابتدائی مدارس کے نچلے درجوں

سے لے کر یونیورسٹی کے اعلیٰ درجے تک کہیں بھی سماجی امتیازات کا نام و نشان نہیں ہے۔ بالعموم تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ دارالاقامہ کے طلبا سے بھی رہنے سہنے کے لئے کچھ نہیں لیا جاتا۔ جہاں کہیں فیس لگائی گئی ہے محض برائے نام ہے۔ اور مقامی اقتصادی حالات کا جائزہ لے کر اس نسبت سے لگائی جاتی ہے۔

مدرسے نہ صرف طلبا کو کشمکش حیات کے لئے تیار کرتے ہیں بلکہ ایسے شہری پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جنکو فرائض ملی کا پورا پورا احساس ہے بچوں کو موجودہ حکومت سے محبت کرنے کا سبق سکھایا جاتا ہے جس نے ترکی کو آزادی۔ تحفظ نفس اور خودداری کی تعلیم دی۔ حبِّ وطن کے اس جذبے کو ہر طریق سے بیدار رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ ترک بچے اور بچیاں نہ صرف یہ جانتے ہیں کہ کیا کچھ کیا جا چکا ہے۔ بلکہ انھیں اس امر کا بھی شدید احساس ہے کہ کیا کچھ کرنا باقی ہے۔ انہیں بتایا جاتا ہے کہ اس اہم کام کی ذمہ داری ان کے شانوں پر ہے ان میں بجائے ایک مصنوعی جذبۂ افتخار اور طمانیت پیدا کرنے کے ایک پیہم قوت عمل بیدار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ انہیں یہ نہیں پڑھایا جاتا کہ ترکی ایک بہشت ہے بلکہ یہ کہ اس کو بہشت بنانا ان کے ہاتھ میں ہے۔ تعلیمی ترقی کا راستہ وادی پرخار میں سے گزرتا ہے لیکن پچھلے پندرہ سال کی کوششوں کے نتائج بے حد حوصلہ افزا ہیں۔ تجربی اور نامکمل کوششوں کا دور جلد ہی ختم ہو جائے گا ترکوں نے ضبط و تنظیم کی خداداد قابلیت کا عجیب شاندار مظاہرہ دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ آئندہ نسل اپنے پیشترو مصلحین کے تجربے اور ان تھک کوششوں کا پھل اٹھائے گی اور ان کے لئے ترقی کی شاہ راہ پرفضا اور آسان ہو گی۔ (ایشیاٹک ریویو)

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش | نامور ترکی خاتون خالدہ ادیب خانم کے اُن آٹھ خطبات کا مجموعہ جو موصوف نے جامعہ ملیہ کی دعوت پر ہندوستان تشریف لا کر جامعہ میں پڑھے۔

اصل لیکچر انگریزی میں تھے۔ اردو ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم، اے، پی ایچ، ڈی نے کیا ہے۔ شروع میں ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری مرحوم کا ایک جامع اور اہم مقدمہ ہے۔ قیمت مجلد صرف عہ/۔ انگریزی ہے ر

تقسیم و انتشار آراضی

جناب حبیب الرحمٰن صاحب، پروفیسر معاشیات، جامعہ عثمانیہ نے گذشتہ مارچ میں لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے "ہندوستانی زراعت کے بعض معاشی مسائل" پر تین تقریریں نشر کی تھیں۔ اس سلسلے کی پہلی تقریر کھاد کے عنوان پر مئی ۳۰ء کے "جامعہ" میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ اسی سلسلے کی دوسری تقریر ہے۔

ہندوستان کی زرعی زمین سے تعلق رکھنے والے مسائل میں تقسیم و انتشار آراضی کا مسئلہ بہت اہم اور فوری توجہ کا محتاج ہے، کیوں کہ اول تو یہ خرابی تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہے، دوسرے ترقی و اصلاح کی تمام تدبیروں میں مانع اور (اس طرح) ہندوستانی کاشتکاروں کی خوش حالی میں بری طرح حائل ہو رہی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ اولاً اس مسئلے کی نوعیت اچھی طرح سمجھ لی جائے تاکہ ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ اصل خرابی کیا ہے۔ اور اس کی بدولت ہماری زراعت کی ترقی میں کس قسم کی رکاوٹیں پیش آ رہی ہیں۔

یہ ایک بدیہی بات ہے کہ دولت پیدا کرنے کے لئے مختلف عوامل درکار ہوتے ہیں لیکن یہ بات بھی کچھ کم بدیہی نہیں ہے کہ کاروبار کی نوعیت اور پیمانہ پیدائش کا لحاظ کرتے ہوئے ان عوامل کی جو مختلف مقداریں درکار ہوتی ہیں، ان میں ایک طرح کا تناسب برقرار رکھنا کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہے۔ زراعت ہو یا صنعت و حرفت، تجارت ہو یا آمد و رفت، ہر شعبہ پیدائش میں اس بدیہی اور سیدھے سادے اصول کی پابندی ناگزیر ہے ورنہ کاروبار کے نفع بخش طریقے پر چلنا ناممکن ہے۔ مثلاً اگر کسی کاروبار میں مشینیں تو ہوں ضرورت سے زائد لیکن ان کو استعمال کرنے کیلئے کافی مزدور نوکر نہ ہوں، یا مشین اور مزدور دونوں موجود ہوں لیکن خام پیداوار کافی مقدار میں تیار نہ رکھی جائے، یا یہ تمام چیزیں تو مناسب مقدار میں موجود ہوں لیکن کام کرنے کے لئے جگہ بہت تنگ ہو، تو

ظاہر ہے کہ تمام صورتیں انتظام کی خرابی کا نتیجہ سمجھی جائیں گی، اور اگر کاروبار میں نقصان آئے، یا کم نفع حاصل ہونے لگے تو اس کا باعث اس خرابی انتظام کو قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی کسان زمین لے بے ضرورت سے زائد لیکن کام کرنے کے لئے اس کے پاس کافی آدمی موجود نہ ہوں، یا یہ دونوں عامل موجود ہوں۔ لیکن ان کی مناسبت سے زرعی آلات و اوزار یا بونے کے لئے کافی تخم دستیاب نہ ہوں یا اس کے برعکس کام کرنے والے تو کثیر تعداد میں موجود ہوں لیکن اسی مناسبت سے نہ زمین ہو اور نہ آلات و اوزار، تو ظاہر ہے کہ یہ حالات بھی کسی طرح زرعی کاروبار کے لئے نفع بخش نہیں ثابت ہو سکتے۔ ایسی ہی مثالیں پیدائش کے دولت کے دوسرے شعبوں سے بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ انسانی جدو جہد کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اس بنیادی اصول کے عمل سے مستثنیٰ ہو۔ لیکن ہندوستانی زراعت کے موجودہ حالات میں اس اصول کی صریح خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ ہمارے ملک کی ۷۰ فی صدی آبادی زراعت کو اپنا ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہے۔ لیکن اتنی کثیر تعداد کو کاشت کے لئے جس قدر زمین ملنی چاہیئے، وہ اسے میسر نہیں ہے اور نہ اس کے پاس اس قدر سرمایہ ہے کہ وہ جدید آلات و اوزار، عمدہ تخم، مناسب کھاد، طاقت ور مویشی اور ترقی زراعت کی دوسری ترکیبیں اختیار کر سکے۔ بہ الفاظ دیگر ہماری زراعت میں ایک عامل پیدائش یعنی محنت تو کثیر مقدار میں موجود ہے لیکن دوسرے عوامل یعنی زمین و اصل اسی مناسبت سے موجود نہیں ہیں۔

جب ایک محدود رقبۂ زمین ایک کثیر مقدار میں تقسیم ہوتا جائے گا تو ظاہر ہے کہ ہر ہر شخص کے حصے میں جو رقبہ آئے گا وہ چھوٹا ہوتا جائے گا۔ چنانچہ ہندوستان کی زرعی زمین کسانوں کی روز افزوں تعداد میں تقسیم ہوتے ہوتے اب اس نوبت پر پہنچ گئی ہے، اور کاشتکاروں کو فرداً فرداً جو رقبہ ملا ہوا ہے وہ اب اس قدر چھوٹا ہو گیا ہے کہ کسان اور اس کا خاندان اس پر اپنا پورا وقت مفید طریقے پر صرف نہیں کر سکتے۔ تقسیم آراضی سے دراصل یہی صورتِ حال مراد ہے اور ایسے ہی چھوٹے چھوٹے غیر نفع بخش کھیتوں کو اصطلاح میں غیر معاشی کھیت کہتے ہیں۔

تقسیم آراضی کے علاوہ اور اس سے بھی زیادہ مضرت رساں ایک اور خرابی یہ ہے کہ کسان

کو جو کچھ تھوڑی بہت زمین حاصل ہے۔ وہ سب ایک مقام پر موجود نہیں ہوتی بلکہ اس کے کئی چھوٹے بڑے ٹکڑے ہوتے ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ اور دور دور واقع ہوتے ہیں۔ اسی خرابی کو اصطلاح میں انتشار آراضی کہتے ہیں۔

ہندوستان میں تقسیم و انتشار آراضی کی خرابی اب کس حد تک پہنچ گئی ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لئے چند اعداد و شمار پر نظر ڈالنا مناسب ہے۔ اس بارے میں سب سے زیادہ مکمل تحقیق پنجاب میں کی گئی ہے جس سے حسب ذیل اعداد[ف] تیار کئے گئے ہیں

ایک ایکڑ یا اس سے بھی کم رقبے پر کاشت کرنے والے کسانوں کی تعداد	۵ ر ۲۲
ایک سے ۲½ ایکڑ تک کاشت کرنے والے کسانوں کی تعداد	۴ ر ۱۵
۲½ سے ۵ ایکڑ " " " "	۹ ر ۱۷
۵ سے ۱۰ ایکڑ " " " "	۵ ر ۲۰

دوسرے صوبوں کے متعلق ایسے جامع اعداد و شمار حاصل نہیں ہیں لیکن زرعی کمیشن کی یہ رائے ہے کہ بمبئی اور برما کو چھوڑکر دوسرے تمام صوبوں میں کافی کاشتکار اوسط رقبے کی مقدار پنجاب سے بھی کم ہے۔ بمبئی کی حالت غالباً پنجاب ہی کی سی ہے اور برما کا اوسط غالباً پنجاب سے زیادہ نکلے گا سنہ ۱۹۲۱ء کی (CENSUS) رپورٹ میں مختلف صوبوں کے اندرونی کاشتکار زیر کاشت ایکڑ کی مقدار حسب ذیل ہے۔

بمبئی	۲ ر ۱۲
پنجاب	۲ ر ۹
صوبہ متوسط برار	۵ ر ۸
برما	۶ ر ۵

ف:۔ ماخوذ از رپورٹ زرعی کمیشن بابت سنہ ۱۹۲۸ء۔

مدراس	۴٫۹
بنگال	۳٫۱
بہار اڑیسہ	۳٫۱
آسام	۳٫۰
صوبجات متحدہ	۲٫۵

زرعی کمیشن کا خیال ہے کہ گو یہ اعداد کامل طور پر صحیح نہیں ہیں تاہم ان سے سرسری طور پر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں کھیتوں کا رقبہ گھٹتے گھٹتے کس حد تک پہنچ گیا ہے۔

انتشار کے متعلق کمیشن نے بعض دیہی تحقیقات کا حوالہ دیا ہے۔ مثلاً پمپلا سوداگر میں ڈاکٹر مین کی تحقیق کے مطابق ۶۲ فی صدی کسانوں کے کھیت وسعت میں ایک ایکڑ سے کم ہیں۔ جاتے گاؤں میں ایسے کسانوں کی تعداد ۳۱ فی صدی ہے۔ بیرام پور میں مسٹر بھالا کی تحقیق کے مطابق ۳۴ $\frac{1}{2}$ فی صد کسان ایسے ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس پچیس جدا جدا قطعات ہیں۔ پنجاب میں بہ کثرت ایسے اشخاص ملتے ہیں جن کی زمینیں بیس بیس، تیس تیس مختلف جگہوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مسٹر کالورٹ کو تو ایک کسان ایسا بھی ملا جس کی زمین کے دو سو سے زیادہ جدا جدا منتشر ٹکڑے تھے۔ بعض مقامات میں تو اس خرابی کی بدولت کھیتوں کی حالت بالکل مضحکہ خیز ہوگئی ہے۔ مثلاً رتنا گیری میں بعض قطعوں کی وسعت ایکڑ کے ایک سو ساٹھویں حصے یعنی ۳۰ $\frac{1}{4}$ گز تک پہنچ گئی ہے۔ پنجاب میں بعض کھیت ایسے پائے گئے ہیں جو ایک ایک میل لانبے لیکن صرف چند گز چوڑے ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد رقبے ایسے موجود ہیں جو منتشر ہوتے ہوتے اب اس حد کو پہنچ گئے ہیں کہ ان پر کاشت کرنا سرے سے ناممکن ہوگیا ہے۔

تقسیم و انتشار آراضی سے ہندوستان کی زراعت کو جو گوناگون نقصانات پہنچ رہے ہیں، ان کا بہ آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً عوامل پیدائش کا نقصان بہت بدیہی ہے۔ کاشتکار اور اس کے مویشیوں کا بہت سا وقت اور بہت سی محنت مختلف کھیتوں کے درمیان آنے جانے میں

ضائع جاتی ہے اور زمین بہت چھوٹی ہونے سے کاشتکار نہ اپنے آپ کو اور نہ اپنے مویشیوں کو پورے وقت مصروف رکھ سکتا ہے۔ حالانکہ کام کم لینے سے کچھ مویشیوں کی خوراک میں کمی واقع ہوتی۔ جس قدر کھیت منتشر ہوتے ہیں اسی قدر زیادہ زمین حد بندی کی نذر کرنا پڑتی ہے اور اس طور پر جو زمین فصل اُگانے کے کام آتی وہ یوں ہی بے کار ضائع ہوتی ہے۔ فرداً فرداً تو یہ نقصان کچھ قابل لحاظ نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے تو جو قابلِ کاشت زمین ضائع ہو رہی ہے، اس کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ یوں بھی منتشر کھیتوں کے مصارف نسبتاً بہت زیادہ ہوتے ہیں کیوں کہ ایک طرف عوامل پیدائش ضائع ہوتے ہیں اور دوسری طرف کھیتوں کی نگرانی اور پیداوار کے نقل و حمل کے مصارف بڑھ جاتے ہیں۔ اور ان مادی نقصانات کے علاوہ پڑوسیوں سے آئے دن جو جھگڑے ہوتے ہیں اور اپنے ہم پیشہ ساتھیوں سے مقدمہ بازی کی جو ترغیب ہوتی ہے وہ علیحدہ ہے۔ لیکن ان سب سے زیادہ اہم اور بہ لحاظ اپنے اثرات کے بنیادی اور مستقل نقصان یہ پہنچا ہے کہ کاشتکاروں کو اپنے کاروبار میں زیادہ روپیہ لگا کر اسے بہتر بنانے اور ترقی دینے کی کوئی ترغیب نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ جب تک کوئی خاص معینہ رقبۂ زمین اس کے قبضے میں نہ ہو کیونکر کوئی کاشتکار روپیہ خرچ کر کے خسارہ اُٹھانے پر آمادہ ہوگا۔ نتیجہ یہ ہے کہ کھیتوں کے اطراف ایسی باڑ لگائی جاتی ہے جو فصل کو آوارہ جانوروں اور چوروں کے حملوں سے محفوظ رکھ سکے، نہ کھیتوں پر کنوئیں کھودے جاتے ہیں کہ جن سے بارش کی بہت زیادہ احتیاج باقی نہ رہے، نہ کھاد خریدنے کی طرف توجہ کی جاتی ہے اور نہ نئے آلات و اوزار استعمال کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ تمام چیزیں صرف اسی وقت مفید ہو سکتی ہیں جبکہ رقبۂ کاشت کافی وسیع ہو۔ ذرا ذرا سے قطعات پر ایسی اصلاحات اول تو عمل میں نہیں لائی جا سکتیں اور اگر انھیں عمل میں لایا بھی جائے تو اُن سے بجائے فائدے کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہی حال ذرائع آب پاشی کا ہے۔ ذرا ذرا سے ٹکڑے کے لئے کون کنواں کھودنے کی طرف راغب ہوگا اور بے شمار چھوٹے چھوٹے کھیتوں کی نہروں سے کیوں کر آب پاشی کی جائے گی۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ بہت سے کسان مل مل کر کنوئیں کھودیں اور استعمال کریں یا سرکاری نہروں سے اکٹھا پانی حاصل کر کے آپس میں تقسیم کرلیں۔ لیکن موجودہ حالات میں اس کی کامیابی

کی کوئی توقع نہیں ہے۔ مختصر یہ کہ موجودہ حالات میں ہماری زراعت کو دونوں طرح سے نقصان پہنچ رہا ہے کیونکہ ایک طرف تو اس میں چھوٹے کھیتوں کی تمام خرابیاں موجود ہیں جس کی وجہ سے نہ مشینیں استعمال کی جاسکتی ہیں اور نہ محنت بچانے کے دوسرے طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں اور دوسری طرف وہ چھوٹے کھیتوں کے خاص فوائد سے محروم ہے۔ کیونکہ انتشار کی وجہ سے کاشتکار ہر ہر قطعہ پر پوری توجہ صرف نہیں کرسکتا۔

ہندوستان میں تقسیم و انتشار آراضی کی موجودہ حالت کے کئی اسباب بیان کئے جاتے ہیں۔ اس بارے میں بعض لوگوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے قوانین وراثت پر بہت زور دیا جاتا ہے اور انہیں قوانین کو وہ تقسیم و انتشار کا خاص سبب قرار دیتے ہیں۔ اگر موروثی جائداد ہر ہر نسل کے بعد ورثا میں برابر تقسیم ہوتی چلی جائے اور ساتھ ہی ساتھ آبادی میں اضافہ ہوتا رہے تو ظاہر ہے کہ جائداد کے نہ صرف چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوجائیں گے بلکہ جہاں زمین یکساں زرخیزی والی نہ ہوگی وہاں یہ ٹکڑے ایک دوسرے سے منتشر بھی ہوتے جائیں گے تاکہ ہر وارث کو ہر قسم کی زمین میں حصہ مل سکے اس میں شک نہیں کہ اس خرابی کے پیدا کرنے میں ملک کے قوانین وراثت کا ضرور حصہ ہے۔ لیکن ان کو تقسیم و انتشار کا بنیادی سبب قرار دینا درست نہیں ہے۔ اول تو ہندوستان کی کثیر آبادی میں اشتراک خاندان کا طریقہ رائج ہے جس کے مطابق موروثی جائداد منقسم نہیں ہوتی بلکہ مشترک رہتی ہے۔ مسلمانوں کے قوانین کا رجحان یقیناً تقسیم در تقسیم کی طرف ہے۔ لیکن زراعت کے پیشے میں مسلمانوں کی تعداد نسبتاً کم ہے۔ اس کے علاوہ قوانین وراثت خواہ وہ ہندوؤں کے ہوں یا مسلمانوں کے، مدتوں سے ہمارے ملک میں رائج ہیں لیکن تقسیم و انتشار آراضی کی موجودہ خرابی نسبتاً حال کی بات ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ محض قوانین وراثت موجودہ صورت حال کے پیدا کرنے کے لئے کافی نہ تھے بلکہ کچھ اسباب اور ایسے پیدا ہوگئے تھے جو بجا طور پر اس کے ذمہ دار قرار دئے جاسکتے ہیں۔ ان نئے اسباب میں آبادی کا اضافہ، ملکی صنعتوں کی تباہی اور اشتراک خاندان کے طریقے کا زوال، یہ امور خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ جب تک ملک میں مزید قابل کاشت زمین

آسانی سے حاصل ہو جاتی تھی، اضافۂ آبادی کا کوئی خاص اثر محسوس نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ موروثی زمین کے ٹکڑے کرنے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ چند صنا اسی گاؤں میں کوئی نئی زمین زیر کاشت لے آئیں۔ لیکن گذشتہ سوڈیڑھ سو سال سے کچھ تو اضافہ آبادی کی بدولت اور اس سے کہیں زیادہ ملکی صنعتوں کے زوال کے باعث کاشت کے لئے نئی نئی آراضی کا دستیاب ہونا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ریلوں اور دوسرے ذرائع آمدورفت کی ترقی اور ساتھ ہی حکومت کی آزاد تجارت والی پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں کثرت سے دوسرے ملکوں کی مصنوعات آ آکر فروخت ہونے لگیں اور مشین کے استعمال کی بدولت یہ چیزیں یہاں اس قدر سستی بکنے لگیں کہ ہندوستان کے دستکار ہاتھ سے تیار کیا ہوا مال اس قدر سستے داموں فروخت نہیں کر سکتے تھے۔ اور چونکہ حکومت اس بارے میں دخل دینے کے لئے قطعًا تیار نہ تھی اس لئے نتیجہ بالکل بدیہی تھا۔ ہندوستانی دستکار اور صناع روزافزوں تعداد میں اپنے اپنے پیشوں سے دست کش ہونے لگے اور آبائی زمینوں پر کاشت کر کے گذراوقات کرنے لگے اس طرح نہ صرف قدرتی اضافۂ آبادی بلکہ تبدیلِ پیشہ کے ذریعے سے بھی ہندوستان میں زراعت پیشہ طبقے کی تعداد خوب بڑھنے لگی اور زمین پر اس کا روز افزوں بار پڑنے لگا۔ اب اگر کاشتکاروں کی یہ روزافزوں تعداد اپنے قدیم اور روائتی اشتراک خاندان کے طریقے سے استفادہ کر کے آبائی جائداد کو مشترک رکھتی اور اس پر مشترک طور پر کاشت کرتی تو ممکن تھا کہ ملک کی زراعت اس قدر تباہ حال نہ ہوتی۔ لیکن بدقسمتی سے عین اسی زمانے میں مغربی ملکوں سے جو تعلقات بڑھنے لگے تو اُن کے خیالات اور رسم ورواج کا یہاں بھی پرتو پڑنے لگا، اشتراکیت کم زور اور انفرادیت قوی ہونے لگی اور اشتراک خاندان کے طریقے میں تزلزل پیدا ہونے لگا۔ خاص کر انگریزی نظام معدلت کی اشاعت اور انگریز یا انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانی ججوں کے فیصلوں سے انفرادیت کے رجحان کو زبردست تقویت پہنچی اور ہندوستان کے مشترک خاندان کثرت سے منقسم ہونے لگے اس کے علاوہ امن وامان کا قیام، رسائل، نقل وحمل کی ترقی، زرعی پیداواروں کی روزافزوں طلب، ان سب کا مجموعی اثر یہ ہوا کہ زرعی زمینوں کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔ لیکن یہ اضافہ کاشتکاروں کے لئے ایک خداداد نعمت ثابت ہونے

کی بجائے اُن کے حق میں اور وبالِ جان بن گیا۔ صدیوں کی جہالت اور قدامت پسندی اور نامعقول رسم و رواج اور توہمات کی جکڑبندی کے زیر اثر یہاں کے بھولے بھالے کاشتکار اپنی زمینوں کو مارواڑیوں کے ہاتھ رہن رکھ رکھ کر قرضے حاصل کرنے لگے اور مارواڑیوں کے ہاتھوں میں پہنچ کر یہ زرعی زمینیں اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہونے لگیں۔

ہندوستان میں تقسیم و انتشار آراضی کا موجودہ حالت اور اس کے مختلف اسباب اور گوناگوں نقصانات کا ہم مختصر طور پر ذکر کر چکے اب یہ امر دریافت طلب ہے کہ اس خرابی کی اصلاح کیوں کر ہو سکتی ہے۔ واضح رہے کہ اس بارے میں ایک تو ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کچھ خرابی واقع ہو چکی ہے، اُسے رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے یہ اہتمام کیا جائے کہ دوبارہ وہ خرابی پیدا نہ ہونے پائے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے مختلف تجویزیں پیش کی جاتی ہیں جن کی خوبیوں اور نقائص کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے۔ البتہ دوسرے ملکوں کے تجربے سے جو بات نمایاں طور پر واضح ہے، وہ یہ ہے کہ محض کاشتکاروں کی رضامندی اور ذاتی کوششوں پر بھروسہ کرنے سے اس خرابی کی اِصلاح ناممکن ہے۔ بلکہ اس کے لئے سرکاری مداخلت اور ایک حد تک جبر سے کام لینے کی ضرورت ہے، فرانس، سوئٹزرلینڈ، بلجیم، جرمنی، ڈنمارک، جاپان، ان میں سے ہر ایک کو تقسیم و انتشار آراضی کی خرابی سے دوچار ہونا پڑا۔ لیکن بغیر قانون سازی اور جبری مداخلت کے کہیں بھی اس کی اصلاح نہ ہو سکی۔

لیکن ہندوستان کی حکومت اس قسم کی تدبیریں اختیار کرنے سے ہمیشہ محترز رہی اور اب بھی بہت کچھ پس و پیش کرتی ہے اور اس کا یہ تامل بڑی حد تک حق بجانب ہے۔ اول تو حکومت کا اجنبی ہونا اس کی طرف سے رعایا کے دلوں میں طرح طرح کی بدگمانیاں اور شکوک پیدا کرنے کے لئے کافی ہے۔ دوسرے یہاں کے کاشتکاروں کی اپنی زمینوں سے کچھ ایسا قدرتی لگاؤ ہے کہ وہ کسی طرح ان سے علیحدہ ہونا پسند نہیں کرتے خواہ اس طرز عمل سے انھیں کتنا ہی نقصان پہنچ رہا ہو۔ تیسرے یہ کہ یہاں اور ملکوں کی طرح دوسرے ذرائع معاش موجود نہیں ہیں۔ ملک کی قدیم دستکاریاں تو تباہ ہو چکیں لیکن ان کی جگہ نئی صنعتیں ابھی تک اتنی ترقی نہیں کر سکی ہیں کہ ان میں کثیر دیہاتی آبادی کی کھپت

ہوئے۔ ظاہر ہے کہ باشندوں کی ایک بڑی تعداد کو بغیر کسی ذریعہ معاش کے یوں ہی چھوڑ دینا سراسر خلاف مصلحت بلکہ سخت خطرناک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زرعی کمیشن نے جہاں حکومت کو یہ نصیحت کی ہے کہ وہ اس بارے میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھی رہے، وہیں اس نے یہ بھی تاکید کی ہے کہ وہ نہایت احتیاط کے ساتھ پھونک پھونک کر قدم اٹھائے۔ مختصر یہ کہ ہندوستان کے موجودہ حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہاں سردست اس بات کی گنجائش نہیں ہے کہ سخت قوانین نافذ کرکے اور رعایا پر جبر و تشدد کرکے تقسیم و انتشار آراضی کی اصلاح کی جاسکے۔ لہٰذا جو کچھ کیا جاسکتا ہے وہ محض رعایا کی رضامندی سے کیا جا سکتا ہے اور یہ رضامندی محض پروپگنڈا کے ذریعے حاصل کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں جو تدبیر سب سے زیادہ کارگر ثابت ہوئی ہے وہ پنجاب کا تجربہ ہے جس کی نمایاں خصوصیت یہی پروپگنڈا اور عام رضامندی ہے۔ اس کے علاوہ صوبہ متوسط کا تجربہ بھی بہت کامیاب ثابت ہو رہا ہے اور وہ اس وجہ سے امید افزا ہے کہ اس میں کسی قدر سرکاری مداخلت اور جبر کا عنصر بھی شامل ہے۔ ان دونوں تجربات کی کسی قدر تفصیلی کیفیت آیندہ کسی موقعہ پر نشر کی جائے گی۔

غزل

یہ کیا بات ہے جاننا چاہتا ہوں
کسی کو میں کیوں پوجنا چاہتا ہوں

کہیں کوئی گم کردہ دل ہے جہاں میں
دلِ بے بہا بیچنا چاہتا ہوں

الٰہی کہیں تو نے پیدا کیا ہے
کوئی ہمنوا ڈھونڈھنا چاہتا ہوں

یہ رنگِ گلستاں، یہ عمرِ گریزاں
کہوں کیا الٰہی کہ کیا چاہتا ہوں

ابھی تو یہی جی میں ہے، آگے جو ہو
کہ ان کو فقط دیکھنا چاہتا ہوں

جو شایانِ شاں ہو ترے وہ عطا کر
مرا کیا میں کیا جانے کیا چاہتا ہوں

اٹھا کر دکھاؤ گے کیوں دل کو ناحق
میں اس بزم سے خود اٹھا چاہتا ہوں

جسے کام ہر اک سے کس کام کا وہ
میں اپنا الگ اک خدا چاہتا ہوں

وہ گھبرا کے یوں منع کرتے ہیں فضلی
کہ جیسے میں سچ مچ کہا چاہتا ہوں

ہندوستان کے مزدور

ازجناب ضمیر صدیقی صاحب بی۔اے (علیگ)

ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور آبادی کے تناسب سے مزدوروں کی تعداد بہت کم ہے۔ صرف چند بڑے شہروں بمبئی۔ کانپور۔ مدراس اور دیگر تجارتی مرکزوں میں مزدوروں کی کثرت نظر آتی ہے۔ یوں تو ہندوستان میں مزدور ہمیشہ سے رہے ہیں لیکن منظم جماعت کی حیثیت سے ان کی تعداد ۱۹۱۱ء سے بڑھنا شروع ہوئی اور ۱۹۲۱ء تک کارخانوں کے بڑھنے سے مزدوروں میں بھی اضافہ ہوتا رہا ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ کل آبادی میں ۹۵، ۹ فیصدی مزدور ہیں اور باقی آبادی کا انحصار کاشتکاری، تجارت اور ملازمتوں پر ہے۔ حسب ذیل نقشہ سے معلوم ہوگا۔ کہ ہندوستان میں کل مزدور کن کن پیشوں میں منقسم ہیں اور اُن کی تعداد کیا ہے۔ یہ اعداد و شمار ۱۹۳۱ء کی مردم شماری سے لئے گئے ہیں۔

کپڑے کے کارخانوں میں	۴۱،۰۲،۱۳۲
لباس اور فیشن کی اشیاء بنانے والے	۲۳،۸۰،۸۲۴
لکڑی کے کارخانوں میں	۱۶،۳۱،۷۲۳
خورد و نوش کی اشیاء بنانے والے	۱۴،۷۶،۹۹۵
عمارات بنانے والے	۶،۱۸،۵۲۷
دھات کی اشیاء بنانے والے	۷،۱۳،۰۷۰
وغیرہ	۶،۰۳،۵۰۴
چمڑا اور کھالیں بنانے والے	۳،۱۲،۰۷۴
معدنیات اور کان والے مزدور	۳،۴۶،۰۰۰

متفرق ۱۴۰,۹۸,۰۵۴

اس کے علاوہ مزدوروں کی بڑی تعداد چھوٹے اور غیر رجسٹری شدہ کارخانوں میں کام کرتی ہے جو مندرجہ بالا اعداد و شمار سے الگ ہیں۔ انکی تعداد بھی ۴۰ لاکھ سے کسی حالت میں کم نہیں ہے۔ کل مزدور ۲ کرڑور سے کچھ ہی کم ہوں گے جو مزدور کارخانوں کے علاوہ دوسری قسم کی مزدوری کرتے ہیں ان کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ لیکن وہ بھی ایک بڑی تعداد میں ہے۔

زیادہ تر مزدور گاؤں سے آتے ہیں جو وہاں کے زمیندار اور ساہوکار سے خائف ہو کر بھاگ آتے ہیں۔ اِن مزدوروں کو ملازمت دلانے، تنخواہ کی ادائیگی، اور دیگر انتظامات کے لئے کارخانے والے شہروں میں ایک طبقہ مستقل طور پر ہوتا ہے جو دلاّل کہلاتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۳ء سے قبل مزدوری کی کمی کی وجہ سے اِن دلاّلوں نے مزدور بہم پہونچا کر کارخانے والوں کی بڑی امداد کی اور بڑے لالچ دے کر دیہات والوں کو کارخانوں میں لایا گیا لیکن اب صورتِ حال بالکل بدل گئی ہے۔ مانگ کم ہے اور رسد زیادہ اس لئے بعض اوقات تو مزدوروں کو ملازمت حاصل کرنے کے لئے رشوت بھی دینی پڑتی ہے۔

ہندوستان میں مزدوری کا معاوضہ عام طور پر ماہانہ ہوتا ہے۔ اس طریقہ سے مزدور ایک طرح سے کارخانے والوں کا غلام ہو جاتا ہے کیونکہ مزدور ایک ماہ کا خرچ ادھار اور قرض لے کر چلاتا ہے اور جب تنخواہ ملتی ہے تو اس وقت ادائیگی ہوتی ہے۔ بعض مہینے میں خرچ کا اندازہ نہ ہونے سے مزدور مقروض بھی ہو جاتا ہے جس کی ادائیگی اگلے ماہ کی تنخواہ پر واجبی ہوتی ہے اس قسم کے واقعات دو تہائی سے بھی زائد ہیں۔ مزدور بہت معمولی روپیہ قرض لیتا ہے لیکن اس پر سود اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس کی ادائیگی مزدوروں کی طاقت سے باہر ہوتی ہے۔ احمد آباد کے کارخانے والے قریب کے گاؤں کے لڑکوں کو ٹھیکہ پر مزدور رکھتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ لوگ لڑکوں کے ماں باپ کو ۲۰ یا پچیس روپے سالانہ کے حساب سے دیتے ہیں اور وہ گاؤں کے لوگ ناداری کی وجہ سے اپنے بچوں کو مزدور بنا کر بھیجتے ہیں حالانکہ اِن لڑکوں کے کھانے اور رہنے کا انتظام کارخانے والے خود کرتے ہیں لیکن یہ انتظام اِتنا خراب ہوتا ہے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ ہمیشہ یہی کوشش کرتے ہیں کہ اِن کے

کھانے اور رہنے پر کم سے کم خرچ کیا جائے"۔ یہ غلامی کا طریقہ اتنا مضبوط ہو گیا ہے۔ کہ ٹریڈ یونین جیسے اداروں کو بڑی دقت پڑ رہی ہے کہ وہ اِن مزدوروں کی بہتری اور ترقی کے لئے کوئی تحریک کریں۔

کارخانوں کے لئے قانون اور مزدوروں کے معاوضے

۱۸۸۱ء تک کارخانوں کے لئے ہندوستان میں کوئی قانون نہ تھا۔ اس قانون کے مطابق ۷ سال سے کم عمر کے بچے مزدوری نہیں کر سکتے تھے۔ ۷ سال سے ۱۲ سال تک کے لڑکوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ ۹ گھنٹے روزانہ کام کریں۔ اس کے بعد ۱۹۲۲ء میں یہ پاس ہوا کہ ۱۲ سال سے کم عمر کا لڑکا کام مزدوری نہیں کر سکتا۔ اس سے زیادہ عمر کے لڑکے صرف ۶ گھنٹے روزانہ کام کر سکتے ہیں۔ بڑی عمر کے مزدوروں کے لئے قرار پایا کہ وہ ۱۱ گھنٹے روزانہ کام کریں۔ لیکن باوجود اِس قانون سازی کے یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی کارخانے میں اس پر عمل نہیں ہوتا۔ ۱۹۲۲ء میں احمد آباد کے کارخانوں میں ۲۲۶۰ لڑکے کام کرتے تھے۔ آج کل بھی دو کانوں میں لڑکے ملازم رکھے جاتے ہیں۔ اور آپ کو تعجب ہو گا کہ اُن سے مقررہ وقت سے دو گنا کام لیا جاتا ہے۔ جن کارخانوں میں مشین سے کام نہیں لیا جاتا مثلاً بیڑی کا کارخانہ، قالین بننے کا کارخانہ اُن میں عورتیں اور بچے ہی کام کرتے ہیں۔ کارخانے والے اس کا قطعی لحاظ نہیں رکھتے کہ عمر کے لئے کیا قانون ہے اور اُن سے کتنے گھنٹے کام لینا چاہیئے اس کے علاوہ جس فضا میں وہ کام کرتے ہیں وہ نہایت گندی اور مضرِ صحت ہوتی ہے۔ وہائٹلے رپورٹ میں عورتوں اور ۸ برس کے بچوں کے ساتھ جو برتاؤ ہوتا ہے۔ اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

> "اِن کارخانوں میں عورتوں اور بچوں سے ڈنڈوں، بیدوں، اور دوسری قسم کی مار پیٹ سے کام لیا جاتا ہے۔ جب اِن مزدوروں پر مار پڑتی ہے تو کارخانوں میں ایک ہنگامہ ہو جاتا ہے۔ تمام کارخانوں میں گرد اور دھول اس قدر اڑتی ہے کہ کھڑا ہونا محال ہوتا ہے۔ مزدور ماؤں کے بچے ان کے قریب ہی ریت اور دھول پر لیٹے ہوئے نظر آتے ہیں جن پر میلے کچیلے کپڑے پڑے ہوتے ہیں اور یہ بچے اپنی سانس کے ساتھ دھول اور جراثیم پیٹ میں پہونچاتے رہتے ہیں۔"[۱]

---

[۱] The cotton Industry of India, 1930 by ARNO PEARSE

اِس رپورٹ میں بیڑی کے کارخانوں کے متعلق لکھا ہے :-

"بیڑی کے کارخانوں میں پانچ پانچ برس کے بچے کام کرتے نظر آئیں گے جن کے لئے پورے دن کے کام کے بعد کچھ منٹ کا وقفہ بھی نہیں ملتا کجا ہفتہ میں آرام کا ایک دن یہ بچے صرف دو آنہ یومیہ کے لئے ۱۰ اور ۱۲ گھنٹے روزانہ کام کرتے ہیں"

اس کے علاوہ بڑے بڑے کارخانوں میں بھی بہت بے توجہی سے کام لیا جاتا ہے۔ ۱۹۲۶ء میں بنگال کے جوٹ کے کارخانوں میں ۳ لاکھ ۱۹ ہزار مزدوروں میں سے ۸۰ ہزار عورتیں اور ۲۹ ہزار بچے کام کرتے تھے۔ کام کا وقت ۵½ بجے صبح سے لیکر ۷ بجے شام تک ہے اور لطف یہ کہ درمیان میں کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔ عورتیں ایک ہاتھ سے بچے سنبھالتی ہیں اور دوسرے سے کام کرتی ہیں۔ حاملہ عورتیں محض اِس خوف سے کہیں ملازمت نہ چھوٹ جائے اپنے بچے کارخانوں میں ہی جن دیتی ہیں۔ ۱۹۲۴ء کے سرکاری بیان سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۳۲ حاملہ عورتوں میں سے ۱۰۲ عورتوں نے اپنے بچے کارخانوں میں جنے[1]

بمبئی کے روئی کے کارخانوں میں عورتیں اپنے بچے ساتھ نہیں لاسکتیں اور چونکہ ان میں زیادہ تعداد ایسی ہے جو اپنے بچوں کے لئے کوئی انتظام نہیں کرسکتیں جو اُن کے بچوں کی دیکھ بھال کرسکے اس لئے یہ عورتیں اپنے بچوں کو افیون کھلا کر آتی ہیں تاکہ وہ سوجائیں اور شام تک خاموش رہیں۔ ۱۹۲۲ء کی سرکاری تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ ۹۸ فی صدی بچوں کو افیون کھلائی جاتی ہے[2]۔ مزدور کی حالت جیسی ہندوستان میں ابتر ہے اتنی شاید ہی کسی ملک میں ہو۔ یہاں نہ تو اس کی صحت ہی کے لئے کوئی خاص انتظام ہے اور نہ اُس کے معاوضے کے لئے کچھ پرواہ کی جاتی ہے۔

۱۹۲۸ء میں بمبئی میں جو اسٹرائک ہوئی تھی اُس سے کپڑے کے کارخانوں کی حالت بہت کچھ ظاہر ہوئی ہے۔ اِس سلسلے میں جو ٹوسٹ کمیٹی قائم کی گئی تھی اور اُس نے مزدوروں کے معاوضے کے متعلق جو معلومات بہم پہونچائی ہیں وہ قابل غور ہیں۔ کمیٹی نے ہندوستانی مزدور اور ممالک متحدہ امریکہ و انگلستان کے مزدوروں کے معاوضے کا مقابلہ کیا ہے۔ رپورٹ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی ہے

ملاحظہ ہو۔

ہندوستان میں ایک ماہ کی مزدوری (۲۶ دن ۱۰ گھنٹہ) ۔ ۔ ۔ تقریباً ۱۴ روپے
ممالک متحدہ امریکہ " " (۲۴ دن ۸ گھنٹہ) ۔ ۔ ۔ تقریباً ۲۱۰ روپے
انگلستان " " (۲۴ دن ۸ گھنٹہ) ۔ ۔ ۔ تقریباً ۹۰ روپے

باوجود اِس قدر کم مزدوری ہونے کے بھی کمیٹی نے یہی طے کیا کہ ہندوستانی مزدور کے معاوضے میں کمی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ۳۰ روپے ماہوار ملنے والوں کی تنخواہ میں کمی کردی گئی اِس رپورٹ نے یہ بھی معلوم کیا تھا کہ ایک مزدور کے گھر کے کھانے میں آمدنی کا ۷۵ فی صدی روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جو مزدور کارخانوں میں کام کرتے ہیں اُن کے معاوضے بھی کم کردئے گئے تھے یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو گورنمنٹ نے ریلوے کے مزدوروں کی تنخواہ میں ۱۰ فیصدی تخفیف کردی اور بعد میں محکمۂ ڈاک کے ملازمت نیز دوسرے سرکاری ملازموں کی تنخواہوں میں ۱۰ فیصدی کمی کی گئی۔

کانوں کے مزدور کی حالت

۱۹۲۳ء کے مائنس ایکٹ کے قبل گورنمنٹ نے اِن مزدوروں کی طرف کوئی توجہ نہ کی تھی۔ ۱۹۳۱ء میں جو مردم شماری ہوئی اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۲ برس سے کم عمر کے بچے جو کانوں میں مزدور کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ کل ۵۴۸۰ کی تعداد میں تھے۔ اس قانون نے ۱۳ برس سے کم عمر کے لڑکوں کے لئے قطعی ممانعت کردی کہ وہ کان میں کام نہ کریں اور بڑی عمر کے آدمیوں کے لئے ہفتہ میں ۵۴ گھنٹہ کام کرنے کا وقت مقرر کیا گیا اور کان کے باہر ۶۰ گھنٹہ فی ہفتہ کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ ۱۹۲۹ء میں ایک اور قانون پاس کیا گیا جس سے عورتوں کو کارخانوں میں کام کرنے کی ممانعت کردی گئی۔ اس وقت جو کوئلے کی کانیں بنگال۔ بہار۔ اُڑیسہ اور سی۔ پی میں ہیں ان میں ۱۴ فی صدی عورتیں مزدور ہیں۔ ان کارخانوں میں تو ہوا کا تو گذر ہی کہاں بلکہ مزدور جیسے جیسے کان کھودتا ہوا زمین کے اندر جاتا ہے ویسے ہی درجۂ حرارت بڑھتا جاتا ہے اور نمی میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ رانی گنج (بنگال) کے

1) Shrader and Furtwangler.
2) Bombay Labour Gazette, Sept. 1932.

نوٹ صفحہ ۹۵۵
علہ علہ

کوئلے کی کان میں چونکہ مرد اور عورتیں ننگے پیر کام کرتے ہیں انکے پیر اکثر زخمی ہوجاتے ہیں اور وہ کئی کئی دن تک کام نہیں کرسکتے۔ دھا نٹلے کمیٹی نے بھی شکایت کی ہے کہ عورتوں سے وہ بھاری کام لیا جاتا ہے جو اُنکی طاقت سے باہر ہوتا ہے۔ کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ گورنمنٹ کو اِن مزدوروں کی صحت کا خاص خیال رکھنا چاہئے

کارخانوں میں جو حادثات پیش آتے رہتے ہیں وہ بھی کم نہیں۔ ۱۹۲۶ء میں ۲۲۷ موتیں ہوئی تھیں جس میں ۹۰ امرد اور ۲۷ عورتیں تھیں۔ ۱۹۲۲ء میں جو ورکمین کمپنسیشن ایکٹ پاس ہوا ہے اس سے پہلے ایک مزدور کی موت پر اُس کے وارثان کو کچھ نہ ملتا تھا لیکن اس قانون سے بالغ کی موت ہونے پر تقریباً ۲ ہزار روپے اور نابالغ کی موت پر جس کی عمر ۱۵ سال سے کم ہو تقریباً ۲۵۰ روپے ملتے ہیں۔ ہندوستان کا مزدور اس کی اہمیت اس لئے نہیں سمجھتا کہ ابھی حقیقت میں اس نے اپنے حقوق نہیں پہچانے۔ وہ یہ ہی نہیں جانتا کہ اس کی محنت پر دنیا کے کاروبار چلتے ہیں اگر آج وہ کام بند کردے تو سارے سنسار میں تہلکہ مچ جائے۔ ۱۹۲۹ء تک مزدوروں کی موت کا اعداد و شمار ایک ہزار پر ۱۳ کا ہے۔

مزدوروں کے مکانات

ہندوستان میں کانوں اور کارخانوں کے مزدوروں کی حالت بہت ناگفتہ بہ ہے یہ ضرور ہے کہ کان کے مزدور کو کان کے مالک کی طرف سے مکانات دئے جاتے ہیں لیکن اُن کے لئے ایک چھوٹی سی کوٹھری ہوتی ہے جس میں ایک بے کواڑ کا دروازہ ہوتا ہے اُس میں نہ کوئی کھڑکی ہوتی ہے اور نہ کوئی روشندان چھت ایسی خستہ ہوتی ہے کہ موسمِ برسات میں اُن میں سے پانی آتا ہے کارخانوں کی حالت بھی یہی ہے۔ وھا نٹلے رپورٹ کا حسب ذیل بیان ملاحظہ ہو۔

"۱۹۲۱-۲۲ء کی تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ بمبئی میں ۹۷ فی صدی مکانات صرف ایک کوٹھری کے ہیں جن میں ۶ سے لیکر ۹ آدمی تک رہتے ہیں۔ کراچی میں مزدوروں کی ½ آبادی اِنھیں کوٹھریوں میں رہتی ہے۔ یہی حالت احمد آباد، کانپور، ہاوڑہ، کلکتہ وغیرہ میں ہے۔"

صرف چند مثالیں ایسی ہیں جہاں زمین اور مکانات کارخانے والے مہیا کرتے ہیں ورنہ عام طور پر مزدوروں

کو زمینداروں کے رحم وکرم پر چلنا پڑتا ہے۔ زمین مہنگی ہونے کی وجہ سے مکانات اس قدر چھوٹے اور تنگ بنائے جاتے ہیں کہ ان میں سانس لینا دشوار ہوتا ہے۔ گلیاں اور کوچے اتنے گندے اور کم چوڑے ہوتے ہیں جن میں بارہ مہینہ گندگی میلا، اور کیچڑ رہتی ہے۔ جو مزدور اپنی بیویوں کو سخت پردے میں رکھتے ہیں۔ وہ گھروں کے دروازوں کے سامنے ٹین اور ٹاٹ کے ٹکڑے ٹانگ دیتے ہیں جو غربت کی عین نشانی ہے ہندوستانی مزدور ایسی ہی فضا میں پیدا ہوتے، چلتے، زندہ رہتے، اور مرتے ہیں اور انھیں احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ دنیا کے لئے کیا کر رہے ہیں اور اس کا بدلہ دنیا انھیں کیا دے رہی ہے۔

۳۱۔۱۹۳۰ء میں جب غیر ملکی کپڑے کا بائیکاٹ ہو رہا تھا اس وقت احمد آباد میں کپڑے کے کارخانے بہت اچھی مالی حالت میں تھے لیکن اس وقت بھی مزدوروں کے رہنے سہنے کا انتظام اتنا خراب تھا کہ لوگ پہلے سے بھی زیادہ بری حالت میں ہو گئے۔ مزدوروں کی تعداد بڑھ گئی لیکن کارخانوں کے مالکوں نے ان کے نئے مکانات کا انتظام نہ کیا۔ ۱۹۳۱ء میں ٹیکسٹائل یونین نے ایک رپورٹ چھاپی جس سے معلوم ہوا کہ احمد آباد میں ۱۶،۰۰۰ کوٹھریاں ایسی تھیں جن میں انسان رہ نہیں سکتا۔ ان میں نہ ہوا کا گذر تھا نہ روشنی کا

مزدوروں کی بے روزگاری

کارخانوں کو شروع میں مزدوروں کی بڑی مانگ تھی اور مزدور ڈھونڈے نہیں ملتے تھے لیکن جب سنسار کی مالی حالت میں تبدیلی ہوئی اس وقت ۱۹۲۴ء سے بے روزگاری شروع ہوئی۔ وھاٹلے رپورٹ جو اس زمانہ میں شائع ہوئی تھی اس سے معلوم ہوا کہ بمبئی کے کارخانوں میں ۱۹۲۴ء میں مزدوروں کی تعداد ۷،۵۴۳،۴۳ تھی لیکن ۱۹۲۹ء میں صرف ۶۹ ۳ ،۱۸ ، ا رہ گئی۔ اس طرح ٹاٹا کمپنی میں ۳۲۰۵۲۱ سے ۲۸،۶۶۰ رہ گئی۔ اس زمانے میں کلکتہ میں بے روزگاری کا دورہ دورہ شروع ہو گیا۔ ۱۹۳۵ء میں تقریباً ۴۰ ہزار مزدور ریلوے سے نکالے گئے اور جوٹ کے کارخانوں میں تقریباً ۳۴۰ ہزار مزدوروں میں سے ۸۰ ہزار بیکار ہو گئے۔ اس طرح کل بیکار مزدوروں کی تعداد ۴ کروڑ کے قریب پہونچ گئی ہے بیکار مزدور یا تو اپنے گاؤں کو واپس چلے گئے یا پھر فقیر ہو گئے اور بڑے بڑے شہروں میں امیروں کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرنے لگے۔

مزدوروں کی صحت اور تندرستی

مزدور کی بے روزگاری، قلیل تنخواہ، گندے اور خراب مکانات اور گندی فضا میں رہنے سے اس کی تندرستی پر اثر پڑتا ہے جو ہر سال کی اموات کی اعداد و شمار سے ظاہر ہے۔ لوگوں کا یہ خیال کہ ہندوستانی مزدور ایک مٹھی بھر چاول پر زندہ رہ سکتا ہے سراسر غلط ہے۔ غذا میں کمی اور قوت نہ ہونے ہی سے ہندوستان میں عمر کا اوسط ۲۳ سال اور انگلستان میں ۵۵ سال کا ہے بنشہ ۱۹۳۰ء میں اموات کا اوسط ۲۶،۸ فی ہزار اور انگلستان میں ۱۱،۷ فی ہزار تھا۔

۱۹۱۸ء میں بخار اور انفلوئنزا میں ایک کروڑ اور ۱۰ لاکھ آدمی مرے تھے اور کل آبادی پر ۶۲،۲۶ فی ہزار کا اوسط تھا اس سال آگرہ میں ۱۲۸،۹۵ فی ہزار، کانپور میں ۹۹،۹۱ فی ہزار اور پونا میں ۸۴،۰۰ فی ہزار کا اوسط تھا۔ یہ حال صرف شہروں ہی کا نہ تھا بلکہ دیہاتوں کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ ڈاکٹر سی۔ سی۔ بنٹلی نے اپنی رپورٹ ۱۹۲۷ء میں لکھا ہے۔

"صرف بنگال میں ہر سال دس لاکھ آدمی مر رہے ہیں۔ ۱۰ سال سے کم عمر کے بچے ۱۰ فیصدی کی تعداد میں مرجاتے ہیں۔ یہ محض خراب خوراک سے بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جو آدمیوں میں پھیلی رہتی ہیں۔ گذشتہ سال ۱۲۰ ہزار ہیضہ سے، ۳۵ ہزار ملیریا سے، ۳۵۰،۰۰ ہزار دق سے مرے ہیں۔ اوسط یہ ہے کہ ہر سال ۵۵ ہزار حال کے پیدا شدہ بچے مرجاتے ہیں"

یہ برابر دیکھنے میں آرہا ہے کہ ہر سال ہیضہ، پلیگ، اور چیچک کے مریض بڑھتے جا رہے ہیں اور ہزاروں ہندوستانی ذرا سی بے پرواہی سے مرجاتے ہیں۔ ڈاکٹر سر جون میگو نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ سارے ملک میں ایک کروڑ ۳۰ لاکھ انسان مختلف بیماریوں میں مبتلا ہیں۔ اُس میں سب سے زیادہ دق کے بیمار ہیں اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دق کی بیماری ہر سال ہمارے ملک میں بڑھ رہی ہے۔ رات کا اندھاپن جو خوراک ٹھیک نہ ملنے سے ہوجاتا ہے اس میں ۶ لاکھ آدمی

بتلا ہیں۔ رپورٹ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں ۳۹ فی صدی آدمیوں کو خوراک ٹھیک ملتی ہے۔ ۴۱ فی صدی لوگ خراب خوراک سے اپنا گذارا کرتے ہیں اور باقی ۲۰ فی صدی کو تو بدترین کھانا ملتا ہے۔ اس سلسلے میں بنگال کی حالت بہت افسوسناک ہے۔ وہاں موتیں بہت ہوتی ہیں اور اوسط ہزار پر ۵۰ آدمیوں کا ہے۔ مزدوروں کی حالت اور بھی بدتر ہے۔ ایک کوٹھری میں رہنے والے خاندان کی موتوں کا اوسط ہزار پر ۵۷۷ اور دو کوٹھری میں رہنے والوں کا اوسط ہزار پر ۴۲۵ ہے ہسپتال میں مرنے والوں کی تعداد ہزار میں ۱۰۷ کی ہے۔ مـ۱

اب ہندوستان کے سرمایہ داروں کی آنکھیں کھل گئی ہیں کیونکہ مزدور کی خراب تندرستی سے اُس کے کام میں ہرج ہوتا ہے۔ ہر کارخانے والے نے اپنے ہسپتال کھلوا دئے ہیں اور دوائیوں کا بھی انتظام کیا ہے۔ ہندوستان میں کل ۱۷۷ رہ ہسپتال ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں کانگریس آف میڈیکل ریسرچ ورکرس نے خاص توجہ سے کام کیا ہے اور مزدوروں کو بیماریوں سے بچانے کے لئے مختلف تدابیر سوچی جارہی ہیں کیونکہ اب یہ اچھی طرح سے معلوم ہو چکا ہے اگر مزدور کی تندرستی اچھی ہوگی۔ تو اُس سے اچھے سے اچھا کام لیا جاسکتا ہے۔

مزدوروں کی تعلیم

ولایتی سرمایہ دار ملک اس نتیجہ پر پہونچ گئے ہیں کہ جس طرح مزدور کے لئے صحت اور تندرستی ضروری ہے بالکل اُسی طرح اُس کے لئے تھوڑی بہت تعلیم بھی ضروری ہے لہٰذا انہوں نے اپنے یہاں جبریہ تعلیم کا سلسلہ جاری کرایا ہے۔ ہندوستان میں بھی اس مسئلہ پر کئی سال سے غور ہو رہا ہے اور ملک کی مجلسِ قانون ساز نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے۔ ۱۹۳۰ء تک ملک میں ۱۳۲ میونسپل بورڈوں نے اور ۱۳۰۷ دیہاتوں میں جبریہ تعلیم کا نفاذ ہو گیا تھا۔

سائمن رپورٹ (حصہ دوم) میں بیان کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں جس قدر بھی ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اُس میں سے فوج پر کل آبادی میں ۲ روپے ۴ آنہ فی آدمی، تعلیم پر ۴ آنہ فی آدمی خرچ

کیاجاتا ہے۔ ریاست بڑودہ میں تعلیم پر برٹش انڈیا میں فی آدمی کی تعلیم سے تین گنا یعنی ۱۲ آنہ فی آدمی خرچ ہوتا ہے انگریزی ہندوستان کی ۲۴ کروڑ آبادی پر گورنمنٹ صرف ایک کروڑ پونڈ تعلیم کے لئے خرچ کرتی ہے اور انگلستان کی ۴ کروڑ کی آبادی پر گورنمنٹ پانچ کروڑ پونڈ سے بھی زائد صرف کرتی ہے، تعلیم اور صحتِ عامّہ جو نہایت ضروری چیزیں ہیں اُن پر اتنا کم روپیہ خرچ کیاجاتا ہے۔ دیگر امداد و شمار سے معلوم ہوا ہے کہ انگریزی ہندوستان سے تو ریاستی ہندوستان ہی تعلیم کے اوپر بہت خرچ کرتا ہے۔ سارے ہندوستان میں لکھناپڑھنا جاننے والے مرد تقریباً ۱۴ فی صدی اور عورتیں ۲ فی صدی ہیں۔ میسور جیسی چھوٹی ریاست میں مرد ۱۴ فی صدی اور عورتیں ۲ فی صدی لکھناپڑھنا جانتے ہیں۔ تعلیم کے لئے مزدور اور کسان بھی بیدار ہو رہا ہے اور جیسے ہی ہندوستان کے مزدور میں بیداری پیدا ہوئی اس وقت آپ دیکھیں گے کہ ہندوستانی مزدور کسی ملک کے مزدور سے کم نہ رہے گا۔

تہذیب جدید کا انجام

(مولوی محمود علی خاں صاحب جمابی سے - بھوپال)

سناؤں تمہیں داستانِ الم — وہ تہذیبِ حاضر کا ظلم و ستم
مسلّم ہیں تہذیب کی نعمتیں — مبارک ہیں سائنس کی دولتیں
عروجِ تجارت بطرزِ عجیب — قرونِ گذشتہ کو کب تھا نصیب
رسل اور رسائل کی آسانیاں — ہوئیں جن سے آساں جہانبانیاں
بساطِ زمیں پر وہ ریلوں کا جال — لئے پھرتی ہیں جو تجارت کا مال
وہ ڈاک اور مسافر کو لیکر رواں — شب و روز شام و سحر ہیں رواں
وہ بے تار پیغام کا سلسلہ — دیا جس نے عالم کو یکسر ملا
سنا کرتے ہیں تھا کبھی جام جم — تصاویر برقی ہیں کیا اس سے کم
رواں جس گھڑی ہو دخانی جہاز — جھکائے سمندر جبینِ نیاز
وہ سینہ میں دوزخ جلاتا ہوا — گرجتا ہوا تیز جاتا ہوا
فلک سیر طیارہ گانِ عظیم — سفر جن میں کرتے ہیں اہلِ نعیم
مسافت مہینوں کی گھنٹوں میں طے — عجیب اس سے ممکن ہے کیا اور شے
وہ دنیائے صنعت کی اعلیٰ مثال — وہ سائنس کا انتہائی کمال
سفینے مسلح بہ آلاتِ جنگ — وہ انسان کے تیار کردہ نہنگ
وہ عفریت پیکر مشینوں کا زور — بپا کرتی ہیں جو قیامت کا شور
ترقی وہ تشریح کی بے مثال — گزرتا نہ تھا جس کا دل میں خیال
وہ آلات مہلک وہ توپ و تفنگ — کہ عقلِ بشر جن سے رہ جائے دنگ

مشین اور سائنس کا یہ کمال — ہے اخلاق و انسانیت کا زوال

خدا اور مذہب سے بیزار ہیں — فقط سیم و زر کے پرستار ہیں

سیاست سے کشور کشائی کریں — غریبوں پہ زور آزمائی کریں

وسائل ذلیل و سیاست ذلیل — بظاہر بنیں امن کے وہ کفیل

مہذب درندوں سے عالم تباہ — کریں ذبح بھرنے نہ دیں پھر بھی آہ

کریں منعقد مجلس اقوام کی — نمود و نمایش فقط نام کی

حبش لقمۂ آز اٹلی بنے — یہ معصوم خرمن وہ بجلی بنے

وہ اسپین کا کشت و خوں الاماں — وہ مزدور و سرمایہ کی داستاں

تقاضائے تہذیب حرص شدید — تمدن کا معیار ہل من مزید

اُدھر جوعِ ارضی سے جاپان تنگ — بپا جس نے کی ہے قیامت کی جنگ

یہ سب کچھ ہے اس یوم بد کی خبر — کہ تہذیب ہو جب کہ زیر و زبر

بپا ہو قیامت کی جنگِ عظیم — فراموش ہو جائے جنگِ عظیم

سمندر میں افواج کی دار و گیر — بیک لحظہ غرقاب جم غفیر

وہ بحری جہازوں کی حربِ عظیم — بنائیں جو پانی کو نارِ جحیم

وہ مسموم گیسوں سے مردوں کا ڈھیر — کہ زاغ و زغن جن سے ہو جائیں سیر

غریبوں کی موت اور یتیموں کی آہ — غضب کی قیامت خدا کی پناہ

امیروں کے مسکن غریبوں کے گھر — مکان و مکیں خاک ہوں سر بسر

یہ صدیوں کا تیار کردہ نظام — فنا ہو نہ لے کوئی بھی اس کا نام

وہی بربریت کا دورِ عمل — وہی سعی انساں کا روزِ ازل

یہ دولت تمدن کی کھو جائے گی — یہ تہذیب ماضی میں سو جائے گی

رفتارِ عالم

پیمان سعد آباد

معاہدہ سعد آباد (ترکی، افغانستان، ایران اور عراق کا معاہدہ) کا متن عام اخبارات میں شائع ہو چکا ہے جن پُر خلوص اُمیدوں اور جذبِ صادق کے ساتھ اس معاہدہ کی تکمیل عمل میں آئی ہے۔ وہ بہت خوش آیند ہے، اس موقعہ پر کاخ سعد آباد میں متعاہد حکومتوں کے نمائندوں نے اس پیمان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا تھا، ہم چاہتے ہیں کہ ان تقریروں کا اقتباس آپ کی خدمت میں پیش کریں

ان تقریروں میں "اسلام" کا لفظ ڈھونڈے نہیں ملتا۔ لیکن اس پر اگر کسی کو رنج ہو تو شاید اس کی اپنی کوتاہ بینی ہے۔ تقریروں کے ایک ایک لفظ سے اسلام کی سچی تعلیم کی ترجمانی ہوتی ہے۔ نام کو بغیر معنی کے استعمال کرنے والوں نے نوبت یہاں تک پہنچا دی ہے کہ اب معنی کو بلا نام کے بیان کرنا پڑتا ہے:

آقائے سمیعی وزیرِ خارجہ ایران آقائے سمیعی نے مختصر سی تمہید میں معاہدہ پر انتہائی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ

"اس معاہدہ کی اہمیت ایک کھلی ہوئی چیز ہے، بالخصوص اس لئے کہ ان چاروں ملتوں کے اس مضبوط اتحاد سے مغربی ایشیا میں صلح قائم رکھنے میں غیر معمولی مدد ملے گی اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایشیا عام طور پر امن وامان سے ہم آغوش رہیگا"

رئیس الوزراء دولت ایران رئیس الوزراء ایران نے تمہید میں ایران و عراق کے تنازعہ کے دوستانہ فیصلہ پر ڈاکٹر توفیق رشدی آراس اور ڈاکٹر ناجی الاصیل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ

"آج جس مسرت بخش کام کو ہم نے انجام دیا ہے اس کی نظیر ہمارے ملکوں کی

تاریخ میں موجود نہیں ہے، میرے پاس الفاظ نہیں جن سے میں اپنی مسرت کا اظہار کر سکوں۔ بلا شک و شبہ آج کے معاہدہ نے ہمارے دوستانہ تعلقات میں ایسا استحکام پیدا کر دیا ہے کہ جس سے چاروں ملک باہم دگر مربوط ہو گئے ہیں۔ ہمارا یہ پیمان جس کو آپ نے بہ نظر لطف و کرم پیمان سعد آباد سے موسوم کیا ہے سیاسی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس اتحاد کے بغیر ہم دنیا کے لئے کس حد تک توجہ کے قابل تھے! ہمارا یہ پیمان مشرق کی صلح کا بہترین ضامن ہے۔"

آقائے سردار فیض محمد خاں وزیر خارجہ دولت افغانستان "میں نازاں ہوں کہ اعلیٰحضرت ہمایوں نے ایک ایسے اہم کام کی انجام دہی کے لئے ہم سب کو یہاں جمع فرمایا۔ اور ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ ہم مشرق کے بسنے والوں کا مرنا اور جینا مشترک ہے، ...."

جیسا آقائے رئیس الوزراء نے فرمایا ہے "اس معاہدہ سے کسی حکومت کی مخالفت مقصود نہیں ہے بلکہ اتحاد و اتفاق کی ایک جائز آرزو ہے جسے ہم نے آج عملی جامہ پہنا دیا ہے، اور ہماری یہ آرزو اس لئے ہے کہ ہم دنیا میں صلح و امن کو قائم رکھنے میں مدد دیں اور بنی نوع انسان کی خدمت کر سکیں۔"

ڈاکٹر ناجی الاصیل وزیر امور خارجہ عراق "آج کا واقعہ ایک یادگار واقعہ ہے، اسی لئے ہم بہ کمال افتخار شرکت کے لئے آئے ہیں۔ سعد آباد کی سرزمین میں آج محبت و مودت کا جو بیج بو یا گیا ہے اس کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ میں ہر چہار وزراء کو معاہدہ کی باقاعدہ تکمیل پر مبارکباد دیتا ہوں۔ طہران و انگورہ، اور کابل و بغداد نے جو قدیم متمدن قوموں کے پایہ تخت ہیں اپنے اس اتحاد سے یہ ثبوت دیا ہے کہ صلح و آشتی کے قیام میں تعاون کرنا ان کے نزدیک ترقی و سعادتِ قومی کی اساس ہے، ان قدیم ملتوں نے عالم انسانی کی شاندار خدمات انجام دی ہیں اور اس مبارک معاہدہ کے ذریعہ تہذیب انسانی کے یہ مرکز اپنی عظمت رفتہ کو واپس لانے کے لئے قدم اٹھا رہے ہیں، مشرق اب خواب غفلت سے بیدار ہو گیا ہے اور بہت سے نمایاں کارناموں سے اپنی عظمت و صلاحیت کا ثبوت دے رہا ہے۔ مشرق کا

یہ دور جدید جس کا افتتاح کارخ سعد آباد کے اس تاریخی پیمان سے ہو رہا ہے۔ ہم میں برادرانہ محبت، دائمی دوستی اور حسن تفہیم کی بنا ڈالے گا۔"

توفیق رشدی آراس، وزیر خارجہ ترکیہ "سعد آباد کے قصر شاہی کا یہ پیمان مشرق جدید کی صبح امید کا پیغام ہے، اس معاہدہ نے تاریخ مشرق میں جس صفحہ کا اضافہ کیا ہے اس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی۔"

روحانی نقطۂ نظر سے پیمان مذکور جائز اہمیت کا مالک ہے بلکہ کہنا چاہئے کہ وہ الفت و محبت کا فنا نہ ہونے والا سرچشمہ ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ تمام عالم میں یہ چشمہ فیض جاری ہو جائے۔

. . . .

یہ معاہدہ تکمیل انسانیت کی راہ میں ایک قدم ہے۔ اس معاہدہ نے دنیا میں ایک مشترک وطن اور برادری کی نیو رکھی ہے۔"

"اب پرانی کشمکش اور دیرینہ کینہ جوئی کی بجائے جس نے ہمارے وطن کو ویران کر رکھا تھا محبت و الفت کا دور ہوگا۔ اور جو ملت ہماری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے گی ہم خوشی کے ساتھ اُسے اپنے آغوش میں جگہ دیں گے۔ ہمارا یہ پیمان اس لئے نہیں ہے کہ ہم صرف اپنی نگہداشت کریں ہم تو چاہتے ہیں کہ وسیع کرتے کرتے تمام قوموں کو اس میں شامل کر لیں۔

میں بھی اُن ملتوں کا ایک فرد ہوں جن کی تاریخ فتوحات و افتخارات سے مزین ہے لیکن اسی قدر شکستوں اور مصیبتوں کے اثرات سے اس کا چہرہ زخمی بھی ہے اور اسی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ہمیں کسی قوم پر بھی رشک کی ضرورت نہیں لیکن ایک چیز ہے جس سے ہم سب قرنوں سے محروم ہیں محبت اور دوستی ہے۔ اس لئے اس مقام سے جو دنیا کے قدیم ترین تمدن کا مرکز ہے میں بآواز بلند کہتا ہوں ہم اس جگہ کو ساری دنیا کی الفت و یگانگت کا مرکز بنانا چاہتے ہیں اور اجازت ہو تو اتنا اور عرض کر دوں کہ اس عشق و تعلق کی سرحد کرۂ ارضی کی انتہا کے سوا کچھ نہ ہوگی۔

میں صمیم قلب کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ ہماری آرزو یہ ہے کہ ہم اپنے بچوں کو آرام اور سکون

کے ساتھ پرورش کر سکیں، ہمارے کسان پورے امن و اطمینان کے ساتھ اپنے کھیتوں کی دیکھ بھال کریں اور مختصر یہ کہ خوش قسمت اور سعید قوموں کے ساتھ ہر قوم مامون و محفوظ رہے۔

صلح ہمارے نزدیک وسیلہ نہیں بلکہ مقصود ہے۔ اگر ہم قوی بننا چاہتے ہیں تو اس لئے کہ دنیا ضعف سے نفرت کرتی ہے، اور ہم جنگ سے بیزار ہیں تو اس لئے نہیں کہ ہمیں اس سے وحشت ہوتی ہے بلکہ اس لئے کہ ہمارے یقین میں آج تک یہ دوا نہ کسی دُکھ کا علاج کر سکی ہے اور نہ کسی مشکل کو حل کر سکی، لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم جنگ کا جواب خاموشی سے دیں لیکن ہاں یہ ضرور چاہتے ہیں کہ پہل کسی حالت میں ہماری طرف سے نہ ہو

.... ہمیں فوج اب بھی عزیز ہے اس لئے نہیں کہ وہ ہمارے امن کی ضامن ہے بلکہ اس لئے کہ وہ نظم و نسق، ترک نفس اور وطن پرستی کا مکتب ہے۔

اگر سامان حرب کی نسبت قطعی طور پر طے ہو جائے اور نوع انسانی آلات جنگ کی تدریجی کمی کی قائل ہو جائے تو اسی روز ہم اپنے توپخانہ کو کسانوں کے سپرد کر دیں گے تاکہ وہ ان سے اپنے مطلب کے اوزار تیار کریں۔

ہم چاہتے ہیں کہ خطرہ نہ ہمارے درمیان باقی رہے اور نہ دوسری اقوام عالم کے درمیان رہے، یہی نظریہ ہے جس کی بنا پر جائزہ بشریت کے ذریعہ ہم دوسری قوموں کی خدمت انجام دینا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بین الملی آسائش و آرام کے مسائل محض سیاسی طور پر حل نہیں ہو سکتے، اقتصادی مسائل جو کسی طرح بھی سیاست سے کم اہم نہیں ہیں ہماری توجہ کے خاص محتاج ہیں..........

بین الملی کثرت مبادلات کے سلسلہ میں اعتماد اور باہمی امداد بہت قیمتی عوامل ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ان عوامل کو سیاست و معیشت میں علیحدہ علیحدہ تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ اکثر سیاسی اختلافات کی بنا دراصل معاشی مسائل پر مبنی ہے، یہ صحیح ہے کہ آج سب ملکوں میں سیاست و معیشت کے درمیان وہ ربط و تعلق نہیں ہے جو ہونا چاہیئے۔ لیکن اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ذمہ دار لوگ اس حقیقت سے اب بخوبی واقف ہو گئے ہیں، اور آپس کے سیاسی مسائل میں مناسب نظم و ترتیب پیدا کرنے کی

سعی کر رہے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کوششیں کامل اتحاد و اتفاق کے ساتھ کامیاب نہ ہوسکیں گی۔
ہمارے خیال میں ان کوششوں کا دائرہ زیادہ وسیع ہونا چاہئے اس لئے کہ ملی منافع خواہ سیاسی ہوں یا اقتصادی جب تک منافع عمومی کے ساتھ ترکیب نہ پائیں اطمینان بخش نہیں ہوسکتے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ خوردہ گیران سیاست اس پر یہ اعتراض کریں گے کہ اس سے ملی منافع اور خود داری کو صدمہ پہنچے گا۔ لیکن ہمارا یقین ہے۔ اگر خود پرستی میں حقیقت شناسی کی لاگ رہے تو پھر دیگراں پرستی اور خود پرستی میں فرق باقی نہیں رہتا۔ اور یہ جذبہ محض تربیت نفس اور قومی تعلیم اور بالخصوص نوجوانان ملت کی تربیت سے پرورش پاسکتا ہے۔ بچوں کی تعلیم میں ہر موقع پر ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا چاہئے تاکہ عیش و مسرت کی گھڑیاں ایام مصیبت نہ بن جائیں۔ سیاسی اور معاشی مسائل کو متوازی حیثیت دے کر جذبہ مفاہمت کے ساتھ حل کرنا چاہئے۔ اور دنیا کی تمام قوموں کے لئے سیاسی امن و امان اور معاشی آسائش و آرام کی مساوات کی حمایت کرنی چاہئے۔

مصری روئی

مصر کی معاشی خوش حالی کا دارومدار روئی پر ہے اور مصری روئی کی قیمت کا کم اور زیادہ ہونا امریکن روئی کی مقدار پر موقوف ہے۔ اس سال امریکن روئی کی پیداوار کا خیال ہے کہ گذشتہ سال کی نسبت ⅕ حصہ زیادہ ہوگی۔ نو دمصر میں بھی اس سال مقدار پیداوار زیادہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت روئی کی قیمت میں ۳۰ فیصدی کے قریب کمی آگئی ہے۔ اور روئی کی قیمت گھٹ جانے کا لازمی اثر یہ ہے کہ باقی تمام ضروریات بقدر ۳۰ فیصدی کے قیمتی ہوگئی ہیں۔ ذیل کے اعداد و شمار سے امریکن اور مصری روئی کی مقدار پیداوار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

گذشتہ سال امریکن روئی		ایک کروڑ پچیس لاکھ گانٹھیں	
اس سال	” ” (اندازہ)	ایک کروڑ ساٹھ	”
گذشتہ سال مصری روئی		ساڑھے بائیس لاکھ	”
اس	” ” (اندازہ)	پچیس لاکھ	”

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس

ماہ رواں میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس مسٹر جناح کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ لیگ کا اجلاس یہ دوسری مرتبہ لکھنؤ میں ہوا اور مسٹر جناح بھی دوسری مرتبہ لیگ کے صدر ہوئے۔ اس سے پہلے ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں اجلاس ہوا تھا اور اتفاق سے مسٹر جناح ہی اس کے صدر تھے۔ لیگ کا یہ بالکل پہلا اجلاس تھا جس میں مسٹر جناح شریک ہوئے تھے۔ ۱۹۱۶ء سے پہلے وہ کانگریس کے نہ صرف معمولی ممبر تھے بلکہ اس کی مجلس منتظمہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے رکن تھے اور لیگ کی شرکت سے ہمیشہ اس لئے انکار کرتے تھے کہ وہ اسے ایک فرقہ وارانہ جماعت سمجھتے تھے۔ جب ۱۹۱۶ء میں لیگ کا اجلاس بھی کانگریس کے ساتھ ہی لکھنؤ میں ہونا طے پایا۔ اور آنے والے دستور کے لئے لیگ اور کانگریس سمجھوتے کے امکانات معلوم ہوئے تو مسٹر جناح نے اس شرط پر لیگ کی شرکت اور صدارت منظور کی کہ لیگ بھی وہی نصب العین منظور کرلے جو کانگریس کا ہے۔ چنانچہ مسٹر جناح کی تحریک پر مسلم لیگ نے ۱۹۱۶ء میں "درجہ نوآبادیات" کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ لیکن جب ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں کانگریس نے "درجہ نوآبادیات" کو بدل کر "سوراج" کو اپنا نصب العین قرار دیا تو مسٹر جناح ؎

اگر یک سرموئے برتر پرم   فروغ تجلی بسوزد پرم

کہتے ہوئے کانگریس سے علیحدہ ہوگئے۔ اس وقت سے موصوف کانگریس سے برابر دور ہوتے چلے جارہے ہیں۔ لیکن اس دوری کے باوجود زمانے کی رفتار کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جس نصب العین کی وجہ سے مسٹر جناح نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کی تھی آج ۳۷ء میں لکھنؤ میں خود آپ کی تحریک پر لیگ نے اسی کو تسلیم کرلیا۔

لیگ کے ۱۹۱۶ء اور ۱۹۳۷ء کے اجلاسوں میں بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں۔ دونوں اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوئے۔ دونوں کے صدر مسٹر جناح ہوئے۔ دونوں میں لیگ کا نصب العین

تبدیل ہوا اور لیگ کی ساری تاریخ میں یہی دو اجلاس ایسے نظر آتے ہیں جن میں حیات کے کچھ آثار پائے جاتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ۱۹۱۶ء کے اجلاس میں تعمیری حیات جلوہ گر تھی اور لیگ نے کانگرس کے ساتھ وہ تاریخی معاہدہ کیا تھا جو تقریباً حرف بحرف مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم میں شامل کرلیا گیا تھا۔ بخلاف اس کے موجودہ اجلاس میں تخریبی عناصر کارفرما نظر آتے تھے۔ یعنی لیگ نے خود کوئی ٹھوس کام کرنے یا مسلمانوں کے لئے کوئی صحیح شاہراہ عمل تجویز کرنے کے بجائے سارا زور کانگرس کی مخالفت میں لگا دیا اور شاید اتنا زور لگا دیا جتنا شمع سحری اپنی آخری بھڑک میں صرف کردیتی ہے۔

بہرحال بادی النظر میں لیگ کا رویہ کتنا ہی مخالفانہ کیوں نہ رہا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ لیگ نے دو تجویزیں نہایت نتیجہ خیز منظور کیں۔ پہلی تجویز نصب العین کی تبدیلی سے متعلق ہے جس کی رو سے لیگ نے بھی قریب قریب کانگرس کا نصب العین تسلیم کرلیا اور دوسری تجویز کے ذریعے سے لیگ نے وفاق کی سخت مخالفت کی۔ یہ دونوں رزولیوشن لیگ کے ترقی پسند رویے پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔ خواہ یہ رویہ اس نے عمداً اختیار کیا ہو۔ یا مجبوراً اختیار کرنا پڑا ہو

لیگ کے موجودہ اجلاس میں تعمیری مقاصد کے ماتحت نہیں بلکہ محض کانگرس کی مخالفت میں مسلمانوں کے مختلف الخیال طبقے ایک جگہ جمع ہوگئے تھے۔ لیکن اُن کا اتحاد بھی اتنا ہی عارضی اور ناکتی تھا جتنا لیگ کا عام جوش و خروش۔ چنانچہ اگر مذکورہ بالا تجاویز کے منظور کرنے اور ترقی پسند رویہ اختیار کرنے کے بعد لیگ نے حسب دستور تمام کارروائی بلند آہنگ دعووں تک محدود نہ کردی بلکہ عمل کو بھی دخل دیا تو خواہ اس نے کانگرس کی کتنی ہی مخالفت کیوں نہ کی ہو وہ لازمی طور پر کانگرس سے قریب تر آجائے گی اور مسلمانوں کا سرکار پرست طبقہ خود بخود اس کا ساتھ چھوڑ دے گا۔ لیکن اگر اُسے عمل کی توفیق نہ ہوئی تو آج نہیں کل اس کی موجودہ حیثیت کا فنا ہوجانا یقینی ہے یعنی بے عملی کی صورت میں وہ حکومت کی حامی اور سرکار پرست جماعت بن جائے گی۔ اور عمل کی صورت میں وہ کانگرس کے دوش بدوش آکھڑی ہوگی۔ اس کے علاوہ لیگ کے لئے کوئی

تیسرا راستہ نہیں ہے۔

علاوہ ازیں دو عناصر اور بھی ہیں جن کی وجہ سے لیگ کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ لیگ کا پروگرام تمام تر سیاسی ہے۔ اس کی ساری جدوجہد کونسلوں اور اسمبلیوں کی نشستیں حاصل کرنے اور سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کرنے تک محدود ہیں۔ اس کے آگے نہ اب تک لیگ نے کچھ کیا ہے اور نہ موجودہ اجلاس میں آیندہ کے لئے کچھ طے کیا۔ یعنی لیگ میں اقتصادی پروگرام کا کوئی وجود نہیں ہے۔ مسلمانوں میں کارخانہ دار اور مزدور کا سوال زیادہ اہم اور نمایاں نہیں ہے۔ لیکن کسان اور زمیندار کا سوال اتنا ہی نازک ہے جتنا ہندوؤں میں ہے۔ اس کے باوجود لیگ نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی اور نہ موجودہ صورت میں وہ کچھ کر سکتی ہے۔ کیوں کہ لیگ پر زمیندار طبقہ پورے زور شور کے ساتھ چھایا ہوا ہے۔ اور وہ نہیں چاہتا کہ اپنے حقوق سے شمہ برابر بھی دست بردار ہو۔ اس کے علاوہ خود مسٹر جناح نے اپنے خطبۂ صدارت میں یہ خیال ظاہر فرمایا کہ بھوک، افلاس، تشدّد اور کسانوں کے حقوق کا شور مچانا کھلم کھلا اشتراکیت کا بیج بونا ہے۔ ایسے حالات میں ظاہر ہے کہ لیگ سے کسی اقتصادی پروگرام کے پیش کرنے کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ اور جب تک یہ نہیں ہوتا لیگ کا وجود ہمیشہ خطرے میں رہے گا۔

دوسری چیز لیگ کا جمہور سے تعلق ہے۔ اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں کہ اس وقت لیگ بالائی اوسط طبقے کی جماعت ہے۔ زیریں اوسط طبقے اور جمہور سے اُسے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ مانا کہ موجودہ اجلاس میں اس کی کوشش کی گئی ہے اور لیگ نے اپنی فیس کی نیت کم کر دی ہے اور مختلف صوبوں اور ضلعوں میں شاخیں قائم کرنے پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ لیکن بظاہر اس کا کوئی خاص نتیجہ برآمد ہوتا نظر نہیں آتا۔ کیوں کہ جب ان شاخوں کے پاس کرنے کے لئے کوئی کام نہ ہوگا اور ان کے سامنے کوئی عملی اور تعمیری پروگرام نہ ہوگا تو وہ کب تک باقی رہ سکتی ہیں وہ تو صرف برسات کی گھاس کی طرح ہوں گی جو پانی کے چند چھینٹے پڑنے

سے جم آتی ہے۔ اور پھر تیز دھوپ پڑنے سے مرجھا جاتی ہے۔ حیات دراصل عمل میں ہے۔ اور عمل کے بغیر جمہور سے واسطہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جب تک لیگ جمہور سے واسطہ پیدا نہ کرے گی۔ اور اُن کے فائدے کے لئے کوشش نہ کرے گی۔ اس کی حیات کے امکانات معلوم۔ (م، ع، خ)

مدراس اسمبلی

جب سے کانگریس نے حکومت سنبھالی ہے۔ کانگریسی صوبوں میں بڑی چہل پہل ہے۔ اُن کی سرگرمیوں کے چرچے دوسرے صوبوں پر بھی اثرانداز ہیں۔ پہلی بار ہندوستان کے عوام نے محسوس کیا ہے کہ حکومت میں ہمارا بھی حصہ ہے۔ ایسے موقعہ پر کسی ادارے میں عوام کے شامل ہو جانے سے جو ہماہمی، خلوص اور جوش پیدا ہو جاتا ہے وہ ایک بڑی حد تک دکھائی دے رہا ہے۔ خصوصاً اسمبلیوں میں اُن کا مظاہرہ بہت زیادہ دلچسپ اور پرجوش طریقے پر نظر آیا۔ یہ جوش نہ صرف عوام میں ہے بلکہ خواص تک اس میں سرشار نظر آتے ہیں۔ خصوصاً مدراس میں تو بڑی مستعدی اور چستی کے ساتھ ارکان حکومت وممبران اسمبلی مصروف کار ہیں۔ ایک دن تمام ارکان نے یہ طے کیا کہ آج بجٹ کی کارروائی ختم کر کے چھوڑیں گے۔ چنانچہ اس روز نصف شب تک اجلاس ہوتا رہا۔ یہ ہندوستانی اسمبلیوں میں پہلی مثال ہے۔

بجٹ | عارضی وزارت کے زمانے میں گورنر نے چھ مہینے کے لئے بجٹ منظور کر دیا تھا کانگریسی وزارت کو بقیہ چھ ماہ کا بجٹ بنانا تھا۔ وہ بھی بہت جلد۔ اس عجلت میں اس نے جو بجٹ تیار کیا ہے، ستائش کے قابل ہے۔

اس وزارت کے لئے بجٹ بنانے میں بڑی دقتیں تھیں۔ صحت تعلیم اور اصلاحی کاموں پر خاص توجہ کی ضرورت تھی۔ پھر ترک مسکرات کا خسارہ۔ لگان کی کمی کا گھاٹا پورا کرنا اور عارضی وزارتوں کی فروگذاشت کا خمیازہ بھی انھیں ہی بھگتنا تھا۔ اخراجات میں کمی کی

جو سب سے آسان اور بہتر صورت بڑی تنخواہوں میں تخفیف کی تھی وہ پہلے ہی سے شجر ممنوعہ ہیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ بجٹ میں کسی آمدنی کے اضافے کا امکان نہ تھا اگر عوام پر کوئی ٹیکس لگایا جاتا تو اُن کی کم آمدنی پر ایک مزید بار پڑتا جو کسی طرح مناسب نہ تھا البتہ متمول صحاب پر انکم ٹیکس بڑھایا جا سکتا تھا۔ اس سے ان کی ذات پر چنداں اثر نہ پڑتا اور بجٹ بھی ایک حد تک متوازن ہو جاتا۔ لیکن قانون کی رو سے صوبجاتی حکومتیں اس معاملے میں بھی بے بس ہیں وہ انکم ٹیکس نہیں بڑھا سکتیں۔ اس لئے جوں توں کاٹ کر کے بجٹ بنا لیا گیا۔ بجٹ میں عوام کی بہبود اور قومی تعمیری کاموں کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ مثلاً لگان کی معافی کے لئے ۷۵ لاکھ ہیں۔ صحت، آب رسانی، زراعت وغیرہ کے لئے ۴۲ لاکھ سے زیادہ۔ چرخے کی صنعت کے فروغ کے لئے دو لاکھ۔ صفائی، قرض امداد باہمی اور دیگر تعمیری کاموں کے لئے بھی کافی گنجائش رکھی گئی ہے باوجود اس کے ۶۰ ہزار پس انداز ہوتے ہیں۔

نشیلی اشیا کا ترک نشیلی چیزوں کے ترک کرنے پر کانگریس کا بڑا زور ہے۔ مسکرات کی قباحت اور مضرات کے سب قائل ہیں اور اس کے ترک کے لئے بھی آمادہ۔ مگر اس راہ میں ایک بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ آب کاری کے محکمے کی آمدنی تعلیم پر صرف ہوتی ہے۔ اس کے بند کرنے کے معنی قوم کی بنیادی ضرورت، تعلیم کو روک دینے کے ہیں۔ اس لئے یہ مسئلہ بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن گاندھی جی تعلیم کے لئے ناپاک آمدنی کے سخت خلاف ہیں۔ کانگریس بھی "آب زمزم از دہانِ طشت" کی قائل نہیں۔ خود وزیرِ اعظم مدراس اس معاملے میں بہت کڑے ہیں انھوں نے حال ہی میں کہا ہے کہ میں وزارت کو ترک کر سکتا ہوں مگر ترک مسکرات کے خیال سے باز نہیں آ سکتا۔ چنانچہ اسمبلی نے طے کر دیا ہے کہ تدریجاً اس بلا کو ملک سے ٹالا جائے۔ تاکہ رفتہ رفتہ خسارہ پورا ہوتا جائے۔ اور کام بھی پختگی کے ساتھ انجام پائے۔ چنانچہ خیال ہے کہ تین سال میں یہ اسکیم کامیاب ہو جائے گی پورے صوبے میں ترک مسکرات سے آب کاری کے شعبے کو ۵۰۰۰۰۰۰ روپے کا نقصان ہے، ابتداءً مدراس میں ایک ضلع طریقہ کار

کے طے کرنے اور کام کا تجربہ حاصل کرنے کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ یہ ضلع سیلم ہے۔ سردست اس ضلع کی آب کاری کی ۱۱۰۰۰۰۰ روپے کی آمدنی سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ تخمینہ آمدنی صرف سال رواں کا ہے۔ ورنہ یوں یہاں سے آب کاری کی سالانہ آمدنی ۳۰۰۰۰۰۰ روپے ہے۔ اس ضلع کا ۷۰۵۰ مربع میل اور آبادی ۲۴۳۴۹۷۲ ہے۔

سیلم ضلع خاص طور پر اس لئے منتخب کیا گیا ہے کہ یہ وزیر اعظم مدراس کی جائے پیدائش ہے اور ان کا اثر و رسوخ اس ضلع میں بہت زیادہ ہے۔ اس کام کی نگرانی کے لئے ایک خاص افسر مقرر کیا گیا ہے۔ حکومت کا خیال ہے کہ مزید عملے کی ضرورت نہ ہوگی کیوں کہ اب تک جو ساقی تھے وہی محتسب بن جائیں گے۔ آب کاری کے شعبے کے لئے یہ بھی بڑی دلچسپ خدمت ہوگی۔

اس تجویز کا نفاذ ۲ر اکتوبر سے ہو چکا ہے۔ حکومت کے کارندے، قومی لیڈر، وزرار سب جلسے جلوس، وعظ و تلقین میں مصروف ہیں۔ جام و سبو لوٹ رہے ہیں۔ مے خانوں کی جگہ چار خانے بن رہے ہیں۔ پرانے پرانے مے گسار اپنے ہاتھوں پیمانہ و ساغر توڑ رہے ہیں۔ یہ سب وہاں ہو رہا ہے "جہاں ہندو راج" ہے۔ لیکن ہمارے "اسلامی صوبے" اب تک خاموش ہیں۔

کے توانم دید زاہد جام صہبا بشکند　　می پرو نگم حبابے گر بہ دریا بشکند

(م ۔ ح)

ممالک متوسط کی اسمبلی

بجٹ سی پی کی وزارت کے لئے بجٹ بنانا بہت ہی مشکل کام تھا، اس لئے کہ یہاں کی آمدنی زیادہ تر روئی پر موقوف ہے۔ لیکن اس سال کثرت باراں کی وجہ سے فصلوں کو نقصان پہنچا۔ اس نقصان سے بچنے کے بعد جو پیداوار ہوئی اس کے لئے بازار میں مقابلہ سخت ہے وجہ یہ ہے کہ اس سال امریکہ میں روئی کثرت سے پیدا ہوگئی۔ اس خاص مشکل کے علاوہ اس صوبے کے لئے ان تمام دقتوں کا سامنا بھی تھا جو نئ

کانگریسی صوبوں کو پیش آئیں۔

۳۸-۱۹۳۷ء کے بجٹ کے مطابق یہاں کی آمدنی ۴٬۴۴٬۴۴٬۰۰۰ روپیہ اور خرچ ۴٬۴۴٬۵۳٬۰۰۰ ہے اس طرح ۳۱٬۰۰۰ کی بچت ہو گی۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کانگریسی وزارت سے پہلے ۳۷-۱۹۳۶ء کے بجٹ میں ۸٬۶۰٬۰۰۰ روپیہ کے خسارہ کا اندازہ لگایا گیا تھا۔ لیکن وہ بڑھ کر ۱۴٬۵۸٬۰۰۰ روپیہ تک پہنچ گیا۔ حالانکہ اس بجٹ میں وہ بہت سی قومی تعمیری مداتِ خرچ شامل نہیں تھیں۔ جو اس میں رکھی گئی ہیں۔

سی، پی میں جنگلی مواضعات کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے جن میں زیادہ تر گونڈھ اور بھیل قدیم قومیں آباد ہیں۔ ان کی تعلیم و تربیت کی طرف اب تک کسی حکومت نے توجہ نہیں کی۔ لیکن کانگریسی وزارت نے اس کا خیال رکھا ہے۔ چنانچہ ہر حلقے میں ایک مدرسہ کھولنے کی اسکیم ہے۔ بجٹ میں ۸۰۰۰ روپیہ قانون زراعات پر عمل درآمد اور قدیم باشندوں کی اخلاقی ترقی کے لئے جنگلی مواضعات کی تعلیمی ترقی کی خاطر ۴٬۰۰۰ روپیہ سالانہ اور ۷٬۲۰۰ روپیہ یکمشت، ضلع ملیوں کے لئے ۱۲٬۰۰۰ منظور کئے گئے ہیں۔

بہت رواروی میں یہ بجٹ بنایا گیا ہے۔ امید ہے کہ آئندہ بجٹ تک وزارتوں کو سوچنے کا موقع مل جائے گا۔ اور کام کا اچھا خاصا تجربہ ہو جائے گا۔ آمد و خرچ کی ہر مد اُن کے پیش نظر رہے گی۔ اس لئے وہ بہت بہتر بجٹ بنا سکیں گی۔ موجودہ صورت میں بھی یہ بجٹ بہت غنیمت ہے۔

ترک مسکرات | ترک مسکرات کی اسکیم ضلع ساگر اور نرسنگھ پور سب ڈویژن میں چلایا جانا طے ہوا ہے۔ نیز آکوٹ (برار) اور چند چیدہ صنعتی علاقوں میں بندش کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ اندازہ ہے کہ اس تحریک سے صوبے کو ۳۴ لاکھ کا خسارہ ہوگا اس گھاٹے کو پورا کرنے کے لئے کئی سال پر تقسیم کر دیا جائے گا۔ کچھ نئے ٹیکس لگائے جائیں گے جن کا غریبوں پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ اور اسی اثناء میں یہ رقم دیہات سدھار کے کاموں پر صرف ہو گی۔

چونکہ اس سال شراب کے ٹھیکے دسمبر تک اور تاڑی کے اگست تک جاری رہیں گے اس لئے کل خسارہ ۳۵٬۰۰۰ روپیہ کا ہو گا۔

اعزازی پولیس کے افسر | یہ طے کیا گیا ہے کہ اعزازی پولیس افسر کا تقرر کیا جائے۔ تاکہ تنخواہ دار ملازموں میں

تخفیف ہو۔ اور پولیس کی اسپرٹ میں بھی نمایاں فرق پیدا ہو جائے۔ سردست ایسے افسران مقامات اور فرائض پر مامور کئے جائیں گے جہاں جانوروں کی بے رحمی کے انسداد کی ضرورت سمجھی جائے گی۔ اس طرح ان افسروں کو بہت کچھ تجربہ حاصل ہو جائے گا۔ اور پولیس کے اونچے عملے میں تخفیف کا موقع ملے گا۔ نیز اس صورت میں عوام کو پولیس سے وحشت نہ رہے گی اور ایک دوسرے کے معاون و مددگار ثابت ہوں گے۔



ایشیائی آداب

(کرنٹ ہسٹری)

بقائے صحت کیلئے ایک اچھی دوا

اوکاسا ASA

دماغی کام کرنے والوں کو

اوکاسا کے استعمال سے چہرے کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ چستی و توانائی بڑھ جاتی ہے۔

اوکاسا کے استعمال سے جھریاں اور سفید بال نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے اعضائے رئیسہ نئی قوت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

اوکاسا کے استعمال سے اضمحلال، چڑچڑاپن، نیز دوسری اعصابی بیماریاں دور ہو جاتی ہیں اور آدمی کی تمام زائل شدہ قوتیں عود کر آتی ہیں۔

اس سے پہلے کہ

بحالی قوت رفتہ کا وقت گذر جائے اوکاسا کا استعمال شروع کر دیجیے

سو ٹکیوں کا بکس دس روپے عہ ۱۰/ آزمائش کیلئے ۴۰ ٹکیاں چار روپے للعہ ۴/

اوکاسا کے استعمال سے مکمل فائدہ حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ نئی اور تازہ اوکاسا کی ٹکیاں استعمال کی جائیں اس کی شناخت یہی ہے کہ تازہ اوکاسا کے ڈبے پر ایک سرخ فیتہ ہوتا ہے

اوکاسا ہر دوافروش سے مل سکتی ہے یا ذیل کے پتہ سے بھی منگا سکتے ہیں۔

اوکاسا کمپنی برلن انڈیا (لمیٹڈ) نمبر ۱۲ ریمپرٹ رو پوسٹ بکس نمبر ۳۹۶ ممبئی

روزنامہ

مونس

اٹاوہ

مسلمانوں کے حقوق کا سچا محافظ۔ حق و صداقت کا علمبردار۔ حقیقی ہندو مسلم اتحاد کا شیدائی۔ حکومت کی پالیسی پر آزادانہ نکتہ چینی کرنے والا۔ آزادی کا حامی مسلم لیگ کا حمایتی۔ ہندوستان و ممالک غیر کی تازہ ترین خبریں شائع کرنے والا۔ صوبہ متحدہ کا نہایت ارزاں اخبار زیر ادارت جناب مولوی فدا حسین صاحب فاضل ادب کامل۔ عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

ایجنٹوں کی ہر شہر و قصبہ میں ضرورت ہے۔ خط و کتابت سے معاملات طے ہو سکتے ہیں مشتہرین کے لئے خاص رعایت۔ نمونہ کا پرچہ مفت۔

جن لوگوں کو اخبار کی خریداری منظور ہو وہ ایک کارڈ بھیج کر اپنا نام درج رجسٹر کرالیں۔ نامہ نگاروں سے خاص طور سے التماس ہے کہ اپنے گاؤں، قصبہ، شہر کی اہم خبریں برابر بھیجیں جو بغیر کسی معاوضہ کے درج اخبار کی جاویں گی۔

چندہ سہ ماہی ۔۔۔ عہ/۱۲

ششماہی ۔۔۔ صہ/

پتہ:۔ مینجر مونس اٹاوہ

دور جدید لاہور

معاصرین کرام کی آراء

لاہور کے ہفتہ وار اخباروں میں دور جدید ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ مجموعی حیثیت سے دلچسپ اور مفید ہے۔ **معارف**

اس میں ایک ہفتہ وار اخبار کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ ایڈیٹر صاحب پرچے کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ **جامعہ**

ترتیب شگفتہ مقالات پرفکر۔ رائے میں صحت و دیانت مضامین عمدہ اور معلومات کا اچھا ذخیرہ ہوتے ہیں۔ **النجم**

اس کی خبروں کا انتخاب پنجاب کے ہفتہ وار اخباروں میں سب سے بہتر ہوتا ہے۔ **ہمدرد**

نہایت قابلیت سے ایڈٹ کیا جاتا ہے۔ پڑھنے والے کو مختلف اخباروں کے مطالعہ سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ . . . . **مصباح**

لاہور سے آج کل جس قدر اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ روزانہ چھوڑ کر ہفتہ وار اخباروں میں دور جدید ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ . . . . **ندیم**

دور جدید اردو کا بہترین ہفتہ وار اخبار ہے۔ . . . . **دلچسپ**

نوٹوں میں معقولیت اور کسی پر اعتراض کرتے وقت نہایت شرافت کو مدنظر رکھتا ہے۔ **پیغام صلح**

بڑی محنت اور کاوش سے ترتیب دیا جاتا ہے۔ عام مروجہ دلچسپیوں اور مفید معلومات سے اس کا کوئی نمبر خالی نہیں ہوتا۔ . . . . **شاہکار**

سالانہ قیمت چار روپے — قیمت فی پرچہ ایک آنہ — نمونہ مفت

منیجر دور جدید۔ ۴۹ کشمیر بلڈنگ میکلوڈ روڈ لاہور

شعلۂ طور

از

جگر مرادآبادی

سادگی و پرکاری، بےخودی و ہشیاری

جو فارسی میں

امیر خسرو کے کلام کی مخصوص صفت ہے

اُردو میں

جگر مرادآبادی کے حصہ میں آئی ہے

شعلۂ طور

جگر کے کلام کا مکمل مجموعہ ہے

قیمت سے ر

مکتبہ جامعہ دہلی

nted at ,nunoun-ul-Mataba Delhi.

جامعہ

مکتبہ جامعہ دہلی

مضامین رشید

از

پروفیسر رشید احمد صدیقی

پروفیسر رشید احمد صدیقی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اردو کے منتخب لکھنے والوں میں ہیں۔ خصوصاً ان کی مزاحیہ نگاری ملک کے ہر طبقے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ان کے مزاحیہ مضامین کا ایک مجموعہ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے شائع کیا ہے۔ یہ مضامین کیا ہیں دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، تر و تازہ، شاداب اور فرحت بخش۔ کتاب کی ظاہری خوش نمائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

قیمت دو روپے (عـ۲)

مکتبہ جامعہ، دہلی

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۸۹۲

بسم اللہ

جامعہ

زیرادارت: ڈاکٹر سید عابد حسین ایم اے۔ پی ایچ، ڈی

جلد ۲۸	دسمبر ۱۹۳۷ء	نمبر ۶

فہرست مضامین

۱۔	وردھا کی تعلیمی کانفرنس	پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے۔ (آکسن)	۹۷۷
۲۔	ہندوستان میں مزدور تحریک	جناب ریاض الدین احمد صاحب ایم اے۔	۹۸۹
۳۔	فروخت پیداوار	پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب ایم اے	۱۰۰۹
۴۔	اسلامی دنیا میں تیل کا خزانہ	مولوی عبد الملک صاحب (جامعی)	۱۰۲۰
۵۔	غزل	حضرت جلیل احمد صاحب قدوائی	۱۰۳۴
۶۔	روس میں اندرونی کشمکش	م۔م	۱۰۳۵
۷۔	تعلیمی دنیا	جناب محمد عبد الغفور صاحب ایم اے (علیگ)	۱۰۴۰
۸۔	رفتار عالم	مراکش۔ فلسطین، مصر، ترکی جیمس رامزے میکڈانلڈ، سر جگدیش چندر بوس حکیم محمد احمد خاں۔ جاپان کا چین پر حملہ	۱۰۴۸

قیمت سالانہ صہ / فی پرچہ ۸ر

پرنٹر و پبلشر پروفیسر محمد مجیب، بی اے (آکسن) محبوب المطابع برقی پریس دہلی

وردھا کی تعلیم

(پروفیسر محمد مجیب صاحب بی اے (آکسن) استاد جامعہ)

پچھلی جولائی سے رسالہ ہریجن میں ایسے مضامین نکلنے لگے جن سے سمجھنے والے سمجھ گئے کہ گاندھی جی کے دل میں ایک نئی دھن سمائی ہے۔ اسی طرح کی دھن جس نے ستیاگرہ کی تحریک چلائی، قوم پرست ہندوستانیوں کو کھدر پہنایا، اور دو مرتبہ ہندوستان کے سارے جیل خانے کانگریسیوں سے آباد کر دیے۔ یہ نئی دھن تعلیمی ہے۔ مگر ابتدا اس کی اخلاق سے ہوئی، اور اسے پیدا دنیاوی حکمت عملی کے اس خیال نے کیا جس نے اخلاقی درجے کا [illegible] جاتا ہے اور ایکسائز کے شعبے میں اپنی بوٹیاں نوچنے لگتا ہے۔ [illegible] کانگریسی حکومت نے ارادہ کیا کہ شراب کی تیاری اور خرید فروخت بند کر دے اور یہ سوال فوراً اٹھ کھڑا ہوا کہ ایسا کیا گیا تو پھر تعلیمی منصوبوں کا کیا حشر ہوگا۔ اب تک تعلیم کا خرچ اس آمدنی سے نکالا گیا ہے جو شراب اور دوسری منشیات کی تجارت پر محصول لگانے سے ہوتی تھی، اور اس آمدنی کے موقوف ہونے سے عام جبری تعلیم کا ارادہ پورا کرنا درکنار ان تعلیمی اداروں کی جان پر بن جاتی جو اس وقت موجود ہیں۔ یہ صورت حال ایک ہی صوبے میں نہیں ہے بلکہ ہندوستان کے بیشتر صوبوں میں پائی جاتی ہے، اور ہمارے ملک میں افلاس بھی اس طرح پھیلا ہے کہ دوسرے ذرائع آمدنی [illegible] بڑھانے سے پوری نہیں کی جا سکتی۔ اس عملی دشواری نے گاندھی جی کے دل پر بہت اثر کیا۔ وہ سوچتے رہے کہ کیا کرنا چاہیے اور ایک دن ان کے دل میں خیال آیا کہ تعلیم کو اپنی ضرورت [illegible] حکومت کا کام آسان نہ ہو گا۔ بلکہ وہ بے روزگاری کی زبردست [illegible] جو موجودہ نظام تعلیم نے پیدا کی ہے، کیونکہ تعلیم اپنا خرچ آپ [illegible] دستکاری سکھائی جائے اور اتنا مال تیار [illegible] کہ جب بچے مدرسوں [illegible] اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔

اپنا یہ خیال گاندھی جی نے "ہریجن" میں پیش کیا، لوگوں نے اس کے متعلق اپنی رائے دی اور گاندھی جی خود بھی اور نکتے اور تفصیلی باتیں جو اُن کی سمجھ میں آئیں بیان کرتے رہے۔ لیکن یہ معاملہ اتنا سلجھا ہوا نہیں ہے کہ مضمون لکھ کر طے کر لیا جائے، اس وجہ سے وردھا میں فن تعلیم کے ماہروں اور کانگرسی وزیروں کی ایک کانفرنس کرائی گئی۔

کانفرنس کے صدر مہاتما جی خود ہوئے۔ ان کی صحت بہت نازک ہے، اور اس ڈر سے کہ کہیں عین وقت پر ان کے قویٰ جواب نہ دیدیں انھوں نے چار پانچ روز پہلے سے خاموشی اختیار کر لی تھی۔ لیکن کانفرنس کے پہلے اجلاس میں وہ قریب ڈیڑھ گھنٹے کے بولے اور تعلیم کا جو نیا طریقہ ان کے ذہن میں تھا اسے تفصیل سے بیان کیا۔ میں نے ان کی تقریر حرف بحرف لکھنے کی کوشش نہیں کی اور گاندھی جی زبان کو سلجھانے اور آسان کرنے کے سوا اور کسی ادبی خوبی کی پروا نہیں کرتے، اس لئے میں ان کے خیالات کو اپنے الفاظ میں اور اختصار کے لئے ترتیب ذرا بدل کر بیان کردوں گا۔

گاندھی جی نے اس وقت کی اعلےٰ اور ابتدائی تعلیم پر جو اعتراض کئے وہ مسلم ہیں، انھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ آیندہ تعلیمی نظام کو درست کرنے کے لئے ان دونوں کو الگ کر دینا ہوگا۔ ابتدائی تعلیم میں بھی انھوں نے شہروں کی ضروریات کو چھوڑ کر صرف دیہات کو مدنظر رکھا۔ موجودہ طریق تعلیم کے انھوں نے جو نقصان بتائے کہ اس کی بدولت دیہاتیوں کو شہریوں کی نقل کرنے کی خواہش ہوتی ہے، ان کے اخلاق بگڑ جاتے ہیں اور کچھ نہیں تو انھیں اپنا خاندانی پیشہ چھوڑ کر نوکری حاصل کرنے کی فکر ہو جاتی ہے، ان سب باتوں سے ظاہر ہو گیا کہ انھیں شہروں اور شہری زندگی سے کچھ نفرت سی ہے۔ پھر بھی ہندوستانی آبادی کا اتنا بڑا حصہ دیہات میں رہتا ہے کہ گاندھی جی کے اس معاشرتی تعصب کا ان کی تجویز پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اپنی تجویز کا یہ پہلو واضح کر دینے کے بعد گاندھی جی نے کہا کہ ابتدائی تعلیم کے لئے عام طور سے چار سال کی جو مدت رکھی گئی ہے وہ بہت کم ہے، اسے بڑھا کر سات سال کر دینا چاہئے، اور ابتدائی تعلیم میں ثانوی تعلیم شامل کر کے پوری مدت کے لئے ایک مشترک اور مسلسل نصاب بنانا چاہئے،

اس طرح کہ فارغ ہونے پر لڑکے کی معلومات قریب قریب اتنی ہوں جتنی کہ اس وقت میٹریکولیشن کے لیئے درکار ہیں۔ مگر یہ تعلیم خالی کتاب کے ذریعے سے نہ دینا چاہئیے، جیسے کہ آج کل ہوتا ہے، بلکہ نصاب کا مرکز کسی دستکاری کو بنانا اور باقی تمام مضامین اسی کے ضمن میں پڑھانا چاہئیے۔ گاندھی جی نے کہا کہ تعلیم کا یہ طریقہ بالکل نیا ہوگا، لیکن جنوبی افریقہ اور ہندوستان میں مجھے تجربہ کرنے کے جو موقعے ملے ہیں ان کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ اس طریقہ پر تعلیم دینا نہ صرف یہ کہ ممکن ہے بلکہ اس کی بدولت بے شمار فوائد بھی حاصل ہوں گے۔

اس وقت جو تعلیم عام طور پر دی جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نوجوان اپنے خاندانی پیشے کو چھوڑ کر نئے ذرائع معاش تلاش کرتے ہیں۔ دستکاری کی جو تعلیم دیہات میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس میں ذہنی تربیت داخل نہیں، اور جو فن بھی جس طریقے پر سکھایا جاتا ہے وہ سائنٹفک نہیں، اور اسلیئے یہ بھی اکثر ہوتا ہے کہ نوجوان اپنا آبائی پیشہ سیکھ کر بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ حکومت نے زراعت اور صنعت کی تعلیم دینے کے لیئے جو مدرسے کھولے ہیں وہ ایسے اوزار، سامان اور تنظیم کی عادت ڈال دیتے ہیں کہ وہاں تعلیم پاکر پھر گاؤں میں کام کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت گاؤں میں اچھے دستکار نہیں ملتے اور دیہی صنعتوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی تمام کوششیں ناکامیاب ہوتی ہیں۔ اگر ہم ابتدائی اسکولوں میں کام بھی سکھائیں اور ذہنی تربیت کا بھی انتظام کریں تو ہماری یہ غرض پوری ہو جائے گی۔ گاؤں کے رہنے والے گاؤں کو چھوڑے بغیر اپنا آبائی پیشہ اس طرح سیکھ لیں گے کہ وہ ان کا ذریعہ معاش بن سکے اور ان کے ذہنی قوی کی ایسی تربیت ہو جائے گی کہ وہ جدت اور ترقی کے حوصلے کر سکیں۔ کام کے سلسلے میں ذہنی تعلیم دی جائے تو دماغ پر بہت بوجھ نہیں پڑتا، اور ذہنی اور جسمانی نشو و نما میں ہم آہنگی رہتی ہے۔ سچی تعلیم دراصل دستکاری کے ذریعے ہو سکتی ہے۔

ہندوستان کے دیہاتوں میں ہر جگہ اب بھی بہت سی صنعتیں نیم جان یا انتہائی پستی کی حالت میں موجود ہیں۔ جن کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اور تکلی اور چرخا تو ایسی چیزیں ہیں جو ہر وقت اور ہر جگہ کام آ سکتی ہیں۔ کاتنے اور بننے کا کام کم سے کم سرمایہ سے شروع کیا جا سکتا ہے۔ اس میں یہ دشواری

بھی نہیں ہے کہ جو مال پیدا کیا جائے اس کی طلب کیونکر ہو۔ اس کے علاوہ ایسے ہیں کہ اس کے سلسلے میں تاریخ، ریاضیات، باقی جغرافیہ وغیرہ جیسے تمام علم بڑی آسانی سے سکھائے جا سکتے ہیں۔ ہم چاہیں تو ابھی سے تکلی ہاتھ میں لے کر اس نئے طریقے پر تعلیم دینا شروع کر سکتے ہیں۔ سیگاؤں میں اس وقت تکلی چلانے کے ساتھ ساتھ حساب، ہندوستانی، تاریخ، جغرافیہ اور موسیقی کی تعلیم دی جا رہی ہے۔

گاندھی جی کی تعلیمی تجویز کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر نئی وضع کے مدرسوں کا انتظام ایسا ہو کہ وہ اپنا خرچ آپ برداشت کریں یعنی اتنا مال پیدا کریں کہ اسے بیچنے سے ان کے اخراجات پورے ہو سکیں۔ ہندوستان جیسے کنگال ملک میں تعلیم عام کرنے کا اور کوئی طریقہ ممکن ہی نہیں۔ ہمارے وزیر اس فکر میں ہے کہ آمدنی بڑھے تو تعلیم پھیلائیں تو انھیں بہت انتظار کرنا ہوگا۔ اگر وہ واقعی کام کرنا چاہتے ہیں تو انھیں اس اصول پر چلنا ہوگا کہ تعلیم اپنا خرچ آپ نکالے۔ دوسری طرف اگر خالص تعلیمی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ مدرسے میں آمدنی کے خیال سے کام کرایا جائے۔ یہ سمجھ لینا کہ لڑکوں نے ہاتھ میں جو چیز بنائی ہے اسے وہ توڑ پھوڑ ڈالیں یہ بالکل بیجا ہے، اور ہم بغیر کسی دشواری کے کھلونوں کو تعلیم کا ذریعہ اور یہ تعلیم اور آمدنی کا ذریعہ بنا سکتے ہیں۔ ایک صاحب نے اس کے متعلق "ہریجن" میں لکھا ہے کہ لڑکوں سے اس طرح کام لینا ان کو غلام بنا لینے کے برابر ہے۔ لیکن اس طرح کا اعتراض صحیح نہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہی لڑکے اب بھی ماں باپ کے لئے برابر ایسے کام کرتے ہیں جن سے آمدنی کی امید ہوتی ہے۔ دیہاتی تو سب اس پر خوشی سے راضی ہو جائیں گے کہ ان کے لڑکوں کو دستکاریاں سکھائی جائیں، اور اگر اس تعلیم کا برابر باضابطہ امتحان ہوتا رہا تو انھیں اور بھی زیادہ اطمینان ہوگا۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنے آپ کو اس دھوکے میں رکھیں کہ تعلیم صرف دان دی جا سکتی ہے، اور لڑکوں سے تعلیم کے لئے بدل نہیں لے سکتے۔ حکومت کو تو یہ سمجھنا چاہئے کہ مدرسوں اور طالب علموں سے یہ مطالبہ کر کے کہ وہ اپنا خرچ اپنے کام سے نکالیں، وہ دراصل اس کا مطالبہ کر رہی ہے کہ تعلیم کارآمد ہو اور جو اسے حاصل کرے وہ کما کر کھانے کے لائق ہو جائے۔

اب رہا یہ سوال کہ ہمارے دیہاتی اسکولوں کے لئے مدرس کہاں سے آئیں گے سو اس کا

حل وہی ہے جو پروفیسر شاہ نے پیش کیا ہے کہ ہم ان تمام لڑکوں کو جو میٹرکولیشن پاس کریں ایک سال کے لئے دیہاتی اسکولوں میں پڑھانے پر مجبور کریں۔ دوسرے ملکوں میں نوجوان فوج میں بھرتی کئے جاتے ہیں اور انہیں اپنی عمر کے دو سے تین سال تک فوجی خدمت کے لئے وقف کرنا پڑتے ہیں اس لئے ہم اپنے نوجوانوں سے تعلیمی کام لیں تو اس میں کوئی بے انصافی نہ ہوگی۔ جب ریاست لڑکوں کی تعلیم پر اتنا خرچ کرتی ہے تو وہ اپنے خرچ کا ایک حصہ اس طرح وصول بھی کر سکتی ہے۔

آخر میں گاندھی جی نے کہا کہ سیرت کی تشکیل کتاب کے ذریعے سے نہیں ہوتی، ہاتھ کے کام سے ہوتی ہے۔ خالی دماغ سے کام لینا آدمی کی فطرت نہیں ہے، [illegible] فطرت ہے تعلیم کے معاملے میں ہم یورپ کی تقلید نہیں کر سکتے، اس لئے کہ وہاں لوٹ مار ہی کا راج ہے اور روس بھی ہمارے لئے کوئی مثال نہیں، اس لئے کہ ہم اہمسا کو مانتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں تعلیم پر بہت زیادہ خرچ کیا جاتا ہے لیکن ان کی دولت دوسری قوموں کا خون چوس کر حاصل کی جاتی ہے۔ ہمیں تو اپنی تدبیریں اختیار کرنا ہوں گی جو ہماری معاشی حالت اور اخلاقی عقیدوں کے مناسب ہوں۔

گاندھی جی نے جو تجویزیں پیش کیں وہ ایسی تھیں کہ ایک طرف وزیر جنہیں تعلیم کا انتظام کرنا تھا اور جو یوں بھی مالی مشکلات کے سبب سے پریشان تھے اور دوسری طرف ماہران تعلیم گھبرا گئے۔ وزیروں میں کوئی بھی نہیں مانتا تھا کہ تعلیم اپنا خرچ آپ برداشت کر سکتی ہے۔ لیکن اگر کانفرنس گاندھی جی کے اصرار پر طے کرتی کہ ایسا ہو سکتا ہے تو ان کی چھوٹ جاتی۔ ان سے کہا جاتا کہ تعلیم کا بڑے پیمانے پر نئے اصول کے مطابق انتظام کرو اور اگر وہ ذرا بھی پس وپیش کرتے تو ہر طرف سے اعتراضات کی مار پڑتی ماہران تعلیم زیادہ تر اس وجہ سے گھبرائے کہ وہ تعلیم کی پیچیدگیوں اور استادوں کی کوتاہیوں سے واقف ہیں۔ انہیں اخراجات کا بھی اندازہ ہے۔ اور اس لئے ان میں سے کوئی بھی یہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا کہ مدرسوں میں دستکاری کے ذریعہ مکمل تعلیم دی جا سکتی ہے یا دستکاری سکھانے سے مدرسے اپنا خرچ نکال سکیں گے۔ لیکن دونوں اپنی بات کمزوریوں کے اعتراف کے پیرائے میں کہہ سکتے تھے، وزیر کہتے تو یہ کہتے کہ ہم میں اتنی انتظامی قابلیت نہیں ہے کہ ہم ایسے مدرسے بڑے پیمانے پر قائم

کر سکیں، ماہران تعلیم یہ کہتے کہ اب تک ہم نے جس طریقے پر پڑھایا ہے اس میں کتاب کے بغیر کام نہیں چلتا، کتاب کے ساتھ ہم اچھے استاد پر بڑی بھروسا کرتے ہیں، اور اگرچہ ہم خالی کتابی تعلیم کو برا سمجھتے ہیں اور حتی الامکان ہاتھ کا کام بھی سکھاتے اور کراتے ہیں، ہم نے یہ کبھی نہ دیکھا ہے نہ سنا کہ مدرسے اپنی بنائی ہوئی چیزوں کو بیچ کر اپنا خرچ نکالتے ہیں۔ ہاں یہ بےشک ممکن ہے کہ ہم لڑکوں سے کارخانے کے اصول پر کام کرائیں اور کارخانے کا نام اسکول یا صنعتی اسکول رکھ لیں۔ کانفرنس میں ایسے لوگ موجود تھے جنھیں دعوے تھا کہ انھوں نے دستکاری کے ذریعے سے مکمل تعلیم دی ہے اور مدرسے کی مصنوعات سے تعلیم کا پورا خرچ نکلا ہے، اس لیے وزیروں اور ماہران تعلیم کی معذرت آمیز مخالفت کا نہ جانے کیا نتیجہ نکلتا۔ لیکن گاندھی جی نے تقریر ختم کر کے جب لوگوں سے کہا کہ اپنی اپنی رائے دیں تو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ادھر اُدھر دیکھ کر اور سب کی نظریں نیچی پا کر کھڑے ہو گئے، اور ان کی تقریر نے سب کی مشکلیں آسان کر دیں۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب خود بھی سمجھتے ہیں کہ سچی تعلیم وہ ہے جس میں انسان کی تمام صلاحیتیں نشو و نما پائیں، اور چونکہ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ خالی کتابیں پڑھ لینے سے یہ مطلب حاصل نہیں ہوتا، اس لیے وہ بھی چاہتے ہیں کہ ابتدائی تعلیم میں خصوصاً ہاتھ کے کام کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دی جائے۔ لیکن یہ مسئلہ تعلیمی ہے، اس کا روحانیات، اہمسا، دیہاتی تہذیب، تکلی اور چرخے سے کوئی خاندانی تعلق نہیں۔ ذاکر صاحب نے تقریر شروع اسی سے کی۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی کا یہ خیال کہ وہ تعلیم کو ایک بالکل نئی صورت دے رہے ہیں صحیح نہیں، اس لئے کہ مشہور جرمن معلم پستالوئزی نے اسی طریقۂ تعلیم کو سب سے بہتر مانا ہے، اور اس کے بعد سے اس خیال کو عام طریق تعلیم میں شامل کرنے کی برابر کوشش ہوتی رہی ہے اور سینکڑوں معلموں نے تجربہ کر کے اس خیال کو بہترین عملی روپ دینے کی ترکیبیں نکالی ہیں۔ اس وقت اسی طریقے کی ایک خاص صورت امریکہ میں پروجکٹ متھڈ (منصوبی طریقہ) اور دوسری روس میں کومپلکس متھڈ کے نام سے رائج ہے۔ لیکن یہ طریقہ اتنا محدود نہیں ہے جتنا کہ گاندھی جی نے ظاہر کیا ہے، تکلی کے ذریعے ہر علم نہیں سکھایا جا سکتا

اور ایک دستکاری کو لے کر بیٹھ جانے سے کام کے ذریعے تعلیم دینے کا اصول برتا نہیں جاسکتا۔ گاندھی جی نے ابتدائی تعلیم کے لئے سات سال کی جو مدت مقرر کی تھی اس سے ڈاکٹر ذاکر صاحب نے اختلاف کیا، اس بنا پر کہ یہ تعلیم اس وقت ختم ہو جائے گی جو در اصل صلاحیتوں کے ظاہر ہونے کی عمر ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تعلیم اور تربیت نا مکمل رہ جائے گی اور اس کا مقصد بھی یقین کے ساتھ نہ بتایا جا سکے گا کہ پورا ہوا یا نہیں۔ ہمیں چاہئے کہ سات برس کی عام جبری تعلیم کو تکمیل دینے کے لئے ایسے مدرسے قائم کریں جہاں مخصوص صلاحیتوں کے مطابق تربیت دی جائے، یعنی ایک مدرسہ دستکاری اور صنعتی تعلیم کے لئے ہو تو دوسرا ریاضی اور علوم طبیعی کے لئے، اور چونکہ ادبی ذوق بھی مانی ہوئی صلاحیتوں میں ہے، اس کی تربیت کے لئے بھی ایک مدرسہ چاہئے۔ چونکہ ہم اس طریق تعلیم کو بہت بڑے پیمانے پر رائج کرنا چاہتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ ہم چند ادارے منتخب جگہوں پر قائم کریں، اور وہاں اس کا تجربہ کر کے ایسے نمونے بنالیں جن کی پھر عام طور سے نقل کی جا سکے، ورنہ ممکن ہے کہ نئی تعلیم کے رواج سے ہمیں فائدہ کی جگہ الٹا نقصان ہو۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے بعد مولوی عبدالحق صاحب نے ایک مختصر سی تقریر میں فرمایا کہ اگر بچوں کی تعلیم ساتویں برس شروع کی جائے تو اس کا بھی انتظام ہونا چاہئے کہ وہ پانچویں سے ساتویں برس تک تعلیمی کھیل کود میں مشغول رکھے جائیں اور مدرسے کی تعلیم کے لئے تیار کئے جائیں۔ مولوی صاحب کے بعد کئی حضرات نے جن میں تقریب قریب سب کسی نہ کسی طرح کنڈرگارٹن کی تعلیم کا تجربہ رکھتے تھے کانفرنس کو اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا۔

کانفرنس کے لوگوں میں گاندھی جی کی تجویزوں سے بنیادی اختلاف صرف پروفیسر شاہ کو تھا۔ وہ سوشلسٹ ہیں اور ان کے خیال میں اس وقت مشین اور کارخانے سے عداوت برتنا جب کہ ساری دنیا میں انہیں کا راج ہے دیا کو الٹا بہانے کے منصوبے سے کم نہیں۔ گاندھی جی نے یہ طریقہ تعلیم بے روزگاری دور کرنے کے لئے سوچا ہے، لیکن تعلیم سے قطع نظر ہندوستان میں جو معاشی دشواریاں پیش آرہی ہیں ان کا سبب دولت کی غلط تقسیم ہے، اور یہ مسئلہ نئی تعلیم کی مدد سے حل نہ ہوگا۔ ہم دستکاری کی تعلیم دیں یا اسے

تعلیم دینے کا ذریعہ بنا [illegible] تو یہ ہے کہ سب لوگ ایک خاص ذہنیت کے نمونے بن جائیں گے
اور ہماری غریبی اور بڑھ جائے گی۔ دوسرا خطرہ یہ ہے کہ اگر تعلیم کا خرچ نکالنے پر زور دیا گیا تو نئے مدرسوں
کی صنعتی تعلیم ویسی ہی بےجان ہو جائے گی جیسی کہ کتابی تعلیم اس وقت ہوگئی ہے۔ معاشی نقطۂ نظر سے غور
کیا جائے تو تعلیم کا یہ طریقہ بڑی الجھنوں کا پیش خیمہ ہوگا۔ گاندھی جی کی تجویز کے مطابق ریاست نئے
مدرسوں کو عمارت، سامان، استاد دے گی، اور ان میں جو چیزیں تیار ہوں انھیں بیچنے کا انتظام
کرے گی۔ اس طرح کوئی دو کروڑ بچے ہر وقت صنعتی مال تیار کر کے منڈی میں ڈالتے رہیں گے۔ اگر ایسا
ہوا تو پھر ان دستکاروں کا کیا [illegible] ہوگا جو اس وقت موجود ہیں، اور ان کو جنھیں نئے مدرسے تعلیم دے کر
اپنی روزی کمانے بھیجیں گے [illegible] اصل گاندھی جی کی تجویز اسی صورت
میں قابل عمل ہو سکتی [illegible] موجودہ صنعتوں کو بھی ختم یا
کسی طرح نئے تعلیمی نظام میں [illegible] شاہ کو اس سے اتفاق تھا کہ تعلیم ہاتھ کے کام کے
ذریعے سے دینا چاہیے، مگر اس میں انھوں نے یہ شرط لگائی کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے مخصوص استعداد
کے مدرسوں کی جو تجویز پیش کی تھی وہ بھی منظور کی جائے۔ اور عام تعلیم کے انتظام کے ساتھ ایسے مدرسے
بھی قائم کیے جائیں۔

پروفیسر شاہ کے بعد کئی اور حضرات نے تقریریں کیں جنھیں یہاں دہرانے کا موقع نہیں۔ اسی روز
سہ پہر کو کانفرنس کا دوسرا اجلاس ہوا۔ مہاتما جی نے شروع میں اعتراضات کا جواب دیا، لیکن ان کا
اصل مقصد یہ تھا کہ غلط فہمیاں رفع کریں اور یہ واضح کر دیں کہ وہ تکلی کا پرچار کرنا یا کسی نئے صنعتی نظام
کی بنیاد رکھنا نہیں چاہتے ہیں۔ ان کے بعد جن لوگوں نے ان کے قریب بیٹھ کر یا کھڑے ہو کر تقریریں کیں
وہ ایک خاص ذہنی رنگ [illegible] رنگے ہوئے تھے اور اپنے پیر و مرشد کی کمزوری اور پست ہمتی سمجھتے تھے کہ وہ
دوسرے کی بات سننے [illegible] پہلے مقرر ونوبا صاحب نے کہا چاہیے
کہ گاندھی جی کو سامنے [illegible] تعلیمی [illegible] پیش [illegible] کا سہرا اپنے سر [illegible] جو
کچھ میں نے پڑھا اس سے [illegible] تصدیق کی [illegible] شباہت [illegible] تب بھی دو چار

کے اندر جانے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم کچھ چاہتے ہیں۔ یعنی گاندھی جی کی تجویز خاص ان کے ذہن کی ایجاد ہے، اور یہ جو کہا گیا کہ لوگ پہلے بھی اسے جانتے تھے وہ غلط ہے۔ آگے چل کر انھوں نے یہ فرمایا کہ آج کل لوگ محنت سے جی چراتے ہیں، استاد لڑکوں کو مدرسے کے سامنے پیشاب کرتے دیکھتے ہیں اور کچھ نہیں کہتے، ان سے بیڑیاں منگواتے ہیں اور اپنی طرح انھیں بھی آرام طلب بنا دیتے ہیں۔ استادوں کی مخالفت کرتے کرتے ونوبا صاحب تعلیم کی بھی مخالفت کرنے لگے، اور ایسا کچھ کہا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ تعلیم کا لفظ دوسروں کی رعایت۔ شاید گاندھی جی کی اخلاقی کمزوری۔ سے درمیان میں آیا۔ ورنہ اصل کام تو دستکاری سکھانا ہے۔ گاؤں والے استاد اور تعلیم کی حقیقت معلوم کر چکے ہیں۔ وہ مروجہ قسم کے مدرسوں میں اپنے بچوں کو بھیجنے میں تامل کرتے ہیں، دستکاری سیکھنے کے لئے بڑی خوشی سے بھیجیں گے۔

ونوبا صاحب بول چکے تو کاکا صاحب کالیلکر کی باری آئی۔ انھوں نے ۱۹۰۶ء سے اپنا تجربہ اور اپنے تعلیمی نصب العین کے بدلنے کا قصہ سنایا، گاؤں کی اہمیت اور کتابی لیاقت کی بے وقعتی جتائی، مشین سے اس وقت تک کام لینا حرام ٹھہرایا جب تک آدمی اور جانور کی پوری طاقت سے کام نہ لیا جا چکا ہو۔ پروفیسروں اور وکیلوں نے جو قوم کو الجھن میں ڈال رکھا تھا اس کی شکایت کی، اور اس کے بعد فلسفۂ تعلیم پر پہنچے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے چند ماہرانِ تعلیم کے نام لئے تھے۔ یہ سب، کاکا صاحب نے زور سے اور فرمایا کہ میں ان سب کو پڑھ چکا ہوں، اور چونکہ یہ نتیجہ نکالا کہ جب تک ہندستانی ان قوموں میں شامل نہ ہو جائیں جو دوسروں کا خون چوس کر دولت حاصل کرتی ہیں تب تک ہندوستان میں مونٹے سوری اور پروجیکٹ متھڈ (منصوبی طریقہ) رائج نہیں ہو سکتا۔

اس گولہ باری کے بعد صوبہ متوسط کے وزیر تعلیم شکلا صاحب نے تقریر کی۔ وہ خود اس فکر میں ہیں کہ عام جبری تعلیم کا خرچ کسی طرح سے نکالیں، اور انھوں نے یہ طے کیا ہے کہ جہاں جہاں اسکول بنائے ہوں وہاں اتنی زمین حاصل کر لیں جو استاد کی بسر اوقات کے لئے کافی ہو۔ اپنے تجویزہ مدرسوں کا نام انھوں نے ودیا مندر یعنی علم کا گھر رکھا ہے، اور انھیں وہ غالباً تعلیم کے ساتھ تنظیم کے مرکز بھی بنانا چاہتے ہیں۔ دستکاری کے ذریعے تعلیم دلانے میں انھیں کوئی عذر نہیں، اور مدرسے اپنا خرچ آپ نکال سکیں تو

انہیں بہت خوشی ہوئی لیکن انھوں نے کہا کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ممکن کیسے ہوگا۔ میں نے تو یہ سوچا ہے کہ واپس جاتے ہی حکم دیدوں گا کہ وردھا اور سیگاؤں کے ارد گرد پندرہ بیس مدرسے بنا دئے جائیں، اور انہیں مہاتما جی کے سپرد کردوں گا کہ انہیں چلائیں۔ کامیابی کی صورت میں میں تیار ہوں کہ مہاتما جی جو نمونے پیش کریں ان کی نقل کردوں۔

گاندھی جی کی خواہش پر اسی روز رات کو آٹھ سے دس بجے تک کانفرنس نے بحیثیت کمیٹی کے ان کی تجویزوں پر غور کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو اس کمیٹی کا صدر مقرر کیا۔ صدر کی حیثیت سے ذاکر صاحب کو ان لوگوں کی دلجوئی کرنے کا موقع مل گیا جنھیں ان کا یہ کہنا بہت ناگوار معلوم ہوا تھا کہ مہاتما جی کی تجویز نئی اور نرالی نہیں ہے، اور انھوں نے ان تمام لوگوں کو تقریروں کا موقع دیا جو اپنی قابلیت ظاہر کرنے کے لئے بے چین تھے۔ کمال یہ تھا کہ کام بھی ہوگیا، اور کمیٹی نے بحث کے بعد چار رزولیوشن اتفاق رائے سے کانفرنس کے سامنے پیش کرنے کے لئے مرتب کرلئے۔ رزولیوشن یہ تھے:

(۱) اس کانفرنس کی رائے میں سارے ملک کے لئے عام جبری تعلیم کا انتظام کیا جائے اور یہ تعلیم سات سال تک دی جائے۔

(۲) ذریعہ تعلیم مادری زبان ہو۔

(۳) یہ کانفرنس مہاتما گاندھی کی اس تجویز کی تائید کرتی ہے کہ اس تمام مدت میں جو تعلیم دی جائے اس کا مرکز کوئی دستکاری ہونا چاہئے یہ دستکاری ماحول اور ضروریات کا لحاظ رکھ کر منتخب کی جائے اور جہاں تک ممکن ہو تعلیم اور صلاحیتوں کی تربیت کا جو طریقہ اختیار کیا جائے اس کا اسی دستکاری سے گہرا تعلق ہونا چاہئے۔

(۴) اس کانفرنس کو امید ہے کہ اس طریقہ تعلیم سے آہستہ آہستہ اتنی آمدنی ہونے لگے گی جس سے استاد کی تنخواہ نکل آئے۔

دوسرے روز کمیٹی کے یہ ریزولیوشن کانفرنس کے سامنے پیش کئے گئے اور گاندھی جی نے یہ کہہ کر کہ کانفرنس کی تجویزوں کا مقصد ملک کو پابند کرنا نہیں ہے اور جنتا اور تعلیم یافتہ لوگوں نے انہیں دل سے قبول

نہ کیا اور مدد کرنے کو کھڑے نہ ہوگئے تو تجویزوں پر عمل نہ کیا جاسکے گا پھر حاضرین کو اپنے خیالات ظاہر کرنے کی دعوت دی۔ پروفیسر شاہ نے پھر اصرار سے کہا کہ آمدنی پر زور نہ دینا چاہئے، تعلیم کو کسی ایک صنعت تک محدود نہ کرنا چاہیئے۔ ابھی ناس لنگم صاحب، ایم ایل اے اور پروفیسر ملکانی صاحب نے اپنے تجربے کی بنا پر کہا کہ آمدنی اور تعلیم دونوں کا ایک ساتھ خیال نہیں رکھا جاسکتا۔ اور نانا بھائی صاحب نے بھی، جو بھاونگر کے ایک بہت مشہور اور کامیاب بچوں کے اسکول کے بانی اور مہتمم ہیں، کہا کہ تجارتی پہلو کا زیادہ خیال کیا گیا تو ابتدائی تعلیم کی تعلیمی قدر بہت گھٹ جائے گی۔ اس کے بعد وزیروں کی تقریریں ہوئیں، اور ان سب نے کانفرنس کی عام رائے سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے بس بھر کرنے کا وعدہ کیا، مگر صبر اور احتیاط کی ضرورت بھی جتائی۔

آخر میں گاندھی جی نے کانفرنس میں جو خیالات ظاہر کئے گئے تھے ان پر ایک نظر ڈال کر کمیٹی کے چاروں ریزولیوشن کانفرنس کے سامنے پیش کئے اور وہ سب اتفاق رائے سے منظور ہوئے۔ تب گاندھی جی نے اس نئے طریقۂ تعلیم کے لئے نصاب بنانے کی غرض سے ایک کمیٹی مقرر کی اور ذاکر صاحب کو اس کا صدر بنایا۔ ذاکر صاحب کو وردھا میں ایک دن کے لئے روک کر گاندھی جی نے نصاب کمیٹی کا پہلا جلسہ بھی کرالیا، اور یہ کمیٹی غالباً نومبر کے آخر تک اپنا کام ختم کردے گی۔

گاندھی جی نے ایک تقریر کے دوران میں کہا تھا کہ میں پہلے نہیں سمجھتا تھا کہ مجھ میں پروپگنڈا کرنے کی خاص صلاحیت ہے، لیکن لوگوں نے میری تعریف کرتے کرتے مجھے یقین دلادیا ہے کہ میں واقعی اس فن میں ماہر ہوں۔ دراصل لوگوں کی زبان سے زیادہ گاندھی جی کی اپنی یک جہتی اور ان کے خلوص نے ان کو تبلیغ کے فن میں کامل بنادیا ہے، اور وہ اپنی بات کی دھوم ہی نہیں مچا سکتے بلکہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کرسکتے ہیں اور کراسکتے ہیں۔ ان میں یہ صلاحیت بھی ہے، جو خدا کی طرف سے صرف چند برگزیدہ ہستیوں کو ملتی ہے، کہ وہ آدمی ہی نہیں بلکہ زمانے کو بھی پہچانتے ہیں اور زندگی کو کبھی مقصد سے خالی نہیں رہنے دیتے۔ یہ ان ہی کی شخصیت کا فیض ہے کہ ہندوستان کی سیاسی تحریک کے ساتھ ساتھ ایسی معاشرتی تحریکیں بھی جاری رہیں جنھوں نے قومی خدمت کا حوصلہ اور استعداد رکھنے والوں کو برابر تعمیری کاموں میں

مصروف رکھا اور اب کہ مخالفت کی جگہ حکومت کے فرائض ادا کرنا کانگریس کے سپرد ہوا ہے۔ ان ہی کی نظر ہے
جو وقتی دشواریوں اور ذمہ داریوں کے آگے دیکھ رہی ہے۔ کانگریس کے موجودہ صدر نے کانگریس کو
بحیثیت پارٹی کے مضبوط اور سب پر حاوی کرنے اور لگے ہاتھوں قدامت پسند اور فرقہ پرست مسلمانوں کی جڑ
کاٹنے کا تہیہ کیا ہے۔ کانگریسی حکومتیں ابھی تک کندھے بدل بدل کر اپنے آپ کو سیاسی باربرداری کا عادی
بنا رہی ہیں۔ گاندھی جی نے عام جبری تعلیم کی تحریک اٹھائی ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ ہماری سیاست کی جان
یہی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ قوم ان کی دور اندیشی کا حق ادا کر سکے گی یا نہیں۔ اپنی طرف سے تو وہ جو کچھ ہو سکتا
ہے کر کے چھوڑیں گے۔"

ہندوستان میں مزدور تحریک

لی مزدور قوانین

۱۸۸۱ء سے ۱۹۱۴ء تک

از ریاض الدین احمد صاحب ایم اے

ابتدائی مزدور قوانین کا دور ہندوستان کی کاروباری جدوجہد میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ملوں اور فیکٹریوں کا آغاز ہوا۔ اور جدید کاروباری اصول کی طرف ملک نے پہلا قدم اُٹھایا۔ اس وقت سیاسی بیداری اور کاروباری ہوش مندی کا فقدان تھا لیکن یہ مظاہرہ کسی حیرت انگیز اور غیر فطری حقیقت کا نہ تھا ہاں اگر عجیب اور غیر فطری کوئی چیز تھی تو وہ برطانیہ کی نامانوس ہمدردی اور مانچسٹر اور لنکا شائر کے "دکھلانے والے دانت" برطانوی تجار اور پیشہ وروں کا جو تعلق اس وقت تک ہندوستان سے قائم ہوچکا تھا اس کا مقتضیٰ یہی تھا کہ ہندوستان میں برطانوی مال تجارت کے لئے ایک عظیم الشان منڈی تیار کی جائے۔ جہاں نہ مقابلہ ہو نہ محاصل کی حد بندی۔ نہ صنعت و حرفت میں تیز رفتاری ہو نہ اس کے لئے کوئی جذبہ۔ یہ تھا وہ نظریہ جس کے تحت میں ہندوستان کے پہلے مزدور قانون کا مسودہ ۱۸۸۱ء بمبئی کی مجلس قانون ساز میں پیش ہوا۔ اس کے اہم نکات قارئین کی دلچسپی کے لئے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

مسودہ قانون ۱۸۸۱ء

(۱) بچوں کی عمر کا قانونی تعین

(۲) بچوں کے اوقات کا تعین۔

(۳) مشین کے خطرناک حصوں سے بچوں اور لڑکیوں کا تحفظ۔

(۴) تحفظ کے لئے چوگردوں کی تعمیر

(۵) حادثات کاروباری کی فوری اطلاع۔

(۶) سلکٹری انسپکٹر ورل

اگرچہ اس مسودے میں سہراب جی شاپور جی بنگالی کا ہاتھ تھا، جو یقیناً ہندوستان کے ان ناقابل فراموش بہی خواہوں میں سے تھے جن کا دل غریب مزدوروں کی تباہ حالی پر تا حیات آنسو بہاتا رہا مگر یہ بات ذرا قابل غور معلوم ہوتی ہے کہ مندرجہ بالا مسودے میں انھوں نے خود بھی ایسے ہی نکات شامل کئے تھے جن کا تعلق براہِ راست برطانوی مفاد سے تھا۔ نہ اس میں مزدوری کے متعلق کوئی مطالبہ کیا گیا تھا نہ بود و ماند کے انتظامات کی طرف اشارہ تھا۔ نہ حادثات کے مواقع پر مالی اعانت کی گنجائش پیدا کی گئی تھی۔ وغیرہ۔ نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو اس کے اسباب بالکل عیاں ہیں۔ اول تو سہراب جی کی آواز میں کسی منظم فرقے کی طاقت شامل نہ تھی اُن کی جد و جہد ایک گونہ شخصی تھی اور وہ صرف اپنے ان تاثرات کو استعمال کر سکتے تھے جو انھوں نے برطانوی عہدہ داروں پر قائم کر رکھے تھے۔ دوم وہ سمجھ چکے تھے کہ ایسے قانون کا نافذ کرانا جو مانچسٹر اور لنکا شائر کے منشار کے خلاف ہو ناممکن تھا[۵]۔ اس لئے یہ مسودہ ایک "مجلسِ انتخابیہ" کے سامنے غور و خوض کے لئے بھیجا گیا جس نے بعد ترمیم مزید سفارشات پیش کیں وہ یہ تھیں۔

مجلس انتخابی کی تجاویز

(۱) ہر اس کارخانے کو جو کم از کم چار ماہ (فی سال) جاری رہے، اور جس میں بھاپ، پانی اور دیگر آلات کا استعمال بھی کیا جاتا ہو اور جہاں کام کرنے والوں کی تعداد کم از کم سو ہو۔ قانون کی تحت میں لانا چاہئے۔

(۲) ان کارخانوں میں کام کرنے والے بچوں کی عمر کے حدود ۸ اور ۱۴ برس مقرر کئے جائیں اور اُن کی تعداد اور دیگر حالات کا ایک مستقل رجسٹر رکھا جائے۔

(۳) دورانِ کار میں آرام کے لئے وقفے اور اُن کے وقت کا تعین کیا جائے اور صوبہ جاتی حکومت کو حق حاصل ہو کہ وہ جملہ کارخانوں کا معائنہ کریں اور ضرورت کے موافق وقفوں کا انتظام عمل میں لادیں۔

(۴) اس کمیٹی کی آخری مگر خاص تجویز یہ بھی تھی کہ فیکٹری قانون کو ہندوستان کے ہر حصے میں نافذ کیا جائے۔

---

۵ لندن ٹائمس ۱۳ ستمبر ۱۸۷۸ء صفحہ ۱۰ کالم اول (ہندوستان میں فیکٹری لیبر۔ مرتبہ ڈاکٹر احمد مختار صفحہ ۸)

سنہ ۱۸۸۱ء کا قانون

یہ تجاویز پیش خیمہ تھیں اس قانون کا جو ۱۸۸۱ء میں نافذ ہوا۔ اور دس سال تک بلا ترمیم جاری رہا۔ اس کی رو سے :-

(۱) ہر وہ کارخانہ جس میں مشینوں کا استعمال بھاپ یا بجلی کی مدد سے ہوتا تھا۔ جو سال میں کم از کم ۴ ماہ جاری رہتا تھا، اور جہاں کم از کم سو مزدور روزانہ کام کرتے تھے۔ قانونی تحت میں لایا گیا۔ لیکن چائے۔ نیل اور قہوے کے کارخانوں کو قانونی دست برد سے پناہ میں رکھا گیا۔

(۲) بچوں کی عمر ۷ اور ۱۲ برس کے درمیان میں مقرر ہوئی۔ اُن کے اوقاتِ کار کی آخری حد ۹ گھنٹے قرار پائی۔ اور ایک گھنٹہ یومیہ وقفے کا مقرر ہوا۔ اس کے علاوہ ان کے لئے ہر ماہ میں کم از کم ۴ دن کی تعطیل بھی لازمی قرار دی گئی۔

(۳) جملہ حادثاتِ کاروباری کی اطلاع فیکٹری انسپکٹروں کے پاس بھیجنے کا حکم صادر کیا گیا۔

(۴) فیکٹری کے خطرناک حصوں میں چوگردوں کی تعمیر لازمی قرار دی گئی۔ اور فیکٹری انسپکٹروں کو اختیار دیا گیا کہ وہ خطرناک حصوں کی تجویز اپنی رائے سے کریں۔

(۵) ہر شہر کا حاکم ضلع، فیکٹری کا انسپکٹر مقرر ہوا۔ اور صوبجاتی حکومت کو اختیار دیا گیا کہ وہ حسب ضرورت دیگر انسپکٹروں کا تقرر بھی عمل میں لائے۔

(۶) صوبجاتی حکومت کو مزید اختیار عطا ہوا۔ کہ وہ اس قانون کے نفاذ کے لئے مناسب قواعد وضوابط خود وضع کرے۔

اس قانون کے مطالعے کے بعد برطانوی "نیک نیتی" کا دعوی فوراً باطل ہو جاتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مانچسٹر اور لنکاشائر کے مدعیان اصلاح جنہوں نے ہندوستانی مزدوروں کی حالت سدھارنے کا بیڑا اس دعوے پر اٹھایا تھا کہ وہ یہاں کے غریب مزدوروں کو ان تجربات اور مصائب سے محفوظ رکھیں گے جو گذشتہ صدیوں میں برطانیہ کو برداشت کرنا پڑے تھے[1] محض لسان اور فضول گو تھے۔ کیونکہ جس قانون کا نفاذ

---

[1] کمپنی ملوں کے حالات از میو پور

ہوا وہ اپنی جگہ پر بالکل ابتدائی تھا اور کسی طرح ہندوستانی مزدوری کی ضروریات کے لئے کافی نہ تھا اس کے اہم نکات میں اوقات کار کے تعین اور بچوں کے تحفظ کے علاوہ کسی کار آمد اصول کی پابندی عمل میں نہیں لائی گئی تھی۔ مزدوری بے سروسامانی کے بنیادی اسباب کو چھوا بھی نہیں گیا تھا۔ درحقیقت جو کچھ کیا گیا تھا اس میں برطانیہ کا مفاد ہر حال میں مدنظر تھا۔ اور مانچسٹر اور لنکا شائر ہی کے مطالبات پورے کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

۱۸۸۱ء کے قانون کے بعد

دیسی کاروبار اور ملوں کی ترقی کو روکنا برطانی زعماء اور تجار کا وہ حقیقی مقصد تھا جو آزادی کے ساتھ تقریر اور تحریر میں بیان کیا جاتا تھا[۵۱] اور یہ حقیقت ہے جس پر پردہ ڈالنا بڑے سے بڑے برطانیہ پرستوں کے بھی احاطے سے باہر ہے۔ لیکن اعداد و شمار پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ روک تھام کی تمام کوشش تقریباً ناکام رہیں اور اگرچہ اس تیز رفتاری کا سدباب ہوگیا جو "اندیشہ ناک" صورت اختیار کررہی تھی لیکن پھر بھی ۱۸۸۱ء میں فیکٹریوں کی تعداد بمقابلے ۱۸۸۰ء کے ۶۶ کے بجائے ۸۹ ہوگئی تھی۔ اور کپڑے کی بیرونی تجارت ۳ کروڑ گز کے بجائے ۵ کروڑ گز ہوگئی تھی[۵۲] اس ترقی کو مزید طور پر واضح کرنے کے لئے مندرجہ ذیل نقشہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

سوتی کپڑوں کے ملوں کی ترقی[۵۳]

سال	پھرکیوں کی تعداد	چرخوں کی تعداد
۱۸۷۷ — ۷۸	۱۲۸۹۷۰۶	۱۰۵۳۳
۱۸۸۲ — ۸۳	۱۶۵۴۱۰۸	۱۵۱۱۶
۱۸۸۷ — ۸۸	۲۳۷۵۷۲۹	۱۸۸۴۰
۱۸۹۲ — ۹۳	۳۳۷۸۳۰۳	۲۶۳۱۷

---

[۵۱] تفصیل کے لئے "ابتدائی قانونی کوشش" مطبوعہ رسالہ جامعہ ماہ ستمبر صفحہ ۱۷۵ ملاحظہ ہو۔

[۵۲] انڈین ایئر بک ۳۷-۱۹۳۶ء [۵۳] منقولہ از تاریخ محصولات مرتبہ جے، ان، شاہ۔ صفحہ ۲۵۳

ان اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸۸۲ء کے قانون محصولات کے باوجود جس نے برطانیہ کو ہندوستان میں تجارتی آزادی دے کر مقابلے کو قبل از وقت شدید بنا دیا تھا ملوں کی تعداد اور کپڑوں کے کاروبار میں اضافہ ہوتا ہی رہا۔ لیکن اس موقع پر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اگر حکومت کی ہمدردی دیسی کاروبار کے ساتھ شامل ہوتی تو یقیناً ترقی کی رفتار زیادہ تیز ہوتی اور یہ امید کی جا سکتی تھی کہ ہندوستان کی ملیں جلد ہی بیرونی مقابلے کو پسپا کرنے میں کامیاب ہو سکتیں۔ مگر افسوس ہے کہ حکومت کی کوششیں اس کے خلاف تھیں اور بیرونی مقابلے کی پرورش کے لئے ہر ممکن تدبیر عمل میں لائی جا رہی تھی۔

نئے قانون کا مطالبہ

ایسی حالت میں مانچسٹر میں ایجی ٹیشن کا عود کر آنا حیرت انگیز نہیں معلوم ہوتا۔ نئے قانون کا نفاذ ہوتے ہی اس کے خلاف بیزاری کے اعلانات شروع ہو گئے تھے پھر دیسی تجارت کی تیز رفتاری نے زخم پر نمک کا کام کیا لہٰذا ۱۸۸۴ء ہی میں نئے مطالبات کے لئے چیخ و پکار اور ترمیم قانون کے لئے شور و غل شروع ہو گیا۔ اسی زمانے میں میڈکنگ[۵] نے جو ایک برطانوی فیکٹری انسپکٹر تھے بمبئی کی ملوں کا معائنہ کیا اور ایک تحقیقاتی رپورٹ شائع کی جس میں اس زمانے کے جملہ نقائص پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے شکایات کی ایک طویل فہرست بھی تیار کی تھی جس کے اہم نکات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

(۱) اس قانون میں صفائی اور تندرستی کے احکامات کا فقدان ہے۔

(۲) کام کی یکسانی، غیر دلچسپی کا سبب ہو کر عورتوں اور بچوں کی صحت پر خراب اثر ڈالتی ہے۔

(۳) اکثر ملوں میں بچوں کو ۶ بجے صبح سے ۶ بجے شام تک مشغول رکھا جاتا ہے

(۴) دوپہر میں وقفوں کا انتظام نہیں ہے

(۵) مل میں کام کرنے والے بچوں کی عمر اکثر ۸ برس سے بھی کم ہے۔

(۶) بچوں کے لئے ڈاکٹری معائنے اور ان کی صحت کے تیقن کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

۵ میڈکنگ کی تحقیقات کا سلسلہ ۲ ماہ تک جاری رہا تھا۔

(۷) ۱۳ تا ۱۶ برس کی عمر کے بچوں کے لئے قانونی تحفظ کی ضرورت ہے اس لئے "نوعمروں کا ایک نیا درجہ" قائم کیا جائے۔

میڈلینگ کی سفارشات زیادہ تر بچوں کے متعلق نہیں۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ برطانوی تجار کو عام طور پر یہ بڑی شکایت تھی کہ ایک تو ہندوستان میں مزدوریاں یوں ہی کم ہیں اس پر بچوں کا تقرر "سونے پر سہاگہ" نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیسی ملوں کے کپڑے ارزاں فروخت ہوتے ہیں اور برطانوی مال کو گھاٹا اٹھانا پڑتا ہے۔ بلا شبہ بچوں کی ملازمت کی اصلاح ہر حال میں ضروری تھی اور جملہ نقائص کا دور کرنا حکومت کا بہت بڑا فرض تھا لیکن ساتھ ہی یہ امر بھی کم قابل غور نہیں کہ بچوں کا حال زار ملوں کی فطری خرابیوں کا نتیجہ تھا۔ یا بے بس ہندوستانی مزدوروں کی معاشی اور اقتصادی کمزوریوں کا؟ ایک طرف تو مزدوروں کی اجرتیں اس قدر قلیل کہ بلا بچوں کی مدد کے پیٹ پلنے کے لالے۔ دوسری طرف مانچسٹر اور لنکا شائر کا یہ اصرار کہ اُن کا وجود "غیر معاشی مقابلہ" کی قوت کو نشو و نما دے رہا ہے، اس لئے اُن کی بیخ کنی لازمی۔ ایسی متضاد کیفیت کا مظاہرہ تھا کہ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن اس پر لطف یہ ہے کہ بے شمار مجالس نے سفارشیں کیں۔ بڑے بڑے کمیشنوں نے تجاویز پیش کیں۔ وفدوں نے حقوق طلب کئے۔ کانگریس نے یہ نہ سوچا کہ ان نقائص کی جڑ کدھر ہے۔ حقیقی اور بنیادی کمزوری کون سی ہے۔ بچوں پر پابندیاں عائد کرنے سے مزدور فرقے پر کیا اثر پڑے گا؟ ان کی صحت کے قائم رکھنے کا کیا انتظام ہوگا؟ اُن کی تعلیم و تربیت کی کیا صورت ہوگی؟ اگر ان تمام چیزوں کی ذمہ دار حکومت نہیں ہوسکتی تھی تو کیا ضرور تھا کہ بچوں کا تحفظ عمل میں لاکر اُن کی زندگی ملک و قوم اور والدین کے لئے اور بھی دبال دوش بنا دی جائے۔ لیکن چونکہ اصل مقصد کا تعلق ہندوستان کے بہبود سے کم اور برطانیہ کے مفاد سے زیادہ تھا اس لئے مزدور قانون کے اُن لوازمات پر غور کرنے کی ضرورت تھی نہ فرصت۔ لہذا میڈلینگ کی سفارشات کی نقلیں صوبجاتی حکومتوں کے پاس روانہ کی گئیں۔ اور امید کی گئی کہ صوبوں کو ترمیم قانون میں اعتراض نہ ہوگا۔ بمبئی اور مدراس نے مجوزہ ترمیم کے لئے رضامندی کا اظہار کیا۔ لیکن حکومت بنگال نے سختی کے ساتھ مخالفت کی اور بقیہ صوبوں سے بھی ہمت افزا جواب نہیں ملا۔ ہوا کا رخ مخالف دیکھ کر لارڈ رپن نے نئے قانون کی تجویز پیش کرنا مناسب نہ سمجھا مگر حکومت بمبئی نے عزم بالجزم کا اظہار کیا اور ۱۸۸۴ء میں ایک تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا۔ جس سے میڈلینگ کی

رپورٹ پررائے طلب کی۔

ملک کمیشن

اس تحقیقاتی کمیٹی نے جس کے صدر مسٹر ملک تھے اپنی رپورٹ میں حسب ذیل تجاویز پیش کیں۔

(۱) مزدور قانون کا صوبجاتی نفاذ نہ صرف غیر ضروری بلکہ مضر ہے۔ اس لئے یہ قانون تمام ہندوستان میں نافذ ہونا چاہیئے۔

(۲) ملوں اور فیکٹریوں میں حفظان صحت کے حسب ذیل اصولوں کی پابندی لازمی اور ضروری قرار دی جانی چاہیئے :۔

ا ۔ ۱۴ ماہ میں ایک بار سفیدی۔

ب ۔ ۷ سال میں ایک بار رنگائی۔

ج ۔ ہوا کی صفائی کے لئے پنکھوں کا انتظام۔

د ۔ فیکٹری کی تعمیر میں نئے اصولوں کی پابندی۔

(۳) عورتوں اور بچوں کے تحفظ کا انتظام لازمی قرار دیا جائے۔ اور اُن کے اوقات کار ۷ بجے صبح اور ۵ بجے شام تک کے درمیان میں مقرر کئے جائیں۔

(۴) عورتوں اور بچوں کو ہر مہینے میں کم ازکم ۴ دن کی تعطیل دی جایا کرے۔

(۵) بچوں کی عمر کم ازکم ۹ اور زیادہ سے زیادہ ۱۴ برس کے درمیان مقرر کی جائے۔

(۶) بچوں کی تقرری کے لئے ڈاکٹری معائنے کی سند ضروری ہے۔

(۷) مالکان مل کے پاس مزدوروں کا ایک مکمل رجسٹر ہو جس میں اُن کی پوری کیفیت درج ہو۔

(۸) وہ تمام کارخانے بھی قانونی تحت میں لائے جائیں جہاں کام کرنے والوں (بچے، عورتیں، مرد) کی تعداد دس یا دس سے زیادہ ہو۔

حکومت بمبئی تو ترمیم قانون کے لئے بیتاب ہی تھی۔ اس لئے مندرجہ بالا نکات کو قبول کرنے کے لئے فوراً تیار ہو گئی۔ صرف دقت یہ تھی کہ دیگر صوبجات کو اپنا ہم خیال کیونکر بنایا جائے۔ حکومت بمبئی اسی اُدھیڑبن

یں تھی کہ ۱۵ نومبر ۱۸۸۸ء کو مانچسٹر کی مجلس تجارت نے وزیر ہند کی خدمت میں درخواست کی کہ انگلستان کا فیکٹری قانون ہندوستان میں بھی فوراً نافذ کر دیا جائے۔ دوسرے سال ۲۲ مارچ ۱۸۸۹ء کو پھر ایک وفد لنکاشائر کے تاجروں کا وزیر ہند لارڈ کراس کی خدمت میں پیش ہوا۔ اس نے بھی نئے قانون کا مطالبہ کیا۔[۵۷]

ہندوستان میں مخالفت کی ابتدا

اب کی بار ہندوستان کی پرسکون فضا میں بھی ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ اور آنے والے قانون کی طرف سے بے اطمینانی کا اظہار کیا جا رہا تھا۔ اسی دوران میں ملک کمیشن کی تقرری نے جذبۂ اختلاف کو اور بھی بھڑکا دیا تھا اور مسٹر ان، ایم لوکھانڈی نے پہلی بار ۵۵۰۰ مزدوروں کو ہم نوا بنا کر اس کمیشن کے جانب دارانہ طرز عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔ ان کی سب سے بڑی شکایتیں یہ تھیں کہ کمیشن کے اراکین میں کوئی ہندوستانی نہ تھا۔ مالکانِ مل کے نمائندوں کی اکثریت ہی بلکہ شاہدوں میں بھی انھیں کا پورا خیال رکھا گیا تھا۔ مزدوروں کی اس جماعت کی طرف سے مسٹر لوکھانڈی نے مطالبات کی ایک فہرست بھی تیار کی تھی جو کمیشن کے سامنے پیش کی گئی۔ مطالبات یہ تھے۔

(۱) ہفتے وار تعطیل۔

(۲) دوپہر کے وقت کم از کم ½ گھنٹے کا وقفہ۔

(۳) اوقاتِ کار کا ½ ۶ بجے صبح اور غروب آفتاب کے درمیان میں تعین۔

(۴) ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک اجرت کی لازمی ادائیگی۔

(۵) کاروباری حادثات کے موقعوں پر تاوان کی ادائیگی۔

۵۷ اس وفد نے کہا تھا کہ اگر ہندوستان کی ملوں کے مزدور دن رات، اتوار اور سنیچر برابر کام کرتے رہے تو ظاہر ہے کہ اس ملک (برطانیہ) کے مزدور دنیا کی منڈی میں ان کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہیں گے۔ لیکن یہ الزام بالکل غلط تھا۔ اس لئے بمبئی اور مدراس کی مجالس تجارت نے فوراً اس کی تردید کی اور ثابت کیا کہ یہاں کے مزدور گرمیوں میں ۱۳ گھنٹے اور جاڑوں میں صرف ۱۱ گھنٹے کام کرتے ہیں

ان تجاویز کا مقابلہ ملک کمیشن کی سفارشات سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ مزدوروں کی اس جماعت کی آواز درجہ قبولیت تک پہنچنے سے قاصر رہی اور مندرجہ بالا مطالبات میں سے ایک بھی شامل نہیں کیا گیا۔ البتہ وہ تمام نکات موجود ہیں جو مانچسٹر اور لنکا شائر نے طلب کئے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ایسی صورت حال نئے قانون کے منافی تھی اس لئے یہ تمام سفارشات معرض التوا میں پڑگئیں اور نئے قانون کی تجویز کچھ عرصے کے لئے ملتوی ہوگئی

نئے قانون کے لئے مزید کوششیں

لیکن برطانوی تجار خاموش بیٹھنے والے نہ تھے۔ التوا کی خبر مشتہر ہوتے ہی درخواستوں، وفدوں اور ریزولیوشنوں کی ہماہمی پھر شروع ہوگئی۔ اور وزیر ہند کو ہندوستان میں نئے قانون کے نفاذ کے لئے مجبور کیا جانے لگا۔ ۱۸۸۵ء میں مسٹران گرہم اور منڈلا نے دارالعامہ برطانیہ میں نئے قانون کے نفاذ کے متعلق متعدد سوالات کئے۔ اور وزیر ہند سے ان کوششوں پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی جو وضع قانون کے سلسلے میں ہندوستان میں جاری تھیں۔ اسی سال (۱۸۸۵ء میں) لنکا شائر کے کپڑوں کی ملوں اور دیگر فیکٹریوں کے نمائندوں کا ایک وفد وزیر ہند لارڈ کراس کی خدمت میں پیش ہوا جس نے ہندوستان میں نئے قانون کا مطالبہ شدومد کے ساتھ کیا۔

برلن کانفرنس

یہ سلسلہ جاری ہی تھا کہ بین الاقوامی مزدور کانفرنس کا انعقاد برلن میں ہوا۔ اس نے جو تجاویز شرکائے کانفرنس کے ممالک کو بھیجیں اس سے برطانوی تجار کو ایجی ٹیشن کا مزید موقع ہاتھ آیا۔ تجاویز یہ تھیں۔

(۱) ہفتے وار تعطیل ہر فیکٹری میں لازمی ہو۔

(۲) ۱۲ سال سے کم عمر کے بچے ملوں میں ملازمت نہ حاصل کرسکیں۔

(۳) بچوں کو رات میں کام کرنے کی ممانعت کی جائے۔

(۴) ملوں کے مخدوش حصوں میں کام کرنے سے بچوں کو روکا جائے۔

(۵) رات کے وقت عورتوں کو کام کی اجازت نہ دی جائے۔

(۶) ہر فیکٹری میں ۱۱ گھنٹہ یومیہ کا وقفہ مقرر کیا جائے۔

(۷) عورتوں کو زچگی کے بعد ۸ ہفتے کی تعطیل منظور کی جایا کرے۔

ان تجاویز نے برطانیہ کو پھر یورش برپا کرنے کا موقع دیا اور میک لین اور ہیلٹ نے مضامین کے ذریعے سے کانفرنس کے نکات کو ہندوستانی فیکٹری قانون میں شامل کرنے کا مطالبہ کیا۔ لہٰذا گورنر جنرل ہند کی طرف سے فوراً ایک کمیشن کی تقرری کا اعلان کیا گیا جس کا مقصد برلن کانفرنس کی تجاویز پر غور کرنا اور ہندوستان کے لئے اُن کی موزونی پر روشنی ڈالنا تھا[۱]۔ لیکن اگرچہ اب تک ہندوستانی مزدوروں میں خود کوئی بیداری پیدا نہ ہوئی تھی۔ مگر بعض ہمدرد لیڈروں میں ان غریبوں کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا، اور غفلت کا خواب سرگرانی پیدا کرنے لگا تھا، اس لئے مزدور حلقوں سے صدائے مخالفت بلند ہوئی[۲] اور مسٹر لوکھانڈی نے ایک بار پھر ۲۴ اپریل ۱۸۹۰ء کو دس ہزار مزدوروں کو ہم آہنگ کیا اور اُن کے مطالبات اور حقوق کی حمایت شدومد کے ساتھ شروع کی۔ اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ہفتہ وار تعطیل کا مطالبہ مالکان مل نے منظور کر لیا۔ اور اس کے لئے اتوار کا دن مقرر ہوا۔

لیتھ برج کمیشن

۲۵ ستمبر ۱۸۹۰ء کو لیتھ برج کمیشن نے جو برلن کی تجاویز پر غور کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا اپنی رپورٹ شائع کر دی[۳] اور حسب ذیل تجویزیں پیش کیں:۔

(۱) عورتوں کے کاروباری اوقات ۱۱ گھنٹے سے زیادہ نہ ہوں۔

(۲) بچوں میں "چھوٹے" اور "نوعمر" کی تفریق نہ کی جائے[۴]۔

---

[۱] "ہندوستان میں کاروباری حالات" از لوکاناتھن۔ صفحہ ۱۰

[۲] مخالفین میں جمعیۃ التجار کلکتہ، ایوان تجار بنگال، جوٹ ملوں اور کلکتہ ہائڈرالک پریس کی مجالس قابل ذکر ہیں۔

[۳] اس کمیشن نے تحقیقات کی ابتدا بمبئی میں کی اور بعد میں احمد آباد، کانپور اور کلکتہ کا دورہ کیا۔ اس سلسلے میں اس نے ۴۳ فیکٹریوں کا معائنہ کیا اور ۹۶ مزدوروں کی شہادتیں طلب کیں۔

[۴] مجوزہ میڈکینگ ۱۸۵۳ء

(۳) بچوں کی عمر تقرری زیادہ سے زیادہ ۱۴ اور کم سے کم ۱۲ ہو۔

(۴) بچوں کے اوقاتِ کار ۶½ گھنٹوں سے زیادہ نہ ہوں۔

(۵) ہفتے میں ایک دن عام تعطیل کا مقرر کیا جاوے۔

(۶) ½ گھنٹہ یومیہ کا وقفہ لازمی قرار دیا جائے۔

۱۸۹۱ء کا فیکٹری قانون

ان سفارشات نے اس نئے قانون کی طرف رہنمائی کی جس کے متعلق یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ کمیشنوں کانفرنسوں عرض داشتوں اور وفدوں کے عجیب و غریب مجموعے کی پیداوار تھا[۵۱]۔ اس قانون کی رو سے:

(۱) تمام وہ کارخانے جن میں مزدوروں کی تعداد کم سے کم ۵۰ تھی احاطہ قانون میں طلب کئے۔ اور صوبوں کی حکومتوں کو اختیار دیا گیا کہ وہ ان کارخانوں کو بھی قانونی تحت میں لا سکتے ہیں جن میں مزدوروں کی تعداد کم از کم ۲۰ ہو۔

(۲) بچوں کے تقرری کی عمر ۱۴ اور ۱۹ کے درمیان مقرر کی گئی۔

(۳) بچوں کے اوقات کار کو ۹ کے بجائے ۷ گھنٹے کر دیا گیا۔ اور کام کا وقت ۷ بجے صبح اور ۸ بجے شام کے درمیان میں مقرر رہا۔ اسی وقت میں ½ گھنٹے کا وقفہ بھی منظور کیا گیا۔

(۴) عورتوں کے اوقاتِ کار ۱۱ گھنٹے یومیہ رکھے گئے۔ جو ۷ بجے صبح اور ۸ بجے رات کے درمیان کسی وقت مقرر کئے جا سکتے تھے اور ½ گھنٹے کا وقفہ بھی منظور کیا گیا (باقساط (Shifts) کام کرنے والے کارخانوں کو رات میں ہی کام کرنے کی اجازت دی گئی۔

(۵) ہفتے وار تعطیل منظور کی گئی۔

(۶) مجمع کے انسداد اور آب و ہوا کی صفائی کے متعلق صوبے کی حکومت کو قواعد کے وضع کرنے کا اختیار دیا گیا۔

۵۱ ہندوستان میں کاروباری حالات۔ از لوکاناتھن صفحہ ۱۰

ان نکات کے مطالعے سے یہ بات صاف طور پر ظاہر ہے کہ بچوں پر جو قانونی پابندیاں عائد کی گئیں انھوں نے ان کے فاضل اور غیر مصروف اوقات کو جو بہترین کاروباری اور علمی ترقی کا ذریعہ بن سکتے تھے بیکار کر دیا اور ان کی وہی مثل ہوئی کہ نہ الی الذی نہ الی الذی نہ خود ترقی کر سکتے تھے نہ والدین کو مدد دینے کے قابل رہے۔ کیا اس موقع پر برطانیہ کے تجربے سے فائدہ اُٹھا کر ان بچوں کے لئے جبریہ اور بلا معاوضہ تعلیم کا انتظام ممکن نہ تھا؟[۵۱] افسوس ہے کہ برطانوی مدعیان اصلاح نے خود غرضی کا دامن کسی حال میں بھی اپنے ہاتھوں سے چھوٹنے نہ دیا۔ اور اس وقت بھی اپنے مفاد کی پاسداری میں ہندوستانی مزدوروں کے بچوں کو بے رقام اور آوارہ بنانے کی صورتیں مہیا کر دیں ——— کیونکہ فرصت اور ایسی فرصت جس میں کچھ کام نہ ہو صرف کاہلی کردگی کے منافی ہی نہ تھی بلکہ والدین کو مجبور کرتی تھی کہ وہ فاضل اوقات میں اپنے بچوں کے لئے دوسری ملوں میں جگہیں تلاش کریں۔ غرضکہ ۱۸۹۱ء کے قانون کا یہ جز جس قدر اہم تھا اسی قدر عبث اور ہندوستانی کاروبار کی ترقی سے بے تعلق تھا۔

۱۸۹۱ء کے قانون سے بیزاری ——— مانچسٹر میں

اگرچہ یہ قانون ۱۸۸۱ء والے قانون کے مقابلے میں بہتر خیال کیا جاتا تھا۔ لیکن ہندوستان اور مانچسٹر ہر دو جگہ آقا و مزدور ہر دو طبقے میں اس کے خلاف بے زاری کا اظہار کیا گیا۔ مانچسٹر کی مخالفت کا سبب وہ وسیع مطالبات تھے جن کا مقصد دیسی ملوں کی قوتِ مقابلہ کو یک سر نیست و نابود کرنا تھا۔ اس لئے وہ چاہتے تھے کہ برلن کانفرنس کی سفارشات پر عمل کیا جاتا۔ اگرچہ ان کی پابندی خود برطانوی ممالک پر عائد کرنا گوارا نہیں کی گئی مگر ہندوستانی مزدوروں کے قانون میں ان کا شامل کرنا ناگزیر خیال کیا جانے لگا[۵۲] اس مقصد کی تکمیل کے لئے دار العامہ میں سوالات کئے جانے لگے اور گرماگرم

---

۵۱ تاریخ قوانین مزدوران۔ از ہچنسن و ہیرسین صفحہ ۹۷ منظر ہے کہ برطانیہ میں مزدوروں کے بچوں کی جبریہ تعلیم کا انتظام ۱۸۳۳ء اور ۱۸۶۷ء کے قوانین کی رو سے عمل میں آگیا تھا اور نیم اوقاتی مدارس میں مقررہ حاضریوں کا پورا کرنا لازمی قرار دیا جا چکا تھا۔

۵۲ ہندوستان میں فیکٹری قوانین۔ از راجنی کانت داس (فیکٹری قانون ۱۸۹۱ء)

مباحثوں کے سلسلے جاری ہوئے۔ مانچسٹر کے خاص نمائندے مسٹر ہولٹ ہیلٹ نے بھی اس موقع پر ہندوستانی فیکٹریوں کی حالت کا خوب ہی خوب چربا اتارا۔ اسی دوران میں بین الاقوامی حفظانِ صحت کانفرنس کا انعقاد لنڈن میں ہوا[51] وہاں بھی اسی مسئلے پر پرزور مقالے پڑھے گئے اور مسٹر ہیلٹ نے ثابت کرنا چاہا کہ جسمانی تندرستی کے لحاظ سے ہندوستانی مزدوروں کی حالت قابلِ رحم تھی۔ مگر خوبیٔ قسمت سے اس کانفرنس میں چند ایسے اصحاب بھی موجود تھے جو حقیقت سے پوری طرح آشنا تھے۔ اور مخالفوں کا جواب ترکی بہ ترکی دے سکتے تھے۔ اس سلسلے میں گرانٹ کالج بمبئی کے استاد ڈاکٹر ان بنرجی اور سرجن جنرل اینچ کک[52] کے نام خاص طور پر یادگار رہیں گے۔ ان حضرات نے ذاتی تجربے کی بنا پر ثابت کر دکھایا کہ مانچسٹر کی طرف سے جو کچھ بیان کیا گیا تھا وہ حقیقت سے کس قدر دور تھا۔ اور مسٹر ہیلٹ کے مبالغے نے واقعات کی اصل صورت کو بالکل ہی مسخ کر دیا تھا۔"

اسکاٹ لینڈ

اسی دور میں ہندوستان ایک نئے جرم کا خطادار دیا جانے لگا تھا۔ وہ یہ کہ یہاں کی جوٹ ملیں بھی اسکاٹ لینڈ کے کارخانوں سے برسرِپیکار ہو چلی تھیں۔ اور اتنی ترقی کی رفتار سے یہ اندیشہ ہونے لگا تھا کہ ڈنڈی کے کارخانے کہیں ٹھپ نہ پڑ جائیں۔ ۱۸۸۰ء کے بعد ۱۵ برس کی مدت میں جوٹ کے کاروبار میں جو ترقی ظہور پذیر ہوئی اس نے اسکاٹ لینڈ کے مالکانِ مل میں شدید ہیجان برپا کیا۔ اور مانچسٹر کے کپڑوں کے مل والوں کی طرح یہ بھی شور و غل مچانے لگے۔ اور ترمیمِ قانون[53] کا مطالبہ کرنے لگے۔ نیچے دیئے ہوئے نقشے سے معلوم ہوگا کہ ۱۸۹۵ء میں جوٹ ملوں کی ترقی کس زینے پر تھی:-

---

[51] اس کانفرنس کا انعقاد ۱۸۹۱ء

[52] سرجن جنرل کک نے ہندوستان میں ۳۰ (تیس) سال کی طویل مدت گذاری تھی اور جو کچھ انھوں نے بیان کیا وہ ذاتی تجربات کی بنا پر تھا۔

[53] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ہندوستان میں فیکٹری قانون از ڈاکٹر داس (بہ سلسلہ قانون ۱۹۱۱ء)

نکات	اضافہ فی صدی (بعد ۱۵ سال)
(۱) ملوں کی تعداد	۲۴
(۲) چرخوں کی تعداد .	۹۶
(۳) رقم اصل مصروفہ	۹۴
(۴) تعداد ملازمین	۶۶

اس کے علاوہ بجلی کے استعمال نے ان ملوں میں شب و روز باقساط[1] کام کرنے کی آسانیاں بہم پہنچا کر اسکاٹ لینڈ کے خطرات کو اور بھی مستحکم اور شدید بنا دیا تھا۔ اس لئے وہ محسوس کرنے لگے تھے کہ اگر یہی حالت قائم رہی تو بنگال کے مقابلے میں ڈنڈی کے کاروبار کا خاتمہ ہے اس لئے وہاں کی مجلس التجار نے ہندوستان کی جوٹ ملوں کے لئے نئے قانون کا مطالبہ کیا اور حکومت برطانیہ سے درخواست کی کہ برلن کانفرنس کی تجاویز ہندوستان سے منظور کرائی جائیں۔ انھوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دیسی مزدوروں کے ہمدرد اور انسانیت کے علم بردار کا روپ بدل کر خود ہندوستان کی جوٹ مجالس سے درخواست کی کہ ترمیم قانون کے لئے جدوجہد میں آگے بڑھیں۔

برطانیہ میں مزید یورش اور اس کے اسباب

اگرچہ ان تحریکات نے اب تک کوئی خاص نتیجہ پیدا نہیں کیا تھا اور نہ دیسی ملوں کی ترقی نے کسی خاص معاشی یا اقتصادی انقلاب کی صورت اختیار کی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ حالات میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں، حکومت کی پالیسی کاروباری نظام پر گہرا اثر ڈال رہی تھی۔ بیرونی ممالک سے تجارتی تعلقات وسیع کئے جا رہے تھے اور اسی لحاظ سے ملکی آئین میں بھی تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ غرض کہ قدرتی اور مصنوعی اسباب کچھ اس طرح بہم ہوتے گئے تھے کہ ۱۸۹۲ء میں ایسے تغیرات کی ابتدا ہوئی جس نے برطانوی تجارت کو شدید خطرے میں مبتلا کر دیا۔ یہ تغیرات

---

[1] اس وقت جوٹ ملیں ۳ قسطوں میں کام کرتی تھیں۔ لیکن عورتوں اور بچوں کو ۸ بجے رات کے بعد کام کی اجازت نہیں تھی۔

مختصر طور پر ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :۔

(۱) ۱۸۹۲ء میں زراعت کی ناکامی کے باعث خام ... کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔

(۲) ۱۸۹۳ء میں چاندی کے (DEMONETISE) ہونے اور روپیوں کی ٹکسال سے بند ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان اور دور دراز مغربی ممالک کے درمیان تجارتی رشتوں کو قائم رکھنے کے لئے جدید ساخت کی انتظامات کی ضرورت لاحق ہوئی۔

(۳) اسی سال یہ تجویز بھی منظور کی گئی کہ صورت کی لچھیوں کو محصول سے معاف رکھا جائے۔ مگر سوتی کپڑوں پر خواہ وہ باہر سے آویں یا ہندوستان کے تیار شدہ ہوں ۵ ۳/۱ فی صدی کا محصول عاید کیا جائے

(۴) ۱۸۹۴ء ہی میں چین و جاپان کی جنگ کا بھی آغاز ہو گیا جس نے بین الاقوامی معاشی ہم آہنگی کو منتشر کر دیا۔

(۵) ۱۸۹۵ء میں ہندوستانی محاصل کا ترمیم شدہ قانون پاس ہوا اور سوتی سامان پر ۵ فی صدی محصول درآمد عاید کیا گیا۔ (یہ محاصل ۱۸۸۲ء میں اٹھائے گئے تھے)

(۶) بیرونی (بلکہ برطانوی) سامانِ پوشش پر محصول کے اعادے نے مانچسٹر میں تہلکا مچا دیا۔ اور وہاں کے تجار نے اس قدر شور و غل مچایا کہ حکومتِ ہند کو مجبور ہو کر دیسی سامان پر بھی ۵ فی صدی محصول عائد کرنا پڑا

(۷) ۱۸۹۶ء میں زبردست قحط اور ساتھ ہی طاعون نے ہندوستانی کاروبار میں ایسی جدید معاشی کیفیتیں پیدا کر دیں جنھوں نے برطانوی مفاد کو شدید ترین خطرے کے مدمقابل کر دیا۔

ان تمام غیر معمولی حالتوں کے باوجود جب کساد بازاری بھی پورے عروج پر تھی۔ دیسی فیکٹریوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا رہا۔ لہذا ۱۸۹۵ء میں جو تعداد صرف ۱۴۷ تھی ۱۹۰۰ء میں ۱۹۰ ہو گئی۔ یہ ترقی یقیناً برطانوی کاروباری حلقوں میں ہلچل پیدا کرنے والی تھی۔

(۸) اسی زمانے میں بنگال کی تقسیم کے اعلان نے ہندوستان میں ایک نئی سیاسی تحریک کی بنا ڈالی یعنی سودیشی کا پرچار اور بدیشی کا بائیکاٹ۔ اس تحریک نے مانچسٹر اور لنکا شائر کو اپنا دشمن بنالیا۔ اس لئے ۱۹۰۶ء میں برطانوی مزدوروں کی مجلس نے وزیرِ ہند سے درخواست کی کہ ہندوستان کے بالغ مزدوروں

پر کبھی قانونی پابندیاں عائد کی جائیں۔

ہندوستان میں

۱۹۰۵ء میں کساد بازاری کا دور تقریباً ختم ہو چکا تھا اور تجارتی دنیا میں پھر ہماہمی شروع ہو گئی تھی۔ حالات میں جو تغیر واقع ہو چکا تھا اس نے ملوں کی منفعتوں کو بہت بڑھا دیا تھا۔ اور کاروباری اوقات میں غیر معمولی اضافہ عام طور پر رائج ہو گیا تھا۔ اور ان ملوں میں جہاں بجلی کا استعمال ہوتا تھا دن رات مسلسل کام جاری رہنے لگا تھا۔ اس طرح ۱۴، ۱۵ گھنٹے یومیہ کام لینا بالکل معمولی بات ہو گئی تھی۔ ایسی صورت میں مزدور طبقے پر شدید بے اطمینانی پیدا ہو چلی تھی اور اب کی بار قانون کا مطالبہ انہی کی طرف سے کیا جا رہا تھا۔ اور درخواست کی جا رہی تھی کہ ۱۱ گھنٹے یومیہ کا قانونی تعین عمل میں لایا جائے اور مالکانِ مل کو مجبور کیا جائے کہ حادثات کے تاوان اور طبی امداد کے اصول کو منظور کریں۔ اس زمانے میں مزدوروں کے حامیوں میں ہندوستان کا مشہور اینگلو انڈین اخبار "ٹائمس آف انڈیا" بھی تھا۔ اس کے ایڈیٹر نے "غلامانِ بمبئی" کے عنوان سے ایک مضمون ۱۹ دسمبر ۱۹۰۵ء کے اخبار میں شائع کیا جس میں ہندوستانی مزدوروں کے حالِ زار کا پر درد نقشہ کھینچا گیا تھا۔ اس مضمون کا آخری حصہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جاتا ہے:۔

> "۔۔۔ طمع اور حرص کے اس کاروبار کو جو دس ہزار ناتوان اور حرماں زدہ مزدوروں کا خون چوس رہے ہیں روکنے والا کوئی نہیں۔ دولت بارش کی طرح برس رہی ہے۔ مالکانِ مل خوش اعتقادانہ تحریکیں پاس کر رہے ہیں۔ تحقیقاتوں کا لامتناہی سلسلہ جاری ہے مگر مظلوم مزدوروں کی جگر خراش صدائیں کسی کے کانوں تک نہیں پہنچتیں۔"

ممکن ہے کہ "ٹائمس آف انڈیا" کی یہ حمایت در پردہ مانچسٹر، لنکاشائر اور ڈنڈی ہی کی بہبودی کے لئے ہو۔ مگر فی الحال اس سے بحث نہیں کہ اس کا مقصد کیا تھا۔ بہرحال یہ پروپیگنڈا ہی اس طویل یورش کے سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہئے جس نے ہندوستانی مزدوروں کے لئے قانون کا مطالبہ کیا۔

۱۹۰۸ء کی تحقیقاتی کمیٹی

بالآخر کارروائیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ دسمبر ۱۹۰۶ء میں حکومتِ ہند نے وزیرِ ہند کے ایما سے ایک تحقیقاتی کمیٹی

مقرر کی جس کے صدر سر ایچ . پی فریبیر اسمتھ تھے ۔ تحقیقات کا مقصد سوتی کپڑوں کی ملوں کے مزدوری حالات کی جانچ کرنا اور اس کی بنا پر نئے قانون کے لئے مشورہ دینا تھا ۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ

" قوانین خصوصاً جن کا تعلق مزدوروں سے ہو اگر کامیابی کے ساتھ عمل میں نہ لائے جاسکیں تو ان سے کسی مفید نتیجے کی اُمید کرنا عبث ہے ۔ بلکہ درحقیقت اکثر و بیشتر ان نقصان کے فائدہ نہیں پہنچتا ۔ مالکانِ مل کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ حکومت کی دخل اندازی نے اُن کی ذمہ داریوں کو بہت کچھ اپنے ہاتھ میں لے کر ان کے بوجھ کو ہلکا کر دیا ہے ۔ اس لئے ان کا فرض ہے کہ وہ قانون کے عمل درآمد میں پوری طرح حکومت کی مدد کرتے رہیں ۔" ؎۵

اور حسب ذیل سفارشات حکومت کے سامنے پیش کیں :۔

(۱) فیکٹریوں کے اوقات کار کو باقاعدہ متعین کیا جائے اور ان ملوں میں جہاں " باقساط " کام نہیں ہوتا ہے مزدوروں کے اوقات کار ½ ۵ صبح اور ½ ۶ شام کے درمیان میں مقرر کئے جائیں ۔ ۱۲ اور دو بجے کے درمیان میں کم از کم آدھے گھنٹے کے لئے مشین بالکل بند کر دی جایا کرے ۔ جن کارخانوں میں " باقساط " کام ہوتا ہے وہاں قسطوں کا تعین ۵ بجے صبح اور ۸ بجے رات کے درمیان کیا جائے اور بالغ مزدوروں کے کام کی حد ۱۲ گھنٹے سے زیادہ نہ ہو ۔

(۲) عورتوں سے رات کے وقت ہرگز کام نہ لیا جائے ۔

(۳) " نوعمروں کا ایک درجہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے ۔ البتہ ۱۶ برس سے کم عمر کے مزدوروں کا ایک الگ رجسٹر قائم کیا جائے ۔

(۴) یومیہ اور نصف یومیہ کام کرنے والے لڑکوں کے لئے ملازمت سے قبل عمر اور تندرستی کی سند حاصل کرنا لازمی قرار دی جائے ۔

؎۵ سوتی کارخانوں کے مزدوروں کی تحقیقاتی کمیٹی سنہ ۱۹۰۶ء صفحہ ۴

(۵) اس کے علاوہ حسب ذیل دیگر انتظامات کرنے کی درخواست کی گئی:-

(ا) فیکٹری کے مرطوب حصوں میں خشک قمقموں والے مقیاس الحرارت (DRY BULB THERMOMETER) کا استعمال کیا جائے۔

(ب) پانی کی صفائی کا خاص انتظام کیا جائے۔

(ج) سفیدی کی تاریخ درج رجسٹر کی جایا کرے۔

(د) پائخانوں کا مناسب انتظام کیا جائے —— وغیرہ

۱۹۰۸ء کا لیبر کمیشن

سوت کی ملوں کے متعلق جو سفارشات اوپر درج کی گئی ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستانی فیکٹریوں کے لئے ایک نئے قانون کی ضرورت تھی۔ لہٰذا حکومتِ ہند کو ان کا وہ وعدہ یاد دلایا گیا جس میں ۱۹۰۶ء کی تحقیقات کا فیصلہ نئے قانون کے حق میں ہونے پر ایک باقاعدہ کمیشن کے تقرر کی امید دلائی گئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں آنریبل مسٹر (بعد ازاں سیر) ڈبلو۔ ٹی۔ مارسین کی قیادت میں ایک کمیشن کا تقرر ہوا۔ جس نے ۱۹۰۸ء میں ایک کارآمد اور قابل قدر رپورٹ شائع کی[۱]۔ اس کمیشن کی رائے میں ہندوستانی فیکٹریوں کی سب سے بڑی خرابی بچوں کی تقرری کا طریقہ تھا۔ جس میں قانون نکات کی پاسداری بھی روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ اس لئے انھوں نے یہ تجویز کیا کہ ۹ برس کے بچوں کو "نصف یومیہ" اور ۱۴ برس کے لڑکوں کو "یومیہ" ملازم تصور کیا جائے اور اس قانون کی خلاف ورزی کو مناسب سزا کے ذریعے سے روکا جائے۔ اسی طرح انھوں نے بنگال جوٹ ملوں کے طریقۂ عمل کو بھی قابل اعتراض قرار دیا کیوں کہ وہاں ۶، ۷ برس کے لڑکے بھی ۸ اور ۹ گھنٹے کام کرنے پر مجبور کئے جاتے تھے اور غرض کی دُھن میں عمر کے قانونی تعین کو بھی ٹھکرا دینے میں گریز نہ کیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ "نصف یومیہ" مزدوروں میں سے تقریباً ۳۰، ۴۰ فی صدی ایسے تھے جن کو "یومیہ" کام کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا تھا۔ حالانکہ اُن کی اُجرتوں میں کوئی خاص اضافہ واقع نہ ہوتا تھا۔

[۱] فیکٹری لیبر کمیشن ۱۹۰۸ء۔

اسی طرح عورتوں اور مردوں کے مزدوری حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی۔ اور دکھلایا گیا تھا کہ باوجود قانونی پابندیوں کے اکثر ملوں میں دوپہر کے وقفے کا دستور ہی نہ تھا اور نہ اتوار کا دن تعطیل ہی کے لئے وقف کیا جاتا تھا۔ بسا اوقات عورتوں سے رات میں بھی کام لیا جاتا تھا۔[۵] روئی صاف کرنے والے کارخانوں میں جہاں باقساط کام کا طریقہ رائج تھا بسا اوقات عورتوں سے رات میں بھی کام لیا جاتا تھا۔

ظاہر ہے کہ یہ تمام کمزوریاں معائنہ کرنے والوں کی غفلت اور عدم توجہی کا نتیجہ تھیں، اور محض سخت گیر انسپکٹروں کی تقرری سے درست ہو سکتی تھیں۔ مگر جو زیادہ اہم مسائل کمیشن کے پیش نظر تھے وہ عمر اور تندرستی کی سند حاصل کرنے اور بالغ مردوں اور عورتوں کے اوقات کار کے تعین کے لئے۔ یہ مسائل تھے جن پر نہ صرف عام رایوں میں اختلاف تھا بلکہ ممبران کمیشن خود بھی کسی ایک رائے پر متفق نہ تھے۔ کمیشن کی کثریت اس بات پر زور دے رہی تھی کہ یومیہ مزدوروں کے لئے عمر اور تندرستی کی سند تقرری سے قبل حاصل کر لینا لازمی قرار دیا جائے۔ لیکن ڈاکٹر نائر کا[۶] خیال تھا کہ نہ صرف "یومیہ" بلکہ "نصف یومیہ" مزدوری سے بھی اس سند کا مطالبہ کرنا چاہیئے۔ اسی طرح عورتوں کے اوقات کار کے متعلق بھی رایوں میں اختلاف تھا۔ عام طور پر خصوصاً برطانیہ میں مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ ان کے اوقات کار کو گھٹا دیا جائے۔ مگر کمیشن کو اس سے اختلاف تھا اور بجائے گھٹانے کے اُن کے اوقات کو ۱۱ گھنٹے یومیہ سے ۱۲ کر دینا چاہتے تھے اور ایک گھنٹہ یومیہ کے وقفے میں بھی کاٹ چھانٹ کر کے صرف ½ گھنٹہ کر دینا چاہتے تھے۔ رات کے اوقات میں البتہ عورتوں کے کام کی مخالفت کمیشن نے بھی کی اور ساتھ یہ سفارش کی کہ صفائی اور حفظان صحت کے طریقے تمام فیکٹریوں میں رائج کئے جائیں

غرض کہ یہ رپورٹ جو اب تک اپنے قسم کی آخری چیز ہے "محققین فیکٹری قوانین کے لئے باعتبار تنظیم خیالات (نہ کہ باعتبار نتائج ماخوذہ) از حد دلچسپ ہے" اسی رپورٹ کی بنا پر ۱۹۱۱ء کا نیا قانون نافذ ہوا جس نے گذشتہ قانون میں حسب ذیل ترمیمات رائج کیں:-

---

۵ اکثر ملوں میں اتوار کا دن ظاہراً تعطیل کا ہوتا تھا مگر مشین کی صفائی کے بہانے سے کام بھی جاری رکھا جاتا تھا۔

۶ ڈاکٹر نائر کا اختلافی نوٹ ملاحظہ ہو رپورٹ کمیشن سنہ ۱۹۰۸ء

(۱) مردوں کے اوقات کار ۱۲ گھنٹے یومیہ مقرر ہوئے جس میں ½ گھنٹے یومیہ وقفے کی رعایت بھی رکھی گئی تھی۔

(۲) بچوں کی عمر اور تندرستی کی سند پیش کرنا قبل ملازمت لازم کی گئی۔

(۳) عورتوں کے لئے رات کا کام بالکل بند کر دیا گیا (صرف روئی صاف کرنے والی فیکٹریوں میں عورتوں کو رات کے کام کی اجازت دی گئی)

(۴) موسمی کارخانے بھی قانون کی تحت میں لائے گئے۔

(۵) ملوں میں حفظان صحت اور تحفظ کے طریقوں کا استعمال لازمی قرار دیا گیا۔

(۶) ملوں کے معائنے کے لئے انسپکٹروں کے علاوہ دیگر عملوں کے تقرری کا حکم بھی دیا گیا۔

یہ قانون بخیر وخوبی اپنے فرائض کو انجام دے رہا تھا کہ ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم کی ابتدا ہوگئی۔ اس نے یک بیک سیاسی اور معاشی حالات کا رخ پلٹ دیا۔ کاروبار کی خاموش ترقی کے دن ختم ہوگئے اور ایک ہیجانی اور ہنگامی دور کی ابتدا ہوئی جس نے درحقیقت پہلی بار ہندوستانی مزدوروں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور ان کو حقوق کی پاسداری کا سبق دیا۔ اس لئے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک ہندوستان عجیب وغریب معاشی اور سیاسی کشمکش کی آماجگاہ بنا رہا۔ جس کی تفصیل فی الحال آئندہ کے لئے ملتوی کی جاتی ہے۔

فروختِ پیداوار

حبیب الرحمٰن صاحب پروفیسر معاشیات جامعہ عثمانیہ نے مارچ سنہ ۱۹۳۷ء میں "ہندوستانی زراعت کے بعض معاشی مسائل" پر لاسلکی نشرگاہ حیدرآباد سے تین تقریریں نشر کی تھیں یہ اس سلسلہ کی تیسری تقریر ہے۔

اگرچہ اب بھی ہندوستانی کاشتکاروں کے اکثر خاندان اپنے ہی استعمال کے لیے غلہ اور اجناس اُگاتے ہیں، تاہم یہ ایک بدیہی بات ہے کہ اس قدیم طریقے پر اب بہت سُرعت کے ساتھ زوال آرہا ہے۔ جدید وسائل آمد و رفت کی ترقی نے نہر سوئز کے افتتاح کے بعد سے ہندوستان کی زرعی پیداواروں کے لئے دُور دراز ممالک میں خریدار پیدا کردئے ہیں، خاص کر یہاں کی روئی، سَن، چاول اور مختلف روغن دار تخموں کے لئے تو ساری دنیا کے بازار کھل گئے ہیں۔ مزید برآں خود ملک کے اندر کثرت کے ساتھ چھوٹے بڑے شہر نمودار ہورہے ہیں، جن کی بدولت اشیائے خوراک کے وسیع بازار پیدا ہورہے ہیں اور ملک میں صنعت و حرفت کے کارخانوں کے ساتھ ساتھ خام پیداواروں کے لئے بھی نئے نئے بازار مہیا ہوتے جارہے ہیں۔ ان تمام رجحانات کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہندوستان میں کاشتکاروں کی روزافزوں تعداد اس لئے کاشت نہیں کرتی کہ اپنی پیداوار سے براہ راست اپنی احتیاجات رفع کرے بلکہ اس کا زیادہ تر یہ منشا ہوتا ہے کہ دوسروں کے ہاتھ اپنی پیداواریں فروخت کرکے منافع حاصل کرے اور اس کو اپنی معاش کا ذریعہ بنائے۔

ہمارے نظمِ معیشت کی اس تبدیلی کی وجہ سے ہندوستانی کاشتکار کی خوش حالی کے گوناگوں عوامل میں ایک اور عامل کا اضافہ ہو جاتا ہے اور جیسے جیسے ملک میں، نیز ملک کے باہر نقل و حمل کے وسائل محفوظ اور ارزاں ہوتے جاتے ہیں اور زرعی پیداواروں کے بازار پھیلتے پھیلتے تمام دنیا پر محیط ہو جاتے ہیں، اس نئے عامل یعنی فروختِ پیداوار کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے

اور اگر پھر بھی اُس کی طرف سے غفلت کی جائے تو زراعت کے دوسرے شعبوں کی اصلاح و ترقی سے کاشتکاروں کو جو فوائد حاصل ہونے چاہئیں، اُن سے وہ بڑی حد تک محروم رہتے اور دوسرے اشخاص اُن سے مستفید ہوتے ہیں۔

زرعی پیداواروں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت زیادہ موسموں کی پابند ہیں جس کی وجہ سے سال بھر کی تمام پیداوار ایک خاص وقت پر پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ مصنوعات کی طرح وہ سال کے بارہوں مہینے متواتر تیار نہیں ہوتی رہتیں۔ نتیجہ یہ کہ جب تک کوئی خاص انتظامات نہ کئے جائیں، بازار میں رسد غیر معمولی طور پر بڑھ جاتی ہے اور چونکہ ہر کاشتکار جلد از جلد اپنی پیداوار فروخت کرنا چاہتا ہے، اور خریداروں کو کوئی خاص عجلت نہیں ہوتی اس لئے قیمتیں ناواجبی طور پر گر جاتی ہیں اور کاشتکاروں کو اپنی محنت کا کافی معاوضہ نہیں ملتا۔ مزید برآں زرعی کاروبار بالعموم اس قدر چھوٹے پیمانے پر کئے جاتے ہیں کہ اگر کوئی ایک کاشتکار بلکہ کسی ایک گاؤں کے تمام کاشتکار اپنی پیداوار کو روک رکھیں تب بھی مجموعی رسد پر اُس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑ سکتا اور نہ قیمتیں گرنے سے رُک سکتی ہیں۔ لہذا ضرورت جس چیز کی ہے وہ یہ ہے کہ جو بھی نظم قایم کیا جائے وہ سارے ملک پر حاوی ہو، اور زرعی کاروبار کی حد تک یہ کوئی آسان کام نہیں ہے کیونکہ مصنوعات تیار کرنے والے چند بڑے بڑے کارخانوں میں جس سہولت کے ساتھ اتحادِ عمل پیدا کیا جا سکتا ہے وہ چھوٹے چھوٹے کم حیثیت کثیر التعداد کاشتکاروں میں ممکن نہیں۔

اس کے علاوہ زرعی پیداواروں کے خریدار بالعموم بڑے بڑے کارخانوں کے ایجنٹ یا مقامی ساہوکار ہوتے ہیں۔ یہ لوگ بالعموم دولت مند، تعلیم یافتہ، طلب و رسد کے حالات سے باخبر اور معاملہ کرنے میں بڑے تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں اس کے برعکس کاشتکار غریب، جاہل، اور مقامی اور بیرونی حالات سے قطعاً ناواقف ہوتے اور معاملہ کرنے میں بڑی آسانی سے دہوکہ کھا جاتے ہیں۔ اکثر کارخانوں کے ایجنٹ انھیں کچھ پیشگی رقم دے دلا کر تیار ہونے سے پہلے ہی پیداوار پر اپنا حق جما لیتے ہیں اور جب معاملہ مقامی ساہوکار سے پڑے تو پھر کاشتکار کو ذرا بھی چون و چرا کی

گنجائش نہیں رہتی کیونکہ وہ پہلے سے ساہوکار کا قرضدار ہوتا ہے اور جب تک وہ اُسے مزید قرضہ نہ دے، آئندہ بھی اُس کا کوئی کام نہیں چل سکتا۔ اور اگر بالفرض کاشتکار مقامی ایجنٹ یا ساہوکار کے ہاتھ فروخت نہ کرے تو پھر جائے کہاں۔ ہندوستان کے اکثر دیہاتی علاقوں میں ذرائع آمدورفت اس قدر ناقص حالت میں ہیں کہ پیداوار کو دیہات سے باہر لے جانے میں کافی مصارف لاحق ہوتے ہیں۔ اور اگر کاشتکار یہ مصارف برداشت کر کے دُور دراز شہروں اور منڈیوں تک اپنی پیداوار لے بھی جائے، تب بھی اُسے ویسے ہی تیز ہشیار، باخبر اور مالدار فریق سے دوچار ہونا پڑے گا کیونکہ گو ہندوستان میں منڈیاں کافی تعداد میں موجود ہیں، لیکن اکثر و بیشتر صورتوں میں وہ نہ کسی خاص قانون اور ضابطے کے تحت قایم ہوئی ہیں اور نہ ان کے کاروبار میں کسی قسم کے قواعد و ضوابط کی پابندی کی جاتی ہے مختصر یہ کہ کاشتکاروں کی ناقابل برداشت قرضداری، اُن کی جہالت اور عام ناواقفیت، کثرت تعداد کی وجہ سے اُن میں اتحاد عمل کا فقدان، دیہاتی علاقوں میں ذرائع آمد و رفت کی غیر اطمینان بخش حالت، اور باضابطہ منڈیوں کی عدم موجودگی، یہ ایسے امور ہیں جن کی وجہ سے ہم یہ توقع نہیں کر سکتے کہ کاشتکار بغیر کسی بیرونی امداد کے اپنی پیداواروں کی واجبی قیمتیں پا سکیں گے اور جب مناسب قیمتیں ملنے کا ہی قرینہ موجود نہ ہو تو پھر کس امید پر کوئی اپنی پیداوار کو بہتر بنانے کی کوشش کرے۔ نتیجہ یہ کہ زرعی ترقی کے تمام شعبوں کی کامیابی فروخت پیداوار کے مناسب انتظامات کے ساتھ ناگزیر طور پر وابستہ ہے۔

جہاں تک فروخت پیداوار کے موجودہ طریقوں کا تعلق ہے، وہ نہ صرف مختلف صوبوں میں مختلف ہیں بلکہ ایک ہی صوبے کے اندر مختلف پیداواروں کو فروخت کرنے کے مختلف طریقے رائج ہیں۔ لیکن باوجود ان گوناگوں اختلافات کے چند عام خصوصیات ایسی ہیں جو ملک کے ہر حصے میں نظر آتی ہیں اور جن کا بحیثیت مجموعی تمام ملک پر اطلاق ہوتا ہے۔ مثلاً اوزان اور پیمانے بالعموم اس طور پر استعمال کئے جاتے ہیں جس سے ہمیشہ کاشتکار ہی کو نقصان پہنچتا ہے۔

چونکہ ملک میں اوزان اور پیمانوں کے معینہ معیار نہیں ہیں اور نہ ان کی تنقیح و نگرانی کا کوئی باقاعدہ انتظام ہے اس لئے اس قسم کی دھوکہ بازی کا یہاں وسیع امکان موجود ہے جس کا خمیازہ ہمیشہ کمزور فریق کو بھگتنا پڑتا ہے۔ مزید برآں مذہبی اور خیراتی اغراض کے نام سے بغیر کاشتکار کی رضامندی کے قیمت کا ایک جزو وضع کر لیا جاتا ہے اور رسم و رواج کا اثر اس قدر غالب ہے کہ کاشتکار اپنی ناراضگی کے اظہار کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔ نمونے کے طور پر پیداوار کی اچھی خاصی مقدار نکال لی جاتی ہے اور خواہ پیداوار خریدی جائے یا نہ خریدی جائے، بیچنے والے کو نمونے کی مقدار کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ بسا اوقات خود کاشتکاروں کو اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لئے ایجنٹوں کا واسطہ ڈھونڈنا پڑتا ہے اور یہ ایجنٹ خریداروں کے نمائندوں سے جو کچھ گفت و شنید کرتے ہیں وہ بالکل راز میں رہتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہاتھوں پر کپڑا ڈالکر انگلیوں کے اشاروں سے معاملات طے کئے جاتے ہیں۔ اور غریب کاشتکار اُن کی نوعیت سے سراسر ناواقف رہتا ہے۔ بڑی بڑی منڈیوں میں کاشتکار کسی نہ کسی دلّال کو مقرر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور یہ دلّال بالعموم کاشتکاروں سے ناواقف لیکن خریداروں سے روزانہ ملنے جلنے والے ہوتے ہیں اور اس وجہ سے فطرتاً انھیں کی حمایت کرتے ہیں، اور اگر کہیں خریدار اور فروشندہ، دونوں کا ایک ہی دلّال ہو تو پھر خریدار کی حمایت اور بھی زیادہ یقینی اور بدیہی ہو جاتی ہے۔ یہ ایسے نقائص ہیں جو ہندوستان کے کسی خاص مقام یا کسی خاص پیداوار کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ملک کے ہر حصہ میں اور ہر پیداوار کی خرید و فروخت میں وہ کم و بیش ضرور پائے جاتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ان خرابیوں کو کیونکر رفع کیا جائے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ کاشتکار کے تمام موجودہ مصائب کا باعث محض یہ درمیانی اشخاص ہیں جو کاشتکار سے اس کی پیداوار اونے پونے داموں پر خرید کر خریداروں سے اس کی خوب قیمتیں وصول کرتے اور اس طور پر مفت اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ لہٰذا ان خرابیوں کی اصلاح کا سیدھا سادہ علاج یہ ہے

کہ درمیانی تاجروں کا قلع قمع کر دیا جائے اور کوئی ایسا انتظام کیا جائے کہ کاشتکار اپنی پیداواریں براہ راست صارفین کے ہاتھ فروخت کر سکیں۔ واضح رہے کہ اس قسم کے عام بیانات کو علمی تحقیق کا مرتبہ نہیں دیا جا سکتا اور نہ کوئی ذمہ دار شخص ان کی بنا پر کوئی عملی تدبیر اختیار کر سکتا ہے جدید نظامِ معیشت سے جو لوگ ذرا بھی واقفیت رکھتے ہیں، وہ درمیانی تاجروں کی ناگزیر ضرورت اور ان کے اہم فرائض کی نوعیت سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ کاشتکاروں سے پیداوار اکٹھا کر کے اسے صارفین میں اس طور پر تقسیم کرنا کہ مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں طلب و رسد کا توازن نہ بگڑنے پائے ایک نہایت دقت طلب اور پیچیدہ کام ہے اور جب تک کہ کوئی شخص اپنے آپ کو ابتدا ہی سے اس کے لئے وقف نہ کر دے، وہ اسے کامیابی کے ساتھ نہیں انجام دے سکتا۔ مال تیار کرنے یا پیداوار اگانے والوں سے یہ توقع کرنا کہ وہی اس پیچیدہ کاروبار میں بھی مہارت تامہ حاصل کریں، دراصل عبث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ملک میں تجارت پیشہ اشخاص کا ایک علیحدہ گروہ موجود ہے جو ملک کی معاشی زندگی میں ناگزیر خدمات انجام دیتا ہے ہندوستانی زراعت میں تو ان خدمات کو انجام دینے والے ایک مخصوص طبقے کی ضرورت اور بھی ناگزیر ہے۔ اول تو یہاں ذرائع آمد و رفت انتہا درجے ادنیٰ حالت میں ہیں دوسرے یہاں کا زرعی کاروبار کثیر التعداد کم حیثیت کاشتکاروں کے ہاتھوں میں ہے۔ تیسرے ان کسانوں کی نہ مالی حالت ایسی ہے کہ وہ اپنی پیداوار فوراً فروخت کرنے کے لئے بے چین نہ ہوں اور نہ انھیں ایسے گودام میسر ہیں جہاں وہ بہتر قیمتوں کی امید میں اپنی پیداواروں کو بہ حفاظت رکھ سکیں مزید براں جس حالت میں وہ اپنی پیداوار فروخت کرنے کے لئے آتے ہیں، وہ بے احتیاطی اور قصداً آمیزش کرنے سے ہرگز اس قابل نہیں ہوتی کہ بازار میں اس کی اچھی قیمت مل سکے۔ ان گوناگوں دقتوں پر غالب آنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم بھی دوسرے ممالک کی طرح درمیانی تاجروں کی خدمات سے مستفید ہوں، اور ان خدمات کا واجبی معاوضہ ادا کرنے میں تامل نہ کریں۔ البتہ یہ احتیاط لازم ہے کہ یہ لوگ ملک کے حق میں مفید ثابت ہونے کی بجائے

کہیں اُلٹے وبالِ جان نہ بن جائیں۔ ہندوستان میں فروخت پیداوار کی حد تک سر دست جو خرابیاں نظر آرہی ہیں، وہ دراصل ایسی ہی احتیاط نہ کرنے کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ قرض دینے والے ساہوکار کا خود اپنے آسامی کی پیداوار خرید لینا، یا ضرورت سے زیادہ اشخاص کا اس درمیانی تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنا لینا، یا اس میں ایسے اشخاص کا داخل ہونا جن کا منشا محض کاشتکاروں کی مجبوریوں سے بے جا فائدہ اُٹھانا ہو، یہ ایسی خرابیاں ہیں جو زراعت کی ترقی اور زراعت پیشہ طبقے کی خوش حالی میں بُری طرح حائل ہیں اور اسی وجہ سے ان کی اصلاح کے مسئلے کو یہاں بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

اصلاح کی تدبیروں میں سب سے زیادہ اہم باضابطہ منڈیوں کا قیام ہے۔ زرعی کمیشن کا بیان ہے کہ جب کبھی کاشتکار کو اپنی پیداوار اپنے ہی گاؤں میں فروخت کرنے کی بجائے کسی منڈی میں فروخت کرنے کا موقعہ ملتا ہے تو باوجود مصارف نقل و حمل کے اُسے نسبتاً بہت بہتر قیمت ملتی ہے، خواہ منڈی کتنی ہی محدود اور اس کی تنظیم کتنی ہی خراب ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں موجودہ منڈیوں کی اصلاح اور جدید باضابطہ منڈیوں کا قیام کاشتکاروں کے حق میں نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ لہذا ملک کی زرعی ترقی کے لئے جو بھی اسکیم بنائی جائے، باضابطہ منڈیوں کا قیام اس کا ایک لازمی عنصر ہونا چاہئے کیوں کہ اُسی کی بدولت زراعت کے محکموں کی گوناگوں کوششیں بارآور ہوسکتی ہیں۔

خوشی کی بات ہے کہ اب ہندوستان کے اکثر صوبوں میں باضابطہ منڈیوں کے قیام کی کوششیں کی جارہی ہیں اور ہماری ریاست حیدرآباد بھی اس جدوجہد میں دوسروں کے دوش بدوش چل رہی ہے چنانچہ ایک خاص قانون کے تحت متعدد باضابطہ منڈیاں قایم ہوچکی ہیں اور ہمارے کاشتکاران کے فوائد سے روز بروز مستفید ہورہے ہیں۔ قوانین بازار کی رو سے ہر ہر صوبہ وار حکومت منڈیاں قایم کرکے ان کا اعلان کردیتی اور ان کے انتظام کے لئے کمیٹیاں مقرر کردیتی ہے جن میں خریدار اور فروشندہ، دونوں کے نمائندے شامل کئے جاتے ہیں، انتظامی کمیٹیوں کی

ترکیب اور ان کے اختیارات کی صراحت کر دی جاتی ہے اور ان کی رہ نمائی کے لئے مفصل قواعد بنا دئے جاتے ہیں جن کے مطابق وہ فیس وصول کرتی اور بازار کے اغراض پر صرف کرتی ہیں، دلالوں اور تولنے اور ناپنے والوں کو خاص شرائط کے تحت لائسنس عطا کرتی ہیں، تول اور ناپ کے لئے خاص خاص مقام اور خاص خاص اوزان اور پیمانے مقرر کرتی ہیں اور وقتاً فوقتاً ان کی نگرانی اور تصحیح کرتی ہیں، غرض منڈی کے انتظام سے متعلق جو جو امور پیش آسکتے ہیں، ان سب کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ صوبہ واری حکومت کو یہ اختیار ہے کہ غیر اجازت یافتہ منڈیوں اور بازارات کو خاص خاص حدود کے اندر ممنوع قرار دے۔

زرعی کمیشن نے ان قوانین کی تفصیلات میں بہت کچھ اصلاح کی گنجائش بتائی ہے لیکن وہ جس اصول پر مبنی ہیں اس کی بہت تعریف کی ہے اور حکومت سے پر زور سفارش کی ہے کہ دوسرے صوبوں میں بھی ایسے ہی قوانین نافذ کر کے جلد از جلد باضابطہ منڈیاں قائم کی جائیں۔ تفصیلی سفارشات بیان کرنے کی تو یہاں گنجائش نہیں ہے، البتہ تین چار امور ایسے ہیں جن کا سرسری ذکر کر دینا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ ان قوانین کے تحت جو باضابطہ منڈیاں اب تک قائم ہوئی ہیں، ان سب کا تعلق صرف روئی کی خرید و فروخت سے ہے۔ بمبئی کا قانون تو صریحاً روئی ہی کی تجارت کے لئے بنایا گیا ہے۔ برار کے قانون میں اگرچہ دوسری پیداواروں کے لئے گنجائش موجود ہے لیکن عملاً جتنی منڈیاں اب تک قائم ہوئی ہیں وہ سب روئی کی تجارت سے متعلق ہیں۔ ممکن ہے کہ ابتداً یہی طرز عمل قرین مصلحت رہا ہو لیکن اب جبکہ تجربے سے باضابطہ منڈیوں کے فوائد بدیہی طور پر ثابت ہو چکے ہیں، کوئی وجہ نہیں کہ وہ روئی کے علاوہ دوسری پیداواروں کے لئے بھی مفید ثابت ہوں۔ دوسرے یہ کہ باضابطہ منڈیوں کا قیام بلدیات یا مجالس اضلاع کے صوابدید پر نہ چھوڑا جائے۔ یہ ادارے پہلے ہی سے دوسرے طبقوں کے زیر اثر ہیں اور کاشتکاروں کو ان میں کوئی دخل یا اثر حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ ہر صوبہ واری حکومت اپنی عملداری میں ایک بالکل علیحدہ قانون نافذ کرے جس کے تحت باضابطہ

منڈیوں کا قیام، انتظامی کمیٹیوں کی تشکیل اور ان کے قواعد و ضوابط کا تعین عمل میں آنے۔ تیسرے یہ کہ جب خریدار اور فروشندے کے درمیان کوئی جھگڑا واقع ہو تو اس کے تصفیہ کے لئے پہلے سے باقاعدہ انتظام موجود ہونا چاہیئے۔ ورنہ کاشتکار ہی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ مثلاً روئی کی حد تک اکثر یہ شکایت سننے میں آتی ہے کہ خریدار منڈی میں تو نمونہ دیکھ کر روئی خرید لیتا ہے لیکن ginnery میں پہنچ کر جب گاڑی سے روئی اتار لی جاتی ہے تو اسے خلاف نمونہ قرار دے کر قیمت میں کمی کر دیتا ہے۔ غریب کاشتکار میں کہاں یہ استطاعت کہ پھر گاڑی میں روئی لاد کر اُسے کہیں اور فروخت کرنے کے لئے لیجائے۔ چار و ناچار اسی قیمت پر راضی ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں یہ ضروری ہے کہ انتظامی کمیٹی کی جانب سے کوئی پنچایت یا ثالثی بورڈ مقرر کر دیا جائے جو اس قسم کے تمام جھگڑوں کا مناسب تصفیہ کر سکے۔

باضابطہ منڈیوں کے قیام سے کاشتکاروں کو اور بھی بہت سے فوائد پہنچنے کا قرینہ ہے۔ مثلاً پیداواروں کی طلب اور رسد اور ان کی قیمتوں سے ہمیشہ باخبر رہنا فریقین کاروبار کے لئے خاصکر اس روز افزوں مسابقت کے زمانہ میں بے حد ضروری ہے۔ ذرائع نقل و حمل اور وسائل خبر رسانی کی غیر معمولی ترقی کی بدولت اب اکثر زرعی پیداواروں کے لئے ساری دنیا گویا ایک بازار بن گئی ہے۔ اگر دنیا کے کسی ایک گوشے میں فصل خراب یا معمول سے زیادہ سرسبز ہوتی ہے تو اس کے اثرات صرف اسی خطے تک محدود نہیں رہتے بلکہ ساری دنیا پر پھیل جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی ایک ملک میں کسی پیداوار کی طلب بڑھتی یا گھٹتی ہے تو دوسرے تمام ممالک اس تبدیلی سے کم و بیش متاثر ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ کاشتکار کو اپنی پیداوار کی واجبی قیمت پانے کے لئے بازار کے حالات اور ان کی تبدیلیوں سے بروقت واقفیت حاصل کرنا نہایت ضروری ہے ہندوستانی کاشتکار کی لاعلمی کی یہ کیفیت ہے کہ دوسرے ممالک کے حالات تو ایک طرف، وہ خود اپنے صوبے کی حالت سے بھی بے خبر رہتا ہے اور اسی وجہ سے معاملہ کرنے میں دوسرے فریق سے بہ آسانی دھوکہ کھا جاتا ہے۔ روئی کی حد تک اس قسم کی واقفیت بہم پہنچانے کے

کہیں کہیں انتظامات موجود ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی یہ کہنا بالکل درست ہے کہ سردست ملک میں کاشتکاروں کو بازار کے حالات سے بروقت واقف ہونے کے کوئی ذرائع حاصل نہیں ہیں۔

باضابطہ منڈیوں کے قیام سے یہ کمی بہ آسانی پوری کی جا سکتی ہے اور وہ اس طور پر کہ انتظامی کمیٹی کے فرائض میں یہ بات شامل کر دی جائے کہ وہ اس منڈی میں لین دین کرنے والوں کے فائدے کے لئے بازار کے متعلق خاص خاص معلومات وقتاً فوقتاً مہیا کیا کرے مثلاً یہ کہ پڑوس کی دوسری منڈیوں میں اور ملک کے بڑے بڑے بندرگاہوں میں جہاں سے پیداوار برآمد کی جاتی ہے، کیا قیمتیں رائج ہیں، گرنیوں اور کارخانوں میں سابقہ ذخیرے کن مقداروں میں موجود ہیں، دوسرے ملکوں میں طلب و رسد کے کیا حالات ہیں اور پیداواروں کی قیمتوں پر ان کے کیا اثرات پڑنے کا قرینہ ہے وغیرہ وغیرہ۔

مناسب قیمت حاصل کرنے کے لئے بعض اوقات پیداوار کو کچھ دنوں کے لئے رکھ لینا ضروری ہوتا ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جبکہ پیداوار کو بحفاظت رکھنے کے لئے گودام موجود ہوں اور اس پیداوار کی بنا پر فوری ضروریات کے لئے روپیہ حاصل کرنے کا امکان بھی ہو۔ ہندوستان میں یہ سہولتیں بالکل مفقود ہیں۔ لیکن اگر باضابطہ منڈیاں قائم ہو جائیں تو اس کمی کی تلافی بھی چنداں مشکل کام نہیں ہے۔ ہر انتظامی کمیٹی اپنی مالی حالت کے مطابق تھوڑا بہت روپیہ محفوظ گوداموں کی تعمیر پر صرف کر سکتی ہے۔ اور امداد باہمی کی انجمنوں کے اتحاد عمل سے [illegible] ان کی پیداواروں کی ضمانت پر تھوڑی مدت کے لئے [illegible] ضرورت [illegible] دینے کا انتظام [illegible] جاتا ہے۔ اس قسم کی سہولتوں کا وجود بسا اوقات خریداروں کو کاشتکاروں کی مجبوریوں [illegible] بیجا فائدہ اٹھانے اور ناواجبی طور پر پیداواروں کی قیمتیں گھٹانے سے باز رکھنے کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں اوزان اور پیمانہ جات کی موجودہ حالت بہت ہی ناگفتہ بہ ہے۔ صوبہ بمبئی کے صرف ایک ضلع یعنی مشرقی خاندیش کی سولہ منڈیوں میں کوئی تیرہ مختلف وزن کے جدا جدا من

مروج ہیں پنجاب کے ضلع جہلم میں صرف ساٹھ مربع میل کے رقبے کے اندر اناج کی خرید وفروخت میں چھ مختلف پیمانے استعمال کئے جاتے ہیں۔ کم وبیش یہی حال ہندوستان کے دوسرے حصوں کا بھی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ اشیاء کے لین دین میں بالعموم سخت مزاحمت واقع ہوتی ہے۔ خاصکر کاشتکاروں کو اس سے ہمیشہ نقصان پہنچتا ہے۔ اپنی جہالت اور دوسری مجبوریوں کے باعث پہلے ہی سے ان کا انحصار درمیانی اشخاص کے رحم وکرم پر ہوتا ہے۔ لیکن اوزان اور پیمانوں کا کوئی عام معیار معین نہ ہونے سے ایک اور حربہ ان درمیانی اشخاص کے ہاتھ لگ جاتا ہے جس کی بدولت غریب کاشتکاروں کو دھوکہ دینے اور ان کی مجبوریوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کے مزید امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ حکومت ہند نے اس مسئلے کی تحقیق کے لئے ۱۹۱۳ء میں ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس نے اس بارے میں متعدد سفارشیں پیش کیں۔ ان کے منجملہ ایک بہت اہم سفارش یہ تھی کہ حکومت ۸۲ ½ پونڈ کے مَن کو سارے ملک کے لئے وزن کا معیار قرار دے۔ بدقسمتی سے ان سفارشوں پر اب تک کوئی عمل نہیں کیا گیا اور صورت حال اب بھی وہی ہے جو اس تحقیق سے پہلے موجود تھی۔ لیکن باضابطہ منڈیوں کے قیام سے اس بات کی قوی توقع ہے کہ یہ خرابیاں بھی بڑی حد تک رفع ہو جائیں گی اور اس ضروری اصلاح میں ان کی وجہ سے بہت ناگزیر مدد ملے گی۔

باضابطہ منڈیوں کا ایک اور اہم فائدہ یہ ہے کہ ان کو مظاہروں اور پروپگنڈا کا ایک موثر ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ زرعی ترقی کی مختلف تدبیروں سے کاشتکاروں کو واقف کرانے کے لئے زراعت اور امداد باہمی کے صوبہ واری محکمے بہت کچھ پروپگنڈا کرتے ہیں اس غرض کے لئے ان کے کارکن وقتاً فوقتاً دیہات کا دورہ کرتے اور کاشتکاروں کو مختلف امور سے جو ان کی زندگی پر اثر انداز ہو رہے ہیں، آگاہ کرتے اور ان کے مضر اثرات سے محفوظ رہنے اور ترقی کے راستے پر چلنے کی ہدایت کرتے اور تدبیریں بتاتے ہیں۔ باضابطہ منڈیوں کے قیام سے اس ضروری پروپگنڈا کے لئے ہر جگہ نہایت موزوں مرکز مہیا ہو جائیں گے۔ مزید برآں ہر اہم منڈی کے احاطے میں

انجمن امداد باہمی یا ڈاکخانے کے سیونگ بنک کی ایک شاخ کھول کر کاشتکاروں کو آمادہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ قیمت پیداوار کا کچھ نہ کچھ حصہ اس میں بطور امانت رکھ دیں بلکہ خود مشترک سرمایہ دا. بنکوں کے سامنے بھی ان منڈیوں کے قیام سے کاروبار کا ایک وسیع میدان کھل جائے گا اور عوام میں بنکوں سے لین دین کرنے کی عادت ترقی پائے گی۔ ؋

اسلامی دنیا

حبشہ پر حملہ کرنے کے مسئلہ پر غور کرتے ہوئے مسولینی نے "پلانسو جی" کے کونسل روم میں آمرانہ انداز میں کہا تھا کہ "ہاں تو اب ہم حملہ کریں گے، برطانیہ دخل نہیں دے گا۔ جرمنی کو فوجی تعمیر سے فرصت نہیں ہے، فرانس ہمارا یار ہے رستہ بالکل صاف ہے، ہمارے پاس سونا، آدمی، جنگی مشینیں بہت ہیں ہمیں کوئی نہیں روک سکتا"۔ ایک مغربی مصنف پیٹرک تھامپسن کا خیال ہے کہ مسولینی اس وقت ایک چھوٹی سی چیز بھول گیا جو اس کے یلغار کے لئے سد سکندری بن کر حبشہ میں اس کی مشین گنوں کو ٹھپ کر سکتی تھی، وہ شے تھی کیا؟ تیل۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اٹلی میں[۱] تیل کا خرچ تو کروڑوں ٹن ہے اور ہوتی ایک بوند نہیں۔ نہ اس کے اپنے ملک میں ہوتی ہے اور نہ اس کے زیر اثر علاقوں میں تمام تر تیل اس کو دوسرے ملکوں سے خریدنا پڑتا ہے۔

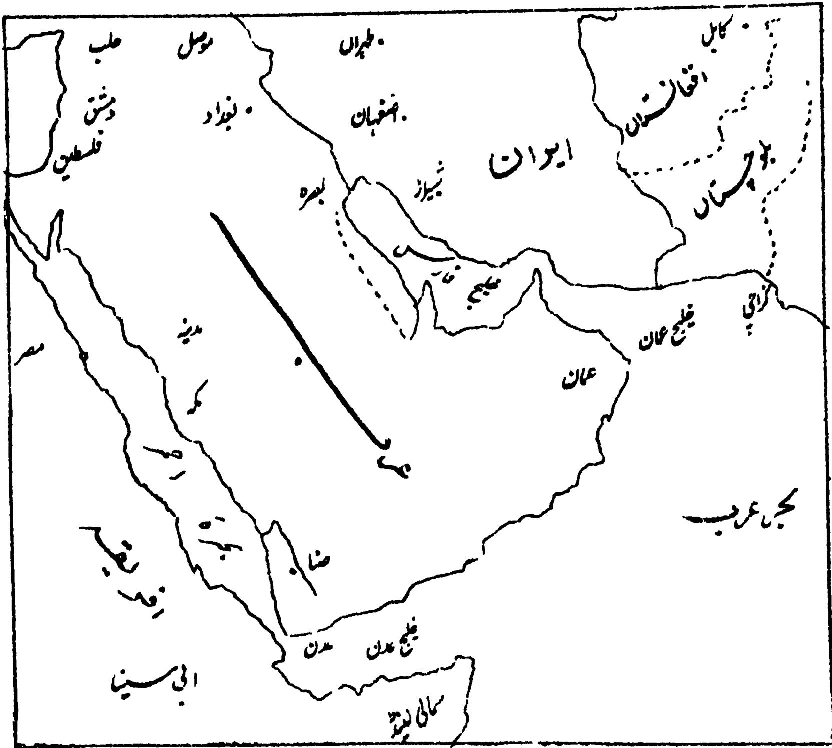
برطانوی کابینہ کے ایک سابق رکن نے جنگ عظیم کے متعلق کہا تھا "اتحادیوں کی فتح کی کشتی تیل کے سمندر کے ذریعے آئی تھی" تو غلط نہیں کہا تھا لیکن تیل صرف جنگ ہی میں صرف نہیں ہوتا۔ اب امن و امان کے زمانے میں اس کی جو مقدار سالانہ خرچ ہو رہی ہے وہ پونے کروڑ ٹن کے قریب ہے پھر کس کی مجال ہے جو تیل کی اہمیت سے انکار کرے۔

اسلامی دنیا اپنے بحری اور ہوائی راستے میں واقع ہونے کی وجہ سے تو سیاسیات عالم میں اہم ہے ہی لیکن پڑول

---

[۱] یوں تو برطانیہ عظمیٰ بھی محتاج محض ہے، لیکن ماتحت علاقوں میں اتنا تیل موجود ہے کہ دوسرے ملکوں کے آگے ہاتھ پھیلانا نہیں پڑتا۔ مگر اٹلی کے کسی ماتحت علاقے میں بھی تیل نہیں ہوتا۔ دنیا کی سات بڑی طاقتوں میں صرف روس اور امریکہ تیل کے معاملے میں بے نیاز ہیں۔ باقی پانچ میں یا تو سرے سے ہوتا ہی نہیں اور اگر ہوتا ہے تو ناقابل ذکر۔ فرانس اپنے کل خرچ میں سے ۲۹/۳۰۔ جرمنی ۹/۱۰ جاپان ۶/۱۰ اور اٹلی سو فی صدی دوسرے ملکوں کے دست نگر ہیں۔

کی مفلسی ، اور چھوٹوں کے ہاں تیل کی فراوانی نے اس کی اہمیت میں اور اضافہ کر دیا ہے ۔ افغانستان سے لے کر مصر و شام تک تمام ملکوں میں تیل کی اچھی مقدار موجود ہے ۔ اسے اتفاق کہئے یا قدرت کی ستم ظریفی کہ تیل بیچنا سب سے پہلے انھوں نے شروع کیا جو فارسی پڑھتے اور نہ صرف پڑھتے بلکہ لکھتے اور بولتے بھی ہیں سیال سونے کی یہ کثرت ان ملکوں کی خوش قسمتی ہے ۔ لیکن جب روشنی طبع پہ حرص و آز کی بلائیں ہجوم کرنے لگیں تو خطرہ بھی بن جاتی ہے ۔



بہر حال یہ قدرت کا ایک عطیہ ہے ۔ جس میں اہلیت نہیں ہے اس کے پاس نہیں رہے گا اور جو صلاحیت رکھتے ہیں ان سے کوئی چھین نہیں سکے گا ۔ عام واقفیت کے لئے ہم ان عصبیات پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں ۔

ایران

تیل کی زیادتی کے لحاظ سے ممالک اسلامیہ میں ایران کا نمبر اول ہے ۔ اینگلو ایرانین کمپنی (اس میں شریک غالب حکومت برطانیہ ہے ، جو گذشتہ سال تک ایرانی تیل کی واحد اجارہ دار تھی ، ایران کی سب سے پہلی کمپنی ہے

یہ کمپنی اصل میں ڈبلیو ۔ کے ۔ ڈی ۔ آرسی کے اس معاہدے کی پیداوار ہے جو سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوا تھا ۔ مسٹر آرسی جو ایک زمانے میں برماشل کمپنی میں بھی رہ چکے تھے ، حکومت (اس زمانے میں مظفر الدین قاچار بادشاہ تھے) نے ۶۰ سال کے لئے معاہدہ کیا تھا اور ایران کے پانچ شمالی ضلعے مستثنیٰ کرکے تمام ملک میں انھیں تحقیق کی اجازت دے دی تھی سنہ ۱۹۰۹ء میں یہ اجارہ اینگلو ایرانین کمپنی نے حاصل کرلیا ۔ مسٹر آرسی نے ۸ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد مسجد سلیمان میں تیل کا پتہ لگایا ۔ کنوئیں کھدوائے گئے ۔ تیل صاف کرنے کے کارخانے قائم ہوئے اور ۲۰ سال بعد سنہ ۱۹۲۲ء سے تیل کی باقاعدہ تجارت ہونے لگی ۔ سنہ ۱۹۱۹ء تک اس کے تیل کی مقدار ۱۰ لاکھ ٹن تک تھی اور سنہ ۱۹۳۱ء میں ۶۰ لاکھ ٹن ہوئی ۔ گذشتہ سال ۹۰ لاکھ تک پہنچ گئی ابھی اس میں ترقی کی بہت گنجائش ہے ۔

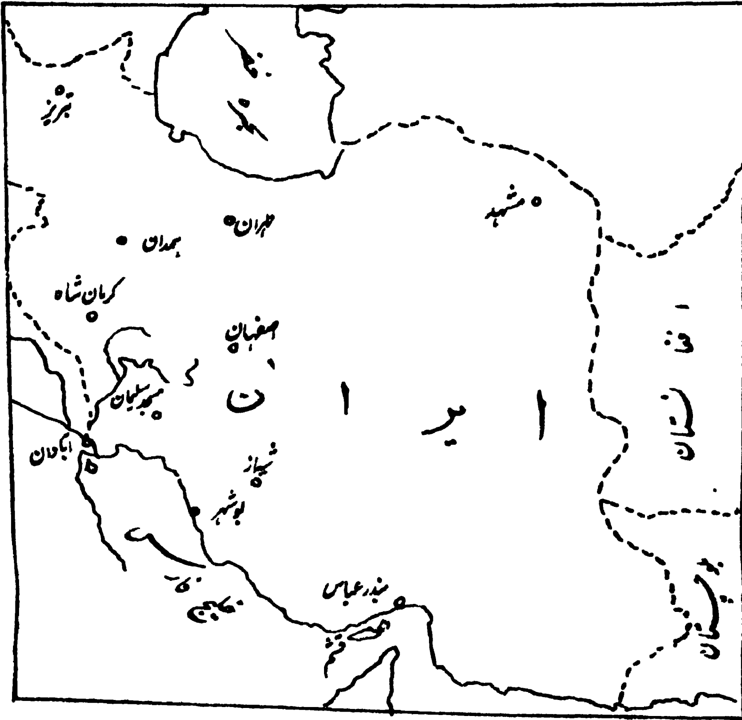
تیل کی صفائی آبادان میں ہوتی ہے اور یہیں سے اس کی برآمد ہوتی ہے ۔ مسجد سلیمان اور آبادان کا فاصلہ کوئی ۲۰۰ میل کے قریب ہے ۔ آبادان ایک چھوٹی سی بستی ہے جس کو سمندر سے نکالی ہوئی نہر نے دو حصوں میں تقسیم کردیا ہے ۔ ایک طرف ایرانی آبادی ہیں دوسری طرف کمپنی کے انگریز افسر اور ملازمین کی کوٹھیاں ہیں ۔ یہ نہر کمپنی نے اپنی سہولت کے لئے بنائی ہے لیکن اس میں شک نہیں اس نے شہر میں خاص رونق پیدا کردی ہے ۔

تیل نکالنے کا مرکز صرف مسجد سلیمان ہی نہیں ہے ۔ ہفت کل کے علاقے میں اگرچہ بعد میں تیل دریافت ہوا ہے ۔ لیکن اس کی پیداوار بڑھ رہی ہے اور اب مسجد سلیمان سے زاید ہوگئی ہے ۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں ہفت کل کے تیل کی مقدار چوالیس لاکھ چوہتر ہزار ٹن تھی اور مسجد سلیمان کی چھتیس لاکھ اکتالیس ہزار ٹن ۔ نئی تحقیقات برابر جاری ہیں ۔ ہفت کل سے ۱۲۵ میل جنوب مشرق میں اور آبادان کے مشرق میں ۱۵۵ میل پر ایک مقام ہے گچ قزل علی وہاں بھی تیل کے آثار ہیں ، اس کے قریب ہی اسمری میں ایک کنواں گذشتہ سال کھودا گیا تھا ۔ اس سے تو ۲۰۰ ٹن یومیہ تیل نکلا ، لیکن دوسرے سے چار ہزار ٹن یومیہ کا اوسط رہا ۔ خیال یہ ہے کہ یہ میدان مسجد سلیمان کے میدان سے بازی لے جائے گا ۔

مسجد سلیمان کے شمال مغرب میں زلکو کے مقام پر تیل کا یقین تھا ۔ کھدائی شروع ہوئی اور جب عام گہرائی پر تیل نہیں نکلا تو اور زیادہ کھودا گیا حتیٰ کہ وہ گیارہ ہزار فٹ یعنی ۲ میل سے زیادہ گہرا ہوگیا ۔ یہ دنیا کا عمیق ترین کنواں ہے ۔ لیکن تیل کی مقدار کھودا پہاڑ نکلا چوہا کی مصداق رہی ۔

۱۹۲۳ء سے اب تک یعنی ۱۰ سال میں ایران کے ان میدانوں سے نو کروڑ ٹن سے زیادہ تیل حاصل کیا جاچکا ہے۔

۱۹۲۶ء میں ایران میں انقلاب ہوا۔ شاہانِ قاچار کے آخری بادشاہ سلطان احمد کو تخت سے اتار دیا گیا اور رضا شاہ پہلوی کی تاج پوشی ہوئی، ایرانیوں میں نئی زندگی پیدا ہوئی۔ ملک میں دورِ جدید کا آغاز ہوا۔ ہر ہر شعبے کو غور کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا تو بعض شکایات کی بنا پر نومبر ۱۹۳۲ء میں کمپنی کے معاہدے کو بھی فسخ کر دیا گیا۔ لیکن پھر کمپنی سے نئی شرائط کے ساتھ مصالحت ہوگئی۔ اجارہ کی مدت ۶۰ سال ہوگئی، اور یہ طے پایا کہ کمپنی کم از کم ساڑھے سات لاکھ پونڈ سالانہ حکومت کو ضرور دے گی (چار شلنگ فی ٹن کے حساب سے تیل خواہ ایران کے اندر فروخت کیا جائے یا باہر، دونوں صورتوں میں)



۱۹۳۵ء میں حکومت ایران سے دو کمپنیوں نے اور معاہدہ کیا ہے۔ ان میں ایک ایرانین تیل کمپنی (سی بورڈ) ہے اور دوسری ایران پائپ لائن کمپنی (سی بورڈ) ہے۔ پہلی سے یہ معاہدہ ہے کہ وہ مشرقی اور شمال مشرقی ایران

کے پانچ لاکھ مربع میل علاقے میں تحقیق و تلاش کا کام شروع کر سکتی ہے۔ لیکن کھدائی کے لئے صرف ایک لاکھ مربع میل کا علاقہ دیا جائے گا۔ کمپنی تین سال کی مدت میں دو ایسے علاقوں کا انتخاب کرے گی جو رقبۂ مجازہ سے زائد نہ ہوں یہ علاقہ یقین ؟ بندر شاہ سے سرحد بلوچستان تک ہے۔ ضلع سیمنان (طہران کے مشرق میں) تو تیل کا پہلے سے یقین ہے۔

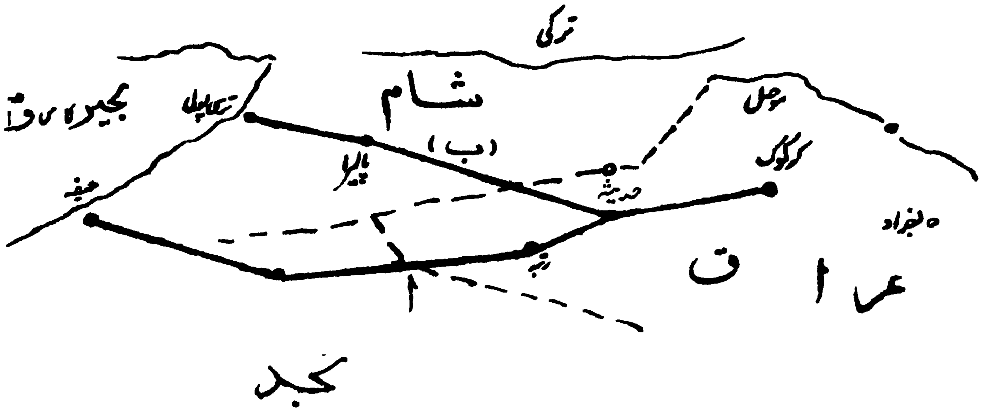
اگر ان میدانوں میں اچھے کنوئیں نکلے تو کمپنی کام جاری سکے گی۔ حتیٰ کہ ۶۰ لاکھ ٹن تیل سالانہ ہو جائے یہ کمپنی بھی انگریز ایرانی کمپنی کی طرح چار شلنگ فی ٹن حکومت کو دے گی اور عام شریکوں کے حصے میں سے۔ ۵۰ فیصدی ادا کرے گی (انگریز ایرانی کمپنی ۲۰ فی صدی دیتی ہے) ان دونوں رقموں کی تعداد پہلے تین سال میں تین تین لاکھ، دوسرے پانچ سال میں پانچ پانچ لاکھ اور اس کے بعد (ختم معاہدہ تک) چھ چھ لاکھ پونڈ سے کم نہ ہونی چاہیئے۔ (انگریز ایرانی کمپنی کم از کم ۷۵ لاکھ پونڈ ادا کرتی ہے) کمپنی سے یہ بھی طے ہوا ہے کہ وہ ایرانی طلباء کو امریکہ میں تعلیم دلانے کے لئے (جب تیل تجارتی مقدار میں نکلنا شروع ہو جائے گا) دس ہزار پونڈ سالانہ کی امداد دے گی۔

دوسری کمپنی نے پائپ لائن تعمیر کرنے کا معاہدہ ہوا ہے، یہ دونوں معاہدے ساٹھ سال کے لئے ہیں۔ پائپ کمپنی افغانستان کا تیل ایرانی نلوں سے بھیجنے کی مجاز ہوگی۔ ایران کی ایک تازہ اطلاع (تصدیق طلب) ہے کہ جنوبی ایران میں اجارہ کے متعلق بعض کمپنیوں سے گفت و شنید ہو رہی ہے۔ جزیرۂ قشم میں تیل کے یقینی آثار ہیں۔

عراق

عراق کی تاریخی سرزمیں جو تہذیب کے قدیم ترین مرکز بابل و نینوای کو اپنے دامن میں نہیں چھپائے ہو بلکہ مسلمانوں کے تمدن کا گہوارہ بھی رہ چکی ہے، آج تیل کی طویل ترین لائن کا منبع ہونے کی حیثیت سے مشرق و مغرب کی سیاست کا شریک بنی ہوئی ہے۔ یہاں ایک اجارہ دار، عراق پٹرولیم کمپنی ہے جس کے ساڑھے تئیس فی صدی حصے انگریز ایرانی (برطانوی حکومت) شاہی ڈچ، شل، فرانس دی پٹرول (بہ شرکت حکومت فرانس) اور امریکن کمپنیوں (اسٹینڈرڈ آئل آف نیو جرسی اور ساکونی ویکیم) کے پاس ہیں۔ دوسری کمپنی

بی، او، ڈی' ہے جو موصل آئل فیلڈ کمپنی کے ماتحت ہے۔ عراق کے تیل کے میدانوں کا رقبہ کوئی ۶۰ مربع میل ہے، بالکل بیابان، تیل اور پانی کے نلوں کے انچارج افسروں اور ملازموں کے سوا یہاں نہ



نہ کوئی رہتا ہے نہ بستا ہے۔ لیکن یہ میدان جو بقول لارڈ کمیڈمین" سوڈے کی بوتل کی مانند تیل سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان کی زمین کے نیچے بڑی بڑی قوتیں پوشیدہ ہیں اور باہر آنے کے لئے بیتاب ہیں" ۱۔ تیل کا نل کا کرکوک سے بحر روم تک مسلسل چلا گیا ہے۔ درمیان میں شام، شرق اردن اور فلسطین کے ملکوں سے گذرتا ہے اس نل کی دو لائنیں ہیں ایک شام سے گذرتی ہوئی ٹری پولی چلی جاتی ہے یہ فرانس کی لائن ہے۔ دوسری شرق اردن اور فلسطین ہوتی ہوئی حیفہ بندرگاہ تک آتی ہے۔ یہ برطانیہ کا نل ہے۔ کرکوک سے دونوں نل ساتھ چلتے ہیں حدیثہ (اس کو تیل کی دنیا میں ذک ۔۳۔ (K-3 کہتے ہیں۔) پہنچ کر فرانس کا نل پالمیرا کا رخ کرتا ہے۔ اور برطانوی نل ٹربتہ کی راہ لیتا ہے۔ اس لائن پر ۱۲ پمپنگ اسٹیشن ہیں۔ تین آباد اور ترقی یافتہ بستیوں کے گذرے ہیں اور نو بے آباد مقام ہیں۔ دنیا کی یہ عجیب و غریب لائن جو بقول لانگ ہیل اہرام مصر سے کم تعجب خیز نہیں ہے۔ ۶۰۰ میل تک ریگستان میں چلتی ہے۔ کل لمبائی گیارہ سو پچاس میل ہے۔ لائن کا نشیب فراز بھی خوب ہے۔ ایک جگہ بلند ہوتے ہوتے آٹھ سو فٹ بلند ہو گئی ہے اور دوسری جگہ پست ہونی شروع ہوئی تو سطح سمندر سے نو سو فٹ نیچے پہنچ گئی ہے جہاں پہاڑ راستے میں آگئے ہیں پوری پوری چٹانیں کاٹ ڈالی ہیں

بظاہر یہ کام انسانوں کا نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن فرہادِ عشق کی تیشہ زنی پتھر کو پانی کر دیتی ہے

عراق میں تیل کا دوسرا میدان نفت خانہ ہے۔ یہ ایران اور عراق دونوں کو تیل دیتا ہے۔ نفت خانہ سے درۂ پائتاک ہو کر لائن کرمان شاہ جاتی ہے۔ کرمان شاہ میں تیل صاف کرنے کا کارخانہ ہے جس کارخانہ میں دس ہزار ٹن تیل روزانہ وصول ہوتا ہے۔ سالانہ پیداوار پچاس لاکھ ٹن سے زیادہ ہے۔

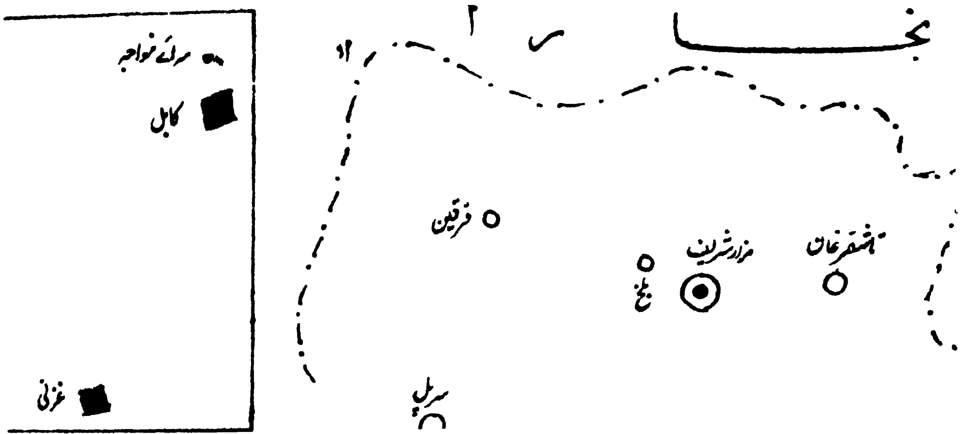
٭٭٭

افغانستان میں بھی لوگوں کو تیل کا یقین ہو چلا ہے۔ اس سلسلے میں جن مقامات کا نام لیا جاتا ہے ان میں ایک تیرپل ہے جو ہرات کے مغرب میں ٹھیک ایران کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں کچھ چشمے دریافت ہوئے ہیں اُن کے تیل کا نمونہ وزارت تجارت افغانستان کے عجائب خانہ میں بھی موجود ہے مقر (غزنی کے جنوب میں) اور سمت جنوبی میں (جس کی سرحد ہندوستان سے ملتی ہے) میں بھی زمین کا پتہ دیتی ہے۔ علاوہ ازیں مزار شریف کے جنوب مغرب میں سرپل، تاشقرغان (مزار شریف کے بالکل قریب) قطغن اور سرائے خواجہ (نزد کابل)



میں بھی زمین کی حالت بہت امید افزا ہے۔ ان حالات میں باقاعدہ تحقیق و تلاش ضروری تھی ہی، حال میں حکومت نے ایک امریکن کمپنی سے معاہدہ کر لیا ہے۔ اس کی شرائط بھی بالکل اسی قسم کی ہیں جیسی ایران اور آرمینین کمپنی کے درمیان طے ہوئی ہیں۔ کمپنی کا نام ان لینڈ ایکسپلوریشن کمپنی ہے۔ مدت معاہدہ پچہتر سال ہے۔ کمپنی کا دعوہ ہے کہ جلد سے جلد تیل کی مقدار کو بیس لاکھ ٹن تک پہنچا دے گی، حکومت کو فی ٹن چار شلنگ اور منافع کا

۲۰ فی صدی حصہ پیش کرے گی۔ یہ واجب الادا رقم ساڑھے چار لاکھ پونڈ سے کسی طرح کم نہ ہوگی حتی الوسع افغانستان کے باشندوں کو ملازم رکھے گی۔ کمپنی کو اجازت ہے کہ وہ فنی اشخاص کو بقدر ضرورت افغانستان لائے۔ لیکن امریکہ کے علاوہ اور کہیں سے نہیں رکھ سکتی کمپنی تیل کی برآمد شروع ہوتے ہی افغانستان کے طلباء کی تعلیم (امریکہ میں) کے لئے ۵۰ ہزار ڈالر مخصوص کردے گی وغیرہ وغیرہ

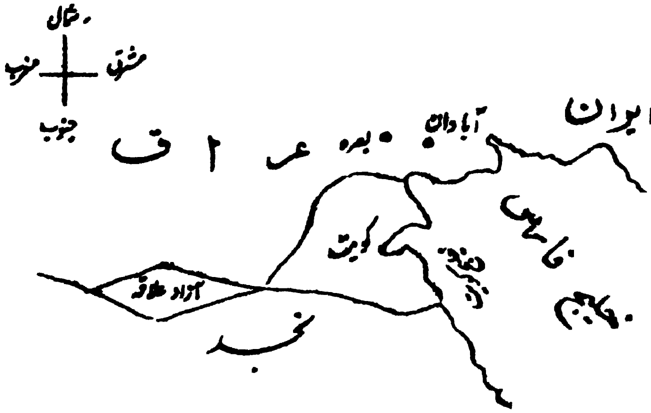


کمپنی نے عہد کیا تھا کہ وہ آٹھ مہینے کے اندر اندر افغانستان کے ہمسایہ ممالک میں سے کسی ایک سے معاہدہ کرکے سمندر تک تیل کے جانے کے حقوق حاصل کرلے گی۔ سواب ایران سے معاملہ کرلیا ہے۔ یوں کمپنی کی تجویز یہ ہے کہ افغانی تیل کے میدانوں سے بحرۂ عرب تک ایک پائپ لائن تعمیر کرلی جائے۔

کویت

کویت خلیج فارس کے شمالی سرے پر آبادان سے کوئی سو میل جنوب میں واقع ہے یہ ڈیڑھ لاکھ آبادی کی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ لیکن عرب اور مشرق وسطیٰ کی سیاست میں اسے بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا، یہ عراق اور سعودی عرب کی سرحد پر واقع ہے۔ اس تمام ریگستان میں جو عراق کو عرب سے الگ کرتا ہے کویت ہی ایسا مقام ہے جہاں پانی کے اچھے کنوئیں موجود ہیں اسی لئے عراق اور عرب کی شاہراہ کویت سے ہوکر گذرتی ہے۔ ایک ربع صدی پہلے تمام جزیرۃ العرب کی طرح یہ امارت بھی حکومت عثمانیہ میں شامل تھی

لیکن ایک خانہ جنگی نے ۱۸۹۹ء میں اس کو انگریزوں کا غلام بنا دیا۔ موجودہ امیر شیخ احمد الجابر ہیں۔ کویت



برطانوی ہوائی جہازوں کا مستقر ہے۔ جب سے برطانوی ہوائی جہاز خلیج فارس سے جانا شروع ہوئے ہیں خلیج فارس کی اہمیت بڑھ گئی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کویت کی۔ برطانیہ اس کے اپنے معاملات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں سمجھتی اس لئے یہ امارت اندرونی طور پر آزاد کہلاتی ہے۔ اگرچہ ایک مستقل برطانوی افسر وہاں مقیم ضرور رہتا ہے۔ پہلے کویت موتیوں کی تجارت کے لئے مشہور تھا مگر جب سے مصنوعی موتیوں کا بازار گرم ہوا ہے کویت کے بازار کی آب و تاب جاتی رہی۔ "گلف آئل کارپوریشن" جس کے ساتھ "انگلو ایرانین کمپنی" نے آدھا ساجھا کر لیا ہے، یہاں تیل کی تحقیق و تلاش کا کام کر رہی ہے، کوششیں نتیجہ خیز ثابت ہو رہی ہیں۔ خلیج کویت کے شمال میں ایک کنواں کھودا جا رہا تھا، اس کی گہرائی آٹھ ہزار فٹ تک پہنچی۔ تیل تو اس میں نکلا مگر تجارتی طور پر کچھ زیادہ مفید نہیں سمجھا گیا۔ اس لئے اسے بند کر دیا۔ کویت کی جغرافیائی تحقیقات ابھی ابھی مکمل ہوئی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ خلیج کویت کے جنوب میں حالات بہت امید افزا ہیں۔

بحرین

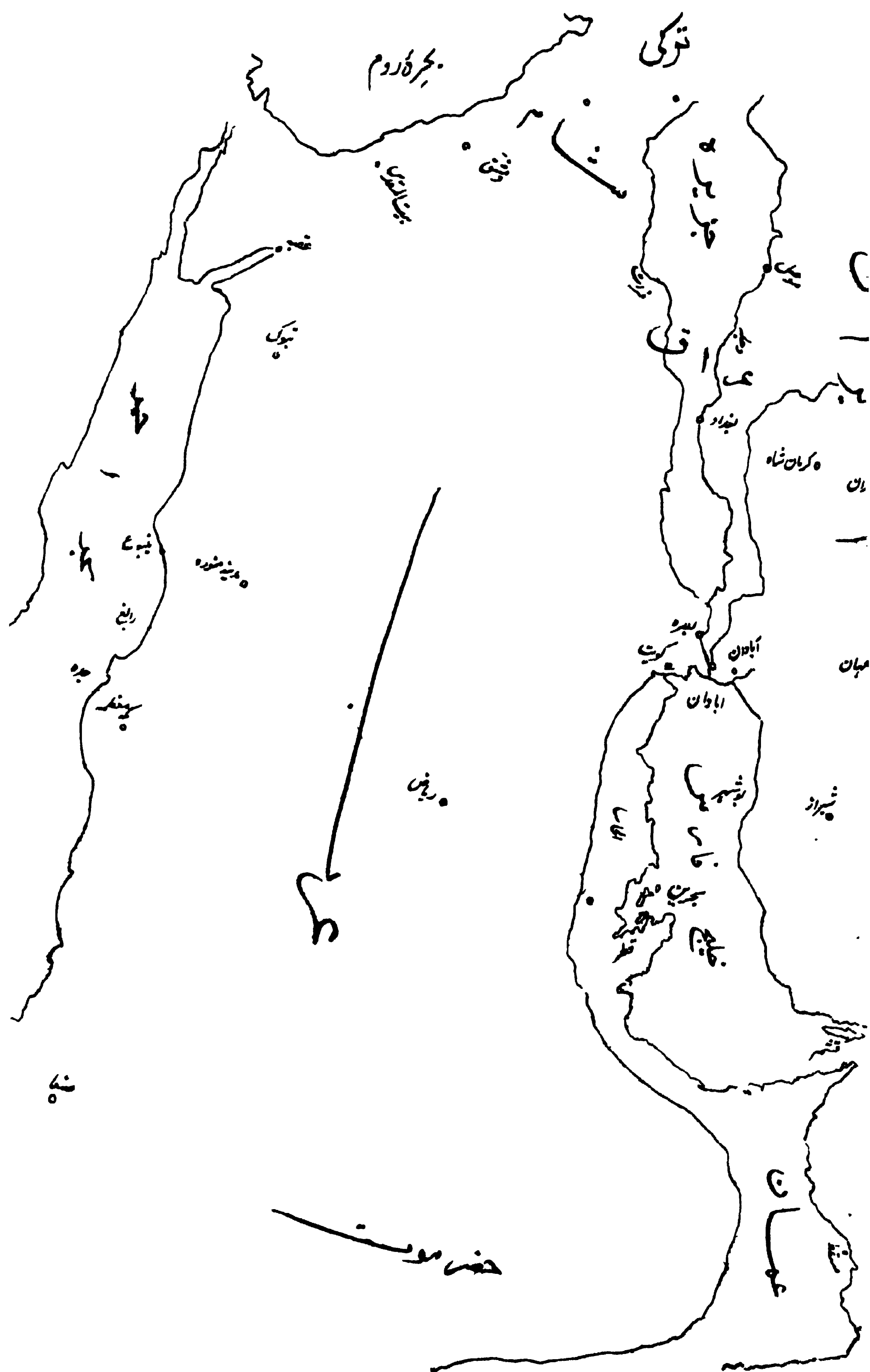
بحرین جو اپنے موتیوں کے لئے عہد وسطیٰ میں کافی شہرت حاصل کر چکا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جزائر کا ایک مجموعہ ہے۔ کہ معظمہ سے مشرق کی طرف اگر ایک خط مستقیم کھینچا جائے تو وہ تقریباً سات سو میل کا فاصلہ طے کرتا ہوا بحرین سے مل جائے گا۔ آٹھ سو تراسی مربع میل اس کا رقبہ ہے اور کوئی دو لاکھ آبادی

موتیوں کی برآمد اب بھی اچھی خاصی ہوتی ہے۔ صدر مقام جزیرہ محرق ہے۔ خلیج فارس کی دوسری اسلامی حکومتوں کی طرح یہ بھی برطانیہ کے زیر اقتدار ہے۔ موجودہ امیر شیخ محمد بن عیسیٰ الخلیفہ ہے۔ امریکہ کی دو بہت بڑی کمپنیاں اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کیلیفورنیا اور ٹیکسس کارپوریشن یہاں تیل کا کام کر رہی ہیں۔ یہاں کے تیل کی کانیں سونے کی کانیں ہیں۔ تیل نکالنے میں تقریباً کچھ خرچ نہیں ہوتا اور تیل بافراط۔ تیل کو سیال سونا کہنا سب سے زیادہ بحرین ہی میں صحیح ہے۔ بحرین کے میدانوں سے تین ہزار ٹن سے زیادہ تیل روزانہ نکل رہا ہے۔ بقول شخصے جہاں قدرت آدمی کو کچھ نہیں دیتی۔ وہاں تیل چھپا ہوتا ہے جو لوگ اللہ کی صفت رحیمی پر ایمان رکھتے ہیں انہیں تو ہر حال میں رحمت کا یقین ہے خواہ وہ بظاہر زمین سے برآمد یا آسمان سے نازل نہ بھی ہو مگر محقق کی تسکین کچھ نظر آنے ہی پر ہوتی ہے۔ بحرین کے کنوؤں پر صدہا امریکن، یورپی، ہندوستانی اور عرب کام میں لگے ہوئے ہیں۔ میدان سے ساحل سمندر تک پائپ کی لائن دوڑتی چلی گئی ہے۔ بحرین دنیا کے گرم ترین علاقوں میں ہے اس کا درجہ حرارت ۱۲۰ فا تک پہنچ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بڑھتی ہوئی آبادی، تالاب، میدان اور بستیاں سب کچھ موجود۔ اندازہ ہے کہ اس سال اس کے تیل کی مقدار ایک لاکھ ٹن تک پہنچ جائے گی تیل کے میدانوں میں ترقی تعداد کا نمبر بارھواں ہے۔ خیال ہے کہ بحرین اس کی جگہ لے لے گا۔

عرب

سعودی عرب کی وادی غیر ذی زرع میں بھی تیل کے بہت آثار پائے گئے ہیں، عراق پٹرولیم کمپنی نے مغربی عرب میں سلطان ابن سعود سے مراعات حاصل کی ہے اور حال میں اس میں یہ مزید اضافہ ہوا ہے کہ یہ کمپنی حجازی ساحل کے شمالی علاقے میں ۶۰ میل کی چوڑائی تک اپنی تحقیقی کوششیں شروع کر سکتی ہے (مقامات مقدسہ اور ان کے ملحقات کا تحقیق سے کوئی تعلق نہیں)، اجازت ملنے کی دیر تھی۔ کمپنی نے کام شروع کر دیا ہے۔ مشرقی عرب میں کیلیفورنیا اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کو اجازت ملی ہے۔ عمان میں (جو بحرین کے ایک جزیرہ "الاسی" کے مقابل تقریباً ۲۰ میل شمال کی طرف واقع ہے) خوب کام ہو رہا ہے۔

ایک نجی کمپنی نے ایک لاکھ پونڈ کے سرمایہ سے قطر کے علاقے میں کام شروع کیا ہے۔ یہ کمپنی عراق پٹرولیم کمپنی کے ماتحت ہے۔ قطر کا علاقہ جزائر بحرین کے جنوب مشرق میں ایک جزیرہ نما کی شکل میں ہے۔ اور خلیج فارس


ترکی
بحیرۂ روم
عقبہ
تبوک
ینبوع
مدینہ منورہ
رابغ
جدہ
مکہ معظمہ
ریاض
صنعا
حضرموت
بغداد
کرمان شاہ
بصرہ
کویت
آبادان
ابادان
بوشہر
شیراز
بحرین
قطر
قشم

میں شاید یہی ایک علاقہ ہے جو برطانیہ کے پاس نہیں ہے

صوبہ الحاسا (عرب کا شمال مشرقی علاقہ) میں بھی تیل کی امید ہے۔ یہاں بھی کام ہو رہا ہے۔ یہ علاقہ کافی وسیع ہے۔ خلیج فارس کے ساحل پر ہے۔ یقین ہے کہ یہاں بھی تیل کا بڑا خزانہ ہوگا۔

عرب کے جنوب مغرب میں دو، لاکھ پچیس ہزار مربع میل کی ایک ریاست ہے، مسقط، اس کے ساحل کی لمبائی چار سو کیلو میٹر ہے، آبادی بھی دوسری ریاستوں سے کہیں زیادہ یعنی ۱۵ لاکھ ہے۔ ایک خاص قسم کی کھجور یہاں پیدا ہوتی ہے اور امریکہ کو جاتی ہے۔ صور، شنیاس، وغیرہ مشہور شہر ہیں سعد ابن تیمور حاکم ہیں۔ حضرت عمرو بن عاص اس علاقے کے اولین گورنر تھے۔ اب سلاطین کی کم زوری کی وجہ سے سوا سو سال سے انگریزوں کی نگرانی میں ہے۔

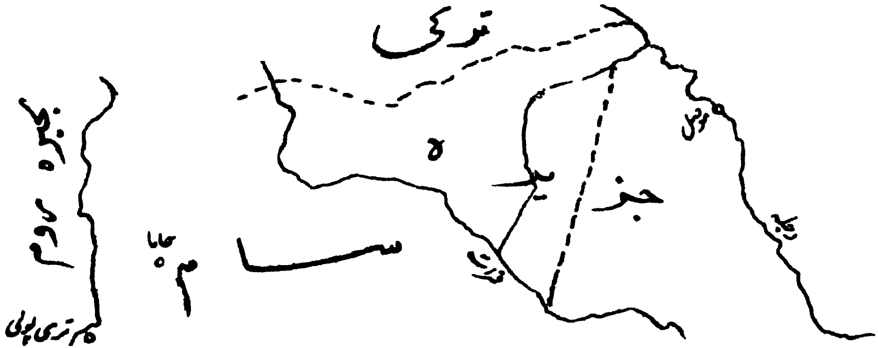
تیل کے خزانے یہاں بھی موجود ہیں۔ لیکن ابھی کوئی کمپنی میدانوں میں نہیں پہنچی ہے۔

شام

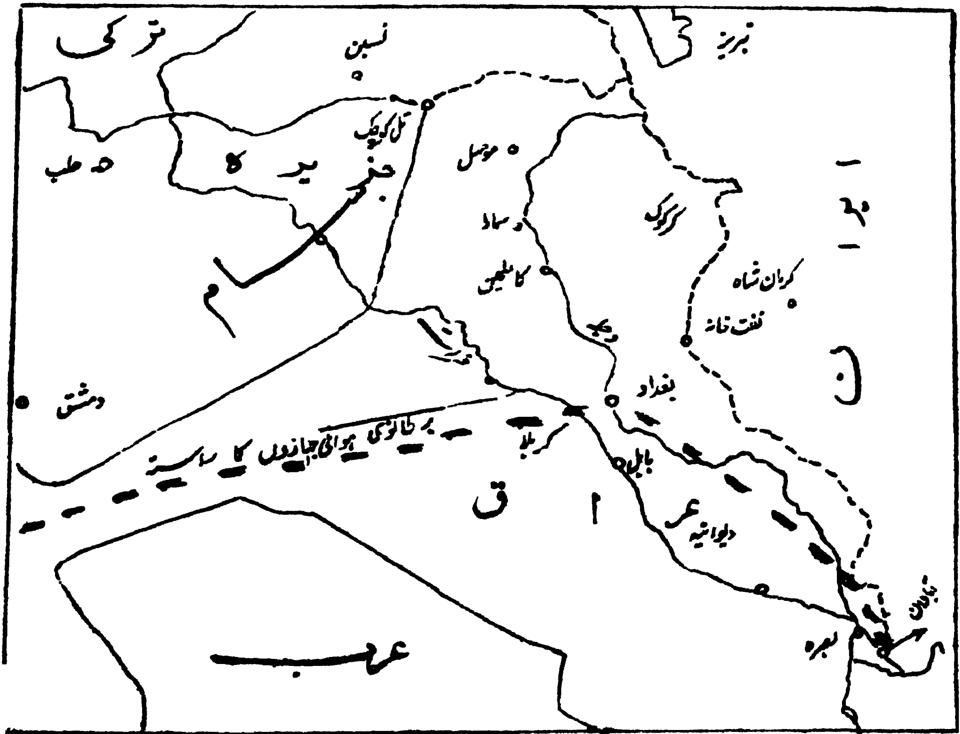
عرب کے گنگا جمنا، دجلہ و فرات مشہور دریاؤں کے درمیان شمال میں جو علاقہ ہے وہ جزیرہ کہلاتا ہے۔ اس کے کچھ مشرقی حصے کے علاوہ تمام علاقہ حدود شام میں شمار ہوتا ہے، ماہرین فن کے اس فیصلہ نے کہ جزیرہ ان چشموں کا منبع ہے جو عراق میں پائے گئے ہیں، فرانس کے سیاسی اور معاشی سمندر میں ایک تلاطم پیدا کر دیا ہے فرانس حال ہی میں شام کو انتداب کی قید و بند سے بہت کچھ آزاد کر چکا تھا اب بہت سٹ پٹا رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ہاتھ سے نکلی ہوئی چڑیا کو کسی طرح پھر پکڑلے۔ حال ہی میں یہ تجویز سننے میں آئی کہ حکومت فرانس جزیرہ کو شام سے الگ ایک علیحدہ نظام کے ماتحت رکھنا چاہتی ہے۔ اس نظام کی اسپرٹ سمجھنا مشکل نہیں ہے۔

شام اپنی وسعت میں انگلستان کے لگ بھگ ہے، ۱۵ لاکھ انسانوں کا مسکن ہے، جنگ عظیم کے نتائج اور شریف حسین مہنری میکموہن کے "معاہدہ" کے مطابق" فرانس کے حصے میں آیا تھا۔ یہ ذلت شامیوں پر بہت شاق تھی۔ ہزارہا مجاہدین آزادی فرانس کے ظلم و جور کا شکار ہو کر ملک پر قربان ہو گئے۔ لیکن غلامی کا بندھن کچھ مضبوط ہی ہوتا گیا۔ ۱۹۳۶ء میں صیاد آپ ہی آپ مہربان ہوا اور چند شرائط کے ساتھ آزادی بخش دی۔ دنیا کی چال ڈھال سمجھنے والوں کا خیال ہے کہ عراق اور مصر میں برطانوی پالیسی کا عمل اور

بحرۂ روم کی خطرناک صورت حال کو دیکھتے ہوئے فرانس کے لئے ایسا کرنا ناگزیر تھا.



قومی حکومت تیل کے خزانوں کو امدادِ غیبی سمجھ رہی ہے ۔ اور اپنی مشکلات کے حل کرنے میں اس نے ان چشموں سے بہت امیدیں وابستہ کرلی ہیں۔ اور اس کا ارادہ تھا کہ ان چشموں سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایک ملکی کمپنی قائم کی جائے لیکن ابھی معلوم ہوا ملک کی مالی دشواریاں اس کی اجازت نہیں دیتیں۔ اور اب مجبوراً کسی غیر ملکی کمپنی کو ٹھیکہ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔



مصر

مصر میں تیل کافی ہوتا ہے۔ تقریباً ۴۰ سال سے ایک انگریزی کمپنی یہاں کام کر رہی ہے۔ پچھلے سال حاصل شدہ تیل کی مقدار ایک لاکھ چوہتر ہزار ٹن رہی۔ یہ تیل پیوستہ سال کی نسبت ایک ہزار ٹن زیادہ ہے

مصر میں ابھی تحقیقات کا کام جاری ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ حکومت نے نئی کمپنیوں کو مزید علاقوں میں تیل کا اجارہ دینے والی ہے۔ اس سال اس کمپنی نے پانچ جدید کنوئیں مکمل کر لیے ہیں ان میں سے ایک کنوئیں سے صرف دو مہینے میں ۲۰ ہزار ٹن تیل حاصل ہوا۔



غزل

از جلیل صاحب قدوائی ۔ ایم ۔ اے

جو وہ بر سرِ مہربانی نہیں ہے ۔ تو کچھ لذتِ زندگانی نہیں ہے

نگاہیں تو ملتی ہیں اب بھی مگر اب ۔ نگاہوں میں وہ مہربانی نہیں ہے

نہیں یاد آئیں گی میری وفائیں ۔ انھوں نے مری قدر جانی نہیں ہے

نہیں حسن میں کوئی ان کا مقابل ۔ تو الفت میں میرا بھی ثانی نہیں ہے

نگاہیں جو کہدیں تو کہدیں وگرنہ ۔ مجھے حالتِ دل سنانی نہیں ہے

بجز داغِ حسرت کے اب اور کوئی ۔ مرے پاس دل کی نشانی نہیں ہے

ترے حسنِ دلکش کا ہے اک ترانہ ۔ مرے دردِ دل کی کہانی نہیں ہے

حقیقت ہی ہر لفظ میں اس کے پنہاں ۔ جو تم سُن رہے ہو کہانی نہیں ہے

وہ اک کھیل لفظوں کا ہے جذبِ دل کی ۔ اگر شعر میں ترجمانی نہیں ہے

کوئی اُن سے جا کر یہ کہہ دے جلیل اب

مری حالتِ دل بیانی نہیں ہے

روس میں اندرونی کشمکش

کسی ملک میں "انقلاب" ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہاں جو کچھ بھی ہو جائے تعجب نہیں۔ ہر انقلاب بے شک خاص حالات کے اثر اور خاص لوگوں کی جدوجہد کا نتیجہ ہوتا ہے، لیکن زندگی جب ایک مرتبہ اپنی پرانی روش چھوڑ دے تو وہ پھر کسی ڈھرے پر لگتے لگتے بہت پلٹے اور اکثر پٹخنے کھاتی ہے، اور انقلاب چاہے جتنا "کامیاب" ہو، یعنی کسی ایک عقیدے کے لوگ ملک کی زندگی پر کتنے ہی حاوی کیوں نہ ہو جائیں، اس کا آخری نتیجہ دراصل ایک قسم کا سمجھوتا ہوتا ہے۔ وہ ایک فیصلہ ہے جس میں عدالت کے حکم میں اس کا ردعمل، یعنی سزایافتہ مجرم کی خواہشیں، اغراض اور حوصلے بھی شامل ہو جاتے ہیں، جیسے بھنور میں پانی چکر کھا کر پلٹتا بھی ہے اور دھارا آگے بھی بہتا چلا جاتا ہے۔

روسی انقلاب کی ابتدا سوشل ڈیموکریٹک (جمہوری) پارٹی نے کی، پھر اس پر لینن اور بولشوک پارٹی کا قبضہ ہو گیا۔ بولشوک پارٹی کارل مارکس کی صحیح تقلید کا دعویٰ کرتی تھی، لیکن اسے ماحول، مصلحت اور موقع کا بہت کچھ لحاظ کرنا پڑا۔ اب بولشوک حکومت کی باگ ڈور ستالن کے ہاتھ میں ہے، اور وہ کارل مارکس اور لینن کی تعلیم پر موقع اور مصلحت کا لحاظ رکھتے ہوئے عمل کر رہا ہے۔

۱۹۳۶ء کے شروع میں وہ لوگ جو روس کی حالت سے بخوبی واقف تھے سب یہ کہہ رہے تھے کہ روسی زندگی انقلاب کی طوفانی منزلوں سے گزر چکی ہے، اب وہ ایک خاص ڈھرے پر لگ گئی ہے اور ایسی رکاوٹوں اور دشواریوں کا اندیشہ نہیں ہے جو اسے اپنا رخ بدلنے یا زور دکھانے پر مجبور کریں۔ پھر اچانک جولائی میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ زینووی یف، کامینف اور چودہ اور آدمی جو سب کم و بیش ممتاز تھے گرفتار کر لئے گئے ہیں، اور ان پر غیر ملکوں سے تعلقات رکھنے، انھیں روسی فوج اور سامان جنگ کے بارے میں اطلاعات پہنچانے، روسی حکومت اور صنعت کا نظام بگاڑنے اور مختلف عہدہ داروں کے قتل کی

سازشیں کرنے کا الزام لگایا گیا ہے۔ جنوری ۱۹۳۷ء میں ۱۷ اور آدمی اسی طرح پکڑے گئے، جن میں سے تیرہ کو موت اور چار کو لمبی قید کی سزا دی گئی۔ جون ۱۹۳۷ء میں مارشل توخا چیفسکی، انقلابی فوج کے سپہ سالار اور اس کے ساتھ فوج کے سات اور بڑے عہدہ داروں کو موت کی سزا ملی۔ حال ہی میں یہ خبر آئی ہے کہ لتوی نوف، جو یورپی ملکوں میں روس کا سب سے ممتاز نمائندہ رہا ہے اور جو خارجی پالیسی میں ستالن کا دست راست کہا جا سکتا ہے گرفتار ہوا ہے، اور غالباً وہ بھی چند روز کے اندر موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ یہ تمام ملزم نوا لیسے، ہیں جن کے نام روس کے باہر کے لوگ بھی جانتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے لوگوں نے سزائیں پائی ہیں جن کی صرف تعداد بتائی جاتی ہے۔

ان کارروائیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ روسی حکومت چھپے مخالفوں سے پاک کی جا رہی ہے۔ لیکن یہ روس کا اپنا گھر کا معاملہ ہی نہیں ہے، اس کا اثر دنیا کی سیاست پر پڑے گا۔ اسی وجہ سے اس پر غور کرنا بہت ضروری ہے، اگرچہ حقیقت کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے اور ہم کوئی بات پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے۔

ان تمام لوگوں پر جنہوں نے سزائیں پائیں یہ الزام لگایا گیا کہ وہ ٹروٹسکی کے پیرو، یعنی ستالن اور اس کی حکمت عملی کے مخالف ہیں، اور ان کے خلاف یہ ثابت کیا گیا کہ ایک طرف تو وہ سبوتاژ (آلات اور سامان صنعت کی تخریب) کے ذریعے موجودہ صنعتی پالیسی کو کامیابی سے محروم رکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف غیر ملکوں کو ترغیب دلا رہے ہیں کہ وہ روس پر حملہ کریں یا اس کے کسی حصے پر قبضہ کر لیں۔ ستالن اور ٹروٹسکی کے درمیان شخصی عداوتوں کے علاوہ یہ اصولی اختلاف ہے کہ ٹروٹسکی عالمگیر انقلاب کو سوشلسٹ تحریک کی کامیابی کے لیے ناگزیر سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک مارکس کے ہر سچے پیرو کا فرض ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے ہر ملک میں انقلابی تحریک کو تقویت پہنچائے۔ اس کے برخلاف ستالن اس پر تلا ہوا ہے کہ روس کو سوشلسٹ نظام کا ایک مکمل نمونہ بنائے، اور اس طرح دنیا کی اور قوموں کو سوشلزم کی طرف مائل کرے۔ شاید ٹروٹسکی اپنی اصولی اور اصطلاحی بحث میں روس کی خاص ضروریات کو نظرانداز کرتا ہے، اور ممکن ہے اصولی نقطۂ نظر سے ستالن پر جو الزام وہ لگاتا ہے وہ بھی کسی حد تک صحیح ہوں۔ ستالن کا حکومت

اور کومِن ترن ۔یعنی اس جماعت پر جو عالم گیر انقلاب کی ذمہ دار مانی جاتی ہے، پورا تسلط ہے، ستالن نے ٹروٹسکی کو جلاوطن کرا دیا۔ اور اس کے ہم خیال لوگوں کو بے دست و پا کر دیا۔ ان کے لئے سازشیں کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا اور بہت ممکن ہے جن لوگوں پر الزام لگایا گیا ہے وہ سازشوں میں شریک ہوئے ہوں ۔لیکن اصولی اختلافات ہر ملک کی سیاسی پارٹیوں میں ہوتے ہیں۔ یہ بات ذرا مشکل سے سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ ٹروٹسکی اور ستالن میں اصولی اختلاف تھا اس وجہ سے ایک کے پیرو روس کو غیروں کے ہاتھ بیچنے پر تیار ہو گئے اور دوسرے نے انھیں پکڑ کر قتل کرا دیا۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ لوگ جنھیں روسی عدالت نے سزا دی واقعی اسی سزا کے مستحق تھے، لیکن ان پر جو الزام لگائے گئے تھے ان سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہی کا انھوں نے اپنی زبان اور قلم سے اقبال کیا۔ عدالت اور حکومت نے غالباً ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی نہیں کی، اور ملک میں کوئی ان کی حمایت میں نہیں بولا۔ اس سے ایک گہری سازش کا پتہ چلتا ہے ۔اگرچہ ایسی کارروائیوں کے ظاہری اور حقیقی پہلو میں اکثر زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے ۔یہ سال روسی عدالت کا ان ملزموں کے بارے میں جو فیصلہ تھا وہ بغیر چون و چرا دنیا بھر نے تسلیم نہیں کیا۔ ہر طرح کے بوجھ بجھکر اس معمے کو حل کرنے کی فکر میں پڑ گئے، اور ہر طرف سے تحقیقات اور رائے زنی ہونے لگی۔ اس سب کا نتیجہ جو بحیثیت مجموعی صحیح معلوم ہوتا ہے یہ ہے۔

روسی عدالت نے بے انصافی نہیں کی، اگرچہ سرکاری وکیل کی زبان کہیں کہیں پر قابل اعتراض تھی، مجرم کے اقبال جرم کو ثبوت کے سمجھا گیا، اور بہت سے کاغذات اور خطوط جن کی بنا پر الزام قائم کئے گئے تھے عدالت میں پیش نہیں کئے۔ ملزموں کا مفصل اور مدلل اقبال جرم حیرت انگیز معلوم ہوتا، اور فوراً یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان کو اقبال جرم پر مجبور کیا گیا ہوگا، لیکن جبر کے علاوہ اس کے اور اسباب بھی ہو سکتے ہیں۔ جن میں سب سے زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ان لوگوں کے اوپر جاسوس لگائے گئے تھے، جو انھیں دھوکے میں ڈال کر سازش میں شریک ہوئے، اور بعد کو جب انھیں جاسوسوں کا سامنا کرایا گیا تو ملزموں کو سب کچھ قبول دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ شاید وہ یہ بھی سمجھتے ہوں کہ

جرم قبول دینے سے ان کی سزا کچھ ہلکی ہو جائے گی ۔

اب رہا یہ سوال کہ انقلاب کے شیدائی غدار کیسے بن گئے ۔ اس کا جواب ملزموں کی شخصیت اور ان کے عقائد پر غور کرنے سے مل جائے گا ۔ ملزموں کے پہلے اور دوسرے گروہ میں زیادہ تر لوگ ایسے تھے جن کی عمر سازشیں کرتے گذری ، ان کے عقیدے ملک اور قوم کے تصورات کے پابند نہیں تھے ، اور وہ یہ جانتے تھے کہ معاشرتی انقلاب بغیر بین الاقوامی فساد کے ممکن نہیں ۔ لہٰذا اگر ان میں سے کوئی یہ تدبیر سوچتا کہ جرمنی کو روس کا ایک حصہ دیکر اس کی طاقت بڑھائی جائے اور پھر دوسرے ملکوں کو اس سے بھڑا دیا جائے تو اس میں کوئی بات اصول یا انقلابی تعلیم کے خلاف نہ ہوتی ۔ روسی عدالت نے ملزموں کو غدار اس لئے نہیں ٹھہرایا کہ انھوں نے انقلابی اصولوں کو چھوڑ دیا تھا بلکہ اس بنا پر کہ انھوں نے روس اور روسی قوم کو شدید نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی ۔ روس میں اب عام رائے قومیت کی طرف مائل ہے ، روسیوں کے حوصلے صنعتی اور معاشرتی تعمیر کو اپنا مقصد بنائے ہوئے ہیں ، وہ انقلاب کے شعلے بھڑکانے کی خاطر اپنی زندگی کو درہم برہم نہیں کرنا چاہتے ۔ ملزموں کا تیسرا گروہ جو ہیں سب سے ممتاز مارشل توخاچفسکی تھا ، اس حد تک تو انقلاب پسندوں کے ساتھ تھا کہ جرمنی کو فساد برپا کرنے کا ذریعہ بنایا جائے ۔ لیکن فساد سے اس کو صرف انقلابی تعلیم کے پھیلنے کی امید نہ تھی بلکہ وہ اپنی ترقی بھی چاہتا تھا ۔ لوگ کہتے ہیں کہ توخاچفسکی انقلاب اور فساد سے وہی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا جو نپولین کو ہوا ۔ روسیوں کا اپنے موجودہ مسلک پر قائم رہنا اور ستالن کا اسی طرح حاوی رہنا توخاچفسکی کے حوصلوں کے لئے ناکامیابی کا اعلان تھا ۔ جرمن فوج اور اعلےٰ فوجی افسروں سے روسی سپہ سالار اور اس کے ماتحتوں کے کئی برس سے خاصے گہرے تعلقات رہے ہیں ، اور کوئی تعجب نہیں کہ اس نے ان تعلقات سے کام لینے کا ارادہ کیا ہو ۔

اتنے ممتاز آدمیوں کا ایک ساتھ سزا پانا ایسا مظاہرہ جس نے روس کے باہر لوگوں کو روسی انقلاب کی خونریزیاں یاد دلا دیں ، لیکن انگریز اور امریکن کبھی مانتے ہی نہیں ہیں کہ دوسری قومیں انصاف کر سکتی ہیں یا ظلم اور تشدد سے پرہیز کرنے کی خواہش رکھتی ہیں ۔ دراصل موقع کو دیکھتے ہوئے روسی

حکومت نے کوئی خاص زیادتی نہیں کی ہے۔ جن لوگوں کو سزائیں دی گئی ہیں ان میں سے اکثر ایسے تھے کہ ان کی بے چین طبیعتیں پرامن زندگی گوارا نہیں کر سکتی تھیں اور بہت سے ایسے بھی تھے جنھوں نے انقلابی بن کر ذاتی فائدے حاصل کئے تھے یا ایذا رسانی کا شوق پورا کیا تھا۔ روسی اپنی حکومت کی اس کارروائی سے خوش ہیں اور باہر کے لوگوں کو بھی مطمئن ہی ہونا چاہئے۔ روس ان ملکوں میں سے ہے جو اس وقت جنگ سے بچنا چاہتے ہیں اور دنیا کے امن کا دارومدار ایسے ہی ملکوں پر ہے۔

تعلیمی دُنیا

(محمد عبدالغفور صاحب۔ایم۔اے علیگ)

روس میں صنعتی مراکز حکومت روس کی طرف سے اسکولی بچوں کے لئے تقریباً آٹھ سو صنعتی اور زرعی مرکز کھولے گئے ہیں، یہاں ہزاروں بچوں کو جدید ترین صنعتی اور زرعی طریقوں نیز آلات سے روشناس کیا جاتا ہے۔ان مرکزوں میں بچوں کو اپنے "بیدو" سادے طریقے سے تجربے کرنے اور نئی چیزیں ایجاد کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ بڑے مشہور ماہرین فن کے زیر ہدایت عمل کرتے ہیں۔سب سے بڑا زرعی اسٹیشن ماسکو میں ہے جو زراعت سے دلچسپی رکھنے والی نوجوان نسل کا مرکز ہے۔ہر سال ہزاروں بچے اس کے دفتر میں خطوط۔استفسارات نیز بیج۔پودوں اور پیوندی شاخوں کے لئے درخواستیں بھیجتے رہتے ہیں۔ پچھلے سال اس ادارے میں ۱۰۰۰ خطوط موصول ہوئے، جن کے جواب میں آٹھ ہزار بیجوں اور ۶۳۰۰ پودوں کے بنڈل بھیجے گئے۔ ماسکو کے مرکز میں ۷سال سے ۱۷ سال کے نوجوان ،علم نباتات۔حیوانات۔فلکیات وغیرہ پر کام کر رہے ہیں۔

جرمنی میں یونیورسٹی طلباء کی تعداد ۱۹۳۴ء میں ۳۰۰۰۰ تھی۔ یہ اب گھٹ کر صرف ۶۵۰۰۰ رہ گئی ہے۔سائنس میں تحقیقات کا کام محض جنگی ضروریات کے نقطۂ نگاہ سے کیا جا رہا ہے۔آرٹس میں علمی آزادی کے آخری نشان بھی آہستہ آہستہ مٹ رہے ہیں۔اساتذہ جب تک آریہ نسل سے ہونے کا پورا ثبوت نہ دیں نہ لیکچر دے سکتے ہیں، نہ کوئی کتاب شائع کر سکتے ہیں۔کم از کم ۱۵۰۰ معلمین کو زبان بند رکھنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔اور ان کے علاوہ ہزاروں روزی چھن جانے کے ڈر سے خاموش ہیں۔نئی ملازمتیں صرف ان کو مل سکیں گی جو لیبر کیمپ۔فوج یا کسی خاص کیمپ میں جہاں نازی ازم کی تعلیم دی جاتی ہے، کام کر چکے ہوں۔حکومت کی طرف سے ایک نیشنل اسٹوڈنٹ لیڈر

مقرر ہے جو ہر یونیورسٹی کے لئے ایک ریکٹر معین کرتا ہے۔ اس افسر کے اختیارات یونیورسٹی ریکٹر (Rector) سے بھی زیادہ ہیں۔ پچھلے دنوں تمام یونیورسٹی ریکٹروں کو ہدایت کردی گئی ہے کہ وہ وزارت تعلیم سے مشورہ لئے بغیر کسی طالب علم کو سزا نہ دیں۔

آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کا تیرھواں اجلاس ۲۷ دسمبر سے ۳۰ دسمبر ۱۹۳۷ء تک کلکتہ میں منعقد ہوگا۔ مفصلہ ذیل عنوانات پر مقالات پڑھے جائیں گے اور بحث و مذاکرات ہونگے۔ ابتدائی اور دیہاتی تعلیم۔ ثانوی۔ یونیورسٹی۔ گھر کی تعلیم۔ تعلیم بالغان۔ بیٹیوں کی تعلیم۔ طریقۂ امتحان۔ صحت اور ورزش کی تعلیم۔ تعلیم اخلاق و مذہب۔ اساتذہ کی تربیت و تعلیمی تحقیقات۔ بین الاقوامی اخوت اور امن کی تعلیم۔ اس کانفرنس میں نیو ایجوکیشن فیلوشپ کا یوپی وفد بھی شامل ہوگا۔ نیز ایک تعلیمی نمائش بھی اس سلسلہ میں منعقد کی جائے گی۔

پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب وائس پرنسپل ٹریننگ کالج علیگڑھ کو برمنگھم یونیورسٹی کی طرف سے ان کے مقالہ پر جو انھوں نے ایم اے ایجوکیشن کے لئے پیش کیا تھا۔ ریڈبری پرائز عطا کیا گیا ہے۔ پروفیسر موصوف پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے یہ تعلیمی امتیاز حاصل کیا ہے۔ مقالہ کا موضوع "طریق امتحان اور اس کا جائزہ" تھا۔ امتحان کا تعلیمی مسئلہ ولایت کے تعلیمی حلقوں میں جاذب توجہ ہے۔ ابھی پچھلے سال سر فلپ ہارٹوگ کے قلم سے امتحانوں کا امتحان، کے عنوان سے ایک رپورٹ شائع ہو چکی ہے۔ نیز ایک بین الاقوامی تعلیمی کمیشن نے بھی اس موضوع پر مبسوط تحقیقاتی رپورٹ شائع کی ہے۔ پروفیسر موصوف کو اس کامیاب مقالے کی تصنیف پر پروفیسر سرل برٹ جیسے مشہور ماہر تعلیم اور محقق نفسیات تعلیمی نے مبارکباد دی ہے۔ امید ہے یہ مقالہ عنقریب چھپ کر شائع ہو جائے گا۔ نیز Intellectual Co-operation کے بین الاقوامی مرکزی دفتر سے صاحب موصوف سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ ہندوستانی نظام تعلیم اور امتحان کے سلسلے میں

تحقیقات کے کام میں مرکز مذکور سے تعاون کریں۔

چین میں تعلیمی فلموں کے سلسلے میں کچھ عرصے سے خاص دلچسپی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ پچھلے سال وزارت معارف کی جانب سے ملک بھر میں ۱۶۰ فلمیں (۱۶ ملی میٹر۔ با آواز اور خاموش دونوں) کی تقسیم و اشاعت کا انتظام کیا گیا تھا۔ یہ فلمیں ابتدائی اور ثانوی تعلیم میں امدادی طور پر استعمال ہونگی۔ نیز عوام کے لئے دلچسپ معلومات اور تفریح کا سامان مہیا کریں گی۔ تمام ملک کو ۱۲۰ اضلاع میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ ہر ضلع میں ایک تربیت یافتہ آپریٹر ہوگا۔ پچھلے سال نانکن یونیورسٹی کی طرف سے آپریٹروں کی تربیت کے لئے ایک خاص جماعت کھولی گئی تھی۔ حکومت ایک سینما اسکول کھولنے کی تجویز پر بھی غور کر رہی ہے۔

حکومت اسپین کی طرف سے مزدوروں کے لئے ایک آسان بی۔اے کی ڈگری کا انتظام کیا گیا ہے جس میں پندرہ سال سے ۳۵ سال کی عمر تک کے طلباء داخل ہوسکیں گے۔ ان طلباء کا انتخاب ان امیدواروں میں سے کیا جائیگا جن کے نام کسی ٹریڈ یونین کی طرف سے پیش کئے گئے ہوں اور جنھوں نے فاشسزم کے خلاف عملی جدو جہد کی ہو۔ مدت تعلیم دو سال ہوگی۔ اختتام کے بعد طلباء کو بی۔اے کی سند دی جائے گی جس کی علمی حیثیت دوسری اسناد کے برابر تصور کی جائے گی۔ طلباء سے فیس نہیں لی جائے گی بلکہ کتابیں اور سامان تعلیم بھی مفت مہیا کیا جائے گا۔ حکومت کی طرف سے ان طلباء کو جو مشقت و مزدوری سے اپنا کنبہ پالتے تھے امداد دی جائے گی تاکہ وہ اور ان کے متعلقین مالی مشکلات سے بے فکر ہو جائیں۔

ورلڈ ایجوکیشنل کانفرنس ٹوکیو میں ۵۰ ہزار جاپانی اور نو سو غیر ملکی نمائندے شامل ہوئے جن میں تقریباً چالیس ممالک کے ماہرین تعلیم تھے۔ جاپان کے بعد امریکہ کے نمائندے سب سے زیادہ

تھے یعنی ۵۷۴۔ اس کے بعد کینیڈا ۹۲۔ فلپائن ۷۳۔ ہندوستان ۶۲۔ انگلستان ۲۸۔ سیام ۱۱۔ چین ۱۱۔ جرمنی ۸۔ لنکا ۷۔

کانفرنس کا پروگرام متنوع اور بے حد دلچسپ تھا جس میں خاص قابل ذکر چیزیں مفصلۂ ذیل ہیں:۔ ٹوکیو پریفیکچرل آرٹ گیلری میں آرٹ کی نمائش۔ جدید وقدیم۔ شہ وکیوٹ یپارٹمنٹ سٹور میں تمدنی اور صنعتی آرٹ کی نمائش سٹوکیو میں نسوانی اعلیٰ نارمل اسکول میں تعلیمی نمائش ٹوکیو امپیریل یونیورسٹی کی سیر۔ جاپانی ناچ۔ مہمانوں کے لئے جاپانی ارکسٹرا ا(Orchestra) ڈرامے۔ چائے نوشی کے مہذب طریقے۔ جاپانی پھولوں کی سجاوٹ۔ فن پہلوانی۔ تیغ زنی۔ تیر اندازی وغیرہ کے مطالعہ کے لئے مناسب سہولتیں مہیا کی گئی تھیں۔ بقول ایک ہندوستانی ڈیلیگیٹ کے معلوم ہوتا تھا کہ اہل جاپان نے ہم لوگوں کو اپنے تہذیب وتمدن سے روشناس کرانے کے لئے بلایا ہے نہ کہ اک دنیا بھر کی تعلیمی مجلس میں مشورے اور بحث وگفتگو کے لئے۔

ہائی کمشنر ہند کے دفتر تعلیم سے انگلستان میں ہندوستانی طلبا ر کے موضوع پر سالانہ رپورٹ حال میں ہی شائع ہوئی۔ یہ رپورٹ ستمبر ۱۹۳۶ء تک کی ہے۔ اس سال کے دوران میں ۱۳۵۰ ہندوستانی طلبا ء انگلستان میں تعلیم پا رہے تھے جن میں ۴۷ عورتیں تھیں۔ سب سے زیادہ طلبا ء ڈاکٹری میں (یعنی ۴۴۶)۔ اس کے بعد آرٹس میں (۳۱۲) ہیں۔ اس سال کے دوران میں ہندوستانی طلباء کا ہوسٹل جو ۱۲ کرام ول روڈ پر واقع تھا۔ طلباء کی کمی کی وجہ سے بند کر دیا گیا۔ ہندوستانی طلباء کی یونین اور ہوسٹل واقعہ ۱۱۲۔ گوئر اسٹریٹ اپنے مفید فرائض باقاعدگی کے ساتھ انجام دیتے رہے۔ اور پچھلے سالوں کی نسبت انجمن کے ممبروں میں کافی اضافہ ہوا۔ اس سال ہندوستانی طلباء نے تعلیمی حالت اور امتیازات حاصل کرنے کا معیار تسلی بخش رکھا۔ ۴ سائنس کے طلباء کو ڈی ایس سی ۴۲ کو پی ایچ ڈی۔ اور ۱۲ کو ایم ایس سی کی ڈگریاں ملیں۔ آرٹس میں ۱۴ طلباء نے پی ایچ ڈی کی تکمیل کی کھیلوں میں جہانگیر خاں کیمبرج کی طرف سے کرکٹ کھیلا۔ مسٹر بیگ نے مکہ بازی میں

کیمبرج یونیورسٹی کی نمائندگی کی اور بھنڈاری یونیورسٹی کے ٹینس بلیو (Blue) کا امتیاز حاصل کیا۔ اس سال میں خاص طور پر قابل ذکر یہ امر ہے کہ ایجوکیشن یعنی اساتذہ کی ٹریننگ کلاسوں میں طلبا کی تعداد میں معتد بہ اضافہ ہوا۔ ہندوستان میں ایک نیا تعلیمی دور کا آغاز ہونے والا ہے، امید ہے کہ ہندوستانی تربیت یافتگان کی بڑھتی ہوئی تعداد تعلیمی ہندوستان کی روزافزوں ضروریات کو پورا کر سکے گی۔

پچھلے پندرہ ماہ کی مدت سے فرانس کا نظام تعلیم ایک ایسے دور اصلاحات میں سے گزر رہا ہے جس میں نظم ونسق۔ اسکولی بچوں کی عمر کے تعین وغیرہ کے سلسلے میں دلچسپ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ مادام ژولیو کیوری کو ان وسائل کی نگرانی پر مقرر کیا گیا ہے جن کے ذریعہ حکومت اعلےٰ سائنس کی ایجادات کو فروغ دے سکے گی۔ وزیر تعلیم موسیو ژری آن زاا اسکولی عمر کی حدود کو متعین کرنے اور لازمی تعلیم کے اجرا میں خاص دلچسپی لے رہے ہیں۔ ایک نئے قانون کی رو سے چھ سال سے چودہ سال کے بچوں کے لئے خواہ ملکی یا غیر ملکی۔ ابتدائی تعلیم لازمی قرار دی گئی ہے۔ نیز لیبر کوڈ (Labour Code) میں بھی مناسب تبدیلیاں کردی گئی ہیں جن کی رو سے کوئی بچہ چودہ سال کی عمر سے پہلے کسی تجارتی یا صنعتی ادارے میں ملازم نہیں رکھا جا سکتا۔ پچھلے دسمبر میں ایک اسکول براڈ کاسٹنگ کمیشن مقرر کیا گیا ہے۔ جس کا فرض اسکولوں کے لئے مناسب تعلیمی پروگرام تیار کرنا ہے۔

جولائی ۱۹۳۶ء میں ہام برگ میں کل دنیا کی فالتو اوقات اور تعلیمی تفریح کی کانگرس کے مذاکرات کے بعد برلن میں ایک مرکزی بیورو قائم کیا گیا ہے جس کے فرائض مفصلہ ذیل ہیں: ۔ ان انجمنوں اور مشاہرین کے پتے مہیا کرنا جو تفریحی تحریکات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ نیز اس تحریک پر ہر قسم کا لٹریچر مہیا کرنا۔ تفریحی تحریک کی تاریخ پر تحقیقات کرنا۔ مختلف قوموں کی تفریحی تنظیم اور طریق کا مطالعہ کرنا اور

اس کی کل دنیا میں اشاعت کرنا۔ یہ ادارہ تفریح کے عملی پہلو۔ مختلف ممالک کی تحریکوں کی رپورٹ وغیرہ بھی مہیا کرتا ہے۔ نیز اس سلسلے میں اعداد و شمار فراہم کرتا ہے۔ ایسے مختلف ممالک میں جو تفریحی تنظیم میں پیش پیش ہیں۔ تعلیمی دوروں۔ تقریر دو ۱۲ علماء اور عملی کام کرنے والوں کی باہمی کانفرنسوں کا انتظام کرتا ہے۔ اس تحریک کی پہلی کانفرنس لاس اینجلوس میں ۱۹۳۲ء میں منعقد ہوئی تھی۔

نازی حکومت کی تحریک سے جرمنی کے تعلیمی اور سماجی حلقوں میں جسمانی ورزش پر بہت توجہ کی جا رہی ہے اور کچھ عرصے سے مختلف یورپی ممالک کے ماہرین تعلیم بھی اس تحریک کو بے حد دلچسپی سے مطالعہ کر رہے تھے۔ پچھلے نومبر میں انگلستان سے ریاضت جسمانی کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک وفد جرمنی بھیجا گیا جو دس افراد پر مشتمل تھا۔ وفد نے ابتدائی اور ثانوی مدارس کا مطالعہ کیا۔ نیز چند ایسے اداروں کا جو جرمنی بلحاظ اس کی موجودہ حکومت سے مخصوص ہیں۔ ان میں خاص طور پر قابل ذکر نیشنل پولیٹیکل ایجوکیشن کا ادارہ ہے جس میں ان طلبا کی تربیت کی جاتی ہے جن میں قیادت اور رہبری کا ذاتی ملکہ موجود ہے۔ ایک دوسرا اسکول قائدین کے لئے ہے۔ لیبر کیمپ میں نوجوانوں کو بغیر کسی سماجی امتیاز کے اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور مشقت کی عزت کرنا سکھایا جاتا ہے۔ a and year camp میں شہری بچوں کو دیہات کی زندگی اور مشغلوں سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ وفد نے ہٹلر کی نوجوان تحریک کا خاص طور پر مطالعہ کیا۔ وفد نے ولایت کے تعلیمی بورڈ کے سامنے اس موضوع پر رپورٹ پیش کر دی ہے جس کی سفارشات پر غور کیا جا رہا ہے۔ ہندوستان میں ریاضت جسمانی کی تحریک ابھی قائدین کرام اور ماہرین تعلیم کی توجہ کی محتاج ہے۔ مسٹر کھیر نے جو خوش قسمتی سے وزیر اعظم کے فرائض کے ساتھ ساتھ وزارت تعلیم کا قلمدان بھی سنبھالے ہیں کونسل کے اندر اور باہر ملک کی توجہ اس اہم مسئلہ پر مبذول کرائی ہے۔ مگر ہندوستان میں ریاضت جسمانی کے ساتھ ساتھ اسکول کے بچوں کی خوراک کا مسئلہ بھی انتہائی ضروری ہے بلکہ اس سے زیادہ اہم ہے۔ خالی پیٹ ورزش کرانا یا ایسے بچوں سے جن کو غربت کی وجہ سے اچھی غذا نہ مل سکے ریاضت جسمانی کا کام لینا یقیناً ان کی صحت کے لئے مضر ہوگا۔

حکومت بمبئی نے شریمتی ناتھی بائی دامودر ٹھاکرسے انڈین وومن یونیورسٹی کو سرکاری طور پر منظور فرما کے طبقۂ نسواں پر بڑا احسان کیا ہے۔ یونیورسٹی کی بنیاد پروفیسر کاروے کی مخلصانہ اور سرفروشانہ کوششوں سے پڑی تھی۔ حکومت کی طرف سے منظوری ہونے کے بعد یونیورسٹی کو پندرہ لاکھ کا وہ گراں قدر عطیہ مل جائے گا جو سر وٹھل تھیکرسے نے اس ادارے کے لئے وقف کر دیا تھا اور اب تک شرائط وقف کی رُو سے یونیورسٹی اس رقم کے صرف سود سے مستفید ہو سکتی تھی۔ اس ادارے میں سب مضامین کے لئے ذریعہ تعلیم دیسی زبانیں ہیں۔ اور بی۔اے کے بعد کی جماعتوں میں بھی دیسی زبانوں ہی میں تعلیم ہوتی ہے۔

آئندہ سال ماہ جنوری میں انڈین سائنس کانگریس، کلکتہ میں اپنی سلور جوبلی کی تقریب منا رہی ہے اس سلسلے میں کانگریس کی طرف سے برٹش ایسوسی ایشن (Br. Association) کے سرکردہ اصحاب اور غیر ممالک کے مشاہیر سائنس کو مدعو کیا گیا ہے۔ طے کیا گیا تھا لارڈ رتھرفورڈ کی صدارت میں برٹش ایسوسی ایشن اور انڈین سائنس کانگریس کا مشترکہ اجلاس منعقد ہوگا۔ مگر پروفیسر موصوف کی بے وقت اور ناگہانی موت کے سبب اس تقریب کو یہ عزت حاصل نہ ہو سکی۔ انگریزی وفد دسمبر میں روانہ ہوگا اور تقریباً دو ماہ انگلستان سے باہر رہے گا۔ کانگریس کی طرف سے پروفیسر آئن سٹائن کے نام بھی ایک دعوت نامہ بھیجا گیا تھا، ان سے اس موقع پر اپنے خاص موضوع پر چند تقریریں کرنے کی درخواست کی گئی تھی مگر موصوف نے ناسازی طبع کی وجہ سے حاضری سے معافی چاہی۔ اس کانگریس میں دنیائے سائنس کے درخشاں و تابندہ ستارے شامل ہو رہے ہیں۔ سرزمین ہند پر اس سے پہلے سائنس کے علماء کا اتنا بڑا اور اہم اجتماع نہیں ہوا۔ مثلاً صرف شعبہ نفسیات میں ہی مائر (Myer) ڈائرکٹر لیبریٹری آف انڈسٹریل سائیکالوجی انگلستان۔ پروفیسر سپیرمین (Spearman) لندن یونیورسٹی۔ ڈاکٹر ینگ وغیرہ شامل ہو رہے ہیں۔

ٹرویندرم میں آئیندہ دسمبر میں ہونے والی آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کی صدارت پروفیسر ایف۔ڈبلیو۔ٹامس فرماویں گے جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں بوڈن پروفیسر آف سنسکرت ہیں۔

کونسل آف برٹش اکادمی نے سر رادھا کرشنن، پروفیسر فلسفہ کلکتہ (حال آکسفورڈ) کو Master Mind (بہترین دماغ) کے موضوع پر سالانہ لیکچر دینے کے لئے مدعو کیا ہے۔ اس سلسلے میں اس سے پہلے دانتے۔ ارسطو۔ سپینوزا وغیرہ پر ڈین انگ اور پروفیسر راس نے لیکچر دئے ہیں۔ رادھا کرشنن صاحب آغاز ۱۹۳۸ء میں مہاتما بدھ پر تقریر فرمائیں گے۔ اور یہ لیکچر کتاب کی شکل میں اکادمی مذکور کی طرف سے شائع کیا جائے گا۔

رفتارِ عالم

مراکش

مراکش میں بے چینی برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے ، عرب وطن پرست آئینی جد و جہد کو چھوڑ کر مرنے مارنے پر تلے ہوئے ہیں۔ پڑوس میں ہسپانوی مراکش ہے ، جہاں نوجوان عرب جرمن افسروں سے قواعد سیکھ کر جنرل فرانکو کی فوجوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ یہیں سے مراکشی وطن پرستوں کو ہتھیار پہنچتے ہیں۔ فرانسیسی حکومت سختی کرتی ہے تو خون خرابہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر نرمی برتتی ہے تو وطن پرستوں کی تحریک آزادی کو اور پھلنے پھولنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ ہل چل صرف مراکش تک ہی محدود نہیں بلکہ الجزائر اور ٹیونس میں بھی قوم پرستوں نے آزادی کی لڑائی شروع کر دی ہے۔ آخر الذکر ملک کے مشہور رہنما عبدالعزیز الثعالبی ایک عرصے کی جلاوطنی کے بعد واپس ٹیونس پہنچے ہیں۔ آپ کے دم سے ملک کی مردہ تحریک میں ازسر نو جان پڑ گئی ہے ، فرانس میں اس وقت عوام پسند حکومت ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ شمالی افریقہ میں پرانی حکمتِ عملی کو بدلا جائے۔ اور قوم پرستوں کے مطالبات کو ایک حد تک مان لیا جائے لیکن اہل ملک کی مصیبت اتنی بڑھ چکی ہے کہ معمولی دوا داروسے ان کا اچھا ہونا مشکل ہے۔ ضرورت ہے کہ سرے سے سامراج کی لعنت سے اس زمین کو پاک کیا جائے۔ پھر کہیں جا کر شمالی افریقہ میں بسنے والوں کو اطمینان نصیب ہو سکتا ہے۔

مراکش ، الجزائر اور ٹیونس کی بے چینی کی تہ میں اقتصادی اسباب کام کر رہے ہیں۔ ساحل کی زرخیز زمینیں فرانسیسی آبادکاروں نے لے لیں ، تجارت یہودیوں اور فرانسیسیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اب عرب کھائے تو کہاں سے کھائے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سوزش پھیلنے لگی اور اب فرانس ہے کہ تمام جتن کرتا ہے لیکن حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔

(م ، س)

فلسطین

فلسطین کے عربوں کی "خود سری" اور "ناشکری" پر برطانیہ کہاں تک صبر کرتی آخر سات آٹھ لاکھ عربوں کو برطانیہ کی جناب میں یہ گستاخی کرنے کی جرأت کیسے ہوئی کہ وہ برطانیہ کے شاہی کمیشن کے فیصلے کو ٹھکرادیں مجبوراً ان سرپھروں کو قرار واقعی سزا دینے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ آن کی آن میں تمام فلسطین پر فوجی قبضہ ہوگیا مجلس اعلیٰ توڑ دی گئی اور اس کے ارکان قید و بند کی نذر ہوئے، مجلس اسلامی معطل، اور مفتی اعظم برخاست جس نے اجتماع کی جسارت کی، گرفتار کرلیا گیا۔ راستوں اور سڑکوں پر پہرے بٹھا دئے گئے۔ جس گاؤں کے قریب گولی چلنے کا حادثہ ہوا۔ اس گاؤں کے ممتاز لوگ گرفتار ہوا اور ان کے مکان آگ کی نذر، اختیارات عام عدالتوں سے چھین کر فوجی عدالتوں کو دے دئے گئے ہیں۔ راہ چلتوں کی جامہ تلاشی ہورہی ہے۔ جس کے پاس سے آتشیں ہتھیار نکلتا ہے وہ پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جاتا ہے۔

فوجی قانون کی اس داروگیر نے "سرپھرے" عربوں کو کچھ زیادہ سراسیمہ نہیں کیا۔ ریلوے گاڑیاں اب بھی بارود سے اڑائی جارہی ہیں۔ عرب نشانہ باز پولیس اور فوج کی تاک میں برابر رہتے ہیں اور کوئی دن نہیں جاتا کہ کوئی واردات نہ ہوتی ہو۔ ایک طرف فلسطین میں قتل و غارت کا بازار گرم ہے تو دوسری طرف جزیرہ عرب، شرق اردن، شام اور عراق میں برطانیہ کی اس حکمت عملی کے خلاف سیاسی مجلسوں، دینی اجتماعوں اور جمہوری اداروں میں آگ برسائی جارہی ہے۔ حجاز کی خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیرۂ عرب کے بدو تک اپنے فلسطینی بھائیوں کی مصائب سے متاثر ہورہے ہیں اور ابن سعود کی حکومت کے لئے "برطانیہ دوستی" کا طرز عمل رکھنا مشکل ہوگیا ہے۔

عراق اور مصر تو چند سال پیشتر برطانیہ کے ساتھ خون کی اس قسم کی ہولی کھیل ہی چکے ہیں۔ اور وہ اچھی طرح سے جان گئے ہیں کہ جب برطانی سامراج اس طرح کے اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے تو یہ اس کی "باعزت پسپائی" کی تمہید ہوتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ برطانیہ کب تک بندوقوں کی گولیوں، طیاروں کے بموں اور پھانسیوں کے تختوں کے ذریعے عربوں کو شاہی کمیشن کے فیصلوں کو ماننے پر اصرار کرتی ہے۔

(م۔ س)

مصر

مصر کی سیاسی ہائے و ہو صرف ان باتوں میں گھر کر رہ گئی ہے ، بادشاہ کی ذات ، وفد جماعت اور اس کا رہنما ۔ سیاسی جماعتوں کی آپس کی تو تو ، میں میں ، بادشاہ کسی جامع مسجد میں نماز ادا کرتا ہے تو صفحوں تک اخبارات کے کالم سیاہ ہوتے ہیں ۔ اب خیر سے بادشاہ کی شادی کی دھوم ہے ، بادشاہ کی ہر دل عزیزی وفد کے رہنما مصطفیٰ نحاس کو پریشان کر رہی ہے ۔ بادشاہ شہر کی ایک جامع مسجد میں نماز پڑھتا ہے تو نحاس پاشا کسی دوسرے حصے میں پہنچتا ہے ۔ ایک طرف "زندہ باد بادشاہ" کے نعرے بلند ہوتے ہیں تو دوسری طرف نیلی "پوشوں" کے دستے "زعیم مصر" کو سلامی دیتے ہیں ۔ نیلی پوشوں کی تحریک وفد جماعت نے شروع کی ہے ، اور بعض لوگوں کا خیال ہے کہ نحاس پاشا مصر میں ہٹلر اور مسولینی بننے کا خواب دیکھ رہا ہے حاشیہ نشین اسے بادشاہ کے خلاف بھڑکا رہے ہیں اور ہٹلر اور مسولینی کی مثال دے کر مصر کا مختار مطلق بننے کی ہمت دلاتے ہیں ۔ وفد اور قصر شاہی کی یہ کش مکش اب ہر شخص کی زبان پر ہے ۔ وفد کو اپنی اکثریت پر ناز ہے اور بادشاہ پرست استحقاق شاہی اور دین دار طبقوں کی پشت پناہی ڈھونڈھتے ہیں ۔

سیاسی جماعتوں کی خانہ جنگی نازک صورت اختیار کر رہی ہے ۔ وسط نومبر میں پارلیمنٹ کا سہ ماہی اجلاس شروع ہوا ۔ ایک اخبار کا بیان ہے کہ کئی ارکان اندر کی جیبوں میں پستول لے کر گئے ۔ پارلیمنٹ کے باہر پولیس بغرض احتیاط تیار تھی ۔

ادھر زعما آپس میں دست گریباں ہیں اور ادھر مغربی حدود پر مسولینی فوج پر فوج بھیج رہا ہے ۔ اہل مصر نام نہاد آزادی پا کر خوشی میں یہ بھی بھول گئے کہ آزادی کے لئے سپاہ و اسلحہ کی ضرورت پڑتی ہے ۔ مصر جیسا غیر محفوظ ملک جو چاروں طرف سے دشمن سے گھرا ہوا ہے فوج کی طرف سے کس طرح غفلت برت سکتا ہے لیکن برطانیہ کی قوت و جبروت پر بھروسہ ہے اس لئے مگن ہے ۔ اور آپس میں لڑ رہے ہیں ۔

(م ۔ س)

ترکی کا پنج سالہ پروگرام

مصری اخبارات کا خیال ہے کہ عصمتی وزارت کے استعفے اور جلال بائر کے کابینے کے تقرر کی وجہ یہ ہے کہ ملک کو اب سیاسی مدبروں سے زیادہ معاشی ماہروں کی ضرورت ہے، ممکن ہے عزل ونصب کی یہ وجہ صحیح نہ ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ جمہوریہ ترکیہ اپنی تمام تر توجہ اس وقت ملک کے معاشی اور سماجی اصلاح وتعمیر پر صرف کر رہی ہے۔ کانج سعد آباد میں توفیق رشدی آراس نے جو تقریر کی تھی اس میں سب سے زیادہ زور معاشی اصلاح واستحکام پر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ترکی میں پہلے پنج سالہ پروگرام کے ختم ہونے سے قبل ہی ایک دوسرے پروگرام کا عمل شروع ہو گیا ہے۔ ترکی جمہوریت قوم کی معاشی اور سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں کی تعمیر براہ راست خود کرنا چاہتی ہے۔ وہ ایک بڑے اجارہ دار کی طرح ان کاموں کو انجام دے رہی ہے۔ وہ ریلیں نکالتی ہے فیکٹریاں کارخانے اور بجلی گھر قائم کرتی ہے۔ زراعت کو نئے نئے آلات کے ذریعے ترقی دیتی ہے اور یہ تمام کام ایک معین اور واضح پروگرام کے ماتحت کئے جاتے ہیں ۱۹۳۲ء میں حکومت نے پہلے پہل یہ تحقیق کیا تھا کہ ملک میں تمام چھوٹے بڑے کارخانے ۱۴۲۰ ہیں۔ جن کی سالانہ آمدنی نوے کروڑ روپے کے قریب ہے، یہ سب نجی کارخانے تھے۔

حکومت نے ان تمام کاموں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے ملک میں سب سے پہلے ایک شکر فیکٹری قائم کی جس کی سالانہ پیداوار رفتہ رفتہ ۷۵ ہزار ٹن ہوگئی۔ ملک کی ضرورت کے لئے یہ مقدار بالکل کافی تھی، اس طرح شکر کی درآمد کا دروازہ بند ہو گیا۔ پہلے پنج سالہ پروگرام کا سب سے بڑا عطیہ کپڑا بننے کا کارخانہ ہے۔ وہ اس وقت ملک کی اسی فی صدی ضرورت کو بخوبی پورا کر رہا ہے۔ ملاطیہ میں فیکٹری کی عمارت بن رہی ہے اس کی تکمیل کے بعد پھر باہر کے کپڑے کی قطعاً ضرورت نہیں رہے گی۔ نقلی ریشم کے کپڑے کی صنعت بھی اچھی ترقی کر رہی ہے۔ علاوہ ازیں معدنیات اور کاغذ بنانے کے کارخانے بھی پہلے ہی پروگرام سے حاصل ہوئے۔ ترکی صنعتی ترقی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۲۳ء میں نوے کروڑ روپے کی چیزیں تیار ہوئی تھیں اور ۱۹۳۶ء میں چار ارب اڑتیس کروڑ کی تیار ہوئیں۔

دوسرا پنج سالہ پروگرام (۱۹۳۸ء۔۱۹۴۳ء) جس کا اجراء ابھی عمل میں آیا ہے۔ معدنیات کو خاص

طور پر ترقی دینا چاہتا ہے۔

ترکی میں معدنیات کی کمی نہیں ہے، ترکی زمین اُن کا بہت بڑا خزانہ چھپائے ہوئے ہے۔ اور پھر یہ کہ ان کانوں میں نہایت عمدہ قسم کی دھاتیں ہیں۔ ترکی کی کچی دھاتوں میں اصل دھات کی جو مقدار ہوتی ہے دوسرے ملکوں کی دھاتوں میں عموماً نہیں ہوتی۔ بعض بعض دھاتوں میں تو دوسرے ملکوں کی نسبت دوگنی مقدار نکلتی ہے۔ معدنیات کے کارخانے ابھی ابتدائی حالت میں ہیں لیکن کم از کم گندھک کے لئے اب بھی ترکی کسی کا محتاج نہیں ہے۔ پہلے ہی پروگرام کے ماتحت "کیسی کارلو" میں گندھک صاف کرنے کا کارخانہ مکمل ہوگیا۔ اس لئے گندھک کی درآمد کی ضرورت نہیں رہی۔ تانبے کی کانوں میں بھی اب ازسرِنو کام شروع ہوا ہے تاکہ جدید ایجادات اور تحقیقات سے فائدہ اٹھاکر انھیں زیادہ بہتر بنایا جاسکے۔ اس پروگرام میں معدنی کارخانوں کے علاوہ دوسری اہم چیز بحری جہازوں کی تعمیر ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ترکی بندرگاہوں پر بھی نظرثانی کی جائے گی اور ان کی اصلاح و ترمیم عمل میں آئے گی۔ چند نئی بندرگاہیں اور بجلی گھر بھی بنائے جائیں گے۔

ایک تیسرا پروگرام اور ہے وہ خالص زراعتی ہے اور ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۲ء تک عمل کرے گا۔ اس کے کل خرچ کا اندازہ دو ارب روپے ہے۔ اس کے ماتحت بہت وسیع پیمانے پر زراعت اور جنگلات کا کام کیا جائے گا۔ لکڑی کے ہل کی بجائے نو ایجاد زراعتی مشینیں استعمال ہوں گی۔ دوسرے زراعتی ملکوں کی نسبت ترکی بڑا خوش قسمت ہے اسے نہ آبادی بڑھ جانے کی شکایت ہے اور نہ اچھی زمین کی کمی کا شکوہ، ضرورت صرف دو چیزوں کی ہے۔ نئے آلات کا استعمال اور پانی کے خزانوں کی تعمیر۔ اور یہی دو کام زراعتی پروگرام کا مقصود ہے۔

اس سلسلے میں گذشتہ مہینے کمال اتاترک نے سمرنا کے قریب (اسمرنی) میں کپڑا بننے کے ایک کارخانے کا افتتاح کیا ہے۔ جس کا سرمایہ دو کروڑ روپے کے قریب ہے۔ اس موقع پر کمال اتاترک اور وزیرِاعظم جلال بائر نے ملک کی معاشی ترقی کے متعلق ایک نہایت موثر تقریر کی۔

ریلوں کی طرف سے بھی حکومت غافل نہیں رہی ہے۔ پچھلے پروگرام میں بھی ریلوں کی تعمیر ایک اہم عنصر تھا اور اس نئے پروگرام میں بھی موجود ہے۔ ہم آئندہ کوشش کریں گے کہ تعمیر شدہ اور مجوزہ ریلوے لائن کو نقشے کے ذریعے واضح کریں

(ع ، م)

جیمس رامزے میکڈانلڈ

۹ر نومبر کی شب کو "ریناڈل پیسیفکو" نامی جہاز پر دنیا کے زبردست مدبر اور برطانیہ عظمیٰ کے سابق وزیر مسٹر میکڈانلڈ کا انتقال ہوگیا۔ آپ تفریح کی خاطر تین ماہ کے لئے جنوبی امریکہ جارہے تھے۔ اور روانگی کے وقت آپ نے فرمایا تھا کہ "یہ پہلا سفر ہے جو میں دنیا کی تمام فکروں سے آزاد ہوکر شروع کررہا ہوں" اتفاق دیکھئے کہ اس کے ساتھ ہی ان کا آخری سفر بھی شروع ہوگیا۔ خوش قسمتی کی اس سے زیادہ اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ ایک معمولی سے مزدور کا لڑکا دنیا کی عظیم الشان سلطنت کا ایک مرتبہ نہیں بلکہ تین مرتبہ وزیر اعظم بنے اور جب مرے تو دنیا کی تمام فکروں سے آزاد ہوکر

مسٹر میکڈانلڈ ۲۲ر اکتوبر ۱۸۶۶ء کو انگلستان کے ایک چھوٹے سے گاؤں لاسی متھ میں پیدا ہوئے۔ اور قصبہ ڈرینی کے بورڈ اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ چند سال بعد وہیں پڑھنے اور پڑھانے کے دونوں کام ایک ساتھ انجام دینے لگے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں وہ لندن پہنچے اور تقریباً دس روپیہ فی ہفتہ پر کلرک کی حیثیت سے ملازم ہوگئے۔ لیکن اپنی تعلیم کا سلسلہ شبینہ مدارس اور نجی مطالعہ کے ذریعے سے برابر جاری رکھا۔ اس کے بعد خرابی صحت کی وجہ سے ملازمت ترک کرکے اخبار نویسی کا پیشہ اختیار کرلیا۔

مسٹر میکڈانلڈ کے وسیع مطالعہ نے انھیں پکا اشترا کی بنادیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۴ء وہ انڈیپنڈنٹ لیبر پارٹی میں شامل ہوگئے اور اگلی ہی سال پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے کھڑے ہوئے۔ لیکن ناکام رہے۔ ۱۸۹۶ء میں مارگریٹ ای گلیڈ اسٹون کے ساتھ آپ کی شادی ہوئی اور ۱۹۱۰ء میں آپ پہلی مرتبہ ہندوستان تشریف لائے۔ پھر ۱۹۱۲ء-۱۹۱۴ء میں سول سروس رائل کمیشن کے رکن کی حیثیت سے آئے۔

یہ آپ کی ابتدائی زندگی کے چند معمولی واقعات ہیں جنھیں کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اصل چیز تو آپ کی سیاسی زندگی ہے۔ ۱۹۰۰ء سے پہلے انگلستان میں ٹریڈ یونین جماعتیں سیاسیات اور دستوری جدوجہد سے بالکل الگ تھلگ رہتی تھیں۔ یہ مسٹر میکڈانلڈ ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۱۸۹۹ء میں ٹریڈ یونین کانگریس نے ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی کہ وہ پارلیمنٹ میں مزدوروں کی سیاسی جماعت قائم کرنے کے مسئلے پر غور کرے۔

اس کمیٹی کے سکریٹری خود مسٹر میکڈانلڈ ہوئے ۔ بالآخر اسی کی سفارش پر ۱۹۰۰ء میں لیبر پارٹی قائم ہوگئی اور ۱۹۰۶ء میں اس نے پہلی مرتبہ پارلیمنٹ کے انتخابات میں حصہ لیا۔ چنانچہ اس مرتبہ صرف ۲۹ رکن منتخب ہوسکے جن میں سے ایک مسٹر میکڈانلڈ بھی تھے ۔ ہوتے ہوتے ۱۹۱۱ء میں آپ لیبر پارٹی کے لیڈر ہوگئے ۔ اور ۱۹۱۴ء میں یعنی جنگ عظیم سے عین قبل آپ نے وہ معرکہ آرا تقریر کی جس میں آپ نے برطانیہ کے جنگ میں حصہ لینے کی سخت مخالفت کی تھی ۔ اس تقریر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساری قوم میں جس پر اس وقت جنگ کا بھوت سوار تھا ، آپ مردود و معتوب ٹھہرے اور آپ کو لیبر پارٹی کی لیڈری سے استعفیٰ دینا پڑا۔ پھر ۱۹۱۸ء کے عام انتخابات میں آپ پارلیمنٹ کے معمولی رکن بھی منتخب نہ ہوسکے ۔ اس طرح ۱۹۲۲ء تک آپ ملک کی عملی سیاسیات سے بالکل علیحدہ رہے ۔ حتیٰ کہ قوم کو ہوش آیا اور اسے آپ کی اصابتِ رائے تسلیم کرنا پڑی ۔ چنانچہ ۲۲ء کے انتخابات میں لیبر پارٹی کے ۱۴۰ ممبر منتخب ہوکر آئے اور مسٹر میکڈانلڈ تمام مخالف جماعتوں کے لیڈر مقرر ہوئے ۱۹۲۳ء میں پھر عام انتخاب ہوا ۔ اور لیبر کو ۱۹۲ نشستیں حاصل ہوگئیں ۔ اس کے بعد ۱۹۲۴ء میں اپنے حکومت کے خلاف عدم اعتماد کی تجویز پیش کی جو لبرل جماعت کے اشتراک سے پاس ہوگئی ۔ چنانچہ ۲۴ر جنوری ۲۴ء کو آپ وزیر اعظم مقرر ہوگئے ۔ آپ کا یہ پہلا دورِ حکومت صرف ۱۰ ماہ تک جاری رہا ۔ اس عرصے میں آپ نے ۱۹۱۴ء کی تقریر کی مطابقت میں دنیا میں امن و امان قائم کرنے کی بہت سی تدابیر اختیار کیں ۔ ان میں سے ایک تدبیر روس سے معاہدہ کرنا تھا ۔ اس پر لبرل جماعت علیحدہ ہوگئی اور کمیونسٹ ورکرز ویکلی کے ایڈیٹر مسٹر جے ۔ آر کیمبل کے خلاف مقدمہ واپس لینے کے سلسلے میں مسٹر میکڈانلڈ کی حکومت کو شکست ہوئی جس کی وجہ سے عام انتخاب لازمی ہوگیا ۔ اب ساری قوم لیبر جماعت سے برگشتہ ہوگئی تھی اور اسے بالشویکی اصول کا حامی سمجھتی تھی ۔ اس لئے اس مرتبہ لیبر جماعت کے صرف ۱۵۰ ممبر منتخب ہوسکے چنانچہ مسٹر میکڈانلڈ نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور پھر مخالف جماعتوں کے لیڈر ہوگئے ۔ اور لیبر جماعت نے ۱۹۲۶ء کی کانفرنس میں ان کی لیڈری پر اپنے اعتماد کی مہر ثبت کردی

پانچ برس بعد ۱۹۲۹ء کے انتخابات میں لیبر جماعت کا پلّہ پھر بھاری ہوگیا یعنی اس کے ۲۹۰ ممبر منتخب ہوگئے ۔ بخلاف اس کے ۲۵۹ قدامت پسند ، ۵۷ لبرل اور ۹ غیر متعلق اراکین پہنچ سکے ۔ چنانچہ آپ دوبارہ

وزیر اعظم مقرر ہوئے ۔ وزارت ترتیب دینے کے بعد ہی آپ نے دنیا میں امن قائم کرنے کا اپنا ناتمام مشن دوبارہ شروع کر دیا۔ اور اس میں بہت بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی ۔ اسی زمانے میں عالم گیر کساد بازاری کا دور دورہ ہوا اور اکثر ملکوں کی حکومتوں کی طرح مسٹر میکڈانلڈ کی حکومت بھی دو برس کے اقتدار کے بعد اس کا شکار ہوگئی ۔ یہاں تک آپ کی زندگی کا ایک باب ختم ہو جاتا ہے اور آگے بالکل نیا اور دوسرا باب شروع ہوتا ہے ۔

اس شکست کے بعد آپ نے لیبر جماعت کی مرضی کے خلاف دوسری جماعتوں سے سمجھوتہ کر کے ایک مشترکہ قومی حکومت قائم کر لی۔ پھر ۱۹۳۱ء کے عام انتخابات میں قومی حکومت کو زبردست تائید حاصل ہوئی ۔ اور خود مسٹر میکڈانلڈ ایک سوشلسٹ کے مقابلے میں زبردست اکثریت سے کامیاب ہوئے لیکن آپ کی لیبر جماعت آپ سے برگشتہ ہو چکی تھی ۔ اور اس قلابازی کو پارٹی کے ساتھ غداری سے تعبیر کرتی تھی مسٹر میکڈانلڈ کے اس طرز عمل کے اسباب و وجوہ کچھ بھی ہوں یعنی چاہے آپ نے اس وقت کے حالات اور مصالح کے پیش نظر قوم کی بہبودی کی خاطر یہ صورت اختیار کی ہو یا ذاتی وجاہت اور اقتدار کی لالچ میں ایسا کیا ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ جس جماعت کے آپ بانی تھے ۔جسے گہوارے سے لے کر شباب تک آپ نے پروان چڑھایا تھا اور جس کے اقتدار اور عدم اقتدار کے ہر زمانے میں بیس برس تک آپ لیڈر رہے تھے اس جماعت کو آپ کی اس حرکت سے زبردست دھکا لگا ۔ اس کا وجود معرض خطر میں پڑ گیا اور اس کا شیرازہ ایسا بکھرا کہ شاید وہ اس ضرب کاری سے نہ سنبھل سکے ۔ تھامس مور نے ایک موقع پر لبرلوں کے لئے کہا تھا کہ " جس طرح شہد کی مکھیاں پھولوں پر بیٹھ کر بھن بھنانا بند کر دیتی ہیں اسی طرح وِگ جماعت والے جب وزارت کی کرسی پر بیٹھتے ہیں تو اُن کی زبانیں بند ہو جاتی ہیں "۔ لبرلوں سے زیادہ یہ چیز لیبر پر اور اس کے بانی اور رہنما پر صادق آئی ۔ کیونکہ نہ صرف اس کی زبان بند ہوگئی بلکہ اس نے سرے سے اپنی جماعت ہی سے منہ موڑ لیا اور وزارت کی کرسی ہی کا ہو رہا ۔

بہرحال ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۵ء تک آپ قومی حکومت کے متواتر وزیر اعظم رہے لیکن اس زمانے میں اپنے متعلق خود آپ کی یہ رائے تھی کہ " میں کنسرویٹو جماعت کے ہاتھوں میں ایک قیدی کی حیثیت رکھتا تھا "

۳۵ء میں آپ نے خرابیٔ صحت کی وجہ سے قلمدانِ وزارت مسٹر بالڈون کے سپرد کر دیا اور خود لارڈ پریسیڈنٹ کے عہدے پر قناعت کی۔ پھر آخر ۳۵ء میں جب عام انتخابات ہوئے تو مسٹر میکڈانلڈ اپنی اس قلابازی کے بدولت بہت بری طرح ہارے۔ لیکن کابینہ میں رکھنے کی خاطر آپ کے احباب نے ۳۶ء میں آپ کو اسکاٹش یونیورسٹیوں کی طرف سے پھر منتخب کرالیا۔ چنانچہ مئی ۳۷ء تک آپ مسٹر بالڈون کی حکومت کے لارڈ پریسیڈنٹ رہے۔ اس کے بعد مسٹر بالڈون کے ساتھ آپ بھی مستعفی ہو گئے۔

ہندوستان کو بھی لیبر گورنمنٹ سے اور اس سے زیادہ بیداری ہند کے مصنف مسٹر میکڈانلڈ سے بہت کچھ امیدیں تھیں۔ لیکن جو امیدیں انھوں نے خود پیدا کی تھیں ان کا بھی لیبر پارٹی کی طرح خود ہی خاتمہ کر دیا۔ اور ہندوستانیوں کو یہ محسوس کرایا کہ آزادی کسی کے دینے سے نہیں بلکہ خود حاصل کرنے سے ملتی ہے۔ بہر حال موجودہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مسٹر میکڈانلڈ ہی کے زمانے کی یادگار ہے۔ (م، ع، خ)

سر جگدیش چندر بوس

سر جگدیش کی موت سے ہندوستان کی وہ زبردست شخصیت اٹھ گئی جسے مہاتما گاندھی اور سر رابندر ناتھ ٹیگور کی طرح بین الاقوامی اہمیت حاصل تھی۔ نباتات کے متعلق جدید تحقیقات کے سلسلے میں سر جگدیش کی شہرت ان کے اوائل شباب ہی میں دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھی۔ اُن کی شخصیت اور اُن کی دریافت مسلمہ ہو چکی تھی۔

موصوف چند روز سے اپنے ایک عزیز کے یہاں گریڈیہ میں مہمان تھے اور علالت کے کوئی آثار موجود نہ تھے۔ ۲۲ نومبر کی شب میں حسب معمول آپ ۱۰ بجے سو گئے اور صبح ہشاش بشاش اٹھ کر غسل خانے میں تشریف لے گئے۔ لیکن جب خلاف معمول وہاں آپ کو دیر ہوئی تو لیڈی بوس نے اس کی جستجو کی چنانچہ آپ وہاں بے ہوش پائے گئے۔ فوراً ڈاکٹر طلب کئے گئے مگر کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور اس عظیم الشان سائنس داں کی روح ۲۳ نومبر کو ۸ ½ بجے جسد خاکی سے پرواز کر گئی۔

اِس وقت ۷۹ برس کی تھی۔ آپ ۱۸۵۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ سینٹ اکسیویر کالج کلکتہ سے ڈگری لینے کے بعد آپ تکمیل تعلیم کے لئے کیمبرج تشریف لے گئے جہاں سے ۱۸۸۴ء میں آپ نہایت اعزاز کے ساتھ کامیاب ہوئے اور واپسی پر فوراً ہی کلکتہ کے پریسیڈنسی کالج میں طبیعات کے پروفیسر مقرر ہوگئے اس کے بعد آپ نے تحقیقات کا سلسلہ شروع کیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ نباتات میں بھی نشوونما کی وہی صورتیں پائی جاتی ہیں اور وہی احساسات موجود ہیں جو دوسرے جان داروں میں ودیعت کئے گئے ہیں۔ اس کے ثابت کرنے کے لئے آپ نے ایک خاص آلہ یا مشین ایجاد کی جسے کریسکوگراف کہتے ہیں۔ یہ آلہ نباتات کی چھوٹی سی چھوٹی حرکت کو ظاہر کرسکتا ہے۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پودے بھی اسی طرح بڑھتے۔ جوان ہوتے اور بوڑھے ہوکر مرجاتے ہیں جس طرح دوسرے جان دار علاوہ ازیں ہر مرض۔ درد و تکلیف اور رنج خوشی کا انھیں بھی اسی طرح احساس ہوتا ہے جس طرح ہمیں ہوتا ہے اور وہ ان سب چیزوں سے پوری طرح متاثر ہوتے ہیں۔

شروع شروع میں سائنس داں دنیا نے آپ کے اِن دعووں کو افسانوں سے زیادہ وقعت نہیں دی لیکن جب مختلف ممالک میں آپ کو اپنے دعووں کو ثابت کرنے کے لئے مدعو کیا گیا اور آپ نے اپنے ایجاد کردہ آلات سے انھیں پوری طرح ثابت کرکے سائنس دانوں کو مطمئن کردیا تو انھیں بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا۔

اس کے بعد آپ نے کلکتہ میں بوس انسٹیٹیوٹ کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد ڈالی جس میں آپ کی دریافت کے سلسلے میں مزید تفتیش و تحقیق جاری ہے اور سائنس سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کی صحیح تعلیم و تربیت کی جاتی ہے۔ (م۔ ع۔ خ)

[illegible] ان

خاندانِ شریفی میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم کے بعد حکیم محمد احمد خاں یونانی طب میں غیر معمولی شہرت کے مالک تھے۔ ملک کے گوشے گوشے سے مریض اُن سے علاج کرانے دہلی آتے تھے

رحمۃ اللہ ان کے فیض عام سے مستفید ہو رہے تھے۔

آپ حاذق الملک حکیم عبدالمجید خاں صاحب کے بڑے صاحب زادے تھے۔ ۱۳۰۲ھ میں پیدا ہوئے۔ مبادیات طب اپنے والد سے اور عربی ادب، فلسفہ مولوی طیب عرب صاحب رام پوری سے پڑھا لیکن والد کے انتقال کے بعد طب کی تکمیل اور مطب کی مشق اپنے چچا حکیم واصل خاں صاحب سے کی۔ اس کے بعد اپنا علیحدہ مطب شروع کر دیا۔ اسی کے ساتھ ایک عرصے تک طبیہ کالج میں درس بھی دیتے رہے۔

حکیم اجمل خاں صاحب کے انتقال کے بعد طبیہ کالج اور ہندوستانی دوا خانہ تو ان کے صاحبزادے حکیم محمد جمیل خاں صاحب کے سپرد ہوا۔ طبی کانفرنس حکیم غلام کبریا خاں صاحب عرف بھورے میاں کے ذمے کی گئی اور خاندانی مطب میں حکیم محمد احمد خاں صاحب بٹھائے گئے۔ لیکن حکیم محمد جمیل خاں صاحب کے مستعفی ہو جانے اور حکیم بھورے میاں کے انتقال سے یہ تمام ذمہ داریاں حکیم محمد احمد خاں کے سپرد ہو گئی تھیں جنھیں گذشتہ سال تک آپ نے سنبھالا۔ لیکن اس سال آپ سب سے کنارہ کش ہو گئے اور اپنی تمام توجہ مطب تک محدود کر دی۔ چونکہ ایک عرصے سے آپ کی صحت خراب تھی اس لئے ابھی کچھ مدت ہوئی کہ تبدیلِ آب و ہوا اور آرام کی خاطر آپ عراق تشریف لے گئے تھے وہاں شدید بخار کا حملہ ہو گیا اور حالت بد سے بدتر ہونے لگی۔ یہ دیکھ کر آپ کے ہمراہی فوراً آپ کو ہندوستان واپس لے آئے۔ جب آپ ۱۳ر نومبر کو دہلی پہنچے تو سرسامی کیفیت طاری تھی۔ یہ صورت ۱۸ر نومبر تک جاری رہی اور شام کو ۵ بجے کے قریب آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

حکیم محمد احمد خاں بڑے جید طبیب تھے اور قدیم فلسفہ کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ اس ضمن میں علم طب اور علم کیمیا سے آپ کو خاص شوق تھا۔

طب کے سلسلے میں آپ کی قوت تشخیص اور علاج میں اُپج خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ یوں تو آپ کے علاج کے متعلق سینکڑوں قصے مشہور ہیں لیکن ہم یہاں مریضوں سے نہیں بلکہ امراض سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ حکیم محمد احمد خاں صاحب کو بعض امراض کے علاج میں خاص امتیاز حاصل تھا۔ یعنی ان امراض کا جس طرح وہ علاج کرتے تھے اس طرح اب تک دوسرے اطبا نے ان کا علاج نہیں کیا تھا دوسرے اطبا کو مرحوم کی سی

کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی

میں یہاں صرف دو امراض کا تذکرہ کروں گا یعنی ورم زائدہ دودیہ (Appendicitis
اور دردِ قولنج (Colic)۔ ان دونوں امراض کے علاج میں مرحوم کو خاص ملکہ حاصل تھا۔
(Appendicitis) کے متعلق ڈاکٹروں کا یہ نظریہ ہے کہ انسان کے جسم میں ایک ایسی آنت ہے



جو کسی زمانے میں اپنا کام کرتی تھی۔ لیکن انسانی ارتقا کے سلسلے میں اب اس نے کام کرنا بند کر دیا ہے اس لئے
وہ سوکھ کر رہ گئی ہے۔ اسے (Appendix) کہتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو شکل) جب اس میں
کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی داخل ہو جاتی ہے تو سمیت پیدا ہو کر ورم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے درد شروع
ہو جاتا ہے۔ اس لئے ڈاکٹروں کے نزدیک اس کا کوئی علاج نہیں ہے بجز اس کے پیٹ کا آپریشن
کرکے یہ زائد آنت کاٹ کر پھینک دی جائے۔ حکیم محمد احمد خاں اس کے قائل نہ تھے اور انھوں نے اس کے
متعدد کامیاب علاج کئے۔

آپ کا نظریہ یہ تھا کہ ایک تو ہاضمہ درست رکھا جائے اور سمیت پیدا نہ ہونے دی جائے۔ اور
دوسرے پیدا شدہ سمیت کو رفع کرکے ورم کو تحلیل کیا جائے۔ جب ورم تحلیل ہو جائے گا تو آنت مذکور
سکڑے گی اس فعل میں وہ عارضی چیز یا تو خود بخود خارج ہو جائے گی یا اگر تھوڑے عرصے تک سمیت پیدا نہ ہوئی

تو وہ جزو بدن ہو جائے گی۔

دوسرا مرض قولنج تھا۔ اس سلسلے میں آپ کا خیال تھا کہ (Colon) میں (ملاحظہ ۲)
صفرا نہ گرنے کی وجہ سے انقباض پیدا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے درد اٹھنے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں اسہال
کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لئے عموماً کسٹرائل۔ گرم پانی۔ صابون وغیرہ کا انیما کیا جاتا ہے۔ لیکن جب قبض
شدید ہوتا ہے تو یہ چیزیں کوئی اثر نہیں کرتیں۔ اس لئے زیادہ تیز اور زود اثر چیز کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ
حکیم محمد احمد خاں ہمیشہ گائے کے پتے (صفرا Bile) کا انیما دیا کرتے تھے۔ ایک تو تیزی کی وجہ سے
اس کا اثر یقینی ہوتا تھا۔ دوسرے صفرے کی کمی کو یہ خارجی طور پر پورا کر دیتا تھا۔

اس کے علاوہ امراض نسواں کے علاج میں آپ کو خاص ملکہ حاصل تھا اور عرق گلاب سے فالج کا
علاج بھی آپ کا بہت مشہور ہے۔

علم کیمیا اور دوا سازی سے حکیم صاحب کو غیر معمولی شغف تھا۔ کیمیا میں آپ اس حد تک کامیاب
ہوئے تھے کہ سونے کا "جوڑا" بنانے لگے تھے۔ جوڑا کیمیا کی ایک اصطلاح ہے جس کا مفہوم ایسا سونا بنالینا
ہے جو ہم وزن اصلی سونے سے ملا دینے کے بعد اصل شرح سے کچھ کم پر فروخت ہو سکے۔

مرحوم یونانی دوا سازی کے فن کو یورپ کے سائنٹیفک اصولوں پر ڈھالنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں
نے اس سلسلے میں دو مرتبہ یورپ کا سفر بھی کیا اور وہاں کے مختلف کارخانوں میں دوا سازی کے طریقے۔ اور
سائنٹیفک آلات کا بطور خود مطالعہ اور تجربہ بھی کیا اور ہندوستان واپس آکر انہی اصولوں پر امراض معدہ
و جگر و امعاء، امراض خون، امراض سینہ وغیرہ کے لئے چند دوائیں تیار کیں۔ مختلف خام ادویہ کے رُبوب یا
ست نکالنے اور ان کے امتزاج سے کوئی نئی دوا تیار کرنے میں آپ ہمیشہ مصروف رہتے تھے۔
افسوس کہ موت نے انھیں مہلت نہ دی ورنہ یونانی طب کو ان کی ذات سے بہت کچھ فائدہ پہنچنے
کی امیدیں تھیں۔

(م ۔ ع)

جاپان کا چین پر حملہ

۷ر جولائی کو جاپان نے ایک معمولی سے واقعے کو بہانہ بنا کر چین پر لشکر کشی شروع کر دی۔ یہ لڑائی غصے میں نہیں چھیڑی۔ جاپانی فوجوں کی پہلی نقل و حرکت سے ظاہر ہو گیا کہ اُن کے سپہ سالار سب کچھ طے کئے بیٹھے تھے اور بس اشارے کے منتظر تھے۔ چین کے دارالسلطنت پیپنگ سے ایک جاپانی فوج شمال مغرب کی طرف بڑھی۔ ایک جنوب مغرب کی طرف اور ایک جنوب کی طرف۔ اس لشکر کشی کا مقصد یہ تھا کہ شمالی چین کے پانچ صوبوں یعنی چاہار، سوئی یوآن، شان سی، شان تنگ اور ہو پئی پر قبضہ ہو جائے۔ جن کا رقبہ چار لاکھ مربع میل اور آبادی ساڑھے سات کروڑ ہے۔ دو برس پہلے جاپان نے مانچوکو کی طرح ان صوبوں کو بھی ایک ماتحت سلطنت بنانے کی کوشش کی تھی جو ناکامیاب ہوئی اور ۱۹۳۶ء کے آخر میں مانچوکو کی ایک فوج جو چاہار صوبے میں گھس گئی تھی پسپا کر دی گئی۔ اب جاپان علانیہ ان صوبوں پر قبضہ کر رہا ہے

چین کی حالت اتنی نازک تو نہیں ہے جتنی کہ حبش کی تھی لیکن سامان جنگ اور جدید آلات کی کمی کے سبب سے چینی فوج جس کی کل تعداد پچیس تیس لاکھ بتائی جاتی ہے۔ جاپانیوں کے سامنے کہیں بھی نہ ٹھہر سکے گی وہ تمام ریاستیں جو جاپان کی روک ٹوک کر سکتی تھیں خاموش بیٹھی رہیں، اور جاپان کو اٹلی کے مقابلے میں کہیں زیادہ آزادی سے مہم سر کرنے کا موقع مل گیا ہے۔

مالیات کے ماہر کہتے ہیں کہ جاپان نے ۱۹۳۱ء کے بعد سے جو صنعتی اور سیاسی پالیسی اختیار کی ہے اس کا نتیجہ جاپان کے حق میں مفید ہو ہی نہیں سکتا۔ جاپان نے مانچوکو فتح کر کے کئی ارب ین کا نقصان اٹھایا اور اب چین کی مہم بھی انتہائی کامیابی کے باوجود جب حساب لگایا جائے تو معلوم ہو گا کہ بہت ہی غلط سودا ہے۔ لیکن یہ جب ہو گا تب ہو گا۔ ابھی تو جاپانی فوجیں آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں اور جن صوبوں پر وہ قبضہ کرنا چاہتی ہیں ان کے مرکزی مقامات اُن کے ہاتھ آ گئے ہیں۔ شروع دسمبر میں نہیں تو بڑے دن تک چینی دارالسلطنت نین کنگ پر جاپانی جھنڈا لہرا رہا ہو گا۔ شینگ ہائی میں جن قوموں کا کاروبار ہے۔ یعنی انگریز

امریکن اور فرانسیسی، انھوں نے جاپان کو وہ مرتبہ دینا منظور کر لیا ہے جو چینی حکومت کو اب تک حاصل تھا اور برسلز میں جو کانفرنس ہو رہی تھی اس نے جاپان کو اخلاقاً مجرم ٹھہرا کر اسے عملاً اختیار دے دیا ہے کہ جو چاہے کرے۔ در اصل برطانوی سامراج کے تمام اراکین اور باقی تمام قومیں جنھیں جاپان سے ذرا بھی اندیشہ تھا جاپان کی حکمت عملی سے بہت مطمئن ہیں۔ کیونکہ اب جاپان ایک عرصے تک چین کے سوا اور کسی طرف پھیلنے کا خیال نہ کرے گا۔ وہ اہل رائے جو پہلے کہتے تھے کہ جاپان کی مالی حالت بہت نازک ہے۔ اب کہتے ہیں کہ چین کی فوجوں کو شکست دینا بہت آسان ہے۔ چین پر قابض رہنا بہت مشکل ہوگا۔ اس لئے کہ میدان میں شکست کھانے کے بعد چینی قزاقانہ جنگ شروع کر دیں گے۔ لیکن یہی سب جاپان کے بارے میں بہت وثوق کے ساتھ کہا جا چکا ہے جاپان نے چین پر منہ مارا ہے اور جتنا منہ میں آیا اتنا نوالہ نگل جائے گا

(باقی آیندہ)

صحافت کے ذریعے سے

ہندوستانی ذہنیت میں زبردست انقلاب پیدا کرنے کی اردو زبان میں پہلی کوشش

کلیم دہلی

زیر ادارت شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی

ہر صاحب عقل ہندوستانی کو جو اس دور کے رجحانات سے واقف ہے اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہندوستان کو اس وقت ذہنی انقلاب کی فوری ضرورت ہے۔ اگر آپ کو اس مقصد عظیم سے ہمدردی ہے تو "کلیم" کی خریداری منظور فرما کر ملک کے ارباب فکر کا ہاتھ بٹائیے۔ اور سنجیدہ علمی اور ادبی مضامین کے دوش بدوش "کلیم" میں وہ سب کچھ ہوگا جسے رومان اور رنگینی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں شاعر انقلاب کا تازہ بتازہ کلام بھی ہر ماہ بالالتزام شائع ہوتا ہے

عمدہ تصاویر سے مزین۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ رنگین سرورق

سالانہ چندہ چھ روپے (لعہ) ششماہی تین روپے آٹھ آنے (عہ؍)

نمونے کے پرچے کے لئے ۸ کے ٹکٹ آنا ضروری ہیں

منیجر کلیم، ۱۸ جانتی نواس، دریا گنج، دہلی

پتہ:۔ مکتبہ اردو ۱۵ بیکلروڈ لاہور

سالنامہ

ادب لطیف

لاہور پنجاب

۱۹۴۳ء کا شاہکار

آسمانِ ادب کے افق پر ستارۂ صبح کی تابانیاں لئے ہوئے پوری شان کے ساتھ ہویدا ہوگا۔ ہندوستان بھر کے آتش نوا شعرا کی بلند پایہ نظمیں آپ کی روح پر انبساط طاری کردیگی۔

ایک ہی پرچے میں، بیک وقت

مسکراہٹیں اور آنسو ...... قہقہے اور آہیں ...... مسرت اور غم

معرکہ آرا علمی و ادبی مقالات

دلنواز اور دل گداز افسانے ۔ رومان آفریں اور کیف افزا مسرت خیز اور بہار آفریں دہشت انگیز اور وحشت زا

آپ دیکھیں گے

سالنامے کا ہر مضمون، ہر افسانہ، ہر نظم ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے

مشرق و مغرب کے مشہور مصوروں کی شاہکار تصویریں

جو آپ کے دل و دماغ پر وجدانی کیفیت طاری کردیں گی

سائز جہازی ضخامت ۲۵۰ صفحات اِن تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف ایک روپیہ

اگر آپ سالنامہ اور ضخیم افسانہ نمبر مفت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آج ہی تین روپے چار آنے (ع۳) بھیجکر خریدار بن جائیے

نوٹ:۔ مشتہرین حضرات کو چاہئے کہ ایسے کثیر الاشاعت سالنامے میں اشتہار دیکر اپنی تجارت کو فروغ دیں (مینجر)

صحیفۂ چین

از

اسد علی انوری فرید آبادی

"صحیفۂ چین" میں چین کی قدیم و جدید تاریخ پر نہایت محققانہ نظر ڈالی گئی ہے، اور ثابت کیا گیا ہے کہ پرانے زمانے میں مذہبی، اخلاقی اور اجتماعی علوم کا معیار کس قدر بلند تھا۔ زبان میں سلاست اور روانی کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔

کتابت و طباعت نہایت عمدہ اور کاغذ چکنا لگایا گیا ہے۔ کتاب کی جلد بندی میں خاص اہتمام ملحوظ رکھا گیا ہے، ڈسٹ کور کی رنگینی نے اس کی زینت کو اور بھی بڑھا دیا ہے

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (۱۸/)

مکتبہ جامعہ، دہلی

شعلۂ طور

از

جگر مرادآبادی

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری

جو فارسی میں

امیر خسرو کے کلام کی مخصوص صفت ہے

اُردو میں

جگر مرادآبادی کے حصے میں آئی ہے

شعلۂ طور

جگر کے کلام کا مکمل مجموعہ ہے

جامعہ

Printed at Muhbub-ul-Matabn, Delhi.